دکن میں اردو

نصیرالدین ہاشمی

دکن میں اردو

نصیرالدین ہاشمی

ترقی اردو بیورو ، نئی دہلی

DCEEAN MEIN URDU
by ; Nasir-Uddin-Hashmi

سنہ اشاعت : جنوری ، مارچ 1985 - شک 1906

پہلا ایڈیشن : 3,000

سلسلہ مطبوعات نمبر : 482

کتابت : لقارالرحمٰن

4876/4 مسجد محلہ ، پرانا سیلم پور ، دلّی

قیمت : -/42

ناشر : ڈائرکٹر ترقی اردو بیورو ، ویسٹ بلاک 8 آر، کے، پورم نئی دہلی 110066

طابع : سپر پرنٹرز ، ساؤتھ انارکلی ، دلّی 51

اپنی بات

دکن میں اُردو، اُردو کی ان کتابوں میں سے ہے جس کے ایڈیشن ہزاروں کی تعداد
میں بار بار چھپتے رہے ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰ صفحوں پر مشتمل تھا اور چھٹا، ساتواں،
ایڈیشن گیارہ سو سے زائد صفحوں کا ہوگیا۔ کیونکہ نصیر الدین ہاشمی کو قدیم اُردو ادب سے
خاص دلچسپی رہی اور وہ ہمیشہ نئے مواد کی تلاش و تحقیق میں رہے۔ جس ذریعہ سے بھی مواد
ملتا رہا کتاب میں اس کا اضافہ کرتے رہے اس امر کا اظہار خود انہوں نے اظہار
و واقعات کے تحت صفحہ ۲۵ پر کر دیا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کے انتقال سے ایک سال پہلے ۱۹۶۳ میں میری اُن سے کئی ملاقاتیں
ہوئیں مگر پہلی ملاقات ان کے دولت خانہ پر کتب خانہ خواتین دکن میں ہوئی تھی جب کہ
پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کے سلسلہ میں مواد اکٹھا کرنے کے لیے میں حیدرآباد گئی ہوئی تھی
اس کتب خانہ میں جمع نایاب کتابوں کا وہ خاص طور سے تعارف کراتے رہے۔ میں نے
چند کتابوں کو ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب
موصوف نے ایسی کتابیں بھی مجھے گھر لے جانے کی اجازت دے دی جس کا ثانی نسخہ
تک نایاب ہے۔ ایک اجنبی اسکالر پر ان کا یہ اعتماد میرے دل پر نقش ہو کر رہ گیا ہے۔
دوسرے دن جب میں نے کتابیں واپس لوٹا دیں تو ہاشمی صاحب کی خوشی کی انتہا نہ
رہی کہ ان کا علمی سرمایہ حفاظت کے ساتھ ان کے کتب خانہ میں واپس آگیا۔ تقریباً پانچ
ماہ تک میرا حیدرآباد میں قیام رہا اور ہاشمی صاحب سے کبھی کتب خانہ سالار جنگ
میں تو کبھی ادارۂ ادبیات اُردو میں اکثر ملاقات ہو جاتی وہ مخطوطات کے مطالعہ اور
ضروری نوٹ لینے میں مصروف نظر آتے آمدم بر سر مطلب اس پیرانہ سالی میں بھی ہاشمی
صاحب کے مطالعہ کا شوق اور معلومات کو تازگی بخشنے کی دھن کا عالم نوجوان محققوں کا
سا تھا۔ اور وہ سفر کی ہزار مصیبتوں کو برداشت کرتے کتب خانوں میں موجود ہوتے۔
۱۹۶۴ء یعنی اپنے انتقال تک ہاشمی صاحب دکن میں اُردو کے مواد میں برابر اضافہ
کرتے رہے۔ آج اس بات کو ۲۱ سال ہو رہے ہیں۔ اس دوران بہت سا نیا مواد سامنے

آگیا ہے، جو اس کتاب میں شامل ہو سکتا ہے۔ ترقی اردو بیورو میں ڈائریکٹر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسی خیال کے تحت دکن میں اردو کی کتابت رکوادی تھی کہ کتاب نظرثانی کے بعد شائع ہو۔ مگر چند مجبوریوں کی وجہ بغیر نظرثانی کے ہی یہ کتاب چھاپی جا رہی ہے۔ ایک اہم بات تو یہ ہوئی کہ اس موضوع پر دلی میں حوالہ کا بیشتر مواد دستیاب نہیں ہے۔ دیگر جگہوں سے مواد کا اکتساب اور اس میں سے صرف متعلقہ مواد کا اضافہ، وقت اور محنت طلب کام ہیں۔

ادھر کئی سالوں سے مارکیٹ میں دکن میں اُردو دستیاب نہیں جس کی وجہ سے طالب علموں، محققوں اور اسکالروں کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا یہی مناسب معلوم ہوا کہ کتاب کی چھپائی میں تاخیر نہ کی جائے۔ نظرثانی کا کام آئندہ ایڈیشن کے لیے ہوتا رہے گا۔ ترقی اُردو بیورو سے دکن میں اُردو کا یہ پہلا ایڈیشن ہے ویسے یہ کتاب آٹھویں بار چھپ رہی ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران چند امور کا خیال رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ روز بروز سامنے آنے والے نئے مواد کی روشنی میں قدیم اُردو کی تصانیف اور قدیم اُردو کے شاعروں و مصنفوں کے بارے میں نئے نظریے اور حقائق سامنے آتے رہے ہیں۔ اپنی معلومات کو صحیح رکھنے کے لیے طالب علموں کو اس سے باخبر رہنا چاہیے اس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو اس صدی کی ابتدا میں اُردو کا پہلا شاعر اور نثر نگار مانا گیا تھا۔ مگر عہد جدید کی تحقیق نے ان تمام رسائل کو حضرت سے منسوب کردہ ثابت کیا۔ دکن میں اُردو میں اس موضوع سے متعلق درج ذیل معلومات ملتی ہیں۔

۱۔ "آپ کی تصانیف کا پتہ چلتا ہے یعنی معرج العاشقین و ہدایت نامہ، تلاوت الوجود اور شکار نامہ اور رسالہ سہ بارہ وغیرہ" ص ۵۱۔

معراج العاشقین کو ایک اور بزرگ مخدوم حسینی کی کتاب ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر حفیظ قتیل نے ایک مکمل کتاب تصنیف کر ڈالی ہے۔

۲۔ ہاشمی صاحب نے حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی مندرجہ ذیل پانچ تصانیف کا ذکر کیا ہے۔

بشارت الذکر، مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز شرح مرغوب القلوب" ص ۶۹۔

میراں جی کی سب سے اہم مثنوی شہادت التحقیق کا ذکر چھوٹ گیا ہے جو ۱۱۰۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ مگر اسے ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زور اور موجودہ مورخین میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ۵۷۳ اشعار کی مثنوی سمجھا ہے (ص ۱۷۱ تاریخ ادب اردو حصہ اول اس مثنوی کا ایک مکمل مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے راقمہ کا مضمون رسالہ سب رس (حیدرآباد) اور اس مثنوی کا دوسرا نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی میں موجود ہے۔

اسی طرح حضرت شاہ میراجی کے فرزند حضرت جانم کی تصانیف کا ذکر بھی نامکمل سا ہے۔

احمد گجراتی کی دو مثنویوں کا ذکر ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔ "احمد کی دو مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک تو لیلی مجنون ہے اور دوسری مصیبت اہل بیت" ص ۱۱۶۔

دیگر کلام کے ساتھ احمد کی تیسری طویل مثنوی دریافت ہوئی ہے جس میں کل ۲۷۰۹ شعر موجود ہیں ڈاکٹر سعیدہ جعفر نے اسے مرتب کیا اور چھپوایا ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء ہے یہ مثنوی وجہی کی قطب مشتری سے بھی پہلے کی تصنیف ہے

ملک خوشنود بیجاپور اور گولکنڈہ کا ایک اہم شاعر گزرا ہے جس کی دو مثنویوں کا ذکر ہاشمی صاحب نے کیا ہے۔

"دو مثنویاں ہم دست ہوئی ہیں ایک ہشت بہشت اور دوسری بازار حسن اولذکر مثنوی کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے"

مذکورہ مثنوی کا نام بازار حسن ہے اور نہ ہشت بہشت بلکہ یہ غلط نام خوشنود کی ایک مثنوی جنت سنگار کو بخشے گئے ہیں جو امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت کا ترجمہ ہے۔ جنت سنگار کے دو قلمی نسخے انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ خاص میں محفوظ ہیں" (تاریخ ادب اُردو حصہ اوّل جمیل جالبی ص ۲۵۳) اس مثنوی کا ایک بہت ہی عمدہ اور مکمل نسخہ میرے علم میں ہے جو مدراس میں موجود ہے۔ برٹش میوزیم کا نسخہ بھی مکمل اور اچھی حالت میں ہے۔

مذکورہ مثالیں ایسے مواد کی تھیں جن کا کتاب میں اضافہ ہونا چاہیے۔ اس کتاب میں ایک اور طرح کا مواد ابتدا ہی سے شامل ہے۔ جس کی نشاندہی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جائے گا۔

نصیر الدین ہاشمی نے بہمنی دور کے مصنّفین کا ذکر کرتے ہوئے۔ ایک بزرگ صدرالدین کو بھی شامل کیا ہے (ص ۔ ۴۲) اور چند رسالوں کو ان کی تصانیف مانا ہے۔ رموزالکاسبین' کسب محویت وغیرہ اور مثال کے طور پر ۲۵ شعر بھی پیش کیے ہیں۔

یہ سارے رسالے سید شاہ صدرالدین میسوری کے ہیں۔ جن کے قلمی نسخے میسور حیدرآباد اور علی گڑھ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ بارہویں صدی ہجری کے بہت مشہور بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کا مزار شریف نل منگل گاؤں میں موجود ہے۔ جو شہر بنگلور سے ۱۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

ایسے چند جزوی بیانات سے قطع نظر دکن میں اُردو کی افادیت کے بارے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ البتہ عنوان کی مناسبت سے کرناٹک، مہاراشٹرا، اور تامل ناڈو کے علاقوں کے ادب کا بھی اسی قدر تفصیل سے ذکر ہونا چاہیئے تھا جیسا کہ آندھرا کا ہے۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علاقوں کا ادبی سرمایہ اتنا زیادہ اور اہم ہے کہ ہر علاقہ کی الگ الگ تاریخ لکھی جائے کیونکہ ان علاقوں کے اُردو ادب کی تاریخ ہندوستان کے کسی بھی ادبی مرکز کے مقابلہ میں سب سے زیادہ طویل مدت کی حامل ہے۔ کرناٹک کو ہی لیجیے۔ نویں صدی ہجری میں بہمنی دور سے اُردو ادب کی جو ابتدا ہوئی اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
ڈائرکٹر ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی

فہرست

قطب شاہی نثر

دوسری فصل

چوتھا دور

مرثیہ گو

پانچواں دور

شعرائے عہد عثمانی

چھٹے دور کی نثر

ساتویں دور کی نثر

خواتین کے کارنامے

نثر نگار خواتین

خواتین شعراء

نثر نگاری

خواتین کی نثر نگاری

اخبارات اور رسائل

ماہوار اور سہ ماہی رسالے

اردو کے ادارے

دیباچہ

"دکن میں اردو" کی آٹھویں اشاعت پیشِ خدمت ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن جو (۱۸۰) صفحات پر مشتمل تھا لیکن چھٹا ایڈیشن جو مؤلف کی وفات سے چند سال پہلے شائع ہوا۔ گیارہ سو سے زائد صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے جو چھٹی اشاعت ہی کی نقل ہے۔

مولف نے اپنے انتقال (سنہ ۱۹۶۴ء) سے پہلے اس کتاب پر نظرثانی کی تھی اور کسی قدر اضافہ بھی کر دیا تھا۔ انتقال سے پیشتر ان کے بعض مضامین جو دکھنی ادیبوں کے متعلق شائع ہوئے تھے ان کے اقتباسات بھی اس ایڈیشن میں شامل کیے گئے ہیں۔ حالیہ عرصہ تک جو تبدیلیاں اور تغیّرات ہوئے تھے ان کی صراحت بھی ضروری تھی، چنانچہ حاشیہ میں اُن تمام تبدیلیوں کی صراحت کر دی گئی ہے۔

یہ کتاب دکھنی ادب میں منفرد اور مستقل مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے اس لیے ہاشمی صاحب کے مختصر حالات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے مولف کی کتاب "مولوی عبدالقادر" اور مؤلف کی خود نوشت سوانح عمری "آپ بیتی" (مطبوعہ نقوش لاہور آپ بیتی نمبر اور سب رس حیدر آباد "ہاشمی نمبر" (جنوری ۱۹۶۵ء) ملاحظہ ہوں۔

اس کتاب کی نظرثانی میں عزیزی ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے میری مدد کی، جس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ ان کے علاوہ میری چاروں بہنوں صفیہ، عفیفہ، خدیجہ اور صبیحہ نے بھی کسی نہ کسی طریقہ سے مفید مشورے دیے اور ہاتھ

بٹایا۔ میں خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب سابق صدر شعبہ لسانیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور ترقی اردو بورڈ کا ممنون ہوں جس کے تعاون سے اس کتاب کی مکرر اشاعت ہو سکی۔

ڈاکٹر ظہیر الدین ہاشمی

"بیت الفضل" ۱/۳/۵/۱۰ تالاب ماں صاحب
حیدرآباد ۵۰۰۰۲۸، (اے۔پی) انڈیا

حالاتِ زندگی

مولوی نصیرالدین ہاشمی مرحوم

مولوی نصیرالدین ہاشمی حیدرآباد کے ایک ممتاز ادیب، محقق اور ماہر دکنیات تھے۔ ان کی گرانقدر تحقیقات، تالیفات اور تصنیفات کو اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے۔ دکن اور دکنیات ان کی زندگی کا ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ آخری لمحوں تک کام کرتے رہے۔

نام ونسب اور خاندان

ہاشمی صاحب جن کا پورا نام نصیرالدین محمد عبدالباری تھا حیدرآباد کے ایک معزز قبیلہ قریش کے ہاشمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد ان اصحاب میں شامل تھے جو عراق و حجاز سے مغربی ساحل پر آج سے زائد از ایک ہزار سال پہلے آئے اور شاہی سلطنت میں معزز خدمتوں پر فائز ہوتے۔ چار پشت تک گوا کی قضائت انجام دی پھر عہد عالمگیری میں سدھوٹ کے قلعہ دار بنے وہاں سے ارکاٹ گئے اور تین پشت تک دیوانی کے فرائض انجام دیئے سرکاری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس میں بھی مصروف رہے۔ ہاشمی صاحب مرحوم کے اجداد میں مفتی عطا احمد، مفتی مخدوم اسحاق (بھڑوچ۔ گجرات)، فقی مخدوم اسمعیل (بھٹکل۔ شمالی کنڑا)، فقی مخدوم علی مہائمی (ماہم۔ بمبئی) قاضی محمود کبیر، قاضی رضی الدین مرتضیٰ (گوا)، قاضی نظام الدین احمد کبیر، مولانا صبیب اللہ بیجاپوری (بیجاپور)، مولوی عبداللہ شہید (ناڑپتری)، مولوی محمد حسین امام المدرسین (بیدر)، مولوی محمد غوث شرف الملک، مولوی عبدالوہاب مدارالامرا، قاضی بدرالدولہ، شمس العلماء قاضی عبیداللہ اور مولوی غلام محمد شرف الدولہ (مدراس) قابلِ ذکر ہیں۔

سرسالار جنگ اوّل کی خواہش پر ان کا خاندان حیدرآباد آیا۔ یہاں ان کے والد مولوی عبدالقادر منصف عدالت اور رجسٹرار بلدہ رہے اور ان کے نانا مولوی حسین عطاء اللہ صاحب نائب معتمد فینانس اور آخر میں سر آسماں جاہ مدارالمہام ریاست حیدرآباد کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ان کی ملکی و علمی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ دکن کے مستند تذکروں اور تاریخوں میں ان کا نام بار بار آیا ہے۔

پیدائش ہاشمی صاحب ۱۵ر مارچ ۱۸۹۵ء م ۱۷ر رمضان ۱۳۱۲ھ بروز جمعہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت ہاشمی صاحب کی تعلیم و تربیت دارالعلوم حیدرآباد میں ہوئی جہاں سے انھوں نے منشی اور مولوی عالم کا امتحان کامیاب کیا اس کے علاوہ مدراس یونیورسٹی کے منشی فاضل بھی تھے لیکن کہنا چاہیئے ان کی اصل تعلیم تو دارالعلوم کی چاردیواری کے باہر ہوئی۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کی تصانیف سے زیادہ دلچسپی رہی۔ حضرت امجد حیدرآبادی سے دارالعلوم ہی نہیں عمر بھر ساتھ رہا۔ ہندوستان کے مشہور کتب خانوں سے علمی پیاس نہ بجھی تو انگلستان فرانس اور اٹلی کا تعلیمی سفر کیا وہاں کے کتب خانوں اور مغربی عالموں اور مستشرقوں سے استفادہ کیا۔

ملازمت تعلیم کی تکمیل کے بعد ہاشمی صاحب دفتر دیوانی و مال (سنٹرل ریکارڈ آفس) میں ملازم ہوئے اور اپنی فرض شناسی اور دیانتداری کی وجہ سے مسلسل ترقی کرتے گئے۔ آخر سررشتہ رجسٹریشن و اسٹامپ میں بہ حیثیت رجسٹرار بلدہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی حیثیت سے ۱۹۵۰ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء تک تاریخ آزادی ہند کے سلسلے میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے مامور رہے۔

سیر و سیاحت ہاشمی صاحب کو سیر و سیاحت کا کافی موقعہ ملا۔ ہندوستان کے کئی شہر، متعدد اضلاع اور بے شمار تعلقے دیکھے۔ حکومت آصفیہ کے وظیفہ پر برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، فرانس، اور اٹلی کی سیاحت کی اور اپنی والدہ کے ہمراہ عراق، بصرہ، بغداد، کاظمین، کربلا اور نجف اشرف گئے۔ اس

کے علاوہ کراچی و لاہور کا بھی سفر کیا تھا۔

وفات

ہاشمی صاحب نے ۲۶ ستمبر ۱۹۶۴ء مطابق ۱۸ جمادی الاوّل ۱۳۸۴ھ بروز شنبہ دن کے گیارہ بجے داعی اجل کو لبیک کہا۔ تدفین اسی دن شام میں درگاہ حضرت سید احمد بادپا احمد نگر حیدر آباد میں عمل میں آئی۔ قطعہ تاریخ وفات حسب ذیل ہے ؎

موت نے آج یہ کیا سخت ستم توڑا ہے — کتنی بے کس نظر آتی ہے وطن میں اردو
ایک دکنی جو اُٹھا سال یہ رحلت کا ملا — ہاشمی چل بسا روتی ہے دکن میں اردو

۸۴ — ۱۴۶۸ - ۸۴ = ۱۳۸۴ھ

(اکبر الدین صدیقی)

تصنیف و تالیف

ہاشمی صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے تھا۔ ان کی پہلی تالیف "دکن میں اردو" ہے۔ اس کتاب نے اردو کی ادبی تاریخ میں جتنی شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ اس موضوع پر کسی اور کتاب کو نہ مل سکی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اس کا عنوان اور صوبوں میں اردو کی نشو و نما پر تحقیق و تالیف کے لیے ایک نمونہ، ایک بنیاد اور ایک طرح بن گیا۔ اس مشہور تالیف کی اشاعت کے بعد وہ سرکاری وظیفہ سے یورپ گئے برطانیہ (انگلستان) فرانس اور اٹلی کے کتب خانوں سے جو مواد اکٹھا کیا اس کو "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ ان مشہور اور مقبول عام کتابوں کے علاوہ ان کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

تاریخ و تنقید ادب

(۱) دکن میں اردو (جس کے ہندوستان اور پاکستان سے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں) (۲) سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری (۱۹۳۲ء)، (۳) حضرت امجد کی شاعری (۱۹۳۴ء) (۴) مدراس میں اردو (۱۹۳۸ء)، (۵) مقالات ہاشمی (۱۹۳۹ء)، (۶) دکنی ہندو اور اردو (۱۹۵۶ء) (۷) دکنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین (۱۹۶۳ء)

قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں

(۱) یورپ میں دکنی مخطوطات (۱۹۳۲ء) (۲) دفتر دیوانی کے اُردو مخطوطات (۱۹۳۵ء) (۳) سنٹرل ریکارڈ آفس کے اردو مخطوطات (۱۹۴۵ء)، (۴) کتب خانہ سالار جنگ

کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست (۱۹۵۷ء)، (۵) کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات (دو جلدیں) ۱۹۶۱ء۔

تاریخ و سوانح
(۱) ذکر نبی صلعم (۱۹۳۴ء) (۲) تذکرہ دارالعلوم (۱۹۴۴ء)، (۳) تاریخ عطیات آصفی (۱۹۴۴ء) (۴) جلوہ زار (۱۹۴۴ء) (۵) تذکرہ مرتضیٰ (۱۹۴۵ء)، (۶) عہد آصفی کی قدیم تعلیم (۱۹۴۶ء)، (۷) آج کا حیدرآباد (۱۹۵۳ء) (۸) جنگ آزادی کی کہانی (۱۹۵۷ء)، (۹) مولوی عبدالقادر (۱۹۶۳ء)، (۱۰) دکنی کلچر (۱۹۶۳ء)

نسوانیات
(۱) خواتین عہد عثمانی (۱۹۳۶ء)، (۲) جنابان نسوان (۱۹۳۸ء) (۳) خواتین دکن کی اردو خدمات (۱۹۴۰ء)، (۴) حیدرآباد کی نسوانی دنیا (۱۹۴۴ء)، (۵) تذکرہ حیات بخشی بیگم (۱۹۵۴ء)

دیگر فنون
(۱) نجم الثاقب (فقہ شافعی) ۱۹۲۴ء اور ۱۹۷۸ء) (۲) رہبر سفر یورپ (۱۹۳۰ء) (۳) فلم نما (۱۹۴۰ء)، (۴) مکتوبات امجد (۱۹۴۴ء)، (۵) زبیدہ کے دیس میں (۱۹۵۵ء)

ان تصانیف کے علاوہ ہاشمی صاحب نے تقریباً ایک ہزار کے قریب اہم تحقیقی مضامین اور مقالے لکھے۔ ہاشمی صاحب کے مضامین کی ایک فہرست ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد کے ہاشمی نمبر (جنوری ۱۹۶۵ء) میں موجود ہے۔

ہاشمی صاحب مرحوم کی علمی، ادبی، لسانی، تاریخی، مذہبی اور تحقیقی خدمات اردو ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں جو ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گی۔

ڈاکٹر افضل الدین اقبال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اظہارِ واقعات

"دکن میں اردو" پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی جس میں جنوبی ہند (دکن) کے تمام علاقوں کی اردو کا مختصر جائزہ لیا گیا تھا، اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں دوسری بار مکتبۂ ابراہیمیہ (حیدر آباد) کی جانب سے اس کی اشاعت ہوئی، دوسری اشاعت میں کسی قدر کمی بیشی ترمیم اور اضافہ کیا گیا تھا، تیسری اشاعت ۱۹۳۶ء میں پھر مکتبۂ ابراہیمیہ کی طرف سے ہوئی۔ اس میں میں نے اپنی کتاب "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے مواد کے مدِّ نظر بہت کچھ اضافہ کیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی مدراس، میسور وغیرہ کی اُردو کے متعلق جو مختص ابواب تھے ان کو خارج کر دیا گیا کیونکہ "مدراس میں اردو" کے نام سے میں نے ایک مستقل کتاب شائع کر دی تھی۔

حیدر آباد میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ایک انتشار کا زمانہ رہا۔ بالآخر ۱۹۵۲ء میں مکتبہ معین الادب (لاہور) کی جانب سے چوتھی بار اس کی اشاعت ہوئی، اس مرتبہ سولہ سالہ جدید معلومات کے مدِّ نظر بہت کچھ اضافہ کیا گیا، ترمیم بھی کی گئی۔

پانچویں اشاعت ۱۹۶۰ء میں میرے بلا علم اردو مرکز لاہور کی جانب سے ہوئی اس میں کوئی ترمیم اور اضافہ نہیں ہوا ہے، بلکہ بالکلیہ چوتھی طباعت کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

گزشتہ نو دس سال میں کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ اور ادارہ ادبیاتِ اردو وغیرہ سے بہت کچھ مواد حاصل ہوا اور دکھنی ادب کے متعلق کثیر ذخیرہ مل گیا، جس کو چھٹی اشاعت میں جو نسیم بکڈپو لکھنؤ سے ہوئی ہے شامل کیا گیا ہے۔

اس چھٹی اشاعت میں کثیر جدید معلومات کے شریک کرنے کے علاوہ ترمیم بھی کر دی

گئی ہے، یہ اشاعت پانچویں اشاعت سے بالکل بدل گئی اور زیادہ معلومات آفریں معلوم ہوگی۔

اس ایڈیشن میں ایک جدید باب کا اضافہ "آندھرا میں اردو" کے عنوان سے کیا گیا ہے، کیونکہ حکومتِ آصفیہ اور حکومتِ حیدرآباد کے اختتام کے بعد نومبر ۱۹۵۶ء میں آندھرا پردیش قائم ہوا، اگرچہ حیدرآباد کے کئی اضلاع جو مہاراشٹر اور کرناٹک سے متعلق تھے وہ جدا ہو گئے، لیکن آندھرا کے کئی ایک اضلاع شریک ہو گئے، اسی کے مطابق ترمیم اور اضافہ کیا گیا ہے۔

ساتویں دَور کے آخر میں جو فضا اُردو کے ناموافق ہوگئی تھی وہ پھر سے بدلنے لگی اور ہمدردانِ اردو کے لیے مسرت اور شادمانی کا سامانِ ضیافت مہیا ہوگیا۔

میں اپنی ناچیز تالیف کی مقبولیت پر خداوند کریم کا شکر گذار ہوں کہ مجھے اسکی اشاعت کی توفیق بخشی، اور اصحابِ علم وفن خصوصاً ہمدردانِ اردو کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے میری حقیر تالیف کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ کر میرے حوصلہ کو بلند کیا۔

۱۳۸۴ھ، ۱۹۶۴ء

تالاب ماں صاحب، حیدرآباد

نصیرالدین ہاشمی

دکن میں اُردو

یعنی

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اُس کی ترقّی

مقدّمہ

گلستانِ ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آکر اردو کا بیج بویا، گنگا اور جمنا نے آبیاری کر کے چھوٹے پودے کو اُگایا۔ اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی انھیں ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔ کرشنا اور گوداوری و موسیٰ درخت کے اُگانے میں معاون ہوئیں۔ ہنوز شمالی چمن کا درخت بارآور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بروقت آبیاری سے بہت جلد تر و تازہ، سرسبز اور شاداب ہوگیا۔ لیکن قبل از وقت بارآوری سے پھلوں میں کثرت ہو کر زیادہ مٹھاس باقی نہ رہی۔

اسی اثنا میں ایک دکھنی باغبان نربدا کے اس پار جا پہنچتا ہے اور اپنے فن زراعت دانی سے شمالی چمن کے درختوں کی پرداخت کرتا ہے۔ پرانی شاخیں قطع و بُرید کر کے چمن کی آراستگی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ پھر تو تھوڑی ہی مدت میں چمن سرسبز اور درخت بارآور ہو جاتے ہیں۔ چمن نئے نئے گُل بوٹوں سے اپنی بہار دو بالا کر دیتا ہے۔ پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ بہار کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ خزاں اس کی جگہ لے لیتی ہے، باغ کے خوبصورت

پھول مرجھا جاتے ہیں۔ درخت عُریاں چمن تاراج اور باغباں برباد ہو جاتے ہیں۔

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن   اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

جمنا کے ساحل کو ایسی حالت میں پاکر کچھ باغبان گومتی کے کنارے جا پہنچتے ہیں اور وہاں کے چمن کی آراستگی اور درختوں کی آبیاری میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر یہاں بھی ان کو قیام اور دوام حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ عرصہ ستلج کی وادی میں قیام کرنے کے بعد وہاں اپنی نشانیوں کو چھوڑ کر اپنے قدیم مامن مسکن کی طرف پلٹ آتے ہیں۔

یہاں کا چمن گو خزاں سے برباد نہ ہوا تھا، درخت پھلوں سے خالی نہ ہوئے تھے۔ پھول زمانہ کی نیرنگیوں کے باعث کمھلا نہ گئے تھے تاہم عمدہ مسالہ اور نئے مصلحوں کی ضرورت تھی، تاکہ طرزِ جدید کے آلات اور نو ایجاد کھاد کو جو یورپ کے گلزاروں کی چمن بندی میں کارآمد تھے استعمال کریں۔ باغبانوں نے اس گُر کو دریافت کر لیا اور نئے ساز و سامان کے ساتھ چمن کی آراستگی میں مشغول ہو گئے۔

صفحات آیندہ آپ کو اس کی حقیقت سے بخوبی آگاہ کریں گے اور میرے مافی الضمیر کو روشن کر دیں گے، تاہم اس امر کا خیال رہے کہ میں نہ تو انگریزی سے واقف ہوں اور نہ عربی و فارسی سے کماحقہٗ آگاہ مجھے اس امر کا دعویٰ نہیں کہ میں انشاپرداز یا مضمون نگار ہوں، نہ تو مجھ کو شاعری و سخن سنجی میں دخل ہے اور نہ شعر فہمی کا ذوق۔ ان تمام امور کے لحاظ سے میری تالیف کا کیا رُتبہ ہونا چاہیے خود ناظرین غور فرما سکتے ہیں۔

مگر اس میں شک نہیں میں نے تلاش و تجسس اور غور و مطالعہ کے بعد اس کو مرتّب کرنے کی جسارت کی ہے۔ سب سے بڑی دشواری فراہمی مواد کی تھی، کیونکہ ایک امر کے دریافت کرنے کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا تھا مغربی ممالک کے پریس اس امر کا خاص انتظام رکھتے ہیں کہ جو کتاب طبع ہو اس کے مضامین اور جن جن امور کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہو اس کی فہرست مرتب کر کے کتاب کے ساتھ لگا دی جاتی ہے جس کے باعث اہلِ مغرب جب کسی تصنیف یا تالیف کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو ان کے لیے فراہمی مواد میں دشواری پیدا نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے ایشیائی افراد خصوصاً اہلِ ہند کے لیے یہ آسانی نہیں ہے کیونکہ یہاں عموماً ہر کتاب کے ساتھ فہرست کے نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مطلوبہ داخلہ کس صفحہ پر درج ہے۔ البتہ مغربی ممالک

میں جو کتابیں عربی زبان کی شائع ہوئی ہیں ان میں یہ انتظام ملحوظ رکھا جاتا ہے، چنانچہ مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس خوبی سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ مصر اور بیروت میں بھی اس اصول کی پابندی ہوتی ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں سے لکھا ہے اگرچہ ابتدا میں میرا ارادہ ایک مختصر مضمون لکھنے کا تھا لیکن جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مضمون طویل ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ ایک کتاب کی صورت ہو گئی، اس کتاب میں میں نے ان اصحاب کے کلام کو بھی پیش کیا ہے جو دکھنی نہیں تھے بلکہ یہاں صرف بود و باش اختیار کر لی تھی اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ میں نے اس امر کو اس لیے جائز رکھا ہے کہ میر اور غالب جن پر دہلی ناز کرتی ہے وہ درحقیقت دہلی کے نہیں تھے بلکہ آگرہ کو ان کا وطن ہونے کی عزت حاصل تھی لیکن انھوں نے دہلی میں بود و باش اختیار کر لی تھی اور دہلی ہی کے ہو رہے تھے اس لیے وہ دہلوی مشہور ہو گئے۔ میر لکھنؤ میں آکر پھر دہلی گئے نہ آگرہ وہیں ان کا مدفن ہوا۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کہ میں نہ شاعر ہوں اور نہ سخن فہمی و سخن سنجی کا مدعی پس جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں اپنی استعداد اور اپنی پسند کا لحاظ رکھا ہے۔ درحقیقت ہر شخص کا انتخاب اس کے مذاق کے مناسب ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کا مذاق یکساں نہیں ہو سکتا۔ کسی کو سوز و گداز پسند ہوتا ہے تو کوئی شیرینی و لطافت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ کوئی کلام کی سادگی کو پسند کرتا ہے تو کوئی رنگینی اور نزاکت کو۔ غرض یہ ناممکن ہے کہ ہر ایک کا مذاق یکساں ہو۔ اگر ناظرین کو انتخاب میں کوئی سقم نظر آئے تو اس میں میرے مذاق کا قصور اور کمی ہوگی نہ کہ شاعر کا نقص۔

المختصر میری دو سالہ محنت کا جو کچھ ثمرہ ہے وہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش ہے۔ فقط!

خاکسار

نصیر الدین ہاشمی

۷ ربیع صفر ۱۳۲۳ھ

جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا اور اس کی ترقّی

تمہید

کوہ بندھیاچل کا جنوبی حصہ بھی علم و ہنر کی ترقی میں دنیا کے اور کسی حصۂ ملک سے کم نہیں رہا۔ اس سرزمین نے بھی وہ وہ باکمال ہستیاں پیدا کیں، جنھوں نے گلشن گیتی کے چمن کو رنگ برنگ کے علمی گُل بوٹوں سے آراستہ و مزین کیا اور اپنی ظاہری ہستی کو نابود کرنے کے بعد بھی صفحۂ روزگار پر سرسبز اور شاداب علمی گلشن اپنی یادگار چھوڑ گئیں۔

ہندوستان کے مشہور مؤرخ فرشتہ اور فارسی کے نامور باکمال شاعر ظہوری نے یہیں عمر بسر کی۔ بلبلِؔ ہزارداستانِ ایران کو پیغام طلب گیا۔ علاوہ ازیں سلطنت بہمنیہ کا مشہور مدرسہ جس کے کھنڈر اب تک بیدر میں اپنے بانی محمود گاواں کی یاد تازہ کرنے کے لیے موجود اور زبان حال سے گویا ہیں کہ میرا بانی تعلیم سے کیسا گہرا ذوق، کیسی دلچسپی اور اصلاح قومی کے لیے کیسا بے چین دل رکھتا تھا۔

اسی کی خاک میں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم چشم و چراغ فرنگی محل آرام فرما رہے ہیں اور سرزمین دکن ہی کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ اردو کا نہ صرف پہلا شاعر اور مذہبی و علمی تصانیف کا موجد یہیں سے جلوہ نما ہوتا ہے، بلکہ اردو زبان کی یونیورسٹی قائم ہو کر چار دانگ عالم میں اپنا غلغلہ بلند کرتی ہے۔

اُردو کی ابتدا جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بود و باش اختیار کرتی ہے تو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال اور کام کاج میں ایک کے الفاظ

ؔ سلطان محمود شاہ بہمنی نے خواجہ حافظ شیرازی کو طلب فرمایا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ نہیں آئے (فرشتہ)

دوسرے کی زبان میں منتقل ہوں۔

ہندوستان ہمیشہ غیر اقوام کا اماجگاہ رہا ہے۔ آرین قوم نے شمالی ہند پر حملہ کیا اور یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ ان لوگوں کی زبان تامل، اُڑیا اور تلگو وغیرہ تھی چنانچہ آج تک دکن میں یہ قدیم زبانیں مروّج ہیں۔ فاتحوں نے خیال کیا کہ عام شودروں (مفتوح) کی زبان سے اپنی زبان بلند پایہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے قواعد و اصول ترتیب دیے اور اپنی زبان کا نام سنسکرت رکھا۔ لیکن ان کی سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے اور ہوتے ہوتے پراکرت زبان خود بخود پیدا ہوئی۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ پراکرت زبان ہی کُل شاہی دفاتر اور دربار کی زبان ہو گئی۔ عام طور سے مذہبی کتب وغیرہ اسی زبان میں مرتّب ہونے لگیں۔

لیکن تقریباً پندرہ سو سال کے بعد جب کہ راجہ بکرماجیت کے سر پر تاج شاہی آیا تو قدیم سنسکرت زبان کو پھر سے عروج حاصل ہوا اور وہ آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگی۔ غرض اس طرح شاہی دربار امرار اور پنڈتوں کی زبان سنسکرت رہی مگر عوام میں وہی پراکرت مروّج رہی۔

پراکرت

آج سے پہلے پروفیسر دبیر کی تحقیقات کی رُو سے چھٹی صدی عیسوی میں بیس سے زیادہ پراکرت زبانیں بولی جاتی تھیں۔ جن میں سے پانچ زیادہ مشہور تھیں۔ یعنی پالی، جینی، مہاراشٹری، سوراسنی اور مگدھی۔

سوراسنی کا دوسرا نام برج بھاشا ہے۔ یہ زبان بہت وسیع علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ سندھ سے بہار اور لاہور سے مالوہ تک اس کی وسعت تھی۔ اردو زبان کا مخزن اسی برج بھاشا کو قرار دیا گیا تھا مگر جدید تحقیقات کی رُو سے یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔

اُردو کی ابتدا کے متعلق اس وقت جو مختلف نظریے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

الف۔ اس کی ابتدا پنجاب سے ہوئی۔

ب۔ اس کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔

ج۔ اس کی ابتدا دکن سے ہوئی۔

د۔ اس کی ابتدا دوآبہ گنگا جمنا سے ہوئی۔

یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے

پیدا ہوئی ہے۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔

سندھ کی اسلامی حکومت کا آغاز ۹۲ھ/۷۱۲ء سے ہوچکا تھا اور صدیوں تک وہ یہاں حکومت کرتے رہے۔ حکومت کی رواداری، اور ہندو مسلمانوں کے عام طور سے ملنے جلنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور باہمی تبادلہ خیالات کے مواقع پیدا ہوگئے۔ ان حالات کے مدِ نظر اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے جو زبان بنی اس کا آغاز اسی مقام سے ہوا ہے تو غلط نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو تحقیقات ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ان فاتحوں کی اصلی زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان عالمِ وجود میں آئی وہ عربی اور سوراسنی سے مشترک ہوتی مگر چونکہ اس میں فارسی کا حصّہ زیادہ ہے اس لیے ہم یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اردو کی ابتدا سندھ سے نہیں ہوئی۔ سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد سواحل ملیبار اور کرناٹک پر ہوئی۔ شیوخ عرب اور سرداران آل ہاشم تجارت اور تبلیغ دین کی دھن میں صدہا میل سمندر کی راہ طے کر کے پُرامن طریقہ سے سواحل ہند پر پہنچے، اور اپنی کوشش و جدوجہد سے سواحل کے ہندوؤں میں خاص رسوخ حاصل کرلیا۔ اپنی ملنساری اور نیک مزاجی سے ان کے دلوں میں گھر کرلیا اور وہ سواحل سے گذر کر اندرونِ ملک میں دور تک پہنچ گئے۔ اپنی مسجدیں تعمیر کیں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ اپنی تعلیم کی تلقین کی۔

مشہور و معروف مسلم سیاح ابن بطوطہ (جنھوں نے علائی فتح کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۷۴۳ھ میں ان سواحل کا سفر کیا تھا) کے سفرنامہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسلامی اثر ہمہ گیر تھا۔ اس کے بعض بیانات حسب ذیل ہیں۔

الف:- شہر بدپٹن[1] سے چل کر ہم فندرینہ[2] پہونچے۔ یہ بڑا شہر ہے۔ بازار اور باغات اس میں بکثرت ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے تین محلّے ہیں۔ ہر محلّہ

---

[1] کالی کٹ کے قریب "بے پور" کے نام سے موسوم ہے۔

[2] کالی کٹ سے سولہ میل شمال میں "پندرانی" کے نام سے موسوم ہے۔

یں مسجد ہے اور جامع مسجد سمندر کے کنارے واقع ہے۔ (عجائب الاسفار صفحہ ۲۹۱)

ب ۔ وہاں سے چل کر ہم کالی کٹ میں پہنچے ۔ مالابار میں یہ بہت بڑی بندرگاہ ہے ۔ یہاں کا راجہ سامری کہلاتا ہے ۔ امیر التجار کا نام ابراہیم شاہ ہے ۔ وہ بحرین کا باشندہ ہے ۔ اس شہر کا قاضی فخرالدین عثمان بھی بڑا سخی ہے ۔ خانقاہ کا شیخ، شہاب الدین گازرونی ہے صفحہ ۲۹۲)

ج ۔ پانچویں دن ہم کنجی گری پہونچے .... مسلمان سوداگر بھی اس شہر میں بہت ہیں ۔ ان میں سب سے بڑا علاء الدین ادھی شہر آدہ کا رہنے والا ہے ۔ اس شہر کا قاضی ایک فاضل ہے مسلمانوں میں بڑا آدمی محمد شاہ بندر ہے اس کا بھائی تقی الدین بڑا فاضل ہے ۔ اس شہر کی جامع مسجد بھی عجیب ہے خواجہ مندب نے اس کو تعمیر کیا تھا ۔ مسلمانوں کی اس شہر میں بڑی عزت ہے راجہ کا نام تبردی ہے ۔ وہ مسلمانوں کی نہایت عزت کرتا ہے ۔ (صفحہ ۲۹۸)

د ۔ دوسرے دن صبح کو ہنور[1] میں پہنچے ۔ یہ شہر ایک بڑی کھاری پر واقع ہے اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں ۔ انھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی، فقیہہ اسمٰعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں ۔ وہ نہایت پرہیز گار، خوش خلق اور فیاض ہیں ۔ اس شہر کا قاضی نورالدین علی ہے .... یہاں کی عورتیں خوب صورت اور باعصمت ہوتی ہیں، سب کی سب حافظ قرآن ہوتی ہیں ۔ اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے اور تیئیس مکتب لڑکوں کے ہیں ۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے ۔ اس کو مالابار کے لوگ کچھ معین خراج دیتے ہیں ۔ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن حسن بڑا نیک بخت ہے ۔ ہمیشہ باجماعت نماز پڑھتا ہے ۔ جب میں اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلا لیتا تھا ۔ فقیہہ علی[2] اور فقیہہ اسمٰعیل بھی موجود ہوتے تھے ۔ (صفحہ ۲۷۹)

علاء الدین خلجی اور ملک کافور کے فتوحات دکن کے پہلے کئی ایک صوفیاء کرام دکن کے

---

[1] اس کو اب "ہونور" کہتے ہیں ۔ احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے ۔

[2] یہ فقیہہ علی ملا علی مہائمی ہیں جو تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں ۔

مختلف حصوں میں سکونت کر کے اپنے اخلاقِ حسنہ کے باعث ہندوؤں میں ہردل عزیز ہوگئے تھے، ان کی تبلیغ اور ہدایت جاری تھی۔ ان میں سے بعض صوفیا یہ ہیں۔

۱۔ حاجی رومی متوفی ۵۵۵ھ
۲۔ سید شاہ مومن عارف اللہ متوفی ۵۹۷ھ
۳۔ بابا مظہر طبل عالم متوفی ۶۶۲ھ
۴۔ شاہ جلال الدین گنج رواں متوفی ۶۴۴ھ
۵۔ سید احمد کبیر جہاں قلندر متوفی ۶۵۹ھ
۶۔ شاہ علی پہلوان متوفی ۶۷۲ھ
۷۔ شاہ حسام الدین متوفی ۶۸۰ھ
۸۔ صوفی سرمست متوفی ۶۸۰ھ
۹۔ بابا شرف الدین متوفی ۶۸۷ھ
۱۰۔ بابا شہاب الدین متوفی ۶۹۱ھ
۱۱۔ بابا فخر الدین متوفی ۶۹۴ھ
۱۲۔ سید اعز الدین حسینی متوفی ۶۹۹ھ[1]

اس کے علاوہ اور بیسیوں صوفیاء کے نام ہمدست ہوتے ہیں جنھوں نے دکن کے مختلف حصّوں میں سکونت کر لی تھی اور وہیں انتقال فرمایا۔

اب یہ امر خاص طور سے غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدّتوں دکن میں بود و باش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا یہاں کے مُلکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت کام کاج خرید و فروخت میں ان سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو دونوں غیر قوموں کے لیے تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔ اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے۔ وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اُردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے

---

[1] "تذکرہ اولیاء دکن" جلد اوّل۔ جلد دوم

ہیں۔ اس لیے سردست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔

پنجاب کے مولد ہونے کے متعلق مؤلف "پنجاب میں اردو" مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، مگر جب تک مسعود کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا جاسکتا اور جیسا کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری کی رائے ہے:[1] "پنجابی زبان، اردو کی ماں نہیں ہوسکتی، بلکہ بہن ہوسکتی ہے۔"

سندھ، دکن، پنجاب کے خارج ہو جانے کے بعد اب صرف دوآبہ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ماہرین لسانیات یعنی پروفیسر موسیو جیولس بلاک، پروفیسر ٹرنر، پروفیسر بیلی، پروفیسر چٹرجی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری کی تحقیقات کی رو سے اردو کا سرچشمہ وہ زبان ہے جو پنجابی اور برج بھاشا دونوں کی ماں تھی[2] یعنی وہ پراکرت زبان جو مسلمانوں کی آمد کے وقت پشاور سے لے کر الہ آباد تک بولی جاتی تھی۔

مسلمان فاتحین شمال کی جانب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو اوّل انھوں نے پنجاب میں قیام کیا۔ مگر اس کے بعد دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے صدہا خاندان جو ترک، مغل اور افغان تھے جن کی زبان عام طور سے زیادہ تر فارسی تھی۔ پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہوگئے۔ اس زمانہ میں یہاں "جدید ہندو آریائی دور کی پراکرت" زبان بولی جاتی تھی اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو کی پیدائش ہوئی۔

دکن میں اردو کی ابتدا

شمال کے فاتحین نے جب ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں دہلی کی چوہان سلطنت فتح کرلی تو یہ نئی زبان بھی اپنے ساتھ لائے۔ اس سرزمین برج میں مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان ابھی پختہ نہیں ہونے پائی اور اس پر برج کا زیادہ اثر نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں نے جنوب کا رُخ کیا۔

اولاً علاءالدین خلجی پھر ملک کافور نے دکن پر مُسلسل حملے کیے۔ ۷۱۰ھ میں راس کماری تک علائی علم پہنچ گیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانہ میں اٹھا اور

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو "ہندوستانی لسانیات"

[2] "ہندوستانی لسانیات اور ہندوستانی صوتیات"

دکن میں جاکر رُکا۔ محمد تغلق نے نہ صرف دکن پر فوج کشی کی بلکہ دیوگڈھ کو دولت آباد سے موسوم کرکے اس کو اپنا پائے تخت بھی قرار دے دیا۔ اس کے باعث نہ صرف فوجی اشخاص بلکہ اہل علم وفضل۔ اہل حرفہ اور تجار سب ہی دہلی چھوڑکر دکن آ گئے۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے دہلی کو مراجعت کی مگر ایک بڑے گروہ نے یہاں بودوباش اختیار کرلی۔

یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے یہاں نہیں تھی، اس کے برخلاف شمال میں برج مروّج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی، اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ عام طور سے پردیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی۔ یہ بات واضح ہے کہ دوآبہ گنگا وجمنا اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے، دکن میں جدید زبان جب بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمین برج سے نکلنے سے قبل اس میں قائم ہوچکا تھا۔

غرضکہ اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔

اُردو کے نام

شمال میں اب تک اس جدید زبان کا کوئی نام رائج نہیں تھا، مگر دکن میں وہ دکھنی کے نام سے موسوم ہوئی لیکن رفتہ رفتہ شمالی ہند میں بھی ریختہ۔ اور اُردو اور اُردوئے مُعلّٰی کے ناموں سے موسوم ہوئی۔ وہاں ناموں کی ابتدا کب سے ہوئی اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں چونکہ یہ امور ہمارے مبحث سے خارج ہیں اس لیے اس کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

دکن میں یہ زبان ہندی اور دکھنی سے موسوم رہی ہے۔ قدیم سے قدیم دکھنی شعراء اور مصنفین نے اس کو ہندی اور دکھنی کے نام ہی دیے ہیں۔ ۱۲۰۰ھ تک بھی دکھنی اور ہندی کا نام رائج تھا۔

وجہی کہتا ہے:۔

دکھنی میں جوں دکھنی مٹی بات کا ‫ ‫ ادا نیں کیا کوئی اس دہات کا

(قطب مشتری)

ابن نشاطی کہتا ہے۔

اسے ہر کس کتیں سمجھا کوں توں بول ‫ ‫ دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

(پھول بن)

رستمی کہتا ہے:۔

کیا ترجمہ دکھنی ہور دل پذیر بولیا معجزہ یوں کمال خاں دبیر

(خاور نامہ)

نصرتی کہتا ہے:۔

صفائی کی صورت کی ہے آرسی دکھنی کا کیا شعر یوں فارسی

(گلشن عشق)

میراں یعقوب کہتے ہیں:۔

"اپنی حیات کے وقت منجے ارشاد کیے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کس کے تئیں سمجھا جاوے۔"

(شمائل الاتقیا)

آگاہ المتوفی سنہ ۱۲۲۰ھ نے لکھا ہے:۔

ولے بعض یاروں کا ایماں ہوا سو ہندی زبان یہ رسالہ ہوا

(رسالہ فرقہ ہائے اسلام)

دیگر

ہے دکھنی میں مجکوں مہارت یتی کہ النصر منکم کہئے نصرتی

قاضی بدرالدولہ المتوفی سنہ ۱۲۸۰ھ لکھتے ہیں:۔

"لیکن دیکھا کہ بازارِ علم کا بہت کاسد ہو گیا اور علم کے جاننے والے دنیا سے گذر گئے ...... تب زبان ہندی میں یہ کتاب لکھنا شروع کیا۔"

(فوائد بدریہ)

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ دکن میں اردو کا نام عام طور سے دکھنی اور ہندی تھا۔ اگرچہ یہاں ایک اور نام ریختہ کا بھی استعمال ہوا ہے مگر اس کو سب سے پہلے ولی اورنگ آبادی نے استعمال کیا ہے۔

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دے رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

دکن میں زمانۂ ولی سے پہلے ریختہ صرف اس کلام کو کہتے تھے جس میں مصرعوں کے بعض ارکان وا!؟ تا د فارسی اور بعض دکھنی ہوتے تھے۔ مثلاً

دیدم نظر بہروپ چو اس شوخ چکہ مستانہ را　　گفتم بیا مندر مئے روشن مکن کاشانہ را

چنانچہ کلیات شاہی سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ریختہ کے عنوان سے جو غزل لکھی گئی ہے وہ تمام تر اسی قسم کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح دکن میں اردو کا نام دکھنی رکھا گیا تھا اسی طرح شمالی ہند میں وہ پہلے پہل ریختہ کے نام سے موسوم ہوئی ہوگی اور ولی نے بھی اس کا استعمال اپنے سفرِ دہلی کے بعد کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی شعراء کے قطع نظر شمالی ہند کے شعراء نے لفظ ریختہ کو عام طور سے استعمال کیا ہے[1]۔

---

[1] ۔ میر صاحب فرماتے ہیں :۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

قائم کہتا ہے :۔

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　ایک بات لچر سی بہ زبانِ دکھنی تھی

اثر کہتا ہے :۔

ریختہ نے یہ تب شرف پایا　　جب کہ حضرت نے اس کو فرمایا

دکن میں اردو نثر و نظم کی ابتدا

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جب دکن شمالی ہند کی اسلامی حکومت میں شامل ہو گیا تو اسی وقت سے یہاں بول چال میں جدید زبان کا رواج شروع ہو گیا اور پھر جب محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنا مستقرِ حکومت قرار دیا تو اس میں اور ترقی ہوئی اور عالم و جاہل، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ ہر شخص اسی دکھنی زبان میں گفتگو کیا کرتا تھا۔ صاحبِ حال درویش بھی اسی زبان میں وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے والد نے جن کا انتقال ۷۳۱ھ میں ہوا[1] اپنا تخلص راجہ رکھا تھا جو آج تک شاہ راجو یا سید راجا کے نام سے مشہور ہیں[2]۔

اسی طرح حضرت زین الدین خلد آبادی المتوفیٰ ۷۷۱ھ کا آخری کلام "منجہ مت بلادہ" مشہور ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے وصال کا وقت قریب ہوا تو آپ کے مُرید عرض کرنے لگے کہ وصیت کی جائے اور کوئی خلیفہ مقرر کیا جائے اس پر آپ نے پہلے تو منھ

---

[1] مشکوٰۃ النبوت (مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ)

[2] انڈیا آفس میں ایک فارسی دیوان ہے نمبر (۲ - ۱۷) اتھے بہت ممکن ہے کہ یہ دیوان آپ ہی کا ہو۔ مصنفِ کیٹیلاگ نے کوئی صراحت نہیں کی ہے اور اصل مخطوطہ سے بھی کوئی مواد حاصل نہیں ہوا۔ دیوان بالکل مختصر ہے۔ صرف (۱۷) ورق ہیں۔ سرورق پر لکھا گیا ہے "اشعار تصنیف راجا بہ ہندی"۔ مگر افسوس کوئی ہندی شعر مذکور نہیں ہے۔ سب فارسی غزلیں یا مثنوی ہے۔ تخلّص کے بعض شعر ملاحظہ ہوں۔

راجا کہ تماشا ہ جہاں سرِ عظیم است   اما چہ تواں کرد کہ ایں چشم نداریم

گفت راجا ناگہا سلطان خوباں رخ نمود   صد ہزاراں سجدہ کردم حسن زیبا یافتم

پھیر لیا اس کے بعد جب آپ کے ایک مُرید خاص نصیر الدین بدہیری نے دوبارہ یاد دہانی کی تو اس وقت آپ نے فرمایا "منجہ مت بلّاد"۔

دکھنی نثر کی ابتدا

اس امر کا ابھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطۂ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گذر کر تحریری صورت میں بھی آئی اور چونکہ اس کی سرپرستی صاحب حال وقال درویشوں نے کی تھی اور وہی اس وقت کے مسلمانِ قوم تھے اور ان کے مُریدوں کی تعداد صدہا بلکہ ہزاروں سے متجاوز ہوتی تھی اور پھر وہ مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس لیے اکثر مرشد اپنے مریدوں کی تلقین اور تبلیغ کی غرض سے رسالے قلمبند فرمایا کرتے۔ چونکہ عام طور سے اب دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا اس لیے اس زبان میں بھی اس قسم کے رسالوں کا لکھا جانا ناگزیر تھا۔

جدید تحقیقات کی رُو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفّی ۸۲۵ھ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس کی ابتدا کی اور "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ" وغیرہ مرتب[۲] فرمائے۔ اس کی مزید صراحت آگے درج کی جائے گی اور نمونہ بھی دیا جائے گا۔

دکھنی کا پہلا شاعر اور نظم کی ابتدا

شاعری کا انسانی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تمدن کی اصلاح میں جو کارہائے نمایاں اس سے ظہور میں آئے وہ اور وسائل سے نہیں آئے۔ نظم کے باعث ہی فطری ولولے جوش میں آتے اور قدرتی جذبات کو حرکت وجنبش ہوتی ہے۔

---

[۱]۔ روضۃ الاقطاب تاریخ خلد آباد۔ مطبوعہ مصنّف رونق علی مرحوم

[۲]۔ اگرچہ بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم المتوفّی ۷۹۵ھ کے بعض رسالوں کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اس لیے وثوق کے ساتھ اس کے متعلق دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اور بعض خواجہ بندہ نواز کے والد سید یوسف کو اردو نثر کا بانی تصور کرتے ہیں۔

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا نہایت دشوار ہے کہ پہلے کس زبان میں نظم کی ابتدا ہوئی لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں جس قدر زبانیں عالمِ وجود میں آئیں ان میں اوّل نظم ہی کا رواج ہوا کیونکہ نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے۔ اسی لیے قدیم زمانہ میں مذہبی کتابیں نظم ہی میں قلم بند ہوا کرتی تھیں۔ سنسکرت میں عرفانِ حقیقی اور فلسفہ و حکمت کا اشراقی کام نظم کے ذریعہ ہی سے وابستہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جبکہ عرب میں کتابت کا دستور نہ تھا۔ سیکڑوں ہزاروں اشعار عرب یاد رکھتے تھے۔ دنیا میں عربوں کے سامنے کوئی قوم خلقی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اسی طرح فارسی زبان میں شاعری سے بڑے بڑے کام لیے گئے اور شاعری کو بادشاہوں کی خلوت جلوت، رزم بزم سے خاص تعلق رہا۔ شاعروں کی کافی طور سے عزت افزائی کی گئی اور انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیا جانے لگا۔

مگر دکھنی زبان میں ایسا نہیں ہوا۔ یہاں نظم کی ابتدا نثر کے بعد ہوئی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریر کی ابتدا چونکہ ترجمہ سے ہوئی ہے اور نظم کے بہ نسبت نثر میں ترجمہ کرنا آسان اور سہل تھا اس لیے غالباً نظم کی ابتدا نہیں ہوئی بلکہ نثر سے ابتدا کی گئی۔

موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے خواجہ بندہ نواز سیّد محمد حسینی گیسو دراز متوفی ۸۲۵ھ دکن کے پہلے شاعر قرار پاتے ہیں۔ آپ کی شاعری کے متعلق آگے چل کر ہم تفصیلی صراحت کریں گے۔

ایک اور امر بھی قابلِ اظہار ہے کہ دکھنی نظم میں کس صنفِ سخن سے ابتدا ہوئی۔ اس کے متعلق بھی گو تیقّن کے ساتھ کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی مگر جہاں تک تحقیق کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکھنی زبان میں کسی غیر مسلسل نظم کے بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلی بنیاد رکھی گئی ہے اور اس کے بعد رُباعی، غزل، قصیدہ کا آغاز ہوا ہے۔

اردو کی ابتدا اور ارتقا کے لحاظ سے ہم حسب ذیل دَور قرار دیتے ہیں۔

پہلا دَور	بہمنی دور	سنہ ۷۴۷ھ	تا	سنہ ۹۰۰ھ
دوسرا دَور	قطب شاہی عادل شاہی اردو	سنہ ۹۰۱ھ	تا	سنہ ۱۱۰۰ھ
تیسرا دَور	مغلیہ اردو	سنہ ۱۱۰۱ھ	تا	سنہ ۱۱۳۶ھ
چوتھا دَور	سلطنت آصفیہ اور اردو	سنہ ۱۱۳۶ھ	تا	سنہ ۱۲۲۰ھ

پانچواں دَور	سلطنت آصفیہ اور اردو	سنہ ۱۲۲۰ھ	تا	سنہ ۱۳۰۱ھ
چھٹا دَور	" "	سنہ ۱۳۰۱ھ	تا	سنہ ۱۳۳۶ھ
ساتواں دَور	" "	سنہ ۱۳۳۶ھ	تا	سنہ ۱۳۷۵ھ
آٹھواں دَور	اندھرا میں اردو	سنہ ۱۳۷۶ء	تا	سنہ ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء

پہلا دور

۷۴۷ھ تا ۹۰۰ھ
۱۳۴۷ء ۱۴۹۵ء

بہمنی دور

دکن کی خود مختار بہمنی سلطنت کا آغاز ۱۳۴۷ء سے ہوتا ہے۔ علاء الدین خلجی اور اس کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کرلیا تھا (۷۱۰ھ ۱۳۱۰ء) اس کے بعد تیس سال سے زیادہ عرصہ تک جنوبی ہند، شمالی ہند کے زیر فرمان رہا مگر سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں امراء دکن نے باہم اتفاق کر کے سلطان کے خلاف بغاوت برپا کردی، دو سال کی جدوجہد کے بعد سلطانی لشکر کو ہزیمت ہوئی اور حسن خاں المخاطب ظفر خاں علاء الدین بہمن شاہ کے خطاب کے ساتھ دکن کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ تقریباً دو سو سال تک اس کے خاندان کے اٹھارہ شخص گلبرگہ اور بیدر میں حکمرانی کرتے رہے، مگر جب سلطنت میں ضعف آگیا تو مختلف صوبہ دار خود مختار ہو گئے اور اپنی جداگانہ سلطنت قائم کرلی، ایک بہمنی سلطنت کے بجائے پانچ حکومتیں گول کنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر میں قائم ہوگئیں۔

علاء الدین حسن نے اپنی فتوحات سے سلطنت کو بہت وسعت دی تاکہ یہ قدرتی حدود تک پہنچ جائے۔ یہ علاء الدین کی سیاسی دور اندیشی تھی اور بغیر اس کے سلطنت مستحکم نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے انتقال کے وقت بہمنی سلطنت کے حدود شمال میں مانڈو سے شروع ہو کر جنوب میں دریائے تنگبھدرا تک اور مشرق میں بھونگر اور مغرب میں گودا تک پھیلے ہوئے تھے۔

علاءالدین حسن ایک اچھا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں مولانا لطف اللہ، ملا اسحاق سرہندی، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیرالدین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی اور رضی الدین جگا جوت جیسے نامی علماء جمع تھے[1] مولانا عصامی بھی بہمنی دربار کے علماء میں شامل تھے۔ آپ سلطان محمد تغلق سے ناراض ہو کر دکن آئے تھے، علاءالدین نے آپ کی بہت قدر کی اور سرپرستی فرمائی۔ اس سرپرستی کے باعث مولانا نے ایک مبسوط تاریخ نظم میں لکھی، جو فتوح السلاطین کے نام سے موسوم کی گئی۔ یہ تاریخ سلطان محمود غزنوی کے عہد سے شروع ہو کر علاءالدین بہمن شاہ پر ختم ہوتی ہے[1]۔ بہمن شاہ نے ملک میں مدرسے بھی قائم کیے تھے جہاں طلبہ اور استادوں کو وظیفے دیے جاتے تھے۔ بہمنی شاہ کا انتقال ۱۳۵۸ء میں ہوا[2]۔

علاءالدین حسن کا جانشین اس کا فرزند محمد شاہ ہوا، اس کا وزیر سیف الدین غوری تھا جو بادشاہ کا خسر بھی تھا، ان دونوں نے مل کر سلطنت کے نظم و نسق کو بہت کچھ سنوارا اور انتظام ملک کے لیے ایک کتاب "نصائح الملوک" لکھی

محمد شاہ کو سلطنت کے رعب و داب کا بہت خیال تھا، بڑے اہتمام سے دربار کو آراستہ کیا[2] جاتا۔ تخت فیروزہ اسی کے عہد میں تیار ہوا۔ بہمنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور تمام ملکوں کو چوروں اور قزاقوں سے پاک کر دیا گیا۔ ملک میں امن و امان قائم تھا۔ اخلاقی اصلاح کے لیے شراب نوشی بند کر دی گئی۔

محمد شاہ کے بعد اس کا فرزند مجاہد شاہ تخت نشین ہوا مگر اس کے چچا داؤد خاں نے اس کو قتل کرا دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا مگر چند ماہ کے بعد مارا گیا۔ اس کے بعد محمد شاہ ثانی حکمراں ہوا جو بانی سلطنت حسن خاں کا پوتا تھا (۱۳۷۸ء) مورخین نے اس کے عدل و انصاف کی بڑی تعریف کی ہے، محمد شاہ صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ علامہ فضل اللہ انجو جیسے صاحب علم جو دنیائے اسلام کے مشہور علامہ سعد اللہ بن تفتازان کے شاگرد رشید تھے، گلبرگہ آئے بادشاہ نے ان کی بڑی قدر کی۔ محمد شاہ کے زمانہ میں

---

[1] تاریخ فرشتہ

[2] ۲،۲،۱ بہمنی سلطنت، پروفیسر صدیقی

کئی علمار ایران اور عراق سے گلبرگہ میں آئے، محمد شاہ نے خواجہ حافظ شیرازی کو بھی پیغام طلب ارسال کیا تھا مگر خواجہ حافظ سمندر کے سفر سے ڈر گئے اور بادشاہ کے عطیہ کے شکریہ میں ایک غزل ارسال کی جس کا مطلع اور مقطع درج ہے۔

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمے ارزد　　　بہ مئے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمے ارزد

چو حافظ در قناعت کوش واز دنیائے دوں بگذر
کہ یکجو منت دوناں بہ صد من از نمی ارزد

محمد شاہ کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں مثلاً گلبرگہ، بیدر، قندھار، دولت آباد، ایلچ پور وغیرہ میں مدرسے قائم ہوئے۔ جہاں قابل قابل اساتذہ طلباً کو درس دیا کرتے، طلبار کے وظائف جاری تھے

بہمنی سلطنت کا دوسرا علم دوست صاحب علم بادشاہ فیروز شاہ ہے جو ۱۳۹۷ء ۸۰۰ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دور حکومت بہمنی سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس کے زمانہ میں ایک طرف سیاسی تدبیر اور انتظام نظم و نسق کے لحاظ سے ترقی ہوئی اور دوسری طرف پاکیزہ تمدن اور بہترین کلچر کی وجہ سے ملک کو زینت دی گئی۔

فیروز شاہ، علامہ فضل اللہ کا شاگرد تھا۔ اس نے ایک طرف علوم اسلامی، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ وغیرہ علوم میں کافی مہارت پیدا کی تھی تو دوسری طرف ریاضی، ہندسہ، ہئیت فلسفہ وغیرہ علوم میں مہارت تامہ رکھتا تھا خصوصاً ریاضی سے اس کو بڑی دل چسپی تھی۔

فیروز شاہ شاعر بھی تھا اور ادیب بھی، اس کا تخلص فیروز اور عروجی تھا۔ اس کے علم ذوق اور شوق کے باعث دربار شاہی میں علمار اور اصحابِ علم کا جمگھٹا ہوتا تھا اور جب بادشاہ سلطنت کے کاموں سے فارغ ہوتا تھا تو خود ہی علمار کی محفل میں شریک ہو جاتا تھا۔ بادشاہ کے ریاضی کے شوق کے باعث بالاگھاٹ پر رصدگاہ قائم ہونے والی تھی مگر حکیم حسن گیلانی کی بے وقت موت کے باعث اس کا سرانجام نہ ہو سکا۔

فیروز شاہ ہفتہ میں تین دن یعنی شنبہ، سہ شنبہ اور چہارشنبہ کو خود طلبار کو درس دیا کرتا

لے بہمنی سلطنت صفحہ ۹۱

تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا، اس درس میں شریک ہوتے تھے[1]۔

فیروز شاہ دنیا کی کئی زبانوں سے واقف تھا، اور اس زبان میں اچھی گفتگو کرسکتا تھا، اس نے دریائے "بھما" کے کنارے ایک شہر فیروز آباد آباد کر کے اس کو اپنا پائے تخت قرار دیا۔ یہاں دریا کے کنارے ایک خوبصورت عالی شان محل اپنے لیے بنا رکھا تھا۔ دربار سے ایک نہر بھی نکالی گئی تھی[2]۔

اسی کے عہد میں خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز ہندوستان سے گلبرگہ آئے، بادشاہ ان کا استقبال کر کے شہر گلبرگہ میں لایا۔

فیروز شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی قلمرو کے تینوں حصّوں یعنی تلنگی، کنڑی اور مرہٹی زبان بولنے والوں کو ایک اسٹیج پر جمع کر دیا۔ نظم و نسق کے انصرام کے لیے ان تینوں علاقوں کے قابل اشخاص کو حکومت کے عہدے دیئے، ہندو رانیوں سے شادیاں بھی کیں۔ رسم و رواج، رہنے سہنے کے طریقے ہندوؤں سے لیے، ایک مخلوط دکھنی کلچر کے بانی کی حیثیت سے فیروز شاہ کا نام تاریخ دکن میں نمایاں ہے۔

فیروز شاہ اپنے فرزند کو بادشاہ بنانے کا خواہش مند تھا، مگر قدرت نے اس کے بھائی احمد شاہ کو بہمنی تخت کا وارث قرار دیا، ۵ شوال ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۲ء کو احمد شاہ تخت نشین ہوا اور دس روز کے بعد فیروز شاہ کا انتقال ہوگیا۔

سید محمد گیسو دراز نے دکھنی میں تصانیف کے، نظم اور نثر میں رسالے لکھے جو تصوّف کے مسائل پر مشتمل ہیں۔

احمد شاہ نے گلبرگہ کے بجائے بیدر کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ اس کے عہد میں ایران کے شاہ نعمت اللہ کے پوتے شاہ نور اللہ بیدر میں آئے۔ جب شاہ نعمت اللہ کا ایران میں انتقال ہوگیا تو ان کے فرزند شاہ خلیل اللہ بھی بیدر آئے ان کے ساتھ ان کے فرزند شاہ حبیب اللہ اور شاہ محب اللہ بھی دکن آئے اور بادشاہ نے اپنی دو لڑکیاں شاہ حبیب اللہ اور شاہ نور اللہ سے بیاہ دیں۔

---

[1] تاریخ فرشتہ

[2] ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد سوم صفحہ ۱۰۹

احمد شاہ کے عہد میں شیخ آذری ملک الشعرا تھے اور انھوں نے "بہمنی نامہ" کی تصنیف شروع کی تھی۔ بقول مؤرخ فرشتہ بہمن نامہ کا بڑا حصّہ یعنی سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کے عہد تک آذری نے مکمّل کر دیا تھا۔ اس کے بعد ملّا نظیری، سنامی اور دوسرے شعرائے نے اس میں اضافہ کیا[1]۔

احمد شاہ کے بعد اس کا فرزند علاء الدین ثانی پھر ہمایوں شاہ اس کے بعد نظام شاہ اور نظام شاہ کے بعد محمد شاہ ثالث بہمنی تخت پر جلوہ گر ہوئے۔

اگرچہ ہمایوں شاہ اپنے جور و ستم کے باعث بدنام ہے، مگر اس کے زمانے میں علم کی ترقّی بھی ہوئی، شاہ طاہر استر آبادی ملّا محمد تقی اور نظیری اس کے درباری شعراء تھے۔

نظام شاہ کے مرنے کے بعد جب محمد شاہ بہمنی تاج اور تخت کا مالک بنا تو اس کی کم سنی کے باعث ملک التجار خواجہ محمود گاواں اور خواجہ جہاں ترک مشیر سلطنت بنے اور صدر جہاں شوستری جو اس زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے، بادشاہ کی تعلیم و تربیت پر مامور کیے گئے، بقول مؤرخ فرشتہ فیروز شاہ کے بعد بہمنی خاندان میں محمد شاہ ہی ذی علم، علم دوست شایستہ بادشاہ تھا[2]۔

بادشاہ کی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد جب خواجہ جہاں سے غدّاری شروع ہوئی تو محمد شاہ کی والدہ مخدومہ جہاں نے اس فتنہ کو بڑھنے سے پہلے ختم کر دینا چاہا، چنانچہ خواجہ جہاں قتل کرا دیا گیا۔ اب محمود گاواں ہی برسر اقتدار رہا۔ بہمنی وزراء میں سیف الدین غوری جس طرح نیک نام اور زبردست وزیر اعظم ثابت ہوا تھا۔ اسی طرح خواجہ محمود گاواں ثابت ہوا۔ اس کی فراست اور عقلمندی سے ملک کے حدود میں ترقّی ہوئی اور چار صوبوں کے بجائے آٹھ صوبے بنائے گئے، تعلیم کی ترقّی کے لیے ایک مدرسہ بیدر میں تعمیر کیا گیا، جس کے کھنڈر آج تک باقی ہیں۔ اس مدرسہ میں عالمگیر کے عہد تک برابر تعلیم ہوتی رہی، محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کو انتہائی عروج ہوا اور اس کے بعد ہی زوال شروع ہو گیا، زوال سلطنت کا محمود گاواں کے قتل سے آغاز ہوا جو بادشاہ کے حکم سے ہی ۸۸۶ھ ۱۴۸۱ء

---

[1] ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ صفحہ ۱۳۴

[2] ترجمہ تاریخ فرشتہ جلد سوم۔ صفحہ ۱۸۰

ہوا تھا[1]، محمود کے دشمنوں نے سازش کی تھی اور یہ سازش کارگر ہوگئی۔

محمد شاہ ثالث کے بعد اس کا لڑکا محمود شاہ اور اس کے بعد علاء الدین سوم بادشاہ بنے، لیکن ان کی حکومت برائے نام تھی، علاء الدین سوم کے بعد ولی اللہ اور کلیم اللہ بھی بہمنی سلسلہ میں منسلک ہیں بالآخر کلیم اللہ کے مرنے پر ۹۳۴ھ ۱۵۲۷ء بہمنی حکومت کا خاتمہ ہوگیا[2]۔

اوراق گذشتہ میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ جس وقت بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ اس وقت دکن میں دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا، عوام اسی زبان میں بات چیت کرتے تھے جو شمالی ہند سے آئی تھی۔ سلاطین بہمنیہ نے اس زبان کی خاص طور پر سرپرستی فرمائی اور اس کو سلطنت کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔

چنانچہ فرشتہ نے اپنی تصنیف میں صاف طور پر ذکر کیا ہے کہ شاہی دفتروں میں ہندی زبان رائج تھی[3]، اور ہم نے اس امر کی صراحت کر دی ہے کہ "ہندی" اسی کا نام تھا جو شمال سے مسلمانوں کے ساتھ آئی تھی۔ کیونکہ ہندی سے مراد کسی اور دکن کی زبان تلنگی، مرہٹی، کنڑی مراد نہیں ہوسکتی۔ یہ زبانیں دکن کے صرف مختلف حصّوں مہاراشٹر، تلنگانہ اور کرناٹک میں استعمال ہوتی تھیں، قلمرو..... بہمنی تین علاقوں پر مشتمل تھا۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک زبان کو عام طور سے سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ حکمرانوں کو لازمی طور پر ایسی زبان اختیار کرنی پڑی جو مساوی طور پر سب باشندوں میں عام تھی اور یہ وہ زبان تھی جو محمد تغلق کے ساتھ شمال سے آئی تھی اور دکن میں نشو و نما پاکر دکھنی سے موسوم ہوگئی تھی۔

پروفیسر سروری نے اپنی کتاب اردو کی ادبی تاریخ میں یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"اردو جیسے جیسے مختلف علاقوں میں پھیلتی گئی اس مقام کے نام سے وہ موسوم کی جاتی رہی، چنانچہ گجرات میں اسے ہندی اور گوجری کے ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا، دکھن میں وہ دکھنی سے موسوم کی گئی، اس زمانے میں زبان کی

---

[1] بہمنی سلطنت

[2] اس تاریخی یادداشت کے لیے تاریخ فرشتہ سلطنت بہمنی صدیقی اور تاریخ دکن عبدالغفور خاں سے مدد لی گئی ہے

[3] تاریخ فرشتہ

حالت بہت سیّال تھی، رفتہ رفتہ اس زبان میں کچھ مقامی اثرات سے تھوڑی بہت تبدیلیاں بھی ہوگئی تھیں[1]۔

بہمنی دَور کے جن اُردو شعراء اور نثر نگاروں کا پتہ چلتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) حضرت سیّد محمد حسینی گیسو دراز
(۲) سید اکبر حسینی
(۳) نظامی
(۴) شاہ صدرالدین
(۵) عبداللہ حسنی
(۶) مشتاق
(۷) لطفی
(۸) شاہ میران جی شمس العشاق
(۹) آذری

ان اصحاب کے مختصر حالات اور کلام کا نمونہ آگے آتا ہے، بعض اصحاب نے خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے والد سید یوسف حسینی المعروف "راجا" کی نظم اور نثر کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کیا ہے، نیز بعض اور اصحاب کی نثر کا بیان بھی ہے[2]، لیکن چونکہ وثوق کے ساتھ اس کو پیش نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ان کو میں نے سردست نظر انداز کر دیا ہے۔

(۱) حضرت سیّد محمد حسینی

حضرت[3] سید محمد حسینی جو عام طور سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہیں ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور ۸۲۵ھ میں یہاں انتقال فرمایا[4]۔

آپ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے مُرید اور خلیفہ تھے علم تصوف میں آپ کی متعدد

---

[1] اردو کی ادبی تاریخ صفحہ ۸

[2] بعض اصحاب شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو بھی شامل کرتے ہیں اور پہلا ناشر قرار دیتے ہیں۔ مگر چونکہ ہم نے ان کو دیکھا نہیں اور بعض وجوہ سے یہ رسائل ہنوز تحقیق طلب ہیں اس لیے ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

[3] تذکرہ اولیائے دکن

تصانیف ہیں آپ کے مُریدوں اور معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ تبلیغ اور ہدایت کا سلسلہ جاری رہا کرتا۔ نماز ظہر کے بعد آپ طلباء اور مُریدوں کو علم تصوّف حدیث اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور پھر کلام اور فقہ کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے ان کے لیے آپ دکھنی میں تقریر فرماتے اور انھیں کے لیے آپ نے اپنی تصانیف مُرتّب فرمائیں[1]۔

آپ کی چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے یعنی معراج العاشقین[1] و ہدایت نامہ[2] تلاوت الوجود[3] اور شکار نامہ[4] اور رسالہ سہ بارہ[5] وغیرہ، یہ رسالے علم تصوّف میں لکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم حاصل نہیں ہوا، مگر انھوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا ہے کیونکہ شمالی ہند کے قطع نظر دکن میں دکنی زبان کا رواج تھا عام و خاص اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستّر ہزار پردے او جیالے کے ہور اندھیا کے اگر اس میں تے یک پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے اور دیکھو بے پردا اندھیارے کے اوجیالے کے عارفان پر ہے واصلان پر پردے نورانی۔ دے واصلان کا صفا پردا ہوتا ہے۔ محمد کا نور اے عزیزان اوّل ربوبیت کا پردہ سوائے تن جمالی جسم کے پردے کو اپڑے باج اس جمالی الوہت کے پردے ممکن الوجود کوں اپڑ سکے۔" (معراج العاشقین)

سوال:- ذاتی ایمان کونسا اور صفاتی ایمان کون۔

جواب:- اکھنڈا حال ثابتی ہے۔ سو ذاتی ایمان وہ ہے ثابتی آتی اور جاتی ہے سو صفاتی ایمان۔ (رسالہ سہ بارہ)

ایک دوسری کتاب کی نثر کا نمونہ:-

"کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف، فخلقت الخلق یعنی سلطان اپنی ذات کے

---

[1] دیباچہ معراج العاشقین

دربار میں گنج مخفی چھپاکر رکھیا تھا، بقا کے موتیاں سوں بھر کر احسن حال میں یکایک اوس گنج کی طرف نظر کیا اس موتیاں کا اوجلا دیکھ کر عاشق ہوا۔ ہور مصلحت تجویز میں لایا۔ جو ایسے زار کے موتیاں چھپا کر رکھنا خوب تیں، بلکہ عشق کے بازار میں ظاہر کرنا خوب بھلا ہے ولے بغیر از جوہری کے اس موتیاں کا قدر نا ہونے پہ تجویز آپس میں آپ کیا ہور جوہری کون بھی لانے اس ذات کے دریا کے نور سوں جوہری کون بنایا۔" (مخطوطہ دارالاسرار کتب خانہ سالار جنگ)

معراج نامہ یا معراج العاشقین کا مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (بھارت) میں موجود ہے علاوہ ازیں اولاً حیدرآباد سے شائع بھی ہوا اور اب دہلی سے دو اصحاب نے شائع کیا ہے۔ شکار نامہ اور تلاوت الوجود کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

خواجہ بندہ نواز کی نظم کے مختلف نمونے دستیاب ہوئے ہیں جن کی یہاں صراحت کی جاتی ہے، آپ کا تخلص شہباز تھا۔

(۱) مختلف بیاضوں میں بعض بیماریوں کے نسخے اور بعض شعر آپ کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں۔

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھتا وسے — جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوی خودی اپنی خدا سات محمدؐ — جب گھل گئی خودی تو خدا بن نہ کوئی دسے

آنتوں ہلیلہ آنتوں لوں — پتیں کے گھر جائے کون
آنکھ کو ہلیلہ دانت کوں لوں — حکیم کے گھر جائے کون

جتنا کاجل اتنا بول — اوس سے دونا گوند گھول
ذرا سی پھٹکری نمک لاتھوڑا — قلم جیسے جوں ترکی گھوڑا

سن تو سیانے میری بات — بولوں دارد میں کس دھات

لے رسالہ "النسار" حیدرآباد ۱۳۴۰ھ مضمون سید تمکین کاظمی

جس کے منہ میں آوے باس اس کی دارد سن مجھ پاس
جس کے منہ میں دِکھتے دانت ہلتے جلتے کٹے کٹے پات
وزن برابر سب کو تول وارد ہووے یوں انمول
داتوں کا رن مسّی کر خوبی کن تو دل میں دھر
زیرہ مرچیاں ستواسنوٹ کہتا اجلا لے کر گھونٹ
نیلا طوطہ دھنیا بھون اس میں ملا تو سیندا لون
پان پلاس کے کاہنٹیاں آن ماپھل دوچن اور لوبان
جوں جوں لگاوے پاوے سکھ تجھ داتوں کا جاوے دُکھ[1]

(۲) مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشوو نما میں صوفیاء کرام کا کام" میں بعض نامکمن نظمیں شائع فرمائی ہیں جن کو حضرت گیسودراز سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو نظام کالج حیدرآباد کی مملوکہ بیاض[2] میں خواجہ صاحب کے نام سے حسب ذیل کلام درج ہے۔

میں عاشق اس پیو کا جنے مجھے جیو دیا ہے او پیو میرے جیو کا بر مالیا ہے
اور معشوق بے مثال ہے نور نبی پایا
نور نبی رسول کا او میرے جیو میں بھایا
اپسکوں اپنے دیکھنے کیسی آرسی لایا
لھڑے کھڑے پیو جیو میں اپسیں آپ دکھاوے
ایسی میٹھی معشوق کوں کوئی کیوں دیکھنے پاوے
جنھ دیکھے ادسی کوں اسے اور نہ بھاوے
کل شئے محیط ہے اسی کون پچھانے

---

[1] بیاض مملوکہ سید علی اکبر صاحب

[2] حیدر حسن صاحب کی یہ بیاض کسی بزرگ ابوالقاسم نصیر الدین کی ہے جو عالمگیر کے ساتھ ان کی فوج میں شامل تھے اور جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا کلام ملا اس کو جمع کر لیا ہے یہ بیاض ۱۱۱۳ھ میں مرتب ہوئی ہے۔

جو کوئی عاشق اس پیو کے اسی جیو میں جانے
اسی دیکھت کم ہور ہے جیسی میں دیوانے

خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائی
جیو کا کہوں کٹ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائی
رکھے سید محمد حسینی پیو سنگھ کہیا نہ جائی

دیگر

اے محمد ہجلو جُم جُم جلوہ تیرا   ذات تجلی ہو بگی سیس پیلو رنہ سیہرا

واحد اپنی آپ تھا اُپیں آپ نبھایا
پرکٹ جلوے کارنے الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دینے کر کاف نون بسایا

لولاک لما خلقت الافلاک خالق یا لائے
فاضل افضل جتنے مرسل ساجد سجود ہو آئے
امت رحمت بخشش ہدایت تشریف پائے

مخفی ناتوں معشوق رکھ ظاہر شہباز کلائے
عشق کے جینی چندر بند اپنی آپ دکھلائے
الان کما کان پھر آپیں آپ سمائے

دیگر

مشکل بازی عشق کے چھوٹے جیو کو انا   موتو قبل ان تموتو شاہد ہے معنا

اونچا مندر ہر عشق کا کوئی کیونکر پاوے
چاروں سیریاں جذبہ کر توپے ہار تا آوے
جی سیس دیوے پانوں تل تو بھی نا پاوے

دوئی دوئی تائی دور کر یکٹ واحد ہونا
چاروں کپڑے جال کر مجنوں ہو رہنا
پورا مفلس ہوے تو اسے کھیل چٹ لانا

سو ہے عاشق شہباز ہے دوہوں جگ کھلارا

خواجہ نصیرالدین سائیاں پت راکھے ہمارا
نسنکہ کھیل توں پند دعشق کے تہارا

(۲) چکّی نامہ :- اس نظم میں بارہ بند ہیں۔ یہ مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے، ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ نے اپنی کتاب "تذکرہ اردو مخطوطات" میں اس کا تعارف کرایا ہے :-

دیکھو واجب تن کی چکّی | پیو چاتر ہو کے سکی
سوکن ابلیس کھینچ کھینچ تھکی | کہے یا بسم اللہ، اللہ ہُو

الف اللہ کا دستا | نے محمد ہو کر بستا
پہنچی طلب یوں کو دستا | کہے یا بسم اللہ، ہو اللہ

دانے ہی سو چن چن لانا | شاید ہاتوں سے لے کر بہانا
شریعت سے چکّی یہی | کہے یا بسم اللہ، ہو اللہ

الف اللہ اس کا باوں | پیر مرشد صلک جانو
سپوانا اس سے ہے چھانو | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

لادم وجود باسن ہونا | اسی توبہ ستی دھونا
ذات کی پانے سو آملی کونہنا | کہے بسم اللہ ہو ہو اللہ

خواجہ صاحب کی غزل کا نمونہ پیش ہے۔

توں تو سہی ہے شکری کر نفس گھوڑا اسارتوں
ناہو نرم تجہ اوچری پس پلوے گا آزار توں

گوڑے کون تھبر کھوڑ ہے بدخیال اس کا ہور ہے
تن لوٹ نے کا جوڑ ہے نا چھور اس مد تھار توں

دی کلا دل گیان کا چارا کھلا ایمان کا
انعام دے خوش دھیان کا رک باندا اپنے دار توں

خوگیر شریعت نعلبند زین ہے طریقت زہر بند
حق ہے حقیقت پیش بند ٹک معرفت اختیار توں

دونوں رکاباں نیک و بد رکھتا قدم توں ایک حد
تب ہو پری کا ایک جب توباکا چابک مار توں

تب قید گھوڑا آئے گا تجھ لامکاں لے جائے گا
تب عشق جھگڑا پائے گا خوش مارلے تلوار توں

شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ اپے یک ہوئے کر تب پاوے گا دیدار توںؒ

سو نے ندیوں خلق گوں شہبا نلسدن لا روے کر
سونی سنی پر کون میری مت کوئی دیکھے سوے کر

سوناریاں سینارکیاں کے لاک لیلی سارکیاں
عاشق تیری دیدارکیاں مجنوں نہ شیدا ہوئے کر

بھواں سکھا سن ہوں کرو پلکھان او پر پنجرے دھرے
دن رات شہ کون لے پھروں دو نین پتلیاں بھوئے کر

جس رات شہ سوں نا ملوں اس باج جیوں ییں تلملوں
آپ آہ کی آگ ییں جلوں آپس بو جاؤں روئے کر

تارے دسیں گرد قمر یا بند پری گل لعل اوپہ
افشاں ورق پر ہے مگر یا مکھ دیکھا دل خولے کر
نقاش جب تجھ دیکھیا صورت تری لکھنا سکیا
ان جسد کر جتنا جیا سب جنم اپنا کھوئے کر

ل مقالات ہاشمی صفحہ ۱۴ ۔ اشعار نمبر ۳ تا ۵ رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء سے لیے گئے۔

جب جیو کے سلطان کون ہوئے ہوس چوگان اوپر
سر اپنا میداں میں رکھے حسینی گوے کر
شہباز دو جانام جب جیواپرلے آوُں میں
آرے تے سرتا پاوُں لگ آپس چڑاوُں دوئے کر[1]

(۲) سیّد محمدّ اکبر حسینی

خواجہ بندہ نواز کے فرزند سید محمد اکبر حسینی دہلی میں تولد ہوئے، بڑے عالم اور فاضل تھے ۸۱۵ھ میں گلبرگہ آئے۔ باپ نے خلافت دی، مگر باپ کی زندگی میں ۸۲۳ھ میں انتقال ہوگیا۔ باپ نے خود غسل دیا، گلبرگہ میں دفن ہوئے[2]۔

آپ کو نثر اور نظم میں مہارت تھی۔ آپ کی ایک کتاب کا پتہ چلتا ہے جس میں نظم اور نثر دونوں موجود ہیں، یہ تصوف میں ہے، مولوی محمد باقی صاحب نے ایک تعارف کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے[3]۔

نمونہ نظم اور نثر حسب ذیل ہے۔

"سنو اے مسلمانوں طالب خدا کے بوجھو زندگی سہل ہے۔ جیوں کا بھروسہ نہیں۔ موجب حکم حضرت علیؓ کے عمل کرو۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عجلو بِالصَّلٰوۃِ قَبْلَ الفَوْتِ عجلو بِالتَّوْبَۃِ قَبْلَ المَوْتِ۔ یعنی شتابی کرو نماز وقت گزرنے سوں آگے ہور شتابی کرو توبہ مرنے سوں آگے۔ یعنی مُرید ہو کر توبہ کرنا ہور کفر و ضلالت سوں آپس کو پاک کرنا۔ ایک کے تابع ہو کر خدا طلبی ہیں عافیت کی راہ سنوارنا۔ اس باب میں حق سُبحانہٗ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کہا ہے۔ اپنے حبیب کو خبر دیا ہے۔ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ الخ...... جس کوں پیر نہیں اسے دین نہیں۔ جسے دین نہیں تو اسے بوج نہیں۔ ہور جسے بوج نہیں اسے عشق نہیں، ہور جسے عشق نہیں اسے صحبت نہیں ہور جسے صحبت نہیں اسے پیر نہیں بے پیر ہو کر رہنا عین کفر ہے۔"

۱۔ رسالہ اردو کراچی۔ بابت اکتوبر ۱۹۰۵ء
۲۔ تذکرہ اولیاء دکن۔ عبد الجبار۔ صفحہ ۹۹۶
۳۔ مجلہ مکتبہ نمبر ا۔ جلد اپریل ۱۹۲۸ء

آپ کی نظم کا نمونہ یہ ہے۔

دھو کر زبان کوں اپنی پہلے پیر سوں بیان پر
بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زبان پر

بے خدا ہے صفت اس اس کو نہیں نہایت
کرنے کو تس صفت تو نیں مجھ زبان میں طاقت

بعد از ثنا خدا کی بھیجوں درود نبی پر
بھئی آل پر........ اس کے اصحاب میں.....

بعد اس کے نام لے کر قادر محی الدین کا
بولو بیاں سنو بو حاصل مرا دین کا

بے پیر جھاڑ بوئے دارد جو لیا دہا تو
ہرگز نہ کھائے اس کوں کر کھائے تو دو اور

بے پیر کے جو ہیں گے دارد جو کھا چیا کر
بے شک حیا تو جانو اس کو ہوا دو کافر

بے پیر ہیں گے دارد کھا کر اگر موا تو
ایماں سلب ہو تس پر مرتا ہے بے ایماں ہو

بے پیر کے جو ہتکا پانی طعام کھاوے
ہو گوشت سور کا اس کوں حرام پاوے

بے پیر جو موا تو نین ہے درست اس پر
پڑنا نماز جنازہ تو ہوئے گناہ اکبر

بالغ ہوا نہیں لک نیں حکم اس پو جانو
بالغ ہوئے کے بعد از ہوا مر ہے سو مانو

بیٹے کوں باپ بولے بیٹا کہے پدر تئیں
ہونا مرید جلدی لے کر بجا امر تیں

بیٹے نے ماں سو کہنا اے مہربان مادر
ہونا مرید شتابی یک لحظہ نادرنگ کر

کوئی پیر پر فنا ہو کیتا اپس فنا ہو
پاوے مراد حق سوں جو کچھ طلب کرے سو

سو رگ ستی جو کہنا تو یو سخن عبس ہے
عاقل کے تیں اشارت اتنا ج یو سوبس [1] ہے

اگرچہ یہ نظم اور نثر بہت صاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے زمانہ مابعد میں اس کے الفاظ شاید تبدیل ہوگئے ہوں۔

۲۔ نظامی

اسی دور کا ایک شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ ثالث بہمنی (۸۶۵ھ تا ۸۶۷ھ) کے زمانہ میں موجود تھا، اس کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات ہیں صرف اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ سلطان کا درباری شاعر تھا، اس کی ایک مثنوی جو "کدم راؤ اور پدم" سے موسوم تھی ہم نے لطیف الدین اور بسی مرحوم تاجر کتب کے پاس دیکھی تھی۔ اور اسی زمانہ میں اس کے نوٹ اخذ کیے گئے تھے۔

یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ جس کے ہیرو کدم راؤ اور پدم ہیں۔ افسوس ہے کہ پوری مثنوی کے مطالعہ کا موقع ہمیں نہیں ملا۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان میں موجود ہے۔ چنانچہ اس مثنوی کے چند صفحوں کے فوٹو انجمن ترقی اردو پاکستان کے اخبار قومی زبان میں شائع ہوئے تھے۔

نظامی عہد کو بہمنیہ سے تعلق ہونے کا ثبوت حسب ذیل امور سے ملتا ہے۔

الف۔ مثنوی میں اشعار ذیل موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بہمنی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنور	پر یتال سینسار کرتار ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا بہنگ	کنور شاہ کا شاہ احمد بہنگ

---

[1] مجلہ مکتبہ نمبرا۔ شمارہ بابتہ اپریل سنہ ۱۹۱۸ء

لقب شہ علی آل بہمن ولی　　ولی تھے بہت بدہ ندا کلی

ب ۔ مثنوی میں مختلف عنوانات ہیں ایک عنوان حسب ذیل ہے :۔

" مدح سلطان علاؤالدین بہمنی نوراللہ مرقدہ "

اس سے واضح ہے کہ علاؤالدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور اشعار ماقبل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شہزادہ تھا ۔

ج :۔ زبان بھی نہایت قدیم ہے اس پر ابتدائی دکھنی کا بلا خوف اطلاق ہو سکتا ہے' اب تک قدیم سے قدیم جو بھی کلام دستیاب ہوا ہے اس سے بھی یہ نظم زیادہ ادق ہے
اب اس امر کی تحقیق کرنی ہے کہ یہ مثنوی کس سنہ میں لکھی گئی اس کے متعلق ہم کو مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی علاءالدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کا ولی عہد احمد تھا ۔ خاندان بہمنی کے سلسلہ سے واضح ہوتا ہے کہ سوائے گیارھویں حکمران علاءالدین ہمایوں شاہ کے کوئی اور ایسا حکمران نہیں ہوا جس کا لقب علاءالدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو ۔ یہ احمد شاہ ثالث سنہ ۸۶۵ھ سے سنہ ۸۶۷ھ تک حکمران رہا ہے ۔ اس لیے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانہ میں قرار دینی چاہیے ۔

اگرچہ تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھا ہے مگر جو سکے سنہ ۸۶۵ھ سے سنہ ۸۶۷ھ تک مضروب ہوئے ہیں ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک[1] ہوا ہے ۔

اس مثنوی کے اس عہد میں تصنیف ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شاعر بادشاہ کا مصاحب تھا اور اس کو دربار شاہی سے تعلق تھا اس لیے بہت ممکن ہے کہ شاعر نے اپنا تخلص بادشاہ کے لقب پر نظامی قرار دیا ہو ۔

مثنوی حمد و نعت اور منقبت سے شروع ہوئی ہے اس کے بعد علاءالدین بہمنی کی مدح لکھی ہے ۔ پھر اصل قصہ شروع ہوا ہے ۔ حسب رواج قدیم اس میں عربی اور فارسی کے بجائے ہندی الفاظ زیادہ ہیں ۔ اس کی زبان اس قدر مشکل ہے کہ اس کا سمجھنا دقت

---

[1] اردوئے قدیم طرح ثانی ۔ صفحہ ۲۴ حاشیہ

طلب ہے۔ بریں ہم اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظامی اپنے عہد کا باکمال شاعر تھا اور اپنے فن میں اُستادانہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

حمد

گسائیں تھیں ایک ونہ جگ دار — بروبرد جگ تہیں دینہار
اکاس انچہ پاتال دھرتی تھیں — جہاں کچھ نہ کوئی تھا ہے تہیں

نعت

تہیں ایک ساچا گسائیں امر — سری ددی تیں جگ تورادگر
بٹھایا امولک رتن نور دہر — کرتی ویک بلکٹ کرن راج کر
امولک کلت سیس سنسار کا — کرے کام نردھار کرتار کا
محمد جرم ادم بنیاد نور — دو بہی جگ سری دے پوسا دنور

مدح بادشاہ مرحوم

بڑا شاہ وہ شاہ جس شاجگ — دھین سیوتی جرم تسے پائے لگ
نہیں شہ کیا شادر کہن دہرن — گگن دل دہرت دل مسخر کرن
عطارد مسخر ہوا ے قلم — مسخر کیا سور وے ہت علم
علم گار کہن سور چل سرا چاؤ — طبل ڈھول برغون بدل تون بجاؤ
چمکنے لگی جب کتک ہیستر — چرھا وا گیا دہرت آکاس پر
چمک بجلی تیوں علم مجہ جیوں — علم سنک تون گرج کہن جیوتوں
شہنشہ بڑا ... ... الخ

کدم راؤ اکھیں رن ونہ آدھر — کہ رھن بات سن بات بک بت دھر
سینا تھا کی ناری دہری بہت جند — سوئیں آج دیتیا تری جند بند
دھسی جہند جب میں دنیا جگ میں — نتی دبل تھے تہن ھوی پربارک میں
سجات ایک ناگن کجات ایک سانپ — اسنکت دتھی کھلیں لاتب چانپ
جو کرنار مجکوں کیا سوی راؤ — اسنکت کہ کیوں دیکھ سکوں اہناؤ

پدم راؤ بہیتا ما کر دیں — کندل پیراؤ بہا ہور ہر دیں
پھرا تیر ہو جیوں رمیا مہتا ادھل — کمان ہو پیریا نیکہ کی یائے تل
اجا سلیس باہر کیسی بکہ بنات — نہ یوں کوئی منوی نہ ناکہ جاٹ

کہ توں سا چ میرا گسائیں کدم　　　پدم راؤ تجہ پاؤ کیدا پدم
جہاں توں دہرے پاؤ ھول سرو بدن　　　اپس سار کی لک ترای کردن

(۴) صدرالدین

اس دور کے ایک اور شاعر صدرالدین ہیں دراصل یہ ایک صوفی بزرگ تھے۔ حضرت بدرالدین چشتی (متوفی ۸۲۸ھ) کے مرید اور خلیفہ تھے، اولاً ناسک میں قیام کیا اس کے بعد "بیپری" میں سکونت اختیار کی۔ ۸۷۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ اب بھی آپ کا مزار زیارت گاہ عام و خاص ہے[1]۔

شاہ صدرالدین اپنے پیش رو اصحاب طریقت کے مطابق صاحب تصنیف تھے۔ چنانچہ ایک کتاب "کسب محویت" آپ کی تصنیف دستیاب ہوئی ہے یہ تصوف میں ہے اور ۸۷۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے[2]۔ اس کے علاوہ کئی تصانیف کا پتہ چلا ہے جو تصوف میں ہیں۔

"کسب محویت" میں روح، احدیت، محویت وغیرہ مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے۔

ناؤں لے اللہ محمد کا اوّل　　　کسب کا سب کو کہوں در ہر محل
گوش جاں سوں اب سنو صاحب یقیں　　　کیا کہتا ہے نظم میں شہ صدرالدین
اولاً بانفس و دل قطب مثال　　　خواہش دانائی کا تو بوجھ حال
کامیاب کوں یہاں تے ہے راہ وصل　　　راہ الاتصال ذو الفضل

صدرالدین تو کسب پر ثابت اچھے　　　صرف سوں صفتوں کے نت ثابت اچھے
صدرالدین پل پل میں یوں بیکل ہوا　　　وصل بھی یک پل منجی میں حل ہوا

بس کر اے شہ صدرالدین راز کوں　　　دید میں دیدار یا آپس کوں کھوں

شاہ صدرالدین کا ایک رسالہ رموزالسالکین ہے اس کا نمونہ یہ ہے۔

---

[1] اولیاء دکن عبدالجبار خاں حصہ اوّل صفحہ ۴۶۴

[2] مذکورہ اردو مخطوطات ڈاکٹر زور مخطوطہ نمبر ۱۴

مطلب سوں اپنے کام ہے کئی اچھوں یا فارسی
مکھ دیکھنے سوں ہے غرض جس جنس کی ہو آرسی

کروں حمد و ثنا حق کا اوّل میں بھی نعت مصطفےٰ کا خوش نما میں
ہے وہ دریائے کبریا کا ظاہر یہ اور اک دو عالم سوں ہے باہر
اگر روں روں مری لک لک زباں ہو پھر ہر یک زباں سوں لک لک بیاں ہو
ثنا کی بحر سوں یک ہندسہ سے صفت کی کینہ کوں انار پر سے
رسول پاک پر لک لک صلوٰۃ بر اہل آل و اصحاباں سو تحیات
پس از حمد و ثنا کے کھول در حال زبان ذکر کو دریاب اشغال
شغل بہتر ہے ہر دم ذکر مولا بغیر از یاد حق نیں کام اولا
کروں ذکر اون کی زہ کا کچھ یہاں میں کروں راز ہتاں کیتی عیاں میں

ایک دوسرے رسالہ کے چند شعر۔

بول تو گنج خفی کا حال وحدت کی اب سن یو خیال
وحدت کوں تو یوں کر جان جان پیکا آیا گیان
واحدیت سو بوج اشتہار قابل پایا چہار اعتبار
وجود علم ہور جانے تور شہودیت کو پائے ظہور
ان چاروں کی بوج یک ہوئی ذایت کیہی او سے سب کوئی
ان تینو کا مسمی حال آپ تیں تجھ بھا دل مثال
مطلق علم سو وحدت بوج اوس یک یو جمع تیں ہے وہ سچ
ایک تو احدیت کو جان دوہم سو واحدیت پچھان
واحدیت سو ایک وجود دوہیم علم ہدیٰ نور شہود[1]

(۴) عبداللہ الحسینی اس دَور کے ایک اور مصنف سید عبداللہ الحسینی ہیں، آپ خواجہ بندہ نواز سید محمد حسینی کے پوتے تھے، اپنے دادا کی

---

[1] رسالہ تصوف صدرالذکر دونوں رسالے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔

طرح ارشاد اور ہدایت آپ کا مشغلہ تھا۔ احمد شاہ ثانی بہمنی (۸۳۸ھ تا ۸۶۲ھ) کے زمانہ میں موجود تھے۔ سید عبداللہ حسینی اپنے دادا کی طرح مقبول امام تھے۔ اپنے عہد کے اکابر صوفیا میں شمار ہے، آپ نے اپنے مُریدوں کی ہدایت کے لیے حضرت سیّدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف "نشاط العشق" کا قدیم اردو (دکھنی) میں ترجمہ فرمایا تھا اور اس کی شرح قلم بند کی تھی، بقول اسٹوارٹ (مصنّف کیٹلاگ کتب خانہ ٹیپو سلطان) اس کا ایک نفیس مخطوطہ کتب خانہ ٹیپو سلطان میں موجود تھا، افسوس ہے کہ اس کے دستیاب نہ ہونے سے کوئی مزید صراحت نہیں کی جاسکتی۔

(۵) مشتاق اس کے متعلق تفصیلی معلومات تاریکی میں ہیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد شاہ بہمنی (متوفی ۱۴۸۲ء) کے دور میں موجود تھا۔ اور سلطان محمد شاہ بہمنی (متوفی ۱۵۱۶ء) کے دور میں شہرت حاصل کی سیّد برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں اس نے دکھنی زبان میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس کی چند غزلیات بھی ہمدست ہوئی ہیں بعض اصحاب اس کو بعید رکے برید شاہی دور میں شامل کرتے ہیں مشتاق کی غزلیات اور قصیدہ کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ مشتاق اپنے عہد کا باکمال شاعر اور استادِ سخن تھا۔

مشتاق کے کلام کا نمونہ و غزلیات

او کسوت کیسری کرتن چمن میانے چلی ہے آ
رہے کھلنے کون تیون دستی او چپنے کی کلی ہے آ

سورج مرجان میں جیوں دستا نظر دوں کا پتی تھرتھر
جو لٹ پیچاں بھری سر تھے اور رخ او پر ڈھلتی ہے آ

سورج کی تاب سینے جوں پگلتا برف آپس میں
او رخ دیکھت نظر انکھیاں کے انکھیاں میں گلی ہے آ

او دیکھ کعبہ کرن برہان کر سر پانی سولت او ہے
نین سدیوں دے گویا کہ جج عین علی ہے آ

کھیا مشتاق فارسی سوں رہتے تم کان جو میں آون
کھی دان گھرا ہے براکن کی جان گلی ہے آ

تجھ نرگسیں اس باغ میں جیوں گل سو رخسارہ دسے
او لب سو دو پھٹکریاں چھریاں اس گل تھے یکبارہ دسے

انکھیاں اپر ہے بال یا پنجرے منے کونی رہیا
یا جال میں مچھلی ہے یا بادل میں سیارہ دسے

آوے نظر کے جیب پر شیریں متھا جیوں جیوا ہے
جیو کے شکر سیتی بنیا سو لب شکر پارہ دسے

نادیوے دیکھن رخ کوں تجھ او زلف موئے جیوں رقیب
رخ روح ہے ہور زلف سو جیوں نفس امارہ دسے

لب کے بساط اوپر رکھیا چوپر نظر کا کھیلنے
ہنس کر کہے مشتاق تجھ پھانسہ سو پو بارہ دسے

نیں تجھ مد بھرے دیکھت نظر میانے اثر آوے
آدھر کے یاد کرنے میں زباں اوپر شکر آوے

صفا اس گال کوں دیکھت نظر سو جب گا گر پڑتی
مکھی کے پر میں کاں طاقت سو رتی لک جا گذر آوے

رقیب او دیو جیوں جب تب پری کے سات یوں آتا
کہ پھولاں سات کانٹا ہور شکر میانے کنکر آوے

نظر نیں عشق کے مشتاق تجھ کو تو عیب رک دیکھے
کتنا ٹیڑا آنگن کوں ناچنے کا نا ہنر آوے

قصیدہ کے چند شعر جو سید خلیل نعمت اللہ کی مدح میں لکھا گیا ہے۔

ناز کا اے طرز ہے کھینچے وفا پر قلم	غمزے کا اے طور ہے گود میں ...
صاف صفا صفحہ پر جدولِ مشکیں ہے خط	موں پو وفا کے رہیا ...
لطف سخن یوں اسے شہد ہے جیوں نیش میں	راکھے قہر مہر میں شیریں میں راکھے ...
لب منے اسے نقش و رنگ مے منے جیوں عیش ہے	کر کہ بچن تے دکھانے آگ کا باغ ...
گرمی ملا ہم ستی آب میں آتش رکھے	بانٹ میں سب گھات ہے مدح میں ... دم

قصدا ہے کعبہ کا کرنے طواف آستاں — جیوں کہ مسلمان کوں فرض ہے طوف حرم
فتنہ شجاعت کا دیکھ رستم وستا چھپا — شور سخاوت کا سن ہوگیا حاتم اصم
شمع ضمیر میز گر کرے پر تو جھلک — شک نہیں پاروشنی ہیڈا ہوئی اند لار کھم
ہاک غضب کی اگر جاوے فلک کے اپر — سیر ستاریاں کا سب بند ہوئے نا ہلکہ کھم
نور بصر شمس الدین شاہ محمد رہے — ہور جو شہ کاظم ہے شاہ کے دل کے ضم
فہم سوں مشتاقیا نقش بو اخلاص کا — ضرب ارادت ستی دل پو اچھا جیوں درم

(۷) لطفی لطفی بھی اسی دور کا شاعر ہے اور مشتاق کا ہم عصر بھی۔ اس کے نام سے ہم واقف ہیں اور نہ تفصیلی حالات سے۔ اس نے حضرت شاہ محمد کی مدح کی ہے جو خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں تھے۔

مشتاق کی طرح لطفی کے قصائد اور غزلیات ہم دست ہوئی ہیں۔ لطفی کا ایک قصیدہ خواجوئے کرمانی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے۔ لطفی کو خواجوئے کرمانی کے کلام سے شغف تھا۔ چونکہ بہمنی دور میں شیخ نور سمنانی دکن آئے تھے اور بہمنی دربار میں خواجوئے کرمانی کا کلام پسند کیا جاتا تھا۔ خواجوئے کرمانی کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

قرطۂ زر چاک زد لعبت سیمیں بدن
رشک ملمع نشاند شمع مرصع لگن

لطفی کے کلام کا نمونہ :-

خلوت منے سجن کے یں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھری ہوں جلنے پرت پتی ہوں

سب نس گھری جلوں گی جا گا سوں نا ہلوں گی
ناجل کو کیا کروں گی اودل سوں مد متی ہوں

اتن مرحال ہلنے کا نا دل میں ڈر گلن کا
نا سر میں سد جلن کا تو یو بلا ستی ہوں

لہ رسالۂ اردو اکتوبر ۱۹۵۰ء

جلتے کون نا جلاؤ تجنے کون آگ لاؤ
بو جوں تو پھر جلاؤ نا یک رتی رتی ہوں

شہ کے ملن کی ماتی ہر نس جلن کوں آتی
سب قد کہرا جلاتی پن آہ نین کہتی ہوں

میں مست ہوں سجن کی سُدبُد ستی ہوں تن کی
آب عشق کی مدن کی مغرور مدمتی ہوں

جلنے کو نا ڈروں گی نا جل کہ کیا کروں گی
کیوں نا جلوں مروں کی اولتی عادتی ہوں

رسیا رسیلے پہوگی سو شاہ محمد
مندر منے سجن کی نس جاگتی رہتی ہوں

نطفی تیرے جلن کی پاکی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈواں کے کھتے سو دہر پتی ہوں

نطفی کے قصیدہ کا نمونہ :-

صبح ہوا پا صفا رین کا کجلا کوا
چھوڑ چمن کی ہوا غیب ہوا با زغن

سور سحر سرک کے گور تھنے ظاہر ہوا
کیس لگا رین کے دیس جلا یا اگن

کرن کی جھاڑ دبند ارین کی کالک چرا
فرش ملمع بچھا خسرو رومی بہ فن

چار پہر برقرار یو پنچ رہیا تھا سنجار
غرب کے کوے منے ڈول دبا یار سن

نین سورج جہاں تھے لعل ہوئے سرک کے
رین کا کاجل منگاتیں ہیں کھپا انجمن

سرک تھے نکلیل چندر لعل لہو کے بھتر
سبز چھپایا خنجر چندر دکھایا مکس

چندر کا بالا بچھا رین کی دائی رچا
مشک و عنبر میں چھپا جہاں کہ راکھے جتن

ماہ نہنا تھا ستا شاہ کے پھیری بدل
جمع ہوا تھا بہم شاہ کا بھیرا بہن

سرک کا طوطی ہریا مشک خطائی چڑیا
رات کا عنبر سریا صبح کے پھوٹے کرن

سرک کا بالا کنور بیٹھیا تخت کے اوپر
نام دہرایا چندر مور کا بیضہ کرن

رین کے پسیار تھے سرک ہوا نو عروس
جیوں لت افشاں درست سرک کے مکہ پیراہن

سرک بالے لکار حسرت کا ابرن ہزار
چھند سوں کیتے سنگار رین سوں باندے بدن

نازک کے نولیاں منے سوں صافی کیا　　غمزۂ جادو گری سرک کا سانپل منجن
مشک کا کالک بھکیا تھال میں کیسر رکھیا　　رات کا ہندو شکیا ترک تھے لا کیا درن
سرک کے آبی چچا سور کا بالا بچا　　میں سبتی اچا لعل تھے دیتے لبن
اوشہ دلدل سوار فارس خنجر گذار　　صفدر شرزہ شکار شرزۂ شکر شکن

لطفیؔ بے عین پر عین عنایت دھرو
اے شہ خوبان من اے مہ تابانِ من[1]

(۸) شاہ میران جی شمس العشاق

حضرت شاہ میران جی شمس العشاق ان اولیاء میں سے ہیں جن کا فیض صدہا مخلوق خدا کی ہدایت کا باعث ہوا ہے۔ شہر پناہ بیجاپور کے باہر آپ نے اقامت کی تھی، آپ خواجہ کمال الدین بیابانی کے مُرید اور خلیفہ تھے[2]۔ ۲۵ شوال سنہ ۹۰۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا، آج تک عُرس ہوتا ہے۔ شاہ حسین ذوقی نے شمس العشاق سے آپ کی تاریخ وفات نکالی تھی[3]۔

یوسف عادل شاہ آپ کا بڑا ادب کرتا تھا، اسی کے زمانۂ حکومت میں آپ کا انتقال ہوا۔

دکن کے اکثر صوفیاء کرام اپنے مریدوں اور خلق اللہ کی ہدایت کے لیے نہ صرف وعظ اور نصیحت کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ عوام کی بھلائی اور بہبودی کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ بھی انھوں نے قائم کیا تھا۔ بعض صوفیا روزانہ اور بعض ہفتہ میں چند روز طلبا کو درس دیا کرتے تھے تاکہ علوم کی خدمت ہو سکے۔ دکن کے صوفیا نے اپنی تصانیف میں اکثر و بیشتر وہ زبان استعمال کی ہے جو یہاں عام طور پر بولی جاتی تھی حضرت شمس العشاق بھی ایسے ہی بزرگ تھے۔ آپ کے مُریدوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ آپ کی متعدد تصانیف کا پتہ چلا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔ بشارت الذکر، مغز مرغوب،

---

[1] رسالہ اردو اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء

[2] روضۃ الاولیا بیجاپور

[3] قدیم اردو عبدالحق

خوش نامہ، خوش نغز، شرح مرغوب القلوب[3]۔

اوّل الذکر چاروں نظم ہیں اور آخر الذکر نثر میں ہے۔ نظم کی دونوں کتابیں تصوّف میں ہیں۔ اس کے مخطوطات انجمن ترقی اردو اور کتب خانہ سالار جنگ وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

خوش نامہ

صنعت کروں میں اللہ کیری جے پوری پورن پور
قادر قدرۃ انگیکا رول نیرے نا دور

نا اس روپ نا اس دیکھ نا اس ٹھاں مکاں
زگن گنونتا کرو اس مکھ کروں بکھاں

پیردھی جی پرم لگاوے نور نشانی عین
منزہ کی سدھ لکھاوے جہاں ویس نارین

علوی نہیں جو چھپڑی اکار اکہ سوسری جوں بات
سفلی کھیل کھلاوے وائم اپنے فعلوں سات

فعل سہادا پنتھ اللہ کا جس راہ گئے رسول
کر مکھ پنتھ پچھانوں سوہے جیہ جیون کا مول

خوش خوش حالوں خوش خوشیاں خوشی رہے بھرپور
یہ خوش خوشیاں اللہ کیرا نوراً اعلیٰ نور

کھنڈیا خوش خوش نامہ تحت ہوا تمام
خوش سب کوئی دایم قایم جیتا خود عن عوام[1]

خوش نغز

جسے ہماری ارادت کی ان کا یہ احکام   نماز تسبیح نیتاں ذکر اللہ پاک نام

---

[1] فہرست کتب خانہ سالار جنگ صفحہ ۱۷۲   [2] رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۷ء

اس پر جیتا رہے صدق سن او تا اچھے لاب — دین دنیا دیدار بہشتاں پاوے نا بے حساب

خوش پوچھے کے کہو میرا نجی عالم اچھے کیتے — پیر کہیں سن جیتے تن اچھیں عالم تیتے[1]

اللہ اللہ اسم ذاتی دو ہوں جگ ازل — جلی ہم خفی سوں کیا ہے فضل
شرف نام دینا سنا لو اوپر — ملائک وجن وجگ اوپر
دو ہوں جگ تمر بن اللہ ایک نام — کہ مخلص و عابد جیسی بیس دام[2]

چلے آدا کہوں جی فرصت حقا — ہر دین کیاں سمج لے سو کر تو بقا

چلے دھات دولی جی نر کن سکن — ذکر بیچ میا نے اے دو بیتا وجن
اسم اللہ رات دن زباں تر امدام — کہ در کوشش اقتد زہر یک کلام
اللہ محمد امام دائم اس سوں جان — سب خاصوں سوں اللہ اللہ تواں کھوں گیاں کیاں
مغز مرغوب دھر یا جانو اس نسخے کا نام — مرشد کیموں سمجھے تو ہووے کشف تمام
بیس نظم اوپر تیس زیادہ اس کا حساب — پر سن پچھاں کر لی رہی تو ہر نعمت کالی سب

ہوا میانے جینا روپ نیتا پیں روہن — دو جاتن سو پیے ہوا کے جس کیت برتی من

بتیجا سو غیب جس آکھیں چوتھا کیاں سپورا — سکر سو سے لے بدپاوین بن کر جم ادھورا

شریعت کن بوجھے پورا طریقت کچ کرے — حقیقت وہ نیچا دیکھے معرفت سوں تھرے
سوتی سو کرے کرے سو دیکھے دیکھے تو کچ بھوک — ستکر کا کریا ہوئے پورا نہیں تو دونا روک[3]

---

[1] رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۶ء

[2] بشارت الذکر مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ

[3] مغز مرغوب مخطوطہ سالار جنگ

خفی اس جو اکہیں خفی یوں اسے | جہاں آپ فانی نہ دے کر کسے
اچارن سید موک موہن سو جان | دیکھن ہار اندھا نہ سن نے ہیں کان
ابول بوں بولی تو پولن پنہائی | یہی بن بول بولیں تو رہیا نبجائی
کہ مرجیو آ آپس تہیں پھر چھپونا | اوسی انگ جیو اپس کھودنا
موا جیو او تھے جیوں امریت گن | سکن اس جو اگہیں خفی خوب سن
یہی ذکن سو کبیری خفی دھات کر | ہتکی سب کت نہاں اہے آپ پر
ادو اسہاں ادر نہ یوگیاں دھیان | اکھنڈ بت رہیا ہو سب دہن مان
جیو ملینج کا پور جا دے سماں | یہی جوت رہیا کہور تج پراں
یو ہے حال واصل توں بوجے تھا | کہ رمزی خفی ہے صفا در صفا[1]

میراں جی شمس العشاق کی نظم کے بعد آپ کی نثر بھی پیش کی جاتی ہے۔ آپ کی نثر کی کتاب "سب رس" سے موسوم ہے۔ یہ وجہی (قطب شاہی شاعر) کی داستان سب رس کی جداگانہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے نمونۂ نثر یہ ہے۔

"ارے طالب خدائے تعالیٰ ایک محبوب ہے۔ اور فقیر لوگ اس کے عاشق ہیں، ہر ایک عاشق اپسکوں یاں حیران کیا ہے۔ اگرچہ دہچہ موں ہے دہچہ لب ہے۔ دہچہ انکھیاں ہیں، جس نے جیوں ریکھا ہے تیوں یہاں کیا ہے۔ ہر ایک کے کہنے میں یک لطافت ہے ہر یک کے کہنے میں یک راحت ہے۔ ہر یک کوں یک جنس سوں وصال ہوا ہے۔ اس کا حسن بے نہایت ہے۔ ہر ایک پر ایک کرم یک عنایت ہے۔ ہر ایک سوں یک سوں مراتب حاصل ہوا ہے۔

ارے طالب اوّل باپ کے صلب میں تھا تو جمیع الایش سے پاک تھا نور تھا، جو ماں کی رحم میں آیا تو سب تعلقات انسانی نجہ میں سنجر کرے جہ ماں کے پیٹ میں تھے بہا نکلیا تب وجود دیکر کر آتا ہے اوس روز تے روز بروز

---

[1] مغز مرغوب مخطوطہ سالار جنگ

ساعت بہ ساعت جیوں جیوں ہوش پکڑتا تیوں تیوں دین کا سواد دیکھتا ہے۔"[1]

(۹) آذری تاریخ فرشتہ کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ آذری سلطان احمد شاہ بہمنی (۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ) کے زمانہ میں ایران سے آکر بیدر دار السلطنت بہمنی میں قیام کیا تھا اور سلطان نے اس کو ملک الشعراء بنایا تھا۔ آذری نے قصائد لکھے تھے اور سلطان نے سلطنت بہمنیہ کی تاریخ لکھنے کے لیے اس کو مامور کیا تھا۔ سلطان نے ایک محل بنایا تو آذری کے حسب ذیل شعر اس پر کندہ کیے گئے۔

جنذا قصر مشید کہ ز فرط عظمت　　آسماں سرۂ از پایہ ایں درگاہ نیست

آسماں ہم نتواں گفت کہ ترک ادبست　　قصر سلطانِ جہاں احمد بہمن شاہ است

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سلطان کی نظر ان اشعار پر پڑی اور دریافت کیا کہ یہ شعر کس کے ہیں تو شہزادہ علاء الدین نے عرض کیا کہ شیخ آذری کے طبعزاد ہیں۔ سلطان نے مسرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ نے بادشاہ کو خوش دیکھ کر عرض کیا کہ آذری اپنے وطن کو جانا چاہتا ہے۔ اگر اس کو اجازت دی جائے تو حج اکبر کا ثواب ہوگا' سلطان نے یہ سن کر حکم دیا کہ چالیس ہزار روپیہ آذری کو دے دیا جائے جب اس قدر رقم آذری کے سامنے پیش ہوئی تو اس نے مسرور ہو کر کہا لا یحمل عطایا کم الا مطایا کم سلطان یہ سن کر ہنسا اور بیس ہزار روپیہ اور دینے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ گراں بہا خلعت اور پانچ غلام دے کر رخصت کیا' آذر ہر سال اپنی زندگی تک بہمنی نامہ کا تکملہ کرتا رہا۔ یہ بہمن نامہ دکھنی سلطان ہمایوں شاہ تک شیخ آذری کا لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد مُلا نظیری اور مُلا سنامی وغیرہ نے اس کا تکملہ کیا۔ بہمنی حکومت کے خاتمہ تک یہ کتاب مکمل ہوئی تھی مصنف فرشتہ نے نہ صرف اس کو دیکھا تھا بلکہ اس سے استفادہ کیا تھا اور خصوصیت سے اس نے دکھنی کی صراحت کی ہے' چنانچہ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

" القصہ بہمن نامہ دکھنی تا داستان سلطان ہمایوں شاہ بہمنیہ از شیخ آذری یست وبعدہٗ مُلا نظیری و مُلا سنامی و دیگر شعراء تا انقراض دولت بہمنیہ

---

[1] سب رس کتب خانہ سالار جنگ

ہر کدام کہ توفیق یافتہ اند داستان و حکایات شاہان دیگر را لاحق نمودہ در ملک نظم کشیدہ از ملحقات بہمنی نامہ شیخ آذری گردانیدہ اند“

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آذری نے بہمنی نامہ کو دکھنی میں لکھا تھا، جو اب ناپید ہے۔

تبصرہ:۔ دور بہمنی کے یہی چند شعراء وغیرہ ہیں جن کا پتہ چلتا ہے' اس سے یہ امر پایۂ تصدیق کو پہنچ جاتا ہے کہ اس دور میں دکھنی زبان یا قدیم اردو بول چال سے گذر کر تحریر کی صورت میں آ گئی تھی۔ نظم اور نثر دونوں اس زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ زیادہ تر تصوف کا رواج تھا، مگر ساتھ ساتھ "افسانہ (عشقیہ) اور تاریخ کا موضوع بھی اختیار کیا گیا تھا، اگرچہ "بہمن نامہ" ہمدست نہیں ہوا ہے' لیکن فرشتہ کی صراحت سے بخوبی واضح ہے کہ اس نے اس کو دیکھا ہے اور یہ کتاب دکھنی (قدیم اردو) میں قلم بند کی گئی تھی۔

اس دور میں مثنوی کے ساتھ غزل اور قصیدے بھی لکھے گئے۔ شاعری میں بحر، قافیہ اور ردیف میں فارسی کا تتبّع کیا جاتا تھا، مگر ہندی الفاظ کے ساتھ ہند کے موافق عورت عاشق ہے۔

قصیدوں میں جو لوازم اس کے مخصوص تھے' یعنی تمہید' گریز مدح اور خاتمہ ان ہی کی پابندی کی جاتی تھی۔

نثر کی جو کتابیں اب تک ملی ہیں وہ تصوّف کی ہیں' دوسرے موضوع کی کتابیں ہمدست نہیں ہوئی ہیں، ممکن ہے آیندہ تحقیقات میں دوسری نوعیت کی کتابیں ہمدست ہو جائیں۔

بہر حال بہمنی دور میں اردو نہ صرف نظم و نثر کی صورت میں تحریر میں آ گئی بلکہ بہت کچھ ترقی بھی ہوئی۔

لے تاریخ فرشتہ مطبوعہ صفحہ ۳۲۶، مقالہ سوم

دوسرا دور

سنہ ۹۰۰ھ تا سنہ ۱۱۰۰ھ
۱۴۹۵ء ۱۶۹۰ء

فصل اوّل

قطب شاہی اُردو

گذشتہ صفحات میں اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ جب بہمنی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو پانچ سلطنتیں۔ گول کنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر میں قائم ہو گئیں۔ یہ سلطنتیں قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی سے موسوم تھیں۔

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ہے جس نے ۹۲۴ھ؍۱۵۱۸ء میں خود مختار حکومت قائم کی اور گولکنڈہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا اس کے بعد اس کے خاندان کے سات شخص یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے سنہ ۹۸ ۱۰ھ؍۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے یہ سلطنت فتح کر کے مغلیہ قلمرو میں شامل کر لی۔

اس خاندان کے سلاطین کی فہرست حسبِ ذیل ہے:-

(۱) سلطان قلی	سنہ ۹۲۴ھ؍۱۵۱۸ء سے سنہ ۹۵۰ھ
(۲) جمشید قلی	سنہ ۹۵۰ھ سے سنہ ۹۵۷ھ
(۳) سبحان قلی	سنہ ۹۵۷ھ سے سنہ ۹۵۷ھ
(۴) ابراہیم قلی	سنہ ۹۵۷ھ سے سنہ ۹۸۸ھ
(۵) محمّد قلی	سنہ ۹۸۸ھ سے سنہ ۱۰۲۰ھ

(۶) محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ھ سے ۱۰۳۵ھ

(۷) عبداللہ ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۸۳ھ

(۸) ابوالحسن تانا شاہ ۱۰۸۳ھ سے ۱۰۹۸ھ / ۱۶۸۷ء

سلطان قلی بہمنی دور میں تلنگانہ کا طرفدار یعنی صوبہ دار تھا، دوسرے صوبہ داروں کی طرح بہمنی حکومت کے زوال پر اس نے بھی (۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء) میں گولکنڈہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی، اس کے بعد وہ قرب وجوار کے علاقے فتح کرکے اپنی قلمرو کو وسیع کرتا گیا اس نے ساٹھ ستر قلعے فتح کیے اور اپنی سلطنت کو ورنگل کی سرحد سے بندرگاہ مچھلی پٹم تک پہونچا دیا۔ گول کنڈہ کو ایک باعظمت اور شاندار سلطنت بنایا، اس طرح سلطان قلی کی حکومت کا بڑا حصہ میدانِ جنگ میں بسر ہوا تاہم وہ علم وفن کی ترقی سے غافل نہیں رہا۔ اس نے "آتش خانہ" کے نام سے ایک خاص محل تعمیر کیا تھا۔ یہاں شعرا اور ادیب جمع ہوتے اور سلطان قلی ان کے کلام سے مستفید ہوتا تھا[۱]

سلطان قلی ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ء میں قتل ہوگیا، اس کا فرزند جمشید بادشاہ ہوا اور سات سال کی حکمرانی کے بعد وفات پائی۔ جمشید شاعر تھا، فارسی میں طبع آزمائی کرتا۔ اس کا تخلص جمشید تھا اور دربار میں ملک الشعرا، ملّا، محمد شریف وقوعی تھا۔

جمشید کے بعد سبحان قلی اور پھر ابراہیم قطب شاہ مسند نشین ہوا۔ ابراہیم کے زمانہ سے قطب شاہی سلطنت کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اس کے عہد میں گول کنڈہ کا ذہنی، ادبی اور تعمیری کام شروع ہوا۔

ابراہیم نے نہ صرف سیاسی لحاظ سے اپنی سلطنت کو مستحکم کرلیا اور اچھا نظم ونسق جاری کیا بلکہ اس کو علم کی ترقی کا بھی خیال دامن گیر تھا، وہ خود صاحب علم تھا۔ اس کے دربار میں علماء فضلا، اصحاب علم جمع رہا کرتے، اس نے عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے ساتھ ملکی زبانوں تلنگی اور دکھنی کی سرپرستی فرمائی، اسی وجہ سے گول کنڈہ علم وفن کا مرکز بن گیا تھا۔ مصنف تاریخ قطب شاہی نے جا بجا اس کی قدردانی علم وفن کی تعریف وتوصیف کی ہے[۲]۔

ابراہیم کا بیس سال کی حکومت کے بعد ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں انتقال ہوا، اس کے انتقال پر اس کا

---

[۱] تاریخ گول کنڈہ۔ صدیقی۔ صفحہ ۲۵

[۲] اُردو شہ پارے۔ ڈاکٹر زور صفحہ ۸۰

فرزند محمد قلی قطب شاہ گول کنڈہ کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کا عہدِ حکومت سلطنت قطب شاہی کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، لڑائی جھگڑے بند ہو گئے، امن و امان صلح اور آشتی کا دور دورہ رہا۔

سنہ ۱۰۰۰ھ میں اس کے شہر حیدر آباد کو آباد کر کے اپنا پائے تخت قرار دیا اور اس شہر کو خوب صورت اور عالی شان عمارتوں، وسیع بازاروں، سرسبز باغوں، پانی کی نہروں اور مدرسوں سے آراستہ کیا۔

سلطان محمد قلی کے عہد میں ایک طرف تمدن اور تہذیب میں دکھنی تمدن اور رسومات داخل کرنے کے لیے کلچر کی بنیاد رکھی گئی تو دوسری طرف دکھنی اور تلنگی زبانوں کی ترقی کے لیے خود ان زبانوں میں شعر کہے۔ اس کا تخلص قطب اور معانی تھا۔

سلطان کے دربار میں علامہ میر محمد مومن کے علاوہ قاضی محمد سماکی میرک معین الدین سبزواری، مرزا محمد امین جیسے اصحاب علم و فن موجود تھے۔ مرزا محمد امین نے خمسہ نظامی کے جواب میں چار مثنویاں، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، فلک البروج اور مطلع الاشعار لکھ کر اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا جیسا کہ تذکرہ کیا گیا سلطان محمد قلی نے شہر حیدر آباد کو آباد کیا اور اس کو عالی شان عمارتوں، خوبصورت ایوان، سرسبز اور شاداب خوش نما باغوں، نہروں سے آراستہ کیا اور اس شہر کے عمرانی لوازم کو نہایت سلیقہ اور ہنرمندی کے ساتھ جمع کر دیا تھا اور تلنگانہ کے طول و عرض میں بہترین اجتماعی زندگی کی بنیاد ڈالی، اس کو فنونِ لطیفہ کی ہر شاخ سے دل چسپی تھی جس کی وجہ سے زندگی میں شگفتگی پیدا کرنے کے اسباب جمع کیے۔ شاعری، موسیقی، مصوری سے دل چسپی تھی اور ان کو ترقی دینے میں پوری کوشش کرتا رہا۔

سلطان محمد قلی کے زمانے میں مدرسے، خانقاہیں، مسجدیں، تعمیر ہوئیں۔ دکھنی (قدیم اردو) شاعری کو بڑی ترقی ہوئی، اس کے عہد کے دکھنی شعرا مشہور ہیں اور ان کے کارنامے بہ دست ہو چکے ہیں۔

چونتیس سال کی طویل اور کامیاب حکمرانی کے بعد ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۶۱۱ء اس کا انتقال ہوا[1]۔ لیکن اس کی عمر صرف اڑتالیس سال کی تھی۔ سلطان محمد قلی کا مقبرہ اپنی

---

[1] تاریخ گول کنڈہ۔ صدیقی۔ صفحہ ۱۱۱

شان وشوکت کے لحاظ سے قابلِ دید ہے۔ اب ادارہ ادبیات اُردو کے اہتمام سے سالانہ جشن منایا جاتا ہے۔

سلطان محمد قلی کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد اس کا جانشین ہوا اور صرف چودہ سال کی حکمرانی کے بعد چونتیس سال کے سن میں ۱۳ جمادی الثانی (۱۰۳۵ھ) میں وفات پائی۔

سلطان محمد اپنے علم وفضل، پاکیزہ زندگی اور اعلیٰ کرداری کی وجہ سے مشہور ہے۔ اس کی چودہ سالہ حکومت میں علمی اور عمرانی ترقی ہوئی۔ حیدر آباد میں مکہ مسجد کی تاسیس اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

سلطان محمد کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہتا تھا "ظل اللہ" اس کا تخلص تھا۔

تمام خاندان قطب شاہی میں سلطان محمد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے خود اپنے علم و فن کا بڑا سرمایہ چھوڑا ہے۔

اس کے زمانہ میں کئی دکنی شعراء تھے جن میں وجہی، غواصی، قطبی، ابنِ نشاطی، جنیدی وغیرہ مشہور ہیں۔

محمد قطب شاہ کے بعد اس کا فرزند عبداللہ تخت نشین ہوا، اس کی کم سنی کے باعث اس کی ماں حیات بخشی بیگم حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر انتظام ملک کرتی رہی، علامہ شیخ محمد جو ابنِ خاتون کے لقب سے مشہور تھے، پیشوائی کے عہدہ پر سرفراز کیے گئے۔ علامہ کی فراست اور دُور رس نظر نے ملک میں فتنہ وفساد کی آگ کو پھیلنے نہیں دیا، اگرچہ عالمگیر نے حملہ کیا مگر حیات بخشی بیگم کی وجہ سے صلح ہوگئی اور قطب شاہی حکومت مغلوں کی باج گزار سلطنت بن گئی۔

حیات بخشی بیگم نہ صرف نظم ونسق کا اچھا سلیقہ رکھتی تھی بلکہ ملک میں مذہبی تعلیم کے لیے اس نے حیات نگر میں ایک درس گاہ بنائی جہاں سو سو طلباء تعلیم پاتے اور ان کے قیام اور طعام کے لیے حکومت کی جانب سے انتظام کیا گیا تھا، آج تک اس مدرسہ اور قیام گاہ کے کھنڈر باقی ہیں۔

سلطان عبداللہ کے بالغ ہونے پر حیات بخشی بیگم نے عنانِ حکومت اس کو سونپ دی —

سلطان عبداللہ اپنے نانا کی طرح عیش پسند اور طرب ونشاط کا دلدادہ بادشاہ تھا، کبھی سات گھاٹ کے پُرفضا باغوں میں دادِ عیش دیتا تو کبھی کوہِ طور کی عشرت گاہیں اور محلات بزمِ طرب بنے ہوتے دن عید اور رات شب برات ہوتی، جنگل میں منگل ہو جاتا۔

لیکن اس کے باوجود ملک کی خوش حالی میں ترقی ہوئی، امن وامان رہا۔ زراعت، تجارت

میں ترقی ہوئی۔ کئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ علم وفن کے لحاظ سے بھی سلطان عبداللہ کا دورِ حکومت پیچھے نہیں رہا۔ اصحابِ کمال اور شعراء نامدار کی سرپرستی ہوتی رہی۔ ادیبوں کو ان کی محنت کا صلہ ملتا رہا۔ نظام الدین احمد نے حدیقۃ السلاطین لکھی جو ۱۰۵۰ھ تک کے قطب شاہی دور کے حالات پر مشتمل ہے۔ علامہ ابن خاتون نے اپنے عہدہ کے اہم فرائض کی انجام دہی کے ساتھ کتاب الارشاد اور جامع عباسی پر حواشی لکھے، اربعین کا ترجمہ فارسی میں کیا، طلبہ کو علومِ منقول اور تفسیر حدیث فقہ کا درس بھی دیا کرتے تھے[1]۔ ملا جمال الدین نے کتاب المصباح کا اور ملا علی ابن طیفور نے عیونِ اخبار کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مولانا حسینی آملی نے نہج البلاغت کی شرح مرتب کی۔ ملا فتح اللہ سمنانی نے امام یافعی کی کتاب روض الریاحین کا ترجمہ کیا، فارسی کی مشہور لغات برہان قاطع اسی سلطان کے عہد میں مرتب ہوئی اور سلطان کے نام پر معنون کی گئی[2]۔

سلطان کے عہد میں دکھنی (قدیم اردو) زبان کو خاص ترقی ہوئی۔ سلطان خود بھی شاعر تھا، عبداللہ تخلص کرتا تھا، دیوان مرتب ہوا ہے۔ اس کے عہد کے چند مشہور شعرا و ادبا یہ ہیں:۔ وجہی، غواصی، ابن نشاطی، جنیدی جو اس سے پہلے اردو کی خدمت کرتے تھے۔ اب طبعی، امین، اولیا، غلام علی وغیرہ نے اپنی شاعری سے نام آوری حاصل کی۔ وجہی نے "سب رس" لکھ کر اردو نثر میں داستان کا آغاز کیا۔ میران یعقوب نے نثر میں شمائل الاتقیا لکھی، بہرحال سلطان عبداللہ کے دورِ حکمرانی میں اردو ادب کی ترقی ہوئی۔

(۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) سلطان عبداللہ کا انتقال ہوا۔ چونکہ سلطان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے اس کا داماد ابوالحسن جو تانا شاہ کے لقب سے مشہور ہے تخت پر متمکن ہوا۔

سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا چودہ سالہ دورِ حکومت ۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ بے اطمینانی اور جنگ وجدال کی خونی فضا سے لبریز رہا، مگر اس کے باوجود اردو ادب کی ترقی ہوئی، محب، کبیر، اولیا غلام علی، فائز، لطیف افضل وغیرہ شعراء نے کئی مثنویاں لکھیں اور اپنے نتائجِ فکر سے اردو ادب کی گراں بہا خدمت انجام دی اور باغِ اردو کی آبیاری میں حصہ لے کر اس کو سرسبز و شاداب کیا۔

قطب شاہی دورِ حکومت کے تقریباً دو سو سال کے عرصہ میں جن دکھنی شاعروں اور ان کی

---

[1] حدیقۃ السلاطین مخطوطہ۔ صفحہ ۲۶۴

[2] تاریخ گول کنڈہ۔ صدیقی صفحہ ۱۷۳

تصانیف کا پتہ چلا ہے ان کی تفصیل درج ہے ممکن ہے ان میں آیندہ اور اضافہ ہو سکے۔

نمبر	شاعر	تصنیف	سنہ
۱	فیروز	توصیف نامہ	
۲	محمود	؟	
۳	ملّا خیالی	؟	
۴	وجہی	مثنوی قطب مشتری	سنہ ۱۰۱۸ھ
۵	سلطان محمد قلی	کلیات	سنہ ۱۰۲۵ھ
۶	سلطان محمد	؟	
۷	سلطان عبداللہ	کلیات	
۸	غواصی	مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال	سنہ ۱۰۳۵ھ
		مثنوی طوطی نامہ	سنہ ۱۰۴۹ھ
		مثنوی چندا و لورک	
		کلیات	
۹	احمد	مثنوی مصیبت اہلِ بیت	
		مثنوی لیلیٰ مجنوں	
۱۰	عاجز	مثنوی لیلیٰ مجنوں	سنہ ۱۰۴۰ھ
۱۱	میران جی خدا نما	نظم	
۱۲	قطبی	تحفۃ النصائح	سنہ ۱۰۴۵ھ
۱۳	سلطان	دیوان	
۱۴	جنیدی	مثنوی ماہ پیکر	سنہ ۱۰۶۴ھ
۱۵	شیخ عبداللہ	نظم	
۱۶	بلاقی	معراج نامہ	سنہ ۱۰۶۵ھ
۱۷	ابنِ نشاطی	پھول بن	سنہ ۱۰۶۶ھ
۱۸	طبعی	بہرام و گل اندام	سنہ ۱۰۸۱ھ
۱۹	شاہ راجو	سہاگن نامہ	
		چکی نامہ	

		چرخا نامہ	
۲۰	تاناشاہ	نظم	
۲۱	محب	معجزہ فاطمہ	۱۰۸۸ھ
۲۲	کبیر	قصہ شمیم انصاری	۱۰۹۰ھ
۲۳	اولیار	قصہ ابو شحمہ	۱۰۹۰ھ
۲۴	خواص	قصہ حیلنی	۱۰۹۰ھ
۲۵	غلام علی	پدماوت	۱۰۹۱ھ
۲۶	سیوک	جنگ نامہ	۱۰۹۲ھ
۲۷	فائز	قصہ رضوان شاہ	۱۰۹۴ھ
۲۸	لطیف	ظفر نامہ	
۲۹	افضل	محی الدین نامہ	
۳۰	فتاحی	مفید الیقین	
		شعب ایماں	
۳۱	سالک		
۳۲	نوری		

اس دور کے جو الفاظ بولے جاتے تھے، وہ آج متروک ہو چکے ہیں، ایسے بعض الفاظ یہاں درج کیے جاتے ہیں جو ان لوگوں کے کلام میں اکثر آتے ہیں۔

ہور	اور	سوں	سے	کان	کہاں	وسنے	نظر آتے
جوں لگ	ابھی تک	لوچن	آنکھ	دو	وہ	کدھن	سمت جانب
رُخ	طرف	تونا	جادو	ہمنا	ہم کو	نین	نہیں
یاں	یہاں	دوتن	سوکن	گگن	آسمان	کنے	پاس
سوت	چشمہ	درس	درشن	نین	آنکھ	سجن	معشوق
جھاڑ	درخت	بہار	باہر	رسن	زبان	اتھا	تھا
پات	پتے	اس پو	اس پر	یو	یہ	جکوئی	جو کوئی
گنھیر	متین	تمن	تم کو	کوں	کو	منج	مجھ

بھاگ = قسمت	سمدور = سمندر	بہوت = بہت	اہے = ہے

اگر بحیثیت مجموعی اس دور کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ زیادہ تر مثنویوں کا رواج رہا، اور ان میں فرضی قصّے منظوم ہوتے رہے۔ ان میں زیادہ تر فارسی کے ترجمے ہیں لیکن ان ترجموں کو دکھنی شعراء نے بہت بڑی حد تک کمی و بیشی کر کے گویا اپنا لیا ہے، چند اچھی داستانیں بھی ہیں، مثنویوں کے ساتھ قصائد اور غزلیات، مرثیہ اور نوحہ بھی لکھتے رہے ہیں۔ مرثیوں کے متعلق ہم نے علیحدہ تفصیلی صراحت کی ہے۔

مثنویوں میں جو قصّے منظوم ہوئے ہیں ان کا خاکہ مکمل ہے۔ تسلسل بیان قابلِ داد ہے۔ کردار نگاری، واقعہ نگاری اور وصف نگاری کے اچھے نمونے ان مثنویوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔

قصائد اپنی شوکت لفظی، طمطراق اور تخیل کی بلند پروازی کے لحاظ سے تعریف اور ستائش کے مستحق ہیں۔ مثنویوں کے مقابلہ میں ان کا ذخیرہ کم ہے۔ غزلیات میں تغزل ہے اور تصوف بھی، ان میں رنگینی اور تخیل کی بلندی، نازک خیالی کے ساتھ ساتھ اثر بھی پایا جاتا ہے۔ اگر زمانہ مابعد کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے تو صرف زبان کا فرق نظر آئے گا، خیالات اور تخیل وہی ہے جو زمانہ مابعد میں غزل کی جان بنے ہوئے تھے۔

اب اس دور کے شعراء اور ان کے کلام کو پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) فیروز قطب الدین نام اور فیروز تخلص، اس دور کا ایک بلند پایہ شاعر ہے، اس کا وطن بیدر تھا، زمانہ مابعد میں گول کنڈہ آ گیا، فیروز قادریہ طریقہ میں مُرید تھا۔ شیخ محمد ابراہیم مشہور مخدوم جی اس کے مرشد تھے۔ مخدوم جی شیخ محمد ملتانی کے فرزند تھے۔ شیخ ملتانی اپنے عہد میں بااثر اور تقدس مآب شخصیت کے مالک تھے، سلاطین گول کنڈہ آپ کا اور آپ کی اولاد کا بڑا احترام کرتے تھے۔

فیروز کے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوئے، مگر اس کی شاعری کی عظمت اور اُستادی کا اعتراف گول کنڈہ کے شعراء وجہی اور ابن نشاطی نے کیا ہے۔ خصوصاً وجہی جیسے مغرور شاعر کا فیروز کی اُستادی کا اعتراف کرنا اس کے زبردست شاعر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ وجہی نے اپنی مثنوی قطب مشتری میں جس عقیدت کے ساتھ فیروز کا تذکرہ کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

کہ فیروز آ خواب میں رات کون — دعا دے کے چومے مرے ہاتھ کون
کہیا ہے توں یو شعر ایسا سرس — کہ پڑنے کوں عالم کرے سب ہوس
تو یوں کر کہ خصلت یو تج آئے نا — کہ تو خوش اچھے ہور کے بھائے نا
توں ایسی طرز دل تے پنجا نوی — کہ دُسرے کریں سب تری پیروی

وجہی ترا دہن جوں برق ہے
تجے ہور بعضاں میں کئی فرق ہے

دوسری جگہ لکھتا ہے ؎

کہ فیروز محمود اچھے جو آج — تو اس شعر کوں بہوت ہوتا رواج
کہ نادر تھے دونوں کے اس کام میں — رہ گیا میں کنے بول اچھوں نام میں

قطب شاہی دور کے دوسرے شاعر ابن نشاطی نے اپنی مثنوی پھول بن میں فیروز کا ذکر اس شعر میں کیا ہے ؎

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد — جو دیتے شاعری کا کچھ مرے داد

اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فیروز کے بہت سارے شاگرد تھے اور وہ اپنے تلامذہ کی بڑی ہمت افزائی کیا کرتا تھا اور اس کی تعریف گویا کمالِ فن اور بہترین شاعری کی دلیل ہوتی تھی۔

فیروز ابراہیم قطب شاہ کے دور کا شاعر ہے اس کی مثنوی پرت نامہ جس کو توصیف نامہ سے بھی موسوم کیا گیا ہے ہمدست ہوئی ہے، اس مثنوی کا ایک نامکمل نسخہ[1] ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے۔ دوسرا مکمّل نسخہ غالباً انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کے کتب خانہ میں ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی نے ایک فاضلانہ مضمون کے ساتھ اس مثنوی کو انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ "اُردو ادب[2]" میں شائع کردیا ہے۔

پرت نامہ میں حضرت سیّدنا عبد القادر جیلانیؒ کے حالات درج ہیں۔ اور مدح کی گئی ہے اور اپنے مُرشد شیخ ابراہیم مخدوم جی کی مدح بھی شامل کیا ہے۔

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۴۴

[2] رسالہ "اُردو ادب" بابتہ ماہ جون ۱۹۵۰ء

جیساکہ تذکرہ کیا گیا ہے کہ مخدوم جی بیدر کے مشہور اور صاحب حال بزرگ شیخ محمد ملتانی کے بڑے فرزند تھے۔ مصنف تذکرہ اولیاء دکن کے الفاظ میں آپ عالم و فاضل اور ولی کامل تھے، جامع کمالات انسانی و فضائل روحانی میں اس وقت آپ کا کوئی نظیر نہیں تھا۔[1]

فیروز نے پرت نامہ میں صراحت کی ہے کہ اس نے خواب میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ آپ ہوبہو مخدوم جی کی ہم شبیہ ہیں، اس لیے اس نے آپ کو ہر جگہ محی الدین ثانی کے نام سے یاد کیا ہے۔

"پرت نامہ" کی تصنیف کا صحیح سن معلوم نہیں ہوا۔ مگر اس میں مخدوم جی کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ وہ عرصہ تک زندہ رہیں تاکہ ان کا روحانی فیض جاری رہے، اور ان کے خلیفہ ہونے کا تذکرہ ہے، شیخ ملتانی کا انتقال ۹۴۰ھ میں ہوا ہے اس سے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ پرت نامہ ۹۴۰ھ کے بعد تصنیف ہوا ہے۔ مخدوم جی نسباً شیخ تھے۔ فیروز نے ان کے متعلق صراحت کی ہے کہ وہ سادات کے دوست ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے غالباً فیروز نسباً سید تھا، فیروز کے کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

تہیں قطب اقطاب جگ پیر ہے — تہیں غوث اعظم جہاں گیر ہے
تہیں چاند باقی ولی تارے ہیں — توں سلطان سردار بسارے ہیں
ولایت سوں جب تو اجایا علم — علم تجھ تلیں ہیں ولی سب حشم
محی الدین توں دین تجہ تے جیا — تو اسلام کوں زور سر تے دیا
نہیں نور دیدا نبی کا یقیں — تہیں عین دستا علی یقیں
کہ باغ علی کوں تو گلشن کیا — چراغ حسین کوں تو روشن کیا

مخدوم جی کی مدح کے اشعار ؎

ابراہیم مخدوم جی جیونا — کہ مے صرف وحدت سدا پیونا
مرا پیر مخدوم جی جگ منے — منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے
کریں منجہ اپر پیار اے پیو جگ — کہ تجہ پیار تھے ہوے مند ہیر جگ
پیا جیو تھے تو ہمن باس ہے — تو ہم جیو کے پھول کا باس تے

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن جلد اول

وہی پھول جس پھول کی باس توں — وہی جیو جس جیو کی آس توں
سوتوں روک ہے دین کا باردار — جو تجہ چھانو تل جگ ہے پکڑیا قرار
اچھو منجہ اپر چھانو تیرا جرم — کہ آدھار میرا سو تیرا کرم

تو سلطان سلاطین رعیت محی — تو حاکم کہ جگ پر حکومت تجی
ولی جاد کر پاؤ آپ سر لیے — قدم راکھے تجہ کہاند ادے
مگر شیخ صنعا ہوا پار کھا — دکھیا دین کھویا کافر سار کا
بھولیا دیک ترسا کہ بک پوستنی — لگی لنگ پوجن لکہا بھوتنی
شراب پیو سترآن لے جالیا — چرا خون کہ دوزخ اپس کھالیا
فرشتے تجہ آزمائے اپنے جب — پران جل پری کٹھنی سزا پائے تب
تہیں عبد القادر سو قادر دیسے — کہ قادر کہ قدرت میں قادر دیسے
نظر توں کرے تو موا جیوا سکتے — وضوبن جو تجہ ناؤں لے سر توں ہنی
رب اپنے سو عاشق ولی سب سدا — تو معشوق عاشق تو سوں رب سدا
بزرگی تجے دلیاں میں سوہے — ولی جس موہی وہی تج سوہے

(۲) محمود

اس دور کا ایک دوسرا مشہور شاعر اور اُستادِ سخن محمود تھا۔ ابن نشاطی کی صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ سیّد محمود ان کا نام تھا۔ چنانچہ پھول بن میں جہاں فیروز کا ذکر ہے اس کے ساتھ ہی محمود کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:۔

اہے صد حیف جونیں سیّد محمود — کتے پانی کوں پانی دودھ کو دودھ

افسوس ہے کہ اب تک محمود کی کوئی تصنیف بدست نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے آئندہ تحقیقات میں کوئی نظم مل جائے۔

(۳) خیالی

ملّا خیالی کے متعلق بھی ہمیں معلومات نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ اس عہد کے شاعر تھے، اور فنِ شاعری میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ابنِ نشاطی نے جن شعراء کے زندہ نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا ہے ان میں ایک ملّا خیالی بھی ہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

اچھے تو دیکھتا ملّا خیالی — یو میں برتا ہوں سو صاحب کمالی

(۴) وجہی

اس دور کا ایک مشہور شاعر اور نثار وجہی ہے، اس کا فارسی دیوان نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ وجہی کا نام اسد اللہ تھا، اس کے اجداد خراسان سے دکن آئے تھے مگر اس کی پیدائش دکن میں ہوئی اس نے اپنا تخلص وجہی اور وجہیؔ وجہ قرار دیا تھا، ایک عرصہ تک عسرت سے اس کی زندگی بسر ہوئی۔[1]

پھر جب زمانے نے گردش کی تو اس کو تقرب شاہی حاصل ہوگیا۔ اس نے قطب شاہی دور کے چار بادشاہوں یعنی ابراہیم قطب شاہ، سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ کے دورِ حکومت کو نہ صرف دیکھا بلکہ تصنیف بھی کرتا رہا۔

اس کی مشہور مثنوی "قطب مشتری" ہے جو ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی کا ہیرو محمد قلی قطب شاہ ہے۔ وجہی کی دو کتابیں اب تک دستیاب ہوئی ہیں، یعنی "قطب مشتری" اور "سب رس"۔

قطب مشتری مثنوی ہے، اور سب رس نثر کی کتاب ہے۔ "سب رس" اردو نثر کی پہلی داستان ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے، وجہی کی ایک کتاب "تاج الحقائق" کا تذکرہ مولانا عبدالحق نے فرمایا ہے جو نثر میں ہے اور تصوف پر مشتمل ہے۔[2]

قطب مشتری کا اسلوب بیان نہایت پاکیزہ ہے اور اس کی زبان بہت صاف ہے، اس

---

[1] ان امور کے متعلق فارسی دیوان کے حسب ذیل اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں ؎

جائے است دریں بزم وجہیؔ کہ از شکن — حسرت بدہاں خاک کند حکمت جم را

اسمم اسد اللہ وجہہ است تخلص — آرائش و کانچہ بازار کلام است

سخنہائے دروغ چند را عزت چہ خواہد بود — وجہیؔ شاعر بگذار و فکر کار دیگر کن

شرمندۂ بنانم از من بے زری وجہہ — کس حال من بہ شاہ دکن گفت یا نگفت

عالمے رامی کنم شاگردی از اعجاز طبع — وجہیا استاد اگر روح ال من باشد مرا

من زہند آشکار گشتم لیک — طبع پاک من از خراسان است

[2] مقدمہ قطب مشتری صفحہ ا۔

مثنوی سے اس زمانہ کی طرز معاشرت، تمدن اور تہذیب کا کافی اندازہ ہوتا ہے، یہ مثنوی اپنی خصوصیات کے باعث اہم حیثیت رکھتی ہے، اس کا موضوع اور پلاٹ اچھا ہے۔ وجہی نے اس مثنوی میں شاعری کی بھی تعریف کی ہے اور اصلی شاعری تاثر کو بتایا ہے، اس مثنوی کی تشبیہیں اور استعارے قابل داد ہیں۔ وجہی نے غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے ان میں زبان اور خیال دونوں اعتبار سے ہندی کا پورا اثر پایا جاتا ہے، الفاظ زیادہ تر ہندی ہیں۔ زبان سادہ اور شیریں ہے بعض عربی اور فارسی الفاظ کو ہندی لب ولہجہ میں ڈھال کر ہندی بنالیا ہے، ہندی شاعری کے مطابق عاشق عورت ہے اور مرد معشوق۔

وجہی کی یہ مثنوی انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوگئی ہے اور اس کو ناگری رسم خط میں بھی حیدرآباد سے ہندی پرچار سبھا نے شائع کردیا ہے۔

وجہی کی دوسری دو کتابیں جو نثر میں ہیں ان کا تذکرہ نثر کے سلسلے میں کیا جائے گا۔

وجہی نے بڑی عمر پائی، کیوں کہ چار بادشاہوں کے عہد میں زندہ تھا اور نہ صرف زندہ تھا بلکہ تصنیف بھی کرسکتا تھا، سلطان عبداللہ کا عہد حکومت ۱۰۳۵ھ سے شروع ہوتا ہے اور وجہی کی سب رس اس کے دس سال بعد ۱۰۴۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

افسوس ہے اب تک وجہی کے انتقال کا سنہ معلوم نہ ہوسکا۔ ممکن ہے آئندہ اس کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوں۔ اب وجہی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

مثنوی

تون اوّل توں آخر توں قادر اہے　　توں مالک توں باطن توں ظاہر اہے
توں محصی توں مبدی توں واحد سچا　　توں تواب توں رب توں ماجد سچا

شہنشہ مجالس کیے ایک رات　　وزیران کے فرزند تے سب سنگات
ہریک خوبصورت، ہر ایک خوش لقا　　سو ہر ایک دل کش ہر ایک دل رُبا
مہابت کے کاماں میں جم جم ہے جیو　　شجاعت کے کاماں میں رستم ہے جیو
ندیم ہور مطرب، سگھڑ، فہم دار　　اتھے شاہ سوں مل کریو سب ایک ٹھار
صراحی، پیالے لے ہاتاں منے　　ندیماں تے مشغول باتاں منے
لگے مطرباں گانے یوں سازسوں　　کہ دھرتی ہے مست آواز سوں

جو مطرب دو صحرا میں اس دھات گائے — تو پھر ان کوں اس شوق تے حال آئے

جو گاوں وہ ٹھ کوں کماتے اتھے — سو راگاں پہ راگاں جماتے اتھے
ندیماں لطافت میں جو چکہ آئیں — تو روتیاں کو خوش کر گھڑی میں ہنسائیں
شراب ہور صراحی نقل ہور جام — ہوئے مست مجلس کے لوگاں تمام
جو ہوئی رات آدھی بچھی دو پہر — خبردار یاراں ہوئے بے خبر
بسر گئے ندیماں طرز بات کا — گنوائے خبر مطرباں ذات کا
نہ ملتے نہ خوبی جھگڑتے کہیں — یکس کے اپر ایک پڑتے کہیں
لگے مست ہو سٹنے مستی سنگات — یکس کے سو پاداں اُپر ایک ہات
سویوں کچ وہ یاراں ہوئے بے خبر — کہ پانی نپتے تھے شراب لکر
یکس کوں بلا ایک ازمائوں سوں — گلے لگتے تھے مست ہو چھانوں سوں
بجاؤ جو کیں تو اٹھیں گائے کر — سٹے مطرباں ہوش خوش پائے کر

چھپی رات اُجالا ہوا دیس کا — لگیا جگ کرن سیو پریس کا
شفق صبح کا نیں ہے آسمان میں — کہ لالے کھلے سُنبلستان میں
جو آیا جھلکتا سورج واٹ کر — اندھارا جو تھا سو گیا نھاٹ کر
سورج یوں ہے رنگ آسمانی منے — کہ کھلیا کمل پھول پانی منے

ابراہیم قطب شاہ مجلس سنکار — کئی مستعد سو پ عشرت اثار
جتیاں خوب خوش شکل تھیاں سندریاں — سو کرتا تک حور کو یکچر اتکیاں

نگر میں جو آیا قطب شاہ نول — لگی بجنے چوندھر خوشیاں کے طبل
شہر میں سو عید آج لوگاں کیے — کھری گرانند کاج کا کان کیے
لگے حال احوال سب پوچھنے — جو شہ دیکھے تے سو کہنے لگے

بڑا عشق کا سب سِتے درجا اہے | کہ یکجا نہیں عشق ہر جا اہے
اگر عشق کچ بلبلا کون جو نیں | تو کی آہ نالے کرے پھول تیں
اگر عشق تیں ہے تو کی شمع پر | پتنگ ایسے جاے ستم آئے کر
اگر نیں ہے عاشق چکور چاند کا | تورا تاں کوں دو کیا سبب جاگتا
کہ لیلیٰ و مجنوں جو کہوائے ہیں | سو اس عشق تے ناؤں یوں پائے ہیں

جوانی کے دریا کوں آیا ادھان | محمد قطب شہ ہوا اب جوان
تیا زور تھا اس کے یکدست سوں | اچاکر پچھاڑے مِتے بست کوں
عجب جان غنیمت ماناہے دو | کہ باگاں سوں پنجا ملاتا ہے دو
چلے زور کر ہم سوں جس نیت ان | زمیں میں گھنسے پانو گڑ گیا لگن
دونو خیز او تار بھج بل غرور | مکیاں سوں پہاڑاں کرے چور چور
اگر شاہ خنجر لیوے ہات میں | ادھیڑے پکڑ باگ کوں بات میں

رتن لا سنوارے مکلل محل | سو مریخ، یاقوت، نیلم زحل
انگن آسماں ہور بادل سو فرش | کہ منڈوا سو کرسی چھجا جیوں ہے عرش
مرصع جڑیا تخت واں لیائے کر | سو اس تخت پر شہ کوں بسلائے کر
ملے دوستاں آج چوندھیر تے | انند عیش کرتے ہیں بھی سیر تے
سو جلوا لگے دینے سب شاہ کوں | سلاکھن سکی مشتری ماہ سوں
زر بنا کیے سور کا قرص توڑ | پنائے رتن گھنگے طبلے کوں پھوڑ
مشاطہ ہو حور آئے جنت تے بھل | کہ پردا ہے اسمان تارے سو پھل
سو اسماں کیں ورسوں یوں جگمگے | کہ پھولاں کے منڈیاں کوں تارے لگے
ملے قطب ہور مشتری ایک ٹھار | ہوا آج جگ میں انند بے شمار [1]

وجہی کی غزلیات کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

---

[1] قطب مشتری۔

غزلیات

طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آ مل رے پیا
تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہوں میں، پانی انجھوں پیتی ہوں میں
تج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہردم توں یاد آتا منجے، اب عیش نئیں بھاتا منجے
بڑھایو سنتا منجے تج باج تل تل رے پیا
تو جیو میرا میں سو دل تج سات رہنا کیوں نہ مل
دن رات میں میں ایک تل بن تج نے غافل رے پیا

پیوا پنے کون ٹک آج میں نس سپنے دیکھی سوئے کر
جب پیو چلیا سمٹ سیج منج تب سوتی اٹھی روئے کر
ہٹ برہا اپنے سارنے پنج چلچل لاگیا مارنے
نہ جاؤں سائیں کارنے بھی اجنوں کیا کیا ہوئے کر
نہ پوچھوں بہن جو تسی کب ملنا پیو سوں ہوے سی
غم برہا سب میں سوے سی نا جانے دُکھیو کوئے کر
کیوں ٹالوں برہا جھال سکی نیں سکتی ہوں سنبھال سکی
اب کیوں کر پانوں لال سکی جو بیٹھی ہمت نے کھوئے کر
یکتائیں سہیلی مرنا دل دوجے پر نا دھرنا
اس پیوں کون اپنا کرنا اس پاپی جیوں کوں کھوئے کر

مدعشق میں پیا سو چڑیا ہے اثر منجے — سدعقل فام چھین کیا بے خبر منجے
دھن مکھ اگن میں پڑنے سمدور ہوا ہوں آج — طوطی نہیں ہوں میں کہ جو بھاوے شکر منجے
سپسلا کے خوبی سو پنج لجاتا بلائے کر
شاندے بو عشق آج کدھر کا کدھر منجے

پیارا سیج پر آیا پیارا جیو تے پیارا ہو
برہ منج دل میں تے نکلیا سو جیو او ساس بارا ہو

برہ کی آگ تے تن پر ہر یک یاقوت کا دانا
لگیا ہو لے تے تھڈا منج رہیا جو انگارا ہو

انکھیا دو ہور پلکاں تو چہ دشمناں ہیں سب
ادھر عیسیٰ اثر شہ کا وہاں اچپتا ہمارا ہو

سورج خوش رنگ سیں بی مے کرن جیو تو قلم لے کر
صورت شہ کی لکھی آیا عطارد اب چنارا ہو

بھنواں دو جیوں رحال ہور الک کی کنڈلاں جرناں
تلک آیت ہے تل مطلق دسے جیہد پیارا ہو [1]

تجہ مکھ کے درس کا یو سورج سو درستی ہے
تج نو جھمکے تے سب جگ میں روشنی ہے

زر تار کے رچ پر گال پر سہاتے
یا چاند کے کنارے خوش رنگ چندنی ہے

دل عاشقاں کے تل تل کی کی بعزتی نیں
کیا شوخ چلبلی توں غمزیاں بھری تھتی ہے [2]

ایک رباعی ملاحظہ ہو:-

تج یاد بنا ہور منجے کام نہیں — نس جاگتے جاتی ہے دن آرام نہیں
میں تو تجے منگتی اوکھ جیو دے — توں کیوں منجے منگتا سو کچ فام نہیں [3]

وجہی نے نوحہ بھی لکھا ہے اس کا نمونہ مرثیہ گوئی کے تذکرہ میں دیا گیا ہے۔

(۵) سلطان محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات صفحات گذشتہ میں درج ہو چکے ہیں، سلطان اردو

---

[1] و [2] قطب مشتری۔

کا ایک بلند پایہ شاعر گزرا ہے۔ اس کا کلیات جس کو اس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا ہے۔ اس کا ایک بہترین نسخہ حضور نظام میر عثمان علی خاں کے ذاتی کتب خانہ میں تھا۔

نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں جو دو نسخے قلمی ہیں اس کو ڈاکٹر زور صاحب نے ایڈٹ کر کے ایک سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے، اب اس کو ناگری خط میں بھی ہندی پرچار سبھا نے شائع کیا ہے۔

اس کلیات کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو نے رسالہ اُردو[1] میں کافی بحث کی ہے۔ مولوی صاحب کا یہ مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اس سے بیشتر سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری کی کیفیت اور ان کے کلام کے نمونے تذکرہ شعرائے دکن[2] مؤلفہ مولوی عبدالجبار خاں صاحب ملکاپوری مطبوعہ ۱۳۲۹ھ میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کریم الدین کے طبقات الشعراء میں بھی سلطان محمد قلی کی شاعری کا ذکر ہے، مگر نمونہ کلام نہیں دیا گیا ہے۔

کلیات محمد قلی میں سارے اصنافِ سخن، مثنویاں، قصیدے، مرثیے، غزل، ترجیع بند اور رباعیات سب کچھ شامل ہیں۔ اس کا تخلص قطب شاہ اور معانی تھا، جو کلیات شائع ہوا ہے اس میں بہت سا کلام نہیں ہے۔

سلطان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ایک فطری شاعر تھا اور ہر موضوع پر نہایت کامیاب طبع آزمائی کرتا تھا۔ آج کل کے عشقیہ کلام سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو واضح ہو گا کہ اس کا دیوان بھی وہی گل و بلبل، شاہد و ساقی کی پرانی داستان کا دفتر ہے۔ البتہ اس زمانے کا لحاظ کرتے، اس کی زبان وہ نہیں ہے جو داغ و ذوق کی زبان ہے۔

مثنویاں متعدد عنوانوں پر لکھی ہیں، کسی میں پھلوں کا ذکر ہے تو کسی میں سبز ترکاریوں کا بیان کسی میں شکاری پرندوں کا ذکر ہے تو کسی میں رسم و رواج، تیوہاروں اور شاہی محلوں کا بیان ہے۔ عید، نوروز، بسنت، مرگ، موسم برسات وغیرہ پر بیسیوں نظمیں ہیں۔

---

[1] رسالہ اُردو جلد ۲ نمبر ۵ بابت ۱۳۴۰ھ

[2] صفحہ ۲۱ تا ۴۷

کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی آمیزش بھی کافی ہے، فارسی کے برخلاف
اس نے ہندی کے اسلوب بیان کو اختیار کیا ہے۔
ذیل میں اس کے ہر قسم کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

باغ محمّد شاہی کی تعریف میں قصیدہ

محمّد نانوں ستے بستا محمّد کا اسے بن سارا
سو طوباں سوں سہاتا ہے جنّت نمنے چمن سارا
دے فانوس کے دریا نے ستے جوں جوت دیوی کا
سو تیوں دستا دوالاں میں ستے میویاں کا بدن سارا
بھے دم عیسوی دائم چمن میں گل لگاتے ہیں
ہرے نہالاں کے جلوے میں مشاطا ہو پون سارا
سڑک سے باغ کوں دیکھت کھلے منج باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں ستے لگیا جگ مگمگن مارا
چمن کے پھول کھلتے دیکھ سکیاں کا مکہ یاد آیا
سہاتا تھا محمّد پھل نمن ان کانیں سارا
دسے ناسک کلی چنپا بھواں دو پات میں تس کے
بھنور تل دیکھ اس جا گا ہوا حیران من سارا
سو خوشے داکھ لاکھاں کے ثریّا سنبلا ہے جوں
سہے اس راکھ منڈوا سو جیسا سبز کہن سارا
اناراں میں سہے دانے سو جوں یاقوت تنبلیاں
ہر ایک پھل اس اناراں پر سہے سکے نمن سارا
کھجوراں کے دسیں چھونکے کہ جوں مرجان کے پنجے
سپاریاں لعل خوشے جوں دسیں دن ہور بن سارا
دسیں ناریل کے پھل یوں زمرد مرتباناں جوں
ہور اس کے تاج کوں کہتا ہے پیالا کر دکھن سارا
دسیں جاموں کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم
نظر لاگے تیوں میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا

صفت کرنے کون سوسن بھی کھلیا ہے دس زباں اپنے
دکھن سب سندریاں کے تیں کھلیا نرگس نین سارا

چمن آواز سن بلبل اپس میں آپ الاپیں ہیں
سو تس آواز سوں موراں کریں رقصاں اپن سارا

مثنوی (سالگرہ)

نبیؐ کی دعا تھے برس گانٹھ پایا
خوشیاں کی خبر کے دمامے بجایا

پیا ہوں میں حضرت کے ہت آب کوثر
توشاباں او پر مجھ کلس کو بنایا

مرا قطب تارا ہے تاریاں میں نجل
تو مجھ بر فلک رنگ کا چھتر چھایا

سورج چندر پی تال ہو کر بجیں تب
منڈل ہو فلک ٹمٹمایاں بجایا

کرے مشتری رقص مجھ بزم میں نت
برس گانٹھ میں زہرہ کلیاں گایا

مرا گلستاں تازہ اس تے بتو اسے
مجھ اس باغ تھے میوہ دمدم کھلایا

دندے دشمناں کو سو جگ جا ملا کر
سو اپسند کے پاتراں کرنا چاہا

خدایا معانی کی امید بر لیا
کہ جیوں سانت کی سیوں تے جگ سب اکھایا

خدا کی رضا سوں برس گانٹھ آیا
سہی شکر کرتوں برس گانٹھ پایا

"بسنت" کے متعلق کئی نظمیں ہیں، ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا
تمیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا

نچھل کندن کے تاراں انگ جھونا
بندی ہوں چھند بند سوں کو سنگارا

بسنت کھیلیں ہمن ہور سا جنا یوں
کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

شفق رنگ جھینے میں تارے مگٹ جوں
سرج کرنا ممن زر تار تارا

پیا پگ پر ملا کر لیائی پیاری
بسنت کھیلی ہوا رنگ رنگ سنگارا

جوبن کے حوضخانے رنگ مدن بھر
سو رو مار دم چرکیاں لائے دھارا

بھیگی چولی میں سجن نشن نشانی
عجب سورج میں ہے کیوں نس کوں ٹھارا

لہ از رسالہ اُردو جلد ۱۔ صفحہ ۵

لہ محبوب الزمن۔ صفحہ ۷۵۳

بسنت ونت جھد سو کندن گال اوپر   پھولایا آگ کیسر کی بہارا

بنی صدقے تے بسنت کھیلیں قطب شاہ   رنگیلا ہور رہیا ترلوک سارا

"مرگ" موسم برسات کے آغاز پر کئی نظمیں ہیں۔ ایک ملاحظہ ہو:۔

مرگ مہینے کوں ملائے ملکاں مل گگنا میں
سمد موتیاں کے جو برسائے سو بھرے انگنا میں

دھرت بند چیر جواہر چولی رنگ پاچ کرانک پر
بربہوٹیاں لعلاں سوں اترے ہیں یمناں میں

کوکے چوندھر کتے میوراں ہرے بن چو طرفاں دیکھ
پنکھی رنگا رنگی نغمیں کریں مست ہے چمناں میں

ہرے صحرا میں نہ ہوے لالی گلالاں نہ ہوے بن میں
شبنمی تیل سوں شمعاں جوں زمرد لگناں میں

موہنیاں تازے طراوت سوں سر نگ انگ رنگ کی دبری
جھوے بند چھند سوں لٹکیتاں جو بنالے جوباں میں

امرت اوصاف سنجل سات ہے ظلمات سوں بھئیں
یا نچھل دو بدلاں سیام ہے جوبن کے کھناں میں

دیکھ عجب وہ نین مج رہے حیراں ہور کہے یوں
جو رہے کیوں لگن ابر سوں کنچک کناں میں

کرنے نظارے ہول کے پیاں مے مست سہیلیاں
چنگ ملہار بھونر گائے سو تن تن سمناں میں

نہ ہوے شکیں بھنوراں دو جو وطن کراہیں پھل میں
نرمل اچھے ہیں تلاں دو سمناں سے ذقناں میں

سر تھے پگ لک جو مسکل ہوز اپنے منے سکیاں
من ہرن پچ بعد ایال گھنگرو ہو نچناں میں

خوش نبی ہور علی کے صدقے تے غزل مرگ کی کہیں
سو قطب نوا سوں جم تپے کہ جوں سورج کرناں میں

سلطان کی کلیات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں جو غزلیں ہیں وہ ردیف وار ہیں، اس کی غزلوں کی تعداد ۲۱۲ ہے اور جملہ اشعار ۲۲۵۴ ہوتے ہیں۔

نزاکت حسن و دولت ہے منگے جا ہی کرن سکنا
نوایوں نو جوانی سوں سکل شاہی کوں کر سکنا

مجنوں سو میرا نام ہے وحشی توں مج سوں رام ہیں
اس ہکوا لکہہ مجھ دام ہیں ہک ییچ میں گل باہیا

میرے بت کوں پوچتے سارے بُتاں   سبھی رمالاں کہو اس کا جواب

وفا منگتے ہمیں بے عقل شہر حسن میں اب
وفا کا باس نہیں اس شہر میں کیسا ہے یہ بدمست

خال ہندو کا کر مجھ کیا ہے بُت پرست
سب خیالاں اپنے سکٹ کرتا ہے میرا خیال بہت

غیر حب لیوے تمن نام ہووے میرا دہن تلخ
شکر و شہد پلا دیں تو نجاوے دو سخن تلخ

زاہد کی باتاں مکر کیاں ہے مے پلا ساقی   کہ ایک دو پیالے پیکر ہوں سوار نیہ کا سمند

سمند ناز کا گرد سرمہ کرد   کہ انکھیاں دیکھتے سو ہوئے قرار

دیا استاد منج تعلیم کچھ ہور   ہمیں کچھ دیکھ کر باندھے ہیں زنار
درد جانے حکیم خوب دانا   ہمارا درد کیا بوجھیں گے اغیار

معانی آس تمیں کیا بوجھیں اے میخو　　تمہاری بزم میں کرتا ہے شمع بات مجاز

قطب دل کے صحیفے پر اول ترا لکھیا صورت
کیا منج پر کرم آخر دیا سوں دوا دل نقاش

دیکھے نہیں کوئی نیں تج توں سب نیں تھے ہے چھپا
تیرے سوہنے کے حسن کا دستار ہے سنسار نقش

جہاں توں واں ہوں میں پیارے منج کیا کام ہے کس سوں
نہ بت خانہ کا منج پروانہ مسجد کا خبر منج کوں
جنّت ہور دوزخ ہور اعراف کچ نیں ہے میرے لیکھے
جدھر توں واں مرا جنّت جدھر نیں واں سقر منجکوں
جنّت کوں ہور دوزخ کوں سو مسجد بُت خانہ کیا
کسے نا جانوں میں معلوم نیں کوئی تج بغیر منجکوں

خواجہ حافظ کی غزل کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

یوسف گم سو پھر آ گا اب بہ کنعاں غم نہ کھا　　گھر ترا امید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا
اے ہسیانیہ دکھ دکھیا سو خوب ہوگا حال تجہ　　من کا پنتا ہوے گا پھر آکہ جاناں غم نہ کھا
جم بہار عمر تج ہے پھر کہ آگا باغ میں　　چتر پھل کا کھاک زنگیں مرغ خوشخواں غم نہ کھا
ہاں تو نا امید نا ہو کہ نہ جانے سر غیب　　کیا اچھیگا پردہ او جھل کھیل تپلیاں غم نہ کھا
او جنگل میں شوق سوں سب کبھو خاطر رکھ قدم　　تج اگر بولیں چبیں کانٹے مغیلاں غم نہ کھا

قطب شہ اس نج فکر و خلوت دین منے
تا اچھے ورت دعا و درس قرآں غم نہ کھا[1]

---

[1] یہ کلام کلیات قطب شاہ مطبوعہ سے لیا گیا ہے۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا — پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہتے ہیں پیا بن صبوری کروں — کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے — کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا

قطب شاہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

رکھ ایک ہے پر ئیک کد من لاکھ چمن ہے
لکھ جوت ہے ہر ٹھار وئے ئیک رتن ہے

سمدور ہے ایک ہور ندیاں میں سو ہزار اں
باتاں سو کروڑاں ہیں ولے ئیک رسن ہے

کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار ہے بھر لور
دیکھیں کو سکت کاں اسے ئیک نین ہے

منج عشق گری آگ کا ایک چنگی ہے سورج
اس آگ کے شعلہ کا دھواں سات گگن ہے

اس کے سو پرت نپت میں چل سیں سوں قطبا
تجکوں سوں مددگار حسینؓ ہور حسنؓ ہے

گرجا ہے میگہ سر سنتے تازہ ہوا ہے بستان
پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار داستان

اے خوش خبر صبا توں لے جا جوان تداں کن
چمناں کی آرزو میں بیٹھے ہیں مے پرستاں

او نونہال پھولاں ہے جام خوئے سو بادہ
نرگس اپس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں

مکھ نور پر دسے یوں مج خط عنبرین رو
جوں سورا پر ہے بادل ریحان سوں گلستاں

بے ہوش میرے دل کوں مٹھے ایدھر جلائے
گلزار ہے عجب او دو لعل شکرستاں

ایدھر مج عشق کے گدا کوں اورنگ شاہی دیتا
سب عاشقاں منج انگھے ہیں طفل جوں دلبستاں

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ
بھرے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

اب مست اچھے دایم ہمیں مست اچھنے کا ہنگام ہے
ساقی صراحی نقل ہور پیالے سوہنا کام ہے

عاشق ازل تھے ہیں ہمیں سرمست ازل تے ہیں ہمیں
نا آج کل تھے ہیں ہمیں زاھد کو نیں یہ نام ہے

روزید کے عید آنے میں ٹک شیر خورماں کھانے ہیں
صوفی چلے میخانے میں تسبیح ہات اب جام ہے

منگتاں ہے بدمستاں کنے مدباج میں سکتا رہے
مے خانہ کے کوچے منے تو متقی بدنام ہے

ساقی پیالا منج پلا پیالا پینے ہوتا ولا
اس پیو کوں تو لیا کر ملا جس پیو تھے مج آرام ہے

قطبا نبی کے آدھار تھے رحمت ہے نت کرتار تھے
تو تج علی کے پیار تھے بلبل نوا انعام ہے

آج شہ جیں چلیا شرق نگر تھے شتاب
ڈھال فلک کی اچا دستہ عالی جناب

باند خنجر کرن کی زریں فرنگ ہاتھ لے
صبح کے وقت ائیا پک دو پیالی شراب

چرک فلک فیل مست سوں مکھ لال کر
گرم ہو جلنے لگیا دن لے کٹک بے حساب

ذرّے ہو فراش سب چلیے شہ چیں آگے
دیتے سراچے شفق لار سے زرین طناب

قوس و قزح ہات لے جوڑ کر تیر استوا
سور کشش جو کیا نسر، کہ اڑا اے غراب

سو ہے غلط یوں نہیں ہے قضیا یوں تو سن
فتح و ظفر چند کا چرخ دیا اس جواب

شاہ ختن سن چلیا غرب نگر تھے لے فوج
تنکے تناں ایں رنگ جیسے رہے مشکناب

کش کہ چلیا ہات قوس اسے اسمان کی
سورِ انارن کوں تیں جوڑیا ستارے شباب

استنے میں دیتار ہے صلح خدا تن منیں
ہے تمیں نس دن کی شہ نا لڑو تم اتنے باب

میں کیا تم دو کوں شاہ یک سرج ہور یک ماہ
دھرتی تمیں دونو جاہ دونو کون سر پر ہے داب

دن کو سرج نس کو چند تدبھی کیا ہے وہاب
چاند کوں کنیا مجی سور کون کیتا ذباب

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے مرثیوں، نوحے اور سلام کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے، اس کے متعلق مرثیہ گوئی کے فصل میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

تبصرہ

سلطان کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوگا کہ اس نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ وغیرہ اس کے تخیل کے بہترین نمونہ ہیں۔ خیالات میں بلندی ہے، تشبیہ اور استعارے نادر اور وصف نگاری کا اچھا نمونہ

لہ سلطان محمد قلی کا کلام کتب خانہ سالار جنگ کے مطبوعہ کلیات اور مولانا عبدالحق کے شائع کردہ مضمون رسالہ اُردو بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لیا گیا ہے۔

پیش کیا ہے۔ مناظرِ قدرت کی جو عکاسی کی ہے وہ لاجواب ہے۔ رسم ورواج، عید، نوروز، بسنت اور مرگ وغیرہ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان میں منظر کشی اور تخیل کی بلندی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کی غزلیں تغزّل سے مملو ہیں۔ عشق اور عاشقی کی روئداد کو نہایت عریاں الفاظ میں پیش کیا ہے، وہ اس امر کو بیان کرتا ہے کہ اس نے اپنے دردِ دل کا اظہار اشعار میں کیا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو اس میں سادگی، صفائی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ اس کے کلام میں لوچ ہے، شگفتگی ہے، کلام پختہ ہے۔

یوں تو ہر شاعر کے کلام میں تصوّف کے اشعار ملتے ہیں مگر خصوصیت سے محمد قلی کا کلام تصوّف سے مملو ہے، اس نے خواجہ حافظ کے کلام کے طرز پر اپنی غزلوں میں تصوّف اور عرفان کے مضمون باندھے ہیں، خواجہ صاحب کی بعض فارسی غزلوں کا دکھنی غزلوں میں کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

سلطان محمد قلی میں کئی باتیں جمع ہوگئی تھیں، وہ ایک عاشق مزاج شخص تھا۔ نوجوانی سے عیش و عشرت کی زندگی میسر آئی۔ اس میں قوت مشاہدہ طبیعت کی موزونی اور تخیل کی بلندی فطری طور پر ودیعت ہوئی تھی یہی وہ چیزیں ہیں جن کی وجہ سے اس کی شاعری کمالِ عروج پر پہونچ گئی اور پھر کلام کی سادگی، شیرینی اور حلاوت نے اس کو مقبول بنا دیا۔ ایک طرف وہ عشق اور عاشقی کے مضامین نہایت عریاں طور پر بیان کرتا ہے تو دوسری طرف حمد و نعت، منقبت کی ترجمانی میں جو کمال دکھایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس کی معاملہ بندی دیکھنے کے بعد خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ ایسا رند مشرب اور بے باک شاعر عقیدت سے مملو مذہبی جوش سے لبریز مذہبی نظمیں لکھ سکے گا۔ بہرحال یہ دعویٰ بالکل صحیح ہوگا کہ محمد قلی اُردو کا ایک زبردست اور بلند پایہ شاعر تھا۔

ظل اللہ

سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا و داماد اور جانشین سلطان محمد بھی شاعر تھا۔ ظل اللہ اس کا تخلص تھا۔ ۱۰۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دیوان میں مثنویاں، قصائد، غزلیات سب کچھ شامل تھے، مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک ظل اللہ کا کلیات ہمدست نہیں ہوا ہے۔ عبدالجبار خاں نے اپنے تذکرۂ شعراء میں جو نمونہ کلام دیا ہے وہ دراصل سلطان محمد قلی کا ہی کلام ہے، اسی وجہ سے دکن میں اردو کی سابقہ اشاعتوں میں ظل اللہ کے نام سے جو کلام پیش کیا گیا اس کو اب خارج کر دیا گیا ہے۔ البتہ ظل اللہ نے اپنے خسر کے کلام کے متعلق جو خیالات نظم میں ظاہر کیے ہیں۔ ان کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

سو کچھ شاعری بیچ شہ دھر کمال | بچن کہہ کے موتیاں نمن صدف ڈھال
کہے نیں گیئں شعر میں وصف اپس | جو رچہ شعر کے فن میں ریتا مرس
جو بھی کوئی اچھے شاعراں دھات وہ | تو بن وصف اپس کے نہ ہے سات وہ
رہیا جائے نا شاعراں من منیں | بتاکے وصف شعر کے فن منیں
جو خاصا ہے یو شاعراں کا ہر ئیک | نہ ایں بن کہے وصف بتیاں کتیک
مگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار | دھرے وصف آپس سوں کہن بہت عار

دنا شعر کہہ بیت میں ئیک بات | کہے نیں لکھیں اپنے وصف سات
جو مقطع میں ہر ئیک اپس شعر کے | لیے بن سو حضرت علیؓ ناؤں اپنے
نہ کرتے تھے ہرگز سو ختم کلام | بغیر از علیؓ کا مئے باج نامؐ

(۷) عبداللہ قطب شاہ

سلطان محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا۔ یہ عبداللہ تخلص کرتا تھا۔ ۱۰۲۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا۔ گول کنڈہ میں مدفون ہے۔

سلطان عبداللہ اپنے نانا سلطان محمد قلی کے نقشِ قدم پر گامزن تھا۔ اسی کی طرح شاعری، موسیقی کا قدردان تھا۔ شاعروں اور موسیقی دانوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ سلطان کی طبیعت رنگین تھی، عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ صاحب علم بھی تھا۔ میر قطب الدین جو مولانا نعمت اللہ کے رشتہ دار تھے، جیسے صاحب ذوق بزرگ نے اس کو تعلیم دی تھی۔ علم دوست تھا اور علماء و فضلاء اور شعراء کی قدردانی میں ممتاز تھا۔ اس کے دربار میں عرب اور عجم کے علماء اور اہلِ فن جمع رہتے تھے۔ برہان قاطع جیسی مشہور لغت اسی کے عہد میں تالیف ہوئی ہے۔

سلطان کو فارسی اور اردو (دکھنی) شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، دونوں زبانوں کے دیوان مرتب کیے تھے۔ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس کے کلیات کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو اب شائع ہوگیا ہے۔

ہر صنفِ سخن میں اس نے طبع آزمائی کی ہے، قصیدہ، مثنوی، غزل، مرثیہ اس کی یادگار

لہ سلطان محمد قلی قطب شاہ مولف ڈاکٹر زور صفحہ ۲۱۸

ہیں۔ سلطان کے کلام میں لفظی شان وشوکت، زبان کی سلاست خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،
سلطان محمد قلی سے اس کی زبان زیادہ صاف ہوگئی ہے، کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

لکھ فیض سوں پھر آیا دن دین محمدؐ کا — آفاق صفا پایا دن دین محمدؐ کا

یو عید ہمن ساجے نصرت کے بجیں باجے — ہے جگ کے نبی راجے دن دین محمدؐ کا

گلشن میں شریعت کے پھل پھیلے طریقت کے — پرمل سوں حقیقت کے دن دین محمدؐ کا

روشن ہوئے اسماناں جھمکائے رتن کھاناں — خط لیوائے مسلماناں دن دین محمدؐ کا

جو بارہ اماماں ہیں لکھ انپہ سلاماں ہیں — ہم ان کے غلاماں ہیں دن دین محمدؐ کا

صدقے نبی عبداللہ شہ کوں ہے مدد اللہ
پنج تن ہیں گوا باللہ دن دین محمدؐ کا

منجے نوروز تھے اگلا صفا تج مکھ جدا دیتا
(سے زیادہ)
صفا جیسا جو منگتا تھا سو ویسا منج خدا دیتا

ترا قد پھول کی ڈالی نمن کھل مکمکانی تھے
خوشی پا جیو کا بلبل سو غم کوں سب ودا دیتا
(وداع)

بغیر ساقی، بغیر پیالا، بغیر پیرت، بغیر پیارے
دنیا کچ نیں کہ منج قلقل صراحی کا صدا دیتا

حمل کا برج مج دل ہے کہ تیرے عشق کا سورج
کیا جیوں آکے منزل سو منجے لکھ فائدا دیتا

انند ہور ذوق منج تیری طرف تھے لے ہے کہ اجنوں
فلک ایراں تھے ہاتف اپے ہو منج ندا دیتا

محبت ہور وفا تیرے کوں دیکھیا بار ہا ازما
اسی پر منج اسی از انتہا تا ابتدا دیتا

(حوصلہ)
ادایاں سب کی تو دیکھیا ولیکن یو ادا تیرا
عجب کچ ہے خدا تج کوں عجب کچ یوں ادا دیتا

منجے نوروز ہور شبرات ہر دن ہر رین ہے کر
(سے ساتھ)
دو تیرا زلف ہور چہرہ گواہی آسدا دیتا

مسیحا اس زمانے کا کہاؤں تو عجب کیا ہے
کہ حق منج عمر کی بیلا ابد لگ خوش بدا دیتا

چھتر ہو اس اماماں کا رہیا ہے چھانو منج سر پر
امت کوں جس اماماں کا امامت اقتدار دیتا

نبی کے صدقے عبداللہ سدا توں شکر کر اس کا
جکوئی تج کوں نوازیا ہور شاہی کا بدا دیتا

تو پیاری عشق بھی تیرا ہے پیارا — لگیا ہے بھوت تج سوں دل ہمارا
سکھی آ مل کہ تل تل ذوق کر لیں — دنیا میں کوئی نیں آیا دو بارا
سکھی پرکھ بھی سمج توں دل میں اپنے — کتا منت کرے عاشق بچارا
اچھے ہیں پھُل (صاف) یاقوت کے کھان (کان) — جہاں توں پان کھا سٹتی غرارا
میں بوکھی سوں سہتا اس پہ بہول ہے — کہ یک دنتی ہتی کا ہے کنبھارا
تجے چاند ہور تارے سوں غرض کیا — تو آپیچ (ایک دانت ہاتھی) چاند ہے آپیچ تارا

نبیؐ کے صدقے عبداللہ کا دل
پنکھی ہے تل ترا اس کوں ہے چارا

بسنت آیا پھل (گھنا) یا پھول (گل) لالا (لالہ) — سکھی لیا اب صراحی ہور پیالا
چمن میں نے پھلیا ہے پھول رنگ رنگ — نپٹ نازک ایکس تے ایک آلا (ایک سے ایک)
گلابی ہور سادی ہور اُجلا — ہریا ہور لال پیلا ہور کالا
لڑاں جھاڑاں کی پیڑاں میاتے بھرتیاں — جھڑی پکڑے ہیں پانی کا جوالا
ہوا مد پینے کا آیا ہے پیارے — تو مد پینے کو من کرتا الالا (ویلولا)
سے لیا نے تیرے جو نیاں کوں — نسا منج تے سنے تے میں اتالا
زلف سے تیری تاراں سیتی بن کر — سنے من میں پرد لیو جھین جالا

نبیؐ کے صدقے عبداللہ تج کوں
لیا سُکھ عشق کا چھاتی سوں لالا

دل کی انکھاں میں جکوئی تج عشق کا انجن کیا
غیب تے پانچ دو سب رنج کوں بھنجن کیا

مکھ تجے درپن میں تل تل دیکھنے عادت ہے کر
نین کوں میں عین تج دیدار کا درپن کیا

رات ساری زلف تیرا باد سوں مل ایک ہو
خوش حکومت منج اپر منگتا ہتوں اپنا من کیا

منج لکھیں اے سرو تیرا چھانو یوں دیتا ہے آج
جیوں ھما اقبال کا منج گھر میں آسکن کیا

عاشقاں سیں کئی دوئی کا نا لویوے نہ ہتوں
تج سوں مل دا ہن اپس کوں ایک دل یک تن کیا

شاہ عبداللہ نبی صدقے تری توفیق تھے
خضر ہو گشت کوں تمام امریت کار بجن کیا

یوں دل کشا عشرت محل مطبوع اوتارا ہوا
جوتی زمین کی پیٹ جیوں مشتری تارا ہوا

ہر طاق یاں خوش طرح کا دستا دریچا فرح کا
عاجز ہوا س کی شرح کا جیراں سنسارا ہوا

انکھیاں سوں چندر سور کے دیکھ آسراتاں دور کے
عاشق ہیں اس کے نور کے کیا خوب یوتھارا ہوا

دیویں صفا دیوار سوں لک نقش تھارے تھا سو
خوش ماں یاں عطار سو فردوس کا بارا ہوا

نازک اچنبا بے بدل لکس بھریا ایسا محل
باندیا نہ کوئی آخر اول جمشید یادارا ہوا

جیوں پھول تازا بن منے جیوں پوتلی بوجن منے
تیوں آج اس دکھن منے یو محل اتم سارا ہوا

صدقے نبیؐ کے یا اماں اس محل میانے ہر زماں
جم عبداللہ شہ ترکماں ہوگی گہنا را ہوا

اے پری پیکر ترا مُکھ آفتاب ۔ دیکھتا ہوں توں رہے نا منج میں تاب
یاد ایسا تا دکھاتا ہے ہنوز ۔ دیکھ تری زلف کا دو پیچ و تاب
میں تجے بلقیس کوں تو کیا عجب ۔ ساچ ہے بلقیس کا تج کوں خطاب
قند ہونا بات گلتا ہے اجہوں ۔ دے نہ سک ترے ہے لب کا جواب
تجہ بہشتی حور کوں دیکھیا ہے جن ۔ جم حرام اس پر ہے دوزخ کا عذاب
شاہ عبداللہ نبیؐ صدقے تجھے
خوب رویاں میں کیا ہے انتخاب۔

گفتم کہ اے پری توں ہے فتنہ زمانا
گفتا کہ راست گفتی اے گھن بھرے سجانا
گفتم کہ در جہاں یا لیلیٰ ہو آئی ہے توں
گفتا کہ من چو مجنوں پائی ہوں تجہ دوانا
گفتم کہ خال و زلفت کیا ہے سو بول منج کوں
گفتا کہ زلف دام است ہور خال ہے سو دانا
گفتم کہ در ہوایت پھرتا ہوں ذرہ ہو میں
گفتا کہ در دل توکی ہوں ازل سے خانا
گفتم کہ خانہ تو کاں ہے نشاں دے منج
گفتا کہ ذرّہ پر در سورج ہوں توانا
گفتم کہ در ذہانت امرت کا ہے چشمہ
گفتا کہ خضر ہو توں اس چشمے پاس دھانا
گفتم کہ کیست این جا تیرا پران پیارا
گفتا کہ شاہ عبداللہ ہے مرا پیارا

اول امید میری دل میں ہے یہی برسات
جونت رفیق ہو توفیق اچھی منج سات
وہ اجا امید یہی ہے جو تندرستی سوں
منج اس جہاں میں خدا دیوے بے شمار حیات

آج زہی بخت جوانی سعادت کی رات
چاند سوں بری ملا غم تھی منج دے نجات
روپ میرے لال کا آئے نہ تحریر میں
چاند عطارد اگر ہوویں قلم ہور دوات
اس کے قداں کے ستم کرتے سرد کوں خجل
باد اڑاتا پھرے چمن چمن پات پات
صدقے نبیؐ کے میرے دل میں رہیا ہے مدام
جیو ہر شاہ عبداللہ خسرو عالی صفات

رنگ بھریا منج گھر میں آج آیا بسنت
غیب تھے تازہ طرب لیایا بسنت
جیوں ابھال یک دھر بتھے چھا آفاق پر
رنگ کا برسات برسایا بسنت
تازگی سوں پھول نمنے کھل تمام
ہر طرف تھے آج مہکایا بسنت
رنگ بھریاں کی بزم کوں بھو رنگ سوں
کر بہارستان دکھلایا بسنت
لا صراحی کو پیالی سوں گلے
سرخوشی کا کام فرمایا بسنت
عاشقاں کو سر تھے معشوقاں کے آج
عشق کے جالے میں الجھایا بسنت
لکھ دعا آج منج لکھ ذوق سوں
تخت پر عشرت کے بسلایا بسنت
کھول شہپر جیوں ہما اقبال کا
چھا نو میرے سیس پر چھایا بسنت
مصطفےٰ ہور مرتضیٰ کے صدقے آج
شاہ عبداللہ کو بھایا بسنت[1]

---

[1] سلطان عبداللہ کا کلام اس کے کلیات سے لیا گیا ہے۔

سلطان عبداللہ کے مرثیہ کا نمونہ اس کے مقام پر درج ہے۔

(۸) غواصی

اس عہد کا دوسرا مشہور شاعر غواصیؔ ہے۔ سلطان محمد قطب شاہ کے زمانے میں اس کی شاعری چمکی اور سلطان عبداللہ کے عہد میں اس کو شاہی تقرب حاصل ہوا۔ اور بڑی عزت و شوکت حاصل ہوئی۔ شاہی سفیر کی حیثیت سے بیجا پور روانہ کیا گیا۔

اس کی دو مثنویاں مشہور تھیں۔ پہلی سیف الملک و بدیع الجمال اور دوسری طوطی نامہ مثنوی سیف الملک و بدیع الجمال کی تصنیف ۱۰۳۵ھ میں ہوئی ہے اس کو اس نے اسی نام کے فارسی قصہ سے دکھنی نظم میں منظوم کیا ہے۔ دوسری مثنوی طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۴۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

غواصیؔ نے غزل اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ اس کا کلیات بھی دستیاب ہوگیا ہے۔ اس کی ایک اور مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو چندا اور لورک ہے۔ یہ بھی فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اس کی تصنیف ۱۰۳۵ھ کے پہلے ہوئی ہوگی۔

سیف الملک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غواصیؔ کس طرح مغرور ہے۔ اظہارِ خود ستائی کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کو ہم پایہ خیال نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ کسی خاص شاعر کا نام تو نہیں لیتا مگر کہتا ہے کہ شاعری کا تمام انحصار اسی کی ایک ذاتِ واحد سے وابستہ ہے۔ دوسری طوطی نامہ سے پیری کی فروتنی اور انکساری ظاہر ہوتی ہے۔ اپنے دنیا دار ہونے پر افسوس کا اظہار کرتا ہے۔

اس کے کلام میں ہندی الفاظ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کلام سادہ اور تصنّع سے پاک ہے بیان کی دلکشی اور قادر الکلامی اس کی مثنویوں کے خاص خدوخال ہیں۔

دونوں مثنویوں کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ انجمنِ ترقی اُردو اور آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر اُردو نظام کالج کے پاس بھی اس کے نسخے پائے جاتے ہیں اور اب یہ دونوں مثنویاں شائع ہوگئی ہیں۔ ان مثنویوں کی تفصیلات ہماری دوسری تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں موجود ہے۔

غواصیؔ کی تیسری مثنوی چندا اور لورک جس کا دوسرا نام مینا ستونتی بھی ہے، ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ اس مثنوی کے چار نسخے حیدرآباد کی سنٹرل اسٹیٹ لائبریری میں اور چار نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں، ادارہ ادبیات اُردو کی جانب سے اس کا کلیات بھی شائع ہوگیا ہے، اس میں ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی شامل ہے۔

بعض اصحاب نے غواصی کو بہار الدین کے نام سے موسوم کیا ہے، مگر ہنوز اس کی توثیق نہیں ہوئی ہے۔

افسوس ہے کہ وجہی کی طرح غواصی کا سنہ انتقال بھی معلوم نہیں ہوتا، مگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۰۶۰ھ کے پہلے اس کا انتقال ہو چکا تھا۔

غواصی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۱) سیف الملوک و بدیع الجمال۔

حمد

الٰہی جگت کا الٰہی سو توں	کرن ہار جم بادشاہی سو توں
تیرے حکم تل نوکر آسمان کے	رعیت ملک تیری فرمان کے
کہ حضرت سلیمان کے وقت پر	اتھا مصر میں راج یک بخت ور
نول عاصم اس راج کا نیک ناؤں	شہاں میں اتھا اس شرف تھاؤں تھاؤں
اور دانا و عادل جواں مرد سہتے	مسلماں خدا ترس با درد تھا
بندا اس کے گھر کا سو اقبال تھا	لباسو اسے کوٹھڑیاں مال تھا

ہوئے جمع جنگی ہزاراں تمام	قدی ہور خونخوار میراں تمام
یک یک جان یک کوہ یا برج جیوں	لے ہاتاں میں فتنے بھرے گرز جیوں
غضب ناک ہو جیوں انگے دل ہوئے	کلیجے پہاڑ ان کے پھوٹ جل ہوئے
سلح پوش پولاد کے کوٹ جیوں	پُر آشوب سمدور کی لوٹ جیوں
اوتائے ہو آفت بھرے عزم سوں	کھڑے آکے میدان میں رزم سوں
بھیا باؤ جیوں قہر کا شور سات	شلطت کی اگن سلگ اٹھی زور سات
کیے قصد لڑنے کو دو دھیر سہتے	زمانہ ہوا تل اوپر سیر سہتے
اوٹھیا غل جدھر کا ادھر مار مار	قیامت زمیں پر ہوا آشکار
جھلک دیک بجلیاں سی تروار کی	اوڑی فاختے سخت سینسار کی
سٹے دھرت پر یوں منڈیاں کاٹ کاٹ	سوکس کو سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ
جو دریا لہو کا اُبلنے لگیا	گگن اس پہ کشتی ہو چلنے لگیا

کہ سلطان عبداللہ انصاف کر / میرے جوہراں پر تے دل صاف کر
دلوے داد میرا ہو سٹ مان پاؤں / اپس دور تی ناگریباں پاؤں
کہ یو شاہ میرا خریدار ہووے / تو تازہ میرا طبع گلزار ہووے
کہ غمگین ہوں میں سخت سنسیار تے / دہروں دغدغے لاکہ اس آزار تے
اگرچہ ہوں شہ کے بندیاں میں حقیر / دلے شعر کے فن میں ہوں بے نظیر
کہ موں کھول یوں میں کہوں کیا اپین / گوا ہے دے یوں شعرا ہیں ناچھیں
بہرحال یوں نظم الہام سوں / کیا میں نول شاہ کے نام سوں
برس یک ہزار اور پنج تیس میں / کیا نظم یو ختم دل تیس میں[1]

طوطی نامہ

رتن خاص دریائے لولاک کا / جھلک لامکاں نور افلاک کا
محمدؐ نبی سید المرسلیں / سدا روشن اوس تے ہے دنیا و دیں

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں / ثریا کے تارک پر اس کا ہے چھاؤں
کہیں قدسیاں صاحبِ صدر اسے / کہ ہر شب سو ہے جیوں کے شب قدر اسے

سینا ہوں جو تھا کوئی یک لشکری / اسے ایک عورت تھی جیوں شہ پری
مکھ اس نار کا چودواں چاند تھا / دل دو لشکری نے اسوں باندھ تھا
روگ گن میں بے مثل ناری تھی وہ / وفا مورست میں کہ ساری تھی وہ
دلے او سپاہی زمانے پہ جا / اچھے اس کی رک دیکھ میں جابجا
دیوانہ ہو گھر میں تے نکلے نہ بھار / گذرنے لگی مفلسی بے شمار

سنیا تھا جو سوداگر اک بے نظیر / اتھا اس کنے ایک واداں گنیر
وفادار خوش فام شیریں کلام / ہنر غیب کی تھا سبج میں تمام

---

[1] سمت الملک وبدیع الجمال۔

کرے گھر کی سب دید بانی وہی دیوے نیک و بد کی نشانی وہی
جیون ایک دن او سوداگر نام دار چلیا کرنے سوداگری ایک ٹھار
لگی دیس لی بیک پایا نہ آن ہتی جان اس کی عورت لگی تلملاں
جواں اسکی باڑی میں تھا ایک خوب لگائی چھپا عشق اسے دیک خوب[1]

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا کہ غواصی کا کلیات بھی اب ہمدست ہوگیا ہے اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے[2]۔ اس میں قصائد، غزلیات وغیرہ ہیں۔ غواصی کے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر تھا۔ قصائد کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

شکر خدا جو ذوق پہ ہے ورق ٹھار من ٹھار آج
یعنی ہوا ہے ہر طرف ابر گوھر بار آج

نادر بہارستان کا زرگر ہزاروں صنع سوں
کتیا جرت گلزار کی جھاراں کوں خوش سنگھار آج

کسوت ہری کر دھر ترے شبنم کے موتیاں میں ہو غرق
دیتی ہے جلوہ ہر گھڑی جیوں گنبد دوار آج

صحرا ہو دریا نور کا موجاں پہ موجاں مار کر
بخشے چندر ہور سور کوں سکہ ہور ضعار اپار آج

عالم معطر ہوئے کر کیوں رات دن مہکائے نا
کھولیا یوں ہر پھول نے صد نافہ تار تار آج

عارف ہو بیج انلاص کا دل کی زمیں میں پرے
جو جھار تج مقصود کا دو جگ میں سیارے بار آج

گلزار تیرے عشق کا کملائے کبھونا بتو کدھن
انکھیاں تے اپنی جیوں بدل برسا انجھو کی دھار آج

مجرا ترے تن کا جو توں منگتا ہے نورانی اچھے
روشن ہو دیوے کی نمن دکھلا ترا جھلکار آج

---

[1] طوطی نامہ
[2] نمبر ۱۰۳۷ دیوان اردو

ملک ابد کی خسروی پاکہ جو تیرا ہے عزم
توفیق کر تیزی پہ چڑ ہمت کی لے تروار آج

بارہ اماماں کا محب سچل اگر توں ہوئے تو
ثابت رکہ اپنی صدق ہور ایمان ٹھار ٹھار آج

سلطان عبداللہ جو شیر خدا کا شیر ہے
مشہور اس کی داب کا دو جگ میں ... آج

اے رنگ رتیاں کے رنگ رتی سائیں بے مثال
اے پیو جہاں کے جیو کے لے لال جگ آجال

جو قد ترا نہال ہے خوبی کے باغ کا
تر لوگ ہوئیں دیک اسے ہر گھڑی نہال

پتلی ہو منج انکھیاں میں دیوے جلوہ صبح و شام
تج گال کا جو تال ہے آرائش جمال

حیران یوں کیا ہے ترا حسن عقل کوں
جو بات ہو پاؤں ہلانے میں اس مجال

کیوں اس کے جیوں کو اچھے آرام ہور قرار
باراں ہو جو لگیا ہے تری زلف کے دنبال

گہہ تج وصال منج کوں کرے خوش تو کیا عجب
گہہ تج فراق منج کوں پتاوے تو کیا ملال

مکھ غیر تے پھرا کہ ترے سات باند دل
کرتا ہوں تج کوں یاد میں یکچت ہوں ماہ و سال

جب نانو نالے تیرا پیاسا ہوں پیوں تو
پانی حرام منج کوں دسے اے ملک خصال

جب تج ثنا و مدح کرے میں فکر سوں
خونِ جگر جو کھاؤں تو ہے منج اپر حلال

جیتا ہوں لگ غواصی ہو ہرگز پچھیں نہ جاؤں
کرنے نثار تج پہ جواہر نفیس ڈھال

مزید کئی اشعار میں اب غزلیات کا نمونہ ملاحظہ ہوسہ

اے جو تج تے حیات میری ہے — تج ادھر پر برات میری ہے
جاگنے کوں منگے تو منج سوں جاگ — آج کی رات رات میری ہے
یاد تج زلف کا جو کھبرتا ہوں — نات آج اسکے ہات میری ہے
کیوں نہ دیوانگی کوں دیووں سر — عین مجنوں کی ذات میری ہے
عشق تے دھات دھات ہوتا ہوں — طرفہ رنگ آج دھات میری ہے
ذوق ہے تج تو بات میری سُن — جب نا بات بات میری ہے

سیوں گا تج کوں نت غواصی ہو
جو تلگ یو حیات میری ہے

جو منج لگ آگے وہ صاحب جمال جاتی ہے
تو لاک جنس کے غمزیاں سوں جال جاتی ہے
کتیاں کے خوں کریں گے کی نیں اس کے آج
کہ وہ تو سدپی متی ہو نڈھال جاتی ہے
قبول صورت اپے سب بھتے ہے کسکو اس بھتے
نہ سُن کے بات کوں میری اُچھال جاتی ہے
وہ دل سوں خوب مرا مدعا سمج کر بی
نہ سمجے تیو پچ ستم آج ٹال جاتی ہے
غواصیا بہت اپس کوں تج یاد کرتا ہے
بجے سمبلا کے وہ صاحب جمال جاتی ہے

عشق کی آگ میں جل کر راکھ ہونا — عشق بازی میں چاک چاک ہونا
خاک ہونا تو سچ ہے آخر کو — خاک نا ہوے لگ پنج خاک ہونا

اس سجن کی وصال کے خاطر آرزو دل میں لاک لاک ہونا

دل کے انکھیاں میں لانے تیں سر اس کی پلکاں منج تلاک ہونا

ہے غواصی یو عاشقانہ غزل

یو غزل سنے درد ناک ہونا

جس تل میں جایو دل میرا تج گال پر کا تل ہوا

اس تل کی دولت تے منجے حاصل صفا تلتل ہوا

دلدار یک دل کا منجے ملتا نہیں گر آج لک

دو دل ہوا تھا سو توں لیا تج سات مل یک دل ہوا

تیرا فراق ہے جس کوئی تلتل اسے تلنے بدل

گرم انجواں سو تیل ہور برھا سو جیوں پائل ہوا

پلا مدست اے ساقی منج عادت ہے پینے کا

ہو سر خوش دور یک دیر تے کرونگا رنگ سینے کا

مرا جیو پیو ہے اس جیو کی جیوں سیوں بسروں کیدں

کدھیں بسروں تو مر جاؤں بنا دوں ذوق جینے کا

ہیں جو مجنوں کے نمنی آپسیں بیابانی کیا عشق میں دانا ہے چپ لوگاں میں نادانی کیا

عاشق کوں اس ہوا میں مد رنگ لال ہونا

معشوق خوب عالی صاحب جمال ہونا

منج تیں کے چمن میں لے تازگی سے دل نے

نازاں کے پھول کی وہ نازک ڈال ہونا

ہے ترا زلف اے سمن اندام دام دیکتا تج کوں تو ہوتا رام رام

سرلیا شوریدگی بلبل کے سار　　رُخ ترا بس خوب اے گلفام فام

زمانے نے آج کی مجنوں ہوا پیدا　　ہوا مشہور غواصی دکھن میں

اے دل آرام میں جدھر جادوں　　دل کو تریج پاس دھر جادوں

دنیا کے طمطراق ستے در مندگی بھلی　　یعنی زمیں کے سار سرافگندگی بھلی
منگتا ہے سرخروئی ابدکی تو اے غواص　　شرمندا اچھ آج کی شرمندگی بھلی

خدا جو سب تے بڑا ہے ہور اس کی ذات بڑی
دیا ہے دولت ازل سے تیرے سنگات بڑی

مثنوی "چندا دلورک" کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

کہوں حمد میں پاک رحمان کا　　کہ او حمد زیور ہے ایمان کا
ثنا حمد اس کوں سرادار ہے　　کہ دو جگ کوں پیدا کرنہار ہے

یہ تھی ایک حکایت عجب خوب تر　　رسالہ مرا خوب شہد و شکر
کہ یک شہر کا ایک تھا بادشاہ　　جہانگیر عالم میں تھا شہنشاہ
بڑا مہرباں عدل او شہریار　　نیکو نام اوس کا سو یالا کنور
وزیراں کہتے خوب حسن کمال　　ملیکا ہزاروں سو تھے محل محال
اوسیں کی ولایت بہوت بشر تھی　　منیں خلق داھان کی دنیا دار تھی
اتھی اوس کی بیٹی تھی صاحب جمال　　اتھا نام اوسکا سو چندا کمال

یو سن بات لورک کہا شا پری　　پکڑ ہات میرا کرم توں کری
توں چندا میں لورک ہوں نوکر ترا　　بلا رو کروں تجہ اوپر جیو میرا
کہی دونوں مل اختیاری یو کہت　　لیے مال ہور یہاں تے تکلی ادیت

اسے چندکوں چوری سے باہر ہوا　　سواد غلبل جگ میں ظاہر ہوا

غواصی یو کرتا کرم کی نظر　　دعا حق سوں منگتا ہے حق او پر
بڑے فام واروں میں ہوں کم فام　　کیا ہوں یو نادانگی سوں تمام
کرم کی نظر رکھ کم و بیش سوں　　کرو پرورش اوس دل وجان سوں
ہزاروں درود اور ہزاروں سلام　　بحق محمد علیہ السلام[1]

غواصی شاعری میں اپنا کسی کو مدّمقابل نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے آپ کو فن شعر میں بہت بلند مرتبہ خیال کرتا ہے۔ غواصی کے کلام کو دیکھنے سے اس کے کہنہ مشق شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ مثنویوں کے علاوہ کلیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا پُر گو شاعر تھا۔ مثنوی سیف الملوک جس کے دو ہزار سے زیادہ شعر ہیں، صرف ایک مہینے کی قلیل مدت میں تمام کیا ہے۔ سراپا نگاری میں غواصی نے جو کمال دکھایا ہے وہ اس کے قادرالکلامی پر بخوبی دال ہے۔ غواصی کے کلام میں اس وقت کے رواج کے مطابق ہندی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ کلام سادہ ہے، تصنّع سے پاک ہے، مبالغہ زیادہ نہیں ہے، اس کا بیان دل کش اور شاندار ہے۔

قصائد میں طمطراق اور زور بیان موجود ہے۔ لیکن زمانہ مابعد کے قصائد کی طرح بادشاہ کے اوصاف میں ہاتھی، گھوڑے، تلوار وغیرہ کی تعریف نہیں ہے۔

غواصی کی غزلوں کی تعداد کئی سو تک پہنچتی ہے۔ ان میں تغزّل بھی ہے اور اخلاقی مضمون بھی۔ سلطان قلی کی طرح اس نے بھی حافظ کی غزلوں کا دکنی غزلوں میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے یہاں ہمیں مسلسل غزلوں کا کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ وہ غزلوں میں بھی اپنے بادشاہ کی مدح کرتا ہے۔ معشوق کی تعریف کرتا ہے، عشق و محبت کی داستان سناتا ہے۔ ساتھ ساتھ تصوّف کے مضامین سے بھی اس کی غزلیں مملو ہیں۔ تخیل کی جولانی، خیالات کی پرواز، انداز بیان کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

بہرحال غواصی کے کلام کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کا بڑا شاعر تھا بلکہ اردو زبان کے شعراء کی صف اوّل میں اس کو جگہ دی جا سکتی ہے۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ مثنوی ۲۴۳

غواصی کے مرثیوں کا تذکرہ دوسری جگہ کیا گیا ہے۔

(۹) احمد احمد بھی اسی دور کا شاعر تھا۔ اس کی پیدائش اور وفات کے سنین سے ہم واقف نہیں ہیں۔ اس دور کا ایک مشہور شاعر ابنِ نشاطی اس کو استادِ سخن کہتا ہے اور اس کے کلام کا معترف اور مدّاح ہے۔

احمد کی دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے ایک تو "لیلیٰ مجنوں" ہے اور دوسری "مصیبت اہل بیت"۔ اوّل الذکر مثنوی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ایماء سے لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گذری مؤلف "پنجاب میں اُردو" نے اس کا ذکر کیا ہے اور نمونہ کلام دیا ہے[1]۔ دوسری مثنوی ہماری نظر سے گذری ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں لکھا گیا تھا[2]۔

مثنوی لیلیٰ و مجنوں

اس اللہ کے ناؤں سوں سب جگت ۔۔۔ جو دائی دیاونت اس کی صفت

سرہانا سب اللہ کوں جم قرار ۔۔۔ جو جگ دھنی ہور پروردگار

محمّد قلی قطب شاہ شاہاں ۔۔۔ جسے چرن سیوک شاہانہ جہاں

جو منج بخت کوں فتح یاور ہوا ۔۔۔ سو منج بخت کا سیوک انبر ہوا
جو شہ آپ تھے آپ منج یاد کر ۔۔۔ منج غم کی بندگی تھے آزاد کر
دیتے امر علی کی یہ باغ لاؤں ۔۔۔ جو پالوں اسے شہ امریت ناؤں
جو میں شہ کا امر سر پر لیتا ۔۔۔ ترت باغ لانے شتابی کیتا
جو احمد کرے آس دھر بن سنگار ۔۔۔ سو اب شہ تھے پائے ستیں سنگار

مجنوں کا باپ جنگل میں جا کر مجنوں کو تفہیم کرتا ہے۔

کیا پوت کا سکھ دکھن آس سو ۔۔۔ رہیا پوت کے دکھ سوں نرآس سو

---

[1] پنجاب میں اردو، صفحہ (۱۷۱) طبع اوّل۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات (۷۵ تا ۷۹)

تری آگ تے جیو میرا جلے — تری آہ تے موم ہو تن جلے
کیتا توں جلے ہور جالے منجے — تیا کیا گلے ہور گالے منجے
جو توں ہے پیار تیں منج کوں — ہنسوں کیوں جو روتے دیکھوتیں کوں
میرا جیو ہے توں میرے لاڈلے — جلے جیو جس کا سو کیوں نہ چلے
رکھیا آس جو توں بسادے محل — نجانیا کہ تو یوں جگادے جنگل
جو گھر چھوڑ جنگل بسانے لگیا — سو تج تے جنگل ہور جنگل بھی جلیا

نہیں باج حکمت کچ اس کا کھیا — نہ بن مصلحت کچ لیا ہور دیا
بھو نیک مراداں نہ ہوئے مرحمت — سو اس میں اچھنیں خبر ہو مصلحت
اکس پر سو نعمت بلا ہو بھرے — اکس کوں بلاوے سو نعمت کرے
نہ اس تے بلا دیک نہ آس ہووے — نہ نعمت کوں بھل کرسٹی دہات کرے

میری خاک میں تے جو اپجے نہال — وفا کے گلے پھول پھل ڈال ڈال

جو روشن کرے رات کوں آہ سوں — سو روشن ہوئے دین کی راہ کوں

منئے کی چھوری ہوئے تو کیا ہوا — نہیں پیٹ میں مار لینا روا[1]

مثنوی مصیبت اہلِ بیت

سنو قصہ مصطفےٰ کا جو ہے سرورِ انبیار
جن کے واسطے پیدا ہوا دونوں عالم دین دنیا
حق کا ناؤں ہے عرش اوپر رحمتہ اللعالمین
اوّل ان کو پیدا کر کر بعد از کیا دنیا دیں
دیکھو یاراں معصوماں پر وقت کیا آپڑیا
پردیس جائے طفلاں اوپر کیا مشکل اکھڑیا

---

[1] اورنٹیل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۲۵ء مضمون محمود شیرانی۔

دونوں فرزند سلما کے اُٹھے چھپ کر قاضی پاس
ڈر کر قاضی کا پریا گھر سوں پکڑا پنی جیو کے پاس

کوٹوالیا نے لاتے پکڑ کر عبداللہ کون دے خبر
بھیجا ان کوں بندی خانہ کھیارا کھو قید کر

پھر خوش ہو علی اکبر کافراں پر جا پڑے
نوکر و کر سب یزیدی تیر تفنگ سوں آلڑے

پیادے ہور سواراں سار مارنے یکبار ملہام
تو زخمی کر علی شہ کوں کیتے کافر اپنا کام

مارا یا نیزا ابن نمیر تی علی شہ کوں اوس وقت
پچھلی مغل ابن مرت زخم کیتا آسخت

اس زخم سوں علی اکبر تیری سیسی کر پرے
یکجوان پر قوجان جوڑ کر سگل کافر آلڑے

لیکے سر جیوں کوئی میانے ملحدانے جس وقت
پرے چپل سب عزیزاں ہور پکارا یا حسین

بلا کیسی کربلا میں پڑی شاہان تج اوپر
مج بلا لان تیرے نیکیاں ہور اندھارا یا حسین

سُن خبر یو مصطفےٰ سوں جگت تھارا تھا ملول
نو سگلکوں ہوا غم بودھر یارا حسین

ایکیلا ایک زنگی میانے دغا دینے کیے
کیوں ڈوبی کر تیر تفنگ کا کہنے مارا یا حسین

تس دن رو رو حسین احمد بولے جبکوں شہ کا غم
رو بھی رو رو آپن غم سوں ہو بیچارا یا حسین[1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات ۔ صفحہ ۷۸، ۷۹

(۱۰) عاجزؔ افسوس ہے کہ ہم عاجزؔ کے متعلق کسی تفصیلی حالات کی صراحت نہیں کر سکتے' اس کی مثنوی سے واضح ہوتا ہے کہ وہ شاہ میران کا مرید تھا، تذکرہ اولیأ دکن سے واضح ہوتا ہے کہ دکن میں شاہ میران کے نام سے تین بزرگ گزرے ہیں ان میں سے ایک بزرگ شاہ میران تو وہ ہیں جو خداوند ہادی خلیفہ شاہ امین الدین بیجاپوری کے مرید اور خلیفہ تھے اور ۱۱۲۵ھ میں حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ چونکہ یہ بزرگ زمانہ مابعد کے ہیں اس لیے غیر متعلق ہوجاتے ہیں۔ دوسرے بزرگ بیجاپوری ہیں، تیسرے بزرگ سیّد میران حسینی الحموی عرف شاہ ہلال ہیں جنہوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانہ میں آکر حیدر آباد میں اقامت کرلی تھی اور ۱۰۴۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا[۱]۔

چونکہ عاجزؔ کی مثنوی ۱۰۳۱ھ میں تصنیف ہوئی ہے اس لیے گمان غالب ہے کہ یہی بزرگ عاجزؔ کے ممدوح ہیں۔ عاجزؔ کی یہ تصنیف "لیلیٰ مجنوں" ہے اور ہاتفیؔ کی فارسی لیلیٰ مجنوں کا دکھنی ترجمہ ہے، چونکہ اس زمانے کے رواج کے مطابق مثنوی میں بادشاہِ وقت کی مدح نہیں ہے۔ اس لیے قیاس ہے کہ عاجزؔ کو شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا اور تصوّف سے لگاؤ تھا۔

دکن میں لیلیٰ مجنوں کے نام سے کئی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ اس کے پہلے احمدؔ کی لیلیٰ مجنوں کا تذکرہ ہوچکا ہے، یہ دوسری لیلیٰ مجنوں ہے اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سیّد سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے[۲]۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

کیا ابتدا میں بنامِ خدا   ہر اک اسم اوپر کروں جیو فدا

خدایا توں ہے پاک بے عیب رب   بنایا جگت خاص ہور عام سب

مصنف کے تخلص، تاریخ تصنیف وغیرہ کی صراحت ملاحظہ ہو ؎

کیا ہوں میں عاجزؔ سمجھ کر بیاں   یو ہے معجزہ سب جگت پر عیاں

منہ عاجزؔ ہے محروم شکر خدا   وہ ہے شاعراں کے جو صف میں کھڑا

---

[۱] تذکرہ اولیاء دکن جلد۔

[۲] وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔ صفحہ ۵۸۷

کہیے ہاتفیؔ فارسی نظم سوں   کیا دکھنی قصہ ہے اس رزم سوں
کیتیں یو طبیعت میں ہوں پائمال   تدبر تازیاں آوری کا کمال
مدد پنجتن پاک و بارہ امام   مدد پیر میراں منزہ مقام
ہزار اور چہل تھے یو ہجرت کے سال   ہوئے تب کیا مجنوں لیلیٰ کا حال

سنی یو خبر جو اپن کان دھر   اندیشی کے غم میں ہوئی تل اوپر
بیٹھی جا سوں لیلیٰ کے نزدیک ہو   کہی کھول دو گھڑا بہنو بن رو
... ہور مجنوں کی گھر گھر خبر   اوٹھائے شہر میں ایسا شور و شر
کرے فن تو ایسے سو مکتب منے   دیکھے کو دکاں میں دہر کس کنے
اگر نا او بچتے تو ہوتا بھلا   عرب میں نہ اوٹھا یو ہرگز خسیلا
کیے لاج سب کل کو اس شہر میں   تجھ ایسے تیں شوخ کس دہر میں
دیو اماج اندھیارا جہو گھر میں سانچ   بورا پوت جتا بہلا او سنے پانچ
قبیلکوں سب بول لاتی ہے توں   میری شرم کوں جگ میں دکھاتی ہے توں

لیلیٰ کا پدر سب قبیلے سنگات   چلیا قافلے منانے مل دیس رات
لیلیٰ خواب میں تھی کجاوے اوپر   شتربان رہا تھا پیچھے چھوڑ کر

بیاباں پڑیا چلیا گاہ گاہ   کجاوا تھا ..... پر ماہ کا
او جنگل میں مجنوں کے رہنے کے ٹھاؤ   لیلیٰ آوہاں نیند تے ہوشیار[1]

(۱۱) قطبیؔ

قطبیؔ کے متعلق بھی ہمیں معلومات بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے اپنی کتاب "اُردو شہ پارے" میں اس کی کتاب "تحفہ" کا ذکر کیا ہے جو اس نے خواجہ نصیر الدین کے مُرید شیخ یوسف کی کتاب "تحفۃ النصائح" کا دکھنی ترجمہ ۱۰۴۵ھ میں کیا تھا اور تذکرہ اُردو مخطوطات میں تحفۃ النصائح کے مترجم کا نام رازیؔ لکھا ہے[2]۔

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] تذکرہ اردو مخطوطات جلد اوّل ص ۲۵

مؤلف اُردوئے قدیم نے ملا قطبی کو عبداللہ قطب شاہ کا معاصر اور تحفۃ النصائح کا مترجم قرار دے کر کلام کا نمونہ بھی دیا ہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے "تحفہ" کے نام سے دو اشخاص نے کتابیں لکھی ہیں۔ ایک تو ملا قطبی جس کے کلام کا نمونہ مؤلف اُردوئے قدیم نے پیش کیا ہے اور دوسرا رازی جس کا ذکر "تذکرہ اُردو مخطوطات" میں ہے۔ دونوں اصحاب نے جو وضاحت اپنی کتابوں میں کی ہے ان میں سے اکثر باتیں مشترک ہیں۔

ہم نے دکن میں اُردو کی تیسری اشاعت میں رازی کی جس کتاب کا تذکرہ کیا ہے وہ ڈاکٹر زور کی تحقیقات کے لحاظ سے بیجاپور کا شاعر ہے۔ چونکہ اس کے متعلق مزید معلومات نہیں ہیں اس لیے سردست اس کو درست قرار دیا جا سکتا ہے۔

قطبی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

بولوں صفت میں بے گنت	اس خالق جنّ و بشر
نردھار کر اسمان رکھیا	سورج ستارے ہور چندر
جو دی بزرگی عرش کوں	پچھے اڑے یک پائیتے
جوں نیچ برساں چار سو	انپڑے بزاں پائے دگر

مؤلف اُردوئے قدیم قطبی اور رازی کو ایک ہی شخص قرار دیتے ہیں، کیونکہ دونوں تخلص اس مثنوی میں موجود ہیں، چنانچہ:۔

نازش جہاں میں میں کیتا	کیتا بُرائی کے جو سبھی
قطبی دھریا اُمید یو	لایا ہوں سب صاحب نظر

بندیاں میں سب کم تر بندہ	رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکنی زباں	شہ کی رضا سے سیس دھر

تاریخ تصنیف کے اشعار:۔

ہجرت ستے دس سو سال ہور	چالیس پر بھی پانچ اُستے

---

[1] اُردوئے قدیم طبع ثانی

تب یہ مرتب سب ہوا تحفہ سو دکنی نام دُر

اسی طرح قطبی تخلص کے اشعار ہیں، چنانچہ اُردوئے قدیم میں ان کو حسبِ ذیل لکھا گیا ہے۔

نازش جہاں میں میں کیتا کیتا بُرائی کے جو بھی
قطبی دھریا امید یو لایا ہوں سب صاحب نظر

دفتر دیوان و مال کے مخطوطہ میں شعر اس طرح ہے:۔

نازش جہاں میں میں کیتا کیتا بُرائی کے بھی
قطبی دھریا امید یو لایا ہوں سب صاحب نظر

اب میں قطبی اور رازی کو ایک ہی شاعر تصور کرتا ہوں اور ان کا نام غالباً قطب الدین تھا جیسا کہ ایک شعر میں صراحت ہے۔ انہوں نے اپنے مرشد شاہ ابوالحسن کے حکم سے ۱۰۴۵ھ میں خواجہ یوسف کی کتاب تحفۃ النصائح کا دکھنی ترجمہ تحفہ کے نام سے کیا۔ یہ شاہ ابوالحسن بیدری ہیں، جو بیجا پور میں تشریف لے گئے تھے۔ تحفہ میں ۴۵ باب ہیں۔ پورے ترجمہ کے بعد آخری باب میں رازی یا قطبی نے اپنے تخلص اور اپنے مرشد وغیرہ کی صراحت کی ہے۔ کسی قدر نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوئے جو بالغ آدمی حق بوجنا ہے فرض اس پر
ایک سچ بیشک ہے خدا اس باج بھی نہیں کوئی مگر

بن یوں ہو دوں حضرت خدا مانند شباہت نا دھرے
ہرگز جنیا نہیں اور کسی ناماں رہے اس کوں ناپدر

عورت نہ ان پانی دھرے حاجت کدھیں ناس کھری
جیسا ہے ویسا نت سدا اندر نہ اوس غفلت بسر

تحفہ اصل اے فارسی سب ترجمہ وکیتی کیا
صاحب سو دیتا ابن کے شہ ابوالحسن فرمائے پر

بندیاں سب کترا ہے رازی تخلص قطب کا
تحفہ کیا دکھنی زباں شہ کی رضائے سیس پر

ملہ اُردوئے قدیم صفحہ ۶۷، ۶۸

بندہ تو سب پُرعیب ہے جوں شاہ بخشے عیب توں
بندہ نوازی شاہ سوں او عیب ہووے سب ہُنر

ہجرت ستے دس سو سال ہور چالیس پر بھی چار تھے
تب اے مرتب سب ہوا تحفہ دکھنی نام ورؔ[۱]

اس سے واضح ہے کہ یہ کتاب ۱۰۴۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

(۱۲) سلطان

سلطان بھی اسی دور کا شاعر ہے، دیگر شعراء کی طرح ہم اس کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ سلطان میراں شاہ کا مرید اور خلیفہ تھا۔ اسی دور کے ایک شاعر افضلؔ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔

میراں شاہ معروف اور دستگیر — کہ دل میرا کر پاک روشن ضمیر
دیئے دست پنجہ بھرے سات ہیں — دئے مج کو سلطان کے ہاتھ میں

(محی الدین نامہ)

سلطان ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کے کلیات کتب خانہ آصفیہ اور ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

اوس پاک عشق باز کوں جب نہہ کا اثر ہوا
تب نور ذات جوش ہوا از گنج بر ہوا
تس نور ذات نام رکھیا احمد و صفات
سو وصف کی زبان ستی کن کا اچھر ہوا

اشعار کو نانوں سجھ سلطان بن مجھ نظم کوں
ہر حرف میں باریک تو ہے معنیٔ اسرار عشق

مجھ غزل سن تو نجہ یک سلطان ریجھیا ہو کیا
نظم میرا سن کہے سب شعر گویا ہے لذیذ

۱؎ دفتر دیوانی و مال۔ اس کے نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں بھی موجود ہیں۔

تس ذات کی رے بحر تے قابل ہو جب تے گل ہوا
تب صفت سوں موجاں اہلِ نس بحر میں یک کل ہوا
میخانہ میں تجہ زلف کے تسبیح اکر کل بری
مے خوار تھا اوّل ایتا اوس کی سبب زاہد ہوا
تج حسن احسن روز تے بولیا کہ میں مشہور ہوں
اوس روز تے لیا کہ ایمان میرا جب شاہد ہوا
میں عبد توں سلطاں ہور نیکی سدا کرو ہم تھا
منج جب دیکھیا توں میں نہیں جا کو توں واحد ہوا

تج حسن کا جد ہاں تے تیں میں مہر ہوا
میرا رے دل سو تج کوں تو یاں تج گھر ہوا

حسنِ زیبا ہے ہر جاگہ وے بینا نظر ہونا
دسے گا حسن ہر جاگہ وے دیکھن بصر ہونا
نہیں ہر ٹھار ریجھنکی مگر کر عشق عاشق ہے
وے بینا منی اپنی اول بنہ کا اثر ہے

اے دل نہ ہو توں غافل اب ہوش وار باد
عشقِ خدا لے وے کر نا کر بچپار باد

علماء تمام مل کر پڑھتے ہیں کئی کتاباں پر یکو علم مجھ کوں تجہ ابرو کا سفر بس

توں فنا ہو یا فنا ہے، یا بقا ہو توں بقا ہے
یا خدا ہو توں خدا ہے زاں مقام آزار باش

جب کچھ نتھا پرچ پیدا تب ای جہاں کہاں تھا
جب بی عیاں اتھا او تب ای عیاں کہاں تھا

بی قال، بی زباں ہو، بی حکم، بی بیاں ہو
جب تھا او بی نشاں ہو تب ای نشاں کہاں ہو

بی چون و بی نشاں ہو اندر نہاں نہاں ہو
جب تھا او لامکاں ہو تب ای مکاں کہاں تھا

بی خود ہو، بی قسم ہو، بی کام، بی جسم ہو
جب تھا او بی اسم ہو تب تن ای جاں کہاں تھا

چودا طبق تمنا ہو جس میں تھا سماں ہو
سو لول کیا اتھا او اوشی وہاں کہاں تھا

لا عبد و لا صمد جو لکھتا نہیں ہی حد سو
ہوتا ہی جملہ رو تو سلطان شاں کہاں تھا

خودی منسوخ کر بولیا سو کیتا ہوں زباں ناسخ
کماں کوں کا پرست دیکھیا تو دستا ہی ایاں ناسخ

کماں چھوڑ پانہ پھیر لیتا کہ العاری ولا یذکر
کہ حرفی وصل خالی لی ہوا ہوں با عیان ناسخ

مکرر زاہداں ساری جو کہتی لامکاں جکوں
او سی لاکون کیا ہوں میں سراسر بامکاں ناسخ

ای عالم حق نشانیا بکوں کئی ہیں ناسخ و منسوخ
ولی اس کی شہکائی مج دیسی اوسب نشاں ناسخ

خدا سلطان دو جگ ہی توں بخس لا مبدل بھی
تو سمجیا ہوں نہیں اس کا آہی امر و بیاں ناسخ

مکھ کی چندر کوں تیری میری نین کا سجود
لب کی شکر کوں تیری میری دہن کا سجود

ابرو کی محراب کون مج ای جیا کا سلام
رخ کی شمع کون تیری میری مدن کا سجود

خال کی تل دانہ کوں مرغ ولم کا سلام
ابر سی لٹ کون تیری میری لکن کا سجود

چاہ زنخ کون تیری مج ای اوس کا سلام
قد کی سرو کون تیری میری کرن کا سجود

نیاز کی مدوہ کون تج مج ای ہوس کا سلام
سحر سخن کوں تیری میری کرن کا سجود

چال کی نکل کوں تج مج ای خوشی کا سلام
تن کی سنی کون تیری میری بدن کا سجود

وصل کی سلطان کون سب ہیں ان کا سلام
کنج خفی کون تیرا میری جیون کا سجود

سب کھیل تو پخ کھیلی کرتا ہی یہی مکر کے
توں کر بدی رکھیا ہی تہمت سو مج اوپر کے

توں عشق باز ہی سو عالم منی نشر ہی
ینہا پخ میں حیا یکا دھرتا ہی بھی ستر کے

بہو روب ای پیاری تیر یچ کن ہیں ساری
سب خیر و شر اپی کر ڈوبی ادھر ادھر کے

خلقت پکپر ہو پرکہت توں عاشقی میں اگر
چھپ اس بہانہ شہ کی تجھکوں کہی دکر کے

کہل چند بند تیری تج بن نہیں ہی دو جا
پکریا ہی نام ہی وہ سلطان بندہ کر کی[1]

---

[1] کلیات شاہ سلطان کتب خانہ آصفیہ۔

(۱۴) خداوند خدانما

آپ کا نام سید میران تھا مگر کئی لقب سے آپ کو موسوم کیا گیا ہے، مثلاً شاہ میران جی خدا نما، سید شاہ میران جی حسین خدانما، میران حسینی خدانما۔ آپ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں حکومت کے ملازم تھے اور حکومت کے ہی کام پر بیجاپور گئے اور وہاں حضرت امین الدین علی کے مرید ہوئے، اور خلافت ملی، بیجاپور سے حیدر آباد آئے، ملازمت ترک کردی، رشد اور ہدایت کے کام میں مصروف ہو گئے اور بندگانِ خدا کو معرفتِ الٰہی سے مستفید کرنے لگے، عوام نے ان کو خدانما سے موسوم کردیا۔ میران جی خدانما پر سلسلہ چشتیہ میں بیعت سے تھے۔ آپ کی جن تصانیف کا علم ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) رسالہ وجودیہ (۲) رسالہ مرغوب القلوب، دونوں نثر میں ہیں، نظم میں جن تصانیف کا پتہ چلا ہے وہ "بشارت الانوار" دو مثنویاں اور چند غزلیات ہیں، آپ کا انتقال ۱۰۸۰ھ میں ہوا، اگرچہ بعض تذکروں میں ۱۰۷۰ھ ہی درج ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے، مختلف تذکروں کی کتابوں میں آپ کے حالات درج ہیں، مثلاً مشکوٰۃ النبوت، تذکرہ اولیاء دکن، افوارالاخیار وغیرہ، اب حال میں ڈاکٹر حفیظ قتیل پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے میراں جی خدانما کا کلام اور آپ کے مفصّل حالات شائع کیے ہیں[1]

شاہ میراں جی کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ساحل سوں جو لگیا قسمت سوں آپیں ہو نہارا ہے
فہم عاجز، عقل حیراں، تردد کیا بچارا ہے

کہ جبتک بخت کا بل نیں سو مشکل عقل کوں جل نیں
مقدر کوں مبدل نیں سخن یو آشکارا ہے

جھوٹی لالچ منے یو دل دسے شرمندگی حاصل
کرادیں آدر دیک تل سو بھاراں عمر سارا ہے

جو عزت تج تھے ہونا کہ ورنا عقل کی کھونا
نکوئی جیوہات بھی دھونا کہ جینارت پیارا ہے

---

[1] مشکوٰۃ النبوت، تذکرہ اولیار دکن، میراں جی خدانما۔

فکر ہمت حرف گیراں تو مارے بول ہمیں تیراں
عمر یو بے وفا میراں دنیا کا کس پتیارا ہے

دائم شراب شوق کو پی کر بنتا اچھوں
باتاں چھپے سو کھول کے نت بولتا اچھوں
بندہ کہوں تو شرک کتے حق کہوں تو کفر
بولو تو از برائے خدا کس وضا اچھوں
ناداں کے طعن ستے عارف کوں کیا خطر
نامحرموں کوں بولتا بے دغدغا اچھوں
مجھ کو خدا نما نہ کر سب کیے ہیں رد
کیا میں خدا نما نہ اچھوں یا خدا نما اچھوں[1]

بشارت الانوار کا نمونہ یہ ہے :۔
سب ہست کر اپس کوں نت ہست رہ توں میراں
اب مست کر توں پیو سوں نت ہست رہ توں میراں
ہستی اپس کی دنیا مستی پیا سوں لینا
تب پیو ہوے اپنا نت ہست رہ توں میراں
سب یاد کوں بسر توں بی یاد پیو دھر توں
نت موت موت مر توں نت ہست رہ توں میراں
سب شئ میں ہست اس کا نا کے ہے قصد کس کا
جوں دود ییں ہے مسکا نت ہست رہ توں میراں
جت ریکھ دیکھ دیکھے ات دیکھ پیو کوں پیکے
تب آگ عشق سیکے نت ہست رہ توں میراں
سب جان اس سوں جانے تب پیو مجکوں مانے
بے پیو نہ ہوں توں شانے نت ہست رہ توں میراں

---

[1] میراں جی خدا نما از حفیظ قتیل

تجہ تن منے او تن ہے جینوں کا ہی او جیوں ہے
تج نیں میں تیں ہے نت ہست رہ توں میراں

ہے جیوں پپیا او دریا کل شئ سوں موج بھریا
ناکد اپس سوں سریا نت ہست رہ توں میراں

یک ذات بہو صفاتی ہے ذات دن نہ راتی
سب سات ہے او ساتی نت ہست رہ توں میراں

ساقی سوں مست رہے گا نت پیو تج سہے گا
محبت متے بہے گا نت ہست رہ توں میراں

بے رنگ رنگ راتے نیں رنگ اس سہاتے
سب رنگ ہے پیاتے نت ہست رہ توں میراں

کوئی رنگ دیک ڈولے جیسے شمع ہو شعلے
شاہ کی روباٹ بھولے نت ہست رہ توں میراں

دیک رنگ لک لکاتاں کرتے ہیں کاٹ کاٹاں
بھولے ہیں پئیو کے باناں نت ہست رہ توں میراں

جسمی کے دیکھ نوراں جیسے ہیں چاند سوراں
نور عین سوں ہو کریاں نت ہست رہ توں میراں

سو نور آوے جاوے یک سات پھرنا آوے
کیا روپ ات دکھاوے نت ہست رہ توں میراں

اس نور کوں فنا ہے صورت جسم پیا ہے
نور عین کوں منا ہے نت ہست رہ توں میراں

سو نور خاص ہوئے رنگ روپ کچ نہ ہوئے
کر صاف دل کو دھوئے نت ہست رہ توں میراں[1]

ایک دوسری نظم :-

---

[1] بشارت الانوار

پیا پتیلی نین میں ہوں آپیں آجوں سماتے ہیں
نظر تو ایک ہے سب میں تیں دو کر دکھاتے ہیں

تیں میں نیں دونا درسو چوتھی عین میں قادر
دہی موہن وہاں حاضر سجن مرشد تھے باہتے ہیں

تیں میں ہیں وہ ظاہر رہن تیں عین سب ماہر
مگر عارف توں باہر پیا جوکے عین لاتے ہیں

جیسکوئی واقف ہے اس سوں نہ حاجت ہے
اس کسوں سوں رکھے دل جان کر کس سوں پیا تو راتے ہیں

جہاں ہم تو ہوئے فانی وہی تو ایک کر جائے
بھی واں ایک ہور ثانی نکوئی واں شرک لیاتے ہیں

نظر تو بطن میں ہے سب سو سب بروے کیا ایک اب
سو صادق صدق سوں پائے تب نظر رخ نور جماتے ہیں

نظر رُخ پر اچھی جھلک ترنجن نور تیں تلک
عاشق کوں تکی کیا ایک نظر نور پھیلاتے ہیں

نظر سب سات ہے توحید ہے عاشق کرے جی عید
نہیں قرب ہور بعید معمار کر جھلپاتے ہیں

سو نور میں نور ہے اعلا اپیں اعلا ہوے لا لا
خداوند کے بھی خیالوں نظر نور پر لگائے ہیں[1]

(۱۴) شیخ عبداللہ اسی دور کے شاعر ہیں، آپ کی ایک نثر کی کتاب بھی ہمدست ہوئی ہے۔ جس کا تذکرہ "دکن میں اردو" کی سابقہ اشاعتوں میں بھی ہوا ہے۔ اب ہم ان کو ایک شاعر کی حیثیت سے بھی پیش کرتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم چھتیس شعر کی سالار جنگ کے کتب[2] خانہ میں محفوظ ہے۔ نظم میں تصوف کے چند مسائل ہیں۔

---

[1] بیاض کتب خانہ سالار جنگ صفحہ ۶۰۸

[2] " " " " " "

اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے مرشد کا نام بابا علی تھا۔ آپ کی نثر کی کتاب جو احکام الصلوٰۃ سے موسوم ہے۔ سنہ ۱۰۳۳ھ میں تصنیف ہوئی[1] ـــــ تذکرہ اولیاء دکن میں بعض عبداللہ نام کے صوفیا کا تذکرہ شامل ہے مگر وہ ان سے منسوب نہیں ہو سکتے۔

یو جنا ہوں حق شناساں تم پر سوال نازکہ
آیا ہے روح کدھر سوں جاتا سو جال نازکہ

دلنفس روح سر نور ہو ذات تس بہتر ہے
یو کیوں نظر میں آنا یو لوا تیال نازکہ

ذاتی عناصراں سوں روحانی ہور جسیمی
یوں کا نکل خصم ہیں اس کا ابال نازکہ

ہر چار نفس روحاں ہور چار دل کنے ہیں
یوں کیوں پرکہ ہیں آنا ان کا خصال نازکہ

چارو مراقبے ہور چاروں مشاہدیاں سوں
یو کہوں عروج نزول ہے یو کیتا ہے فال نازکہ

ارشاد میں علی کے من عرف ہور فقد کے
شہرت دیکھا دو تیکر باجا ہے قال نازکہ

ہے پیر شاہ بابا مرشد علی حسینی
عبداللہ اسی کرم سوں بوجیا سوال نازکہ

(۱۵) جنیدی

اس کا نام احمد تھا اور ماہ پیکر سنہ ۱۰۶۴ھ میں لکھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ اس نے شاعری ترک کر کے برہان پور میں اقامت اختیار کر لی تھی۔

ڈاکٹر زور کی رائے میں وہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر تھا اور غلطی اس کا نام تھا۔ اس کی مثنوی کے دو نسخے کلکتہ میں ہیں۔ ایک امپیریل لائبریری میں اور دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب[2] خانہ میں۔

---

[1] اُردو شہ پارے۔

[2] محفوظ الحق۔

کلام کا نمونہ پیش ہے جو پروفیسر محفوظ الحق کے مضمون سے اخذ کیا گیا ہے کیونکہ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گذری۔

کہ احمد جنیدی پہ کر یوں کرم　　دھوے نانوں لب پہ محمدؐ جرم

رکھیا ماہ پیکر سو اس نیک نام　　الٰہی توں کر اس نظم کوں تمام

کہ ملک باغ میں گال گل لالہ دو　　کہ تل باغباں ہے واں رکھوال ہو

سنیا صاف انبوت تے ہے نار کا　　کہ جاگا ہے مقبول پتہ کار کا

یا انار کے دال ہے تار او　　دو جڑیں کلیاں تار اس تھار او
کہ مینہ باغ میں پھل دو او تار ہے　　کہ یا حسن کیاں نارنگیاں بار ہے

اناراں کے جھاراں کلیاں بار تھے　　کہ لالے میں یاقوت کے سار تھے
کہ آئے تھے جھاراں کو انار بار　　رسیلے نکالے تھے جوبن کے سار
سو چولی نمن پات ان کے اوپر　　رکھے تھے چھپا کر سواں کے بہتر

یَا اَیُّھَا الذین اٰمنوٗ آیات ہے　　یہی حکم حق کا سو دل سات ہے
کیا ہے سو فرقاں میں یو حکم　　کہ ان میں ازدا جکم و اولاد کم
خدا کا امر بھی اسی دھات ہے　　کہ یوم لاینفع مال سو آیات ہے[۱]

(۱۶) بلاقی

سید بلاقی نام اور بلاقی تخلص، یہ بھی اسی دور کا شاعر ہے۔ جہاں تک معلومات ہیں ان کو شاہی تقرب حاصل نہیں تھا، مذہبی آدمی تھے ان کی ایک تصنیف معراج نامہ ہے جو یورپ[۱] اور حیدر آباد کے کئی کتب خانوں میں موجود ہے چنانچہ

---

[۱] محفوظ الحق۔

کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ (سنٹرل لائبریری) اور ادبیاتِ اُردو میں اس کے قلمی نسخے محفوظ ہیں، اس سے واضح ہے کہ یہ کتاب ایک عرصہ تک مقبول رہی اور اس کے نسخے لکھے جاتے رہے۔

اس معراج نامہ کو ایک داستان کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ ایک یہودی کو معراج کے واقعہ سے انکار تھا۔ ایک مرتبہ وہ غسل کرنے دریا پر گیا اور جب غوطہ لگا کر باہر آیا تو خود کو ایک حسین وجمیل عورت کے روپ میں پایا، ایک مرد اس کو اپنے ساتھ لے گیا اور اس سے سات لڑکے تولد ہوئے، کئی سال کے بعد جب پھر دریا میں غوطہ لگایا تو اپنی اصل صورت میں آگیا، گھر پہنچا تو اس کی عورت بدستور مچھلی دھو رہی تھی، اپنے واقعات لوگوں سے بتائے تو کسی نے صحیح نہیں سمجھا، اس کو بے وقوف بنانے لگے، آخر آنحضرت صلعم کے حضور میں حاضر ہو کر واقعات بیان کر کے مسلمان ہو گیا۔

بلاقی نے کتاب کی تصنیف کا سنہ نظم کر دیا ہے۔

قصہ یہ ہوا سب خلق میں عجب — کیا چاند شش میں سو ماہِ رجب
ہزار ایک پنج شست بتیس سال میں[1] — سو انوار کے روز خوشحال میں
اوّل نام اللہ سو بولوں احد — ثنا، وصفت اس کی ہے بے عدد
ثنا اس پر نت سزاوار ہے — کرنہار قدرت میں کرتا رہے
کیا چاند سورج ستارے فلک — زمیں، آسماں، حور، جنّ و ملک

کہ پہلے سما کے سو دربان کوں — کہا کھول بیگی سو دروازہ توں
سو دربان بولا کہ توں کون ہے — کہ آیا ادھی رات کیا کام ہے
کہا میں جبرئیل کچھ کام تھا — گیا تھا زمیں پر جو فرمان تھا
دربان بولا دوجا کون ہے — کہ محبوبِ حق کا نبی خاص ہے
کہا مرحبا بیگی در کھول کے — مجھے دیکھنے میں کھڑا منتظر
کہ اپرال پہلے طبق کے ملک — دیکھے نور کا واں پڑا سب جھلک

---

[1] ۱۰۶۵ھ میں اس مثنوی کی تصنیف ہوئی ہے۔

دے جواب ان کو علیک السلام — کہ صلوٰۃ بولے و کہے سلام

بلاقی نے اس معراج نامہ کو کسی فارسی معراج نامہ سے دکھنی میں ترجمہ کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے:

حکایت جو بولا ہوں میں مختصر — کہ معراج نامہ کی سنیو خبر

کہ ہر عام ہور خاص سمجھیں سگل — کیا فارسی کو سو دکھنی غزل

جو سید بلاقی نبیؐ کا غلام
قصہ یو کہیا ہے لطف سوں تمام

(۱۷) ابنِ نشاطی

اس[1] دور کا ایک اور مشہور شاعر ابن نشاطی ہے۔ مصنفین یورپ نے ابنِ نشاطی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے اور مشرقی تذکرے بھی ساکت ہیں۔ خود اس کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا معزز عہدے دار تھا۔ نثر نویسی میں مشہور۔ پھول بن کی مثنوی لکھنے سے پہلے شعر گوئی کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ وہ غزل گو شاعر تھا۔ وہ مثنوی ہی سے اپنی شہرت کا طالب ہے۔ وہ اپنے ہمعصر شاعروں سے اپنے کلام کی داد نہیں چاہتا بلکہ اپنے پیش رو شعرا فیروز، محمود، احمد اور شوقی[3] کے کلام کا معترف ہے۔ اب جدید تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے ابنِ نشاطی کا نام شیخ محمد مظہر الدین تھا اور ان کے والد کا نام شیخ فخر الدین[4] تھا۔ تفصیلات حالات تاریخ پیدائش تعلیم و تربیت، شاعری میں کس سے تلمذ حاصل تھا۔ ان باتوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

اب تک اس کی تصنیفات سے صرف مثنوی پھول بن کا پتہ چلا ہے جو ایک فارسی قصہ 'بساتین' کا ترجمہ ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۶۶ھ میں ہوئی ہے۔ ابنِ نشاطی نے صراحت کی ہے کہ اس کو تین ماہ کی مدت میں پورا کیا ہے۔ اس کے سترہ سو شعر ہیں۔ بقول بعض ۱۰۶۶ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔

مثنوی پھول بن میں لفظی و معنوی صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہوا ہے۔ ساری کی

---

[1] کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] طبقات الشعراء۔

[3] شوقی کا ذکر دور عادل شاہی میں بیان کیا گیا ہے۔

[4] مضمون ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رسالہ آندھرا پردیش۔

ساری مثنوی مرصع ہے۔ جیسا کہ خود مصنف نے بیان کیا ہے۔ علم معانی کے اصول کے موافق ننانویں قسم کی خوبیاں پیدا کی گئی ہیں۔ مناظرِ قدرت اور مختلف واقعات کے جو منظر پیش کیے ہیں اور رزم و بزم کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ ابنِ نشاطی کی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ مثنوی کی زبان اور اس کا انداز بیان، اس کی سادگی بھی قابلِ تعریف ہے۔ بقول آغا حیدر حسن سابق پروفیسر نظام کالج نصرتی کی مثنوی گلشن عشق قصے کے تسلسل اور بلند خیالی میں تو اس سے بڑھ جاتی ہے لیکن سلاست اور روانی میں اس کو نہیں پہنچتی۔[1]

کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں اس مثنوی کا ایک مخطوطہ موجود ہے جو ۱۱۹۳ھ میں لکھا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو اور حیدر حسن صاحب کے پاس بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔ یورپ میں اس کے تین نسخے ہیں۔[2] کتب خانہ سالار جنگ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ اب یہ مثنوی مجلس اردو مخطوطات کی جانب سے شائع ہوگئی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

اوّل میں حمد رب العالمیں کا ۔۔۔ دل و جاں سوں کہوں جاں آفریں کا
خداوندا تجھے ہے جم خدائی ۔۔۔ ہمیشہ تجھ کوں ساجی کبریائی کا
محمدؐ پیشوا توں سرور ان کا ۔۔۔ ہے سرخیل سب پیغمبراں کا
کروں تعریف میں اس تاجور کا ۔۔۔ سمجھتا ہے جنے قیمت گہر کا
شہنشاں کا شاہ عبداللہ غازی ۔۔۔ اچھو جم حق سوں اس کے پیش بازی

بساطیں جو حکایت فارسی ہے ۔۔۔ محبت دیکھے کی آرسی ہے

مرا تھا باپ سوداگر ختن کا ۔۔۔ نہ تھا پروا اسے کچھ مال دھن کا
بڑا تھا بھوت سب سوداگراں میں ۔۔۔ اتھا مشہور سالم بندراں میں
ہو کر مشہور تھا سوداگری سوں ۔۔۔ کتے تھے کارواں سالار اس سوں
پڑے تھے اس کنے مہراں کے انبار ۔۔۔ دیگاں سوں تھے روپیے ہور دینار

---

[1] رسالہ تحفہ

[2] دیکھو یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۸۰ تا ۹۰

اٹھی اس ٹھار یک زاہد کوں بیٹی | فرشتہ خوی قس عابد کوں بیٹھی
چتر چنچل سرک کنتل سہانی | نہ اس کوں کوئی تھا صورت میں ثانی
چندر آدھا کہوں میں کیوں پشانی | چندر آدھا نہیں ویسا نورانی
بھنواں کے کیوں کہوں محراب تتے کر | کہاں دونوں محراباں کے اوپر
نین کوں نرگساں کہتا ہے ناساز | چمن کے نرگساں میں کالی ہے دوناز
کہوں رخسار کوں کیوں اس کے لالا | ہر ایک لالے کے درمیانی ہے کالا
میں سرتے پاؤں لگ اس موہنی کا | کہ تھا تیوں کیا صنعت کرنی سکوں گا

یکایک دو طرف فتنہ اٹھیا جاگ | اٹھی دو دھرتی جھگرے کی سلگ آگ
ملے ہر حال آکر اجدھا دو | ہوے دو دھرتے لٹ پٹ بلا دو
سلح پوشاں کی یوں دستی تھی نوں | مگر کیا قہر کے دریا پو موجاں
دلیراں کے دسے یوتن پہ جوشن | غضب کی آگ جیوں کہتی ہیں روشن
دلیر لبوں دلیراں ہاتھ میں ہات | ملائے گرز ہور شمشیر کے سات
لگے سٹنے سر اوپر دو اسر کان | کنکوریاں پرسیں جیوں چور سر کان
ٹھناٹھن دیکھ ہور سن کر کھناکھن | لیے دانتاں میں انگلی مردھرت کھن
لگیا تیراں سوں ہور بہالیاں سوں آکام | کیے چھاتیاں کی سب پٹیاں کوں پیغام
یتے تیراں سہے سینے کے سپراں | جھجر ہو کر رہے سینے کے سپراں
ہوا ایسا شفاشف ہور فشافش | زمانہ کہا بر ہو کر کیا غش
دریا ہور ابلنے کوں لگیاں خوں | اجل کچھوا کہ جا بیٹھی بھپراموں

ہوا اس ٹھار پر عالم نیا ٹھار
چلیا دیکھ ہوکہ عزرائیل بے زار[1]

ابنِ نشاطی کی صرف ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی غزلیات قصائد ناپید ہیں اس مثنوی میں ایک غزل موجود ہے جو حسب ذیل ہے۔

---

[1] پھول بن۔

رہے تازہ چمن پیوستہ میرا | شگفتہ ہے سدا گلدستہ میرا
لطافت میں ہے جیوں خوباں کی ابرو | ہر یک مصرع ہے برجستہ میرا
دیا ہے جگ کوں رونق یک طرف تے | ہے یو باز جو دو رستہ میرا
بہوت خونِ جگر کھا کر ہوا گل | کلی نمنی جو تھا دل بستہ میرا

کرم سوں حق کے پایا آج راحت
فلک سوں تھا جو خاطر خستہ میرا

ابن نشاطی کی مثنوی پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ بلند پایہ ہے اور اس زمانہ کی بہترین نظموں میں اس کا شمار کرنا چاہیے۔ ابنِ نشاطی نے اپنی مثنوی میں جو کردار کا نمونہ پیش کیا ہے، قابلِ قدر ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہ بہت صاف ہے اس کے اسلوبِ بیان میں ندرت اور جدت پائی جاتی ہے اور کلام میں درد اور اثر موجود ہے۔ ابن نشاطی نے اس کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ بہرحال گول کنڈہ کے شعراء کی صفِ اوّل میں اس کو جگہ دینی چاہیے۔

(۱۸) طبعیؔ

طبعیؔ، سلطان عبداللہ قطب شاہ کے آخر دَور کا شاعر ہے۔ اس عہد کے دوسرے شعراء کی طرح ہم اس کے پورے حالات سے باخبر نہیں ہیں۔ اس کی مثنوی سے جو امور ظاہر ہوتے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ وہ خاص دکھنی شاعر تھا۔ وہ نہ صرف شاعر بلکہ بلند پایہ مصنّف بھی تھا۔ اس کی مثنوی اس کی سلیقہ مندی اور اعلیٰ قابلیت کی بیّن شاہد ہے، وہ اپنی شاعری کی خوبیوں کا خود معترف ہے اور اپنے معترضین پر سخت سے سخت چوٹیں کرتا ہے مگر اس کے ساتھ اپنے پیش رو شعراء کی تعریف بھی کرتا ہے اور ان کے کلام کا قائل ہے اور داد دیتا ہے۔

طبعیؔ، سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا درباری شاعر ہے۔ وہ جگہ جگہ اپنے بادشاہ کی تعریف کرتا ہے۔ اس کو شاہ راجو حسینی سے بھی عقیدت ہے بلکہ ممکن ہے ان کا مرید بھی ہو۔

اس کی ایک مثنوی قصّہ بہرام و گل اندام ہے جس میں ایران کے بادشاہ بہرام گور کا قصہ منظوم کیا گیا ہے اس کی تصنیف ۱۰۸۱ھ میں ہوئی ہے۔

طبعیؔ کی مثنوی اس کے کہنہ مشق شاعر ہونے پر دال ہے قصہ کی ترتیب تسلسل اور طرزِ بیان کی جدّت قابلِ ستائش ہے۔

یہ مثنوی نایاب ہے اس کے نسخے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ برٹش میوزیم لندن میں اس

کا ایک نسخہ موجود ہے[1] اور کتب خانہ سالار جنگ میں بھی ایک نسخہ ہے۔

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

الٰہی یو طبعی ترا داس ہے ۔۔۔ دے ایمان اس کو تیرا آس ہے

محمدؐ نبی توں خدا کا رسول ۔۔۔ یوں پیغمبراں باغ تھے توں سو پھول

شہ بوالحسن سچ توں شاہ دکن ۔۔۔ تجے شاہ را جو مدد بوالحسن
دیا ہے خدا بادشاہی تجھے ۔۔۔ سہاتا ہے ظلِّ الٰہی تجھے
شہنشاہ توں آج دن سور ہے ۔۔۔ ترے پرتے شاہاں بلا دور ہے
ملاحت میں جیوں سور چندر ہے توں ۔۔۔ صلابت منے جیوں سکندر ہے توں

روایت کیا راوی نیک نام ۔۔۔ بہوت فکر سوں یو حکایت تمام
اتھا روم کے شہر میں بادشاہ ۔۔۔ کہ سردار ویسے بہوت تھے ہور سپاہ
وہ شاہ بہوت مقبول عاقل اتھا ۔۔۔ سخی ہور فاضل او کامل اتھا

سوا لاک تھے اس کو ترکی غلام ۔۔۔ جو الماس تھا نیک ان کا تمام
جو حبشی غلاماں سوا لاک تھے ۔۔۔ او نیلم کے تیوں حسن میں پاک تھے
اگرچہ او شاہ جہانگیر تھا ۔۔۔ نہیں ہے کہ فرزند دل گیر تھا

اوّل شاہ بہرام خوشحال جو ۔۔۔ کہ جوں پھول لالے تمن لال ہو
پریاں کے ہور باپ کے پاؤں جا ۔۔۔ گل اندام کوں لاکو قدماں پو پا

غزل

تیرے ہات میں شاہ جم جام اچھو ۔۔۔ ہمیشہ بغل میں دلا رام اچھو

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۹۱ تا ۹۹۔

جگت کے شہاں میں توں اچھے نیک نام | کہ دشمن تیرا ہے سو بدنام اچھو
چندر سور کے جام تے آسماں | تجلے غسل کرنے کوں حمام اچھو
اچھو سب سلامت عزیزاں ترے | جہاں تک عدو ہیں سو کم نام اچھو
اچھے لگ گگن ہور زمیں پر قرار | ترے پگ پو قربان بہرام اچھو[1]

(۱۹) شاہ راجو حسینی

حضرت شاہ راجو حسینی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ آپ کے والد شاہ صفی اللہ تھے اور سلسلۂ نسب حضرت سید محمد گیسو دراز سے ملتا ہے، شاہ راجو کی پیدائش بیجاپور میں ہوئی، مگر آپ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں حیدر آباد آئے اور یہاں بس گئے، آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ آپ کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ بھی آپ کا معتقد تھا اور بڑی عزت کرتا تھا۔ ابوالحسن تانا شاہ تو آپ کے مریدوں میں شامل تھا۔ آپ نے اس کی بادشاہی کی پیشینگوئی فرمائی تھی۔ بقول بعض آپ کا انتقال ۱۰۹۲ھ اور بقول بعض ۱۰۹۶ھ میں ہوا، فتح دروازہ کے باہر آپ کا مزار موجود ہے، تانا شاہ نے ایک عالیشان گنبد تعمیر کردیا ہے[2]۔

شاہ راجو شاعر تھے، آپ کی کئی نظمیں ملتی ہیں، خصوصیت سے عورتوں کے لیے آپ نے نظمیں لکھی ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سُن ری سہاگن سُن ری سُن | یک یک بول چت دھر سُن
کن سوے گیت پاکی کمان | کھولتا کہنا بھید بیان
مت دلوا کیں بھجیں گے | بہوت دلویا کیں پو نجینگے
جانی جوے پورج نکو | سکہ ہوں سہرا کورج نکو
صدقہ کھیڑ کا رے گے | یا کی سر پر دارے گے
دو ما لیدکن جی لائے | بیشک دوزخ میں وہ جائے
ناڑ کھڑیاں باندے نا | ماٹ ہور سنکیاں ماندے نا

---

[1] مثنوی بہرام گل اندام یورپ میں دکھنی مخطوطات۔
[2] تذکرہ اولیاء دکن جلد اول۔ صفحہ ۳۴۷ تا ۳۴۸۔

غیر از خدا سجدہ کس نا کر | کافر ہوکر دوزخ نہ پر
بی بیان پریاں شاہ رسم | شیطان کیرا ہے حشم
جچا سہاگن نا کہلا | چمک سنواری نا چھلا
نوں کا ٹا من کر نکو | کن فال تو کیں پر نکو[1]

چکی نامہ کا نمونہ :-

بسم اللہ بسم اللہ ہردم میں بولوں گی | ثنا ہور صفت کے موتیاں کو رولوں گی
بسم اللہ بسم اللہ سمرن میرے من کا | ہردم وظیفہ ناری اوس نبی کا
بسم اللہ، جو ناری یک بار کہیں گی | بدی اس کی ندے یاتی نا رہیں گی

چکی کا پھرانا ارشاد کے قوت سوں | ہو ہو آواز اوس میں آتا ہے قدرت سوں
پیتا اس چکی کا انبہائے کوں بھی آتا | سہاگن کے ہاتھوں چک پیسے جاتا
اوّل تو یو چکی دوں نے پھرانا | تس پیچھے دولہن کوں پھرانے سکانا
بعد از سارے بے دیان دولہن سوں بھکے ہیں | زبان پور کتے ہیں دلاں میں لکھے ہیں
الا اللہ فرما کو اثبات اپنا جوریا | لاکھو لو الا اللہ بولو کسکوں چھوڑ یا
میں تیں ہوں یا ہے رب ہوں یا بندی | بوجے تیں سوناری دو نو جگ میں زندی[2]

(۲۰) تانا شاہ

گول کنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ بھی شاعر تھا۔ اس کا تقریباً تمام زمانہ لڑائی جھگڑوں میں بسر ہوا۔ اس لیے غالباً اپنے پیشرو سلاطین کی طرح اس نے کوئی اپنا دیوان نہیں چھوڑا۔ اب تک صرف اس کا ایک شعر تذکرہ نویسوں کو معلوم تھا مگر اب اس کا بھی کچھ کلام ہمدست ہوگیا ہے، جس کو محمد خلیل اللہ شطاری نے اپنی کتاب "بحرِ محیط" میں درج کیا ہے :

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ | جیوں گل شگفتہ ہوکر مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لبِ تصویر بے سخن | اے شوق خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

---

[1] سہاگن نامہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

چاہتا ہوں وصف قد میں کروں فکر شعر کی   اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ

اے جان بوالحسن توں اچھے خوش لٹک سے
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ

نظم کا نمونہ یہ ہے :-

تجھ مکھ کوں کوئی چندر کتے   کوئی سورتیں انور کتے
کوئی حسن کا بندر کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

تو جہ لب کوں کوئی شکر کتے   کوئی شہد سوں برتر کتے
کوئی خضر جان پرور کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

کوئی جیو کی پیاری کتے   کوئی سون اچھن ناری کتے
ناریاں میں کوئی ناری کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

تجہ چک کوئی کوئی کنجن کتے   کوئی ساحر پُر فن کتے
کوئی حقتہ رنجن کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

جوبن کوں تجہ کوئی گج کتے   یا دو سیناں سج کتے
یا مدھ بھرے پنکج کتے   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

اس نظم کا ایک شعر جو بعض تذکروں میں سلطان ابوالحسن کے نام سے ہمدست ہوتا ہے۔
تعجب ہے اس کو مصنف بحر محیط نے نقل نہیں کیا ہے۔

ملنا ممن کا غیر سوں   کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کتے
کس کس کا منہ موندوں سجن   کوئی کچھ کتے کوئی کچھ کتے

ایک اور شعر جس کو مؤلف "گلشن ہند" نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے ؎

کس در کہوں کان جاؤں میں مجھ دل پہ کھٹن بچھڑات ہے
ایک بات ہوں گے سجن یہاں جیوں بارہ بات ہے

(۲۱) مُحبؔ

اسی دور کا شاعر ہے۔ بعض دوسرے شعراء کی طرح ہم اس کے حالات سے واقف نہیں ہیں، اس کی ایک مثنوی جو معجزہ حضرت فاطمہؓ سے موسوم ہے، کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔[1] اس مثنوی میں اس نے اپنے مرشد شاہ بڑے کی تعریف کی ہے اور سلطان ابوالحسن تانا شاہ کی مدح میں مثنوی میں موجود ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ محبؔ گول کنڈہ کا شاعر ہے، مثنوی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف کے وقت شاعر کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی پرورش اس کے بڑے بھائی نے کی تھی۔

اس زمانہ کے رواج کے مطابق عشقیہ مثنوی نہ لکھ کر ایک مذہبی عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے یہ پایا جاتا ہے کہ مُحبؔ کو صوفی گھرانے سے تعلق تھا اور سلوک و باطن سے لگاؤ تھا، روحانیت کی طرف طبیعت مائل تھی، مثنوی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کو فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے اور ۱۰۸۸ھ میں یہ مثنوی تیار ہوئی ہے۔

محبؔ کا نمونہ کلام پیش ہے ؎

الٰہی تو صاحب کا دھنی ؟ تجے ساجتی کبریا و منی
آپس کے توں قدرت سوں جگ کوں سنبھال
دیا رزق ہر ایک کوں مقدار حال

تاریخ تصنیف ؎

اسے تھے یک ہزار و اسی آٹھ سال دیا یار اس مثنوی کا نہال

شب قدر ہور تھا وہ ماہ صیام کیا ختم ترتیب سوں دو کلام

جو یو قصہ تھا فارسی سوں اوّل کیا اس کو دکھنی زباں سوں بدل

کہ اے نامور قطب شاہ بو الحسن عطا تجھ کیے پھر تخت دکھن
تو پیتے متے باد حق کا شراب زندی کا ہے دل جل کے آگ پر کباب

---

[1] کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست۔ صفحہ ۵۰۲۔

بڑے صاحب اس شاہ کے جانشیں — خلافت کے وارث شہ داد و دیں
دے شہ کی جاگے کے اپراں یوں — محمدؐ کی جاگے پہ حیدار جوں
سو اپنی خلافت میں دو گھنیر — پس افتادگاں کی ہوئی دستگیر

کہوں مدح میں قصۂ فاطمہؓ — جو ہے مدح عصمت وہاں خاتمہ
سو وو پاک دامان بنتِ رسولؐ — رہے حق کی درگاہ میں نت قبول
خدا کی سدا یاد سوں شاد ہیں — دنیا کی علائق سوں آزاد ہیں
وہ خاتونِ جنّت ہے خاتونِ دیں — یو دُنیا سوں ہے بندۂ کمتریں
کرے کافراں کے گھراں میں وطن — تب وہ واس ہوان کے بی بی ثمن

کیتک وقت کوں پھر کہ جبرئیل آئے — بہشتے دھاں حور و غلماں لائے
بہشتے زری کیتک دھانت کے — لے کر آئے جلے کیتک بھانت کے
اگر اس ذرنیکوں جن کوئی بجھائے — ملا تاب بے تاب ہو سد گنوائے
اتھا قدرتی دو زرینا تمام — جو بھیجا ہے خالق صبح و شام
سو جبرئیل ویسی زرینی کوں لائے — وہ خاتونِ جنّت کوں سالم پنائے
سگل حور کی نور کی تیل سوں — لگے کرنے کنگوئی خاتون کوں

انو میں نے کیتک زنا پیش آ — لے کر آئے بی بی کی خدمت بجا
کھڑے ہو ادب سات تسلیم کر — لگے بول نے یو زباں کھول کر
قدم پر تمارے ہمیں رکھتے سر — بھوت وقت سوں سب اتھے منتظر
اگر حکم ہووے تو سفرا بچھائیں — بجالا کہ خدمت ہمیں فیض پائیں
دے جاب بی بی ترا یوں شتاب — کھوی تیوں کئی پھر نوکوں جواب
کہے یوں انوں کوں کتے سچ تمیں — ولی کس وزا کھان کھانا ہمیں
تمیں دشمنی دیں ہمیں دیندار — کریں کیوں تناول یہاں اختیار
ہمارے تئی دین پر آئیں گے — بران آکے کھانا ہمیں کھائیں گے

سن انس بات کو دین کر اختیار — ہوئے ان میں چالیس تن دیندار
چلے واں سوں بی بی پھر اپنے مقام — نبی سوں کہے قصہ واں کا تمام

(۲۲) کبیرؔ

بعض دوسرے شعراء کی طرح کبیرؔ کے حالات پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلص کبیرؔ تھا اور اس نے ۱۰۹۰ھ میں اپنی مثنوی کو جو قصہ تمیم انصاری سے موسوم ہے، تصنیف کیا ہے چونکہ بیجا پور کے ایک شاعر صنعتیؔ نے اس قصہ کو دکھنی نظم میں لکھا ہے اس لیے کبیرؔ کو قطب شاہی شعراء میں شامل کیا گیا ہے، سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس مثنوی کے دو قلمی نسخے موجود ہیں۔[۱]

صنعتیؔ کی مثنوی شائع ہوگئی ہے جس کو قصۂ بےنظیر سے موسوم کیا گیا ہے، چونکہ دونوں مثنویاں فارسی سے ترجمہ ہوئی ہیں اس سے مضامین مشترک ہوگئے ہیں مگر دو علیحدہ مثنویاں بخوبی ثابت ہوتی ہیں۔[۲]

صفت میں خدا کا کہوں ابتدا — نہ اوس باج بھی کوئی دسرا خدا
تو صاحب بڑا ہے توں قادر قدیم — ہے اوّل تو آخر اپس تو رحیم
الٰہی جگت کا توں کرتارا ہے — دنیا دیں کا سچ توں غفارا ہے

مرتب کیا میں یوں قصہ سرس — تھا ہجرت ہزار ہور نود برس
تو قصہ اتھا فارسی سوں اوّل — جو دکھنی زباں سوں ہوا ہے بدل

سنا ہوں نقل بو سراج القلوب — تمیم انصاری کا حکایت ہے خوب
دے ہیں بزرگاں عرب میں خبر — عمر ابن خطاب کے وقت پر
عجائب حکایت مدینے میں آئے — ہوا دور میں عمر خطابؓ کے
صبح نور کے وقت عمر کارساز — جماعت سوں سجدے میں کتے نماز

---

[۱] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔
[۲] کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست۔

نظر دور تے ایک عورت پڑی
چادر اوڑ سر پاؤں لگ اکھڑی

مجلس میں آکر کیے اوّل سلام
عجب ہو رہے ایک یاراں تمام

جو دھرتے تھے دو تین فرزند او
لے کر آئے سندگات دل بند او

کہی تب او عورت تمن درمیان
عمرؓ ابن خطاب کا دیو نشاں

کہو سچ تمن میں عمرؓ کون ہے
متن میانے سردار سرکون ہے

بزاں اوسکوں یاراں اشارت کئے
عمر ابن فاروق کو دیکھلا دے

کیتک دن اندھارے او جالے میں جا
وسیا یک جنگل وہاں جا بجا

یکایک منج اوسٹہار پر بے بدل
بلند پانچہ کا وہاں وسیا یک محل

سو دروازے کن جا کو او تین سے
مجھے لے چلے دیں محل میں اونے

دیکھا جا کو میں گھر منی ناگہاں
رکھے ہیں چو دیواں کوں بند کر دہاں

دیکے پیر بری کوں جو دیواں تمام
جو ڈرسوں کھرے کانپتے اوس مقام

جو دہشت سو اوسکی او دیواں سگل
کھڑ، سارہ ادب سات خدمت بدل

زباں سے اوّل قول دینا منجے
کرے گا جو کچھ میں کہوں گا تجے

دیکن توں کر قول مجھ سوں اوّل
میں دیوں گا تجہ یک بادشاہی اصل

کہ اوس جوان کوں میں کہایوں اے یار
تیرا قول سب میں کیا اختیار

مروّت سوں منجہ ہات پکر یا وَلے
بہوت عذر خواہی سوں لایا گلے

بی آیا جو کہانے کے نعمت جتی
میرے سامنے لیا رکھیا سب وتی

کھلایا مجھے لیا طعام ہو کباب
منگا ارغوانی پیلایا شراب

برس سات لگ یا علیؓ دستگیر
دیکھا ہوں جزیرے کیتک بے نظیر

جو کچھ تھا دنیاں کا تماشہ اصل
بیکھا یا خداوند مجھ کوں سگل

حکایت تیم انصاری کی جب سُنے
کہ یاراں عجب ہو رہے سب چتے

امیرالمومنین علی شیر نر
کہ فرمائے یکبار کوں زور تر

کتے یوں جو حمام میں اس لیجاؤ   حجامت کرو خوب اوسکوں نہلاؤ

(۲۳) اولیا

اولیا بھی اسی دَور کا شاعر ہے۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ آخری بادشاہ گول کنڈہ کے دربار سے اس کو تعلق تھا۔ قصہ ابوشحمہ کے نام سے اس نے ایک مثنوی ۱۰۹۰ھ میں مرتب کی ہے۔ اس کا نسخہ انڈیا آفس میں بھی ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ کے فرزند ابوشحمہ کے متعلق ایک قصہ درج ہے کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

عمرؓ کوں جو اس وقت فرزند ایک   خدا نے دیا تھا او دل بند ایک
اتھا حسن میں جوں او آفتاب   کہ روشن ہوا استے یو ماہتاب
عجب خوبصورت او دل دار تھا   عمرؓ کا جو اس پر بڑا پیار تھا
ابوشحمہ سر نانوں اس کا رکھے   دنیا میں نہیں کوئی ویا رکھے

صحابیؓ جتے تھے سو دل گیر ہو   عمرؓ کون کیے عرض تقصیر ہو
کہ شحمہ کوں بخشو تمیں پیار کر   وگرنیں تو ہمنا ستو مار کر
کہ شحمہ بدل سب کوں مارو تمن   اس مشکل ستے بہار کا پر دتمن
اصحابیاںؓ کون سمجھا کو بولے عمرؓ   شریعت کے باتاں کوں کھوئے عمرؓ

اصحابیؓ جتے تھے اپن ٹھار ٹھار
بھے رونے لگے سب وہاں زار زار[۳]

ہمارے خاندانی کتب خانوں میں بھی اس کے دو نسخے ہیں۔

(۲۴) خواص

خواص بھی اسی دَور کا شاعر ہے۔ غالباً خواص علی اس کا نام تھا۔ شاہی تقرب حاصل نہیں تھا۔ یہ درویش منش تھا۔ صوفی شاہ قادری سے بیعت حاصل تھی۔ ان سے خلافت بھی پائی تھی[۴]۔

۱؎ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔
۲؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۶
۳؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۶
۴؎ یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۷۔

اس کی ایک مثنوی انڈیا آفس[1] میں موجود ہے جو قصّۂ حسینی سے موسوم ہے اور ۱۰۹۰ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس میں حضرت امام حسین علیہ السّلام کے متعلق ایک فرضی قصّہ لکھا ہے، مگر آخر پر شہادت کے حالات مذکور ہیں۔

کلام کا نمونہ درج ہے ؎

تو سبحان ہے پاک پروردگار ۔۔۔ سدا ایک ہے توں اے برقرار
اگر چاہے دولت دنیا دار کون ۔۔۔ سو کرنا یزید کوں نکاح آج توں
دگر چاہے صورت حسن دار توں ۔۔۔ نکاح کر توں قاسم بن عباس کوں
اگر چاہے توں حق نے رحمت کرے ۔۔۔ بہی دنیا ہور عقبی بنے سر پرے
سو کرنا نکاح توں حسن جان کوں ۔۔۔ بولیا یو ہمارا سوچ ماں توں
اٹھا غلغل تب او تکبیر کا ۔۔۔ انھا شیر بالک حسین شیر کا
پریا جا غنم پر سواد تھہر ہو ۔۔۔ چلیا مارتا زہر پر زہر ہو
لگیا تورنے بے ضرب بے شمار ۔۔۔ منڈیاں نٹ غنیم کہاں پڑے ٹھار ٹھار

کیا سب دندیاں تیرات تل اپر
ماریا چہار صد سوار جنگی بشر[2]

(۲۵) غلام علی

غلام علی بھی تانا شاہ کے دور کا شاعر ہے وہ اپنے نام ہی کو تخلص کے بجائے استعمال کرتا تھا۔ غزل نما نظموں کی اس کو کافی مشق تھی۔ اس کی ایک مثنوی پدماوت، انڈیا آفس[3] کے کتب خانہ میں ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۹۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے پدماوت کا قصّہ مشہور ہے جو مختلف زبانوں میں منتقل ہوا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ہماری تالیف یورپ میں دکھنی مخطوطات سے حاصل ہو سکتی ہے، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

کہ ہے سب جگتر منے سات دیب ۔۔۔ سنگل دیپ اس میں کا ہے ایک دیپ
کہ او دیب میں ہے سنگل پدمنی ۔۔۔ نہ چینت نہ ہستن نہیں سنکنی

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۷

[2] " " " صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۷

[3] " " " صفحہ ۱۱۸ تا ۱۴۰

سنگل دیپ کے نار کا بات ہے — سنو میں کہوں گا او کس دہات ہے
اتھا ایک راجا سو بہو کن گنیر — سنگل دیپ کے ملک میں بے نظیر

غلام علی جس سوں دل لائے — بچھڑنے سوں بہتر جو جیو جائے
کتے خون دل سوں سو دل لاؤ نا — تو یک تل منے توڑ کر جاؤ نا
جنا ور کے جانے سے دک پائے — تو انسان خاطر نہ غم کھائے

چلیا اوڑ کے سات دریا گزر — تماشے جو دیکتا ہر یک ٹھار ٹھار
بنگالے میں یک خوش باغ تھا — جو جنّت کی دل رشک سوں داغ تھا
اتر واں لگیا سیر کرنے کتیں — جو میوے کے جھاراں پہ پرنے کتیں
وہاں کی قدیمی جو رانوی اتھی — ہیرامن کوں دیک آئی ملنے وتی
دیکھے جوں یو ہے بہوت شیریں کلام — ہوئی بہت خوشحال راتوں تمام

منگا کر ہیرامن کوں پوچھیا یو بات — کہیا سر بسر سب مہاراج سات
کہیا میں یو مطلب کتیں پائیا — نجومیاں کہے سو بجا آئیا
ہوا دل کوں تحقیق یو بات سب — جو بولیا اتھا پیر جس دہای تب

غلام علی نیں دنیا میں وفا — کدہیں ہے خوشی ہور کدہیں ہے جفا
کہ جوں کاندکا ہے چو نا زندگی — تو ہرگز نہیں کس کوں پا بندگی
دنیا کا یو ے کام کوئی سر اوپر — پھرے او کتے کے نمن در بدر
دو دن کا سو جینا نہ کر پائمال
توں ہٹ حرص کوں جو رہے خوشحال[1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

(۲۶) سیوک سیوک[1] کو بھی اسی عہد سے تعلق ہے۔ اس کے متعلق بھی ہمیں کچھ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ اس کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ یہ شیعہ مذہب کا پیرو تھا اور اسی دور کے ایک دوسرے شاعر لطیف سے اس کی چشمک تھی۔ جنگ نامہ ایک مثنوی اس کی تصنیف ہے، اس میں ایک فرضی داستان منظوم کی گئی ہے جس کے ہیرو محمد بن حنیفہ ہیں۔ اس کی تصنیف ۱۰۹۲ھ میں ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو اور کتب خانہ سالار جنگ میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔ ڈاکٹر بیلی کے خیال میں یہ مثنوی ابوالقاسم مرزا کی مصنّفہ ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے ؎

حنف شاہ کھڑے باند لشکر کی صف — کھڑے باند کر شاہ فرزند نجف
اوتھی دیں یزیدی آیکے بار مل — نیکے بار مل ٹہار پر ٹہار مل
حنف شاہ اوٹھائے ترنگاں سگل — سو بہائیاں عزیزاں برادر سگل
سو لشکر میں لشکر ملائی کیا — بشر میں بشر کھل بلائی کیا
اوٹھیا ہاں کہ ہنکار چور ہیب تے — اوٹھیا شور چو دہر تے جوہ آفتے
لگے مار پیٹ واراں کھیل — حنف شاہ کے مومن سوراں سگل
سو اتنے میں طوفاں موغان آئے — ترک راک پر دس ہزاراں اولائے

یو جنگ عظیما کیا سر بسر — تہی تاریخ ندھماں جاں خیر البشر
یو سیوک نو ہجری کرے سال تھی
ہزار یک نو دود کے اپرال تھی[2]

(۲۷) فائز فائز گول کنڈہ کا شاعر ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ دوسرے شعراء کی طرح شاعری اس کا پیشہ نہیں تھا بلکہ شوقیہ مشق سخن پیدا کرتی تھی۔ ۱۰۹۴ھ میں اس نے ایک مثنوی رضواں شاہ وروح افزا نام سے تصنیف کی ہے جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے۔ یورپ[3] میں بھی اس کا نسخہ پایا جاتا ہے۔ کلام

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۸
[2] وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔
[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

کا نمونہ پیش ہے۔

اس مثنوی کا نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی ہے اور دکھنی بورڈ کی جانب سے شائع ہوگیا ہے۔ مثنوی میں تاریخ تصنیف بھی نظم کردی گئی ہے۔

اتھا جس وقت سال ہجرت ہزار　　اس اوپر نود اس کے اوپر چہار
ہوا قصہ رضوان شاہ کا تمام　　نبیؐ ہور علیؓ پر ہزاروں سلام

نمونہ کلام :-

اوّل نام حق کا لے بولوں سخن　　بندوں اس کی توحید، کھولوں سخن
ہے اللہ معبود بر حق قدیم　　کہ رحمان ہے خلق پر ہور رحیم

نبیاں جو سنے اس اُمت کا صفت　　بسر جا اپس کا قرب منزلت
کہے کاش ہوتے یو اُمت ہمیں　　یو شن کر یکڑتے تھے ہمت ہمیں
نہ کر ہم کو محروم تو یا نبیؐ　　بد و نیک تیرے ہیں اُمت سبھی
جتے ہیں حکایات کے راد یاں　　تو قصہ انو یوں کیے ہیں بیاں
کہ تھا چین میں اک بڑا بادشاہ　　دورائی پھری اس کی ایک سال راہ
اس اطراف میں تھا جسے تخت و تاج　　اطاعت کریں ملک دیویں خراج
ولایت ملک کچ نہ تھا اس کو کم　　کسی کے طرف تے نہ تھا اس کو غم
چڑیا باپ کا تخت رضوان شاہ　　جمع ہو وزیراں بی سارے سپاہ
کرے کرنشاں ہور سر بھویں دھری　　کھڑے رہ کو دو دست خدمت گری
قدیمی وزیراں کو عزت دیا　　انو جیوں نصیحت کیے تیوں کیا
کیتک کو دے انعام کیتا نہال　　کسے مال دیتا کسے گوش مال
سنبھالا رعیت کو لشکر رکھیا　　عدل سوں ملک میں بڑا ڈر رکھیا
کبھی بادشاہی کے کاماں چلائے　　کبھی دل منگے تو سواری کو جائے
کیتک سات لے اپنے چابک سوار　　کرے جا جنگل کے جناور شکار

یوسن شاہ اس کی کرے دلبری　　دلاسا کری بہوت اس کو پری

جیسے لگ او صحبت سوں خورسند تھے — مقرب او دونو کے دل بند تھے
انکھیا اس کی ٹھنڈی دل اس کا قرار — اوّل کی مشقت خوش آئی بار[1]

(۲۸) لطیف غلام علی خاں لطیف[2] سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے۔ امرائے قزلباش سے تعلق تھا۔ شاعری تفنن کی خاطر کر لیا کرتا تھا۔ اپنی امارت اور شرافت کے ساتھ اپنے حیدر آبادی ہونے پر اظہارِ فخر کرتا ہے۔ بڑا پُر گو شاعر تھا۔ صرف ایک سال کی مدت میں پانچ ہزار پانچ سو شعر کی مثنوی لکھ دی۔ مرثیہ بھی کہا کرتا۔

اس کی مثنوی "ظفر نامہ" ۱۰۹۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے، اس میں بھی جنگ نامہ کی طرح محمدؐ بن حنیفہ کے متعلق ایک فرضی داستان ہے جس کی تفصیل اور اختلاف وغیرہ ہماری تالیف موسومہ یورپ میں دکھنی مخطوطات[3] سے معلوم ہو سکتی ہے۔

یورپ میں اس مثنوی کا ایک نسخہ ہے۔ کسی اور نسخہ کا پتہ نہیں چلا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے

کروں ابتدا بسم اللہ تے — مدد منگ تے بسم اللہ تے
کہ اوّل کروں وصف اللہ کا — جنے دیا الا اللہ کا

کہ فی الجملہ کر بولتا ہوں عیاں — مرتب کیا ہور کہاں سو بیاں
تھا جب دور سلطان شہ ابوالحسن — شہر حیدر آباد ان کا وطن
کیا تب ظفر نامہ کا میں بنا — مرتب کیے لک سونا چپ رہنیا
سنہ یک ہزار و نو و پانچ پر — بنا کر مرتب کیا یو اچھر

قزلباش فرونیلو آزاد ہوں — ولے زادۂ حیدر آباد ہوں
ہوں سلطان عبداللہ کے دور کا — شجاع ہور سخا ہوں بڑے طور کا

---

[1] مطبوعہ نسخہ رضواں شاہ۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۴۹ تا ۱۵۴، ۱۵۵ تا ۱۷۴۔

[3] 〃 〃 〃 〃 〃

جب کفار کا صف نمودار ہوا — تب اسلام کا تیز تردار ہوا
اوہر تے فرنگی وزنگی کدھنک — خبردار ہو مگ کر ساز جنگ
سگل ٹوپیاں پیں ہودا سری — بنداسب خراں تیں سری پاکھری
فرنگی سوباجا کیے دہات کا — بجاتے جیوں وجال کم ذات کا
دمامہ سو جوں فیل کہ کوہ زیتوں — نفیری سو جوں جند کہ سوز یتوں
نشاناں سو جوں دہوتراں کے مثال — کھڑے کھول صف بند ہو کالا اکھول
کیتے ان میں دستے تھے جوں دہوتری — کتے ان میں شیطان کے تھے پرتری

محمّد حنیفہ تے صف صفدری — نشاناں کھڑے کھول کر حیدری
طبل حیدری یوں تو بجنے لگیا — کہ جوں جگ پو بادل گرجنے لگیا
یو سن کر صدا تب حصار دمشق — لرزنے لگیا جور چھکڑی کا عشق

جنگل گھاٹ سب لہو تے بھر گیا — اچنبا عجب کام شہ کر گیا
خوارج کی جب لہو کی ندی چلی — کہ پاتال لگ سو دہرتے ہلی
لہو میں سو گویار لگیا تیرنے — چلے کرنا فرنا اچا سیر نے
یکایک تو آسماں پر سے صدا — دیا غیب سے سو ہاتف صدا[1]

(۲۹) **افضلؔ**

شاہ محمّد افضل نام اور افضلؔ تخلص، اسی دور کے شاعر ہیں، ایک صوفی بزرگ تھے۔ میراں شاہ معروف سے بعیت کی تھی، افضلؔ کو ان کے مرشد نے اپنے خلیفہ شاہ سلطان کی تربیت میں رکھا تھا، چنانچہ افضلؔ نے اس کا اعتراف ان اشعار میں کیا ہے ؎

میراں شاہ معروف اودستگیر — کہ دل میرا کر پاک روشن ضمیر
دے دست پنجہ بھرے ساتھ میں — دے مجہ کوں سلطان کے ہاتھ میں

افضلؔ کی ایک مثنوی "محی الدین نامہ" اور ان کا قصیدہ ہمدست ہوا ہے۔ محی الدین نامہ میں حضرت

---

[1] ظفرنامہ۔

سیّدنا عبدالقادر جیلانیؒ کے کرامات اور آپ کی فضیلت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

"محی الدین نامہ" کے قلمی نسخے اکثر کتب خانوں میں ہمدست ہوئے ہیں۔ چنانچہ کتب خانہ سالار جنگ[1]، کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ لائبریری) کے علاوہ یورپ[2] میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔

افضل نے قصیدے بھی موزوں کیے ہیں اور خود کو قصیدہ گوئی میں "ہادی الشعراء" ہونے کا دعویٰ کیا ہے، البتہ وجہی کو اہلِ کمال تصوّر کرتے ہیں۔

میں اس وادی میں ہوں ہادی ہدایت مجھ تے پایا ہے
جتے آتر، جتے چاتر، جتے گیانی، جتے گنبھر

افسوس ہے کہ ہم بعض دوسرے شعراء کی طرح افضل کے انتقال کے سنہ سے واقف نہیں ہیں اور "محی الدین نامہ" کی تصنیف کا سنہ بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ آپ کا سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں موجود ہونا ثابت ہے کیونکہ سلطان کی مدح میں آپ نے قصیدے موزوں کیے ہیں۔ آپ کا نمونہ کلام پیش ہے:۔

"محی الدین نامہ" کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

تو ہی قطب عالم محی الدین قدیر — دو جگ ہے تیرے پاس میں دستگیر
تو ہی چاند تج نور دو جگ منے — تو سلطان روشن مربی کنے
محمدؐ کی اولاد میں تو رتن — علیؓ فاطمہؓ کے تو دل کا چمن

کیا ہے قلم لوح قدرت بیاں — ہوا پل میں تج شاہ کو سب عیاں
محی الدین سلطان سو پیر ہے — دنیا و دیں میں او جہانگیر ہے
ولیاں میں تجے بادشاہی ختم — جتے سب ولیاں پر ہے ان کا قدم
کتے غوث ہور قطب اوں کوں — لیے چاون سوں دو ابیں سیس پر

---

[1] فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔ صفحہ ۴۸۷۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۷۵۔

مریدایک شہ کا گنہ گار تھا اجل تے ہوا جیو تن سوں جدا

قبر میں غضب سوں دو منکر نکیر پوچھے آکے اسے بندگان دلپذیر

خدا کون تیرا ہور کون ہے رسول تو دے جواب ہمنا کریں گے قبول

کہا اے ملایک کرو تم قبول محی الدین میرا خدا ہور رسول

کہے پھر کر تیرا او کون دین ہے کہا کس نجانوں محی الدین ہے

یزاں بھی ملایک عذاباں سنگات لگے مارنے اسکوں گرزاں کے ہات

عیاں جب ہوا پیر کو یو احوال لیے پیٹ سوں دیں کھرے رہے سبھال

ڈٹارے فرشتیاں کو اسے بی کٹر کی کرتے ہیں میرے مرید پر خطر

نگہباں ہوں میں سو سن جان کا دیلوں ہار ہوں دین ایمان کا

جسے پیر سلطان ہے سر بسر غضب کا تمارے اوسے کیا ہے ڈر

افضل کے قصیدہ کا نمونہ :-

میرا مکھ بھاگ لوچن لب تے پایا ہے موہن سُندر
جلا سورج گلا چندر ستارہ جوت رنگ عنبر

ترے لب، ونت ہور جوبن، بچن دیکھ لاج تھے پکرے
گلے سُرخی سو موتی خوے ہیرا سخت جل جوہر

تین گھایل ہے، دل زخمی، سو تن مجروح، سینہ ریش
تو قد برچھا فرنگ سو کا پلک کپھوا بھنواں خنجر

مشک جوتی الک عنبر سو خوی گلاب، تن صندل
نین سر خود ادھر راواں کمر شہ زہ چلن کنجر

برا غمزہ قہر عشوہ ظلم ہے ناز آفت چھند
کہ مکھ معجز نیں تونا ادھر تاوں بچن منتر

رچھایا ہور بھلایا سد گنوائے سد کیا موہن
ترا ہنسنا، ترا جلیا، تیرا کسوت، تیرا زیور

---

[1] محی الدین نامہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

سکی آمل چتر سلطان عبداللہ غازی سوں
کہ جگ ادھار، جگ سنگار، جگ جھلکار، جگ پرور

مہا دانی، مہا گیانی، مہا چاتر، مہا جانی
بلند طالع، بلند دانش، بلند ہمت، بلند اختر

دلیری ہور شجاعت کے لیے تعریف لکھنے کے
ملک کاتب، فلک کاغذ، قلم لیکش، بدل مسطر

تجہ ایسے شاہ کوں ہونا سو وجہی مبارک شاعر
نپٹ عاقل، نپٹ کامل، نپٹ گیانی، نپٹ گنبھر

خدا ہور مصطفےٰ، ہور مرتضیٰ، ہور کل ولی رکھنے
تیرے کوٹاں، تیرے شہراں، ترے قلعے، ترے کشور

دکھن میں شعر تھا افضل، ولے ایسا نہ تھا حقا
یتا نرم ویتا گرم، ویتا شیریں، یتا دلبر

میں اس وادی میں ہوں ہادی ہدایت مجھ تے پایا ہے
جتے اتر، جتے چاتر، جتے گیانی، جتے گنبھر[1]

(۳۰) فتّاحی

محمد رفیع نام اور فتّاحی تخلص، اسی دور کا شاعر ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے متعلق بھی تفصیلی معلومات ہمدست نہیں ہوئے، البتہ اس قدر پایا جاتا ہے کہ فتّاحی کو شاہی دربار سے تعلق نہیں تھا۔ مذہبی شخص تھا۔ قادریہ طریق میں منسلک تھا، اس کی دو مثنویاں ہمدست ہوئی ہیں، ایک "مفید الیقین" سے موسوم ہے اور دوسری "شعب ایمان" ہے، مفید الیقین میں آنحضرت صلعم کے مختصر حالات، سراپا اور نور محمدی، معجزات کا تذکرہ ہے یہ مثنوی ۱۰۹۵ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ اس کے دو قلمی نسخے، سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہیں[2]۔ دوسری مثنوی جو شعب ایمان سے موسوم ہے۔ ۱۱۳۰ھ میں مرتب ہوئی ہے اس میں فقہ اور عقائد کے ایک سو مسئلے درج ہیں اس کا بھی ایک نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود

---

[1] رسالہ اردو کراچی۔ اپریل ۱۹۵۰ء۔

[2] فہرست کتب خانہ سالار جنگ۔ صفحہ ۱۴۵ و ۲۳۵

ہے۔[1] نشاطی کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

بی بی خدیجہؓ سے شادی کا حال اس طرح لکھا ہے :۔

گئے ہیں محمدؐ اپن گھر کوں جب | لگے بیا کا سامان کرنے سو تب
مرتب ہوا بیا کا سامان سب | کیے ہیں خدیجہؓ کو معلوم تب
خدیجہؓ بھی سامان سب کچھ کیے | بوطالب کنتیں یو خبر تب دیئے
بولائے قریشاں بو طالب نے سب | بولائے ہیں بعضی جتے تھے عرب
قبیلے قریشاں کے سب آ ملے | عجب نورعینی کے در سب کھلے
نبی نے عمامہ بندے سروری | پہنے تن پہ جامہ سو پیغمبری
بلند قد اتھے لیلۃ القدر سوں | جھمکتا اچھے موہنے بدر سوں
سیہ زین و اللّیل یغشیٰ کے جوں | منور جبیں والضحیٰ کے سو تیوں
سو خوش مون اتھا نور پر نور جیوں | ہزاراں سوں شرمندہ ہیں سورجیوں

ایک اور نمونہ :۔

محمدؐ نبی یوں فتح بازی کیے | او ملعون کوں یوں ہزیمت دیئے
گیا نٹھاٹ ملعوں اپس گھر کنیں | محمدؐ اپس گھر کوں تب آئے ہیں
ہزیمت دے ہیں جو دشمن کو جب | محمدؐ کے یاراں تھے خوشحال تب
خجل ہوا بو جہل گھر میں رہیا | بلا اپنے یاراں کوں یوں کر کہیا
محمدؐ سو تپال زور اوار سیں | سو قاصہ محمدؐ میں کچھ روز تھیں
کہ جس بات آتے ہمیشہ ہمیں | پریا ہے پھتروان منو دیکھن تمیں
صبا خاص ہر عام مجلس کریں | اور پھترے کو درمیان لیا کر دھریں
بلا بھیج جینا محمدؐ کوں تو | محمدؐ بلانے میں آوے گا جو
قریشاں کوں یک دہرتے حاضر کریں | یو طالب کے تیں کیا کہ خاطر کریں
محمدؐ کا بڑا قبیلا ..... جتا | ہو حاضر دونوں طرف .....
ملے دو قبیلے دونوں طرف جب | .... محمدؐ کوں لے جائیں تب

---

[1] فہرست کتب خانہ سالار جنگ. صفحہ ۱۸۵ و ۲۳۵

ہنرزور میں ہوں فاضل بہوت — پھوانہ ہور کشتی میں کامل بہوت
محمدؐ میں اتنا کہاں زور ہے — مکے میں میرے زور کا شور ہے
اٹھاؤں یو پتھر یکوں یکسار میں — اوٹھا یوں پھرتا اویک ہات میں
تماشا یو سب خلق دیکھیں گے جب — عجب ہو کہ شاباش بولیں گے سب
محمدؐ کوں بولیں اٹھانوں سو اب — محمدؐ اٹھانیں سکے گا سو تب
محمدؐ کھو شو ہو کر تب جائے گا — خلق میں خجل ہو کر غم کھائے گا

تاریخ تصنیف، مثنوی کا نام اور تخلص کے اشعار یہ ہیں۔

سو ہجرت بعد از برس یکہزار — نو د پر اتھا پانچ کا بھی شمار
اوسی میں مرتب ہوا یو تمام — کر صلوٰۃ بھیجو نبیؐ پر مدام
یو فتاحی تیرا کمینہ غلام — ترے سو نچہ دل باندھیا ہے مدام
کیا خوش بیاں یہاں معجزا یو تمام — فتاحی ہے محمدؐ نبی کا غلام
مفید الیقین ناؤں اس کا تو جان — مو قوف یقیں کون ہے اس سوں جانؐ

شعب ایمان کا نمونہ:۔

کہوں حمد و ثنا اس پاک ربّ کون — جینے پیدا کیا خلقت عدم سوں
شرف دیا خلق میں سب بشر کوں — شفع کر مصطفیٰ روزِ حشر کوں

محمد رفعتی ناؤں اپنا دھریا ہوں — سو فتاحی تخلص اب کیا ہوں
سو شعب ایماں رفعتی اس کا کیا نام — تو کر اب آخرت کے سب انجام
ہزار یکسو پرس تیں اب برس میں — مُنے ہیں سال ہجرت کے سمج میں

جو افضل شاخ کلمہ کوں تو جاں — فرشتاں تیں ایماں درجا پہچان

بھی پانچواں شعب سو روز حشر سوں — پی ایمان خشدل اے بشر توں

لہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ ۵۲،

چھٹایو شعب تو ایمان لائے   خبر سوں اٹھنا سب پر نیچ پچھتائے[1]

(۳۱) سالک

بعض اصحاب سالکؔ کو بھی اس دور کا شاعر قرار دیتے ہیں اور اس کو سالکؔ یزدی تصوّر کرتے ہیں۔ اس کے کلام میں نازک خیالی شوخی اور جدّت پائی جاتی ہے ؎

مجھ چیٹی لگی ہے تجہ چنچلی کی چٹ نین
جیو کھٹ کتا کر دن میں رہتا نہیں ہے کت نین

میں بچہ تیں مجنوں کیتے ہیں دشمناں گی
تجہ ایک مجکوں ماری ستی پرم کی چھب نین

برہ چلیاں سوں تل تل ہٹ ٹٹ کتا کریں گی
اب ہٹ بھری ہٹیلی کی توں پڑی ہے ہٹ نین

تجہ لٹ پٹا کتا سوں لٹ پٹ ہے یوں جیا مجھ
جیں آملک رہیا ہے غمزا تیرا گھنگٹ نین

خوبی نیں کون تیرے کچھ پند بول بالے
بتیاب دل کیے ہیں سو کے کے بک اوپٹ نین

کوئی سحر ساری کا دیکھے نہیں تو دیکھو
رستی آدکھی لٹکا دھن کی لٹکتی لت نین

نے دیس تے ہوا ہے بے قید بہوت سالکؔ
اما اپنال سپڑیا خوباں کے خوب کٹ نین

پرت کی ریت کا روضہ سدا رکھتی ہوں سر تھار
کرم پانی نین کا لے ملو میں اب سموتی ہوں

سکھیاں سب چھوڑ دیو مجکوں مرا اے کام ہے نازک
پیا کا نقش مجھ دل کی پٹی اوپر گروتی ہوں

---

[1] شعب ایمان مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

سکھیاں سوں سب برابر کر نہ دیکھو تم مجھے سالک
مجھے کنھا میں جوڑو کہ میں غلطاں موتی ہوں[1]

(۳۲) میاں نوری

نوری کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں۔ بقول میر حسن سید شجاع الدین نام تھا۔ تاناشاہ کے وزیر سید مظفر کے بچوں کو تعلیم دیا کرتا، لوگوں نے حسد سے اس پر تہمت لگائی اور گول کنڈہ سے وہ نکالا گیا۔

نوری اپنے دل کی کسی سے نہ کہہ بتھا
حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا[2]

مت ہو سرگرداں سر بجن سو لبسو | بہراز سر گشتہ مت پھر کو بکو
حق کے جانب کوں لیاؤ پاک رو | ہرچہ داری صرف کن در راہ او

لن تنالوا البر حتی تنفقوا

مت ہو آشفتہ خوف ہجر سوں | رکھ اُمید فیضِ حق کے بدل سوں
نامور ہو جگ میں جو دو منزل سوں | مت ہو نا امید حق کے فضل سوں

حق کہا مصحف منی لاتقنطوا

سختی دوراں سین کچھ مت فکر کر | ترک النکار یا حض مکر کر
نام حق کا روز و شب توں ذکر کر | اس کے نعمت کے اوپر توں شکر کر

بوجھ نکتہ واشکر ولا تکفروا

آفتِ دوراں ستے کر صبر جاں | صبر سوں پاوے گا تو مقصود جاں
سن حدیثِ صبر مفتاح الجناں | کھول کر بھی دیکھ توں اندر قرآں

صابری کے تال حق ہے فصبروا

مت ہو جن ہیم کا پیالا ہوا | اونی سودائی جنوں سودا کیا
سیس اپنا کاٹ دل برکو دیا | اونی دل برا پنے کوں دل پر لیا

دی ملا توں مری پیا سوں ہو نیو[2]

---

[1] رسالہ اُردو اپریل ۱۹۵۱ء

[2] بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

(۳۳) **کیشو**

کیشو سوامی نام اور کیشو تخلص، حیدر آباد وطن ۱۶۲۱ء میں ولادت اور ۱۶۸۲ء میں انتقال ہوا۔ سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھا۔ تلنگی، دکھنی، مراہٹی اور کنڑی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اوّل الذکر تین زبانوں میں بھجن لکھے ہیں۔ کیشو سوامی کے استاد دکن کا مشہور فلسفی شاعر رام داس تھا۔ کیشو سوامی کا شہ کار" اکادشی چرتر" کے نام سے موسوم ہے۔ ایک دوسری کتاب جو مراہٹی میں ہے الہنگ سے موسوم ہے۔ کیشو سوامی کے بھجن تصوّف کے مسائل سے مملو ہیں۔ ان میں ترکِ دنیا، حرص وہوس سے کنارہ کشی، طمع اور بغض وحسد سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے کیشو سوامی کے شاگرد بیسوں تھے جو دکن کے مختلف حصّوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے دو شاگرد یعنی شیورام اور سنت راج نے مرہٹی ادب میں اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

کیشو سوامی کے دکھنی کلام میں سادگی، برجستگی، صفائی موجود ہے اور کلام اثر انگیز ہے۔ کیشو سوامی کا انتقال حیدر آباد ہی میں ہوا۔ ان کی سمادھی حیدر آباد کے محلّہ جیا گوڑہ میں ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے کیشو سوامی کے متعلّق ایک تفصیلی مضمون علی گڑھ کے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۶۴ء میں شائع کیا ہے۔

قطب شاہی دور کے یہ ہندو شاعر ہیں جن کا دکھنی کلام پیش ہے ؎

تو گرد کا عمل کھارے بھائی اس عمل کوں بہوت مٹھائی
گروکر پا بیں کیشو لذت پایا توں اپنی سد آپ گنوائی
ست گرو ناتھ کا عمل سچ اس عمل میں صاحبِ دست
گروکر پائیں کیشو عملدار عمل دکھائے اپنا دیدار
تم لیجیو بھائی ایک ہی بار اس عمل کوں چڑنا اوتار

تم سنیو پنڈت میری بات تم آتما کی مت بھکانوں زیات
نرگن برہما بم پڑھے ہیں شاستر توں پھر کیسے غفلت کھاوے
توں نرگن برہما کوں تم نہیں جانے توں کاہے بھکانے شاستر کے معنی
آپس کون بسرے آپس حیانے دیکھو پنڈت کیسے دیوانے

من سے گنگا من منے جمنا من سے سدا شیو گرد بتائے
من سے جمنا من منے دوارکا من منے برنداون سکھائے

کام کرو دو مد تسر چھوڑ کے یو سنسار ساگر ترنا ہے
کہیں پاؤں نکل جائے نہ یاں سنبھل کے چلنا ہے

میرے حق میں دیا رام میرا مار چلا یا کام
لیجیے اس دھن کا ناؤں کیجیے بار بار سلام

دکھلا کر سبت برے اندر کیا
چست کوں یو انعام دیا کیشو کوں نہال کیا

تالی بجاؤں گاؤں رام کا ناوں ہور لوگاں سوں نین میرا کام
گلے میں تلسی من منے شیام بجتے دیکھوں نت رام ہی رام
اندر رام باہر رام رام بنانیں خالی ٹھام
کیشو کہوں پربھو دیکھنا بسرام

جو مانگے اوسے بھر دونیوں گی ہور متوالن ہو جاؤں گی میں
مدن گوپال کے گن گاؤں گی کرین تالی بجاؤں گی میں
بندراون کوں چلی جاؤں گی میں بندراوں کو چلی جاؤں گی میں
بن مالی سوں من لگاؤں گی گلے میں مالا باندھوں گی میں
کیشو سائیں کی گت پاؤں گی میں پاؤں گی پھرین اونگی میں[1]

تبصرہ :۔ صفحات گزشتہ میں قطب شاہی دور کے شعراء کا ہر قسم کا کلام پیش کیا

---

[1] اخبار "ہماری زبان" انجمن ترقی اردو علی گڑھ مورخہ ۱۵ ر فروری ۱۹۶۴ء۔

گیا ہے، جس سے ان کے اسلوب بیان، طرز ادا، تخیل کی پرواز، خیالات اور افکار کا عمق، زبان کی صفائی وغیرہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے چونکہ قطب شاہی عملداری پورے تلنگانہ میں پھیلی ہوئی تھی اور کچھ حصّہ کرناٹک میں شامل تھا اور پھر مہاراشٹر سے بھی تعلقات تھے، اس لیے قطب شاہی اردو میں مرہٹی اور کنڑی الفاظ سے زیادہ تلنگی الفاظ ملتے ہیں۔

مثنوی، قصیدہ اور غزل کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری سے انہوں نے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، غزلوں میں تغزّل کے ساتھ تصوّف بھی شامل ہے۔ مثنوی میں رزم اور بزم دونوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ قصیدوں میں شان وشوکت اور طمطراق نظر آتا ہے۔ دو سو سال کے طویل عرصہ میں دکھنی شاعروں نے ارتقائی مدارج طے کیے ہیں۔

اس تفصیل کے بعد اب اس دَور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

دَورِ قطب شاہی کی نثر

اُردو نثر کی ابتدا کا تذکرہ ہوچکا ہے اور بہمنی دَور کی نثر کے نمونے بھی پیش ہوچکے ہیں، اب قطب شاہی دَور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے اس امر کی صراحت ہوچکی ہے کہ سلاطین قطب شاہی علم و ہُنر کی ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہے اور اصحاب علم وفن کی سرپرستی میں کبھی دریغ نہیں کیا۔ سلاطین اور امراء کی قدردانی کے باعث نثر کی بہت ساری کتابیں اس دور میں مرتب ہوئی ہیں نہ صرف تصوّف بلکہ دیگر فنون میں بھی اس دَور کی نثر کی کتابیں ہمدست ہوئی ہیں۔ صفحات آئندہ میں اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) میراں جی حسن خدانما

سلطان عبداللہ کے عہد میں شاہی ملازم تھے اور سرکاری کام پر بیجاپور روانہ کیے گئے، یہاں حضرت امین الدین اعلیٰ سے بیعت حاصل کی، فیضِ باطنی پایا۔ کہتے ہیں صرف ایک صحبت میں آپ نے کئی مدارج طے کرلیے۔ مرشد نے اپنی خلافت دی۔ بیجاپور سے حیدرآباد آکر مسند مشیخیت پر بیٹھے اور خلق اللہ کی ہدایت میں مشغول ہوئے۔ ۱۰۷۷ھ میں انتقال ہوا۔ مستعد پورہ کاروان ساہوان حیدرآباد میں آپ کا مزار ہے اور زیارت گاہ عام وخاص ہے۔

لہ تذکرہ اولیاء دکن حصّہ دوم۔ صفحہ ۹۰۰

آپ نے دکھنی یا اُردو زبان میں کئی رسالے لکھے تھے جن میں شرح تمہید ہمدانی یا شرح تمہید قابلِ تذکرہ ہے۔ آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ شرح تمہید ہمدانی ایک تصوّف کی کتاب ہے جو امام غزالی کے بھائی شیخ احمد کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔

اس کتاب کے قلمی نسخے حیدر آباد کے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"اللہ بڑا صاحب ہے، اسکوں بہت سرانا، ہور بہوت نوازنا کہ اس کے خدائی سے دونوں عالم پیدا کرنے میں عقل گیان انکھیاں حیران ہیں، خدا دائم قائم ہے اس کی بندگی کا مہر سب پر ہے۔ ہور خدا اکیلا ہے۔ پیدا کرتا ہے، ہور مارتا ہے سب کوں نا اپنے ہاتھوں کرتا ہے، نہ دوسرے فرماتا ہے۔

"خدا کہیا محمدؐ جے کچ فرماتا ہے۔ سو تمیں کرو، بھجیا ہوں، تمنا پر پند کہنے اے دوست تمیں قرآن کے حرفاں کالے دستے ہیں، اجلے کاغذاں پر سونظا ہر قرآن یعنی خداکیاں باتاں۔ اس کالے ستراں میں نور تو نا دیکھیں اسے مخلوق کہتے ہیں"۔ "اے عزیزاں، اے بات نہیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کیے باج نہیں سوار ہوتے، ہور گھوڑے ہیں کچ گھوڑے اچھے تو بھی قبول کرتے۔ یعنی پیر کے عشق میں پہنچیا ہوئے باج خدا کے عشق میں تا آسک سی ہور دیکھ نا سکسی۔ اگر عشق خالق نداری بارے عشق مخلوقے مہیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کا بل نہیں تو اوّل اپنی پچھانت کر، سو اے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نوازنہارا ہے، ہور اس کا اجالا جالنہارا ہے۔ یعنی دوست سو نوازنہایا ہور خوبیاں دینہارا، وے اس کا محبّت اسے دگداتا ہے۔ یعنی معشوق کا محبّت عاشقاں کو گالتا ہے۔ اس کے فراق میں اے مقام ایسا ہے جو عاشق معشوق باج جی نہ سکے۔ باج دیکھے معشوق کا صورتِ عاشق کہاں انکھیاں کون جالتا ہے۔ ہور اپنا رنگ کرتا ہے[1]"۔

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

"ایمان کی حکمان کا معرفت ہور نماز احکام ہور ارکان پچھانتا تمام مسلمان پر فرض ہے کہ سب کوں اس کی پچھان فی چھٹکارا ہے۔ ہور آخرت میں خدا کے عذابوں گرفتار نا ہوے گا۔ اگر تجے پوچھیں کہ ایمان کیا ہے بول تو ایمان اقرار کرنا ہے ظن کے تیئں ہور استوار کرنا ہے۔ دل میں خدائے تعالیٰ ایک ہے مقر اس یک خدا خارج دوسرا نہیں ہے۔ ہور جو کچھ کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے نزدیک تھیں لے کر آئے ہیں سو حق ہے، راست ہے ہور فرشتے ہور آدمیاں پریاں یو سب خدا تعالیٰ پیدا کیا، اگر تجے پوچھیں ایمان مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے۔ لبعض بولتے ہیں کہ ایمان غیر مخلوق ہے اور بعضی بولتے ہیں مخلوق ہے۔ دورویش یہ ہے اوّل ایمان اقرار کرنا ہور استوار رکھنا یو فعل بندے کا ہے۔

(۴) وجہی

قطب شاہی دور کی نثر کی زبردست کتاب "سب رس" ہے جس کو ملاّ وجہی نے تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب کے کئی ایک قلمی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔

ملاّ وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد ۱۰۴۵ھ میں اس کو مرتب کیا ہے، جس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے یہ تصوّف کی ایک بہترین کتاب ہے جس کو فرضی قصّہ کے طور پر لکھا ہے جگہ جا بجا مختلف عنوانات مثلاً ذکر لاالہ، معراج عشق، مذمت طمع، اطاعت مادر و پدر، صبر و شکر پر کافی بحث کی ہے۔ انسانی جذبات کی حقیقت اور کش مکش کو جس خوبی سے فسانہ کی صورت میں پیش کیا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ عقل و دل، عشق، حسن وفا، مہر، غمزہ، ناز، نظر، خیال عاقبت، ہمّت، دیدار وغیرہ نام دیئے ہیں۔ بہرحال یہ کتاب نہ صرف تصوّف کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی نایاب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی کیونکہ ایک صدی سے زیادہ تک اس کے نسخے مرتب ہوتے رہے ہیں۔ کتاب کی عبارت مقفیٰ ہے۔ مختلف مقامات سے نمونہ پیش ہے:۔

"تمام مصحف کا معنی الحمد للہ میں ہے مستقیم۔ ہور تمام الحمد للہ کا معنی بسم اللہ میں ہے تدیم۔ ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کی نقطی میں رکھیا ہے کریم

یو سخن اثر کرے گا مست بے خبر کرے گا۔"

"یتوں بادشاہ ہور بادشاہ کے دوستاں بادشاہ کے عزیزاں بادشاہ کے خویشاں قرابتیاں بادشاہ کے پیاریاں پیارے مانتے منگہارے بادشاہ کے خدمت گاراں دولت خواہاں دعا گویاں، امیدواران سب اپنی مراد کوان پروانع کوں غیب کی نعمت ان پر رزق فراخ اچھو ہمیشہ بعیش و عشرت اچھو دایم بدولت اچھو عافیت بخیر اچھو ایمان سلامت اچھو۔ آمین یارب العالمین۔"

یہ کتاب اب انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ نے اس کتاب کے متعلق بڑی اچھی صراحت فرمائی ہے۔

(۵) میراں یعقوب

اس دور کے ایک اور مصنف میراں یعقوب ہیں جنہوں نے شمائل الاتقیا تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب تصوف میں برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا ترجمہ اسی نام سے میراں یعقوب نے کیا ہے۔ جو ۱۰۷۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔[1] یکم ربیع الثانی ۱۱۶۳ھ کا لکھا ہوا نسخہ میری نظر سے گذرا ہے۔[1]

میراں یعقوب ایک صوفی بزرگ تھے۔ سیّد میراں حسینی چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے، سیّد میراں حسینی خدا نما کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، سیّد میراں حسینی کے فرزند سیّد امین الدین تھے جو اپنے باپ کے بعد ۱۰۶۴ھ میں مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے، ان ہی سیّد امین الدین کی فرمائش پر میراں یعقوب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ میراں یعقوب کے حالات ہمدست نہیں ہوئے۔

کتاب ضخیم ہے۔ نفس مضمون کے پہلے ایک طویل فہرست ان کتابوں کی دی گئی ہے جن سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے جن میں تفسیر کی پندرہ حدیث کی، نو فقہ کی، بیس اور دیگر کتابوں کے سو سے زیادہ نام درج ہیں۔

یہ کتاب جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تصوف میں لکھی گئی ہے۔ اس کو چار قسم اور نوے بیان میں تقسیم کیا گیا ہے۔ توبہ، عملِ حمیدہ، ہدایت و ارشاد، معجزہ و کرامت، حکمت، بیعت، در حکم مرید، آدابِ مرید، حکمِ نماز، علمائے نیک استقامت وغیرہ عنوانات قائم کیے ہیں۔ مختلف مقامات

---

[1] کتب خانہ آصفیہ۔

سے نمونہ پیش ہے :۔

"اپنی حیات کے وقت منجے اشارت کیے تھی جوں شمائل الاتقیاء کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوی تا ہر کسی کوں سمجھا جاوی اس وقت منجے بیا نہیں تاکہ یک ہزار ستر پر اٹھوں سال کون رحلت کیے پر ان کے بھانجے عارف حق رسیدی عارف وریکی نور دیدی مصطفےٰ کی کلیجی ہور مرتضیٰ کے نین شاہ میران ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زمانے میں کتاب لکھنے کا شروع کیا جی کچھ مشکل آتا تھا۔ سو پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا۔ جب خدا کی توفیق سوں کتاب تمام ہوا ہور حضرت شاہ کی حضور ہور محقق کامل موحد واصل شریعت کے موافق بابا ابراہیم خلیل کے اس کی لے کر مطالع فرما کر خوش کیے۔"

"حمد وثنا واصفیا کی کناں ہور خصلتاں کی نمن بعید و بی پایاں ہور سرانا ہور بکھا سا اولیا ہور انبیاں کیاں نیکیاں ہور اس کے صفتاں کے بہانت بے گنست ہور بے انت اس پاک ذات کوں واجب ہور سزاو رہے۔"

"شیخ احمد غزلی فرماتے ہیں کہ غیر خدا بخشش، سو مردا نہ ہونا جو خدا باج کیسے چیز طرف موں نہ پھرادی ہور سب موجودات کوں معدوم کر جیانے یعنی جیکچھ چیزاں تو عالم ہی سو نھیچہ کریو جیپ ہور بہوت اونچی ہمت کا ہونا جو دین ہور دنیا کے تمام قرب ہور مراداں اگر آدے دیوی تو اس طرف رجبی نا کرے تو مازاغ البصر وماطغیٰ کے صفت پاوی۔ ہور ہمیشہ ظاہر کا تجرید ہور باطن کا تفرید اچھی ہور بہوت بار بردار اچھی جو خدا کے بندی اسیتی بچک کر کناری نا ہویں اگر کسی مرید تھی کچھ سہو ہور خطا ہو کر اوی تو عفو کری ہور نصیحت معجزہ اور کرامت کے ذکر میں اس طرح بیان کیا ہے :۔

"ہور ولیاں کوں کرامت ہے کہ اینو پورا علم دھرتے ہیں۔ ولے مغلوب ہور بے خود ہیں جیکچھ اینو تھی ظاہر ہوتا ہے سو اسے کرامت کہتے ہیں اما معونت اوہی جو بعضے دیوانے جو پورا علم و معرفت نہیں دھرتے ہیں انو تھی کچھ خرق عادت یعنی کدھن نہیں ہوتا ہے سو چیز ظاہر ہوتا ہے ہور استدراج اسے کہتے ہیں جو بعضے بے ایمان لوگاں کچھ سحر ہور منتر ہور اس وزان کے چیزا ظاہر

کرتے ہیں :

یو تمام اسرار رموزاں عالم جبروت کے کہاں
تج سکتے ہے لوگاں ناسوں کے

یو سمجھتا راز و رموز ہے کار خاصوں کا
جنو پانی ہے حق کرم تے مریتی لا ہو کے

(٦) عابد شاہ

عابد شاہ قطب شاہی آخری دور کے صوفی بزرگ تھے، آپ کا نام نواب الدین تھا۔ شاہ راجو حسینی کے مرید تھے، یہ راجو حسینی وہی بزرگ ہیں جو سلطان ابو الحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔

عابد شاہ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، آپ کی ایک کتاب جو "گلزار السالکین" کے نام سے موسوم ہے نظم میں ہے، نثر کی کتاب "کنز المومنین" ہے یہ کتاب فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب کے لیے عابد شاہ نے ۵۳ کتابوں سے مدد لی ہے۔ کنز المومنین کی تصنیف ۱۰۹۰ھ کے بعد ہوئی ہے۔ "کنز المومنین" کی عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"سرانا اور تعریف کرنا سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کوں او پیدا کیا ہے۔ تمام خلقت کوں، بعدہ اے عزیز اس کتاب کا نام کنز المومنین رکھا ہوں۔ اس کا معنا مومن کا گنج خزانہ ہے۔ اس کتاب کے بنانے والے کا نام فقیر حقیر احقر العباد نواب الدین عابد شاہ اور میرے پیر کا نام ابو یوسف روحانی شاہ راجو حسینی الحسنی قدس اللہ سرہٗ بعدا ے عزیزاں اس کتاب کو دکنی میں کر کے ہلکا نکو سمجھو۔ اسے بڑے بڑے فقہ ..... مسئلہ جمع کر کے لکھا ہوں[۱]"

"اوّل ثنا صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ قادر ہے تمام چیز او پر قدرت رکھتا ہے اور ہر شے میں حاضر اور ناظر ہے، جیسا کہ شکر مٹھائی اور پھول میں باس اس طرح سب میں صنعت گری رکھتا ہے۔ وحدہٗ لاشریک لا بولے ہیں جیسا کہ وہ ایک ہور اس کی دو جا شریک نہیں ہے۔ ہور وہ شریک سب کا ہے، ہور سب میں ملیا ہے جیسا کہ پھول میں بو ملی ہے، پس اس بو کی صورت معلوم نہیں آتی، جیسا

---

[۱] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ فہرست مخطوطہ صفحہ ٦٠۔

عالم میں دلیل ہے۔"

(۷) سلطان

شاہ سلطان کا تذکرہ شعرا کی تفصیل میں کیا گیا ہے۔ اب آپ کی نثر بھی ہمدست ہوئی ہے جو دارالاسرار سے موسوم ہے اور تصوف میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے[1]۔ نمونہ پیش ہے:

"کنت کنزاً مخفی فاجبت ان طرف ..... یعنی او سلطان اپنی ذات کی دریا میں چھپا راز گنج رکھیا تھا بقا کے موتیاں کا اجالا، دیک کر عاشق ہوا۔ ہور مصلحت تجویز میں آیا، جو راز کے موتی چھپا کر رکھیا خوب نہیں[2]۔"

تبصرہ: صفحات گذشتہ میں اس دور کی نثر کا نمونہ پیش کیا گیا: اس سے واضح ہوگا کہ جہاں تصوّف اور فقہ و عقائد کی کتابیں نثر میں مرتب ہوئیں وہاں ادب کا شاہکار "سب رس" بھی اسی دور کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ "سب رس" کو بعض اصحاب فارسی کا ترجمہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کی ادبی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ سب رس میں کرداروں کی پیش کش ان کی نفسیات اُمور کی وضاحت بڑی خوبی سے اُجاگر کی ہے مرد، عورت، شادی بیاہ کے حالات، عشق کی تفصیل وغیرہ کو بڑی جدّت آمیزی سے بیان کیا ہے۔ وجہی نے سب رس میں انسانی جذبات کو فلسفیانہ رنگ میں ظاہر کیا ہے۔ اگرچہ سب رس ایک افسانہ ہے، مگر درحقیقت تصوّف کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔ اس میں عشق حقیقی کو مجازی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

"سب رس" پر مولانا ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر عزیز احمد وغیرہ کی تفصیلی صراحت ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جامع اور واضح تفسیر ڈاکٹر رفیعہ نے کی ہے[3]۔

بہر حال اس دور کو نثر نگاری کے لحاظ سے بھی اُردو کا ایک تابناک دور قرار دینا چاہیے۔

---

[1] تذکرہ مخطوطات جلد اوّل صفحہ ۳۶۸۔

[2] " " " "

[3] اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا۔

دوسری فصل

عادل شاہی دَور

۸۹۵ھ تا ۱۰۹۷ھ

عادل شاہی خاندان کا بانی یوسف عادل شاہ ہے جس کو سلاطین ترکی کے خاندانِ عثمانیہ میں شامل کیا جاتا ہے، بہمنی حکومت کی جانب سے یہ بیجاپور کا صوبہ دار تھا۔ جب حکومت بہمنی پر زوال آگیا تو کئی صوبہ دار خود مختار ہو گئے، ان میں یوسف عادل شاہ بھی شامل ہے اس نے ۸۹۵ھ میں اپنی حکومت قائم کی۔ دو سو سال تک نو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(۱)	یوسف عادل شاہ	۸۹۵ھ سے ۹۱۶ھ
(۲)	اسمٰعیل عادل شاہ	۹۱۶ھ سے ۹۴۱ھ
(۳)	ملو عادل شاہ	۹۴۱ھ سے ۹۴۱ھ
(۴)	ابراہیم عادل شاہ اوّل	۹۴۱ھ سے ۹۶۵ھ
(۵)	علی عادل شاہ اوّل	۹۶۵ھ سے ۹۸۸ھ
(۶)	ابراہیم عادل شاہ ثانی	۹۸۸ھ سے ۱۰۳۷ھ
(۷)	محمد عادل شاہ	۱۰۳۷ھ سے ۱۰۶۷ھ
(۸)	علی عادل شاہ ثانی	۱۰۶۷ھ سے ۱۰۸۳ھ

(۹) سکندر عادل شاہ ۱۰۸۳ھ سے ۱۰۹۷ھ

یوسف عادل شاہ خود مختاری حاصل کرنے کے بعد اپنی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں مصروف رہا۔ اکیس سال کی حکمرانی کے بعد ۹۱۶ھ میں اس کا انتقال ہوا[۵۱]۔

یوسف عادل شاہ کو علم وفن سے خاص دلچسپی تھی اس کے زمانہ میں کئی اصحاب علم وفن، علماء اور شعراء عراق اور ایران سے بیجاپور آئے اور یوسف کی سرپرستی سے نہال ہو گئے، حاجی رومی شیخ نصیر الدین، علامہ نصر اللہ، پیر مقصود وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔

یوسف عادل شاہ کو شعر وسخن اور موسیقی سے خاص دلچسپی تھی خود شاعر تھا اور فارسی و ترکی میں شعر کہا کرتا۔ مولوی عالی نے عادل نامہ کے نام سے ایک تاریخ نظم میں لکھی جس میں یوسف کا مجمل حال درج کیا[۵۲]۔

یوسف عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند اسمٰعیل عادل شاہ سلطنت عادل شاہی کا مالک تھا، اس نے تقریباً پچیس سال تک حکمرانی کی۔

اسمٰعیل اپنے باپ کی طرح علم دوست و ذی علم بادشاہ تھا۔ علماء اور شعراء کی صحبت کا شائق اور شعر وسخن کا دلدادہ تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ وفائی اس کا تخلص تھا۔ بیجاپور کے مورخ فرشتہ اور بساتین السلاطین کے مؤلف زبیری نے اسمٰعیل کی علم دوستی اور سخن سنجی، اصحاب علم کی سرپرستی کی بڑی تعریف کی ہے[۵۳]۔

اسمٰعیل عادل شاہ کے بعد اس کا بڑا فرزند ملو عادل شاہ تخت نشین ہوا، مگر نوجوانی کی وجہ سے عیش وعشرت، طرب اور نشاط کا دلدادہ بن گیا اس کی وجہ سے ملک میں ابتری پھیل گئی، اس لیے پونجی خانم، یعنی اسمٰعیل کی والدہ نے ملو کو معزول کر کے اس کے بھائی ابراہیم عادل شاہ اوّل کو تخت نشین کیا۔ ملو عادل شاہ نے صرف چند ماہ حکومت کی تھی۔

ابراہیم کا تمام عہد حکومت جنگ وجدل اور معرکہ آرائی میں بسر ہوا۔ اس کی سخت گیری کے افسانے مشہور ہیں، اس نے شیعہ مذہب کو ترک کر کے سنّی مذہب اختیار کیا، اس کی وجہ سے ایرانی

---

۵۱ تاریخ فرشتہ۔ صفحہ ۸۱

۵۲ اُردو کی ادبی تاریخ صفحہ ۸۲

۵۳ فرشتہ فرشتہ صفحہ ۳۳۔ جلد ۴

اثر کم ہوگیا۔ دکھنیوں کو عروج ہوا، اس تبدیلی کا اثر زبان پر بھی ہوا، حکومت کی سرکاری زبان دکھنی (قدیم اُردو) قرار دی گئی[1]۔ اس کی وجہ سے اس کی جڑیں مضبوط ہوگئیں اور اس کے جانشین علی کی انتہائی کوششوں کے باوجود فارسی کا رواج نہ ہو سکا۔

ابراہیم نے اپنے ظلم وستم کے باوجود علماء اور فضلاء کی سرپرستی اور قدردانی فرمائی، خواجہ معین الدین، آقا شہاب الدین شروانی، خواجہ عنایت اللہ شیرازی، ملّا فتح اللہ شیرازی وغیرہ اس کے عہد کے مشہور علماء ہیں، اس کے زمانہ میں شاہ برہان الدین جانم نے جو بیجا پور کے بہت بڑے صوفی اور صاحبِ ارشاد وہدایت تھے، کئی رسالے دکھنی زبان میں قلمبند کیے جو آج بھی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ابراہیم نے دو سال تک علیل رہ کر ۹۶۵ھ میں انتقال کیا[2] اور اسکی جگہ علی عادل شاہ اوّل تخت نشین ہوا۔ اس نے تقریباً بتیس سال حکمرانی کی۔

علی عادل شاہ ایک امن پسند اور صلح جو بادشاہ تھا، وجیانگر کے راجہ رام سے منہ بولے رشتے قائم کیے تھے۔ لیکن اسی کے زمانہ میں دکن کے چار بادشاہوں نے متحد ہوکر وجیانگر کو ۹۷۲ھ میں فتح کرلیا۔

علی عادل شاہ کے زمانہ میں علم وفن کی بڑی ترقی ہوئی، اس کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ سفر کے موقع پر چار سو صندوق کتابوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

اصحاب علم وفن کی سرپرستی کرنے میں اپنے پیش رو سلاطین کے قدم بہ قدم تھا بلکہ قدردانی میں ممتاز رہا، اس کے دَورِ حکومت میں حجاز، ایران، عراق اور آذربائی جان سے بیسیوں علماء بیجاپور آئے۔ ان کی وجہ سے بیجاپور کی علمی سطح بلند ہوگئی۔

اس کے زمانہ میں ایک طرف علم وفنون کی ترقی ہوئی تو دوسری طرف اصحاب طریقت اور صاحبانِ رُشد وہدایت کی وجہ سے ارشاد اور ہدایت کے ذریعہ لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح ہوتی رہی۔

---

[1] تاریخ فرشتہ

[2] " "

[3] " "

علی عادل شاہ نہ صرف علم وفن کا شائق تھا بلکہ اس کو تعمیر سے بھی دلچسپی تھی۔ دارالسلطنت بیجاپور میں کئی باغ بنائے، نہریں نکالیں، ایک عالیشان مسجد بنائی۔ اس مسجد کا نام مسجد غالب رکھا تھا اور لفظ غالب کی تعداد کے مطابق ایک ہزار تینتیس چراغ دان مسجد میں روشن ہوئے تھے، گگن محل، ہرپلہ محل وغیرہ تعمیر کیے۔ شہر بیجاپور کے اطراف فصیل بنائی۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے ابراہیم عادل شاہ اوّل کے زمانہ میں سرکاری زبان اُردو ہو گئی تھی مگر علی عادل شاہ نے پھر سے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا[1] مگر اس کے باوجود اُردو زبان کی ترقی رُکی نہیں بلکہ اور زیادہ ہو گئی اس کے عہد میں شاہ برہان الدین جانم نے کئی رسالے نظم اور نثر میں قلمبند کیے جن میں تصوّف کے مسائل بیان کیے گئے تھے، ان کا تذکرہ اس کے مقام پر آئے گا۔

علی عادل شاہ کی شہادت بقول بعض ۹۸۸ھ اور بقول بعض ۹۸۹ھ میں ہوئی، ایک غلام نے چاقو سے بادشاہ کو قتل کر دیا، بادشاہ کی شہادت کا نہ صرف اہلِ دربار کو رنج ہوا بلکہ قلمرو عادل شاہی میں بڑا سوگ منایا گیا، ملّا رضا مشہدی نے مرثیہ کہا، علماء وقت مثلاً مرتضیٰ خاں، شاہ فتح اللہ شیرازی، شاہ ابو القاسم انجو شاہ عبدالجبّار، میر شمس الدین اصفہانی، افضل خاں شیرازی نے جو علی عادل شاہ کی سرپرستی کے باعث بیجاپور میں جمع ہو گئے تھے نے بڑا ماتم کیا[2]

چونکہ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لیے اس کے بھائی طہماسپ کے فرزند کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے لقب سے عادل شاہی تخت پر بٹھایا گیا، ابراہیم کی عمر تخت نشینی کے وقت صرف دس سال کی تھی۔ اس لیے حکومت کی باگ نائبینِ سلطنت کے ہاتھ میں رہی۔

کامل خاں، کشور خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں یکے بعد دیگرے نائب سلطنت بنتے رہے دلاور خاں کے خاتمہ کے بعد نائبینِ سلطنت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور خود سلطان نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ابراہیم عادل شاہ کا زمانہ حکومت جنگ و جدل سے پُر ہے اوّل تو نائبینِ سلطنت ہی ہنگامہ پیکار میں مصروف رہے۔ جب بادشاہ نے خود حکومت سنبھالی تو اس نے ایک طرف میدان جنگ میں جو

---

[1] تاریخ فرشتہ

[2] تاریخ فرشتہ اور بساتین السلاطین

ہمسایہ حکومتوں یعنی نظام شاہی، قطب شاہی کے علاوہ مغلیہ حکومت سے ہوتی رہی۔ داد شجاعت دے کر اپنی مہارت فن جنگ کا ثبوت دیا[1]۔

اس کے ساتھ ہی انتظام ملک، نظم ونسق، حکومت کو عمدگی سے انجام دے کر چار چاند لگا دیئے، اس کے زمانہ میں علم وفن، شعروادب اور موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی، ابراہیم نے علم کی ترقی اور ترویج میں جو کوششیں کیں وہ تاریخ دکن میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گی۔

بیجاپور کے تمام مؤرخین نے اس کے علم وفضل کی بڑی تعریف وتوصیف کی ہے۔ اس کے زمانہ میں جو علماء موجود تھے ان میں سے بعض یہ ہیں، خواجہ علاء الدین محمد شیرازی، خواجہ سعداللہ خواجہ معین الدین، علامہ عنایت اللہ اردستانی، شاہ فتح اللہ شیرازی، مولانا غیاث الدین جہری علامہ رفیع الدین شیرازی، مولانا حیدر مولانا محمد باقر، آقا رضا، شاہ علیم اللہ محدث، شاہ صبغت اللہ نائب رسول اللہ وغیرہ۔

ابراہیم کو شاعری اور موسیقی سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ نہ صرف شاعری اور موسیقی کا قدردان تھا بلکہ خود بھی ان دونوں میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ ظہوری ملک قمی، آتشی، مقیمی، نوری جیسے شعراء دربار کی زینت بنے ہوئے تھے، اس کے عہد میں ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی مشہور تاریخ فرشتہ قلمبند کی۔ ظہوری نے اپنے قلم کی جولانی سہ نثر ظہوری کی صورت میں دکھائی، ملک قمی نے مخزن اسرار نظامی کا جواب لکھا، عبدالرشید التستینگی نے علامہ علاء الدین محمد بن ذکریا قزوینی کی کتاب "عجائب المخلوقات" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ملا رفیع الدین شیرازی نے "روضۃ الصفا" کا خلاصہ مرتب کیا[2]۔

ابراہیم کی مہارت شاعری اور موسیقی کا شہ کار اس کی تصنیف "نورس" ہے۔ فن موسیقی کے لحاظ سے اس کو استاذ فن تسلیم کر دیا گیا تھا۔

ابراہیم کے عمدہ صفات اور اخلاق حسنہ کے باعث اس کو عام طور سے جگت گروہ سے موسوم کیا گیا تھا، بقول مصنف بساتین السلاطین اس کے معنی شاہ جہاں کے ہیں[3]۔

---

[1] تاریخ فرشتہ اور بساتین السلاطین

[2] تاریخ فرشتہ۔

[3] بساتین السلاطین

سلطان کو تعمیر کا بھی شوق تھا۔ ایک نیا شہر آباد کر کے اس کو نورس پور سے موسوم کیا۔ قلعہ نورس کے نام سے تعمیر کیا۔ شاہی مُہر پر لفظ "نورس" کندہ تھا، درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی کا لقب دیا۔ اپنی کتاب کا نام بھی نورس رکھا۔

غرض ابراہیم کے زمانہ کو سلطنت عادل شاہی کے عروج کا زمانہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہے۔ اس کے زمانے میں ایک طرف عربی اور فارسی کی ترقی ہوئی تو دوسری طرف اُردو کی بھی ترقی ہوئی، اس کے عہد کے اُردو شعراء میں عبدل، مقیمی، صنعتی وغیرہ مشہور ہیں، ان کی تصانیف کا تذکرہ اس کے مقام پر آئے گا۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ کا انتقال ۱۰۳۷ھ میں ہوا یعنی طویل عرصہ تک اس نے حکومت کی اور اپنا نام تاریخ دکن میں تابناک چھوڑ گیا۔

ابراہیم کے انتقال پر اس کا فرزند محمّد عادل شاہ سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کا دَورِ حکومت کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے، ایک طرف جنگ و جدل کی ہنگامہ آرائی ہوتی رہی، دوسری طرف علم و فن کی آبیاری کی جاتی رہی، اس کی وجہ سے بیجاپور کی علمی دولت میں اضافہ ہوتا گیا۔

محمّد عادل شاہ کو کئی دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ یہ امر واقع ہے کہ محمّد عادل شاہ کو اپنے باپ ابراہیم کے ورثہ میں جو سلطنت ملی تھی اس کو اس نے اپنی فتوحات سے وسیع کر لیا۔ اگرچہ عادل شاہی سلطنت کے بعض حصّے مغلیہ حکومت میں شامل ہو گئے تھے مگر دوسری طرف اس کی حدود میں توسیع ہو گئی۔

جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کو نظرانداز کر کے جب علم و فن کی طرف نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ محمّد عادل شاہ نے اپنے باپ دادا کی طرح علم اور اصحابِ علم کی پوری سرپرستی فرمائی، اس کی سرپرستی کی وجہ سے فارسی اور اُردو کے ادبی شاہ کار اس کے زمانے میں مرتب ہوئے جن میں بعض کو زندگی جاوید حاصل ہے۔

محمّد عادل شاہ کے زمانہ میں حکیم آتش نے خمسہ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں، ظہوری کے فرزند مُلّا ظہور نے "محمّد نامہ" مرتب کیا، مُلّا محمّد حسین نے رفیع الدین شیرازی کی کتاب "احوال السلاطین" کا تکملا کیا، قاضی نور اللہ نے کئی کتابیں لکھیں۔

محمّد ابراہیم صنعتی، مقیمی، مرزا دولت، رستمی، ملک خوشنود کی اُردو کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔

محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطانہ شہر بانو (جو گول کنڈہ کے تاج دار سلطان محمّد قطب شاہ کی دختر تھیں) سے علمی سرپرستی بھی قابل تذکرہ ہے۔ ملکہ کی وجہ سے رستمی نے خاور نامہ اور ملک خوشنود نے اپنی تصانیف سے اُردو کے ادبی ذخیرہ میں اضافہ کیا۔ محمّد عادل شاہ کے عہد میں تعلیم کی بھی ترقی ہوئی۔ تمام ملک میں مدارس کھولے گئے۔ طلبہ کو وظائف دے گئے اور اصحاب علم کو فکرِ معاش سے مستغنی کیا گیا[1]۔

محمّد عادل شاہ نے تیس سال حکومت کی اور ۱۰۶۷ھ ۱۶۵۶ء[2] میں انتقال کیا۔ بیجا پور میں مدفون ہے۔

محمّد عادل شاہ کے بعد اس کا فرزند علی عادل شاہ ثانی انیس سال کے سن میں عادل شاہی تخت پر متمکن ہوا، درباری شاعر عبدالنبی نے

"نوبت شاہی زد بعد محمّد علی"

سے تاریخ نکالی، علی عادل شاہ کا دَورِ حکومت بھی اس کے باپ کی طرح جدال و قتال سے پُر رہے، ایک طرف مغلیہ شہنشاہیت کے حملے ہوتے رہے تو دوسری طرف شیواجی کے ہنگامے برپا رہے اور پھر صلابت خاں باغی ہوکر دشمنوں میں مل گیا، لیکن یہ علی عادل شاہی کا دل گردہ تھا کہ وہ نہ صرف اپنے دشمنوں سے لڑتا اور فتحیاب ہوتا رہا بلکہ عادل شاہی قلمرو کے کئی شہر ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود دوسری طرف سرحد عادل شاہی کو وسیع کرتا گیا، غرض سولہ سال کی حکمرانی کے بعد پینتیس ۳۵ سال کے سن میں علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ۱۰۸۳ھ میں ہوگیا۔

"بادشاہ دین علی کرد وطن برجنا"

سے تاریخ نکالی گئی۔

علی عادل شاہ کے دَور پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس کے دور میں شعراء اور ادیبوں کی دستگیری اور سرپرستی ہوتی رہی، علماء اور فضلاء فکرِ معاش سے مستغنی کیے جاتے رہے ــــ قاضی نور اللہ نے تاریخ عادل شاہی قلمبند کی۔ خصوصیت سے دکھنی شاعری کو بڑی ترقی ہوئی، خود سلطان علی شاعر تھا اور "شاہی" اپنا تخلص قرار دیا تھا، اس کا

---

[1] بساطین السلاطین

[2] " " "

کلیات ہمدست ہو چکا ہے۔ دوسرے شعرا میں نصرتی نے "گلشن عشق" اور "علی نامہ" جیسی کتابیں لکھیں۔ ایاغی، شغلی، شاہ ملک وغیرہ کی کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں۔

علی عادل شاہ کی علمی سرپرستی اور شاعری سے دلچسپی کا حال خود عالمگیری مورخ خافی خاں نے لکھا ہے اور اعتراف کرتا ہے، علی عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد اس کا کم سن فرزند سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا، اس کے چودہ سال دورِ حکومت میں جنگ و جدل کے بادل قلمرو عادل شاہی پر منڈلاتے رہے، شیواجی کے حملے ہوئے، عالمگیر نے پورے دکن کو فتح کر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا اور بیجاپور پر حملہ کر کے ۱۰۹۷ھ / ۱۶۸۶ء[1] میں اس کو فتح کر لیا۔ اس طرح دو سو سالہ حکومتِ عادل شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

سکندر عادل شاہ کے زمانہ میں بھی باوجود جنگ کی مصیبت، دشمنوں کے حملوں کی پریشانیوں کے علمی دولت میں اضافہ ہوا، کئی کتابیں اس کے زمانہ میں قلمبند ہوئی ہیں جن کا تذکرہ آگے آتا ہے۔

عادل شاہی دَور کے شعراء اور ان کی تصانیف کی فہرست درج کی جاتی ہے

شمار	نام	تصانیف
(۱)	شاہ برہان الدین جانم	وصیت الہادی، مغز مرغوب سک سہلا، منفعت الایمان
(۲)	ابراہیم عادل شاہ ثانی	نورس
(۳)	عبدل	ابراہیم نامہ
(۴)	آتشی	؟
(۵)	مقیمی	چندر بدن و مہیار
(۶)	امین	بہرام و گل اندام
(۷)	شوقی	فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ

[1] بساتین السلاطین۔

(۸) صنعتی	قصہ بے نظیر، گلدستہ،
(۹) ملک خوشنود	ہشت بہشت، بازارِ حسن
(۱۰) رستمی	خاور نامہ
(۱۱) دولت	تکملہ بہرام و گل اندام
(۱۲) شاہی (علی عادل شاہ)	کلیات
(۱۳) نصرتی	گلشنِ عشق، علی نامہ، تاریخ اسکندری
(۱۴) شاہ ملک	شریعت نامہ
(۱۵) امین (امین الدین علی)	محبت نامہ، رموز السالکین
(۱۶) ظہور	غزل
(۱۷) ہاشمی	یوسف زلیخا، دیوان
(۱۸) ایاغی	نجات نامہ
(۱۹) شغلی	پند نامہ
(۲۰) علی	پند دل بند
(۲۱) کریم	نظم مدحیہ وغیرہ
(۲۲) مرتضیٰ	وصل نامہ
(۲۳) حسینی	دیوان
(۲۴) مختار	معراج نامہ، مولود نبیؐ
(۲۵) قدرتی	قصص الانبیاء
(۲۶) مومن	اسرارِ عشق
(۲۷) قادر	غزل، معجزہ خاتونِ جنت
(۲۸) شاہ من	شجر الاتقیا
(۲۹) معظم	دیوان، گنج مخفی، گلزارِ جنت

اب اس دور کے شعراء ان کا تذکرہ اور کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) برہان الدین جانم

برہان الدین جانم کے والد حضرت شمس العشاق میراں جی تھے۔ جن کا تذکرہ بہمنی دور میں کیا گیا ہے۔ برہان الدین جانم اپنے باپ کے خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی کو اپنے باپ ہی سے حاصل کیا تھا۔ باپ کے بعد مسند ارشاد و ہدایت پر متمکن ہوئے اور ہدایت کرتے رہے۔ ۹۹۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ بیجاپور میں اپنے والد کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔[۱]

آپ کی متعدد تصانیف ہیں جو دکنی زبان میں ہیں ان کا موضوع تصوف اور سلوک ہے جو نظم اور نثر پر مشتمل ہیں۔ آپ کے حالات محمد اکبر الدین صاحب نے دیباچہ کلمتہ الحقائق میں قلمبند کیے ہیں، یہاں آپ کی نظم کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ نثر کا نمونہ آگے آئے گا۔

ملکوتیاں کا ایسا حال منزک ملایگاں
کریں عبادت جوں فرمایا ثابت رگہ

حکم شریعت بھی امر لازم جوں فرمایا خدا
نہ ہوا کاڑ صلاحت نفس کون کیتا روا

جیسیکوئی اسکوں کر دکھاوے پاسیں لیویں کاٹ
بھلا بورا سب سمجا جاوے تسلی ہیں کے بات

کرنیکوں نا میاتی دیکھیں کرا ستھاری باج
ایسا حال جیسی سزاوار تو ملا کوتے آج

یوں رہ منزل لیا ایسا دان آکل پیلا بھوتی
آنکھیں چلنارہ حقیقت نقو الیا کرا وٹھی

روحی انترہ ھیان لگاوے یوں لک دیوے باد
روحی کے سرتی ان ہی بھی پایا دیکھا ہوا شاد

آپس راکھیا اس تسلی ہیں سے جبر و تیکا حال
جبر بہ خالی چھور کرامت سبھی چھی کھال

نظر اس کے دیکھ چند رکت پانی ہو کر گلی
اکل لیا دی پوپ کلیاں چن چن نظروں پرتی کھلی

ایسا ان ہیں دیکھ جمالت سپلتلی پکڑیا بھاؤ
دل توان کا موم نرم جون کس نا دیوے کھاؤ

کہ یک مستی کہ ہشیاری ایسا ان کا کام
بھلی بھید ایمان نہیں جی بچہ کرے کون دام

معرفت سووہ پچھان خدا کا اس کہتے اس بوجہ دیکھین
قدرت کمال پرتی جانے سب موں ہن سب لیکھ

۱؎ روضۃ الاولیاء بیجاپور

ہے ہے کہے تو کہتی نا آوے نہیں کہے تو چوکے
عارف لوگاں یوں حیراں جو ہے گنگے سکے

ان اپنی بات غفلت ناہیں روحی کے یوں باب
کتنی مثال کوئی نہ موجی عاجسہ دیویں جواب[۲]

(۱) وصیّت الہادی :-

سکتا قادر قدرہ سوں سمجھے تجہ کوں کوئی کیا
جسکوں لورے دیوے راہ کہیا یہدی من یشا

یہ روپ پرگٹ آپ چھپایا کوئی نہ پایا انت
پایا موہ میں سب جگ باندھیا کوں کر سوجھے پنت

امر خدا کا لیا ڈبچا توں نہی تہی منکر ہونا
مقام شیطانی جس کو کہنا دل تھی سارا دھونا

چلنے کا تو نیم نہ ہووے یہ توشا پہوکٹ کھایا
اس دھات عمر خرچ کیتا آخر پھر پچتایا

۲ ۔ سک سہیلا

گن آدم کا نہ ہات چڑھے رے کیوں کہنا انسان
صورت پہ اعتبار نہ راکھیں جیسے ہیں حیوان

بلکہ ان تہی گمراہ کریوں قرآن ہیں فرمان
لوکاں پہ مت پکے الادھی جن بوجھہ بجتو لادھی[۲]

۳ ۔ منفعت الایمان :-

اللہ واحد سرجنہار
دو جگ رجنا رجیا اپار

سگل عالم کیا ظہور
اپنے باطن کیرے ظہور

کوئی کہیں سب عشق تمام
عشق کی آنکھیں کیا ہے فہام

عشق لیا ہے سب پھر پاس
عشق تھی سکلا بھوگ بلاس

بعض اکھیں اپنی بوجھہ
معلوم نہیں کچھ اس کی سوجھہ

ایک جمع سب پکڑیا بار
جو کے بیج تھی نکلیا جھاڑ

کانٹا چھانٹا پھل اور پھول
شاخ برگ سب دیکھ اصول[۲]

ان تصنیفات کے علاوہ آپ کا کلام جو " حقیقت " کے عنوان سے لکھا گیا ہے

---

[۱] وصیت الہادی مخطوطہ سالار جنگ۔ از برہان الدین جانم

[۲] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۷ء

دستیاب ہوا ہے۔ ایک نظم یہاں درج کی جاتی ہے۔

نہیں مجھ سیں پت لگائے من لیتاری ۔۔۔ اللہ مجھے عاشق اپناں توں کیتاری

اب چھوڑنیں کہوں مت جاوے رے
مجھ برہ جلی کوں مت ترساوے رے
یو جانے توں میری من بھاوے رے

یو تو شام سلونا توں میرا رے
نہ چلی تجھ پر مستر ہونا رے
جو کوئی چاہیے سو فانی ہونا رے

یو تو بریہ اگن سب دل لائی رے
تن فانوس کر ہوں دکھلائی رے
لہو تیل دیا دیپک جلائی رے

آ کہے جانم جب جانے فانی رے ۔۔۔ جان کی آج ہے مہمانی رے[1]

شاہ صاحب کی متعدد کتابوں کا پتہ چلا ہے، ان کے مخطوطات حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں، اسٹیٹ منزل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں موجود ہیں اور انجمن ترقی اردو علی گڑھ اور انجمن ترقی اردو پاکستان میں بھی موجود ہیں۔

(۲) ابراہیم عادل شاہ

جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کا چھٹا حکمران سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) نہ صرف دکھنی شعر و سخن کا دلدادہ تھا بلکہ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کا تخلص ابراہیم تھا۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ مثنوی غزل، قصیدے اس نے کہے تھے مگر اب سب ناپید ہیں۔ البتہ اس کی تصنیف نورس موجود ہے۔

اس کتاب میں گیت لکھے گئے ہیں جو مختلف راگ اور راگنیوں میں گائے جا سکتے ہیں اس کی تصنیف ۹۹۵ھ کے بعد اور ۱۰۱۵ھ کے پہلے ہوئی ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ

---

[1] بیاض مملوکہ حیدر حسن

٩٧٥ھ میں یہ مرتب ہوئی ہے۔

ایک زمانہ دراز تک یہ کتاب ناپید تھی، اب اس کے کئی نسخوں[1] کا پتہ چلا ہے اس کتاب کو پروفیسر نذیر احمد صاحب نے کئی نسخوں سے مقابلہ کر کے شائع کر دیا ہے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

نورس سورجگ جگ جوتی آنڑ سرو گنی   یوست سرسنی ماتا ابراہیم پرساد بھئی دونی

حضرت محمدؐ جگت ترگرگسائیں   تو درگہ چمک ہیرو من ساز

کودچا ہے ماتنگ تکھار کو درتن مال   کو دبھوجن واسہ کو دوھا مان ڈھولار
ابراہیم چاہے اتم بدیا دان دھرم   سید محمدؐ کی دہائی کریم کرتار

ابراہیم نسو جاگ ایسا پیو کہاں پاوے گا   سندھیاں کو سنگار کو سب کنٹھ لاوے گا
رات تھوڑی مدن بہوت بنا اٹھ جاوے گا

ابراہیم سب سندری دیکھا یو پچھن ہے کہاں   جات چاند سلطان نانوں ملکے جہاں

کمت دسے جیو خسرو مدینا   کبھی خلیف دھر موتیوں خونا
جو دیپک میں دسے نگینا   مشک عنبر بچھائی انگنا
سیوی روند چل ذوالقعد آئینا

پیارے چاندا آکھوں کنتھ دیں دوئی دکھی   من چلے سونس بھئی ہم تم رہیں اب سکھی

---

[1] حسب ذیل مقامات پر یہ نسخے موجود ہیں۔
(۱) عجائب خانہ حیدر آباد (۲) کتب خانہ نواب سالار جنگ بہادر (۳) کتب خانہ دفتر دیوانی و مال سرکار نظام۔ (۴) کتب خانہ آقا حیدر حسن سابق پروفیسر نظام کالج حیدر آباد۔ (۵) کتب خانہ رام پور۔

سید محمد پتی پیرا — جیوں رتن میں اتم ہیرا
محل محل صدر سنوارے — اس نمونے بہشت اپارے
انند ہوتا ہے سدا بہارے — ارتی لیائی انبر بھر تارے
کدم کستوری جو اچندن لائے — بادل کان سے ہر رنگ رس پرسائے
شمالی عنبر بتیاں بھرائے — شربت گھول امرت پلائے
بادل دمامے بجلیاں بجاوے — باجی خالو آشتابی تے پاوے
سہلا نو رس کلیاں ہد ہاوے — ابراہیم گر گنی گاوے

جیوں چھپیا تھا خضر ظلمات میں رے — میرا من سکندر ہو وا ڈھونڈنے رے
سید محمد ابراہیم کو دکھانگے رے

ہردم آوے پیارے تیرے عشق کی باؤ — وہی سلگائے جیو کو نہیں تو جاوے گا بج

مست نین ہو را چپل اموے یوں رے — مول را کھیں جیو ساتھ تو اول ہوں دیوں رے

جے گن سب توں ہیں گون کون کرگن لائے رے
ابراہیم دے گن بس تجھے اس میانے آئے رٹے

(۳) **عبدل**

اس عہد کا ایک شاعر عبدل ہے۔ افسوس ہے کہ گول کنڈہ کے بعض شعرا کی طرح بیجاپور کے اس شاعر کے نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ بقول بعض عبدالغنی اس کا نام تھا اور تخلص عبدل۔

عبدل، ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں تھا اور اپنے آپکو سلطان کا شاگرد کہتا تھا۔ اس زمانہ میں عام طور سے یہ دستور تھا کہ شاہی استاد خود کو شاگرد کے

۱؎ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ اور مخطوطہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد

۲؎ تذکرہ اردو مخطوطات۔ صفحہ ۲۶۸

لقب سے موسوم کرتے تھے۔

عبدؔل کی ایک مثنوی دستیاب ہوئی ہے جو ابراہیم نامہ سے موسوم ہے اور ۱۰۱۲ھ میں قلمبند ہوئی ہے۔ ابراہیم نامہ ابراہیم عادل شاہ کی لائف ہے اور خود اس کے حکم سے تیار ہوئی ہے۔ چنانچہ عبدؔل بیان کرتا ہے کہ اس کو بادشاہ نے یاد فرمایا اور حکم دیا کہ کوئی ایسی کتاب لکھی جائے جس کا جواب نہ ہو اس نے عرض کیا کہ اس کو صرف ہندی (دکھنی) زبان آتی ہے۔ عرب اور عجم کی کسی زبان سے واقف نہیں تو سلطان نے حکم دیا اسی زبان میں لکھی جائے اس حکم کی تعمیل میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے۔ اس کے تقریباً سات سو پچاس شعر ہیں۔ اس میں حمد و نعت منقبت کے بعد خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

نفسِ مضمون کے بعض عنوان حسبِ ذیل ہیں :-

تعریف سخاوت بادشاہ، شہر بیجاپور، دربار بادشاہ، نورس محل، مجلس بادشاہ، شکار، ہیبت لشکر، تعریف فیلان شاہی، سلحدار بادشاہ، تعریف اسپاں تعریف باغ، تعریف بہار، میزبانی، سالگرہ وغیرہ۔

اگرچہ یہ مثنوی ابراہیم عادل شاہ کی پوری سوانح عمری نہیں ہے لیکن اس میں سلطان کی خانگی زندگی کے حالات ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس طرح ادبی اور لسانی اہمیت کے ساتھ تاریخی لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔ ابراہیم نامہ کا نمونہ کلام حسبِ ذیل ہے۔

حمد

الٰہی زبان گنج توں کھول منجہ — امولک بھاکر جکو چہ پول منجہ
کہوں باسم اوّل تو اللہ لائے — گلے موکھ کھلے حبیب پکڑے آوے

اونہی شاہ استاد کر سو نظر — بلایا جو عبدل کوں سر ہاتھ دھر
نوی بات مضمون کر اک کتاب — نہ کو فکر گوندھیا ہے تس کا جواب
نہ باقی رہے کچھ تو عالم نشاں — اگر کچھ رہے تو بچن شعر جہاں
سو یوں بچن سن شاہ استاد کاں — پوچھا جگت گرو شعر کہہ کس زباں

زباں ہندوی مجھ سوں ہور دہلوی
نہ جانوں عرب ہور عجم مثنوی

کہیا شاہ استاد عبدل سریوں
تو ہر اک زباں کر شعر بات کوں

نعت

گوسائیں ایک ٹھانہ ہور کچھ موجود
بنایا محمد سوں لگ جگ وجود

جو گنج مخفی سو پرکٹ دکھایئے
عشق آرسی میم مشکل پھرائے

احد اور کر میم احمد کیا
حرف چار مل بھید چارو دیا

نفس مضمون کی ابتدا

کروں ابتدا شہ ابراہیم نام
کہ جس صفت عالم بھریا ہے تمام

سرگ مرت پاتال ہر یک دھرا
رھیا روپ سرور ہور عالم بھرا

پڑی سانجھ دریا میں جائے کر
صبح آئی مانگی سو شہ پائے پر

توں دے شاہ عالم سورج روپ داں
جیوں منجہ جوت تن ہوئی روشن جہاں

ولے تج شہ روپ ناناپ بھائے
سورج اَہی کھوں کرنا سو چھپ رات جائے

وہ جی چاند ہور بھی تیں روپ کر
بدھا گگن دو گھڑی سوسن رات دھر

شہر بیجاپور کی تعریف

سنوں اب صفت شہ رہن تخت تہاؤں
بدیا پورن کر ہی بھی اس کا ٹاؤں

کہ دھن اس زمیں تھاؤ تھے بخت بھر
بسیا سیں جس کی بدیا پور نگر

ولیکن جتا کچھ زمیں کامدہاں
سو اوس شہر کا چوک اک درمیاں

کریا اوس شہر کا چھپی ایک جاں
دس روپ ست کھن گگن ہور نشاں

سورج تاس زریں تا تکیا سوہائے
کروں دور لا باندہ دستانوں پائے

کونداں کھلا جیوں رکھیا تر بھر
کھری چاند پورن سو روپی کی دھر

ستارے کنت زد شو من کھوں کی ہار
رکھیا مولنچ لائی کوشن سو تھار

کیا اوس شہر دور خندق نشاں
رہیا پل پلا تیر بر آسماں

جوں بازار چاروں طرف شہر تھار
بدیا باغ میں ہو چمن طرف چار

کلاونت کلا روپ کسوت سویوں | سو رباد بدریا کھری جھار جیوں
یہ معمور بستار شہر تھار تھار | ہر ایک دھات بر روپ ہر ایک بازار
نکل شاہ کسوت سوں کر ور نگار | دسے اس شہر میں سو ھویوں نگار
سمند شہر دولت سورج شاہ بھر | دسے چاند گر ناں سوں ہر ایک دھر

تعریف نورس محل

سنو اب صفت شاہ محل رہن تھاؤں | دھریا ناؤں نورس محل تس جو ناؤں
ولے محل نورس دھریا ناؤں یوں | پھر یا رنگ نورس نت انھ روپ جیوں
او سی محل پو شاہ عالم نومائی | کہ جیوں چاند پر سور پھیا ہے آئی
ولے محل نورس ہوا یوں اٹھان | دسے گگن آگن ہور اس نشاں
گگن سات سیڑھی ہو رل جوڑ کر | فلک محل نورس کی ایک کھن اوپر
ولے گگن آکر چھپی تس منجار | رہے طاق بندھیا ہو. بر تھار تھار

نوروز کا جشن

سویوں کھیل کر شاہ نوروز آیا | برس گانٹو کر مزدانی گنا
کھوں مزبانی برس گانٹو شاہ | جو ہر برس کر مز باجی نو ماہ
نہ ایسا سنیا شہ کو دیکھیا کہ ہر | جو ہر برس نو ماہ اند کھر
ہوا شاہ فرمان عالم اوپر | ہر ایک ملک ہر دیپ ہر شہر گھر

تعریف لب

کوئی مکھ ادھر پر سو لعلی دھری | رکھی آرسی بیچ کنول پنکھڑی
کیا او کھیلیا پھول جاسوں بسائی | رکھیا خورشں کافور بہ آن لائی

تعریف پستان

کوئی آ کھڑیاں، دسو تو جو بنیاں | حسن حوض جیوں کنول دو لگیاں
کیا زیب سینا صدر عشق کا | رکھی پھول دو ڈھک نو ہر مشک کا

خاتمہ کتاب

تو عبدالکینی صفت کر شہ بیاں | رہی ہے سو بھر کر زمین آسماں
سو شہ صفت بھر رہ اوجل رنگ ہے | رہے چھائی تر لوک کی سنگ ہے

نہ یو پھول گوندیوں ابراہیم نام   رہیں باغ عالم میں نت باس بھر
بچن پھول گوندیوں ابراہیم نام   کیا سیس پر برس بارہ تمام

خدایا تو عبدل بچن پھول کر
پھنور عارفاں چت سو مقبول کر[1]

(۴) آتشی

حکیم سید آتشی نام اور آتشی تخلص، اُس دور کا زبردست شاعر تھا۔ فارسی کے ساتھ اردو (دکھنی) میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخوں سے اس کے بلند پایہ شاعر ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کو اس کا کوئی اردو کلام دستیاب نہیں ہوا۔ مؤلف اردو شہ پارے کی کوشش بھی ناکام رہی ہے[2]۔

(۵) مقیمی

محمد مقیم[3] نام، مقیمی تخلص، ایک ایرانی شخص تھا، جو بیجاپور آکر بس گیا تھا اور شاہی تقرب حاصل کرلیا۔ فارسی کے ساتھ اردو میں شاعری کرتا تھا، اگرچہ مقیمی کے قصائد اور غزلیات اب تک ہمدست نہیں ہوئے، مگر اس کی مثنوی چندر بدن و مہیار ہمدست ہو چکی ہے، جس کی تصنیف ۱۰۵۰ھ میں ہوئی ہے، اس مثنوی میں جو افسانہ نظم کیا گیا ہے، اس کے صحیح ہونے کی تصدیق تاریخوں سے ہوتی ہے[4]۔

چونکہ مقیمی ایرانی شخص تھا اور فارسی اس کی مادری زبان تھی، اس لیے اردو شاعری میں اس نے نام پیدا نہیں کیا، اس کی مثنوی چندر بدن و مہیار کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔

مقیمی کی مثنوی چندر بدن و مہیار دکنی بورڈ کی جانب سے شائع ہو چکی ہے اس کے حالات محمد اکبر الدین صدیقی نے تفصیل سے لکھے ہیں اور پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد

---

[1] از کتب خانہ ادارہ ادبیاتِ اردو
[2] اردو شہ پارے۔ صفحہ ۳۶ و ۳۷
[3] برہان ماثر، بساتین السلاطین، گلدستہ بیجاپور
[4] تزک آصفیہ مطبوعہ۔ صفحہ ۱۵۲ و ۱۵۳

نے مقیمی کے متعلق اپنے خیالات بعض رسالوں میں ظاہر کیے ہیں۔ بہرحال اب مقیمی اور اس کی مثنوی کے متعلق بہت کچھ معلومات شائع ہوگئی ہیں اور قلمی نسخے بھی کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

اسپرنگر نے جو صراحت کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک اور مثنوی بھی تھی جس کا نام سومہار تھا اس کے دو سو پچاس شعر تھے۔

مؤلفِ اردو شہ پارے نے بھی تفصیل سے اس کے حالات بیان کیے ہیں بعض اصحاب مصنفِ چندربدن و مہیار کو عالمگیر عہد کا شاعر تصور کرتے ہیں مگر ہم نے ابھی اوپر جو امور واضح کیے ہیں ان کی بنا پر یہ خیال درست نہیں ہے۔

مقیمی کے کلام کا نمونہ پیش ہے :-

خدا کوں سزاوار کبرومنی	او قادر ہے قدرت کا صاحب دھنی
جو یوں کیا آدم یک ارواج کوں	بسا لیا ہے طوفاں نے تو نوح کوں
کیا تار گلزار رب الجلیل	کہ نمرود کے ہات بانچیا خلیل
سنا ہوں کہ یک شہر سندر پٹن	اتھا راج وہاں ایک ہندو برن
اتھا بہوت گبراں میں یک دس کہتا	برس دس کوں وہاں بشہر سیر لیتا
کرے راج پوجا سو اس دیو کا	تماشا عجب دے سیو کا
کہ راجوں میں او راج جگ راج تھا	کہ گوہر دہرن ہار اپنا اتھا

کہا جا او سے اے دیوانے بشر	کہاں سوں تو آیا چلیا ہے کدھر
اونے جواب پھر کر دیا شاہ کون	توں چپ چل پکڑ اپنی بات کون
توں عاشق ہوا ہے سو کس حور کا	ہوا مبتلا کہہ توں کس نور کا
تیرا من لگیا ہے سو کہہ توں منجے	جو معشوق تیرا میلاؤں تجے
نزدیک جا کو بولیا کہ سن اے پری	منجے تجھ لطافت دیوانہ کری
دیوانہ ہوں تیرا دیوانے کے تئیں	اپس تے نکو دور جانے کے تئیں

سو تجہ بن منجے کوئی ہونا نہیں — کہ بن جل مچھے کا سو جینا نہیں
کتا ہوں تجھے میں کہ اے گن بھری — توں کرنا اپنا کچھ مری دلبری
سوں یوں کہ ادب سوں تو ڑکر ادنے — وہر یا سس اس کے قدم پر اونے
گلا اس سُنا کر اُٹی بول یوں — سمجھ کچ اپس کوں اے بید دل توں
ہندو میں کہاں اور ترک توں کہاں — کہاں رام سیتا مورک توں کہاں

وہ چنچل چھبیلی اسے دیکھ کر — ہوئی آپ میں تھی وہ بریاں جگر
وہ دل میں تھی رکھتی جنوں یار کا — سدا اس دیوانے کے دیدار کا
جھٹک کر دیوانے کو ایسا کہی — تو کامل سچا ہیگا عاشق صحی
مرے دل میں ہر وقت آتا یہی — کہ دونوں آپس میں یہیں مل رہیں
ولیکن یہ معلوم ہے تجہ نظر — کہ ماباپ میرے ہیں ظالم بشر
کہ دونوں ہی دنیا سے جادیں نکل — تو خوبی سدا کی ہمیں ہو سگل
جو مہیار ہے بات سُن کر وہیں — تماشا دیکھایا ہے قدرت وہیں
گئی روح نکل کر چکا جان دے — کھڑے لوگ دیکھیں عجب سیر ہے
دیکھی یہ پری ہے جو افسوس کر — کہ آخر ہوا یہ رہا منتظر
اپنا جیو رکھے سو پڑی بے شرم — کہ پیچ عاشقوں میں نہیں کچھ دھرم

ہوا جوں عمل قبر کا سب تمام — اوٹھیا دفن کرنیکوں شہ نیک نام
نیر کا جوں قبر میں روتا روں اسے — دفن کر دیتاں تے بساروں اسے
جو دیکھیں جنازہ ہیں مہیار کون — اوہے حقت مل کر اوسے نار سوں
کفن پیچ آکر او چندر بدن! — گلے لگ سوتی ہے سو جوں ایک تن[1]

(٦) امین

بیجاپور اور گول کنڈہ میں متعدد شعرا ایسے گذرے ہیں جن کا تخلص امین تھا۔ زمانہ مابعد میں بھی متعدد شعرا کا تخلص امین تھا۔ بیجاپور

---

[1] مثنوی چندر بدن و مہیار

کے اس امین کو ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد سے تعلق ہے۔ اس کی مثنوی "بہرام وحسن بانو" ہے۔ مثنوی سے امین کے ذاتی حالات کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صوفی مشرب فقیر آدمی تھا۔ شاہی دربار سے اس کو تعلق نہیں تھا۔

اس کی اس مثنوی بہرام وحسن بانو کا ایک نسخہ یورپ میں موجود ہے[1]۔ مؤلف اردو شہ پارے[2] نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مگر مؤلف اردوئے قدیم[3] کی رائے میں یہ مثنوی گجرات کے شاعر امین کی تصنیف ہے۔

واضح ہو کہ اس مثنوی کو امین نے مکمل نہیں کیا ہے بلکہ دولت نے اس کی تکمیل کی ہے امین کی مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھا شاعر تھا۔ اور شعر گوئی میں اس کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

الٰہی جگت کا کرن ہار توں	غریباں بناں کا ادھار توں
کیا حمد اور نعت کوں مختصر	نہیں ہیں کیا طول یو سر بسر
یکایک میرے دل پر آیا خیال	قضا ایک کہوں ہیں مقیمی مثال
زباں پر بچن خوب آتا چلا	یو مضمون خوشتر بناتا چلا
زباں پر ہے جس کے موتی آبدار	اسی کے بچن کا ہے اکثر وقار

سہیلیاں جو تھیاں تیں اس کے سنگات	انوں نے نکالے یہ اس وقت بات
سنا شہر فارس کا ہے بادشاہ	ہے جو بی میں خوب جیوں مہر و ماہ
کہتے ہیں بہوت خوبصورت ہے او	فرنگ چین کی خوبصورت ہے او
اگرچہ وہی آدمی زاد ہے	چندا اس کے انکھیں سو بی مہات ہے
لے آیا اسے دیو عاشق ہو کر	رکھا ہے لیا کر اپس ٹھار پر
کبوتر ہو اسکوں چلو دیکھ آئیں	پیچھوں اپنے گھر کوں اپن سب سدھیں
وہ سن شاہ واں سیتے آیا بہار	دیکھت شہ کی خوبی گیاں سدھ بسار

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۲۱۷

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۳۹ [3] صفحہ ۴۸

ترت سیتی مل کریوں کیتی عرض | کہوں تم کوں ہم ساتھ کیا ہے غرض
جو کپڑے ہمارے رکھیں ہے چھپا | جو کچھ دل میں ہووے سو دیو تم بتا
انوں ساتھ تب شہ اُٹھا بول کر | چھپے راز دل کے سبھی کھول کر
تمارے جو ہے ساتھ بانو حسن | اسنے دل میں میرے کیا ہے وطن

میرا جیو اسن پر ہوا ہے فدا
خدا اس سین مجکوں نہ راکھے جُدا[1]

(۷) شوقی

حسن نام، تخلص شوقی کا ذکر مؤلف اُردو شہ پارے نے گولکنڈہ کے شعراء میں کیا ہے مگر اس کو دکن کے تین مختلف درباروں یعنی قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں سے تعلق تھا، چونکہ زیادہ تر زمانہ اس کا بیجاپور میں گذرا ہے اس لیے ہم اس کو بیجاپوری شعراء میں شامل کرتے ہیں۔

شوقی کی شہرت اس کی زندگی میں کافی طور پر ہو چکی تھی، ابن نشاطی نے اپنی مثنوی "پھول بن" میں اس کی تعریف کی ہے اور اس کے زندہ نہ رہنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

اس کی دو مثنویاں اور چند غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جو انجمن ترقی اُردو میں محفوظ ہیں[2] ان دو مثنویوں میں سے ایک مثنوی میں اس مشہور لڑائی کا ذکر ہے جو شاہان دکن میں اور والی بیجانگر میں ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شوقی کو اس زمانے میں نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اس بناء پر اس فتح کا سہرا اسی سلطنت کے سر باندھا ہے۔ حالانکہ دیگر سلطنتوں کا بھی اس فتح مندی میں خاصہ حصہ تھا۔ دوسری مثنوی میزبانی نامہ ہے۔ اس مثنوی کا موضوع سلطان محمد عادل شاہ والئ بیجاپور کی شادی ہے۔ سلطان نے اپنی یہ شادی اپنے وزیر مصطفٰے خاں کی لڑکی سے رچائی تھی، اوّل الذکر مثنوی سے لڑائی کے حالات تفصیلی طور پر معلوم ہوتے ہیں، دوسری مثنوی سے معاشرتی حالات کا اچھا اظہار ہوتا ہے عیش و عشرت کے جملہ لوازمات پر نہایت اُستادانہ طریقہ سے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔

---

[1] مثنوی بہرام و حُسن بانو

[2] رسالہ اُردو

فتح نامہ نظام شاہ

الٰہی کرم کا کرنہار توں ۔۔۔ ہے اوّل و آخر رہنہار توں
سو قادر ہے قائم تو پرورگار ۔۔۔ توں قادر ہے دائم اپیں برقرار

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوئے ۔۔۔ محبت سوں اخلاص یک دل ہوئے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق ۔۔۔ اپس میں اپیں مل کئے اتفاق
یو سب مل کے ایسا کئے یک پنا ۔۔۔ جو اس کفر کو مار کرنا فنا
کئے بھاگ سوگند و عہد استوار ۔۔۔ یو غازی غزا پر ہوئے برقرار
نکو ڈر بلا تے جو شب درمیاں ۔۔۔ دیکھن کیا چرخ پھیرے ہے آسمان

ڈوبے قاب زریں سو غرقاب میں ۔۔۔ گئی حور زنگی کرے خواب میں
جبش نے پھواں چیر سر پر لیا ۔۔۔ ترک دیکھ پرنار سر تل کیا
جبش تے جو پرگت ہوا چند روپ ۔۔۔ جبش نے جتنے ترک چینی سروپ
بیٹھا ناگ کالا اوڑیا راج ہنس ۔۔۔ اوٹھی شیام سندر سوتاراج اونس
پڑیا پھول پر جب بھنور پنکہ پسار ۔۔۔ چھپا ترک زنگی کھرا آشکار
ہوا گرم ترمغز تب رائے کا ۔۔۔ سنا جب یو آواز کرنائے کا

کہ میں رام اچنتے ترک زور کیا ۔۔۔ سمندر اچھے حوض کوں شور کیا

میزبانی نامہ

سدا دار پر تجھ منگل گزگزیں ۔۔۔ منگل گزگزیں جیوں بدل گزگزیں
ہستی مست پر پیلیاں مست ہے ۔۔۔ زبردست پو کیا زبردست ہے
سدا دار پر تجھ طبل باجتے ۔۔۔ طبل باجتے ہور مندل کا بجتے
بہت دیس تے شہ کی گھر کاج ہے ۔۔۔ شہر گشت کی رات سو آج ہے
شہر گشت کا ساز و ساماں ہوا ۔۔۔ نفیریاں ترائے دماماں ہوا

ے ے رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء

غزل

دلبر سلونی نین پر کھینچی ہے سو کا خوبتر
خطاط جیوں مار یا رقم چھندوں ثلث کے صاد پر

یا چک دوات ہے سیم کی کیکی سو بہر سیاہی رکھے
سو کا قلم جیوں واسطے کاتب گیا اس میں بسر

یا نین موتی دھال میں سو کا سو تا گا نیل کا
موتی پرو کر کھینچے تو رہیا ہے ٹوٹ کر[1]

ہوئی خلق حیران سب دیکھ یوں
کہ اٹکا جنازہ یہاں آ کے کیوں

(۸) صنعتی

محمد ابراہیم خاں نام، صنعتی تخلص ۔ بیجاپور کے اس دور کا شاعر ہے بساتین السلاطین میں ابراہیم خاں نام کے ساتھ صبتی[3] تخلص لکھا گیا ہے ۔ غالباً یہ کتابت کی سہو ہے کیوں کہ اس کی تصانیف سے صنعتی تخلص صاف واضح ہوتا ہے ۔ دوسرے شعراء کی طرح اس کے سنہ وفات وغیرہ کا علم نہیں ہے خیال یہ ہے کہ عادل شاہی دور کے اختتام سے پہلے اس کا انتقال ہو چکا تھا ۔ محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ کے دَور میں موجود رہنے کا ثبوت ملتا ہے ۔ صنعتی کی دو مثنویاں ہمدست ہوئی ہیں ۔ ایک قصہ بے نظیر یا قصہ تمیم انصاری اور دوسری مثنوی "گلدستہ" سے موسوم ہے[4] ۔ پہلی مثنوی ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۴ء) میں تصنیف ہوئی ہے ۔ چنانچہ ذیل کے شعر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۔

ہزار ایک پر سال پنجاہ و پنج
ہوئے تب ہوا پر جواھر یو گنج[5]

دوسری مثنوی "گلدستہ" کی تصنیف کا سنہ واضح نہیں ہوتا ۔

قصہ تمیم انصاری کی سبب تالیف میں صنعتی نے ظاہر کیا ہے کہ ایک مبارک رات جب کہ وہ تخیل کی دنیا کی سیر کر رہا تھا دل میں خیالات دریا کی روانی کی طرح اُمنڈ رہے تھے بسرت طاری تھی گویا معلوم ہو رہا تھا کہ معانی کے دروازے کھل گئے ہیں، حیات

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۹ء

[2] نسخہ مطبوعہ بمبئی ۱۲۹۰ھ صفحہ ۴۵

[3] بساطین السلاطین مطبوعہ مطبع سیدی حیدرآباد ۔ صفحہ ۲۳۳

[4] دکن میں اردو طبع چہارم ۔ صفحہ ۱۶۱ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کا نسخہ موجود ہے ۔

[5] قصہ بے نظیر ۔ مطبوعہ صفحہ ۲۷

ابدی حاصل کرنے کا ولولہ زور پر تھا سونچ تھی دل نے کہا کہ دنیا میں صرف اس کا نام باقی رہتا ہے. جس نے کوئی اچھی یادگار چھوڑی ہو اور اس کا بڑا ذریعہ سخن ہے جو ایک اچھے فرزند سے زیادہ قیمتی ہے جس سے کوئی یادگار باقی نہ رہے تو اس کا مرنا جینا ایکساں ہیں. اس خیال کے تحت اس کو بے نظیر لکھنے کا خیال دامن گیر ہوا، دیو اور پریوں کی داستان کے بجائے پیارے نبیؐ کی روایت بیان کرنا مناسب سمجھی اس لیے یہ داستان قصہ تمیم انصاری قلمبند کی گئی

جیساکہ اس تفصیل سے واضح ہے کہ قصہ بے نظیر یا قصہ تمیم انصاری میں ایک ایسی داستان منظوم کی گئی ہے جو ایک صحابی تمیم انصاری سے متعلق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اپنے گھر سے غائب ہو گئے۔ طلسمات کے پردہ پر رہے۔ کئی سال تک وہاں کے عجائبات دیکھے، مصیبتیں جھیلیں اور واپس آکر اپنے واقعات بیان کیے اکثر لوگوں نے اس کو باور نہیں کیا مگر حضرت علی نے تصدیق فرمائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ تمیم انصاری دُنیا کے عجائبات دیکھے گا۔ صنعتی کے قصہ کی پوری تفصیل پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس کے مطبوعہ نسخہ میں کر دی ہے۔

دوسری مثنوی "گلدستہ" ایک عشقیہ داستان ہے ملک مصر کا شہزادہ سیاحت کے لیے روانا ہوتا ہے۔ اثنائے سفر میں مختلف حادثات پیش آئے، مصیبتیں اٹھائیں اور پریشانیوں سے دو چار ہو کر کامیاب وطن کو واپس ہوا۔

اوّل الذکر مثنوی کو مجلس مخطوطات سالار جنگ نے شائع کر دیا ہے اور اس کا مخطوطہ بھی جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔ ثانی الذکر مثنوی ہنوز شائع نہیں ہوئی اس کا ایک مخطوطہ حیدرآباد کی سنٹرل لائبریری[2] اور ایک نسخہ سالار جنگ کے کتب[3] خانہ میں ہے۔

سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے پاس یہی ایک نسخہ موجود[4] ہے صنعتی کی مثنویوں

---

[1] جامعہ عثمانیہ کے اُردو مخطوطات پروفیسر عبدالقادر سروری ۱۶۷

[2] اردو مثنوی نمبر (۵۳۸) کتب خانہ سالار جنگ

[3] کتب خانہ سالار جنگ اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست. صفحہ ۵۹۴

[4] "سب رس" فروری ۱۹۳۱ء

سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔ اس کی مثنویوں میں سادگی، لطافت، شگفتگی کے ساتھ مثنوی کی دوسری خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ دونوں مثنویوں کا نمونہ پیش ہے۔

حکایت کے راوی نے کر خوش قلم — چلاتا ہے یوں اس بیاں کا رقم
کہ حضرت علی یوں کیے حکم جب — تمیم انصاری کہے کھول سب
کہ اے جانشینِ شہِ کائنات — مجھے غسل حاجت ہوا ایک رات
کہا گھر میں عورت کوں آہستہ نرم — کہ پانی توں کر غسل کوں جلد گرم
بزاں دی او عورت مجھے یوں جواب — کہ پانی کوں کر کے بتا کی شتاب
یدی گرم کرتی ہوں ٹک صبر دیو — نہیں یاں سنے تمنا بجاتا ہے دیو
جو ایسے میں یک دیو آ سخت تر — اوڑیاں داں نے لے مجھ ہوا کے اپر
کیا میں جو اس کی طرف جب نگاہ — دسیا مجھ تین تل جہاں سب سیاہ
جسے تھا سنیا کہن تھے سخت تر — سکل تن پتھر دل و جرٹے نے بہتر
اتھے ہات اوس جھاڑ کینکر کے سار — دھن غار سا سیر تھا جوں پہاڑ
چو بن ہار تھے بال اس کے سکل — اتھا تن سکل گھونگرو کا جنگل[1]

گلدستہ کا نمونہ یہ ہے۔

سنو اے سخن داں صاحب ہنر — ایتا او بیاں کھول بولوں مگر
عجب یو نز اکت بھریا یو بچن — کہ سن تازہ ترھوویں دل کے چمن
خوشی سوں چلیا شاہزادہ نکل — کہ اس کام آنے کا دھر دھر شغل
وہ فعفور کے بارگاہ پیچ آ — کہا حاجیاں کوں سلام ان نجھا
علیکم دے اس جماعت تمام — پوچھے حال اس کا کتے استفہام
بیاں سو اپس کا کہا ان حضور — سنے بات حاجب اد سارے ضرور
آ نگے او کہے اس کون آ بجا من — نصیحت کا سُن تو ہمارا سخن
سخن کھول کر اس کو بولے حکایت — نکل جانکوں دے بلا میں تو بات

---

[1] قصہ بے نظیر۔ مطبوعہ سالار جنگ بورڈ۔ صفحہ ۳۴

وہ دختر ہے خوں ریز ہور جانستاں — نکو اس بلا میں تو پڑنا کہاں
کہا شاہزادہ سنو اے عزیز — میری بات کو دل میں دے کر تمیز
جو کوئی مرتے ہیں ثابت قدم — نہ ہوتے ہیں آپ سے بلائے عدم[1]

(۹) ملک خوشنود

خوشنود[2] دراصل گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا غلام تھا اور خدیجہ سلطانہ کے ساتھ خانگی ملازم کی حیثیت سے بیجاپور گیا۔ راستہ میں اُس نے سامان جہیز کی دیکھ بھال اور انتظام اس عمدگی سے کیا کہ خدیجہ سلطانہ نے اس کے حُسن انتظام کو دیکھ کر ایک اعلیٰ خدمت پر مامور کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کے مراتب بلند ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۲ء) میں سفارت جیسی اہم خدمت اس کے تفویض ہوئی۔ اس خدمت کو ملک خوشنود نے جس عمدگی سے انجام دیا اس کی صراحت گول کنڈہ کی ایک مستند تاریخ حدیقۃ السلاطین میں اس طرح بیان کی ہے۔

"۱۰۴۵ھ میں محمد عادل شاہ نے اپنے وزیر اعظم خواص خاں کی خودسری سے مجبور ہوکر اپنے سالے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے مدد کی خواہش کی اس اہم کام کے لیے ملک خوشنود منتخب کیا گیا کہ وہ یہاں آکر تمام واقعات بیان کر دیئے، اس سفیر کی آمد پر عبداللہ قطب شاہ نے اس کے استقبال کا ایسا عمدہ انتظام کیا تھا کہ شائد آج تک کسی سفیر کا نہیں ہوا تھا شاہی دربار میں آنے کے قبل شاہی محل کے عہدہ دار اس کے استقبال کو شہر کے باہر گئے اور بہت ہی اعزاز اور احترام کے ساتھ اس کو دربار میں لایا گیا۔ ملک خوشنود نے سلطان عبداللہ کی مدح میں ایک بہترین قصیدہ سُنایا، بادشاہ نے خلعت انعام دے کر ایک معزز ہندو کی عظیم الشان عمارت میں اس کے قیام کا انتظام کیا اور جب تک گول کنڈہ میں قیام رہا، تحائف ملتے رہے اور جب اپنے کام سے واپسی کا موقع آیا تو گول کنڈہ سے

---

[1] گلدستہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ

[2] اردو شہ پارے صفحہ ۴۷، ۴۸۔ یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۲۲۳ تا ۲۳۱

غواصی کو اس کے ساتھ بیجاپور روانہ کیا گیا[1]

جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے ملک خوشنود نے قصائد بھی لکھے تھے مگر افسوس ہے کہ اس کا دیوان اب تک ہمدست نہیں ہوا البتہ دو مثنویاں ہمدست ہوئی ہیں ایک "ہشت بہشت" اور دوسری مثنوی "بازار حسن" اول الذکر مثنوی کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ مصنف کیٹلاگ نے سہواً اس کے مصنف کو محمد شاہ لکھ دیا ہے۔ یہ مثنوی دراصل امیر خسرو کی اسی نام کی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ اس مثنوی کے تصنیف کا سنہ صاف طور پر واضح نہیں ہوتا مگر مثنوی کے ایک شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً ۱۰۵۶ھ میں اس کی تصنیف ہوئی کیونکہ کہتا ہے :-

ملک خوشنود موتی صاف رولیا   اپس کے نانو کا تاریخ بولیا

ملک خوشنود کے لحاظ سے ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۵ء) قرار دینا صحیح ہوگا۔ اس مثنوی میں اوّل حمد ہے پھر نعت اس کے بعد معراج کا بیان، اس کے بعد بادشاہ کی مدح اور پھر اصل قصّہ شروع ہوتا ہے۔ یہ داستان بہرام گور سے متعلق ہے اس کے عشق کا حال لکھا گیا ہے بادشاہ کی مدح اور خاتمہ کے اضافہ کے قطع نظر یہ مثنوی فارسی کا ترجمہ ہے اس میں خوشنود نے اپنی جانب سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ رستمی کے خاوری نامہ کی طرح اس کی زبان صاف نہیں ہے۔ اس مثنوی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خوشنود نے ایک دوسری مثنوی یوسف زلیخا بھی نظمائی تھی مگر اب تک اس کا کوئی مخطوطہ کسی کو ہمدست نہیں ہوا اس لیے بعض اصحاب کو اس کی تصنیف سے انکار ہے۔

"مثنوی ہشت بہشت" کا کوئی نسخہ موجودہ معلومات کے لحاظ سے حیدرآباد یا ہندوستان کے کتب خانوں میں نہیں ہے۔ صرف برٹش میوزیم لندن میں ایک نسخہ موجود ہے[2]۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

عجب بے مہر دُنیا بے وفا ہے   محبت عین اس کا سب جفا ہے

جتے ہیں دوستاں فرزند ساتی   سگل ہے گور تک او سب سنگاتی

---

[1] حدیقۃ السلاطین مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۲۶۹ و ۲۷۰

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۲۲۳

نچھل نیکی کے گھر کا ڈال بنیاد — ترے بعد از کرے سب خلق تجھ یاد
نہ کر ایسا بدی جو سر دھنا دے — موے پیچھے ترا کوئی غم نہ کھا دے
ملے ہے باپ، بھائی سب مراثی — ولے کوئی گور میں ہرگز نہ آسی
کہاں دارا سکندر شاہ گیانسی — کہاں جمشید جم حاتم دو نہ انسی
جداں لگ ہے سکت پاتاں منے زدر — تداں لگ سب اچاتے دوستاں شور
چلے چوں نیک مرداں چل تو خوشنود — خدا حاصل کریں گا دل کا مقصود[1]

کیا شہ رخ جدھر خورد دانا — کیا جن عقل میں جگ کو دوانا
لگیا شہ بہوت چند سوں آزمانے — کنک جیو کا کسوٹی پر لگانے
دیا جواب اسکوں اے شاہ سبحانی — کہ طفلاں سوں نہ ہوئے کاردانی
جب اس فرزند کوئی شہ آزمایا — بہت کچھ شادماں دل میں بسایا

کہیا شہ تین گوہر ہے شرفناک — رتن جوں کہاں کے شرشور سوں پاک
ہوا خوش حال اپنے جیو میں برسوں — کیا سجدہ خدا کوں تخت پر سوں
ولے فرماں دیا تینو رتن کوں — نکل جاوو تمھیں ہر یک پٹن کوں
جہاں لگ ہے مرا سب مرغ و ماہی — جہاں پھرتا ہے منج شہ کا دوراہی
رہیں گے واں تو ماروں خوار کر میں — سیاست کو دھروں گا وار پر میں
کہے جب بات اس شہ کی بارے — سیاہ پوش ہو چکے او شاہزادے
بندے توشہ چلے سٹ طمع گھر کا — تماشا دیکھنے سب بحر و بر کا
گئے جب شاہزادے شہر سوں بہار — بغیر جنگل پہاڑوں کوئی نہ ٹھا ٹھار
جکیچ ہر شہر میں آوے سو سیتے — خرابے میں کدہیں جوں شیر سوتے
اتھا سب مغز سر میں سروری کا — ولے پکڑے ہنر سوداگری کا
ہر یک شہ کے نگر میں یو دلیراں — چلیں بکری او پر چوں مست شیراں

---

[1] اردو شہ پارے۔ صفحہ ۲۰۳

ہوا ایک دن فضائے آسمانی — چلے یک ٹھار مل یو یار جانی
جو ل یک شہر کے نزدیک آئے — بندے گھوڑے وہاں آرام پائے
اتھا اس شہر کے نزدیک جنگل — رہے اس بن میں یوں جوں مست منگل
یکایک ایک زنگی دوڑ آیا — کہ جوں شیطاں اپنا مکھ دکھایا[1]

ملک خوشنود کی دوسری مثنوی کا صحیح نام معلوم نہیں ہوتا، مضمون کے لحاظ سے ڈاکٹر زور صاحب نے اس کو "بازار حسن" سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی صراحت کے لحاظ سے یہ مثنوی ملک خوشنود نے بیجاپور جانے سے پہلے گولکنڈہ میں لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ نامکمل مثنوی ہے اس میں بادشاہ کی مدح کی بجائے میر مومن کی مدح ہے جو قطب شاہی امیر اور پیشوا کی خدمت پر مامور تھے۔

مثنوی کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

مناجات

ضعیفاں کوں نہ رکھ سی ذرد میں تو — ہتی شوز ہے ملا دے گرد میں تو
جسے منگتا نہیں کاڑیا وزیری — مڑوڑیا کان اس کے ولے فقیری
کریما کر کرم مجھ حال پر توں — مرے سب حال اور احوال پر توں
خودی کا خدشہ سب توں سروں کر دور — بھرا اتھی ہیں عبادت کا سگل نور
نبی کے لطف کا امرت پلا توں — گنہ سب دور کر پھر مجھ جلا توں

میر محمد مومن کی مدح:

کروں تعریف میں اہل صفا کی — وہ فرزند محمد مصطفےٰ کی
شرف میں غوث ہے سارے جہاں کا — قطب ساتوں زمیں ہور آسماں کا
محمد مومن ہے اسم شرف پاک — اِتن کے سیر کا میداں ہے افلاک
سگل شاہاں مریداں رو زیراں — کریں خدمت سو کل صوفی فقیراں
کریں سب موماں کی رہنمائی — کرے ظاہر خدا کی سب خدائی
منجم، مجتہد، شاعر سخن میں — کہ ہے ہشیار سارے علم و فن میں[2]

---

[1] اردو شہ پارے۔ صفحہ ۲۰۵ و ۲۰۶

[2] تذکرہ اردو مخطوطات۔ جلد سوم صفحہ ۲۰۶

فلاطوں بو علی کی سیمیا کا | ہنر شاگرد کرے کیمیا کا
پڑیا تھا شور سب ساتوں گگن ہیں | کہ نادر ہے ولی ملک دکھن میں
ریاضت سوں بھریا سب دامن نور | ہوا ہور حرص کوں کیتا نظر دور
رکھے ہے پاک دیں اپنے خدا کا | کئے قائم شریعت مصطفےٰ کا
خدا کا لطف سو اوپر تمام ہے | سدا خوشنود جم جیو سوں غلام ہے[1]

ملک خوشنود کی ایک غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو جو انجمن ترقی اردو پاکستان کے ایک مخطوط " علی نامہ" میں درج ہے ـــ

اچپل چتر سکی کوں ہمارا اسلام ہے | جس کی ادہر میں شہد سیوں میٹھا کلام ہے
جیو جوں جگر ہوا تو جہے دیکھت چند مکھی | مجہ من میں اشتیاق سو تیرا مدام ہے
تج باج کیوں رہوں کہ جگت دیکھ مجہ کہے | پیو باج جن جیا، سو جیونا حرام ہے
نس دن مرے خیال میں تلمل جو توں بسے | جوں برہمن کے دل میں سدا رام رام ہے

سو دین کہے ہے شوق سوں خشنود سات مل
قربان تجہ میں بھی مرا جیو تمام ہے[2]

(۱۰) رستمی

رستمی کا نام کمال خاں تھا۔ اسمٰعیل خاں کا فرزند تھا۔ اس کے آبا و اجداد سات پشت سے عادل شاہوں کے نمکخوار اور شاہی خطاطوں کے زمرہ میں شامل تھے ان کو خطاط خاں کا خطاب بھی ملتا تھا چنانچہ اسی خطاب سے کمال خاں رستمی کو محمد عادل شاہ نے سرفراز کیا تھا۔

رستمی اپنے عہد کا ایک باکمال قادر الکلام شاعر تھا۔ قصائد، غزلیات کے علاوہ ایک ضخیم مثنوی "خاور نامہ" اس کی تصنیف میں شامل ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے قصائد اور غزلیات اب تک ہمدست نہیں ہوئے اور خاور نامہ کا بھی صرف ایک نسخہ ملا ہے جو لندن میں ہے[3]۔ اس مضمون میں ایک فارسی دیباچہ بھی شامل ہے جس سے رستمی کے مختصر حالات

---

[1] مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو صفحہ ۱۶

[2] قومی زبان کراچی دسمبر ۱۹۶۳ء

[3] کیٹلاگ انڈیا آفس بلوم ہاوز صفحہ ۱۶ اور یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۲۳۲ تا ۲۵۶

پر روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی خدیجہ سلطان شہر بانو عرف حاجی بڑے صاحب یعنی ملکہ محمد عادل شاہ کی فرمائش اور خواہش پر مرتب ہوئی ہے اس وقت کے تمام شاعروں میں سے رستمی ہی کو اس کا اہل سمجھ کر اس کام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

رستمی کی پیدائش کا سنہ معلوم ہوتا ہے اور نہ مرنے کے سنہ کی اطلاع ہے البتہ یہ واضح ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی تصنیف سنہ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۸ء) میں ہوئی ہے۔

یہ مثنوی دراصل ابن حسام کے فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے ابن حسام کو بعض اصحاب نے حسام الدین اور بعض نے محمد حسام سے موسوم کیا ہے وہ قہستان کا باشندہ تھا۔ خاور نامہ کے علاوہ اس کی اور تصانیف بھی ہیں۔ خاور نامہ کی تصنیف کی وجہ سے اس کو فردوسی ثانی بھی کہا جاتا تھا تیمور کے فرزند عمر مرزا کے عہد ۸۷۵ھ میں اس کا انتقال ہوا[1]۔

ابن حسام نے خاور نامہ کو ۸۳۰ھ میں تصنیف کیا ہے چنانچہ تاریخی شعر یہ ہے :-

چو بر سال ہشت صد بفزود سی ۔۔۔ بشد این نامہ بازبان پارسی

مرایں نامہ را خاوران نامہ نام ۔۔۔ بسازم برانکہ کردم تمام[2]

رستمی کے خاور نامہ مملوکہ انڈیا آفس میں علی ابراہیم خاں نے سنہ ۱۷۸۹ء میں ایک فارسی نوٹ بھی لکھا ہے جس میں ابن حسام کے وطن رستمی کے خاور نامہ کے اشعار اور اس کی تصاویر کی تعداد کی صراحت کی ہے یعنی تیئیس ہزار سات سو پینتیس اشعار اور (۱۵۰) تصاویر ہونا ظاہر کیا[3] ہے۔

بلوم ہارٹ نے نفس مضمون کے متعلق یہ صراحت کی ہے کہ اس میں حضرت علی کی جنگوں کا تذکرہ[4] کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں ایک فرضی داستان نظم کی گئی ہے جس کے ہیرو حضرت علی ہیں۔ داستان امیر حمزہ کی طرح اس کا افسانہ ہے اس میں کئی ملکوں کے بادشاہوں سے جنگ، دیووں پریوں سے مقابلے، طلسم کشائی، عیاری وغیرہ

---

[1] کیٹلاگ

[2] خاور نامہ ابن حسام فارسی مخطوطہ

[3] مقالات ہاشمی مطبوعہ لاہور صفحہ ۴۴

[4] کیٹلاگ بلوم ہارٹ صفحہ ۱۶

امور کی صراحت ہے مگر اصلی مقصد تبلیغ اسلام ہے' اگرچہ رستمی نے اس داستان کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے مگر اس کو ترجمہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ رستمی نے اس کو اپنا لیا ہے۔ خاور نامہ کی کئی خصوصیات ہیں مثلاً یہ اردو کی پہلی ضخیم رزمیہ مثنوی ہے دوسرے یہ کہ ضخیم ہونے کے باوجود تسلسل باقی ہے قصہ مربوط ہے۔ اگرچہ یہ مثنوی فارسی کا ترجمہ ہے مگر اس سے عادل شاہی تمدن اور تہذیب کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسلوب بیان سادہ وصاف اور سلیس ہے۔

رستمی کے باکمال اور قادر الکلام شاعر ہونے کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ ضخیم مثنوی جو تقریباً چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے صرف ڈھائی سال کی مدت میں تیار ہوئی ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جو فن شعر میں استادانہ مہارت رکھتا ہو۔

رستمی نے تاریخ تصنیف خود نظم کر دی ہے چنانچہ کہتا ہے۔

نبیؐ کی جو ہجرت سے تھے کیتا خیال ہزار پر پچاس اور نو کے تھے سال

کیا رستمی اس وقت یو کتاب بند ھابات کے گوہراں بے حساب

رستمی کا خاور نامہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے اور اس کا صرف ایک ہی نسخہ ملا ہے جو انڈیا آفس میں[1] ہے۔

خاور نامہ کے قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی مجلس میں ایک مرتبہ اصحاب کی بہادری کا تذکرہ ہوا، کسی نے سعد وقاص کا نام لیا اور کسی نے ابو المحجن کو ترجیح دی — دونوں میں اس کی وجہ سے رنجش کی صورت پیدا ہو گئی۔ ابو المحجن چونکہ جوان تھا اور حضرت علیؓ سے فنون جنگ کی تعلیم حاصل کی تھی جوانی کے جوش میں سعد سے لڑنے کو تیار ہو گیا رات کے وقت دونوں نے جنگل کی راہ لی مگر اثنا راہ میں ابو المحجن نے کہا اس نے ملک مغرب کو جانے کا ارادہ کر لیا ہے تاکہ وہاں مارا جائے یا کامیابی کا سہرا باندھے' سعد نے بھی تائید کی' دونوں لڑنے کے بجائے دوست بن کر ملک مغرب کو روانہ ہوئے اب ان کا سفر شروع ہوتا ہے بیسیوں ملکوں میں جاتے اور لڑائیاں ہوتی ہیں اس اثنا میں آنحضرت کو اطلاع ہو جاتی ہے کہ ابو المحجن اور سعد وقاص ملک مغرب کو روانہ ہوئے ہیں تو آنحضرت صلعم حضرت علیؓ کو ایک لشکر دے کر ان کی مدد کے لیے روانہ فرماتے ہیں۔ اب

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۲۳۲ تا ۲۵۲

حضرت علی کی جنگوں کے کارنامے شروع ہوتے ہیں۔ عمر عیّار کی عیّاری رنگ لاتی ہے۔ بہادروں کی دلاوری کے موقعے پیش ہوتے۔ پہلوانوں سے حضرت علی کے مقابلے ہوتے ہیں طلسم کشائیاں ہوتی ہیں۔ دیوؤں اور پریوں سے جنگ ہوتی ہے' اسلام کی تبلیغ ہوتی ہے۔ قصہ کی مزید تفصیل میں نے یورپ میں دکھنی مخطوطات اور مقالات ہاشمی میں کردی ہے[1]

کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

صفت شب

آیا تھا زمین پڑ بی جوں شاہ زنگ — زمیں ہور زماں کو لیا تھا بے شک
سفیدی پی کھینچی تھی مکھ پر نقاب — پرندسیہ پنسیا سھا آفتاب
زمیں عنبر کا منڈپ تھا تمام — سوا کون سرا پردہ تھا مشک فام
زمیں پر تو سنبل تھا یں تھا سمن — کیا تھا پی سوسن کا کسوت چمن
گیا تھا محل کی بہتر شاہ چین — ضباحی کا سھا مرغ بھی خواب میں
زمیں ہور زماں میں پی کا جل بھریا — انگار جا کے جگ میں دھواں بھر رہیا
جتے مرغ ماہی کوں تھا بھوت خراب — زمیں کوں درنگ آسماں باشتاب
فلک تو طبق گوہراں سوں سنوار — ہوا کون بی زیور کیا صد ہزار

ہر یک طرف کشتے سوں کشتے لگے — نہیں کوئی لڑتے تھے اس میں سکے
سر نیزہ سیتاں سوں گستاخ ہو — موئے بھوت پینے میں میور اخ ہو
ہوا مرد ماں تھے دریا سارا سیاہ — جو کشتی کوں جاتے نہیں اپڑی راہ
تن مرد ماں سوں جا گا سارا بھریا — لہو گی جانو دستی تھی سب دریا

بزاں رونا بھی اپس بر آغاز کی — ماتم کا ابی شیوہ بھی باز کی
ادیوں بولی اے بادشاہ جہاں — دولت سوں اتھاہ پناہ جہاں
دیتا تجھ پناہ میں اسودہ سھا — ترے دور میں ظلم تو کچھ نہ سھا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۲۴ تا ۲۲۸ مقالات ہاشمی صفحہ ۵۶ تا ۵۹

تری داد ستی ظلم کوتاہ تھا ۔ ترا تاج پس افسر ماہ تھا
توں بیدار کر فتنہ درخواب تھا ۔ زمیں تیغ تل تیری سیراب تھا
اتاں آتی خرابی بکار جہاں ۔ اپر آیا شب روزگار جہاں
اتاں شاہی کا تخت بے شہ ہوا ۔ توں روشن جب تھا سو چوں مہ ہوا
اتاں میں ہور یو سو وضع کا پی درد ۔ انکھیاں تر ہوئیاں خشک ہور آہ سرد
زمانہ جو یوں دیکھ لایا منجے ۔ انجو کی جاگے لہو رلایا منجے

وہی دیو جو سعد کوں لے گیا ۔ ہوا اٹھی دھواں ہو تلیں آئیا
کمر کاہ پکریا اتے اتے کر ۔ لیا ہات میں تیغ او شیر نر
ماریا تیغ او دیو کے سر اپر ۔ کاٹیا سر تھے باداں تلک سر بسر
کیا نعرہ استیپا بھی یک بلند ۔ مو ادیو نعرے تھے ہو کر نژند

سواراں کا شمشیر جوں برق ہو ۔ جھکنے لگے آگ میں غرق ہو
کیے جھگرے کا کرنا بھی وہاں ۔ نقریاں تھے گو ہو رہی سب جہاں
اول آیا بھرے کے میدان کوں ۔ دلیراں کوں دکھلایا جھگرے کا مول
سرافراز ابوالمعجن گرد تھا ۔ جو اس کے انگے شیر نر خرد تھا

کیے یوں داں آواز شیران جنگ ۔ اٹھے پانی بھی بہار بھی ادسنگ
سنئے حیدر آیا ہے لشکر زاب ۔ سپاہ اس طرف انے کرنا شتاب[1]
تمام روے دریا بھی لشکر بھریا ۔ آرائش ہر یک طرف دوسری کیا

... ...

کہاں ہے جو صلصال کا ہے سپاہ ۔ اد آیا بیاری طہماس شاہ
ہر یک ملک تھے رزم ساز گرد ۔ کیے جھگڑے کا روپی ساز کرد

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات. صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۸

ابو المعجن کرد کوں بولے راہ — پکڑ ناوں تو رجبتا ہے برسپاہ
توں ہور سعد وقاص و مرد و دست — توں جا برلب دریا سورواں باست
من پکڑو جاکر گذرگاہ آب — جو دشمن ادھر کوں نہ آوے شتاب
اگر آگا لشکر دریا تھے بردں — ساحل کا جنگل ہو کا دریائے خوں
دیا جواب او یوں کہ قہرباں بزم — جکچ توں کہے گا بیا باں بزم
جو پرلیا گا دشمن اگر جوں عقاب — تو ناں دلیوں اے زور بائے آب
انو رومی ترکش اپر لیائے دست — کماں زہ کئے اور کھولے او وست
جو اناں سپر سوں سپر بافتند — او پیکاں سوں بال بشگافتند
ہلے داں سے حیدر نے پے چھوڑ جائے — فلک کوں انو لیائے رسدم زپائے
سواد امن اب سب پر سپاہ — ہندے چمن اپراں جانے کی راہ
جوں سر بال جھگڑے سوں جاکر ملیا — موے ناموربھوت سوداں دکھیا

... ...

سوراں لے لیو تھے دپولاد نعل — دو نکر میں ہوئے پتھرے سب واں کے لعل
وہی کرد مالک لے گرز گراں — جو رستم اتھا او بی زندراں
کھرے یک میں ماریا دو سو سوار — انو کوں کیا پست اد ایک بار

جتے مرغ ماہی کوں تھا بھوت خواب — زمیں کوں درنگ آسماں باشتاب
اگر ماتی ہودی گا تن زیر خاک — میرا نا جیتا ی مجھ کیا ہے باک
نبی کی جو ہجرت تھی کیتا خیال — ہزار پر پچاس اور نو کی تھی تھال
کیا رستمی اس وقت یو کتاب — بندھا بات کے گوہراں بے حساب

خاور نامہ دکھنی کیتا ہوں نام
ہوا خاوراں پر قصہ سب تمام

رستمی کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو یہ بخوبی واضح ہوتا ہے وہ دکھنی زبان کا بلند پایہ شاعر اور اُستادِ سخن تھا، اس کی پُرگوئی اور قادر الکلامی سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے چوبیس ہزار شعر کی مثنوی صرف ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں لکھ دی۔ یہ نہ صرف اردو

زبان کی پہلی ضخیم مثنوی ہے بلکہ رزمیہ مثنوی بھی ہے۔ اس قدر ضخیم ہونے کے باوجود اس کا تسلسل بیان بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ رستمی کے کلام میں صفائی و سادگی ہے۔ اشعار صاف ہیں، اس کی تشبیہہ قابل داد ہے۔ واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی یہ مثنوی بلند پایہ ہے جنگوں کے حالات، مقابلہ کی روئداد، شب خوں حملہ کی صراحت جس صفائی اور چابک دستی سے کی گئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رستمی اپنے زمانہ کا نامور شاعر تھا اور دکنی شعراء کے صف اوّل میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

اگر اس کے قصائد اور غزلیات دستیاب ہوجاتے تو اس کے کلام کے جوہر اور درخشاں ہوجاتے۔ رستمی کے بلند اخلاق کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس مثنوی میں باوجود ملکہ کے فرمائش سے مرتب ہونے کے اس میں بادشاہ کی مدح ہے اور نہ ملکہ کی تعریف۔

۱۰۔ دولت دولت اسی عہد کا شاعر ہے۔ دیگر شعراء کی طرح ہم اس کے بھی تفصیلی حالات سے باخبر نہیں ہیں۔

اس نے امین کی ناتمام مثنوی بہرام وحسن بانو کی تکمیل کی ہے جس کے متعلق امین کے حالات میں صراحت کی گئی ہے۔

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پر — بنائے محل سارے گلزار پر
بچھے قالیاں بیچ ایوان کے — دھرے تکیہ بغلی بڑی شان کے
بھوت بھات سوں سارے مسند کیا — جواہر کے راسوں سے زینت کیا
کیا آب پاشی وہاں ہر زماں — صبح شام چھڑکا ہوے بے گماں
تھے چھتیس باجے اسی ٹھار پر — بجاں ہار موجود تھے کارگر
پریاں ہر طرف لگیاں ناچنے — یو باجے چھتیسوں لگے باجنے
ہوئی رقص بازی مکان و مکاں — خبر یو ہوئی ہر ملک درمیاں
طعاماں سو اقسام تیار کر — کھلانے لگے سب کوں تکرار کر
کھڑے سربراکار ہو مستعد — ہریک کام پر دل سوں ہو کر بجد
ضیافت بڑے شان ہیں آن کیا — تواضع سیں دل ہاتھ سب کا لیا
ہوئے شاد شاداں سو مہماں سگل — خوشیاں سب کے دل پر سوایاں اہل[۱]

---

[۱] یورپ میں دکھنی مخطوطات

(۱۲) شاہی

علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا تخلص شاہی تھا۔ یہ نصرتی کا نہ صرف مربّی اور سرپرست تھا بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے۔ اس کے عہد کے نامور شعراء کا ذکر ہو چکا ہے۔ سلطان کے شوق کا نتیجہ تھا کہ بیجاپور میں گھر گھر شاعری کا چرچا ہو گیا تھا۔

شاہی نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کا کلام اب سے پہلے بالکلیہ نایاب تھا۔ اب اس کے کلیات کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا ہے[1]۔

شاہی کے قصیدے جہاں ادق اور مشکل بحروں میں ہیں تو وہاں اس نے آسان اور سہل بحریں بھی استعمال کی ہیں۔ ان قصیدوں سے اگر شاہانہ طمطراق رعب و داب کا اظہار ہوتا ہے تو اس کی مثنویاں واقعہ نویسی اور مرقع نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس کی غزلیں رنگیں خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی تخیل کی بلند پروازی کو ظاہر کرتی ہیں۔ صفائی اور سادگی اس کے کلام کے گویا لوازم ہیں۔

شاہی کے کلام کی تعریف اور اس کی اردو شاعری کے انہماک کے متعلق بیجاپور کے سب مؤرخ ہم زبان ہیں، اور اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہی کے کلام کو مرتب کرنے کا کام اس کے صاحب ذوق مصاحب شاہ ابوالمعالی کے ذمّہ تھا۔ بہت ممکن ہے کہ دستیاب شدہ کلیات وہی ہو۔

ذیل میں اس کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

قصیدے

عقل کا مکتب ہوا فہم کے پڑھنے بدل — عقل معلّم اپن قصّہ سکھایا کہن
عقل خبردار ہے، عقل ہمہ کار ہے — عقل کا جاسوس ہو مکھ پہ اچھے یو کرن
عقل کا موتی مگر مغز کے طبلے بہتر — خوب وسادے جھلک در جگ درعدن
عقل کسوٹی ہوئی طبع کے کسنے بدل — بوجھ رکھیا ہے صراف قلب کرا جیو کنجن

---

[1] اس کلیات کا یہ نسخہ دفتر دیوانی و مال حکومت حیدر آباد کے کتب خانہ میں ہے۔ اس پر ہم نے تفصیل سے ایک مضمون لکھا ہے جو رسالہ معارف اعظم گڈھ میں شائع ہوا ہے۔ (جلد ۳۱ نمبر ۵) اور یہ مضمون ہماری کتاب مقالات ہاشمی میں شامل ہے۔

خاک کی پتلی بنا روح نے تن میں بھرا
جال چلا کر اوّل آپ سکھایا کہن
آب و آتش ملا خاک و ہوا تے کلا
چار عناصر لگا دھہ سنوار یا ہمن
دور پھریں جو تمام سجدہ کریں صبح و شام
لیک ستاریاں سنگات چاند سورج اور گگن
نور کا جھلکاٹ دے حور پری لک سنوار
سات طبق سرک کے پور رکھیا ذوالمنن

... ...

شاہی عاشق اتا بول مناجات کچ
تا کہ کرم تج پہ ہوئے بہر حسین و حسن
کار جہاں کے سگل نکرتے بہاری اچھے
سائیں کرے لوبہ جب دور ہو جاوے محن
آہ و افسوس کے قبح تے و محفوظ دہر
سایہ کرم کا دکھا ذوق سوں رکھ مج بدن
سائیں سچّا ہے تھمیں سیوا تجے ہے سہی
جیتے جہاں کے شہاں روز کریں تج سرن

علی داد محل اور اس کے باغ اور حوض کے متعلّق ایک قصیدہ ہے اس کے بعض شعر یہ ہیں :۔

کسوا یا اٹھواں سمد رہبر یا جب نیر سوں حوض
سزاوار اس کے آئیگے ہے یو علی داد محل
پایا یو اچھے اس قصر کا پاتال تلک
طاق کسریٰ ہوئے معراج اسے زہ کے اگل

بھرے ہیں باغ کے تختے گلاں ہر جنس کے تے
خصوصاً ریو نیجا تس ہیں یو سادے جنجل
دسے شربت کے یو کوزے جتے ناریل کے گھر
میٹھے کئی نیر چشمے تے بھریا ہے منجل
نارنجی رنگ کا ہوس دھر لگیا باغ ہیں نے
رنگائے تن کوں سراسر دیکھ ہور نگرس ہیں سگل

خاتمہ

دکھانے طبع کی قوت شاہی اس بحر منے
بندھیا ہر بیت میں کئی لفظ یو صنعت کے نول
جان ہور دل تھے اچا ہات دعا منگتا ہے
تا اچھے امن میں سکھ چین تے یو خلق سگل
جو لگوں نور سوں دن کرا اچھے ہور چاند و گگن
جو لگوں زہرہ ہے زاہرا اچھے ہور پہ زحل
مشتری سعد ہے جو لگوں و عطارد ہے دبیر
جو لگوں پانچوں منے اکاس پہ دستا ہے منگل
جو لگوں رات دن دپہر گھڑی جشن منے
بجو انند سوں اس گھر میں سدا تاں منڈل

کلیات میں (۷۲) شعر کی ایک مثنوی خیبر نامہ کے عنوان سے ہے اس کے بعض شعر یہ ہیں

اوّل حق کی توحید سوں کرو سخن | پچھن خوش ادا سوں بیاں کر بچن
تجھے ہے سزاوار حمد و ثنا | تو ہے حکم سوں ہے نہنّا ہور بڑا

.. ..

آ ایک قصہ سنو جنگ کا | کہ وہ جنگ تھا دین کے ننگ کا
اتھا ایک خیبر کا قلعہ بکل | بڑے بہر کلاں پر اکل تھے اٹل

.. ..

سلح ظاہری و باطنی سوں سنوار | عنایت کیے شاہ کوں ذوالفقار
روانہ ہوئے جنگ کے لینے نامدار | وہ شاہ ولایت ادھک کام گار
چلے شہ وہیں کفر کوں توڑنے | او جاست پتھر کے بتاں پھوڑنے

.. ..

جو مرحب نے دیکھا برادر کتیں | کہیا وہ گیا تو لڑوں گا ج ہیں
زرہ باندھ دوہری بندھا او فرنگ | رکھیا دل میں جب شہ سوں کرنے پلنگ
لیا ہات بھالا جو تھا تین من | شتابی سوں آکر کھڑا اپنچ رن
جو دیکھا نظر بھر شہنشہ کا موں | وہ بولیا سخن یو اپس بوج سوں
کہ سپنے میں دیکھیا ہوں میں رات شیر | کیا پہاڑ پنجے سوں آپس کوں زیر
وہی شیر دستا ہے مج آج یو | غصے سوں کرے گا مگر دہر کوں دو
شہنشہ نے مرحب کوں بیگی بلک | دو شق کر مٹے سیس تے پا تلک

.. ..

یہودی جتے تھے ہوئے سرنگوں | غنیمت لگی بات حد سوں فزوں
فتح کر قلعے کوں شہنشاہ سور | پھرے لے کے لشکر پیمبر حضور
پیمبر خبر سن کے خوش حال ہوں | ہوئے تو آ لگے علی شہ سوں مل

.. ..

ترا یا دوں رات شاہی کا کاج
ترے فیض سوں ہے اسے تخت و تاج

غزلیات

نمونہ غزل

سارے جہاں کے پارکھی پرکھوں رتن کیوں کر کہو — یاقوت ہور مرجان میں کوہی رتن بر تر کہو
بولے جہاں کے پارکھی ہمنا نہ آوے بولنا — تمنا سہاتا بولنا اے شاہ بحر و بر کہو
بولیا ہوں نت میں فکر تے یو دو رتن کا فرق کر — گر سچ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو
مرجان میں صافی نہیں یاقوت میں صافی اچھے — جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کو بہتر کہو

یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل
سن کر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

منظفر علی شاہ کے ہات کا — اچک تیر لاگیا نشاں سے پلک

ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں — زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشاں تج ہات کا

تج بال کالے دیکھ کر بادل پھریں حیران ہو — تج بہال ہور نیلک کنے کیا چاند ہور کیا سورہے

تج نیں کی نرمی کنے منگتے ہیں موتی آبرو — یا روپ کی تو کان ہے یا حسن کی سمدور ہے

تج گال پر رنگ کا نشاں دستا ہے مج اس بات کا
روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

جس دن تے تمن سات لگیا من را ہمارا — اس دن سے پرت کا ہوا مج تن میں پکارا

ریختی

سلطان کے کلام میں ریختی بھی ہے۔

مج نین کے نگر میں لالن وطن کئے جب — تب انجمن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ہیں
گل ہور گلاب میانے نہیں کچھ فرق ازل تے — یوں پیوں سوں مل رہی ہوں الفت اسے کہتے ہیں

روں روں رین کری ہیں شاہی کا ناؤں لینے
پھر پھر وہ ناؤں لینا راحت اسے کہتے ہیں

نمونہ خمسہ

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

دل مرا اپنے سات کیا
مج برہے میں دن رات کیا
دل داری کا نا بات کیا
سب بسرا اسکہ ہے بات کیا
گئے مج سوں ایسی دہات کیا

کوئی جاؤ مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

پیو مورت دیکھو سپنے میں
جب جاگو تب رہوں سپنے میں
لا دیپک برہا اپنے میں
تن جائے جھک جھک جینے میں
آرام اچھے مج کھپنے میں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

تج یاد کر تل ملتی ہوں
لہو تیل سنے دل تلتی ہوں
تن موم بتی ہو جلتی ہوں
اس جلنے سوں نا ٹلتی ہوں

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات   میں نیہ بندی توں کیتا گھات

کوئی آؤ سنورے میرا حال
پیو کیا مج سوں جو کو تال
میں جگ تے نت اٹھ انجو دہال
کل پتی آنسو موتی مال

مج یک پل ہے لک لک سال

کوئی جاؤ کہو مج ساجن سات　　　یس نیہ بندی توں کیتا گھات

رُباعی

سب دیس گیا ہے دھن تے لڑتے لڑتے　　　کھٹ رات گئی ہے پانوں پڑتے پڑتے

کیا نیکہ مدن کا اذنج لگتا ہے مجھے　　　رہے پاؤں سرے پرت کے چڑتے چڑتے

شاہی کے کلام کا مختصر نمونہ پیش ہو چکا ہے، اس سے واضح ہے کہ قصیدہ، مثنوی، غزل وغیرہ اصناف سخن میں اس کو پوری مہارت حاصل تھی۔ اس کے قصیدے اپنے زورِ کلام اور طمطراق، تشبیہہ و استعارہ کے لحاظ سے کافی بلند ہیں۔ مثنوی میں اس نے واقع نگاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ شاہی کی غزلیں حقیقت نگاری کی جھلک پیش کرتی ہیں، کیونکہ شاہی محل سراؤں اور ایوان میں خوبی اور رعنائی کے مجسّم پیکروں کی کوئی کمی نہیں تھی، رخساروں کی گلگونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آٹھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مُہیّا تھا۔ اس طرح حقیقت نگاری کے ساتھ رنگین خیالی، عاشقانہ مضمون آفرینی تخیل کی بلند پروازی کو ظاہر کرتی ہیں۔

سلطان نے دولت کے دامن میں آنکھ کھولی، ہوش آیا تو عیش و نشاط کا چرچا سنا اور جوان ہوا تو ساغر و جام کا دَور دیکھا۔ اس لحاظ سے کلام میں رنگینی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے مملو ہونا ناگزیر تھا۔ بلحاظ فن اس کے کلام کو جانچا جائے تو بلاشبہہ اس کا کلام بہت بلندی پر نظر آتا ہے۔

(۱۳) نصرتی

بیجاپور کا یہ نامور اور ذی مرتبہ شاعر ہے[1]، محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا، اس کا باپ شاہی سلحدار تھا۔ بقول شفیق[2] کرناٹک کا باشندہ ہے اس کی پیدائش کے سنہ سے ہم واقف نہیں ہیں۔

البتہ اب جدید تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ ۱۰۸۵ھ میں اس کی شہادت ہوئی[3] ہے

---

[1] نصرتی کا حال بساتین السلاطین، طبقات الشعرا اور قدیم تذکروں میں موجود ہے۔

[2] چمنستان شعراء

[3] فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ

بعض یوروپین مصنفین نے اس کو ہندو تسلیم کیا ہے لیکن یہ امر بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اس کی تفصیلی تردید ہم نے اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" میں کر دی ہے[1]۔

نصرتی کے باپ کو اعلیٰ سوسائٹی میں بڑی عزت حاصل تھی۔ اس کو سلطنت کا خیر خواہ اور جاں نثار شمار کیا جاتا تھا۔ نصرتی کی تعلیم اور تربیت شاہی محل میں ولی عہد سلطنت علی عادل شاہ کے ساتھ ہوئی۔ جب علی عادل شاہ بادشاہ ہوا تو نصرتی نہ صرف شاہی مصاحبوں میں داخل ہوا بلکہ ملک الشعراء کا مرتبہ بھی عطا کیا گیا۔ وہ ہر وقت بادشاہ کے ساتھ اس کے رزم و بزم میں شریک رہا کرتا۔ نصرتی نے بادشاہ کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔

بیجاپور کے سارے مؤرخوں نے اس کی تعریف و توصیف میں ہم زبانی کی ہے۔

نصرتی کی تین تصنیفوں کا پتہ چلا ہے۔ پہلی گلشن عشق ہے جس کی تصنیف ۱۰۶۸ھ میں ہوئی ہے۔ اس میں کنور منوہر اور مدمالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ دوسری مثنوی علی نامہ ہے اس کی تصنیف ۱۰۷۶ھ میں عمل میں آئی ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی سوانح مرقوم ہے اور قصائد بھی شامل ہیں۔ یورپ اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخے موجود ہیں۔ جن کی تفصیل ہماری دوسری تالیف سے ہو سکتی ہے[2]۔

تیسری کتاب تاریخ اسکندری ہے جس کی تصنیف ۱۰۸۳ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے رسالۂ اردو میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

نصرتی کی مثنویاں اور قصائد کے دیکھنے سے اس کی قادر الکلامی کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے گلشن عشق میں انسانی جذبات اور خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہہ اور استعارات کی ندرت واقعی قابلِ داد ہے۔

علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے۔ رزمیہ مثنویوں کا جو معیار مقرر ہے اس سے بھی یہ بلند مرتبہ رکھتی ہے اور پھر اپچی ہونے کے لحاظ سے اس کو خاور نامہ پر فوقیت دینی ضروری ہے۔ تاریخی حالات کے اعتبار سے یہ نظم نہایت مستند ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی بہت بلند پایہ

---

[1] ، [2] ، [3]۔ ملاحظہ ہو یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۵۷

ہے۔ نصرتی نے اس میں جس طرح کی واقعہ نگاری کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ شہر بیجاپور کے حالات اور اہلِ شہر کی معاشرت پر نصرتی نے علی نامہ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

نصرتی کے قصائد اپنے تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور شوکت لفظی کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہیں اور پھر خیالات کی جدت اور تشبیہہ اور استعارات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی زور بیان سے بھی خالی نہیں۔

ہم نے گلشنِ عشق اور علی نامہ پر اپنی تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات"[1] میں نہایت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

گلشنِ عشق اور علی نامہ کے قلمی نسخے حیدرآباد کے کئی کتب خانوں مثلاً کتب خانہ سالارجنگ، آندھرا اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد اور کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں یورپ میں بھی اس کے نسخے ہیں[2]۔

اب حیدرآباد اور پاکستان سے یہ دونوں کتابیں شائع ہو گئی ہیں۔ البتہ تاریخ اسکندری نایاب ہے۔ صرف ڈاکٹر مولانا عبدالحق کے پاس ایک نسخہ ہے۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے نصرتی اور اس کے کلام کے متعلق ایک مستقل کتاب میں روشنی ڈالی ہے۔

مؤلف "گل رعنا" (حکیم عبدالحئی صاحب) نے نصرتی کی ایک تصنیف[3] کا ذکر کیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے۔ نصرتی کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

صفت اس کے قدرت کے اوّل سراؤں — دھریا جس نے "یو گلشنِ عشق" ناؤں

زہی نام در سیّد المرسلیں — کہ آخر ہے وہی شافع المذنبیں

میری طبع کی تیز تازی کیتیں — یوں سون کر نہار بازی کیتیں
ہر اک داستاں بوستاں — ہر یک بیت ہر یک محل جانشیں
معانی کی صورت کی ہے آرسی — کہیا شعر دکھن جوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام — دھرے فخر ہندی بچن پہ مدام

---

[1] [2] [3] یورپ میں دکھنی مخطوطات

دگر شعر ہندی کی بعضی ہنر　　تس کیتیں میں لیا فارسی میں سنور

میں اس دو ہنر کے خلاصہ کوں پا　　کہیا شعر ایسا دو نو فن ملا

دیویں داد سن فارسی شعر داں

جو ہندی سنے بے کئیں دل سوں تاں

اودھر سات تھی ما کے مدمالتی　　ایدھر ما کے سنگات چنپاوتی

بہوت دن کوں جس وقت بچھڑے ملے　　یکس یک لگائے چنگل کر گلے

انو کیاں سکیاں چونکہ سو سات تھیں　　اینو کے کنے بی اسی دھات سفیاں

دو نو دھیر بی بیاں جو تھیاں مختصر　　بزرگی سو بٹیاں دو جا صدر پر

دو نو دھیر کیاں خوش سہیلیاں تمام　　کھڑیاں خدمتی دھر اپس کا مقام

یو چنپاوتی ہور مدمالتی　　بٹھیاں مل کے نافرق دھر یک رتی

اوٹھی واں تھے تس سات کر تیج پات　　چلے کیلے چپ ہوں پکڑ ہٹ میں ہات

سہیلی جو کوئی سات آنے منگی　　پھرائی او سے میں لے جانے منگی

گیاں مل کے دو نوں یکیلیاں گوں　　تماشے سوں پھر بتاں چمن در چمن

یکٹ ٹھار خاطر میں لیا یک طرف　　بٹھیاں مل کے دو نو اوک دہر مشرف

تب ان پا کے فرصت یو کرنے لگی　　لگی بولنے یوں کہ اے دھن یہی

جو بیٹی کا درشن ہوا سو ہمن　　یو سب فیض بخشش ہے تیرے چرن

نہ ہوتا تو تج پگ تھے یو فیض اگر　　دو کاں پھر کے پڑتی ہمارے نظر

ہمن سر ترایوں ہے آپ کا آج　　جو ہوئی تجہ انگے بات کرنے کی لاج

یو سن بات مدمالتی وہ عجب　　کہی عذر خواہی بتی کیا سبب

کہ میرے سوالوں کوں دے پیچ و تاب　　اجوں لگ یہی دیتی ہے ہو کر پیچ جواب

... ...

کسے دکھ یو کہتا نہ دیکھی دوا　　لگی من میں جل پیچ ہو لا دوا

یکٹ نت رہوں غم سے گر سر تلار　　نہ کوئی بات لیوے میرے دل کا بار

ٹلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں کے سات　　پڑے پن بجر سل ہو سینے پہ رات

زرینا اگن تن پہ سارے لگیں — گلاں سیج کے سب انگارے لگیں
چندر منج اوپر زہر کا ہوا داغ — دیوے ہر ستارہ میرے دل پر داغ
اچھے قس تو دوزخ تے کالی کٹھن — دسے دن تو روزِ قیامت کا دن
مرے سر تلے یوں کٹھن ماہ سال — خدا بن کہوں کس سو منج دل کا حال

.. ..

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھائے — نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگ آئے
دسے دیس تو نت اندھاری مجھے — رین کال دوزخ تے بھاری مجھے
انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھائے — دگر موندتا ہوں تو یو خوف آئے
کہ مست پھر پڑے خواب دندی ہوں سنگ — سٹے پھر کے خرمن میں من کے اننگ
پڑیا آہ ماہی نمن مجھ رہنا — گنوانا زباں ہور نہ چک موندنا

اوساساں نہ کچھ مکھ ستے بھا سکوں — نہ چک تے انجو بھار بھی لا سکوں
یکٹ نت رہوں غم سوں کر سر تلا — نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار
زرایں اگن تن پہ سارے لگیں — گلاں سیج کے مجھ انگارے لگیں
ٹلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں سنگات — پڑے پن بجر سل ہو سینے پہ رات
چندر مجھ اوپر زہر کا ہوا باغ — دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ
اوک موز لگ مجھ تپینا پڑے — اسی گھات کے بعد تپینا پڑے
اچھے تس تو دوزخ ستے کالی کٹھن — دسے دن تو روز قیامت کا دن
میرے سر تلیں یوں کٹھن ماہ و سال — خدا بن کہوں کس سوں مجھ دل کا حال
کہ ناچار اچھے اودریا کے بدل — سو ہنس کھیل گیتا سکیاں میں سنگ

دونوں شاہزادے دو نو ماہ رو — خوشی سوں رضا لے چلے ملک سوں
مرتب کرن ہار مالا رتن — کیا ہے دو دیوں نظم پڑی کہن
جو منہر کنور عاشق بخت ور — چندر سیں صاحب وفا خوش سیر

.. ..

دونوں شاہزادیاں کی دل دہرا و چاٹ — دیکھیں درشن ماباپ ہو راج پاٹ
جو کنچن نگر میں دہر مراج نز — کیا سچا چندر سیں کا کاج کر
جو منہر کنور صاحب اشتیقاق — اول سو ربل سات کر اتفاق
رضا ملک دہر اپنے جانے منگے — بنیاں کون سنگات لے جانے منگے
تھا راج کوئی دن جو خوش باغ باغ — یو سن بات ہو کر نپٹ داغ داغ
قبیلے سوں کئے دیس دل گیر ہو — پھر اس بات پر باج تدبیر ہو
جہازاں کر استعد بے شمار — دھرا ساز و ساماں دریا کنار

.. ..

تلک راج رانی بڑے شوق سوں — کنور سات ملنے چلے شوق سوں

.. ..

محبت سوں چھاتی لگا تیں چکل — بجز تیں کی جہاں دل سوں اول

کہا اس کی تاریخ یو ہجرتی — مبارک یو ہے ہدیۂ نصرتی

کیا ہوں یو قصہ جو خوش دھاون ہوں — علی شاہ عادل گیری نانوں سوں
تلک جگ میں مقبول اچھو مدام — بحق محمدؐ علیہ السلام

علی نامہ

دکھنیوں اور مغلوں کا ایک معرکہ اور آغازِ جنگ کے قبل تیاری :-

اسی رات ارسطوئے دوراں کے یہاں — دکھن کے سب اعیان تھے مہماں
سنوارے تھے کئی انجمن دل نشیں — نشیمن میں ہر روح راحت گزیں
ہر یک نامورے دلیراں کی صفت — اتھا یک مگت میں ہو بیٹھ یک طرف
نہ تھی بن کھرک پچ گمت کوں رواج — نہ بازی کی مذکوری جانباری باج

.. ..

تلک یوں کہے آ کے جاسوس بھید — جو دھرتا ہے یوں دشمن بد اُمید
بد اندیش کے دل کا جب بھید پائے — سبی شیر مرداں نے غصہ میں آئے

کریں تیغ سوں پیش دستی ہمیں   اوتاریں اون سر تے مستی ہمیں
دلیراں اوٹھے بولتے دین دین   کیے نہالداراں کہ بے زین زین
گھڑی بھر میں ہو مستعد بے درنگ   سلح باند سب راوتاں ہور تزنگ
خود بکتراں کوئی سو جوشن بندے   کتے چار آئینہ روشن بندے
زرہ و غلہ پینے کننگ جہل قد   قبایاں دگچیاں تو تھیاں بے عذر
ہوئی فوج جوں مستعد جس گھڑی   دمامیاں پہ چوند ہر تے لکڑی پڑی

... ...

کتا ہوں اتا فوج دہلی کی بات   چلی تھی دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کوں دیکھتے ہیں سمجھے   دسے نا گے انتہا ہور اونچ
ہتیاں کا عرابہ چلے میل میل   تھنا جس میں سردار اصحاب فیل
سراسر گر بہار سارا دسے   تو یک فوجدار اس میں دارا دسے
یک یک ملک کے نام آور جواں   دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں
مغولاں کتے ملک وکئی شہر کے   کتے ہندو کئی ماوراالنہر کے

... ...

سب اس دھات تو جاں خوش آراستہ   چلیاں تھیاں عروساں ہو نوا ستہ
ہر ایک مرد کا شوق تازہ ہوا   لٹا پٹ بدل ذوق تازہ ہوا
عجب فوج رنگیں دل افروز تھی   ولے سخت خونریز جاں سوز تھی

... ...

غنیماں کے بجیاں کوں کھانے شتاب   خوش آنے لگیاں ہوں میں گھرگاں کے آب
کماناں رکھیاں دل کشا کش منیں   او بلنے لگے تیر ترکش منیں
پھوکیاں تیز۔ یوں سخت بھالیاں میں نگ   کہ پھکتا ہے جوں باؤ لیکر بہو جلگ
بھڑکتے ترنگاں ہو آگاں دسے   سواراں بہو کے رن کے باگاں دسے
نکلتے ہیں جوں باگ نخچیر کوں   نکل یوں مہرائے دونوں و ہیر سوں
رکت بھوئیں پہ پڑ پڑ کے پامال ہو   لڑ نت کا ہنگامہ رہیا لال ہو
ہزاراں ترنگاں کا لک تل بجا   رہیں کی دہک تے فلک ہل بجا

زباں لہو کی پیاسی کھرک کے اپار
ہر یک کرتے آواز سن مار مار
نکل آئی جوں میاں کے لب تے بہار
کیا جیو نے دشمن کے ہونٹاں میں ٹھار

شر انگیز باتاں تے شر شور او ٹھیا
جو یک دم چھوٹی ٹوپ ہر فرد فرد
کڑاکر زنبوریاں تے پُر زور او ٹھیا
وچا یا دھواں باد ہو آگ کی گرد

دے نس میں تروار جھلکتی جتی
دھواں جس نظر میں جو بٹھا دسیا
پگڑ گرد میں اڑ رہی ہے بتی
زمیں پر فلک آکے بٹھا دسیا

... ...

کماناں کی رُت جب کشاکش ہوئی
چھوٹی صفت تے یوں تیر یک مٹھ دلیر
ہوا بھر کے تیراں سو ترکش ہوئی
اوڑے کھیت تے جوں ہزاراں تلیر

ہوا لال گیتی پکڑ نیر اوج
لگیا تیر ہر تن پہ جب بالے بال
کہے تو کہ ٹولاں کی نکلی ہے فوج
ڈسیا لہو او چھلتے فوارے کا جال

... ...

دم تیغ تے یوں اٹھے شعلہ جاگ
کریں قیمہ تن کوں تبر بے کماں
لگے جاکے سورج کے کپڑوں کو آگ
کئے کوفتہ سر کوں گرز گراں

کیا جب کٹاریاں سنیاں کو ریش
مہرا ہوئے سب لہو کے شربت میں مل
دلاں بھا پچ چھوڑے جو خنجر کو پیش
مریا رہیا ہو کہ سینیاں میں دل

ہر یک تیر ایک مار ضحاک سھتا
شپا شپ جو برچھیاں موٹھیاں تے لہو لہاں
کرے مغز خواری تو دل چاک سھتا
دیاں کئی سواراں کوں اٹھیاں سو لہاں

قصائد

دی ہے زمستاں نوکری دو ننگا اجاد ہند کار آج
سردار ہو باد خزاں ٹھنڈ کار چیا ہے بہار آج

اپیا ہوا کا فوج یوں شبنم کی گولیاں چھانٹتا
ڈر سوں اگن موں چھانپ سے ڈر رہی ہے بہار ٹھار آج

ہو آگ کوئی مارے تو دم اٹھتی تھی ہو سب تن زباں
ویسی بی سرکش سر نوا پلی دے سد ہار آج

بیشک وطن اس جگ تھے مت جاتی اگن ہو بے نشاں
گر دل میں اپنے عاشقاں دیتے نہ اس کو ٹھار آج

حوض یک ہوا کا یوں دسے مشرق سے مغرب لگ بھریا
کانپے فلک جوں بڑبڑا بھٹے تو تس کے بہار آج

. . . .

شبنم جو اجلا چھاپ سا آشیر سے جل میں پڑیا
ہر بائیں ہوتی ہے دئیں بنڈی جم تیر سب یکبار آج

. . . .

سلطان عالم بخش او شاہنشہ عادل علی
ہیں یوں جہاں پرور ادک نر دھار کوں آدھار آج

جس مہرباں کے فیض تے تب نو بہار اس دور میں
جس کی عنایت نے ادک عالم دسے گلزار آج

جب تے جھلک دیکھیا ادک سورج تری تروار کا
تب تے لگیا تھر کانپنے ہو پر عرق یک بار کا

کوئی بند جو تیری کھرک کی پانی تے دریا میں پڑے
کہا جوش ادک یک تیر ہوئے تختہ اکھنڈ یک گار کا

کس میں تو طالع کے قوی جم تے ادک جم جم دسے
جس میں تو عالمگیر ہو آیا سکندر سار کا

. . . .

اے شاہ عادل تو علی صاحب ہے سب سنسار کا
کفار بھجن جگ تمنے نہیں سور کوئی تج سار کا

یک سال او باغی سیوا جگ میں شلت پیدا کیا
ہے طفل مکتب مکر میں شیطان جس مکار کا

کوئی کھیل اس نگار نے کھیلیا نہ کچ بازی کے بن
گویا فلک کجکول ہے سادیا اسی عیّار کا

... ...

قصیدہ میں لڑائی کا سماں

کھرکاں کھناکن سوزدہر سوران کے یوں بجنے لگے
زہرا کا زہرہ گل رہیا آواز سُن جہلکار کا

کھرکان کھرکان لگ اوک چوندہرتے یوں چنگیاں اوڑیاں
جیوں آگ کیاں بجلیاں چمک برسیا بدل انگار کا

گرزاں سوں مہرے یہاں یو کیتے پراگندہ وسن
گو بہن کے جوں لگتے پھتر پھٹتا ہے حقا نار کا

لاگی تبر کے ضرب سوں تفراخ اجل کے بات کی
جم کی مکھی تے کم نہ تھا وہبکا گرز کی مار کا

ہر گھٹ میں دل کا دھاک سوں رہے تھے رکہت کی کچ ہو
ہر رگ گل تے تھا عیاں خوارہ لہو کے دہار کا

مرتیاں کے لہو کے بجرتے دھرتی پو جب بہرتی دھریا
جتیاں پونٹ پڑنے لگیا ڈونگر پو ڈونگر لہار کا

... ...

جب شہ چڑے گھوڑے اپر یوں فتح گڑ ایسا کیے
تب مکہ بیں نشایاں کے ہوانت وردا اس گفتار کا

کہتا ہے دھن اس مائی کوں ہے جس کوں ایسا شہ خلف
سواد بڑے صاحب ہیں جم پاکر کرم کرتار کا

جس گھر کی نعمت نے جنم پائی گئی ہے سب زمیں
تو آب دریا میں اثر ہے تس کی کہار کا

... ...

اے نصرتیؔ[1] مشغول ہو شہ کی دعا کے دَور میں
کافی ہے دو جگ میں تجے تل فیض تس آثار کا

ہے آسماں یا رب تلک دھرتی کے سر پر سایہ باں
قائم تلک یوں چھترا چھو شہ جگ کے پالن ہار کا

کہیں رکھ دار چینی کے دھریں سو پوست میں لذّت
رکھے سو مغز میں خوشبو کہیں تو بن ہے صندل کا

کیتے رکھ جام و جامن ہور پھنس ہور توت تیندو کے
بھلاوا کہیں ہے ہزار ہے کہیں ماپھل و مینڈل کا

رنگا رنگ کے گلاں خوشبو معطر جگ کر نہارے
دس آوے رائے چنپا جہاں کمینہ پھول پاڑل کا

... ...

صفا پانی کے چشمیا میں سہے پوچھا نوں پر سیامی
سوادِ انکھیاں کوں جوں دیوے درس چشمِ مکحّل کا

فلک سقائے خضری ہو پلاوے تیر سوں جگ کوں
سورج کے جام سوں بھرتا ہے نت داں مشک بادل کا

چلیں بادِ صبا تے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں
کہ جیوں محبوب کے مکھ پر ڈھلک زلفِ مسلسل کا

نصرتیؔ کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

چندر بدن کہیا تو کہی موں سنبال بول	سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال بول
دونوں تجھ نکیوں تو سکے تجکوں کیا کہنا	کہی اس بہشت حسن کوں جم جگ و جاں بول

---

[1] نصرتیؔ کا کلام یورپ میں لکھی مخطوطات سے لیا گیا ہے اور دیگر مخطوطات سے بھی مدد لی گئی ہے۔

بولیا نشاں ہے عشق کی رادت کا قد ترا
بولی کہ بادلی فوج فتنہ اُدچانے کی ڈھال بول

بولیا رہنے منگے ترے سس پھول کن ہلال
بولی کہ بادلی میں ہے گسی تجھ سے نال بول

بولیا کہ تجھ فراق تھے کے عاشقاں خراب
بولی مرے وصل منے کیا تجھ ہے حال نول

بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی تباں کے ہت تھے توٹے تو جلال بول

بولیا کہ لٹی دنوں تھے تری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر۔ بوج کیتک ماہ و سال بول

مغرور بے خبر ہے مدسوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سوالی

اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کا پھل لینے کو جیوا تالی

برھی کے نس میں غم سوں جلتا ہوں شمع تمنے
دکھلا صیا درس کا اے خاورِ جمالی

کرتا ہے ماہ نو کوں سپورن کر آفتاب
، تو آرسی کو ہات پکڑ اور کر آفتاب

کرنیا نہ ہوئے گر جتے کاریاں کلیاں نوبالہ
تج حسن کے ہوا میں جھک ہر پر آفتاب

اینک کرے زمینکوں ترپ آرسی کے تج
جہاں کی تپال چک چودھری تس پر آفتاب

تج حسن کا جھلک جوہری زنکبار پر
ہر جا لملہ وہاں کی جتی دفتر آفتاب[51]

---

(۱۴) شاہ ملک

شاہ ملک[53] اسی دور کا شاعر ہے۔ اکثر دکھنی شعراء کے حالات خود ان شعراء کی تصانیف سے معلوم ہوتے ہیں مگر شاہ ملک کی مثنوی اپنے مصنف کے حالات بہم پہنچانے میں رہبری نہیں کرتی۔

اس کی مثنوی کا نام "شریعت نامہ" ہے۔ احکام الصّلوٰۃ بھی اس کا دوسرا نام ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۷۷ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود[54]

---

۵۱ انتخاب رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۳۳ء سے کیا گیا ہے۔

۵۲ از بیاض مملوکہ مولوی مرتضیٰ مرحوم

۵۳ اُردوئے قدیم

۵۴ یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۷۔

ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ وغیرہ میں متعدد نسخے موجود ہیں[1]۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

الٰہی دے توفیق انسان کوں	جو بندگی کریں تیری دل جاں سوں
توں پیدا کیا محض بندگی کتیں	سو اد چھوڑ پکڑے ہیں گندگی کتیں

نوارکاں ایماں کے دو امیں	دلی عین ایماں سو یو ہیں
جو اقرار اوّل زباں سوں کرے	بھی تصدیق دل میں یو کر دھرے
خدا ایک دوجا شریک نیں اسے	ہے بے مثل اس کی صفت نیں کسے

سو یو شین الف ہے و میم لام کاف	قرض کوں سو دکھنی میں بولیا ہے صاف

سن یک ہزار ہو رستر پو سات	کہا ہوں اسی سال میں یو حکات

(۱۵) **امین** بعضوں نے امین الدین اعلیٰ[2] نام لکھا ہے اور بعضوں نے امین الدین علی[3]۔ تحقیق سے آخرالذکر نام کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ کے ایک مُرید تراب علی شاہ نے اپنی مثنوی "قصۂ ملا" میں آپ کی مدح اس طرح کی ہے:۔

تراب اپنے تو مرشد کی صفت کر	حُسینی پیر ہے ثانیِ حیدر
اوسکا نام امین الدین علی ہے	دیکھو برحق او خدا کا ولی ہے
شہید ناز جو اوس پاس آیا	وصال بادری اوس کو دلایا[4]

ایک دوسرے شاعر معظم نے بھی لفظ علی لکھا ہے:۔

وہاں امین علی ہے پیر	ہے روشن دیکھ ضمیر

شاہ امین الدین علی، برہان الدین جانمؔ کے فرزند تھے۔ آپ کے تولد ہونے کے پہلے ہی

---

[1] فہرست سالار جنگ۔

[2] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیا کرام کا کام۔ مولانا عبدالحق مطبوعہ صفحہ ۷۔

[3] تذکرہ اولیائے دکن از عبدالجبار خاں مطبوعہ صفحہ ۱۱۶

[4] کتب خانہ سالارجنگ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحت۔ صفحہ ۶۱۵

باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ سادات زیدیہ سے سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ برہان الدین جانم نے اپنے انتقال کے وقت اپنی ٹوپی اپنی اہلیہ کو دیکر فرمایا تھا کہ یہ خرقۂ خلافت ہے تمہارا لڑکا پیدا ہونے پر اس کو دینا۔ باپ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد امین الدین علی تولد ہوئے، کہا جاتا ہے بچپن ہی سے آثار رشد و ہدایت ظاہر ہوتے تھے۔ بڑے ہونے پر آپ نے باپ کی ٹوپی یعنی خرقۂ خلافت کو شاہ عطاء اللہ حسینی کے ہاتھ سے پہنا اور باپ کی مسند خلافت پر بیٹھے۔ عوام کو ہدایت سلوک اور باطن کی تعلیم دینے لگے۔ آپ کے مریدوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی۔ ان میں سے میراں جی خدانما، سید ہاشم نیشاپوری عرف خداو ہادی اور تیسرے شاہ عبدالقادر لنگ بند خلفا میں مشہور ہیں۔[1]

شاہ امین الدین کی اولاد بچپن میں انتقال کر جاتی رہی صرف ایک فرزند بابا شاہ حسینی بڑے ہوئے باپ کے بعد زندہ رہے اور مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔[2]

شاہ امین الدین اپنے باپ کی طرح شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، آپ کا امینؔ تخلص تھا۔ اُردو نظم اور نثر کی کئی کتابیں آپ کی تصانیف میں شامل ہیں چنانچہ حسب ذیل کتابوں کا پتہ چلا ہے۔

رسالہ قربیہ، ذکر نامہ، وجود نامہ، چکی نامہ، وصل نامہ، محبت نامہ، نور نامہ، نظم وجودیہ، رموز السالکین۔ گنج مخفی، رموز العارفین، گفتار شاہ امین۔[3]

یہ تمام کتابیں جن میں سے بعض نظم اور بعض نثر ہیں، تصوف پر مشتمل ہیں ان میں سلوک اور باطن کے کئی مسائل بیان کیے گیے ہیں۔ عبدالجبار خاں نے اپنے تذکرہ اولیاء دکن میں شاہ امین الدین کا انتقال ۱۰۶۱ھ درج کیا ہے اور مادہ تاریخ ختم الولی ظاہر کیا ہے۔[4] اس کے برخلاف مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے ۱۰۸۶ھ درج فرما کر مادہ تاریخ "ختم ولی" لکھا ہے۔[5] مزید تحقیقات سے مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

---

[1] تذکرہ اولیاء دکن عبدالجبار صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۱ اور اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام صفحہ ۷۰

[2] تذکرہ اولیاء دکن عبدالجبار صفحہ " " " " " " " " "

[3] کتب خانہ سالار جنگ کے اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۸۹

[4] مطبوعہ صفحہ ۱۲۰

[5] " " ۱۷۰

اب تک شاہ امین الدین علی کا کلام مستقل کتابوں کی صورت میں شائع نہیں ہوا ہے۔ البتہ متفرق طور پر رسالہ اُردو، اُردو شہ پارے، دکن میں اُردو وغیرہ کی کتابوں میں نمونہ کلام درج ہے قلمی کتب، کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، کتب خانہ نواب سالار جنگ، سنٹرل لائبریری حیدر آباد (کتب خانہ آصفیہ) کتب خانہ اُردو ادبیات اردو اور انجمن ترقی اُردو علی گڑھ وغیرہ میں موجود ہیں۔ شاہ صاحب کے کلام کا نمونہ درج ہے[1]۔

قمریں تین تیرے ساحر ہوئے بھولا ہوں کون — گمراہ کر بھلا دے قوس قزح بھوں کون
بیچوں پھر یا زلف تج موجوں ڈبے بحر سون — ہر نہر پر کرشمہ عشاق کے ریجنس کون
راہ پل صراط جوں سر مانگ جو چھپی ہے — کاہے کشاں سما پر محب بلاونے کون
سیہا عرش علامت کرسی ملکٹ سہارے — روشن شمع منور پروانے جالتے کون
دنداں مثال بجلیاں رخشاں کلام کرتیں — زہرہ دھرے نہ دیدہ خوبیں نچاونے کون
چاہ زنخ کا تیرا مانند خوش کوثر — مقتول ہیں جو تیرے انکار نے غسل کون

... ...

تیرے قدم مبارک سوں سب ظہور جلوہ — قصد قدم کیا جب اوّل توں آونے کون
فیضوں قدم کے تیرے پُر نور ہو جہالت — اے صاحب جمالہ یہ فیض تج قدم کون
چرخ فلک کواکب گرداں میں تج خدامت — ملزوم کرتے ہیں سجدے تیرے قدم کون[1]

اللہ پاک منزہ ذات — اس سوں صفتاں قایم سات
علم، ارادت، قدرت یار — سنتا، دیکھتا، بولنہار
ہے صفت یہ جان حیات — اس کو ناہیں کر ممات
ایسیاں صفتاں سوں ہے ذات — چونکے چند نا چاند سنگیات

... ...

ادنیٰ عاشق اعلیٰ بوج — یہ دو مقصود اکھون و تج
عاشق ادنیٰ جوں پتنگ — اعلیٰ موم بتی کا رنگ

---

[1] قصیدہ مدح شاہ برہان الدین۔

جوں پتنگا دیکھ پڑ تا نا — آپ جل کر ہوئے فنا
دے ولایت جوں پتنگ — موم بتی بہ نبوت رنگ
یہ سب بوجھے اس کا سوز — بوجھے مجالس شب اور روز
آخر تو ہے فنا ہنات — اس کی اس کی بکھن بات
پتنگ دیوانا جلنے تہی — فاسد جانے ملنے کسی
قوی ولایت اس کی ہوئے — جسے تابع نبی برلے کوئے[1]

قصیدہ، مثنوی کے بعد امین کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

ضمیرم راز کاں دل یار منجہ سوں بات کرتا نہیں
بہ بینم راد اے شہنشاہ یک تل آکے جا تا نہیں

نباشم جزتو اے رعنا منجے کی حالت را جے
دلم پرخوں جگر فاسد تہی تجھ مہر آتا نہیں

زدستم رفت عناں صبر رہیانا نا ہوش منج میرا
بیا اے ماہ ظالما تم دھوکہ دل کوں دیتا نہیں

چرا ایں قدر مستغنی ہوا تو منجتے اے پیارے
ایا وقت کدام آید کہ بیج تج پیچ پردا نہیں

محض فریادی دارم کہ تج سنگ میل اچھے کون
امین گوید بیاں ہجر بن ساقی اتیار[2] انہیں

اے سبحان دے تو مجھے گیان — میں دیکھوں تجکوں پہچان
کرتوں ہدایت کی نظر
مجھ پر نہ رکھ ذرا بسر
دستا اچھے توں مجھے سر بسر

---

[1] شاہ امین الدین

[2] " "

تن من میرا ہے تجھ پر فدا
ہردم مل رہوں تجھ سوں سدا
نا رک مجھ کوں تجھ سوں جدا[1]

شاہ صاحب کی مختلف نظمیں حقیقت کے نام سے ہیں، بعض کا نمونہ پیش ہے:۔

اے سبحان دے توں مجھے گیان میں دیکھوں تجکوں پہچان

کرتوں ہدایت کی جو نظر
مجھ پر نہ رکھ ذرا بسر
دستا اچھے توں مجھے سربسر

تن من میرا ہے تجھ پر فدا
ہردم مل رہوں تجھ سوں سدا
نا رک کہ مجھ کوں تجھ سوں جدا

نہ دن علی کوں تیرا ہے آس
میں ہوں پیارے تیری داس
ہردم مل رہوں میں شہ کے داس

دیگر

دیکھو شاہ بہروپ صورت جمال
نہ مل روپ معشوق ذات کمال
وصلوں خود فراموش لذتوں وصال

بچوں چگونہ بے شبہ نمود کہنے نہ آوے بیان
لامثال مثل نہ نشاں دیکھو نور نشاں
ذات وحدت گنج لامکاں پرگھٹ سب نہاں

سب سوں بن سب آپ ابہمان دیکھو آپ پچھان
برہان مکمل صورت عیاں اسے قایم قرب مکان
آگے شاہ امین دین روپ بہر پورا پن ندہان

[1] شاہ امین الدین

دیگر

پیارے پیو پایا میں پیو سوں
او محیط دستا ہے ہیو سوں
عرفت ربی علی بولنے جیو سوں

پیو کون بوجھیا میں ہو فانی
پیا دستا ہے وجہ اللہ کے مانی
پیو محیط کل شئ سمانی

وفی انفسکم او کہادی
نحن اقرب نزدیک یا دی
وہی یاد جی اپسیں گنوادی

اے بات میں دیکھے کوج میں
نا سنپری کس کے بوج میں
علی یوج دیکھ مہیا ہے توج میں[1]

(۱۶) **ظہور** مشہور فارسی شاعر ظہوری کا فرزند ظہور تخلص کرتا تھا۔ محمد عادل شاہ کے دور میں اس نے بادشاہ کے حکم سے "محمد نامہ" کے نام سے ایک تاریخ لکھی تھی، جواب ناپید ہے۔

ظہور کی کسی اور تصنیف کا پتہ نہیں چلا، مگر معلوم ہوتا ہے یہ اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا، چنانچہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں ظہور کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے:-

عشقوں موہن کہوت چہندوں جیو کی سوت کیتا
نین تخت پر ایں موہن اپس جلوا دیتا
نین کہو کیسا تخت کھوں کیا سچ کہو تم دیکھو
جس تیر جیو ہور جانا لب تپ اس کہوں سچ نہ لکھو

---

[1] بیاض مملوکہ آغا حیدر حسن صاحب۔

یادو بھانڈے پریم کی ہیں جو وہ، سنس اروپ
عشقوں آکر پریا بھاند جیو کا دہر کر دو پ

یادو چشمی عین سات پوساجی شاد ہو پیو من
کبھی بھرانکوں ہونا ناہیں دایم امر ہو جیون

یادو پیالی پریم اپس کے بھر بھر مت پلاوے
جو کوئی طالب صادق اس کا وہ یہ رستا یاد ہے

یادو بروئے شہ عروس کا عینک مثال جیا
جس میں موہن آمت جوت سوجھے دیکھو پروا کیا

موہن مجھ پہ سلطان سلامی جس کے روپ لوں مایا
نشان جیو ہور جانا کا مجھ تینوں عین بتایا

نین سلامی عین سلامی جانا جیو تمام
مجھ میں میں ہو ظہور کیتا دھر کر میرا نام[1]

(۱۷) ہاشمی

سید میراں[2] نام اور ہاشمی تخلص، بعض کے خیال میں اس کا نام میاں خاں[3]، علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں موجود تھا۔ مصنف بساتین السلاطین نے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ عالمگیر کی فتح بیجاپور کے بعد ہاشمی ارکاٹ چلا گیا اور مغلیہ صوبہ دار ذوالفقار خاں کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ ہاشمی مہدوی مذہب کا پیرو تھا۔ بعض کے خیال میں وہ شاہ ہاشم گجراتی[4] کا مرید تھا۔ دوسرے قدیم شعراء کی طرح اس کے حالات بھی ہمدست نہیں ہوئے اور انتقال کا صحیح سنہ مشتبہ ہے، قیاس غالب یہ ہے کہ ۱۱۰۹ھ ہے۔ ہاشمی کی تصانیف سے اس کی مثنوی اور دیوان دستیاب ہوا ہے ان دونوں کے قلمی نسخے کتب خانہ سالارجنگ میں موجود ہیں[5]۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے اصحاب کے پاس بھی مثنوی یوسف زلیخا کے نسخے

---

[1] بیاض کتب خانہ سالارجنگ نمبر ہاشمی (۶۰۸)
[2] بساتین السلاطین۔ صفحہ ۴۳۱۔
[3] ہندوستانی ادب نومبر ۱۹۴۲ء
[4] اردو ادب مارچ ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۱۲۱
[5] وضاحت فہرست کتب خانہ سالارجنگ۔

موجود ہیں۔

یہ ۱۰۹۹ھ میں مرتب ہوئی ہے، ریختی کا بھی اس کو موجد تسلیم کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کے پہلے کسی شاعر نے ریختی میں اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ ہاشمیؔ کے کلام کا نمونہ پیش ہے:
قصیدہ میں واقعات جنگ کی اچھی صراحت کرتا ہے اب ادارہ ادبیات اُردو کی طرف سے دیوان شائع ہوگیا ہے۔

کہے ذوالفقار خاں نے گھاٹی سدم کے اوترے
ارکاٹ میں گھرے گھر کل سوں ہوا پکارا

نواب آنے کر کہے تو مجھ لکھے گا سچ مچ
جھانگر بجے جھناجھن دھوں دھوں بجے نقارا

کہر سینے اوس نہیں کوں ہور سچ نہیں لگتا
دیکھو چھجے پہ چڑھ کر ڈنکا ڈہل ڈھولارا

نواب چاند ساموں دکھلائیں کن تو دیکھوں
سکھ کا پڑے گا چندنا ہوے دو دکھ کا دور اندھارا

باقی اوپر فلک سے خورشید بی دے تو
صدقہ نواب پر سوں جیسو دیونگی او تارا

دل میں تو پیاریوں ہے ظاہر میں مکہ گھونٹ کر
دو جوں کہ تو نزدیک آبیٹھے گا جب پسارا

ہفتے کا ناؤں لے کر تین مہینے جا کر آنکے
اقرار ہور وعدہ معلوم ہوا تمہارا

ایک گاؤں ہاشمیؔ کون چنکر سرس سا دینا
مشغول ہو دعا میں دھر سر رہے کنارا

مثنوی کا نمونہ :-

ثنا حمد اسکوں سزاوار ہے — سگل عشق کا جس سوں بستار ہے
اوّل عشق کا کر کے رن جگ قرار — بزاں نیچ پیدا کیا آشکار

جو کچھ اتے رات دن جس سنگات — تو درکار ہے اس کوں پوچھنا یو بات
لگا دل جو عورت سوں عورت ملی — سمجھتی ہے ادراک کہ ایک بے دلی
اپنے گنو نتے جو اس کی گیان — زلیخا کے تین دیکھ بے دل بجھیان
کہے یوں دائی نے اسے گن بھری — پورا حال کی توں اپس کا کری
عجب یو چہ لگتا ہے جو دلبر ہے پاس — اجوں لگ ہے کتے ہے ایس دل اداس
کسی کا یو بخشا ہے ایسا خدا — گلا رہنے دلبر کا سنے سدا
کیے جب ممکن ہے کہ ایسے دھات — کرے اپنے دلبر سوں جوں توں بھی بات
تیرے لب کے کہاں تک بختی دکھاؤں — کہ جوں توں بھی بستا ہے یوسف کا ناؤں
عجب نیک بختی دھرے تجہ ببن — جو معشوق کا ہوا ہے یہی وطن
عجب نیک بختی دھرے، تیرے ہاتھ — جو یوسف کی خدمت کرے دیس[1] رات

غزل کا نمونہ :-

اے مدمتی بھاتا تیرا کیفی ہو دُلدل بولنا
تج لب کے مے کے جام کا ہور شیشے کا قلقل بولنا

ہلنا تری نتھ کا مجھے لگتا ہے جھکے کا جھپک
جھنکار پنجن کا ترے گھنگرو کا کھل کھل بولنا

ہیں گال گورے گلگلے مجھ گل گل صورت لگی
گورا کلا تجہ گل گلا نیگی سو گل گل بولنا

جھولنے کوں جھولنا باندکر جھولنا ترا لگتا مجھے
برنا تیرے جھولنے کا دھن ہر رات جھل جھل بولنا

تج لب کے لب کی مے سوں مست ہو پھر پھر گیے ہاشمی
اے مدمتی بھاتا تیرا کیفی ہو دلدل بولنا

ریختی کا نمونہ :-

جاتا سوں اے مسافر رہنے کی بھی خبر ہے
آیا اتا کدھر سوں جاتا سو کہو کدھر ہے

[1] یوسف زلیخا۔

دن میں رہا ہے تھوڑا آتی ہمیں بوند جھو کے

بھوتے جگر ہے تس پر بھی رہبر بے خطر ہے

بھر گرندی چلی ہے طارو بھی بھاگ گئے ہیں

چھایا آیہاں تس پر آن کے کہل گذر ہے

گھر میں ہمن ہمری رہو کھوڑی نفر تمہاری

رہنے کوں بھی تمہارے جانے سو یک چھپر ہے

گھر میں میں ہوں اکیلی اور کوئی بڑا نہنا نہیں

تور ہوکتی یوں میرے دل میں خودی کا شر ہے

جگ شعر ہاشمی کا بہرا اپس سوں مجہ ہوئے ہو

ایسیاں کے کرتے خدمت لیے کچھ مجھے آ جر ہے[1]

اگر کوئی آکے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا

مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاؤں گی چھوڑو

رضا اگر مجھ کو دیتے ہو کروں گی گھر میں جا دارو

اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح پھر آؤں گی چھوڑو

پیح مان اے سنگاتی تجھ تے بچھڑ رہی ہوں

ان پانی سب تجھے ہوں سو تا حرام بولو

مجھ تن نگر کو قابض برہے نے آکیا ہے

پھرتی ہوں جوں مسافر نئے مجھ مقام بولو

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بہار بیٹھوں گی

بہانا کرکے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی

---

[1] از بیاض مملوکہ محترمی حضرت مولوی خلیل اللہ صاحب۔

اونو یہاں آؤ کئیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
انٹھلی ہور منٹھلی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی[1]

---

(۱۸) ایاغی

محمد امینؒ نام اور ایاغی تخلص تھا، اس دور کا شاعر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ایاغی مذہب کا سختی سے پابند تھا، وہ راگ سننے، گیت گانے، شطرنج کھیلنے کو گناہِ عظیم خیال کرتا ہے، اپنے دور کے بادشاہ علی عادل شاہ کے عدل اور انصاف کی تعریف کرتا ہے اور اپنے اس دور میں ہونے پر خدا کا شکر کرتا ہے۔

ایاغی کی ایک مثنوی "نجات نامہ" ہے۔ اس میں شریعت کی پابندی کے متعلق پند و نصائح بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں بیمار نسخہ ہے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

نام اور تخلص کی صراحت:۔

ایاغی کدھر تو چلیا باٹ چھوڑ سرشتے کو پنداں کے تو یوں نہ توڑ

محمد امین و ایاغی اوپر الٰہی کرم کی نظر کر نظر

اگر راستی سو کیا عدل یہاں تجہ اس تے بڑی بادشاہی ہے وہاں
کروں ہر گھڑی شکر پروردگار کہ اس دور میں ہیں علی شہریار

ایاغی غزل بھی کہتا تھا چنانچہ ایک غزل درج کی جاتی ہے ۔

دیکھنے پر کہاں ہیں خیال انکھیاں کیا کھوں کیوں رکھوں سمال انکھیاں
جمع اتھا دل ہوا پریشاں آج کاتتے دیکھیا و زلف کال انکھیاں
پارسائی تمام گئی میری جب سے دیکھیا ہوں او جمال انکھیاں
آج دیدار ہوگا شک نہیں بجھ پھڑک بولتیاں ہیں فال انکھیاں

---

[1] اردو شہ پارے۔

[2] احوال سلاطین بیجاپور۔

بے دعا تے خدا کنے منگتاں　　تلملاتیاں ہیں ماہ وصال انکھیاں
دیکھنے آبی پری بےتے ہر دم　　حق تے منگتا ہوں بال بال انکھیاں
کیا بلا لا بگیاں خدا جانے　　چھوڑتیاں نیں میرا رمال انکھیاں
دیکھ دیکھلا بلا میں سجاؤتیاں ہیں　　میراں مجکوں ہویاں ہیں کال انکھیاں
نین بھر آج میں تجھے دیکھیا　　کام آیاں مجھے اتال انکھیاں
عیش میں ساری رات جاگیاں سو　　بولتیاں ہیں مجی کو لال انکھیاں

دیکھ بے طاقتی ایاغنی آج
مجھ زیا وعدہ وصال انکھیاں[1]

محمّد امین ایاغنی بیجاپوری کی تین سالم غزلیں انجمن ترقی اُردو پاکستان کے کتب خانہ کی ایک بیاض میں درج ہیں

مرے من منیں آج اودھان ہے　　، کہ اس لست خوں ریز کا دھیان ہے
جداں تے ترا زلف دیکھیاں ہوں میں　　تداں تے مرا من پریشان ہے
ہوا باد بارا مرا جیو آج　　ترے عشق کا دل میں طوفان ہے
تجے جیو تے میں زیادہ منگوں　　ترے پر مرا جیو قربان ہے
دیا ہوں محبّت منے جیو میں　　محبّت مرا جیو ایمان ہے
گنہ کیا ہوا ہے سو معلوم نیں　　مجھے دیکھ کے آج انجان ہے
سرج تلملاتا نے کھانے او گال　　جو دیکھیا ترے مکھ منے پان ہے
مرا جیو تپتا ہے جو مے بدل　　کہ اس درد کا درمان ہے

زمین پر سورج کوئی دیکھیا نہیں
ایاغنی تجے دیکھ حیران ہے

ہمیں تے ناز سو پیارے ہمیں عاشق تمارے ہیں
اپس کا جیو تل تل ہم تمن صورت پہ وارے ہیں

---

[1] رسالہ جامعہ بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء۔

گناہ کچھ نیں ہوا ہم تے اگر ہے چوک تو بخشو
ہمارے جیو تے پیارے تمیں ہمنا کو پیارے ہیں

تمن تے کوئی نیں پیارا ہمنکوں تو، خوشی تے ہم
ہمارا جیوا پسند کر تمن اوپر اُتارے ھیں

سٹو ہٹ تٹ، بولو باتاں خدا کی ہنسو سوں پیارے
کد دائم تیوکے نمتے تمیں دل میں ہمارے ہیں
موافق

اگن تجہ عشق کی جاناں، جلائی دل ایا غیؔ کا
اوڑیاں اسمان پر چنگیاں بنو نورین تارے ہیں
چنگاریاں

اس نازنین پری کا پایا ہوں آج رسن
جس نور کے اُجالے، سورج ہوا ہے روشن

کیوں بولنے پھبیکا احوال دل تجہ نوں
جائے گی جیب اس وقت آتی سنوارا و دھن

دیدار دیکھ تیرا حیران ہو رہیا ہوں
یک یک پلک تماری سورج مثال درپن

جس دیس تے تمن کوں دیکھیا ہوں یک نظر میں
ذِہن
سورج ہوئے ہیں دیدے پلکان کے بال کیرن

دیوانگی کوں میری جو کوئی دیکھے سو بولے
اکثر کسی پری کا اس کو ہوا ہے جھڑپن

کنچن بدن تمارا جس دیس تے ہوا ہے
سونا
شرحوں سوں گل اگن میں پانی ہوا ہے کنچن

مت جا . . . ہے آواز دشمنان کو
دستے ہیں چار، دو نویگ میں تے کاڑ پیچن
نکال جاجن

آکر کھڑیا آیا غنی دینے دعا تمن کوں
چوری سوں بات مٹنے منگتا، چھپاؤں جو بن[1]

(۱۹) **شغلی** اس کے نام کی ہم کو خبر نہیں ہے۔ مولانا باقر آگاہ کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس دور کا شاعر تھا[2]۔ اس کی ایک مثنوی جو "پند نامہ" سے موسوم ہے اس کے نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور ادارہ ادبیات اُردو اور حبیب گنج (ضلع علیگڑھ جو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی جاگیر ہے) کے کتب خانہ میں موجود ہیں[3]۔ پند نامہ کے صرف ایک سو پانچ شعر ہیں۔ اس کو کسی فارسی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

کہ یک دن محمد علیہ السّلام ہے اصحاب بیٹھے مدینہ تمام
تہاں یک شخص آ نبیؐ کوں سلام کیا ہور دکہلا گیا یوں کلام
جو میں آئیاں ہوں تمن قوم کن کہ شہر یمن تے نصیحت سکن
سو یو بات سُن کر نبیؐ یوں کہے تیرا بول مقصود جہاں تلک رہے
تو تب دین او، اصحاب کیتا سلام نبی سوں ہوا پھر کے یوں ہم کلام
جو میرا ارادہ ہے۔ یوں دل سے جو طاعت کروں ربّ کی تل تلنے
جو کرتا اچھو بندگی میں سدا کدمی بھی نہ طاعت سوں ہووں جدا
کیا بات واصحاب اس دہات جب سو سن کر نبیؐ یوں کہے بات تب
جو اوّل ہو کے پاک وضو توں ساز جماعت سوں پنج وقت کرتوں نماز
اگر یو امر ربّ کا سر پر لیا گویا کے شب و روز طاعت کیا

تو طاعت عبادت کیا گر سدا تجھے غضب نا کچھ کرے گا خدا
سو یو بات سُن کر کیا دیں سلام نبی سوں ہوا پھرا یوں ہم کلام
جو میں آب کوثر کا پیتا رہوں عمر ہو ابد لگ میں جیتا رہوں

---

[1] قومی زبان کراچی جنوری ۱۹۶۴ء۔

[2] دیباچہ گلزار عشق۔

[3] کتب خانہ آصفیہ میں بھی نسخہ ہے۔

کہے یوں محمد علیہ السلام — دے پیاسے کوں پانی بہوکے کوں طعام
تو تب آبِ کوثر کا ہوے گا عطا — عمر ہو جئے گا سدا بے عطا

بھی بعد از نبی نے دے یوں جواب — کہ واللہ اعلم بالصواب
سو یو پند نامہ سنے تو ثواب — ہے اتنا جو ہوئے نگوتی عذاب
اگر کوئی دیکھے اسے بھر نظر — تو گویا نبی کوں او دیکھا بشر
اگر کوئی اس کوں پڑے گا تمام — کہ دوزخ کی ہے آنچ اس کو حرام
اگر کوئی اس پر کرے گا عمل — سواد ہوے گا خاص بندہ اصل
سو اس وجہ تھی فارسی میں کتاب — سو شغلی دکھنی سال کیتا اشتاب
سبب کیا جو کوئی معنی فارسی — پناتا سو پاوے کیا آرسی[1]

شغلی کی غزل کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو ہے

تجہ حسن کا دیپک جس نے دیکھیا سو پروانا ہوا
تیرے ادھر کا مے جس نے چاکھیا سو پر دیوانا ہوا
انگشت نما ہو در جگت پھرتا ہوں تیرا بھگت
پن توں کدھن یوں تبئی کیست شغلی کدھر آنا ہوا

منجے لحظہ مے پیالا دیا ساقی جو وحدت کا
جو تھی منجہ کیف قرب حق نقل چاکھیا نہایت کا
چلا کر گیان کی پوتی اندھارا گھر کیا جوتی
صفت نکتہ کیا ذاتی تے شغلی حالت[2] کا

---

(۲۰) **علی**

اس دور کا ایک شاعر علی ہے جس کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات ہیں نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثنوی "پند دل بند"[3] کا پتہ چلا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے

---

[1] رسالہ جامعہ بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء [2] کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو۔
[3] اس کتاب کا ایک مخطوطہ کتاب خانہ داری ادبیات اُردو میں موجود ہے۔ تذکرہ مخطوطات نمبر ۲۲۔

کہ خدا کو حاصل کرنے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے یعنی راستی، علم اور عمل۔ اور علم کی توضیح میں اس نے ایک قصہ شیطان کے متعلق نظم کر دیا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

کہوں یک نصیحت عجب خوب تر — بھلی پندسن جیو کے کان دھر
بھلے کوں بھلی پند بھاتی رہے — بھلائی منیں دل بھلاتی رہے

(۲۱) **کریم** اس عہد کا ایک شاعر کریم ہے، اس کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ میراں جی کا مرید تھا۔ اپنے مرشد کی مدح میں ایک نظم کہی ہے۔ جس کا ایک نسخہ کتاب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے[1]۔ اس کی ایک غزل بھی دستیاب ہوئی ہے :۔

ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

جب روح کوں تن سنگ ہوا — بھل اثروں اس کے ڈنگ ہوا
جب گیان ترنگیں لنگ ہوا — یہاں یاد دلبر یک رنگ ہوا
او شاہد دلبر تنگ ہوا — ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

پیر مرشد میراں جی آن ملے — منج پر مول اپنے لائے گلے
سب تن من جیو کے پھول کھلے — اس خوش بوئی سوں جیوں پھلے
یوں سب میں دیکھے ڈبلے دبلے — سب رخ کریما پیو ملے
ارے طالب ہونا طلب خدا
جے حق تے آیا یہی ندا

نظر کے گود میں دیدار و دیدے میں نظر دستا
جو اس دیدے کی ہولی میں سو حل باہر بہتر دستا

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۱۰۹۔

نظر سو ذات دید انور قدرت نقش ہے اسپر
صاعت کر چنارنا سو عجب ہو دستا

سو چشما آب کا چالو سو تس میں ہے وہی صورت
یہ ہارا کتم ہے چالو سپار ہوا شجر دستا

دیوا دید نظر جس پر کار جاں روح چار بھی
سو جاری بھیر معتم ہو کہ شاہد سب....

نظر سومی دو دیدا جیوں پیالا کار بلوری
پیالائے یک رنگ ہو کہ وحدت کا......

جو کالی رات کا لاسکہ اپر جیوں سے بھی کالی ہے
سو جنبش مور کی شیر کے خفی بدرے بدر دستا

بجز شبر کے خفی ہو میں بہوش حال عنبی کا
خفی میں بہو کہ سمجے سباح دلبرت کا ثمر دستا

بقایا اللہ پیغمبر پیر مرشد کے شفاعت سوں
کریماں کے نظر میں سب رحیماں کا ہنر دستا[1]

---

(۲۲) مرتضیٰ اس کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں، ایک طویل مثنوی جو "وصل نامہ" سے موسوم ہے کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے[2]۔ اس مثنوی میں وحدت الوجود کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

بیجاپور میں دو صوفی بزرگ شاہ مرتضیٰ قادری اور شاہ مرتضیٰ حسینی گذرے ہیں۔ دونوں کا زمانہ تقریباً ایک ہے۔ یہ مثنوی ان دونوں میں سے کسی کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک تیسرے شاعر کی ہے جو "سلطان" کا مرید تھا۔ کلام کا نمونہ:۔

اوّل توں انھا گنج مخفی کے بیچ	لیا صفت سانوں اپس بیچ کھیچ

---

[1] بیاض کتب خانہ سالار جنگ نمبر ہاشمی۔ صفحہ ۶۰۸۔
[2] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۲۱۔

کبر یوں رہا بے خودی کے اندر　　سمندر کی سیپیاں میں ہے جوں گہر

---

(۲۳) **حسینی** — اس دور کے ایک شاعر شاہ حسین نام اور حسینی تخلص کرتے تھے حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ غزل گو شاعر تھے۔ ان کا ایک مختصر دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

ہوا تھا شوق مجکوں طبع تیری آزمانے کا
نہیں ثانی ترا جگ میں توں نادر ہے زمانے کا

جہاں کے عاقل و دانا ہیں عاجز تجھ فراست سوں
کسے طاقت صنم تجھ میں تیرے بار پانے کا

حسینی حشر کا کچھ خوف مت کر　　امین الدین ہے تیرا مددگار
نگاہ جسم کا یو ہے طلب گار　　اچھے کیوں نا اسے لذات دیدار

تمہارے دید کا لذت ہمارے آنسو پو چھو
ہور اپنے حسن کی خوبی تجشم نار سوں پو چھو

ادھر پر دہرا دہرا منھے بدن پر سے جو تم موہن
دھڑی مسّی کی کیواں مکی لب ممتاز سوں پو چھو

سینے سے پیج کو سینہ لگائے شوق سوں پیارے
اور راحت ہور خوش جی کو کچھ اس جانباز سوں پو چھو

حسینی منتظر بیٹھا ہے کب سوں چاند سوں مکھ کا
اگر ہو دل منے پیارے تو پھر کیوں راز سوں پوچھو[1]

---

(۲۴) **مختار** — اسی دور کا شاعر ہے، قیاس غالب یہ ہے کہ اس کا نام محمد مختار تھا، اس کے پیر شاہ حضرت تھے، ان کی مدح اس نے اپنی تصنیف

---

[1] کتب خانہ آصفیہ نمبر دواوین ۱۶۸۷ء۔

معراج نامہ میں کی ہے، مختار کے حالات کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ہیں، البتہ خود اس کی تصنیف معراج نامہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک عالم و فاضل شخص تھا۔ اس کی علمی قابلیت بلند تھی، وہ سُنّی مذہب، درویش منش صوفی صافی تھا۔ بیجاپور کے دوسرے شعراء کی طرح اس نے بادشاہ کی مدح نہیں کی ہے، مختار محمّد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کے زمانہ میں موجود تھا۔

مختار کی مشہور تصنیف معراج نامہ ہے، اس کے تقریباً تین ہزار شعر ہیں۔ نہایت تفصیل کے ساتھ اس نے معراج کے حالات قلمبند کیے ہیں، آنحضرت صلعم کا آسمانوں کی سیر کرنا، جنّت اور دوزخ کا معائنہ فرمانا، سات آسمانوں کا حال الگ لکھا ہے۔

معراج نامہ کی تصنیف ۱۰۹۴ھ میں ہوئی ہے، خود مصنّف نے اس کی صراحت کردی ہے۔

یو معراج نامہ ہوا ہے تمام سلام علی روح خیر الانام

سنہ تھا یو ہجرت کا اس دن قرار تھے گذرے نو و چار پر ایک ہزار

معراج نامے کے دو نسخے کتب خانہ آصفیہ (اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد) اور ایک نسخہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔

مختار کی دوسری تصنیف "مولود نامہ" ہے[2]، یہ بھی مثنوی ہے اور نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے، اس مثنوی کے چار سو سے زیادہ شعر ہیں، اس میں آنحضرت صلعم کی ولادت درج ہیں۔ آپ کا سراپا، صورت مبارک کے عنوان سے درج کیا ہے، اس کے علاوہ کئی اور عنوان ہیں نفس مضمون میں صدق اور کذب دونوں شامل ہیں۔

معراج نامہ میں حمد و نعت، منقبت حضرت علی اور امام حسین، مدح شیخ عبدالقادر جیلانی، سیّد محمّد حسینی گیسو دراز اور اپنے مرشد کی ستایش کی ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

کہوں حمد اوّل اس راج کا نبیؐ کوں دیا تاج معراج کا

---

[1] وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ صفحہ (۵۰۱)

[2] " " " " " "

خلائق ساری کیا ہے ظہور ولے سب تے اوّل نبی کا ظہور

اپنے مرشد شاہ حضرت اور ان کے پیر شیخ عبدالصمد کی مدح :-

رتن کا محمّد حسینی ہے ناؤں میرے سر پر اس کی ہمیشہ ہے چھاؤں
کہ اور شاہ حضرت سوں مشہور ہے کہ فیض اس کا دو جگ میں معمور ہے
نثار الفنا سوں پڑیا اسکوں کام بقاء البقا کا اسے ہے مقام
زہے بخت بے مثل پایاں ہوں پیر کہ ہے او دو جگ میں منجے دستگیر
محبّت کا پردہ رچایا ہے جب اپس کوں اپیں واں سو پایا ہے جب

....

اسے پیر ہے شیخ عبدالصمد سو پایا نہایت ولایت کا حد
میرے پیر کا جد ہے او سر فراز محمّد حسینی سو گیسو دراز

شاہ حضرت بیجاپور کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ سیّد محمد حسینی آپ کا نام تھا۔ شاہ ابوالحسن حسینی آپ کے والد بزرگوار تھے۔ جن کی بڑی عزّت ابراہیم عادل شاہ ثانی اور محمّد عادل شاہ کرتا تھا۔ شاہ حضرت کے مختصر حالات، مؤلفٔ اولیاء دکن نے درج کیے ہیں[1]۔

معراج نامہ کا مختصر نمونہ :-

سو زہرہ کا مجہ پہ عجب راگ ہے کہ دل عاشقاں کا کیا چاک ہے
سو نغمے منے جیو لے جاتا اتے جو محبوب اپیں ہو کہ گاتا اونے
نیا سوز کوں لیا کہ اس میں بھرے جکوئی آسونے سو تھکے ہور مرے
جتے عاشقاں کو دِیوانے کیا ولے عشق میں سب کوں وانی کیا
بھرے اس کی آواز سوں کوش جب لجایا ہے او عقل ہور ہوش تب
عجب سور ہے اس کا ہر تال پر سو ہر تال اس کا ہے ہر چال پر
لٹکتا ہے گاتا لٹکتی ہے چال بھٹکتی ہے یاں سد لٹکتا ہے حال
بیاں میں دیکھو حال آتا نہیں کہ او کچھ بیاں میں سماتا نہیں

---

[1] اولیاء دکن جلد دوم۔ صفحہ ۷۹۵۔

سو ہر یک کے حوروں کا تھا یو شمار | جو بیٹیاں اتھیاں اوس پو ستر ہزار
کہ ہر حور پر واں اتھا نور بار | زرینہ اتھا اس کا ستر ہزار
سو ہر بست تے یک خوش آواز تھا | دلاں کے اپر ذوق سب بار تھا
رنگا رنگ ساریاں کھڑیاں تھیاں سنوار | کہ سب مشک عنبر کا واں تھا مکار
اگر ایک انوں کا جو دنیا میں آئے | تو سب آفتاب تلیں چھپ کے جائے
ہر یک کے سو سر کے اپر تاج تھا | سو محبوبیت کا بڑا ساج تھا
اتھے زلف ہر یک کوں چالیس ہزار | کہ عاشق کے دل کا وہاں تھا شکار

....

جتے باغ جنت کے پائے شرف | سویاں تے چلے کا کوے ہر طرف
کنارے پو اس کے تھے ڈیرے پڑے | سو یاقوت موتی کے تھے واں کھڑے
طناباں او ڈیراں کو تھے نور کے | ویسے چونکہ کیرن چندر سور کے
جہلم سانوے ہور کلس تھے دھنور | جوں بیٹھے کنول گل پو نوری بھنور
جیتے تھا تب ڈیریاں کو کہکشاں | او تھے مست جوں ذکر میں سر کشاں
محمدؐ بولا جبرئیل کوں کہے | انگے آو پوچھیں تمیں کھوں رہے
کہے اس معمے کوں کھولو مجھے | یو ڈیرے کیسے ہے سو بولو مجھے[1]

مختار کی دوسری مثنوی مولود نامہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

اتھا رنگ گورا سولالی سہبریا | صفت سب جلالی جمالی سہبریا
بھنواں خم اتھیاں واٹ دونو ملیاں | جوں جنت میں کیاں اونڈیاں دو جلیاں
کھوے دانت بھی چونکہ ہیرے جڑے | وے ایسے ہیرے نظر نیں پڑے
لبد تنگ تھا جوں دھانی کلی | وے کان صفت یو کلی میں چلی
نرم بہوت رخسار تھے موں اوپر | ایسی نرمی کان ہے سو ریشم بھتر
سیاہی کیاں پتلیاں انکھیاں پون لیے | کہ جوں دیس ہو رات یک جا لیے
انکھیاں کی سیاہی اتھی بھوت خوب | سیاہی منی کان ہے اتنا ادروپ

---

[1] معراج نامہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

شال اوسکوں کیا دیوئں بھی رات کا سیاہی منی نور اتھا ذات کا[1]

---

(۲۵) قدرتی

اس دور کا ایک اور شاعر قدرتی ہے۔ جدید تذکرہ نویسوں نے اب تک اس کا حال قلم بند نہیں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم قدرتی کے تفصیلی حالات سے بے خبر ہیں۔ اس کی ضخیم مثنوی جو دس ہزار شعر سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس کی قادر الکلامی کی شاہد ہے۔

یہ مثنوی "قصص الانبیا" سے موسوم ہے اور ۱۲۹۱ عنوانات کے تحت لکھی گئی ہے، حمد و نعت و منقبت کے بعد آدم علیہ السلام سے آغاز ہو کر آنحضرت صلعم کے حالات تک بیان ہوا ہے۔ دس ہزار شعر سے زیادہ ہیں، مگر ہمارا دستیاب شدہ نسخہ جو کتب خانۂ آصفیہ میں ہے ناقص ہے۔ حبش کی ہجرت تک کا بیان اس میں آیا ہے۔ ممکن ہے پوری مثنوی کے اور چند سو یا چند ہزار شعر ہوں۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آنحضرت صلعم کا پورا حال قلم بند کیا تھا یا نہیں؟ اکیس انبیاء کا تذکرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرتی نے اس کو کسی فارسی کتاب سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ یہ اس کی ذاتی تصنیف ہے جس کو اس نے تفسیروں وغیرہ سے اخذ کیا ہے۔ قدرتی کی کوئی عشقیہ مثنوی دستیاب نہیں ہوئی، اس سے واضح ہے وہ مذہبی شخص تھا۔ اپنے کمالِ فن کو عشقیہ مثنوی کی صورت میں پیش کرنے کے بجائے قصص الانبیاء کی صورت میں جن کو وہ صحیح تصور کرتا تھا، پیش کیا ہے۔

جس قدر دکھنی مثنویاں اب تک دستیاب ہوئی ہیں ان میں سب سے ضخیم مثنوی رستمی کی خاور نامہ تھی۔ اب یہ دوسری مثنوی ہے۔ جو دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ قدرتی کا نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے:۔

کہ الحمدللہ پرور دگار	کیا جگ اپس نور تے آشکار
سراوں اوّل میں جو سبحان کوں	جب کوئی جیو دیا ہے سو سلطان کوں
خلیفہ ہے اس کا نبی مصطفےٰ	کیا جس کیتو نیل ہور والضحیٰ

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

قصہ یو جو کہتا ہوں ایوّب کا — اتھا نسل اولاد یعقوب کا
اتھی ماں ان کی یہودا نسل — مین شاہ کی دوا تھی دراصل
بنیاں بیچ صابر وا ایوّب تھے — نظر پاک صورت منے خوب تھے
اتھے دو تونگر بہوت مال دار — بھوکیا کون کھانا کھلاتے بچار
جو کپڑے نہ تھے بین تے تن اوپر — تپلکیاتیں وکپڑے تپا دے اگر
ملاتے وانکی اسی دھات تھے — جو کرتے اپنے خیر خیرات تھے
کتے ہیں جو اس دہات سجاں او — مسلّط کیا ان پر شیطان جو

زلیخا کا قصّہ یوسف کو غلام بنا کر رکھنا۔

قبولی زلیخا جو خدمت کتیں — اسی پرورش خوب کرتی ہوں میں
او دل جاں قبولی محبّت بدل — او خوش حال ہوں یوں جو کھلتا کنول
زلیخا رکھے اس کوں سہال تے — او جیو کر کو اسی کوں ننگے پال تے
جو یوسف اوّل موا تھا بال کا — و نو خیز سترا اٹھا سال کا
خدا کا جبیکچ علم بوجھا اتھا — جیکچ سال کا جاب سوجیا اتھا
اس واسطے جم زلیخا کا دل — اچھے جو بی خوشحال جیوں پھول کھل
اسے عشق دن بدن مزید اہوا — او سودا عشق کا سو پیدا ہوا

بی بی خدیجہؓ کے عقد کا حال :۔

نہیں مسخرانی یو ہے جان توں — قبولی ہوں میں اپنی ایمان سوں
سو جتنے تمارے اچھنگے جو خویش — بلا کر جمع کر توں سارے قریش
سو میرا چچا ورقہ نوفل کتیں — بلا لیای توں میری منزل کتیں
محمّد کوں ہاں تم بلا لیائے کر — کرو خواستداری میری آئے کر
نہیں مرد منج کوں کوئی محمّد بغیر — اس باج منکن نہیں کار خیر
بو طالبؓ سنے ہے خدیجہؓ نے بات — سو خوش حال ہو کر اپی دھاندھات
بلاسیچ سارے اکابر کتیں — منا دید سارے قریش جو دین
بلائے ورقہ نوفل کتیں ایک بار — جو آئے ہے سب مل خدیجہ کے ہنا
پلاتے ورقہ نوفل کتیں تب شراب — و بعضیاں پو سارا جو جس کے گلاب

فرعون کا ڈوبنا:-

دو فرعون ڈبنے لگیا ایک بار ‏ کہیا تب جو موسیٰ کو یوں کر پکار
نکو توں ڈبا منج مسلمات میں ‏ جو ہوتا ہوں لیانا ہوں ایمان میں
اسی سات جبرئیل آئے وہاں ‏ مچلک لکھا سو دیکھائے وہاں
دتو بہ کہا تو ہوا کچ نہ فرق ‏ ہوا سب و لشکر متی آب غرق
و جبرئیل آئے میکائیل سات ‏ جو لے کیے ہزاراں فرشتے سنگات
سو کافر کے لشکر کتیں گھیر بار ‏ ڈبائے مری میں سی ایک بار
و موسیٰ دیکھے علیہ السّلام ‏ ہوا غرق فرعون لشکر تمام
کہے اپنے لوں گاتے ایک بار ‏ چلو جابن کافر ڈبیا ہے جو خوار

مصنف نے تخلص کے چند شعر:-

کہیا قدرتی قصہ دکھنی کلام ‏ ابراہیم نبیؑ پر درو دو سلام
کہیا قدرتی خوب تازہ کلام ‏ کہ برصدق یوسف علیہ السّلام

کہیا قدرتی قصہ ایوب کا ‏ سنے کوئی بندہ جو محبوب کا[1]

---

(۲۶) **مومن**۔ میاں عبدالمومن نام، مومن تخلص مدراس کا باشندہ تھا۔ "اسرار عشق" نام ایک مثنوی بانی فرقہ مہدویہ سید محمد جونپوری کے حالات میں تصنیف کی ہے۔ خاصی ضخیم مثنوی ہے۔ ۱۰۹۳ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی اچھی قابلیت تھی اور شاعری کا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ نمونہ کلام پیش ہے:-

عجب دی شب کہ منجن سیم کر حل ‏ عروس بدر سر تمنا نور کی جل
منجن تھانی تھی مشرق کی نکل ابھار ‏ بیٹھی آ تخت پر نیلم کی اظہار
کرتا جا حجلہ مغرب سی چل ‏ سورجکی شوسوں دی جلوا کی کل

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد۔

پرت کی ریت میں بھی خوب لاگی　　عروس آپ میں ہو جانا شوکی جاگی

ولایت کی جلالت کا سمج راز　　ہوا ہر سور تھا صبح آتش انداز

اکن سوں کھیلئے تھی سخت شیراں　　بھتر پر سپر نکلتی ہے دلیراں
لے سید محمدؐ سوں سیرن بھاک　　کیسی ہر تنہ تھی صورت حراک
کسو نینے تھی اکن میں تیر بازی　　دکھاتی تھی فلک کو تیغ بازی
سمنداہ کابلی صرصر سپچی تھی　　کبھی نکری کی بجلیاں کی پچی تھی
پورن ہور برق لدی اگ کول ناؤ　　جلالت کا دکھا رہی سور کی بھاؤ
اری نوں ازل سوں شاہ کا جام　　کیا تیری طلب کا خوش سرانجام
اتار کر رقص اکت تازہ بنانا　　تنن نانن نانن تننانا

---

(۲۷) قادر شاہ عبدالقادر[2] نام اور قادر تخلّص تھا۔ عام طور سے قادر لنگا کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حیدرآباد کے قادر سے جن کا ذکر میر حسن اور اسپرنگر نے کیا ہے ان کی شخصیت علیحدہ ہے۔
قادر کے شاگرد بھی سکندر عادل شاہ کے زمانہ میں صاحب تصنیف ہو چکے تھے۔ قادر کا کلام خاص طور سے قابل غور ہے کہ انہوں نے غزل میں عام رواج کے خلاف اخلاقی مضامین بیان کیے ہیں۔ حسب رواج تصوّف کے مسائل کو حقیقت کے عنوان سے لکھا ہے نمونہ کلام پیش ہے:۔

شاہ امین علی پیا مجھے سنبھال　　بھوت ناتواں ہے میرا حال

شاہ امین علی پیا مجھے جلا
تیرے محبّت کا مے مجھے پلا
میرے دل کے چمن کا توں پھول کھلا

---

[1] اسرار عشق قلمی　　[2] روضۃ الاولیاء بیجاپور۔

شاہ امین علی پیا مجھے تیری آس
جب محبوب رہے تیری چرن پاس
تُو سائیں میرا میں تیری داس
بولے قادر میں تیرا مکیں بندا
نس دن لاگیا ہے مجھے تیرا دھندا
میں تیرا چکور توں میرا چندا

نرکس پر زبردستی نہ کس کا دل دوکھانا ہے
پتی کیا مال پرستی خدا کوں موں دیکھانا ہے
تکبّر کے جو مسند پر غروری کا جو تکیہ دھر
رہا کیا بٹیہ غفلت کر تجھے دنیا تھے جانا ہے
نکر مردم آزاری تجھے مرنا ہے سوں سار ے
عذاباں قبر ہے بہاری تجھے بھی وہاں سمانا ہے
کفن سے کھول مکھ تیرا لگا کر لیا ہے تربت سیں
کریں سب مل دفن تجکوں دنیا کا کیا بہانا ہے
اجل جس وقت آوے گا مرے گا کن عذابوں سیں
اندہارے گور میں تجکوں دنیا کا کیا بہانا ہے
پوچھے منکر نکیر تجکوں نہ نکلے جواب تجہ مکہ سیں
اوسے دہشت کے لرزے سیں زباں تب لٹ تپانا ہے
خدا قاضی جو ہوے گا محمدؐ پیشوا ہوکر
تیری نیکی بدی دونوں ترازو میں تولانا ہے
ہو جاوے خاک گل درگل رہے ماتی سوں ماتی مل
نکو لیوے نام کوئی یک تل کئیں آخر زمانا ہے

لہ بیاض مملوکہ آغا حیدر حسن صاحب۔

قبر میں رکہ تجھے جیوں کوں چلے سب چھوڑ کر گھر کوں
کہ یارب تم نکو چھوڑو جو یو بے کس بے زبانا ہے
بوے قادر گناہوں کی نجالت سوں
کہ بھی تجکوں خجل صورت اوٹھانا ہے[1]

قادر کی ایک مثنوی "معجزہ خاتون جنت" بھی ہے۔ اس کے تقریباً سوا دو سو شعر ہیں ادارہ ادبیات اُردو میں اس کا نسخہ موجود ہے[2]۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

روایت ہے یو حضرت عباس سوں
لکھے ہیں کتابوں میں اخلاص سوں
لکھے ہیں عربی سوں ہے در کتاب
کیے ترجمہ فارسی در جواب
کہا فارسی کا بھی دکھنی کلام
جو معلوم ہوتا مگر خاص و عام

روایت کتا ہوں سنو اے عزیز
سنو دل کے کانوں سے تم با تمیز
صحیح یو روایت بوقتِ رسولؐ
دل و جاں سوں بات کرنا قبول

عرب تھا عبداللہ نام دار
تھا بہوت تجّار و مالدار
یو دنیا کی تہمت سے مکاجی
تھا دشمنی سب کا او سرک سی
ابوجہل کا اوس کا بھائی اتھا
نکر تو نگر میں ہر جائے تھا
کرے دشمنی او نبیؐ سوں سدا
یو مرک ازل سوں کہا تھا خدا
یوں کرمنی منگے اپنی دختر کا بھاؤ
لگا بہوت بنتِ رسول کر بنکو جاؤ
شروع مہربانی کہا سربسر
ہوا غل خلالوں شہر در شہر
بُلانے لگے سب عرب کو تمام
بولانے لیگا سب عرب خاص و عام
بولایا جنی دوست اور خویش تھے
وہم قوم دل بند، دل ریش تھے
کیا دل میں تجویز او بد اسیر
اولیا نا محمدؐ کی بیٹی کو گھر

---

[1] از بیاض مملوکہ حضرت مولوی خلیل اللہ صاحب۔

[2] تذکرہ اردو مخطوطات نمبر ۱۴۲۔

ہمیں ہیں تونگر اوتو ہیں فقیر　　　بولا مہربانی کو کرنا حقیر

---

(۲۸) شاہ من عرف

شاہ من عرف بھی حضرت امین الدین اعلیٰ کے مُرید ہیں۔ غالباً خلافت نہیں تھی۔ آقا حیدر حسن صاحب کی بیاض سے آپ کا جو کلام ملا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے :-

بوجھنا مشکل پڑیا بوجھنا پیو کا　　　وہ صاحب ہے سب جیو کا

واجب ممکن ہے لو ہنکارا
ممتنع عارف وو لو نر مکارا
روح شاہد ہے دو پرکارا

شاہد مشہود کرتوں ایک انکارا
نور نربجن ہے وہ بے کارا
کنج مخفی سوں ہے اس کا اظہارا

جلال جمال کرتوں ایک ٹہارا
نور جلال کنج سوں ہے تیارا
اس کی آنکے دیکھو پیو کا دیدارا

شاہ من عرف عاجز بندہ گنہ گارا
مرشد امین علی گناہ بخش ہارا
پیر باداشاہ اوتارے مجھے پہلی پارا

دیگر

ذات احد کی پاک ہے اوسے کوئی دیکھ پچھانے
پیو یوں کوں دیکھ کر ہوے نیو کے دیلو انے

جلی ظاہر قلبی دل میں روحی سوں کرو بجہانا
سری سوں سکہ پائے کر خفی میں ایسے چھپانا
لارب ولا عبد ہے فنافی الشیخ ہو جانا

سب پر شاہد نور ہے وہی نور نورانا
ذات کے صفت جمال ہے اس کا دو ہی ٹھکانا
جلال جمال ایک نکتا کر اس میں پیو کوں پانا

مرشد امین علی سرمست پیر بادشاہ حسنی
جلال جمال دکھائے کر کھولے ذات کی نشانی
شاہ من عرف مرید تیرا عاجز کیانی

---

(۲۹) مُعظّمؔ

مُعظّم، تخلص، عادل شاہی دَور کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ کے عہد میں موجود تھا، امین الدین علیؔ کے مرید اور خلیفہ قادرؔ کی شاگردی کی۔ قادر کا مرید بھی تھا اور تلمذ بھی ان سے حاصل کیا۔ اس کے مختصر دیوان کے علاوہ چند مثنویاں بھی دستیاب ہوئی ہیں، چنانچہ کتب خانہ سالار جنگ میں اس کی مثنویاں شجرۃ الاتقیا اور گنج مخفی، گلزار جنّت موجود ہیں۔ دیوان بھی اسی کتب خانہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔ اوّل الذکر دونوں مثنویاں تصوّف میں ہیں اور گلزار جنّت میں، چند صوفیا کے مختصر حالات نظم کیے گئے ہیں۔

الٰہی توں قادر ہے صاحب غنی — توں رازق مطلق ہے سمرت دھنی
تیرا نام قادر سزاوار ہے — تیرے نام کا سب کو ادھارا ہے
اسم باسما ہے تیرا حکیم — سمیع، بصیر، علیم، حکیم
امر مجھ ہوا خواب میں کانیات — تو اظہار کر گنج مخفی کے بات
عبادت میں حق کے تو مشغول ہو — کدورت یہ دنیا کی سب دل سوں دھو
صفت کرنے کا دل جان سوں — معرز ادسے جان ایمان سوں

... ...

ہوا مجھ امر خاتم الانبیار — ایسے نام رکھ شجرۃ الاتقیا
الٰہی بحق محمدؐ رسول — یو مکتوب میرا تو کرنا قبول
اول بات من عرف کے بول کر — سو بعد از فقد عرف سب کھول کر
کئی راز مکشوف یک بات میں — ادسے ہنج گنج کا گلے ہات میں
جکچھ بولتا تھا سو بولے تمام — چھپا راز سب اون پہ کہو تمام

مجالس میں لے جاتی سوں ملا | ولایت کے تشریف ان کو دلا
لیجا حق سوں یک پل میں داخل کیے | درس عشق کا دے کر فاضل کیے
کہے تم سفر اب کیتک دن کھبرو | نبی کا امر تم ہدایت کرو
سفر ایک ظاہر تو پھرنا ہے یہ | سو دوسرا خدا سوں اپڑنا ہے یو
دیکھو ایک ہے حج اصغر کتے | سو دوسرا او سے حج اکبر کتے[1]

گلزار جنّت کا نمونہ:۔

مبارک عجب نام ہے شیخ فرید | مریدوں میں شہ کے بڑے معتقد
کیے سیر سب برّ اور بحر کا | ہر یک ملک کا اور ہر ایک شہر کا
نہ دیکھے خدا کو بیابان میں | یہاں آکر دیکھے ہیں یک آن میں
کتک برس لک شیخ جنگل پھرے | مطالب یہاں آکر حاصل کریں
بھوکے رہ کے جنگل پھرے سو اجر | شکر کو کیے شیخ مائی بہتر
مشرف ہوئے شیخ جب پیر سوں | سو اس قطب دیں شہ اکھیر سوں
تصدق دیکھو پیر کا راز سب | ہوا کشف رویت دیکھو راز سب
جکوئی پیر پکڑے سو واصل ہوئے | جسے پیر نیں وہ سو جاہل ہوئے
پرستش کیے شیخ جب پیر کا | کرم تب ہوا اس جہانگیر کا
ملایک کہن عرش پر اولیا | ملک زاہدوں میں دسا انبیا
آخر تب ہوا شیخ کو رنج کا | ہوا تب لقب یو شکر گنج کا

گنج مخفی کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

الٰہی تہیں قادر ذوالجلال | تو صاحب جمیل ایحب الجمال
سمیع، بصیر، علیم، حکیم | توں خالق توں رازق رؤف الرحیم
توں دانا تو بینا علام الغیوب | توں مومن مومہمن کشاف القلوب

زباں سوں تو وہ ذکر جلی کرے | او دل میں سدا اپنے قلبی دھرے

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] 〃 〃 〃 〃

او قادر او نو کا تو ساقی کتے — پلاتا ہے جی بھر کے باقی کتے
امر پر بتی کے یو کھولا ہوں میں — یو سب ڈیر سو بیت بولا ہوں میں
میرے پر یو سب راز کھولے امین — حقیقت انو کا یو بولا ہوں میں

معظم نے تب جا کر سجدہ کیا
سدا ان کے نعلین سر پر لیا[۵۷]

معظم کی غزلیات کا نمونہ پیش ہے :-

ہنگام یو دستا اب روپ ہے جہاں میں — تس پر تری جوانی نا چیز نا گوانا
اس بھر کی کر کے سیر ہنگی سو چر کے جانو — عشاق سب کتے ہیں دیدار یہاں چہ پاتا
سب ذوق عیش و عشرت ہے آج تجھ میسر — الواں نعمتاں یاں کھانا بھی اور کھلانا

اے دل تو اس دنیاں میں آکر کیا سو کیا — کرنا سو توں کیا تیں کئی دن جیا سو کیا
اب حیات کہتی دلبر کے ہے ادھر میں — او جام تجھ ملاتیں بھی تو لیا سو کیا

ہوشیار ہو معظم قادر صبا پوچھے گا — مجھ باج بھی جہاں میں ناحق رہا سو کیا

مقبول دو جہاں میں یک یار ہے ہمارا — معشوق ہور مہربان دلدار ہے ہمارا
سب عالماں شہر کے کرتے ہیں پیار لیکن — باطن میں زاہدوں سے انکار ہے ہمارا

مشتاق جب ہوا ہوں شہ کے جمال کا — دیدار تب ہوا ہے اوس جگ او [illegible]

قادر کی بات سن کر کہتا ہے کیوں معظم — یا شہد یا شکر جوں یا قند یا نبات،

اصراف دیکھ میرا سب خاص عام کہتے — پایا ہوں گنج مخفی یا کچھ ہے کرامت

---

۵۷ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

دلبر سوں مل منظم عشرت مدام کر تو　　قادر تیرا سنگاتی تیرے سنگات ہے لگ

میں تو سے جاگزر تو وصلت اسے کہتے ہیں　　اوڑھ یاد اور بسر تو عشرت اسے کہتے ہیں
مجنوں الپس ہوا کیوں لیلی چپ کو دکھا بتا　　یہ توں یوں جنجہ مرنا حکمت اسے کہتے ہیں[1]

عادل شاہی نثر

بیجا پور کی عادل شاہی دَور میں شاہ میران جی شمس العشاق بقید حیات تھے۔ مگر آپ کا تذکرہ بہمنی دور میں کر دیا گیا ہے۔ آپ کو عادل شاہی دَور کا پہلا شاعر اور پہلا نثر نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ آپ کی نثر کا نمونہ بہمنی دور میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں متروک کر کے دوسرے نثر نگاروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) شاہ برہان الدین جانم

شاہ برہان الدین جانم کی نظم کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔ آپ نے بعض رسالے نظم میں بھی مرتب فرمائے ہیں۔ ایک کا نام "معرفت القلوب" اور دوسرے کا نام "ہشت مسائل ہے" یہ دونوں رسالے تصوّف میں ہیں اور اس کے مخطوطات آقا حیدر حسن صاحب کے پاس موجود ہیں۔ نثر کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"بسم اللہ نانوں اللہ کا الرحمٰن مہربان الرحیم، بخشینہار اور بخشا نہارا۔ سرانا نوازنا خدا کون بہوت کہ اوپر پرورش کرنہارا۔ تمام عالم کون۔"

"جان اے سالک پہچانت کرنا شریعت کا ہور حقیقت کا ہور طریقت کا، ہور معرفت کا اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں، ہور عاشقاں کوں ہور واصلاں کوں، اب تو سب کوں تسلی دکھلاتا ہے، ہور دل کوں ان پر کہ راحت پاتے ہیں۔"[2]

"ہشت مسائل" کا نمونہ یہ ہے:۔

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

[2] "معرفت القلوب" مخطوط مملوکہ آقا حیدر حسن صاحب پروفیسر نظام کالج حیدر آباد۔

"پیغمبر صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کوں معراج ہوا تب محمد رسول اللہ علیہ السّلام نے سوال کیے کہ سات طبق آسمان ہور سات طبق زمین کیا قدیم ہے یا جدید ہے۔
جواب خدا کہیا اے حبیب من ایں ہمہ جدید آفریدہ شُد۔ سوال تو کچھ نہ تھا تو کیا تھا۔ جواب تجہ سوں میں تھا۔"

آپ کی ایک اور مشہور کتاب "کلمۃ الحقایق" ہے۔ اس کو حال ہی میں اکبرالدین صدیقی صاحب نے ایڈیٹ کر کے شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب تصوّف کے بعض مسائل پر مشتمل ہے۔ بطور سوال و جواب کے۔ یہ کتاب ۹۹۰ھ کے قبل لکھی گئی ہے اس کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو وغیرہ میں موجود ہیں۔ اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:۔

"سوال کہ خدائے تعالیٰ اوّل تھے۔ اوّل کیوں ہے، جواب قدیم تھے، قدیم اوّل تھے اوّل اپین تھا۔ سوال کہ کیوں تھا، کہاں تھا، جواب بے چون و بے چگونہ تھا، و بہ چون و چرانہ باید گفتن ولیکن ہستی یا فی لاشک ولاشبہ سوال او کہاں تھا۔ کہیں تو تعلّقات جا گا مول دھرتا تھا بھی، جواب تیرے بھی وقت سوں تعلّقا دھرتا ہے تو اس ہر شئے کا آفریدگار دیچ جان اور جاگا سب کا آفریدگار، وہی پچھان اس تھے اوّل او اوّل کا بھی اوّل و آخر قدیم و جدید سب اس تھے بے زبان ہوتا اس تھے بول میں آیا کہ اوّل تھے اوّل ہے جملہ مخلوقات تھے لامکاں ہے۔"[1]

(۲) امین الدّین اعلیٰ

شاہ امین الدین اعلیٰ جو حضرت برہان الدین جانم رحمۃ اللہ کے فرزند اور جانشین تھے۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح صاحب ارشاد و ہدایت تھے۔ آپ کی بے شمار کتابیں ہیں۔

شاہ صاحب کی نظم کا نمونہ پیش کیا جا چکا ہے۔ آپ نے نثر میں بھی چند رسالے لکھے ہیں۔ ایک کا نام رسالہ "گفتار شاہ امین" ہے۔ اور دوسرے کا نام "گنج مخفی" ہے۔ ان کا موضوع بھی تصوّف ہے۔

انجمن ترقی اردو وغیرہ کے کتب خانہ میں اس کے مخطوطات موجود ہیں۔ عبارت کا

---

[1] کلمۃ الحقایق۔

نمونہ پیش ہے :-

"اللہ تعالیٰ گنج مخفی کوں عیاں کرنا چاہا تو اوّل اس میں سوں ایک نظر نکلی۔ سو اس سے ایس دیکھ ہوا۔ اس سے شاہد کہتے ہیں۔ یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔

ذات نے اپس کوں دیکھا اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔

یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں[1]۔"

اسی عہد کے دو اور رسالوں کا پتہ چلا ہے جو نثر میں ہیں۔ لیکن ان کے مصنّف کا نام معلوم نہیں ہوتا مگر مخطوطہ کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اسی زمانہ کی تالیف ہیں۔ نمونہ عبارت حسبِ ذیل ہے :-

"اے عارف خدائے تعالیٰ قرآن میں فرمایا ہے"

کل شئ محیط وفی انفسکم افلا تبصرون

اس واسطے ضرور ہوا کہ معرفت حق کا بولنا جوں آپ کوں سچا کیا تبتوں قال علیہ السلام تکلم الناس علیٰ قدر عقلوہم۔ یعنی آدمی بات کرتا ہے اپنی عقل موافق ...... جو کوئی پیر کامل سون یہ دیکھے عن اوس کا متاع ہے۔ نہیں ہے اے عارف ہر ایک انسان کوں پانچ وجود ہیں۔ ہر ایک وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ ہر ایک وجود کی شرطاں اور لوازمات ہیں[2]۔"

دوسرے رسالہ کو ارشاد نامہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ شاہ برہان الدین جانم کی ایک تصنیف اس نام سے موسوم ہے مگر وہ منظوم ہے۔ چونکہ یہ نثر ہے اس لیے نہیں معلوم شاہ صاحب ہی کی تصنیف ہے یا اور کسی کی۔ اس کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

"بسم اللہ نام اللہ کا ......

اللہ محمدؐ کے راز رموز کے باتاں کسی نامحرم کے آگے نا بولنا بولیں گے تو کافر

---

[1] رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۸ء۔

[2] یہ نسخہ میرے چچا عبداللہ صاحب کا مملوکہ ہے۔

ہوئیں گے۔ سو دیوانے ہوونگی تو انو کوں بول کر دیوانے نا کرنا۔ ہور اپی سنا کر کافرنا ہونا یو شرط اس زبان سوں ذکر کرنا اللہ اللہ"

خاتمہ عبارت :۔

"اے بارخدایا ارادت کو مجھ پر آستی تاکہ تیری احد ذات میں فنا ہوئی الف کا لانفی الاثبات ذات تعلق صفات بحق لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ"

تبصرہ عادل شاہی دور میں کوئی ادبی کتاب مرتب نہیں ہوئی، بلکہ اسلامیات کی کتابیں لکھی گئیں، اس دور میں شاعری کو جس طرح بلند مرتبہ حاصل ہو گیا اس کے مقابل نثر کو کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے آیندہ کوئی ادبی کتاب مل جائے۔

---

[1] یہ رسالہ بھی میرے چچا مولوی عبداللہ صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

تیسری فصل

نظام شاہی اُردو

گول کنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتوں کی اُردو کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ہم احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بحری ہے جو ملک نائب بحری کا فرزند تھا۔ ملک احمد بحری جو نظام الملک سے ملقّب تھا سب سے پہلے ۸۹۵ھ[1] میں بہمنی حکومت سے انحراف کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس خاندان کے حسب ذیل بادشاہ یکے بعد دیگرے ۱۰۴۳ھ تک حکومت کرتے رہے۔

۱۔	احمد نظام شاہ	۸۹۵ھ	سے	۹۱۴ھ
۲۔	برہان نظام شاہ	۹۱۴ھ	سے	۹۶۱ھ
۳۔	حسین نظام شاہ	۹۶۱ھ	سے	۹۷۲ھ
۴۔	مرتضیٰ نظام شاہ	۹۷۲ھ	سے	۹۹۶ھ
۵۔	میراں حسین	۹۹۶ھ	سے	۹۹۶ھ
۶۔	برہان ثانی	۹۹۶ھ	سے	۱۰۰۳ھ
۷۔	ابراہیم نظام شاہ	۱۰۰۳ھ	سے	۱۰۰۳ھ
۸۔	بہادر نظام شاہ	۱۰۰۳ھ	سے	۱۰۰۹ھ
۹۔	مرتضیٰ ثانی	۱۰۰۹ھ	سے	۱۰۰۹ھ
۱۰۔	برہان ثالث	۱۰۰۹ھ	سے	۱۰۴۳ھ

---

[1] تاریخ فرشتہ صفحہ ۹۶ مقالہ سوم۔

ملک احمد کی عمدہ سیرت اور بہترین اخلاق کی مصنف تاریخ فرشتہ نے بڑی تعریف کی ہے اور بیان کرتا ہے کہ خصال حمیدہ بے شمار ہیں۔ صفحات گذشتہ میں اس امر کی صراحت ہو چکی ہے کہ بہمنی عہدِ حکومت سے دکن میں دکھنی زبان کا رواج ہو چلا تھا۔ عام طور سے دکھنی بولی جاتی تھی اور تصنیف و تالیف کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

ملک احمد کے زمانہ کے ایک شاعر اشرف سے ہم واقف ہیں جس کی مثنوی ہمدست ہوئی ہے۔

ملک احمد کے مرنے پر اس کا فرزند برہان نظام شاہ مسند نشین ہوا اور طویل عرصہ تک حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے زمانہ میں احمد نگر میں علم و فن کی بڑی ترویج ہوئی۔ شاہ طاہر یزدی اسمٰعیلی نے ایران سے آکر اس کو امامیہ مذہب میں منسلک کر لیا۔ شاہ طاہر ہفتہ میں دو دن جامع مسجد میں درس دینے لگے۔ تمام علمائے شہر جمع ہوتے تھے۔ بہت بڑی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ خود سلطان برہان نظام شاہ اس مجلس میں شریک ہوتا۔ یہ خود صاحبِ ذوق اور ذی علم تھا۔ مجلسِ مناظرہ میں خود حصّہ لیا کرتا۔[1]

برہان نظام شاہ نے جامع مسجد کے سامنے ایک اعلیٰ شان مدرسہ بھی تعمیر کیا تھا اور اس کے اخراجات کے لیے ایک بڑی جاگیر وقف کر دی تھی۔[2] کئی علماء باہر سے آکر مقیم ہو گئے جن میں شیخ احمد نجفی، ملّا پیر محمد، ملک احمد تبریزی، اسمٰعیل صفوی، خواجہ معین الدین صاعدی، شاہ حسن انجو، شاہ جعفر جو شاہ طاہر کے بھائی تھے۔ ملّا شاہ محمّد نیشا پوری، ملّا علی استر آبادی، مُلّا رستم جرجانی۔ ملّا علی مازندرانی۔ ملّا عزیز اللہ گیلانی، ملّا محمّد امامی استر آبادی وغیرہ مشہور ہیں۔ جن کی وجہ سے بقول فرشتہ احمد نگر گلستان ارم بن گیا تھا۔[3]

برہان نظام شاہ کا جانشین اس کا فرزند حسین نظام شاہ ہوا۔ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ذی علم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ ملّا طاہر جو ایران واپس چلے گئے تھے۔ وہ دوبارہ واپس آئے۔ سلطنت نظام کے حدود مغلیہ حکومت کے حدود سے ملے ہوئے تھے۔ اس لیے

---

[1] تاریخ فرشتہ۔ صفحہ ۱۰۲ مقالہ سوم۔

[2] 〃 〃 〃 ۱۱۵، ۱۱۶ مقالہ سوم۔

[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

سلاطینِ مغلیہ نے دکن کی مہم میں سب سے پہلے اسی سلطنت کو آماجگاہ بنایا اور پے در پے حملے کرتے رہے، نظام شاہی سلطنت کی دو شخصیتیں اس لیے خصوصیت سے مشہور ہیں کہ انہوں نے سلطنتِ مغلیہ کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور عرصۂ دراز تک اپنی چھوٹی سلطنت کے باوجود مغلیہ شہنشاہیت کے دانت کھٹے کر دیئے۔ ان دو شخصیتوں میں سے ایک چاند بی بی یا چاند سلطانہ ہے جس نے اکبر کے شہزادوں کا بڑی مردانگی اور شجاعت سے مقابلہ کیا جس کی شجاعت اور دلیری کے کئی واقعات تاریخ دکن میں درخشاں ہیں۔ بالآخر جب ۱۰۰۹ھ میں احمد نگر پر مغلیہ سلطنت کا قبضہ ہو گیا تو نظام شاہوں نے دوسرے مقام کو اپنا مستقر بنا لیا۔ نظام شاہی حکومت کی دوسری مشہور شخصیت ملک عنبر کی ہے جس نے 'کھرکی'[1] آباد کر کے اس کو مستقر حکومت قرار دیا تھا اور عرصہ تک حکومتِ مغلیہ کا بہادری اور دلیری سے مقابلہ کرتا رہا اور اپنے مرنے تک مدافعت میں کامیاب رہا۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں اس کے سپہ سالار مہابت خاں نے ۱۰۴۳ھ میں "کھرکی" فتح کر کے نظامِ شاہی کا خاتمہ کیا[2]۔

اگرچہ عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کو بھی اپنی ہمسایہ حکومتوں سے جنگ وجدل کرتے، مقابلہ اور مدافعت میں ایک زمانہ بسر ہوا مگر نظام شاہی حکومت کو جس طرح مغلیہ شہنشاہیت سے سب سے پہلے نبرد آزمائی کرنا پڑی اور عرصہ دراز تک شہنشاہیت سے مقابلہ رہا اس سے دونوں حکومتیں بڑی حد تک بچی رہیں اسی جنگ وجدل کی زیادہ مصروفیت کی وجہ سے نظام شاہی حکومت میں علم وفن اور شعر وسخن کی وہ گرم بازاری نہ ہو سکی جو قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں میں ہوئی۔ تاہم چند شعراء کے نام ہمدست ہوئے ہیں جن کو احمد نگر سے تعلق تھا اور نظام شاہی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت نے بھی دکنی زبان کی ترقی میں حصّہ لیا اور ان کے عہد کی تصانیف موجود ہیں جن کی صراحت کی جاتی ہے۔

(۱) اشرف

اس حکومت کا پہلا شاعر جس کا کلام ہمدست ہوا ہے وہ اشرف ہے۔ شیخ محمّد اشرف نام اور اشرف تخلص تھا۔ ملک احمد نظام الملک کے زمانہ

---

[1] "کھرکی" زمانہ مابعد اورنگ آباد سے موسوم ہو کر عالمگیر اورنگ زیب کا پایہ تخت بنا۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

میں موجود تھا اور اسی کے عہد میں اس کی مثنوی "نوسرہار" تصنیف ہوئی ہے۔

اشرف کے متعلق ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ صرف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ ضیاء (ضیاء الدین) کا مرید اور معتقد تھا۔ شاہ ضیاء الدین بیابانی، سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسان قندھاری (متوفی ۶۷۷ھ) کے بھانجے تھے۔

بعض اصحاب کو اشرف کے احمد نگر کے شاعر ہونے سے اختلاف ہے، اس کو بیجاپور سے متعلق کرتے ہیں، مگر زیادہ قرائن سے یہ پایا جاتا ہے کہ اشرف کو احمد نگر ہی سے تعلق تھا۔

وہ اپنی اس تصنیف میں کہتا ہے کہ اب تک میری زندگی بیکاری میں گذری، مجھ سے ایسا کوئی کام نہیں ہوا جو مرنے کے بعد میری یاد تازہ رکھتا، جب انسان ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا تو دنیا میں نام نیک چھوڑنا چاہیے۔ یہی سب سے اچھی یادگار ہے۔ میں نے یہ اشعار یادگار کے طور پر لکھے ہیں، تاکہ لوگ انہیں پڑھیں اور نصیحت حاصل کریں۔

نوسرہار میں دکھنی مثنویوں کی طرح بادشاہ کی مدح نہیں ہے، بلکہ حمد اور نعت و منقبت کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے مصائب اور حالاتِ کربلا منظوم کیے ہیں۔ واقعاتِ کربلا سے متعلق یہ دکھنی زبان کی پہلی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی نو باب پر منقسم ہے اس لیے اس کو "نوسرہار" سے موسوم کیا ہے پہلا باب حمد و نعت ہے، دوسرا باب سبب تالیف کتاب کا ہے، تیسرے باب سے حضرت امام حسینؓ کے حالات شروع کرتا ہے۔

واقعاتِ شہادت دوسرے شہادت ناموں یا مرثیہ کے طرز کے نہیں ہیں بلکہ ان کو ایک داستان کے طور پر لکھا گیا ہے۔

اشرف کے کلام کا نمونہ پیش ہے:-

اللہ واحد حق سبحان — جن یہ سرجیا بھوئیں آسمان
چندر سورج تارے روکھ — بادل، بجلی، مینہ اچوک
دوزخ جنت عرش فلک — لوح قلم ہم حور ملک
نبیؐ محمدؐ حق رسول — کیتا جن یہ نفس قبول
دو ہتوں جگ اسر درسیر — جن کوں چاروں یار، وزیر
بوبکر صدیقؓ ایک سرا — عمر خطابؓ ہم دوسرا
اسے دو بزرگ پیر آزاد — عثمانؓ علیؓ دوئے داماد

دوئے نواسے ان مل جاؤں — حسنؓ و حسینؓ جن کا ناؤں
کے تھی اس خود جوے سروپ — صاحب جمال از حد خوب
بادام انکھیاں دانت رتن — زیبا صورت سیمیں تن
بارے اس ملک ہور انس دور — ویسی عورت ناہیں ہور
مجکوں تو خود ویسا روپ — ناہیں ہوں اسد سے خوب
جوان چھوڑے ویسی جوئے — مجکوں کیوں ہمدوسا ہوئے
وہ بے وفا انت عاجز — اس ناں ٹوروں ہوں ہرگز

جیوں یہ زینب پاس گیا — دیکھت آپیں بھول رہیا
اپتر ہو وا دیوانہ — دیوے پر جیوں پروانہ
اب سُن زینب ہور ایک بات — میں سن لاگا تجہ سنگھات
یوں ہوں بھولیا تیرے رنگ — دیوے کارن جیو پتنگ
انہ سنگھاتیں مجھ بی گن — تیرے عاشق چاروں جن

زینب اسہے اس کا نام — نین سلونے جوں بادام
از حد صاحب حُسن و جمال — زیبا موزوں صورت حال
ماتھا جانوں سورج پاٹ — یا کے جانوں چاندا لاٹ
دانت بتیسی تیسی جان — جیسے ہیر نیہ کیری کھان
سرگاں جیسے بے بال — چندا سورج دونوں گال
وئیہ سماوے جیو سہائے — ہونٹ سلونیں حسن لبھائے
ناماں کیتا بول سنوار — جانو موتیوں کیسرا ہار
سونے کی جیوں کھونٹ گھڑ — مانک موتی ہیرے جڑ
ایک ایک بول یہ مانک مول — سیم ترازو سیں تھیں تول
بند پر دسے سوتے تار — سچیں ہوا نوسہ ہار

مثنوی کا نام اس کی تاریخ تصنیف اور تخلص کے اشعار ملاحظہ ہوں :-

ہجرت نبی نو سو نو کہیا اشرف نو سر لو

نو سرہار اس دھریا ناؤں جائے دیکھ تو اب ہر ٹھاؤں

اے نو بابان نوسر ہار قیمت اس کی لاکھ ہزار
بازان جیوں کی تاریخ سال بعد از ہجرت نبی سال
نو سو ہوئے اگلے نو یہ دکھ لکھیا اشرف تو
نانو دھریا اس نو سرہار لیکن یہ سب دکھ کا بہار

اس مثنوی کا ایک مخطوطہ ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ میں بھی ایک نسخہ ہے[1]

"واحد باری" بھی اس کی تصنیف ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے :-

واحد باری ہوئی تمام دنیا میں رہے اشرف کا نام

---

(۲) آفتابی

سلطان حسین نظام شاہ کے عہد کا ایک شاعر ہے۔ اس نے شاہ نامہ کی بحر میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ حسین نظام شاہ کے جنگ کے واقعات درج ہیں۔ اور بادشاہ کی مدح بھی کی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد تقریباً (۳۷۰) ہے۔ شاعر اپنے آپ کو امامیہ مذہب سے وابستہ کرتا ہے اور سلطنت کا مذہب بھی یہی ہونے کی صراحت کی ہے۔

مثنوی کا ایک نسخہ پونہ کی دکن کلشن میں موجود[2] ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کو نمونہ کلام ہمدست نہ ہو سکا۔

---

[1] رسالہ اُردو ادب ستمبر ۱۹۵۶ء

[2] مکتوب پروفیسر عبداللہ چغتائی موسومہ راقم۔

(۴) شوقی

حسن شوقی کا تذکرہ ہم نے بیجاپور کے شعراء میں کردیا ہے۔ اس کو دکن کی تین سلطنتوں سے تعلق رہا۔ اس نے اپنے نظام شاہی تعلق کے زمانہ میں "فتح نامہ نظام شاہ" مثنوی لکھی تھی جس میں بیجانگر کی جنگ اور فتح کا تذکرہ ہے۔ اس میں اس نے فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔

کلام کا نمونہ بیجاپور کے تذکرہ میں پیش ہوچکا ہے۔

چوتھی فصل

برید شاہی اردو

بہمنی سلطنت کے ضعیف ہو جانے کی وجہ سے جہاں دیگر صوبہ دار خود مختاری کا ڈنکا بجانے لگے۔ وہاں خاص شہر بیدر میں بھی جو کہ بہمنی حکومت کا دارالسلطنت تھا، خاندان برید شاہی نے اپنی حکومت قائم کرلی اور عرصہ تک خود مختارانہ حکمرانی کرتے رہے۔

اس سلطنت کو اپنی ہمسایہ سلطنتوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا پڑا مگر علم و ہنر کی گرم بازاری جو بہمنی دَور کے آخر میں تھی سرد نہیں ہوئی تھی مگر افسوس ہے کہ ہم یہاں کے زیادہ شعراء یا کسی نثر نگار کا حال سرِدست پیش نہیں کرسکتے۔ صرف ایک شاعر کو پیش کرتے ہیں:۔

قریشی امیر برید کے زمانہ کا شاعر ہے، ۱۰۲۲ھ میں ایک مثنوی "بھوگ بھل" کے نام سے لکھی ہے، اس کا ایک باتصویر قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے اور ایک نسخہ کلکتہ کی امپریل لائبریری میں موجود ہے۔ "بھوگ بھل" میں جنسی امور کو بیان کیا گیا ہے۔

بھوگ بھل کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

محبت نے سوناری و نر | کیا نسل ہو ذوق جفتی بہتر
بنایا بنی آدم کی پھنسلی حوّا | تو آدم کے دُکھ کوں حوا ہوئی دوا

رکھیا ناؤ بنگار سے بھوگہل | جو چاتر کرے بھوگ دن دن گل
رہے شہر بیدر سچا تخت گاہ | جو پیدا ہو میں شاعراں فلک خواہ
کہ بیدر گر از عبدہٗ یک فقیر | سو شاعر قریشی لکھیا یہ ضمیر

بریدِ شاہ محمود کے دَور بھی   کیے ہندی کو کیا کوں فارسی
ہے اس بعد دُور دُور ثانیٔ امیر   کہ ہے شاہ بہو کے نبی ترل سریر
سو اس شاہ کے دور بیدر مقام   یو شاعر کیا نظم دکھنی تمام[1]

---

[1] کتب خانہ سالار جنگ۔

پانچویں فصل

دکن میں مرثیوں کی ابتدا

عرب کی شاعری میں مرثیے کو خاص درجہ حاصل رہا ہے۔ عربی مراثی اپنے سوزوگداز اور اپنی قوتِ تاثر کے باعث دلوں میں ولولہ، جوش اور انتقام کی آگ روشن کر دیتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے بعد زمانہ اسلام میں مراثی کو مزید ترقی حاصل ہوئی اور کئی مرثیے اپنی فصاحت و بلاغت اور سوزوگداز کے باعث مشہور ہیں۔

فارسی میں بھی مرثیوں کا رواج تھا اور ان پر عربی مراثی کے اسلوب بیان کا بہت کافی اثر ہوا۔ چنانچہ محقق طوسی کے زمانہ میں شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق پُر درد فارسی مرثیے لکھے گئے۔

شمالی ہند میں ہمایوں کے دوبارہ واپس آنے کے پیشتر مجالس عزا اور مرثیہ گوئی کا دستور[1] نہ تھا، مگر اس کے کم و بیش نصف صدی پہلے دکن میں ان کا رواج ہو چلا تھا۔ دکن کی خودمختار سلطنتوں میں جو علم و فن کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتی تھیں، مجالسِ میلاد اور مجالس عزا کا بھی خاص دستور پڑ گیا تھا۔ اس قسم کی مجالس کا آغاز بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت میں ہوا مگر اس کے ساتھ ہی قطب شاہوں اور نظام شاہوں نے بھی اس کو رواج دیا تھا۔

جس طرح دلی میں دکھنی شہزادوں اور امیروں کی بدولت اُردو شاعری کا رواج ہوا۔ اسی طرح انہی دکھنیوں کی وجہ سے وہاں مجالس عزا کا دستور پڑا۔[2]

---

[1] مغل اور اُردو۔

[2] داستان اُردو از مرحوم نواب خیال۔

دکن میں ابتداءً فارسی شعراء کا کلام خصوصاً محتشم کاشی کے بندان مجالس میں پڑھے جاتے تھے مگر چونکہ دکھنی زبان عام طور سے مروّج تھی اور فارسی گویا رخصت ہو چکی تھی۔ اس لحاظ سے مرثیوں کا دکھنی زبان میں لکھا جانا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ایک خاص گروہ مرثیہ گویوں کا پیدا ہو گیا اور کثرت سے مرثیے لکھے گئے۔ خاص مرثیہ گویوں کے علاوہ دیگر شعراء نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

اس امر کا صحیح پتہ لگانا دشوار ہے کہ اولاً دکھنی مرثیے کہاں لکھے گئے کیونکہ عادل شاہی اور قطب شاہی دونوں سلطنتوں کے بانی امامیہ مذہب کے پیرو تھے اور اپنی اپنی سلطنتوں کا مذہب شیعیت قرار دیا تھا۔ نظام شاہی کا دوسرا بادشاہ اسمٰعیل شیعہ ہو چکا تھا۔ رعایا کے خیالات اور اعتقادات میں یکسانیت پیدا کرنے کا خیال تینوں سلطنتوں کو تھا۔ تاریخوں سے اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ بیجاپور اور گول کنڈہ میں شاہی عاشور خانے موجود تھے اور یہاں مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔

بیجاپور میں علی عادل شاہ ثانی اور گول کنڈہ میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں خاص طور سے اس پر زیادہ توجہ کی گئی تھی۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں جشن میلاد مبارک کے جلسوں کے ساتھ ساتھ محرّم کی تعزیہ داری میں بھی ترقی ہوئی۔ تمام ممالک محروسہ میں ایّام عاشورہ تک نوبت و نقارہ موقوف رہتے۔ گوشت اور پان کی دکانیں بند ہو جاتیں۔ تمام مسلمان اور ہندو ماتم میں شریک ہوتے تھے۔

گول کنڈہ[1] میں دو شاہی عاشور خانے تھے۔ یہاں چودہ علم چہاردہ معصوم کے کھڑے کرائے جاتے۔ روشنی کا خاص طور پر انتظام ہوتا تھا۔ سو سو، دو دو سو چراغ کا ایک ایک برنجی درخت بنایا گیا تھا جو اپنی روشنی سے عاشور خانہ کو منوّر کر دیتا تھا، یہاں مرثیہ خواں اور مدّاح شہدا ہر شب کو جمع ہوتے اور اُردو میں مراثی اور مناقب پڑھتے تھے۔ جب مراسم تعزیہ داری ادا ہو جاتے تو حکومت کی جانب سے سب کی دعوت ہوتی، مگر اس میں بے گوشت کی غذائیں ہوتی تھیں۔ ہر گلی و کوچہ میں یہی ہوتا تھا، چھٹی تاریخ کو عاشور خانہ کے باہر کے علم اُٹھائے

---

[1] اس وقت قطب شاہوں کا دارالسلطنت گول کنڈہ سے حیدر آباد تک پھیلا ہوا تھا۔

جاتے، ان کے ساتھ محبان ائمہ اطہار ہاتوں میں مشعل لیے ہوئے اور ذاکرو مدّاح مرثیہ خوانی اور مدّاحی اشعار پڑھتے ہوئے ساتھ ہوتے۔ دسویں تاریخ کو خود سلطان عبداللہ سیاہ لباس میں برہنہ پا علموں کے ساتھ ہوتا تھا۔ مرثیہ خواں آگے آگے مرثیہ پڑھتے جاتے تھے۔ واقعاتِ شہادت اور احوالِ گرفتاری حرم محرّم بھی سنائے جاتے[1]

اسی طرح بیجاپور کے شاہی عاشورخانے کا نام "حسنی محل تھا۔ نصرتی نے اپنے قصیدہ میں اس کی تزئین اور آراستگی کی پوری تفصیل کی ہے اور بیان کیا ہے کہ علی عادل شاہ نے منّت مانی تھی کہ اگر جنگ سے فتحیاب ہو جائے گا تو علم بٹھا کر مرثیہ خوانی کرے گا۔

اس وقت تک قدیم سے قدیم جو کتاب واقعاتِ کربلا کی ہمدست ہوئی ہے وہ نظام شاہی سلطنت کے شاعر اشرف کا " نوسرہار" ہے۔ اس کے بعد جو مرثیہ دستیاب ہوا ہے وہ گول کنڈہ کے مشہور و معروف شاعر وجہیؔ[2] کا ہے۔

اس کے بعد گول کنڈہ اور بیجاپور کے دیگر شعراء اور مرثیہ گویوں کے مرثیے ہیں۔

ان ابتدائی دکھنی مرثیوں کی جو خصوصیتیں ہیں ان کا مختصر اظہار ضروری ہے۔

۱۔ ان مرثیوں سے صاف طور پر مرثیہ پن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا اصل مقصد حضرت امام حسین علیہ السّلام اور اہلِ بیت رسالت کا غم والم تازہ کرنا اور ان کی یاد میں آنسو بہانا تھا۔

۲۔ فرضی روایات اور افسانوں کو مرثیوں کا جزوِ اعظم قرار نہیں دیا گیا تھا۔

۳۔ مرثیوں میں ادبی شان بھی پائی جاتی ہے۔

۴۔ ان مرثیوں سے واقعہ نگاری اور مرقعہ نگاری کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

۵۔ اکثر مرثیوں سے خود مصنّفین کے متعلّق تاریخی حالات معلوم ہوتے ہیں اور دوسرے شاعروں کا نام ان کے وطن اور دیگر ہم عصروں کی صراحت بھی معلوم ہوتی ہے۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ مرثیے پیش کرتے ہیں۔ اولاً احمد نگر پھر گول کنڈہ اور اس کے بعد بیجاپور کے مرثیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] سلسلہ آصفیہ تاریخ دکن جلد دوم۔

[2] وجہی کی نثر سب رس کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق صاحب نے روشناس کرایا تھا اور اس کی مثنوی قطب مشتری اور مرثیہ کا پتہ راقم ہی نے چلایا اور ان کو متعارف کرایا تھا۔

(۱) مرثیہ اشرف

اس کا تذکرہ نظام شاہی دور میں ہوچکا ہے۔

رو رو کہے یوں حسینؑ — اب کے پچھیوری کد ملین
وہ تون جانا مجہ وک دہر — یوں در ماندا بلکے گہر
تجہ بھتیں مرا ہوں ما باپ — اب کیوا نوں طاقت تاب
تیری پیاروں ہوں تھا شاد — ما باپ نا دتے کدھیں یاد
اب یہ دکہ ہوں کیوں سہوں — کس پکاروں کس کہوں
اب بچھورا ہوا جسم — تجب بن تھا کی یوں پر کم
اب کہ ہوں کس کا نانوں — کس پکاروں کہدھر جاؤں

---

(۲) مرثیہ وجہی

وجہی گول کنڈہ کا مشہور شاعر ہے۔ جس کی مثنوی "قطب مشتری" اور نثر "سب رس" کا ذکر گذر چکا ہے۔ اس کا ایک مرثیہ بھی ہم کو دستیاب ہوا ہے۔ جس کو ہم آج سے بہت پہلے ہی اہلِ علم سے متعارف کرا چکے ہیں[1]۔ یہ مرثیہ حسبِ ذیل ہے:۔

حسین کا غم کرو عزیزاں — انجوئیں سوں جڑو عزیزاں
بنا جو اوّل ہے غم کا — عرش گگن ہور دہرت ہلایا
قضا میں جوں جوں لکھیا ابھی — گریا حسین پر ادھی سمایا
نبیاں ولیاں کے انجواں سوں بھڑے — یو غم حسین کا جنم دھولایا
دلاں میں دو گگی چھوہ نے چٹکیاں — یو غم نے سلگا دبرگ لگایا
یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا — مگر قضا تھا سو حق دکھایا
محب دلاں کوں اجل کا ساقی — پیالے غم کے سو بھر پلایا
یو کیا اندیشہ کیتا — فلک شہاں پر ستم خدایا
حسین یاراں درود بھیجو — کہ دین کا یو دیوا جلایا

---

[1] دیکھو مجلہ مکتبہ حیدرآباد۔

تمہارے وجہی کوں یا اماماں
نہیں تمن بن یو اس کو ساتیا

(۳) سلطان محمّد قلی قطب شاہ

سلطان کا کلام صفحات ماقبل میں درج ہو چکا ہے۔ سلطان نے دوسری صنف کے ساتھ مرثیے اور نوحے بھی موزوں کیے تھے۔ ایک نوحہ کا نمونہ پیش ہے :۔

دو جگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی لکڑیاں جالکر کرتی ہیں خواری وائے وائے

ساتو گگن آٹھوں جنّت، ساتو دریا، ساتو دھرت
ایکس تھے ایک آپس میں آپ دکر کرتے کاری وائے وائے

کالا کیا کسوت مبکا دیکھو اماماں دوک تھے
ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تے بہاری وائے وائے

لوح ہور قلم، کرسی عرش قدسیاں ملک غلماں سب
بجلیاں بدل ارڑاتے ہیں رات ساری وائے وائے

اسماں جھج حبالا ہوا سورج اگن والا ہوا
چندا سو جل کالا ہوا ہے دکھ آپاری وائے وائے

پنکھی سٹے ہیں سب پراں رورو بھرائے سمدراں
چھوڑے ہیں سب اپنے گھراں دیکھو تو زاری وائے وائے

کالے ہوئے دکھ تے منگل سر پر سیتی مائی سگل
تو بکڑے اس دکھ تھے جنگل ہے بے قراری وائے وائے

پھولاں سکے سب دکھ ستی مکھ مونڈے بلبل جھکھ ستی
کوئل حسینا دکھ ستی بن بن پکاری وائے وائے

دیکھو تمیں اے ماناں وانے چریں نا پنکھیاں
دھرتی ہے ماتم کی دکھاں دھرتی بچاری وائے وائے

لہ از بیاض مولانا صفی الدین مرحوم

دو جگ خراباں ہورہے جیواں گیا باں ہورہے
سمدر سرایاں ہورہے تا ہوے جاری وائے وائے

دُکھ آگ سوں جگ بن جلے آکاس تا دھرتی ہلے
کمن پر فرشتے کھلبلی سٹ اختیاری وائے وائے

حضرت نبیؐ کے گیسواں دو اماماں کے پکال
جبریل جھلاوے اپ ہتاں آرات ساری وائے وائے

شہزادے کے سب کے اوٹھاں لگنے پکارے اس زماں
عفعف بہن تنکوں ساں کے دوی باری وائے وائے

... ...

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر
کافر کیسے کیسے قہر لو زخم کاری وائے وائے

دُکھ بات کو عبب جلے لکھنے قلم بن نا چلے
دل جیوں شمع جل تلملے سدگی ہماری وائے وائے

قطبا کہے دل کے بچن ہر دم مدا منج پنج تن
راکھے خدا منجکو جتن دشمن کو خواری وائے وائے

قطبا کو ہے اللہ مدد بستا ہے اس دل میں احد
تو منج مدد حیدر ولد بیریاں کو زاری وائے وائے

(۴) مرثیہ غواصی گول کنڈہ کا مشہور شاعر ہے جس کا ذکر صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے اور اس کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ مرثیے بھی کہا کرتا تھا۔ متفرق طور پر اس کے مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جن کو ہم ایک علیحدہ مضمون کے ذریعہ اہل علم سے روشناس کرا چکے ہیں[1]۔

دستا نہیں کروں کیا وہ بیان کربلا کا ۔۔۔ پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
آسمان تے خدایا جبرئیل اوتر کو آیا ۔۔۔ روتا اوپر تے فرمان کربلا کا

---

[1] مملوکہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

گھر باندکربلا میں کرشکر ہر بلا میں — کیوں ہے کہ کربلا میں سلطان کربلا کا
ہے دکھ بڑا یو سب تے نین کس قرابت تے — پکڑیا حسین جب تے میدان کربلا کا
چندا سک سوں سوتا اس دک سوں غم کھوتا — تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا
جلتا ہے سور جوتی دنیا کھڑی ہے روتی — کاں تے ہوا یو کوفی مہمان کربلا کا
منجہ سک نہیں ہے دکھ بن ہوں میں نہال جن — لاگیا ہے رات ہور دن منجہ دھیان کربلا کا

غواصیا معطر عالم کوں سب کیا ہے
گویا یو مرثیہ ہے ریحان[1] کربلا کا

ماہ محرم سوز سوں آیا اہل دل منیر سیوں
روتا عالم یک ریز سوں کیا کام کیتا ہائے ہائے

کیوں حیف نہیں آیا تجے کن بند سکلایا تجے
یو کام کیوں بہایا تجے کیا کام کیتا ہائے ہائے

گر بادشاہی پر منم شاہاں کوں دیتا غم پو غم
مظلوم پر کرتے ستم خوف نہ کھایا ہائے ہائے

دکھ شاہ زادے کوں دیا بدنامی اپنے سر لیا
آخر او کافر کیوں کیا آتاج بتایا ہائے ہائے

مورا کے کفنی بہا گلے جوگی جنگم پر نے چلے
از ادسوں دیتا ک تے سب تن جلایا ہائے ہائے

روتے ملک سب عرش لک سورج ستارے اپنا جھلک
مشرق تے تا مغرب تلک اندکار پایا ہائے ہائے

غم سوں پکڑ بیت الحزن یعقوب نے کھویا نین
شیریں کے بہانے کوہ کن آپ جیو گنوایا ہائے ہائے

---

[1] مملوکہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

بولے غواصی مرثیہ سن روئے دکن کے اولیا
ہرسال کا یو مرثیہ کیا کام گیتا ہائے ہائے

---

(۵) مرثیہ سلطان عبداللہ قطب شاہ

سلطان محمد قلی کی طرح اس کا نواسہ سلطان عبداللہ نے بھی مرثیے، سلام، نوحے تصنیف کیے ہیں اس کے ایک مرثیے کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں :-

علیؓ ہور فاطمہؓ کرتے ہیں دونوں آج زاری بھی
حسنؓ کا ہور حسینؓ کا ڈولہ لیا جگ پو خواری بھی

حسیناں جب چلے لڑنے مراں پر لگے پڑنے
شہیداں ہر طرف چرنے لگیا یو دوکھ پیاری بھی

وصیت یو کیے جاتے نکورو تم آپ بھاتے
نہیں تو پھر کونیں آتے اجل آئی ہماری بھی

یتیماں کو سنبھالو ہور غریبی میں سکھالو ہور
بہوت میراں سوں پالو ہور رہے گی یادگاری بھی

پڑے گا غم تمن پر جب مرا غم یاد کرنا تب
یو دکھ یاد آوے گا ہر کب کرونیں اشکباری بھی

سنے یو غم حرم سارا ہوا مسلم نر آدھارا
سو مارے کل گلا لغرا پکڑ کر بے قراری بھی

شہر بانو کہے آکر کہ اے سنسار کے سرور
منجے کی غربت منے بھاکر نجاؤ چھوڑ باری بھی

منجے کی جاؤ تے یوں حال تمن بعد از مرا کیا حال
کرومت غم سے پائمال دیو درس تماری بھی

علی اکبر کہے میں جاؤں سو پیاساں میں جو پانے لاؤں
زخم کھا آئے پھر اب ٹھا لوتی یہی ہے مشک ساری بھی

دیکھو طفلاں منگے پانی، نہ کر ذرہ مہربانی
ستم سوں تیر مارنے گئے وہ نابکاری بھی

حسینؑ پانی پینے آئے یزیداں تیر برسائے
سو پانی پینے نیں پائے لگی مکھ لہو کی دھاری بھی

بغیر از ظلم بیدادی نہ تھی اس وقت کچھ شادی
ہوئی قاسم کی دامادی دیکھو تقدیر یاری بھی

سو دندیاں نوبت بوند کر جو خوشیاں سات پیوند کر
حرم کوں لے چلے بند کر پڑیا جگ سب اندھاری بھی

عروس آکر پکڑ دامن چلے نوشو ہو جب جو جھن
نشانی کچھ دیو منج کن سو پیارا سنبل تمہاری بھی

حسین کا وقت جب وائیا شمر نے آ گلا کاٹیا
حرم کا دیکھ سینا پھاٹیا دینا اور اپکاری بھی

ننگے پاؤں چلے آئے سو پاواں کو چھلے آئے
اگن دکھیں چلے آئے نکتے دوستداری بھی

کپٹ کینے سیتے پیش آقیامت کچھ نہ اندیشا
اپن ماریا اپے تیشہ تو پایا گرفتاری بھی

یزید دیکھا حسین کا سر بھر آیا پیٹ سوں بھر بھر
سو دیکھو لعنتی کافر، کیا کفر اختیاری بھی

کرو اے دوستاں ماتم ثواب ہے بہت کرنا غم
مدد ہویں گے امام ہر دم کی ہے اُمیدواری بھی

حسین کا دوکھ دل میں آن لگا ایک چپٹ سوں دائم وہاں
کرے قطب عبداللہ سلطان دو کھولوں شہر یاری بھی[1]

---

(۳) مرثیہ لطیف یہ بھی گول کنڈہ کا مرثیہ گو ہے۔ ظفر نامہ بھی اس کی تصنیف ہے جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

---

[1] از بیاض مملوکہ ڈاکٹر محمد غوث صاحب۔

اے اہلِ دل اشک سوں انکھیاں کوں کرو — نکلیا ہے پھر یوما ہے محرم نظر کرو
نازل زمیں پو سر تے ہوا غم حسین کا — ماتم زدیاں کو دتیک طرف تے خبر کرو
پھر تن عود سوز میں غم کی انکار آج — جیوان کون عود ہور دلاں کوں اگر کرو
سلطانِ کربلا کی غریبی کون یاد کر — ٹکرے جگر کوں ہور دلاں کوں خنجر کرو
ہے ڈر اگر تمن کوں قیامت کی دھوپ کا — سایہ کوں اہلِ بیت کے سر کا چھتر کرو
جہاں لگ خوشی دنیا کی ہے سب ناخوشی ہے — ہور اس ناخوشی تے بات میری سن حذر کرو

... ...

بے دین ہو یزید کیا دین میں خلل — لعنت مدام اس کے اوپر سر بسر کرو
گر شہ علی ہے بات میں ثابت قدم تمین — آیات ہور حدیث ہور اسمیں اثر کرو
جکوئی تمنکوں جیو دی پیدا کیا اوّل — دگر چلو پنت نہ آپس کوں نذر کرو
دولت اوپر ابد کی نظر ہے تو دل کوں آج — گنجینۂ محبتِ اثنا عشر کرو

... ...

آلِ عبا کے غم سوں جنم آج صرف کر — محشر کے دلیں ذوق خوشیاں میں اثر کرو
غواص کے زماں کے اچھے لطیف تو — اے عارفاں ہو یاد تمن بو اچر کرو[1]

---

(۷) **مرثیہ کاظم** — کاظم بھی گول کنڈہ کا شاعر ہے۔ صرف مرثیہ گوئی اس کا پیشہ تھا۔ اس کے مرثیے خاص طور پر اس لیے قابلِ لحاظ ہیں کہ ان میں ادبیت اور مرثیہ پن دونوں پائے ہیں۔

تم اپنے دلیراں کی خبر لو علی ولی — بے تاج سروراں کی خبر لو علی ولی
نیزاں اوپر سراں کی خبر لو علی ولی — ظلم و ستم گراں کی خبر لو علی ولی

آرام دل سکینۂ بے تاب کوں نہیں — انکھیاں میں اوسکے راہ دیکھو خواب کوں نہیں
نہیں انتہا یو درد کے اسباب کوں نہیں — غم ہائے بے کراں کی خبر لو علی ولی

---

[1] بیاض کتب خانہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

جن کو سولاتے گود میں رکھتے تھے دوش پر — دریائے خون سر سیں چلا اون کے جوش کر
کیا صبر کر رہے ہیں وہ لب کوں خموش کر — اوس ناز پروراں کی خبر لو علی ولی

ہے سر پہ اون کے تیغ کوہستان کے روش — دل خوں ہوا ہے غم سو بدخشاں کے روش
برسے انجھونیں ستن نیان کے روش — اس پاک جوہراں کی خبر لو علی ولی

گلزار احمدی پہ چلی صرصر خزاں — کانٹوں پہ سوگوار ہو بیٹھے ہیں بُلبلاں
ہر سرو راستی پہ کریں نوحہ قمریاں — بے دل صنوبراں کی خبر لو علی ولی

دریائے خوں میں غرق مجاں ہیں شاہ کے — تا آسماں بگولے اوڑاتے ہیں آہ کے
آتش لگے ہے خرمنِ ہستی میں ماہ کے — اوس خاک بستراں کی خبر لو علی ولی

دنیا منے ہے بس کہ محبّاں او پر ستم — طاقت نہیں ہے ان کا بیاں سب لکھے قلم
فضل و کرم سیں اپنے یو سُن ماجرا اے غم — کاظم سے مضطراں کی خبر لو علی ولی[1]

کیوں یزیداں نے ستم بر سرِ سلطان کیا — اوس رُخِ پاک کتیں خوں سی گل افشان کیا
زلف جمعیت ایماں کو پریشان کیا — دین کوں ہات سیں دے کفر پہ طغیان کیا

... ...

بستر خاک سیں اوس پیکر خونیں کو اوچا — سینہ اپنے سوں لٹا کر سر زانو پہ رکھا
بند سیں بند لگا ٹوٹنے دل کا ہر جا — آہ سینہ سیں نکل چرخ پہ جولان کیا

آہ کر کہنے لگے اپنے جگر کا احوال — کہ جدائی سوں ترے ہے ہدف تیر ملال
تا قیامت تلک اس درد کا وارد ہے محال — لاجرم گریہ و زاری کو میں درمان کیا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

لے چلے مجہ کوں طرف شام کے وہ نامہ سیاہ
صبح امید مری کر کے پریشان و تباہ
کیوں کٹے گی تری فرقت منے مجہ سوں یہ راہ
یو عمل کافر بے دین نے جو شیطان کیا

... ...

لے چلے اوں کوں طرف کوفہ کے واں حسین تا شام
جو کچھ اس رہ منے گذرا ہے جفا اوں پہ تمام
کیا لکھے کاظم غم ناک قلم کا نہیں کام
غیر تسلیم جو کچھ ایزد رحمان کیا[1]

---

(۸) مرثیہ افضل

افضل کا ذکر شعرائے گول کنڈہ میں آچکا ہے "محمد الدین نامہ" اس کی تصنیف ہے۔ یہ مرثیے بھی کہا کرتا تھا نمونہ پیش ہے:۔

حسن کا دلبر و دلدار قاسم　　حسین کا مونس و غم خوار قاسم
کشیدہ رنج و غم بسیار قاسم　　جہاں سوں دیدۂ خونبار قاسم
گیا از بدعت کفار قاسم

... ...

زمیں اس غم سوں ہے درجوش افضل　　فلک گردید نیلی پوش افضل
ملائک سب ہوئے بے ہوش افضل　　کنوں زیں داستاں خاموش افضل
گیا از بدعت کفار قاسم[2]

(۹) مرثیہ شاہی

شاہ قلی خاں شاہی، گول کنڈہ کا نامور مرثیہ گو ہے۔ تاناشاہ کے عہد میں موجود تھا، اس کے مرثیے خاص طور پر حیدر آباد میں مشہور تھے۔ جب عالمگیر نے گول کنڈہ فتح کیا تو اس کے سپاہیوں نے اس کے مرثیے زبانی یاد

---

[1] اردو شہ پارے۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

کر لیے اور اس طرح وہ شمالی ہند میں پہونچ گئے۔ اکثر شمالی تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے؛۔

ہائے غریب یتیم نمائے عابد تری زاری ہے
باپ کا مرنا دکہ بہرنا تس پہ یو بیماری ہے
تیغ کھڑی لے دشمن سر پر داد بلا دکہ بہاری ہے
درد مصیبت عابد تم پر آج کے دن بسیاری ہے

جبرئیل کیتین بتاؤ مجہ کوں نام کیا اُس وادی کا
سنا جب کربل یہی ہے مقتل حسین علی سے ہادی کا
کہا بہشت سے پیام لیا یا عابد تیری دادی کا
کٹھن گھڑی ہو پوتے میرے تجہ پہ سنگ ساری کا

کلثوم زینت اور سکینہ بندی ہو تجہ بندوے سات
سر پدر کا تیرے اوپر کہاتے جاویں مکی لات
کریں محفل سنتے ایسی گہہ نا سکیں دل کی بات
چمکی بجلی گرجے بادل منہ کے رات اندھاری ہے

ٹھنڈے تپ اور تن برہنہ سند ہوں سند سب اکڑے ہیں
ننگے پاؤں پاکر بیڑی طوق گلے میں جکڑے ہیں
بے گنہ نبی کے فرزندین تقصیروں فریادی پکڑے ہیں
بھوکے پیاسے کئی کئی دن کے مدت سے بیداری ہے

... ...

وحدت بیعت اور ولایت یہ ہیں وصی کے مرتبے سب
دوست دوست اور دشمن دشمن ہوئے مومن سب
یا محمدؐ محشر اندر شاہی جب تجہ بخشے رب
تب شفاعت کر یو مجہ پر سب کے وہاں لاچاری ہے[1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۱۸۲

جب تے دھریا امام چرن کربلا منے | تب ستے ہوا ہے غم کوں رہن کربلا منے
افسوس صد ہزار سرو حسین کا | ہو کر رہیا ہے سُرخ بدن کربلا منے
جس روز تے او سور چلیا جگ کوں کر وداع | اس روز تے سو زریں کربلا منے
ہو لالہ زار سریو سارے شہید کے | دستے ہوں لہوں سوں لال چمن کربلا منے
نبہ کا دیپک رگا کر جو شاہی نے دھونڈ کر | پایا ہے بے بہا یورتن کربلا منے

(۱۰) مرثیہ مرزا

گول کنڈہ کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ بیجاپور کے اسی تخلص والے مرزا سے اس کو تعلق نہیں، اس کی جداگانہ شخصیت ہے۔ شمال کے قدیم تذکرہ نویسوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مرزا گول کنڈہ کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کا درباری تھا۔ جب تانا شاہ کو مقید کرلیا گیا تو اس نے فقیری اختیار کرلی اور گوشہ نشین ہوگیا۔ زمانہ مابعد میں ایک عرصہ تک اس کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

اس کے مرثیے مختلف عنوانوں پر ہیں اور کافی طویل ہیں۔ اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ کی بیاض کے علاوہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم[۱] کے کتب خانہ کی بیاض میں اس کے مرثیہ موجود ہیں۔

ان مرثیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اکثر مشکل زمینوں میں مرثیہ لکھا کرتا تھا جو اپنے سوزو گداز کے باعث اعلیٰ درجہ کے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ زبان کے لحاظ سے صاف نہیں ہیں۔ مگر پُر اثر ہیں مرثیوں کا نمونہ پیش ہے :-

زخم تن اوپر جب لگے بے حساب | پڑے سرور اس رن میں جوں آفتاب
اٹھیا شور ہر شئی سوں اس وقت پر | گیا ہانک یو عرش کے تخت پر
دھواں آہ کا اس گگن لگ گیا | سورج غم سوں شعلہ ہو سب جل گیا
نہ کلثوم زینب کوں طاقت رہیا | نہ کچھ شہر بانو کوں راحت رہیا
جتے اہلِ معصوم ہور تھے یتیم | گھڑیا سب اوپر یو جفا ہور عظیم

کہوں دکھ درد اصغر کا اور نور چشم سرور کا | شہ غازی کے جوہر کا کروزاری مسلماناں

---

[۱] بیاض مملوکہ حضرت مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

عزیزاں ہوا پرخوں یوسن اصغر کے ماتم کوں گئے معصوم شہادت سوں کروزاری مسلماناں

حسین اصغر کوں منگائے ان کے تیں تو سلائے بزاں لشکر کنے لائے کروزاری مسلماناں

چھتیاں پہ ہانک تب مارے کہے اے سکینہ دلاں سا کے برائی میں نہ تم ہارے کروزاری مسلماناں

یہی نہ تھا لباس نیلا ہے سب محبّاں کے تن میں غم تھیں

سیاہ پہیرا ہے پتلیوں نے ازل سوں جگ کتے میں ہیں غم تھیں

ہنوز زاری کا حق نہ ہوتا ادا ہمارے گلے سوں بے شک

بساں ندیاں ہو لو ہو کی بہتن اگرچہ سب کے بدن میں غم تھیں

ملا تھا بلبل سوں میں سحرگہ سُنا ہوں احوال گلستاں کا

نہیں ہے کوئی بغیر نرگس دلے ہے گراں چمن میں غم تھیں

خطا کا احوال مشک کہتا ہے جب سوں پہنچی ہے یہ خبر وہاں

ہوا ہے سودا سوں جل کے کالا لو ہو غزال ختن میں غم تھیں

حسین کا احوال عشق کتیں خدا نہ دکھلائے اس دنوں میں

نہیں ڈولے ہے لو ہو میں رد روز لف پڑے شکن میں غم تھیں

یہ مرثیہ بوتراب سنے قبول پاوے تو کچھ عجب نہیں

کہ روح قادر کی زار روے پڑے جو مرزا دکن میں غم تھیں

ہوئی جب تشنگی غالب امام انس و جاں اوپر

خبر یوسن کے پانی کے اپس میں پیچ کھایا ہے

شہیداں کا لو ہو زمین پر پریا جب کربلا میانے

فلک تعظیم سوں شفق کرنے اچایا ہے

ہوا تن تے جدا جب سر شہنشاہ دو عالم کا

گگن سرکات سورج کا شفق کے لہو میں نہایا ہے

الوداع اے الوداع شاہ شہیداں الوداع
الوداع ابنِ علی دوجگ کے سلطاں الوداع
شاہ دو عالم ہوئے مظلوم حیراں الوداع
یو چلے دُنیائے فانی سوں عزیزاں الوداع
یو شفق نیں ہے گگن پر صبح و شام اس درد سوں
نت بھرادیں لہو منے دامن گریباں الوداع

... ...

ہر محرم میں حسین کے درد کے تازے ہزار
دل او پر مرزا کوں ہوتے ہیں یو داغاں الوداع[1]

بیجاپور کے شعراء کے مرثیے بھی اسی زمانہ سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان کی تفصیل درج کی جاتی ہے:-

(۱۱) **مرثیہ نوری** دکن میں اس تخلص کے دو شاعر ہوئے ہیں، ایک تو وہ نوری ہے جس کو گول کنڈہ سے تعلّق تھا اور تانا شاہ کے زمانہ میں موجود تھا۔ دوسرا نوری یہ ہے کہ جس کو بیجاپور سے توسل تھا اور مرثیے کہا کرتا تھا۔

بقول نواب نصیر حسین خاں خیاؔل مرحوم اس نے دہلی کی بھی سیر کی تھی اور ایک زمانہ تھا ابوالفضل اور فیضی کا ساتھ رہا۔[2]

مگر یہ رائے اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی کہ جس مرثیہ کو اس کی جانب منسوب کیا گیا ہے وہ اپنی صفائی کے لحاظ سے اس زمانہ کی پیداوار نہیں بلکہ مابعد کا معلوم ہوتا ہے، نورؔی کا زمانہ ابوالفضل اور فیضی کا ہوتا تو مرثیہ اس قدر صاف ہرگز نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ اس زمانہ اور اس کے مابعد کے کلام سے نورؔی کے کلام کا مقابلہ کیا جائے تو اس کی حقیقت پوری طرح روشن ہوجاتی ہے۔

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا   ولے سب تعصّب دیا ہم مٹا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۸۸ و بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

[2] داستان اُردو از نصیر حسین خاں خیاؔل۔

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا | دہم مرثیے سے بہل کر دیا
شروع میں کیا نظم کل واقعات | دہم تک احوال پورا لکھا
میں جب اسکوں لوگوں کے آگے پڑھا | عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جنّ وانس کرتے تھے سب واہ وا | دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زبان اپنی میں کس نے ایسا لکھا | کبھی اس سے پہلے سنا نے پڑھا

اماماں سے اس کا ملے گا صلہ
کہ ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا[1]

قطب شاہی دَور کے بعد اب بیجا پور کے عادل شاہی دَور کے مرثیے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) مرثیہ مقیمی

مقیمی کا تعارف صفحات گذشتہ میں کرا دیا گیا ہے اس کے مرثیے کا نمونہ پیش ہے:۔

مکھ دیکھا یا چندر گگن سوں نکل | اشک جاری ہوئے نین سوں نکل
خاک جوگی تمن لگا مکھ سوں | خلق پھرتا ہے جو کدھن سوں نکل
بے اثر غم سوں مج نہ کئی دستا | مُردے روتے ہیں کفن سوں نکل
سُن خبر شہ کی ہوش نٹھے یاراں | بے خبر ہو رہے وطن سوں نکل
حیف کیا غل ہوا ہے جنّت میں | حور غلماں پھریں عدن سوں نکل
جب سوں دیکھا چندر محرّم کا | تاب وطاقت گئے بدن سوں نکل

جب مقیمی بیان غم کرتا
آگ جھڑتا ہے سب بدن سوں نکل[2]

---

(۲) مرثیہ علی عادل شاہ

علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی کے چند مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں اس کے علاوہ اس نے

---

[1] داستان اُردو از نصیر حسین خاں خیال

[2] بیاض کتب خانہ سالار جنگ نمبر ۱۰۴۱۔

ایک قصیدہ میں بھی امام حسین کا ماتم کیا ہے۔ قصیدہ کے چند شعر جو امام حسین علیہ السلام کے شجاعت کے متعلق ہیں یہ ہیں :۔

سارے جہاں میں نیں ہوا تج سار کا شمشیر زن
جس پر کیا یک وار توں دو دھڑ برابر ہو پڑے
تج کھرک ہور علم کی تعریف میں کیوں کر سکوں
حق کی عنایت تھے او یک یو دو صفت تج پٹ پڑے

مرثیہ یہ ہے :۔

تجہ فراقوں سور پو دستا اندھارا یا حسین
قرۃ العین نبی کا تھا پیارا یا حسین
فاطمہ رض ہور مرتضیٰ کا تھا جگر گوشا سہی
او مبارک تج بدن سو نور سارا یا حسین
تج شہادت کی مصیبت میں کیا افسوس سوں
صد ہزاراں آہ نالے دل فدا را یا حسین
جب چلیا جنت منے اس جگ سوں تیار ہو کے تو
تج اپر حوراں اپس کیتے نثارا یا حسین
عشق تج دن لگا کرتا اپس ہر دم خدا
ہے ازل سوں تا ابد شاہی تمارا یا حسین

شہ کے غم سوں دل ہے نالاں ہائے ہائے
جگ برستے خوں ابالاں ہائے ہائے
جگ کے سرور دل کے لہو سوں بھر چلے
پھوڑ کر پلکیاں کے بالاں ہائے ہائے
یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا
ہر خزاں میں یو نہالاں ہائے ہائے
کربلا کی سب زمیں رنگیں ہوئی
لہو بھری دلدل کے نالاں ہائے ہائے
ہیں شفق جگ پونچھ کر سنئے ملک
لہو بھری سو اور رومالاں ہائے ہائے
اس رک سوں بھر کے امتی سب تن منے
تب چلیں انکھیاں بلالاں ہائے ہائے
اس رک سوں جوں بستاں بات کون
توڑ کر زلفاں کے بالاں ہائے ہائے
نٹ کریں عادل علی یک دل منے
شہ کا ماتم ماہ و سالاں ہائے ہائے

شہادت کا ذکر کاری فلک ایسا دکھایا ہے
نبی کے خانداں کے جو دیوے تھے سب بجایا ہے

---

[1] بیاض کتب خانہ مولوی صفی الدین مرحوم۔

ہزاراں آہ و نالے کیوں کرے نایو جگت سارا
کہ ویران گلزاراں چمن آتش لگایا ہے

الادیاں کے چھلے ہوکر زمیں کے تن پہ پھوٹے ہیں
انگار آتش الادے کا رگت چکیاں اوڑایا ہے

سنیاسی ہو گگن پھرتا پراو نیل کا لے کر
چندر سورج کی مدری دھر کچر دکھ کا بھرایا ہے

زمیں زاری کرے ساری ندیاں آنسوں چلے کاری
فراق ہونرا دھاری نین بادل رولایا ہے

ستارے شمع داناں کر الادہ سور کا تس پر
ثریا کے قندیلاں بھر چندر ماتم بنایا ہے

سیپی موتی انجھو روتے اگت ہو لعل نت رہتے
فیروزا ماتمی ہوکر اپس کھن میں چھپایا ہے

... ...

حسینؑ ابن علی کا دُکھ بھریا شاہی کے گھٹ میں جب
سینے بھبڑ کے لگا ادل نین آنجھو چوہایا ہے[1]

---

(۳) مرزا اس دَور کا مشہور مرثیہ نگار شاعر مرزاؔ ہے جس نے سوا مرثیہ کے اور کوئی صنفِ سخن پر خیالِ آفرینی نہیں کی۔ حتیٰ کہ بادشاہ نے اپنی مدح لکھنے کی خواہش کی تو اس نے انکار کر دیا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو اس نے ایک مرثیہ میں نام کے بجائے بادشاہ کا نام لکھ دیا۔[2] مرزا کا تذکرہ مؤلف بساتین السلاطین نے کیا ہے اس کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا علی عادل شاہ ثانی کے دَور میں موجود تھا۔ مرزا مرثیہ گوئی کو اپنا مذہبی فرض تصور کرتا تھا اسی انہماک کا نتیجہ تھا کہ اس کو خواب میں بھی اس

---

[1] بیاض اڈنبرا یونیورسٹی۔

[2] بساطین السلاطین صفحہ ۴۳۳۔

کی تلقین ہوتی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا کو ذیل کے مصرع کے لیے دوسرا مصرع موزوں نہیں ہو رہا تھا۔

دلاں پھاکاں اناراں کر رکھو سینہ طبق میانے

اس پر مدہوشی طاری ہوئی اور آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا:۔

نبی آویں گے محشر کوں یو تحفہ کر لے جانا ہے[1]

مرزا کی شہادت یوم عاشورہ ہوئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا تمام رات مرثیہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کے وقت کسی ظالم نے خنجر سے ہلاک کر دیا۔ بیجاپور میں شاہ مرتضیٰ قادری کی درگاہ میں دفن کیا گیا۔ علی عادل شاہ نے حکم دیا تھا کہ شہر کے تمام تازیے اور علم ابراہیم پور کے دروازے سے جو فتح دروازہ سے موسوم تھا، لے جائیں۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ تازیوں اور علموں کے آخر مرزا کا جنازہ بھی دفن کو لے چلے۔ مرزا کے شاگرد مرثیہ پڑھتے ہوئے جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس طرح ایک بڑے مجمع کے ساتھ جنازہ مقام دفن پر پہونچا اور دفن کیا گیا۔[1]

مرزا کے مرثیے دکن میں بہت مشہور تھے۔ حتیٰ کہ عالمگیر کے فوجیوں نے ان کو یاد کر لیا تھا۔ کئی بیاضوں میں مرزا کے مرثیے ہدست ہوئے ہیں۔[2]

مرزا کے مرثیے مختصر بھی ہیں اور طویل بھی۔ دو دو سو شعر کا مرثیہ بھی ہے۔ یہ مرثیے مسدّس بھی ہیں اور غزل نما بھی۔ مرزا کے نوحے اور سلام بھی ملتے ہیں۔ اکثر مرثیوں کو عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ مثلاً قاسم کی شادی، علی اصغر، مرثیہ، قصّہ امام حسین، قصّہ امام قاسم، قصّہ حرّ وغیرہ۔

اگرچہ مرثیوں کو زمانہ مابعد میں لکھنؤ میں جو ترقّی ہوئی وہ صنف مرثیہ کی معراج ہے۔ لیکن مرزا کے مرثیوں کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس نے بھی مجالسِ عزا کو اشکبار کرنے کے لیے اپنے مرثیوں میں مرثیہ پن پر زیادہ زور دینے کے علاوہ شہدائے کربلا کی

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۴۴۳، ۴۴۴۔

[2] بیاض اڈنبرا یونیورسٹی، بیاضات مکتب خانہ سالار جنگ، بیاض سنٹرل لائبریری حیدر آباد۔ اس کے علاوہ ہمارے خاندان کی ایک بیاض (۲۵) مرثیے موجود ہیں۔

شجاعت، بہادری، ہمت اور استقلال، گھوڑوں اور تلواروں کی تعریف، جنگ کا نقشہ وغیرہ امور کی کامیاب واقعہ نگاری کی ہے جو مکالمے کے طرز کے مرثیوں میں موجود ہے۔ مرزا کے مرثیوں کا نمونہ پیش ہے :۔

شریعت اسا سے پہ اتنا ستم   حقیقت شنا سے پہ اتنا ستم
نبیؐ کے نواسے پہ اتنا ستم   سب امت کے آسے پہ اتنا ستم
دیا زہر پانی ملا ظالماں   سو لاگا کلیجے کوں جا کر ندیاں
جگر گوشہ حسنؓ کا پڑا بے گماں   مدینہ کے باسی پہ اتنا ستم
حسینؓ ابن حیدرؓ خدا کا ولی   جگر گوشۂ فاطمہؓ اور علیؓ
بروج دہ دوہ کا ید جلی   شہ کر گھرا سے پہ اتنا ستم
مبارک بدن سوں ہوا سر جدا   اسی غم سوں کہتا ہے مرزا سدا
کیا کیا وہ بدبخت نے اے خدا   شہنشاہ پیاسے پہ اتنا ستم[1]

توں شہیدی تخت بیٹھا ہجلو ہائے شاہ قاسم
بین رسول کے رفت بیٹھنا ہجلو ہائے شاہ قاسم
بی بی کوں سنگار سارے بیبیاں مل تجھے سنوارے
ہو ملول آہ مارے ہجلو ہائے شاہ قاسم
تیل چڑھانے تجکوں مایاں تیراں آہ لے کے آیاں
تیل انجھواں کا مل چڑایاں ہجلو ہائے شاہ قاسم
انجھواں کے موتیاں بچھا کر چوک چاروں کدھن پھرا کر
روتی ہیں حوراں پلا کر ہجلو ہائے شاہ قاسم
شاہ حسینؓ ابن حیدر دیئے تجکوں اپنی دختر
دعا کیے ہاتاں اچا کر ہجلو ہائے شاہ قاسم

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

شاہ حسن کا ہے تو جایا توں نبی کے دل کا مایا
توں حسین کے من کوں بھایا ہجلو ہائے شاہ قاسم

نبیؐ کا توں بنا خاصا توں رسول کا ہے خلاصا
تو خدیجہؓ کا نواسا ہجلو ہائے شاہ قاسم

... ...

منظہر توں کیا سو جلوا مرزا سو جو یوں پلا یا
چندر سور کا دف بجایا ہجلو ہائے شاہ قاسم

کروزاری محباں ہو یود کہ پر دل جلایا ہے
حسینؓ کا غم دو عالم کوں اکت رنجور دلایا ہے

محرم چاند اس غم تے دیکھو کیوں خم ہو آیا ہے
شفق کے لہو میں غطہ کہا گگن میں تن چھپایا ہے

نبیؐ کے آل کی کشتی ہوئی جب غرق اس لہو میں
فلک دیکھو چندر کشتی شفق لہو میں دوڑایا ہے

گگن مندف چندر قندیل جتے تارے داس دیوے
دئے رونق یو سب اس ٹھار کہ شہ کا عرس آیا ہے

... ...

حسینؓ کا درد و غم یاراں ہوا پر ٹھار پر پیارے
گگن اس بھار تی خم ہو زمیں لک سر نو آیا ہے

حسین ابنِ علی صفدر دو جگ کا رہنما سرور
ہوا یوں ظلم ویسے پر غم رولایا ہے

... ...

ملایک عرش و کرسی پر رکھے سر غم کے زانو پر
گگن اس درد سوں رو رو انجو دریا بہایا ہے

چندر سورج انکھیا کھولے فلک حیران ہو دیکھے

کہ غم یوں جب گھر یا شہ پر جہاں کیوں تاب لایا ہے
گگن ہر شب دفن کرتا سورج کوں مار مغرب میں
حسین مظلوم ہو جب سوں زمیں یو سمایا ہے
فرشتاں کے دلاں سارے سدا جلتے ہیں اس غم تے
دھواں ان کے آہاں ... ہے چک پوچھایا ہے
دنیا میں جب بینا مرزا حسین کا درد و غم تب سوں
جگر پر زخم کاری ہے دل سب لہو میں نہایا ہے[1]

مرثیہ مرزا

حسین کے غم سوں یاراں ہو کلیجہ پھٹ گیا سارا
کہ یو ظلمات ماتم کا کیا ہے جگ میں اندکارا
جداں تے یو محرم نے گگن پر آ کیا ٹھارا
نداں تے عرش کرسی کے ملایک سب کیاں نعرا
یو غم ڈونگر جلایا ہے سو پانی کر چلایا ہے
دو عالم تلملایا ہے دو کھوں ہو سخت بے چارا
درو نا غم سوں پھوٹیا ہے سو دل کا عرش ٹوٹیا ہے
اساساں ہو کے چھوٹیا ہے ہماری آہ کا بارا
عجب یو درد حیرانی جو کیس نیئں اسکوں درمانی
ہوا اس غم سوں گل پانی جتا الماس ہور حنارا
عجب یو زہر ہے مشکل جہاں پر حق کیا نازل
یو غم کی آگ اٹھی ہر دل کرے جیوں جال انگارا
ہوئے شہ سوار تازی تب عزا کرنے کو آئے جب
تو ترخیا کافراں کا سب حسین کے دھاک تے زہرا

---

[1] مقالات ہاشمی۔ صفحہ ۲۸۵ از مباحث مولوی صفی الدین مرحوم۔

کہ مرزا سوز سرور کون رکھیا ہے جیو کے جوہر کو،
اچھے گا روز محشر کوں حسین سرور کنے پیار

(۴) **نصرتی** بیجاپور کے مشہور شاعر نصرتی کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس نے شہادت امام حسین علیہ السلام کے متعلق ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس میں بیجاپور کے محرّم اور عاشور خانہ کا تذکرہ بھی ہے۔ چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سرجن ہار کا
افلاک کا اونچا بندیا ہے محل کس بستار کا

منیا کی کسی بام لاجوڑیا ہے ناون کے خنجر
کیتا ہے کامل بدر کوں تابداں انوار کا

اے وائے ظالم کیوں دکھا ایسے جگر گوشہاں کوں تس
جگ جگ جواں پر غضب واجب کیا قہار کا

یو سرو بالا کاٹ کر سب خانداں کے باغ میں
بھوائی لہو کیا شاندیاں طوفاں اچپا احبار کا

تب فاطمہ زاری میں آ بولے جب کوئی ماں نہ ہوئے
اے وائے کن ماتم کرے اس سرو خوش رفتار کا

... ...

یک یک کماں ان ایک ہوئے قوس قزح پیلی ہری
رہے طاقِ کسری پا ہری طاق ان کی سو بار کا

جس فرش بلوریں صفا عینک ہوا ہے چاند کوں
سورج کیا ہے آئینہ میری کی کچ ہموار کا

پر عکس تاریاں کا دسے سب صحن جوں تیلک مریا
خورشید کی پرتوتے ہوئی جو صدا ہے زرتار کا

لہ بیاض کتب خانہ سالار جنگ نمبر۔

چوکر وتس رنگ رس بھریا ہے باغ ایسا جلوہ گر
کرتے ہیں ہوتی رنگین نظر نظارہ جس گلزار کا

... ...

رونق سوں ات کت یوم مجل جگ میں بہشت آئیں ہوا
فرمائے اذن عام شہ پانے کو قبض انظار کا
دیکھیں کوں چھپ ہرجوک نے یوں زہر عالم کا ہوا
یوسف کی کارن وقت تھا جو مصر کی بازار کا
بر بر شدی کی تن اپر سے کسوت ایسے نور کی
سورج کوں جس کے سامنے طاقت نہ تھا چک چار کا

... ...

خواری سوں غم کی کلی نمن عالم گریباں چاک تھا
تھا عندلیباں تے اتک شہ شور نالہ زار کا
رونق اکٹ کا کوٹ کوں یک چاند کر باندیا نکلا
دستہ ہوا تھا کہکشاں مسجد تلک دربار کا
جس بات میں بے لک تے یک سرسے نہ اس شہ کی صفت
کر درد اب اے نصرتیؔ دعوات کی تکرار کا
منیا کی خیم گاہ پر جھلک سورج ڈھائی کفن
یارب تلک عشرت اچھو اس دار ایک دادار کا[1]

(۵) ملک خوشنود | ملک خوشنود کے مرثیہ کا نمونہ یہ ہے:-

ماتم محرم کا انبر بھر جگ منے آیا عجب
دھرتی گگن پاتال میں پھر آگ سلگایا عجب
ٹوٹیا قلم، ترخی زباں، کیوں کر لکھوں غم کے بیاں
خم ہو رہے سات آسماں غم کا بدل چھایا عجب

---

[1] علی نامہ۔

مارے ہیں شہ تج کربلا سوے ہیں دکھ لک لک بلا
مرتا ہے عالم تلملا، گھر گھر سو دکھ ڈھایا عجب

جل جا سورج کالا ہوا تن پہیج کر جالا ہوا
گل گل چندر گالا ہوا مکھ پر کلنگ لایا عجب

روتے ملک جن ہور پری، شہ پر بلا کیونکر کھڑی
ٹکڑے ہوئی سب دھرتری ہے سور کا مایا عجب

سارے محب زاری کرو سمدور نیناں سوں بھرو
باطن سنیاسی ہو پھرو ماتم خبر لیا یا عجب

شہ کا بندا خوشنود ہے دیکھت چرن مقصود ہے
شاہد مرا معبود ہے جن جگ میں پنجایا عجب[1]

---

(۶) ہاشمی

سید میران ہاشمی کا تذکرہ ہو چکا ہے اس کے مرثیہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

دل بند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں
فرزند مصطفےٰ کا تابوت لے چلے ہیں

سلطان دو جہاں کا، سردار اولیا کا
مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

حضرت حسین و حسنؓ کا شاہ زمیں زمن کا
حضرت نبی منگا کر تابوت لے چلے ہیں

حضرتؐ کے تھے نواسے حیدرؓ کے تھے خلاصے
میرے شہید پیاسے تابوت لے چلے ہیں

اے ہاشمی شہاں کا سلطان دو جہاں کا
مقبول اس جواں کا تابوت لے چلے ہیں[2]

قطب شاہی اور عادل شاہی و نظام شاہی اُردو پر تبصرہ

صفحات ماقبل میں بیان ہو چکا کہ ۸۹۵ھ میں احمد نگر پر نظام شاہی اور ۹۱۶ھ میں گول کنڈہ پر قطب شاہی اور ۸۹۵ھ میں

---

[1] بیاض کتب خانہ سالار جنگ۔
[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

بیجا پور پر عادل شاہی پرچم لہرانے لگا اور تقریباً دو سو سال کے بعد یہ علم سرنگوں ہو گئے۔ اس طرح ۱۰۴۳ھ، ۱۰۹۷ھ اور ۱۰۹۸ھ میں احمد نگر و کھرکی، بیجا پور اور گول کنڈہ پر مغلیہ جھنڈا بلند ہو گیا۔

اس عرصہ میں ان سلطنتوں نے علم و ہنر کی ترویج اور تمدّن و تہذیب کے رواج دینے میں جو کچھ سعی کی تھی وہ ہرگز فراموش نہیں ہو سکتی۔ جب ہم ان کے مختصر رقبۂ مملکت کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی شان و شوکت اور دبدبہ و طمطراق کو دیکھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی عظیم الشان دولت و ثروت اور پیش قرار لشکر کس طرح فراہم ہوتا تھا۔ جس طرح ان کی دولت مندی اور ان کے زر و جواہر کی فراوانی بادی النظر میں افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی علم دوستی اور اہلِ کمال کی قدردانی بھی حیرت انگیز ہے۔

احمد نگر، گول کنڈہ اور بیجا پور علم و ہنر کے مرکز تمدّن اور تہذیب کے گہوارے تھے۔ دور دور کے اہلِ علم و فن یہاں کی قدردانی کی شہرہ سُن کر آتے اور اپنی محنت و مشقّت کا کافی صلہ پا کر نہال ہو جاتے تھے۔ یہاں کے چشمہ ہائے فیض کی آبیاری سے چمنستانِ علم و فضل سرسبز و شاداب تھے۔ مے خانہ علم و فن معمور شعر و سخن کی مجلسیں آباد تھیں۔ گھر گھر مشاعروں کے جمگھٹے ہوتے تھے۔ غرضیکہ بیجا پور اور گول کنڈہ کو اگر زمانہ سلف میں قرطبہ اور بغداد سے مماثل سمجھا جاتا تھا تو اب لندن کو اس کے مقابل لا سکتے ہیں۔

عربی و فارسی سے قطع نظر ہم کو دکھنی بہ الفاظ دیگر اُردو کی ترقّی پر ایک تنقیدی نظر ڈالنی ہے۔

یہ امر ہم کو معلوم ہے کہ اُردو کی ابتدا دکن میں ان سلطنتوں کے قیام کے بہت پہلے ہو چکی تھی اور وہ اگرچہ عام بول چال کے دَور سے گذر چکی تھی، اور پھر نثر و نظم کے مدارج بھی طے ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی نثر فقہ و تصوّف کی ایک دو کتابوں تک محدود تھی اور نظم کے بھی ایک آدھ نمونہ کا پتہ چلتا ہے۔ ان سلطنتوں نے اُردو کی سرپرستی فرمائی اور اس کو ترقّی دے کر بار آور اور مثمر کر دیا۔ اس کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر عزّت دی۔ ان خاندانوں کے خود کئی ایک تاجدار اچھے شاعر تھے۔ ان کا کلام آج تک موجود ہے اور اپنے اپنے مصنّفوں کی اعلیٰ قابلیت کا زندہ گواہ ہے۔ سلطان محمّد قلی اور عبداللہ قطب شاہ کے کلیات اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے اُردو کے جواہر پارے قرار دئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح

ابراہیم عادل شاہ کا شہ کار نورس اور علی عادل شاہ کا کلیات اور مثنوی بدیع الجمال درحقیقت کلام الملوک ملوک الکلام کے مصداق ہیں۔

ان حکمرانوں کے دور کے مسلسل اور طویل نظموں کے نسخے موجود ہیں۔ جو صرف کسی اور زبان کے ترجموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ اپچی اور طبع زاد بھی ہیں۔ صنف شاعری کے تعدد اقسام مثلاً مثنوی، قصیدہ، غزل، مخمس، رباعی اور قطعہ میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنی یادگار میں شعر و سخن کے بہتر سے بہتر نمونے چھوڑ گئے ہیں۔

ان کی شاعری میں رزم و بزم۔ واقعہ نگاری، مرقع نگاری، عشق و محبت، تصوف و فلسفہ سب کچھ موجود ہے۔ اسلوب بیان کی جدت، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی ندرت اور سادگی و صفائی۔ تسلسل اور پاکیزگی ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔

گول کنڈہ میں وجہی کی " قطب مشتری " غواصی کی " سیف الملک " ابن نشاطی کی " پھول بن " جنیدی کی " ماہ پیکر " طبعی کی " بہرام و گل اندام " غلام علی کی " پدماوت " اور لطیف کا " ظفر نامہ " شاہ کار ہیں۔ تو بیجاپور میں صنعتی کا قصہ تمیم انصاری رستمی کا " خاور نامہ " نصرتی کی " گلشن عشق اور علی نامہ " ہاشمی کی " یوسف زلیخا " احمد نگر کے شوقی کا " فتح نامہ " نظام شاہ اپنی خوبیوں سے ادب اردو کے جگمگاتے نگیں ہیں۔ اس زمانہ کے قصیدے اپنے شوکت لفظی اور تخیل کی پرواز، واقعہ نگاری وغیرہ کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔

ان سلطنتوں میں مرثیہ گوئی کا بھی آغاز ہوا۔ اس وقت کے مرثیہ اپنے سوز و گداز سے خاص اثر پیدا کرتے تھے۔ اس زمانہ کے مرثیوں سے مجلس عزا میں حقیقی طور پر اشک باری ہوا کرتی تھی۔ ان کا جوہر مرثیہ پن تھا۔ اشرف، غواصی، کاظم، مرزا، شاہی، ہاشمی مرزا (بیجاپور) کے مرثیے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس امر کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ ان سلطنتوں کے قیام کے پہلے اردو نثر کی ایک دو کتابیں مرتب ہو چکی تھیں جو صرف تصوف یا فقہ پر مشتمل تھیں۔ مگر اس دور میں ادبیات کے جواہر بھی مرتب ہونے لگے۔ وجہی کی " سب رس " اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس دور کا

بہترین شاہ کار ہے۔ اس کے علاوہ امین الدین اعلیٰ کے رسائل اور شمائل الاتقیاء وغیرہ کو بھی مثالاً بیان کیا جا سکتا ہے۔

غرض زبان اُردو اور ادب کی جو خدمت ان سلطنتوں نے انجام دی ہے وہ تاریخ اُردو میں آبِ زر سے لکھی جائے گی اور جب تک زبان اُردو کے جاننے والے اس پردۂ عالم پر موجود رہیں گے۔ ان سلطنتوں کے احسان کے منّت پذیر رہیں گے۔

تیسرا دور

۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ

مغلیہ اردو

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مغلوں نے اولاً کھرکی ۱۰۴۳ھ میں اور ۱۰۹۷ھ میں بیجاپور اور ۱۰۹۸ھ میں گول کنڈہ فتح کر کے سلطنتِ مغلیہ میں شامل کر لیے۔ اس طرح نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا اور اب عالمگیر کی جانب سے یہاں صوبہ دار مقرر ہونے لگے۔ احمد نگر و گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں سے شعراء اُردو کے ساتھ بے حد مراعات کی جاتی تھیں۔ انہیں ان کی تصنیفات کا معقول صلہ دیا جاتا تھا۔ نہ صرف سلاطین بلکہ اُمرائے دکن بھی اُردو کی سرپرستی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جایا کرتے تھے۔ لیکن مغلیہ دُور میں اس قسم کی قدردانیوں کے کم ہو جانے کے باوجود قابل افراد بلا کسی صلہ یا قدردانی کی اُمید کے اُردو میں شعروسخن کی داد دینے لگے تھے۔ علاوہ ازیں عالمگیر نے بھی فتح بیجاپور کے بعد دکھنی شاعر کی قدردانی کی تھی۔

اورنگ آباد کو اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۰۶۲ھ میں اپنا صدر مقام قرار دیا تھا، اسی وقت سے اس کی رونق زیادہ ہونے لگی تھی۔ پہلے قطب شاہی پائے تخت گول کنڈہ اور عادل شاہی دارالحکومت بیجاپور شاعری کے مرکز تھے تو اب مغلیہ دور میں اورنگ آباد نے اس کی جگہ لے لی۔ اس طرح اورنگ آباد نہ صرف سلطنتِ مغلیہ کا مستقر ہونے کے لحاظ سے دلی کے امراء، روساء، علماء اور شعراء کا مرکز بن گیا بلکہ گول کنڈہ اور بیجاپور کے باکمالوں کا بھی ملجا ٹھہر

گیا۔ شعروشاعری کا چرچا بڑھا۔ اس طرح اُردو شاعری کے بھی قدم یہاں اچھی طرح جم گئے اور شعرا نے اپنی یادگار میں بہترین کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا۔

ہم یہ بیان کرچکے ہیں کہ ۱۰۹۵ھ میں تقریباً پورا دکن قلمرو مغلیہ میں شامل ہوا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی، دکن بھی اس سے متاثر ہوا، دکن کے صوبہ دار جو مختلف حصوں میں مغلیہ حکومت کی جانب سے مامور تھے۔ تقریباً خود مختار کی سی حالت میں اپنے علاقہ میں حکومت کرنے لگے۔ ارکاٹ، سدھوٹ، سرا وغیرہ کے قلعہ دار اپنے اپنے علاقہ کے حاکم بنے ہوئے تھے۔

مغلیہ حکومت کی جانب سے پورے دکن کی صوبہ داری مختلف اصحاب کو یکے بعد دیگرے ملتی رہی لیکن کسی نے بھی اپنی باضابطہ اور باقاعدہ حکومت کا نقش قائم نہیں کیا۔ بالآخر ۱۱۳۶ھ میں نواب قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے شکر کھیرہ کی لڑائی میں فتح یاب ہوکر سلطنت آصفیہ کی بنیاد ڈالی۔

اس ۲۷ سالہ مدت میں اُردو کے کئی ایک شعرا مشہور ہوئے جن کی مثنویاں دیوان اور مرثیے آج تک موجود ہیں۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد کے علاوہ برہان پور بھی شعراء کا مرکز بن گیا تھا۔ یہاں کے بیسیوں شعرا کا کلام محفوظ ہے۔

اس دَور کے جن شعرا سے ہم واقف ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

شمار	نام شاعر	تصانیف	سنہ تصانیف
۱	ولی	کلیات	مابعد ۱۱۰۰ھ
۲	محمود بحری	من لگن، بھنگ نامہ	"
۳	ضعیفی	ہدایت نامہ، عشق صادق	"
		کفن چور، نصیحت بدن	"
۴	تراب	قصہ ملاّ	"
۵	علادل	ابلیس نامہ	"
۶	حسین	قصہ شمعون	"
۷	مظفر	قصہ مہر وماہ	"
۸	ذوقی	وصال العاشقین، غوث نامہ،	"

		منصور نامہ، وفات نامہ، ماں باپ نامہ	مابعد سنہ ۱۱۰۰ھ
۹	مجرمی	گلشن حسن و دل	سنہ ۱۱۰۴ھ
۱۰	بلبل	چندر بدن	〃
۱۱	راجی	نامہ علی	سنہ ۱۱۱۰ھ
۱۲	دریا	وفات نامہ	سنہ ۱۱۱۱ھ
۱۳	عبدالمحمد ترین	شمائل النبی	〃
۱۴	وجدی	پنچھی باچھا (۱۱۳۱ھ)، تحفہ عاشقاں، مخزن عشق	سنہ ۱۱۴۴ھ
۱۵	محبوب عالم	مرثیہ، مثنوی درد نامہ	
۱۶	فتح	زلیخا ثانی، پند نامہ لقمان	سنہ ۱۱۳۰ھ
۱۷	عاشق	اشارت الغافلین	
۱۸	اشرف	جنگ نامہ حیدرؓ	سنہ ۱۱۲۵ھ
۱۹	ولی دیلوری	روضۃ الشہدا، روضۃ العقبیٰ	سنہ ۱۱۳۰ھ
		روضۃ الانوار، دعائے فاطمہؓ	
		مثنوی رتن پدم	
۲۰	عشرتی	دیپک پتنگ، چت لگن	
		رینہ درپن	
۲۱	روحی	مرثیہ	
۲۲	محمد بن رضا	ترجمہ قصیدہ	
۲۳	محمد حیدر	اضافہ پھول بن	
۲۴	بیچارہ		
۲۵	طالب		
۲۶	فراقی	مرأت الحشر	
۲۷	تیم احمد	مرثیہ	
۲۸	ندیم	مرثیہ	
۲۹	شاہ طاہر	خوان لغیا اور کنز النفائس	

۳۰	شاہ عبدالرحمٰن	باغ حسینی	۱۱۴۱ھ
۳۱	عبدالجلیل	مرثیہ	
۳۲	ذاکر	مرثیہ	

اب ان شعراء کے حالات اور نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے :-

(۱) ولیؔ

سب سے پہلے ہم اس دور کے سب سے بڑے شاعر کا تذکرہ کرتے ہیں، جس کو ایک زمانہ تک اُردو شاعری کا بابا آدم تسلیم کیا جاتا تھا۔

مہاراشٹر کے چند ادیب ولیؔ کو گجرات کا شاعر قرار دیتے ہیں، مگر ہم کو اس سے اتفاق نہیں ہے، کیونکہ ولیؔ کے ہم عصر اور دوست شاہ ابوالمعالی کے فرزند کا جو قلمی دیوان انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس میں انہوں نے ولیؔ کو دکھنی شاعر تسلیم کیا ہے اور گجرات کو دکھن میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ولیؔ کا صحیح نام ولی محمدؐ تھا۔ دکن کے رہنے والے تھے۔ پیدائش کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہے۔ تحصیلِ علم گجرات میں کیا اور ایک مدت تک وہاں اقامت اختیار کی۔ نہ صرف علوم ظاہری کا اکتساب کیا بلکہ حضرت شاہ وجیہہ الدین گجراتی سے فیض باطنی بھی پایا۔

پہلی مرتبہ عالمگیر کے زمانہ میں دہلی گئے اور اپنی شاعری کے باعث مشہور ہوئے وہاں کے شعراء نے ان کی پیروی کی[۵۱] اور فارسی کو خیر باد کہہ کر اُردو میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

دوسری مرتبہ پھر محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی کا سفر کیا۔ شاہ ابوالمعالی بھی ساتھ رہے دیوان بھی ساتھ تھا۔

ولیؔ کے انتقال کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ۱۱۵۵ھ میں انتقال ہوا اور بعض ۱۱۴۳ھ صحیح خیال کرتے ہیں۔ مگر اب مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیقات سے ۱۱۱۹ھ صحیح قرار دیا گیا ہے[۵۲]

اگرچہ یہ امر صحیح ہے کہ ولیؔ اُردو کا پہلا شاعر تھا۔ مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ شمالی ہند

---

۵۰ یورپ میں دکھنی مخطوطات

۵۱ دہلی میں اُردو شاعری مؤلفہ ڈاکٹر سیّد محی الدین۔

۵۲ رسالہ اُردو صفحہ ۴۹۴۔

میں ولی۔ کے بعد ہی اُردو شاعری کا عام طور سے آغاز ہوا اور پھر اب تک جو شاعری دکن میں مروّج تھی اس کی بھی اصلاح ہوئی۔ مثنوی کے بجائے غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ اس لحاظ سے ولی کے سر مجدّدی کا سہرا ضرور باندھا جا سکتا ہے۔

ولی کی قابلیت کے متعلق بعض اصحاب اعتراض کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی عربی اور فارسی معلومات بہت ہی محدود تھیں، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ولی کی حیثیت مجدّد کی سی ہے، اس نے عربی اور فارسی کے جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کو گویا اُردو میں اسی حیثیت میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ ولی ایک فطرتی شاعر تھا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اپنی شاعری کو عربی اور فارسی لفظیات کی کتاب یا لغت بنا دے۔

ولی کا دیوان مشہور ہے اور متعدد مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ یورپ میں بھی ایک مرتبہ طبع ہوا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے ولی کا کلیات نہایت اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ مگر اب بھی قلمی دیوانوں میں ایسا کلام موجود ہے جو اس کلیات میں نہیں ہے

ولی کے زمانہ میں تصوّف کے خیالات عام ہو رہے تھے اور خود ولی نے صوفیانہ مسلک اختیار کر لیا تھا۔ اس لیے اس کا کلام سرا پا تصوّف ہے۔ اس کے کلام میں سلاست اور متانت پائی جاتی ہے۔ اس کا دیوان اس عہد کی بولتی تصویر ہے۔ لطف زبان، سادگی، صفائی اس کلام کے خاص جوہر ہیں۔

بعض اصحاب "دہ مجلس" کو ولی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اس کے متعلق ہم نے "یورپ[1] میں دکھنی مخطوطات" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

ذیل میں ولی کی مسلسل اور غیر مسلسل نظموں کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

مثنوی

عجب شہراں میں ہے پُر نور ایک شہر	بلاشک وہ ہے جگ میں مقصد دہر
رہے مشہور اس کا نام سورت	کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہ نور	اچھوں اس نور سوں ہر چشم بد دُور
شہر جیو منتخب دیوان ہے سب	ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب

---

[1] صفحہ ۴۹۴۔

سرج سن آب اس کی جگ میں کانپا ‌ ‌ ‌ ‌ سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا
کنارے اس کے ایک دریائے تپتی ‌ ‌ ‌ ‌ کہ دُنیا دیکھنے کوں اس کے پٹتی
کیا سب تن خجالت سوں یہ جیوں غرق ‌ ‌ ‌ ‌ ہوا دریا اپس کے عرق میں غرق
شہر سوں ہے وہ ہم بازو ہمیشہ ‌ ‌ ‌ ‌ دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ
کہ آبِ خضر کی ہے اس میں تاثیر ‌ ‌ ‌ ‌ ہوا دیتی ہے اس کی یادِ کشمیر
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم ‌ ‌ ‌ ‌ صبح ہور شام جب کرتا ہے عالم
عجب قلعہ ہے وہاں اک باقرینہ ‌ ‌ ‌ ‌ انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ

ہر ایک رنگ میں جو دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ
ہوا ہے غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

جہاں کے گل بدناں جلوہ گر ہوئے ہیں جہاں
اُڑا ہے ان کی تجلّی سوں عاشقاں کا رنگ

یہ عاشقاں کے جلانے کوں مستعد ہیں مدام
گوا ہے اس کے اپر نورِ شمع وحالِ پتنگ

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل
درائے خونِ جگر نہیں دسا مجھے گل رنگ

دسا نہیں جو گل بے وفا میں رنگِ وفا
تو یو نچہ شور میں ہیں بلبلانِ خوش آہنگ

فلک کے دیکھ کے خشکی جگت ہوا بے دم
رہا نہیں ہے خوارے کے دل میں آب اُمنگ

... ...

جگت کے دیکھ کے حالات لاعلاجی سوں
ہوئے ہیں گوشہ نشیں اہلِ دانش و فرہنگ

ہو دستگیر مجھے یا علی ولی اللہ
کہ اس فلک نے کیا ہے کمال مجکوں تنگ

غزل

اہلِ گلشن پر ترے قد نے جب امداد کیا — اولاً سرکوں غلامی ستے آزاد کیا
اس کی تعظیم ہوئی اہلِ چمن پر لازم — بلبلِ باغ نے جب مصحفِ گل یاد کیا
روزِ ایجاد تری چشم سوں اے نورِ نظر — حُسن کے فرد پہ دیوان ازل صاد کیا
سب سوں ممتاز ہوا سلسلۂ معنیٰ میں — دلِ دیوانے کوں جب عشق نے ارشاد کیا
سینۂ بلبل و قمری کوں کیا محشرِ درد — جب کہ اس سرو نے سیرِ گل و شمشاد کیا
آج تجہ یاد آئے دلبرِ شیریں حرکات — آہ کون دل کے اوپر تیشۂ فرہاد کیا

اے ولی جب سوں کیا عشق تحصیلِ جنو
روحِ مجنوں نے اپس کا مجھے اُستاد کیا

صاف دل کو اگر مدام رکھو — جامِ جمشید کا مقام رکھو
گر تمیں تابِ انتقام نہیں — بے سمجھ مت کسی سے کام رکھو
خیال کی مت کرو طرف داری — خاطرِ زلف مشک فام رکھو

ناز سے سرکشی کون دیکھوں گا
آج میرا نیاز نام رکھو

ماہیٔ دل شکار کرنے کوں — کھول زلفا سجن نے جال کیا
غیر دشنام نہیں سینا ہے ولی — جب سجن پاس عرضِ حال کیا

موسیٰ اگر جو دیکھے تجہ نور کا تماشا — اسکوں بہار ہووے کوہ طور کا تماشا
اے رشکِ باغِ جنّت تجہ پر نظر کیے سوں — رضواں ہووے دوزخ پھر حور کا تماشا
روزِ سیاہ اس کے مو مو سوں جلوہ گر ہے — تجہ زلف میں جو دیکھا دیجور کا تماشا
ہے جس کی یادگاری وہ جلوہ گر ہے ہر دم — چینی میں دیکھ جا کر فغفور کا تماشا
وہ سربلند عالم از بس ہے مجھ نظر میں — جیوں آسماں عیاں ہے مجہ دور کا تماشا

تجھ عشق میں ولی کے انجھوں اُمنڈ چلے ہیں
اے بحرِ حسن آ دیکھ اس پور کا تماشا

مہربانی و لطف دلبر یا | سا بقا تھا سو اب نہیں دستا
یا مگر خواب وہ زمانہ تھا | کہ مجھے خواب میں نہیں دستا

مرثیہ کا نمونہ :-

غوغا ہوا جہاں میں شہ کے وصال کا | سینے منے پڑا ہے چھالا اس ملال کا
محتاج ہیں جہاں کے محباں تمام مل | دیدار چاہتے ہیں مبارک جمال کا

... ...

جو کوئی کرے زباں سوں اونو کا ورد مدام | ہے یہ ولی خلاصہ جواب و سوال کا

اے ہادی سینسار تو کیوں جا بسایا کربلا | اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے نور چشم مصطفےٰ افرزند نوشاہ مرتضیٰ | اے دلبر خیر النساء تو کیوں جا بسایا کربلا

... ...

تو دوستاں کا جان ہے ترا ذکر ایمان ہے | تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا[1]

(۲) محمود بحری

قاضی محمود بحری کے والد کا نام بحرالدین تھا۔ اسی لیے قاضی صاحب نے اپنا تخلص بحری رکھا تھا، بحرالدین قاضی دریا کے لقب سے موسوم تھے، آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے۔

بقول بعض قاضی صاحب اہل نائطہ سے تھے اور آپ کے خاندان میں قضائت کا سلسلہ کئی پشت سے چلا آتا ہے۔ کرناٹک آپ کا وطن تھا، چنانچہ گوگی کو جو ضلع گلبرگہ کا ایک قصبہ ہے آپ کا وطن بیان کرتے ہیں۔ آپ کے والد ماجد یعنی قاضی بحرالدین جو قاضی دریا کہلاتے تھے۔ مقام دمناسری (علاقہ مدراس) سے گوگی آئے تھے اور پھر بیجاپور جاکر شاہ برہان الدین جانم کے کسی خلیفہ کے مرید ہوئے۔ قاضی محمود کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ہوئی۔ بعض اصحاب نے ۱۰۴۰ھ کے قریب ان کی ولادت قرار دی ہے[2] مگر ان

---

[1] ولی کی مثنوی اور قصیدہ کلیات ولی میں شامل ہے۔ غزلیں مولوی جلیل اللہ صاحب کے دیوان سے لی گئی ہیں جو اب تک غیر مطبوعہ ہیں اور رباعی یورپ میں دکھنی مخطوطات سے لی گئی ہیں۔

[2] من لگن مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی صفحہ ۱۸، ۲۱ و ۲۳۔

کی عمر سو سال بیان کی جاتی ہے۔ اس لیے ۱۰۳۰ھ میں ان کی ولادت قرار دی جا سکتی ہے۔
بقول بعض، بحری شاہ باقر بیجاپور کے مرید تھے۔ مرشد نے خلافت بھی دی تھی بحری صاحبِ شریعت اور طریقت تھے۔ قاضی بھی تھے اور صوفی بھی مگر معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال تک رند مشرب رہے کیونکہ خود کہتے ہیں:۔

چالیس برس بھی تھی مستی — یو عشق ہوا شاہداں پرستی

انہوں نے اپنے چچا میر صغیر اللہ کی (جو اپنے وقت کے جاگیردار اور صاحبِ دولت شخص تھے) صاحبزادی سے بیاہ کیا تھا۔[1]
جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے قاضی محمود بحری شاہ باقر عرف منجن بحری کے مرید تھے جو قادریہ کے طریقہ کے بزرگ تھے ان کے علاوہ انہوں نے اپنے باپ سے بھی خلافت حاصل کی تھی۔ یہ سلسلہ چشتیہ تھا۔ اس طرح قاضی محمود دو طریقوں میں منسلک تھے۔[2]
بیجاپور کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ تحائف کے علاوہ جاگیر بھی مرحمت فرمائی تھی۔ عالمگیر کے فتح بیجاپور کے چند سال پہلے بیجاپور سے حیدرآباد روانہ ہوئے پھر اپنے وطن گوگی آکر گوشہ نشین ہو گئے۔ عالمگیر سے یہیں ملاقات ہوئی۔ کہتے ہیں لوگوں نے عالمگیر کو یہ باور کرا دیا تھا کہ بحری بھنگ پیتے ہیں۔ عالمگیر ان کے پاس حاضر ہوا تو انہوں نے قصداً بھنگ کا پیالہ منگوایا۔ عالمگیر نے اس کو دیکھا کہ وہ دراصل دودھ ہو گیا ہے۔ انہوں نے عالمگیر کی مدح بھی کی ہے۔[3]
بحری کا انتقال ۱۱۳۰ھ میں ہوا۔ قطعہ تاریخ کا آخری شعر ہے۔

گوش کردم ندائے رحلت او — داخل مجلسِ رسول اللہ[4]

اپنے مرشد کی درگاہ گوگی میں دفن کیے گئے۔ کہتے ہیں کہ ان کی عمر سو سال کی ہوئی تھی۔ شاعری میں اپنے مرشد شاہ باقر سے بھی تلمذ حاصل کیا۔ ان کی تصانیف کا بڑا ذخیرہ

---

[1] من لگن مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی صفحہ ۱۸، ۲۱، ۲۳۔
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
[3] مقدمہ من لگن مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی۔ صفحہ ۲۳
[4] عروس عرفان مخطوطہ۔

راستہ میں چوروں نے لوٹ لیا۔[1] جس میں مال و متاع کے ساتھ تمام کلام میں جو دکھنی اور فارسی پر مشتمل تھا۔ پچاس ہزار شعر تھے تلف ہو گئے۔ اس وقت جو کلام ہمدست ہوا ہے اس میں ایک تو کلیات ہے جس کو ڈاکٹر حفیظ سید نے شائع کر دیا ہے۔ دوسری تصنیف من لگن ہے۔ اس کو سخاوت مرزا صاحب نے مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کیا ہے۔ دوسری مثنوی بھنگ نامہ ہے یہ ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے۔[2]

من لگن کی تصنیف ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۵ء) میں ہوئی ہے من لگن اور بحری کے دوسرے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ غزل کے شعر یہ ہیں:۔

چال کر آئی چنچل اس چال ہور چھپ کوں سلام
پٹ پٹاتے لب ہور اس کے مطلب کوں سلام

صورت چند بدن کی بس آرسی منے　　　سو دیکھ لب کہے کہ کسی آرسی منے

زلف اندھیارے میں رخ چوں بجلی　　　یک سو کیا یک پل میں لک لک گئے
باس ترے پر کی دھن کیا پک رکھن　　　بل مدینے ہور مکے لگ مکے

عشق کا قول دے بسارا اے دوست　　　دل کی دہلی کوں جیو جمنا کن

کچھ بھی لے جانا تو ہے پن ہم نگوڑے کیا لے جائیں
او تے لیائے تو لے جائے اپس سنگات کچھ

نہ چونکا چار کر پو جوں سہن تجھ مکھ کی لالی کوں
ہوا ترکی تمن ہندی جو مار یا پرتگالی کوں

---

[1] کلیات بحری مرتبہ ڈاکٹر حفیظ سید۔ مطبوعہ صفحہ ۵۲۔
[2] اس مثنوی کے مخطوطات ادارہ ادبیات اردو اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ نمبر ۴۸۔

دھن دندگر کرے تو کہو کس سوں بولنا
مین دوستی دھرے تو کہو کس سوں بولنا

پیتا ہے مل شراب رقیباں سوں رات دن
گر محتسب دھرے تو کہو کس سوں بولنا

یک دو گھڑی جو کوب کیا کچھ عجب نہیں
سب عمر یوں سرے تو کہو کس سوں بولنا

ہے شکر صد ہزار جو چک سوں چلیا ہے نیر
لہو کی لگے جھڑی تو کہو کس سوں بولنا

اس عشق کی دکان میں بحری اپس کے دکھ
انصاف سوں ہرے تو کہو کس سوں بولنا[1]

مثنوی کا نمونہ :۔

جن مطلق عاشق حق
جن عاشق حق مطلق

جن سر بھریا سمدور
جن نور نگر معمور

جن انی انا کے راز
بے خودی میں دیوے ساز

جب کچھ بیان پر آوے
تو تفسیراں دب جاوے

لیا بھرے ذرے میں یہاں
ہور نکے میں قرآں

اور گنکچی ماسا تولہ
کر دکھلاوے یک گولا

تھا اوّل کیوں اب کیوں
او محمد عربی کیوں

او کوں خلیفہ خاص
ہے حق سوں حق اخلاص

وہ کون اسے رہزن
جو پھیرائے سب کا من

کے ویسے اسے یو پٹ
کے پکڑے اس سوں ہٹ

یو دونوں کس جاگے کے
یو موتی کس تاگے کے

او کتے انساں
اس روح کا کیا نشاں

او سب ہور واحد کیا
اور عارف ہور شاہد کیا

یو دونوں کیوں مٹ جانا
نور اس کے اگل پانا

او کیوں النگنا نور
او ذات کیوں ظہور

او سیوٹ فرار کیا ہے
او نقطہ نگار کیا ہے

سب کھول دکھایا ظاہر
سو شیخ محمد باقر[2]

---

[1][2] کلیات بحری مرتبہ حفیظ سید۔

من لگن کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

حضرت کھے میں کیا فقیری ‏ جب فقر کیا یو دستگیری
میری بی عمرات سو برس ہے ‏ دو چار کم ایک سو برس ہے
اس عمر کوں فقر کے کیا پیش ‏ درویش کیا منجھ ایک درویش
حاصل ہوئے حق کے فضل سنگات ‏ سو سال کے فقر میں یو دریات
سو کیا کہ یوان جو اگل آیا ‏ کپڑا بی جو آپ ہو چل آیا
خوش حال یو کھائیا اور اوڑیا ‏ دل اور طرف نہ مکھ مڑوڑیا
یعنی نہ کیا کیا تو برباد ‏ کنکیاں کے اپر پلاؤں یاد
کھادی کے اپر نہ صاف سیلا ‏ یوں دوست ہوا یو دل ہٹیلا
اے یار یو دو تو چور ہے اے ‏ یو چور تو او گھنور ہے اے
اس دو سوں بہت سنبال اپسے ‏ اس دو کے نہ بس میں ڈال اپسے
جھٹکے تو بھلا یو پیٹ یو پیٹ ‏ کرگیاں کی نیٹ پر رہے نیٹ
نا دل کرے ٹوک ٹوک جوں گل ‏ کرتار اپر کرے توکل
نا دوست نہ یار آشنا پر ‏ ہے رزق تر اترے خدا پر
ہونا ہے جو دوست دھرم کا ہو ‏ ہونا جو شریک شرم کا ہو
ہونا تو عزیز بس ہے عرفان ‏ جس بیچ تے یو سگل گلستان[1]

مرثیہ بحری | قاضی محمود بحری کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔ ان کا مرثیہ درج ہے :-

جب شاہ کے وجود مبارک پر غم ہوا ‏ تب سب جہاں کے حرف خوشی کا عدم ہوا
رخ گلرخاں کے غم منے جوں زعفراں ہے زرد ‏ تھا قد الف کن سواد جنوں دال خم ہوا
گلزار گلستاں بنے غم تے ہو چاک چاک ‏ روتا ہے ہر شجر نہ کہ شبنم تے غم ہوا
دل جل کے راکھ کیوں نہ ہوا چھن کے بن منے ‏ جنوں کہ چنار غم کی اگن کا اگم ہوا
غم تاب لیا نہ آپ میں غرقاب نوحیاں ‏ ہور قوم لوط غم تے زمیں میں ہضم ہوا

---

[1] من لگن۔ مطبوعہ صفحہ ۳۳۔

ہریک الم بغیر ملم نہیں ہے یو عجب
غم کے الم کوں پھرتے یہی غم ملم ہوا

بن کر کہہ ہر بشر کوں نہ پانی نہ کھانا ہے
پانی سو تیر نین کا ہور قوت دم ہوا

کروبیاں ملک پہ بتاروے آہ مار
تسنا سیاں کو جل میں یو غم دم بدم ہوا

پیغمبراں میں جنوں کہ محمد سوں ختم ہے
یوں غازیاں شہ کی عزا ہوں ختم ہوا

جیکوئی دل میں شاہ کے غم کا نہال لائے
او دل یقیں کہ حشر کوں باغ ارم ہوا

بحری مدام شاہ کے ماتم ہیں یو گلے
جوں چاند آسماں پہ گل گل کے کم ہوا

یوں محرم کچھ آج کام کیا
سواد کیا چک سہ سک حرام کیا

سو کے پردو کہہ کوں کیا سردار
گنج کو رنج کا غلام کیا

ویندار ان کے دل کے مزرع بدل
شاہ کے دکھ کوں جنوں کہ دام کیا

جاج ہور جیو کون کیا ہمدم
درد ہور دل کوں ہم کلام کیا

دوکھ والان چرخ رگ کھینچا
سو کہر کا صبح مار شام کیا

مے کون محنت کے راکھنے کون جتن
کل محباں کے جیو جام کیا

پی شہادت کے سخت پیالے کوں
اپنا دو جہاں میں نام کیا[1]

(۳) ضعیفیؔ

ضعیفیؔ بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ شیخ داؤد ان کا نام تھا۔ قطب شاہی کے بعد ان کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

ضعیفی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ ان کی قابلیت کی بیّن دلیل خود ان کی تصانیف ہیں۔ تین مثنویوں کا پتہ چلتا ہے یعنی ہدایت نامہ، عشق صادق اور نصیحت بدن۔[2][3]

عشقِ صادق میں ایک فرضی قصہ لکھا گیا ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۰۱ھ یا اس کے مابعد تصنیف

---

[1] کلیات بحری

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۳۳۱۔

[3] ہدایت نامہ فقہ ہندی سے بھی موسوم ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں کئی نسخے ہیں۔ نصیحت بدن بھی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

ہوئی ہے۔

اس مثنوی میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال کیے گئے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کی گفتگو جہاں آئی ہے وہاں اسی سے کام لیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عورتوں کی زبان مردوں سے جُدا تھی۔ مثنوی سے مصنف کی اعلیٰ قابلیت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اس طرح سے ذکر کیا ہے کہ ان پر باوجود جھوٹ ہونے کے اصلیت کا شبہ ہوتا ہے۔[1]

ہدایت نامہ سنہ ۱۱۱۱ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں فقہ حنفی کے مذہبی عقائد اور قوانین معجزات وغیرہ بیان کیے ہیں۔ کتاب کو پچیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) ہدایت نامہ :-

کہی ایک روز پیغمبر راہ پر — کیے تھے جو اطراف کتن گذر
سو دیکھے یہودی کوں آتا ہے — مگر ایک ہرن کوں لاتا ہے
یکایک ہرن نے زبان کھول کر — نبی سات وہ رمز وا بول کر
کہی یوں کہ اے خاص خیر البشر — میرا بند چھوڑ آنکہ اے بول کر
تمیں لگ میرے واسطے ہو زباں — زباں ہو منجے تک دلاؤ اماں
کہ جاؤں اپنے بچوں پاس میں — کروں دور دل کا سو وسواس میں

اورنگ زیب کی مدح اس طرح کرتا ہے :-

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب — کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب
شہنشاہ عادل رہے در اُمور — کہ بدعت ضلالت ہوا جس تے دور
دیا حق تعالےٰ نے یوں جس کو جس — جو دشمن ہوا اس انگے خوار و خس
دھریا سر پو جو بن شی کا دو تاج — ولی ہور دکھن کا ہوا ایک راج
عجب فتح و نصرت ہے اس کے سنگات — جو کوئی نہیں کیا اس سوں دعویٰ کی بات
کہ شاہاں بھی اوّل ہوئے ہیں تو کیا — نہ کوئی زہد و تقویٰ میں ایسا ویسا
رہے اس منے یہی ولی کی صفات — کہ ہو آئے جو موں سوں کا آئے سو بات
بڑا دین اسلام کا کارساز — الٰہی توں کر عمر اس کی دراز

---

[1] انڈیا آفس میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

غرض اس زمانے منے شاہ کے — مسائل کیا دین کی راہ کے
جو تاریخ ہجرت ہزار ایک سو بیچ — ہدایت ہندی ہوا ہو تو بیچ
اگہار اسو اس میں بھرے تھے تمام — اسی بیچ تمت کا دیکھا تمام
صدی بارویں کا لگیا تھا برس — اسی بیچ با جایو دکھنی جرس

مسائل یو فقہاں کے اسناد سوں — بکائے کیا پڑکہ استاد سوں
کہ اگر زباں ہند کی اس طرف — لگے خوش جو پڑتے ہیں دکھنی حرف
اس واسطے ہدیہ یہ یو ہند کوں — جو لیا یا دکھن سال کے سند سوں
ہدایات ہندی لکہ اس کا ناؤں — رکھیا ہور لیا ہوں ہندیاں کے ٹھاؤں

(۲) عشقِ صادق کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

نبیؐ کی محبت کا سوگند تجے — دیکھا بہار برتے تمنے موں منجے
تجے سوگند نبی کی سو دیدار کا — دیکھا دید تیرا منج یکبار کا
اگر توں نبی کا جو دھرتی ہے چار — تو دکھلا تیرے موں کوں برقہ تے کار
دکھائی تو سمجھوں گا تج کوں کھری — محبت سچا توں نبی پہ دھری

جو یوں لعل شعلہ ہوا او تنور — بزاں نار کوں دیں بلا یا حضور
بولا او تنور دیکھلا کہ اس — کھیا جا بہتر اس تنور کے توں گھوس
تجے سیئوں نبی کی سو ہے پیار کا — تجے سیئوں نبی کی سو دیدار کا
... ... — ... ...
تو تو ہوئی تیرا محبت سچا — دگر نیں تو تیرا عقیدہ کچا

دم اس نار کا جب کیا چھور تن — سو دئے غسل کر اس کی تن کوں کفن
سو کر دیں نماز اس جنازے اپر — لجا کر اتارے قبر کے بہتر
بڑے مرتبہ سات اس نار کوں — دفن کو نبی آئے پیار سوں [1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۳۳۳۔

ضعیفی کی ایک اور مثنوی "قصۂ کفن چور" ہے، اس مثنوی کو اس نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ مثنوی میں ایک داستان لکھی گئی ہے کہ ایک چور، جو کفن کی چوری کرتا تھا، ایک مرتبہ حسب عادت چوری کے لیے قبر کھودی تو مُردہ زندہ ہوگیا اور کفن چور نے چوری سے توبہ کی۔ اس مثنوی کے چند شعر حسبِ ذیل ہیں، اس مثنوی کا ایک نسخہ نواب سالارِ جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

الٰہی ہیں ہمیں عاصی گنہ گار	جو پکڑے ہیں تری رحمت کا ادھار
بڑا کچھ آسرا تیرے کرم کا	پکڑ امید دھر تیرے رحم کا

نمونہ قصہ کفن چور:-

حیا ہور شرم کا تھا لاج اسکوں	جتی تعریف کوں تو ساج اسکوں
جمال و حسن میں کامل و سب تھی	ولے کوئی حیات اس کی عجب تھی
اتھی او پارسا دنیا میں پوری	ولیکن موت نیں کیتی صبوری
سوا ایسے گل بدن نازک تن کوں	لیجایا موت میں حب الوطن کوں
بزان سب اس کے غم میں ہو چور	ملے سب رنج میں راحت دئی دور
عزیزان اس لے سب دلگیر ہوکر	خوشی یکبارگی سب دلتے دھوکر
بزاں ناچار ہوا اس گل بدن سکوں	غسل دے کر ملائے تن کفن کوں

....

گیا اس صالحہ کی گورکن او	قبر کوں کھول کر کاڑیا کفن او
کفن بی کاڑا اس گل رُخ اپرتے	نچھا اس مکھ کوں دیکھا جوں نظرتے
وہیں خناس آدل میں بھی اس کے	کہا تجھ کیا ضرر ہے ولے تھے کس کے

یہاں ہے کون جو دیکھے تیرے تیں
یو ایسا داؤ بھی تجہ نا ملے گیں[1]

(۴) تراب تراب تخلص، تراب الدین شاہ تراب علی نام تھا۔ شاہ امین الدین بیجا پوری کے مرید تھے۔ صوفی بزرگ تھے۔ شاعری میں بھی غالباً

---

[1] قصۂ کفن چور مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

شاہ امین الدین سے تلمذ تھا۔ ان کی مثنوی "قصہ ملا" ہے۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے، مثنوی میں ایک داستان نظم کی گئی ہے، جس میں عشق حقیقی کا انجام بتایا گیا ہے۔

تراب کے تفصیلی حالات ہمدست نہیں ہوئے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

مجھے حسن ستمگر کی قسم ہے | مجھے اس زلفِ دلبر کی قسم ہے
چرن پر اس کی جاں قرباں کرونگا | سو اس قدِ صنوبر کی قسم ہے
کروں گا عاشقی میں کچھ تفاوت | اوسی پا پوش زر کی قسم ہے
کروں گا پرتوے خورشید تاریک | سراپا ماہِ انور کی قسم ہے

تراب ہم رنگ غلامی حیدری ہے
مجھے نعلین حیدر کی قسم ہے

مثنوی کا نمونہ :۔ "قصہ ملا"

قلم وصف صنم کا جب اوچایا | لگن کا جگ منے جب غل مچایا
اور ایسا سحر گر جادو نہی ہے | کہ جس سحر کا جگ یک چمن ہے

حکایت مجکوں یک ملّا کی ہے یاد | ہوئیں گے عاشقاں او سے سنکر شاد
تراب اب کر رقم رنگیں بیاں یو | سنے جو خلق سارا داستاں او
انا اس داستاں کہتا ہوں یاراں | ہوئیگا سب جہاں سن اشک باراں
دیوانہ کو سیانہ کر دیکھایا | سیانے کو دیوانہ کر دیکھایا

... ...

کہاں لگ اس پری رو کو سراؤں | دلِ عاشق سرا کو کینوں جلاؤں
گیا تھا نوکری کوں اس کا خاوند | یکیلی گھر میں تھی دلدار دلبند
ہوئے کئی دن جو کوئی شاہ پھر نہ آیا | خبر بھی خیریت کی کوئی نہ لایا
پڑی اس فکر میں او گلبدن نار | کیئں مارا گیا سبھی اوپے مار
کہی تب دائی کو۔ جو اون بلا کے | بولا ملّا کو دائی جلد جا کے

... ...

دیکھا اوپری رو جہاں کتی ہے — غرور حسن میں جیوں مدمتی ہے
ہوئی یک بار دو چک چار دونو — رہی حیرت سوں ہولا چار دونو
یکایک دیکھ دیوانہ ہوا تب — لگیا کہنے کوں بولو کیا لکھوں اب[1]

---

(۵) علاادل یہ بھی اسی دور کا شاعر ہے، اس کے حالات کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ علاؤالدین ان کا نام تھا ان کی ایک مثنوی "ابلیس نامہ" ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ جو ۱۱۱۳ھ میں تصنیف ہوئی ہے مثنوی میں ابلیس کا قصہ یعنی فرشتوں کو تعلیم دیا کرنا، آدم کو سجدہ نہ کرنا اور نافرمانی کی بدولت مردود قرار دینے کا حال نظم کیا گیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ثنا نت خدا کو سزاوار ہے — نرادھاریاں کا اودھار ہے
محمدؐ کوں سرور کیا فام سوں — ہیں پشتو پناہ خاص ہور عام کوں
انس ابنِ مالک روایت کیے — سنے جوں رسول تے حکایت کیے

تاریخ تصنیف، عربی سے ترجمہ کرنا اور مصنّف کا تخلّص

عربی اتھا یو ہوا فارسی — نظر تل پریا مجکوں جیوں آرسی
ہوس مجھ کوں یو پیدا ہوا — تبوفیق حق تے ہویدا ہوا
ہوا تب نظم یو دکھنی سال میں — جیوں انندیا موتی دسیں تھال میں
اگیارویں صدی پر برس تیرواں — چلیا تھا ہجرت ہوا بعد ازاں
ماہے ذالحجہ تھی بست وایک — ہوا ہے قصہ یو عجب نیک دیک

کیا یو علاادل فقیر داستاں
چلی کوئی سینے پر رہے داستاں

---

(۶) حسینؔ ایک اور شاعر حسینؔ تخلص اس دور میں ہوا ہے، اس کے حالات پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کی ایک مثنوی ہمدست ہوئی ہے جو ۱۱۳۵ھ

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

میں تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی کا نام 'قصہ شمعون' ہے۔ اس میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے فرزند کا نام شمعون قرار دے کر داستان لکھی گئی ہے، اس مثنوی کا ایک نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مصنف نے اس کو عربی سے دکھنی میں ترجمہ کیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

ثنا صفت سب تس سزاوار ہے — یو سب اوس کی قدرت کا گلزار ہے
کیا کاف اور نون سو کل ظہور — اپس معرفت کا بھرا اوس میں نور

یو قصہ تھا اوّل عربی زباں — کہے تھے محمدؐ حدیث و بیاں
کیا نظم دکھنی زباں سوں اوسے — ہووے قصہ معلوم کر سب کسے
ثواب و اجر کا یہ قصہ ہے گنج — ہزار ایک سو بیت پر سی و پنج
اتھا اس عدد پر نبیؐ کا وصال — ہوا یہ مرتب اوسی سنہ و سال

الٰہی یو افتعاں ہے عاجر حسین — دے تجھ لطف اور خاص دو جگ میں حسین

قریشی تھا ایک مرد مکہ کے ٹھاؤں — جو خالد اتھا بن ولید اس کا ناؤں
اتھے سات بیٹیاں نہ تھا اوس کو پوت — او محتاج تھا ہویں فرزند ثبوت
اتھے تین سو ساٹ تس گھر میں دیو — او کرتا تھا پوجا سکل مکر دیو
حضوری میں دیواں کی ہر رات دن — کرے ساٹ بکرے تصدق او تن
اونن سو کرے طلب فرزند او — عقیدہ سوں دیوا نتے دل بند او
ہوا مہرباں اوس پو جب کردگار — ہوئی حمل خاص خالد کی نار
دیکھت سب فرشتے فلک کے پکار — کہے توں ہمارا ہے پروردگار
یو کیا نور نازل فلک سے کیا — یہی کافر کے گھر پر شرف تو دیا
جو کچھ پوجتا ہوں کہار تے میں — تہیں بوجھ سکتے نہیں اوسکے تیں
بندہ ایک چیتا ہوں پیدا کروں — میں کس گھر بہتر تے ہویدا کروں

اہلِ بیت کو او نفع دینے ہار　　　مددگار اچھے او محمدؐ کا یارؓ

(۷) **مظفر** اسی دور کا ایک شاعر مظفرؔ بھی ہے، بعض دوسرے شعراء کی طرح ہم اس کے حال سے ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ صاحب کے خیال میں کہ یہ مظفر سلطان ابوالحسن تاناشاہ کا وزیر ہو سکتا ہے، مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال مظفر شاعر اسی دَور سے تعلق رکھتا ہے، اس کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس نے اپنے مُرشد کا نام سیّد شاہ ایوب ظاہر کیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ مظفر ایک صوفی شاعر تھا۔

اس کی مثنوی " مہرو ماہ " ہے جس کو ظفر نامہ عشق سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔ عالمگیر کی مدح میں لکھتا ہے:۔

خدا کے جو خاصاں میں خاصہ ہے او　　　رسولِ خداؐ کا خلاصہ ہے او
سوا دکن جو شاہ اورنگ زیب　　　کیا فکر کوں دور اس کا نہیب
دھریں لطف سوں اس پو آلِ رسول　　　اچھے شاخ پر سائیاں جیوں کہ پھول
رہے اس کے سایہ میں خلق خدا　　　دل و جاں سو کرتے دعا و ثنا
معلّم ہوا ک علم کا با عمل　　　کیا ہے سبھی علم مشکل کوں حل
ہے معلوم علمِ حقائق اوسے　　　ہے مکشوف رمز و حقائق اوسے

میرا باپ جنات کا ہے بادشاہ　　　بڑا مہرباں بے کساں کا پناہ
جہاں شاہ شاہاں ہیں ہے اوس کو نام　　　اجنیاں کے شاہاں تمام اوس کے رام
نہ تھا پوت اس کوں سو دل گیر تھا　　　کلیجا گل اس غم سوں جوں تیر تھا
عبادت کیا حق کی دن رات بہوت　　　کیا بانٹ حق کی خیرات بہوت
کیا مہر چودہل پوتے دیکھ کر　　　او ہووے کس کا ہے سادا لبسر
عیاں حسن اس کا جو ہے بے نظیر　　　میرے من ماریا ہے غمزے کے تیر
اری نیک اختر توں بیگی سوں جا　　　بولا کر اسے میرے نزدیک لا
پری چہرہ آ مہر کوں کیے سلام　　　او عورت ہے کرنیں سکیا مہر خام

لہ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

دیکھا نیک اختر اوسے وقت نواب — اندھارے میں سنپریا ہوکر آفتاب
اوٹھیا نیند میں تے ہوکر کہا بر آ — دیکھا مہر کوں تیں سو بستر پلو آ
ویساں نیں پلنگ کے اوپر مہر سو — ہوا مطلق کہا بُرا عقل کہو
دھاں سوں نکل کر چمن در چمن — لگیا ڈھونڈنے مہر کوں چو کدن

اپی دھو کو یک نہر میں دست رو — تناول کیا میوۂ مشک بو
چڑیا خنگ پر بھی ہوکر دل اُداس — دیکیا پھر کو میدان کے آس پاس
او میدان کے باغ کے گرد بہار — اتھاہ کوہ بھی اٹیک پر کاردار
اتھا کوہ اونچا تیا بے حساب — گینے جا کر تارے جھرے جھوں شہاب
سپنر اوس پہر بیچہ بادی بہار — نہیں باٹ پایا ہے جانے کو بہار

مظفر کی غزل کے چند شعر :۔

اے بے وفا کھینچا سدا آزاد توں وسریاں بدل
روتا پھریا سارا جہاں ہوزاری توں وعمریاں بدل

سنک رباطن سو کیا تجہ بدل مجھ کہر منے
بازار میں ظاہر ہوا سنک رتوں وسریاں بدل

سر پھوڑ لیتے تو میرے کلیجہ میں سٹے ہت لوک یوں
پہتیا کلیجہ میں طوفاں کا جیوں ہار توں وسریاں بدل

اس مثنوی کے نسخے حیدر آباد میں موجود ہیں[2]

---

(۸) ذوقی

سید شاہ حسین ذوقی بھی ایک مذہبی آدمی تھے۔ ان کے مرشد شاہ محمد خان نے ان کو بحر العرفان کا خطاب دیا تھا۔ شعر و شاعری میں ان کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔ اپنی شاعری پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ خود کو نصرتی سے بلند پایہ اور اپنی فصاحت و بلاغت

---

[1] رسالہ اُردو۔

[2] کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ آصفیہ اور ادارہ ادبیات میں اس مثنوی کے مخطوطات موجود ہیں۔

کے لحاظ سے حسّانِ ہند تصوّر کرتے ہیں۔

انہوں نے متعدد مثنویاں تصنیف کی ہیں جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں۔ وصال العاشقین غوث نامہ، وفات نامہ، منصور نامہ، ماں باپ نامہ، ان مثنویوں کے علاوہ غزلیں اور مرثیے بھی ذوقی کی یادگار ہیں۔ غوث نامہ یورپ[1] میں موجود ہے۔ بعض مثنویاں انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ میں ہیں[2]۔

ذوقی کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے اور ان کو اپنے فن میں اُستادانہ مہارت حاصل تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

غوث نامہ

بقا ابن بطو کہے ایک روز
تھے منبر پلو او سرور نیک روز

تجلّی کیا ان کے دل پر خدا
ہوئے اوس تجلّی میں خود سوں جدا

کری اوں کو بے خود تجلّی رب
لگی بہویں پو کرنے نہ لا تاب تب

رسولِ خدا ہات پکڑ ان کے تیئں
رکھے ثابت اوس وقت میز پلو ویں

تجلّی مناسب بنیاں کی تھی او
نہ رہی اس سبب نشہ میں طاقت کی بو

میسّر نہیں کسوں کوں یو حال
اگرچہ مراتب میں پاوے کمال

بناں حق جلالی تجلّی کیا
چڑی کے نمن شاہ لاغر ہوا

گھٹا جسم کاشہ کا ہوئے ناتواں
جمالی تجلّی کیا بعد ازاں

بڑیا شیخ کا جسم اوستے تیا
کہ ہونے ہول دیکھیں سوں اوس کی صدا

مرثیے

اے شمع بزمِ مرتضیٰ گھر آج آتے کیوں نہیں
تاریک ہے کم بن جہاں جلوا دکھاتے کیوں نہیں

وہ جاہل دوزخ وطن آئے ہیں بادل کے نمن
جوں برق تیغ صف شکن شہ جگمگاتے کیوں نہیں

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۳۴۴۔

[2] رسالہ اُردو۔

وہ شمع بزم مصطفےٰ بادا جل سوں گل ہوا
سب سوزِ دل سوں تن سدا یاراں گلاتے کیوں نہیں
چھوڑو سگل دنیا کے کام دس دن تلک اے خاص و عام
ماتم کے آتش میں مدام تن کو جلاتے کیوں نہیں

سنتے ہو تم اے مومناں شہ کی شہادت کا بیاں
سب خاک و خوں کے درمیاں تن کو ملاتے کیوں نہیں
ذوقی تمارا ہے غلام فضل و کرم سے یا امام
اپنی زیارت کو مدام اس کو بلاتے کیوں نہیں

شاہ ماتم تخت گردوں پر رو سا ماہ محن
فوجِ غم نے ملکِ دل ویراں کیے ہیں چو کدھن

... ...

تب ہزاروں درد و غم سوں شہر بانو نے کہا
مجہ کوں کس کوں سونپ کر جاتے ہو اے سرورِ تمن
تم نہاں اے جانِ جاناں کیوں کرد میں زندگی
تم نہاں کس کوں کہوں میں یہ اپس کا دکھ کٹھن

تم نہاں ہر روز مجہ سینے منے یک سال ہے
تم نہاں ہر رات غم سوں مجہ اوپر ہے یک قرن
تم کون روتے سوں نہیں کرتا منع اے غم گسار
مو پریشاں مت کرو اور پارہ پارہ پیرہن

... ...

گرچہ اے ذوقی ترے بے حد گناہاں ہیں ولے
شکر اللہ ہیں شفیع روزِ محشر پنج تن[1]

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۳۲۴ و ۳۷۶۔

(۹) مجرمی

شاہ بر اللہ نام اور مجرمی تخلص تھا۔ بیجا پور کے باشندے تھے۔ ان کی ایک مثنوی جو "گلشنِ حسن و دل" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۱۱۱ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں وجہی کے قصہ "سب رس" کو نظم کا لباس پہنایا گیا ہے۔ مثنوی ہماری نظر سے نہیں گذری، کلام کا نمونہ جو رسالہ اُردو میں شائع ہوا تھا، پیش کیا جاتا ہے :۔

زباں ہور نظر دونوں مل یار ہو — چلے ہیں تماشے کو اک ٹھار ہو
چلے جب تماشے کو مل کے ملوک — تو دیکھے تمیز کو کرتے سلوک
سلوک سوں ہر ایک ملک کا لے خبر — تو واقف ہو پھرتے تھے کرتے نظر

---

(۱۰) بلبل

اس دور کا ایک شاعر بلبل تخلص ہے۔ ہم کو اس کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثنوی چندر بدن ...... کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں محفوظ[1] ہے۔ یہ مثنوی مقیمی کی مثنوی سے ضخیم ہے اس میں بھی وہی قصہ نظم کیا گیا ہے جس میں مقیمی نے دکھنی میں نظم کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیجا پور میں مقیمی کی دکھنی تصنیف کے بعد آتشی نے جو اس زمانہ میں بیجا پور میں تھا اور فارسی شاعری کے لحاظ سے مشہور تھا۔ اسی واقعہ کو فارسی مثنوی میں قلم بند کیا اور زمانہ مابعد میں بلبل نے اس کا ترجمہ دکھنی نظم میں کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے حسبِ بیان یہ مثنوی ۱۱۰۰ھ کے قبل تصنیف ہوئی ہے۔ نمونہ کلام حسبِ ذیل ہے :۔

بنامِ نقش بند نقش ایجاد — کیا قدرت کے نقشے کا دو بنیاد
بندا نقشہ زمین و آسماں کا — بہارِ گلشن و جانِ جہاں کا

قدم پر جا کیا آدابِ سجدہ — بجا لایا او سر سین دابِ سجدہ
جنوں بے تاب ہو محلِ دعا میں — نیازِ عرض کیتا مدعا میں
تو نہیں سلطاں خوباں شہ پری ہے — بصورت تجہ دیوانہ مجہ کری ہے
چھرائی مجکو پرے جا نماں سوں — کری تاراج مجکوں دل و جاں کوں

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات نمبر ۱۸۔

نثار تجھ قدم اب نیم جاں ہے | یہی ہے آرزو فرماں رواں ہے
اے سرمیز نثار خاک راہ ہے | دلِ پُرخوں شدا جلوہ گاہ ہے
تری اے زلف مشکیں گرہ گیر | ہوئے ہیں دام دل زنّار و زنجیر
ترے بت کا صفا بت خانہ دل ہے | ترے مہتاب کا دیوانہ دل ہے
دیا سب آگ میں سامان طاقت | فغاں ہے دل اُپر شور قیامت
قبولے میں نمازِ بے نیازی | کرے فاسق سوں ظاہر بے نیازی

توں بلبل خاص گلزارِ سخن ہے | سخن تیرا چمن اندر چمن ہے

ہوا بلبل اوپر اس تے ضرورت | دکھانا فرس کی ہندی میں صورت

وہ سُن بہرِ مبارک باد آواز | کہا بلبل او چوں پروانہ پرواز[1]

---

(۱۱) راجی اسی دور کے ایک شاعر شاہ عبدالعلی ہیں جن کا تخلص راجی تھا۔ ان کے متعلق بھی تفصیلی حالات کی ہمیں کوئی اطلاع نہیں ہے۔ انہوں نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں "نامہ علی" کے نام سے ایک مثنوی قلمبند کی ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کا ایک معجزہ بیان کیا گیا ہے جو واقعات اس میں لکھے گئے ہیں۔ وہ ایک داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صداقت سے اس کو تعلق نہیں ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود[2] ہے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

کہ ایک دن محمدؐ علیہ السّلام | جو بیٹھے تھے اصحاب یاراں تمام
ابا بکرؓ ہور عمرؓ عثمان تھے | علی مرتضیٰ شاہ مردان تھے
دس نکوں بیٹھے تھے آس پاس | شفاعت کا شربت پیئے عام خاص

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو۔

[2] تذکرہ اُردو مخطوطات نمبر (۲۳)

محمدؐ کہے یا امام علیؓ ترے حق پہ اُتریا ہے نادِ علیؓ
کہ تو پیر پیران کا خوب پیر ہے کہ تو میر میران کا توں میر ہے
کہ ظاہر و باطن تجھے ہے عیاں کہ طٰہٰ و یا سین ہے بیاں
کفر توڑنے کا تجھے جس دیا کہ شیر مرداں علی ہے امام ہدا
علیؓ کوں ولایت عنایت اتھا عجائب علم بے نہایت اتھا
علیؓ نے کہے اے محمد رسولؐ رضا دے مجھ میں کروں گا وصول

---

(۱۲) **دریا** یہ بھی اس دور کا شاعر ہے۔ حالات نامعلوم ہیں۔ "وفات نامہ" ان کی تصنیف ہے۔ ساڑھے تین سو سے زیادہ شعر ہیں۔ ۱۱۱۱ھ میں یہ مثنوی تصنیف ہوئی ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو میں اس کے تین نسخے اور جامعہ عثمانیہ میں ایک نسخہ موجود ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی نسخہ ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے سے

بنا اوّل کروں حمد خدا میں زباں او پہ آپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت
کہوں صلوٰۃ کہہ کر بعد زاں میں بنی جو نقل کیتی سو یہاں میں
عربی فارسی سوں ہے بیاں یو کب تک امیاں ..... بیاں یو
ہر یک دکھنی زباں سو پر کو بوجے نہ رہے محتاج کسوں اب سوجے

عمرؓ کہے بیس، عثمان کہے منجے تیس علی کہے منجلوں مارو گنکو چالیس
کہیا او مرو ساریاں کوں نکو کار تمیں ہمیشہ رہو ساری الپس سٹار
امام دو جہاں ہر دو برادر کہے اسی مرد سوں یوں التجا کر

---

(۱۳) **عبدالمحمد ترین** عبدالمحمد ترین نے گیارھویں صدی کے اوئل میں ایک مثنوی شمائل النبی کے عنوان پر لکھی ہے۔ شاعر کے متعلق کوئی معلومات

لہ تذکرہ اُردو مخطوطات ا نمبر: ۱، ۱۱۹۰، ۱۲۰۔

نہیں ہیں۔ مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ پشتو زبان سے اس کو دکھنی میں نظم کیا گیا ہے۔ اس مثنوی میں آنحضرت صلعم کے سراپا اور اخلاق و عادات کو نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے۔ اس مثنوی کے نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے

الہی سچا توں ہے پروردگار　　دونو جگ میں قدرت ترا آشکار
سچا توں ہے قادر سچا توں حکیم　　سچا توں ہے صانع سچا توں رحیم

کیا قصد عبدالمحمدؐ ترین　　شمائل نبی کا کہوں بہترین
اخوند رویزانی جو پشتو منے　　کیا ہے سو منگتا ہوں میں بولنے
شمائل نبی کا منگوں بولنے　　کریما کرم کر زباں کھولنے
قریب الفہم نظم دکھنی اچھے　　ہر ایک کس کا دل اس کو سکنے اچھے

محمدؐ کے اس سر مبارک اوپر　　اتھے بال کیتے رکھو یاد کر
اتھے لاک بارا او تیرا ہزار　　دیگر تیں صو تیں اندر شمار
وخوش شکل مرغوب ہور سبز تر　　رکھی تھے نبیؐ کے سو سر کے اوپر

---

(۱۴) وجدی

اس دور کا ایک باکمال شاعر وجدی ہے، ان کا نام وجیہہ الدین اور تخلص وجدی تھا۔ اگرچہ صوفی منش شاعر تھے۔ مگر بالکلیہ صاحب عرفان نہیں تھے۔ وہ دنیا کی رنگینیوں اور رومانی زندگی سے واقف تھے۔ وجدی ایک خوش حال، خوش فکر اور فارغ البال شاعر تھے۔ ان کی شاعری سے اس زمانہ کے تمدن اور تہذیب، رسم و رواج پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے کسی کی تعریف اور مدح میں اپنا زور قلم صرف نہیں کیا۔ حکمت ان کا پیشہ تھا۔

ان کی تین مثنویاں مشہور ہیں۔ پنچھی باچھا، تحفہ عاشقاں اور مخزن عشق، پنچھی باچھا شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا ترجمہ ہے۔ اس کو ۱۲۱۱ھ میں وجدی نے دکھنی نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس مثنوی کے ۳۶۵۰ شعر ہیں۔ وجدی نے شیخ عطار کی مثنوی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ بہت کچھ کمی و بیشی اور ترمیم کردی ہے، اس کو آزاد ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔

وجدی کی دوسری مثنوی تحفۂ عاشقاں، عطار کی گل وہرمز کا ترجمہ ہے، یہ بھی لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ وجدی نے اس کو پھیلا دیا ہے اور بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے، اس کی تصنیف ۱۱۵۳ھ میں ہوئی ہے۔ تیسری مثنوی "مخزن عشق" ہے اس کا دوسرا نام "باغ جانفزا" ہے اور ۱۱۴۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ وجدی کی اونچی مثنوی ہے۔ کسی کا ترجمہ نہیں ہے۔ مثنوی 'پنچھی باچھا' طبع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے متعدد کتب[1] خانوں میں پائے جاتے ہیں" تحفۂ عاشقاں[2]" اور "باغ جانفزا" (مخزن عشق[3]) کے نسخے نایاب ہیں۔

محمدّ بن عمر صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) نے وجدی پر ریسرچ کر کے اپنے ایم۔ اے کا مقالہ قلم بند کیا ہے جس سے ان مثنویوں کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اب یہ شائع ہوگیا ہے۔

وجدی کی مثنویوں کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس نے سیرت نگاری، مرقع نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کے مثنویوں کے کردار واضح ہیں۔ مرقع نگاری میں لڑائی کا منظر باغ کا سماں، بزم کے واقعات کامیابی سے قلم بند کیے ہیں۔ وجدی کا اسلوب بیان بھی قابلِ قدر ہے۔ ان کا طرز بیان، حسنِ ترتیب، سادگی، تشبیہات، مکالمے لائقِ تحسین ہیں۔ فنّی نقطۂ نظر سے ان کو پوری کامیابی ہوئی ہے۔ بیان کا تسلسل کافی اچھا ہے۔ وجدی نے اپنے کلام میں اس زمانہ کے رسم اور رواج، تمدّن اور تہذیب پر جو روشنی ڈالی ہے، یہ اس لیے قابلِ داد ہے کہ اور کسی شاعر نے ان چیزوں کو بیان نہیں کیا ہے۔

وجدی کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

۱۔ پنچھی باچھا:۔

واہ واہ اے ہُدہُد ہادی راہ	ہے تجھے معلوم سب وادی کی راہ
ہے سبا کے شہر پر تیرا گذر	کیا سلیماں کو دیا تو خوش خبر

---

[1] ہمارے خاندان میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں اور یورپ میں بھی موجود ہیں۔

[2] اس کا نسخہ آقا حیدر حسن کے پاس ہے۔

[3] جامعہ عثمانیہ میں موجود ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں تین مثنویاں موجود ہیں۔ نیز کتب خانہ سالار جنگ میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

تا تجھے ہے تاجداری سازدار — جب سلیماں کا تو ج ہوا رازدار
کرانیکے دیوکون بیگی سوں بند — بعدازاں کرنت سلیماں سوں انند
بند کرنا نہیں جد کا اس دیوکوں — کب سلیماں کو ملے گا جاکے توں

جب اُٹھاتا ہے وہ سیمرغ نقاب — تب چمکتا منہ ہے مثلِ آفتاب
ڈالتا ہے سایہ اپنا خاک پر — پھر کے اس سایہ پر کرتا ہے نظر
بس جناور اس جہاں کے سربسر — سایہ سیمرغ ہیں سُن بے خبر
جب معمّا تجھ سے سمجھا جائے گا — نسبت اس حضرت سے اپنی پائے گا
گر نہ ہوتا جنگ میں سیمرغ الیقلاں — تو نہ ہوتا سایہ اور نام ونشاں

جب تلک تجھ کو منی ہے اور غرور — تو حقیقت سے بڑا ہے دُور دور
طبع میں تیرے غروری ہے اگر — موکو تیرا ہے فرعوں دستگر
جب تلک باقی ہے تیرے میں منی — آفتوں سے تجکو نہیں ہے ایمنی

ہندواں میں کوئی راجہ تھا گنبھیر — کیں ہوا محمود سلطاں کا اسیر
لے کے آئے جیوں اسے محمود پاس — دین سوں کیتے نبی کے روشناس
جب ہوا اسلام سوں او آشنا — دل دوعالم سوں کیا اپنے جُدا
ایکلا جا بیس گوشے کی مجھار — رات دن رونے لگیا جب زارزار
کچھ نہ تھا کام اسکوں غیر از سوز و آہ — روز اس کا رات سوں بدتر سیاہ
سوز وزاری جب گئے حد سوں گزر — ہوئی بزاں محمود سلطاں کو خبر
بس بولا راجا کوں شاہ نامدار — مہربانی سوں کہا توں کیوں ہے زار
میں تجے دیونگا تیا کچھ ملک و مال — جی توں یک ساعت میں ہوجائے نہال
بس لگیا کہنے کوں راجا شاہ سوں — میں روتا نئیں جو ملک ومال سوں
سوز وزاری ہے منجے اسکے سبب — جی قیامت میں کہے گا یو منجے رب
اے میرے بدعہد بندے بے وفا — کسو ٹلیا کہتا ہے توں ایسا جفا

... ...

شرمساری ہے منجے اس بات کی — سوز دن کا ہور زاری رات کی
تو بھی اے درویش دل رشی یہ آ — راہِ انصاف و وفا در پیش لیا

۲۔ تحفہ عاشقاں :۔

کروں پاک دل ہور زباں پاک سوں — ثنا پاک اس عاشق پاک سوں
کہ جس سے ہوا ہے وہ گم عشق کا — اجوں لگ اُبلتا ہے خم عشق کا
پڑیا عکس اس نور کا جس رخن — جھلکنے لگا آرسی کے نمن
الٰہی بحقِ محمدؐ رسولؐ — میرے رنج کو محنت کوں کر توں قبول

سو اس رنج سوں گل رُخ بے گناہ — لگی دل میں کرنیکوں افسوس آہ
کہ اے چرخ یو کیا ہے مجھ پر ستم — کہ ایک دن گزرتا نہیں بے الم
جنم درد ہور وک سوں رونے گیا — سوا دل کے داغاں سوں دھونے گیا
نہ ماباپ کے گھر بے نکہ سوں رہی — نہ خرم کبھی یار کے مک سوں رہی
نہ دلبر میرے ہات نا. بر میں دل — سو لیو جیو رہے دو طرف سوں خجل
اچھوں کیں نہیں اس دکھی دل کو چین — نہ دل غم سوں خالی نہ انجواں سوں نین

وہیں شاہ گل رُخ کوں چھاتی لگا — دل سے سوں بولیا کہ اے دلربا
جو قسمت میں گردش اتھی چند روز — تو دیکھے ہمیں اس رضا رنج سوز
اتا اول سوں اپنے سگل وکھ بسار — کہ توں ووچ دلبر ہے میں ووچ یار
وہی تو نچ گل ہے میں بلبل وہی — ازل کے ہمیں بلبل و گل سہی
بزاں ایک ایک سکے رنج و سفر — کہے کھول مل پس بایک دگر
رہے ایک ایک سکے مشتاق ہو — ملو بوجیّ ہر کوں ملے جو کہ دو

۳۔ مخزنِ عشق (باغ جانفزا)

پکڑ دل میں فراقِ یار کا غم — کیا قرشاخ طوبا کے نمن خم
جہنم کے صفت سوز جگر سوں — نکالے آہ سوں دل کے دھویں یوں
کری کب شمع سوں مل ہم زباں سے — کبھی پروانہ سوں لب راز جانے

کہ اے روشن دلاں کی انجمن ساز
پری رویاں کی مجلس میں سرافراز
جلن سوں عمر کے تیری درازی
مجھے بھی جلن سوز سرفرازی
اگن سوں کام ہم دونوں کے حاصل
یو سب رونق اگن کے باج باطل
کہوں کیا میں تجے اے شمع سرباز
کہ توں آئی ہے میری محرم راز
مجھے بھی آپڑیا ہے سر تے سودا
اگر سر جائے تو میں مجکو پردا

تصوّر جب کرے دو لعل سے گال
کرے گالاں کوں اپنے لہو منے لال
کروں جیوں یاد اوسکی زلف ابتر
پریشاں ہور ہے جیو میں سراسر
جو چیت میں لیا و چاہ زنخداں
پڑے غوطہ منے حسرت کے حیراں
جب اوسکے ہجر کا دوکھ یاد آوے
تین سوں پورا انجھواں کے بہاوے
لذّت ملنے کی یاد آئے چیت میں
کرے قرباں اپسکوں اوسکے بت میں
غرض اس دہات نت رہے غم
نہ یکدم اوس کے غم سوں جیوں اچھے کم

نہ کچھ مجھے بادشاہی کی ہے درکار
نہ کچھ اس ملک کا میں ہوں خریدار
نہ کچھ دھن مال کی دھرتا ہوں لالچ
نہ تیرے باج ہوتا مجکو ہے کچھ
سباں کرتا ہوں اس کوں بادشاہ بیان
نکو میلا کرا اپنے دل کوں اے جان

وجدی کی غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

چنچل کا آج بچھرا مجھ اُپر بھاری ہوا یاراں
تونیں اس دو جگت سیتیں نرآدھاری ہوا یاراں

ہماری بُت پرستی کوں نہیں سمجھے اجھوں زاہد
برائے کفر ست دیں کو تو جاری ہوا یاراں

نکو کہہ وجدیا اپنا یاں نپٹ وصل کیا باناں
کہتے ہیں لوگ سب تجہ کوں کہ زناری ہوا یاراں

کٹی ہے عمر سب میری سدا صورت پرستی میں
سنیا ہے جس کا مد مجھ سو ہشیاری تھے مستی میں
نکل جاو بدیا شیخی کے شویاں کی جھنجھ سیتے
اگر مقصود خود حاصل کیا ہے بُت پرستی میں

تل دیکھ کر سکھی کا یک تل میں بھل گیا ہوں
اس حسن کا سو مد پی مستی سوں جُھل گیا ہوں
وحیدی کوں آج حاجت کس کیف سوں نہیں ہے
تریا بھونک پرت کا کیفاں میں گھل گیا ہوں[1]

(۱۵) محبوب عالم یہ شیخ جیون کے نام سے بھی مشہور رہتے، ایک مذہبی آدمی تھے، امام حسینؓ کے وصال کے متعلق ایک مرثیہ لکھا تھا ان کی دوسری تصنیف 'دردنامہ' ہے جس میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار شعر ہیں[2]

(۱۶) فتح فتح شریف نام اور فتح تخلص، اس کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں ایک 'زلیخا ثانی' سے موسوم ہے اور دوسری "پندنامہ لقمان" سے، آخر الذکر مثنوی سنہ ۱۱۳۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ اوّل الذکر جامعہ عثمانیہ میں[3] اور آخر الذکر کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود[4] ہے۔ شاعر کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات نہیں ہیں۔ صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے وہ 'گوڈر' کا رہنے والا تھا اور اپنے دوست محمد امین کے کہنے پر زلیخا کا قصہ لکھا ہے۔ دونوں مثنویاں فارسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

نمونہ کلام حسب ذیل ہے :۔

عزیزاں روایت سُنو کان دھر ۔۔۔ اوّل فارسی سھتا یو دکھنی دگر

---

[1] از بیاض مملوکہ محمد نصیر الدین خانصاحب مرحوم۔

[2] مقالہ محمد بن عمر صاحب۔ صفحہ ۱۲

[3] فہرست سروری۔ نمبر ۷۵۔

[4] تذکرہ اُردو مخطوطات نمبر ۱۲۔

اہتا گوڈر ایک شہر کا جو نام ہمیشہ فتح کا اہتا وہاں مقام

انگے بھی سو یو پند لقمان ہے سمجھ کر کرے تب جو عرفان ہے
وے نثر میں فارسی تھا اوّل کیا نظمِ دکھنی سوں یوں بے بدل
رہے جس سنے فائدہ تجہ عظیم کرے پند اودل سیتے مستقیم
سو یوے ہیں لقمان اس دہات سات جو فرزند اپنے سو کھوئے نکات

---

(۱۷) **عاشق** اس کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ شاہ عشق اللہ نام تھا اور شاہ نظام الدین ثانی اورنگ آبادی کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ شاہ نظام الدین کا انتقال ۱۱۴۲ھ میں ہوا۔ عاشق کی ایک تصنیف اُشارت الغافلین ہے۔ یہ ضخیم مثنوی ہے۔ اخلاق اور تصوّف کے مضامین اس میں منظوم کیے گئے ہیں۔ بعض عنوان حسبِ ذیل ہیں :-

فضیلت وضو، نماز، بدکرداری، سخاوت، حرام، عورت، قیامت، بہشت، بیعت، تصوّر، عقل و عشق وغیرہ۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے[۱]
عاشق کے کلام کا نمونہ :-

وے دیکھ کیا ہے عجائب نکات تعجّب نکر یو ہے وبسیچہ بات
جو توں دیکھتا سو ہے اسرار رب یو سنتا سو ہیں اوس کے بھید سب
کہیں کچھ ہوا ہور کہیں کچھ ہے جو بھی دیکھ تو ہے ایک کا ایک او

کیا پیر پر میں اپس کوں فدا اوہے بادشاہ میں اوس کا گدا
مگر پیر میرا سو ایمان ہے کہ ایمان کیا بلکہ رحمان ہے
نظام الدین ثانی ہے ثانی علی بتایا مجھے اون خفی ہور جلی
ولی چشت کے گھر کا ہے جس پو بار کہ عالم ہے اس فیض کا انتظار

---

[۱] تذکرہ مخطوطات اُردو نمبر ۴۴۔

نظام الدین میرا خدا ہور رسولؐ | کیا بھید مخفی او مجھ پر حصول
دگرنیں تو اسرار پانا محال | اگر مجھ عمر ہوتی کئی لاکھ سال
تصدق ہوں بلہار اس پیر کے | نظام الدین ثانی سے اکسیر کے

سنو نام اس کا سوائے مسلمیں | کہتے اس کو البشارت الغافلیں
یو دکھنی میں بولیا ہوں اس واسطے | ہر اک شخص کی یو سمجھ واسطے
مسلماں کو اس تے ہوئے فائدا | اگر بختور ہے یاد ہووے گدا

---

(۱۸) **اشرف** — سید اشرف نام اور اشرفؔ تخلص، شمالی ہند اور دکن کے اکثر قدیم تذکروں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مگر تفصیلی حالات بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ مثنوی اور غزل کے ساتھ اس نے مرثیے بھی کہے ہیں، غربت اور مفلسی میں بسر ہوتی تھی۔ دکن سے شمالی ہند کا سفر کیا اور دہلی بھی ہو آیا تھا۔

اس کی ایک مثنوی جنگ نامہ حیدرؓ دستیاب ہوئی ہے جو ۱۱۲۵ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔[1] اس مثنوی میں ایک فرضی داستان منظوم کی گئی ہے جس کے ہیرو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ یہ داستان دوسری قدیم داستانوں کی طرح ہے۔ طلسم کشائی، جنگ و جدل وغیرہ امور کے ساتھ تبلیغِ اسلام کا جگہ جگہ تذکرہ ہے۔ مرثیوں کے معائنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو فطرت نگاری کا خوب ملکہ حاصل تھا اور ادبیت بھی ہاتھ سے جانے نہیں دی ہے۔

خداوند اکبر ہے صاحب کریم | کہ جس کا محمدؐ ہے نائب مقیم
نہ مادر پدر اس کوں نا نار ہے | دو جگ او پیدا کر نہار ہے
مدینے تے مغرب طرف یک شہر | کہتے دور ہے بہوت اس کا سفر
برس ایک پر چھ مہینے کی راہ | اتھا روم کے ملک میں بادشاہ
بڑا شہر کہتے کوہستان میں | نہ ایسا کئیں ملک آسمان میں
عجب نام اس کا حصار اس کہتے | او کا فر ملک ہر نکار اس کہتے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۴۷۔ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی اس کا نسخہ ہے۔

کہے نام اس بادشاہ کا فضل | اتھی ایک دختر اسے خوش شکل
اتھا نام اس کا سحل دختری | اوشیرے خدا کی اتھی استری
عجب خوبصورت تھی رز خوش نگار | جو قربان تھے اس پو پریاں ہزار
قنبر نے سو یک وار بد کر دیا | سحل نے سو وا دار رد کر دیا
پیاپے کیا وار قرا قنبر | سحل نے لیا تاز یانے اوپر
بھی چوتھا ضرب دے لہو گھوٹ کر | قنبر کی سو تلوار گئی ٹوٹ کر
قنبر کا نچلتا ضرب بات کا | سحل تھا کتا کفر کی ذات کا
سحل بعد ازاں گرز آسمان کر | سو مارا یا قنبر کے اوپر تان کر
حیاتی قنبر کی اتھی پور پور | سو گھوڑا قنبر کا ہوا چور چور
قنبر سو ہوا پا پیادہ وے | سحل نے کمند کھول ڈالیا گلے

... ...

سو اس مں قنبر کوں تبسم ہولے | سحل نے کہا کیا رسم ہے تیرا
مگر ہے دیوانہ یا خفتی مگر | مرا جیو جاتا ترا کیا فکر
سنیا میں ہے تو خواجہ میرا علی | وہ شیر خدا پہلوان نبیؐ
نچھوڑے تجے کیں زمانے میں رچا | اگر باد ہوتوں او شہسوار

نچھوڑے تجے سات دریا کے پار
نچھوڑے تجے کیں زمیں کے تلار

مرثیے

بانو کہیں اصغر نہیں، اب میں جھلاؤں کس کے تئیں
سونا ہوا ہے پالنا، اب میں سولاؤں کس کے تئیں

نہلا کے میں کپڑے پنا اس کوں نباتی گل نمن
وہ پھول سوکھا تیر بن اب میں بناؤں کس کے تئیں

سوتا تھا وہ جب نیند بھر پینے اوٹھاتی دُور کوں
بے دم دیکھو آج وہ، اب میں جگاؤں کس کے تئیں

جب مسکراتا وہ بچا میں شاد ہوتی دل منے
بے جاں پڑا ہے گود میں اب میں ہنساؤں کس کے تئیں
جب شہ کو غمگین دیکھتی لے جاکے دیتی گود میں
سونا کفن وہ اوڑ کر اب میں لے جاؤں کس کے تئیں

کہاں ہے وہ ولی والی حیدر حسن میرا
کہاں ہے وہ حسینؓ ابن علیؓ صفدر شکن میرا
اگن سوں ماتم شہ کے جلا ہے تن بدن میرا
برنگِ برق خرمن سوزِ دل ہے ہر سخن میرا
لگا ہے بسکہ تیر ماتم شہ دل منے کاری
شہید کربلائے غم ہوا ہے جگ میں من میرا
ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل
محبّت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجر داغ غمِ شہ سوں
برنگِ لالہ ہے لبریز خونِ دل کا چمن میرا
مہ و خورشید کے جھلکار سوں نس دن اہے روشن
ضیائے حبِ آل مصطفےٰ سوں انجمن میرا
کیا ہوں بے دل یوں مرثیہ جب سوں اماموں کا
ہوا مشتاق ہر ایک شاعر ملک دکھن میرا
جو کوئی ہے صدق دل سوں دوستدار آل پیغمبر
اے اشرف اس کے پک کی خاک ہے کحل نین میرا[1]

(۱۹) ولی ویلوری

میر ولی فیاض نام اور ولی تخلص تھا۔ ویلور علاقہ مدراس ان کا وطن تھا۔ اولاً سات گڈھ میں اقامت کی۔ فراست خاں صوبہ دار

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحات ۲۴۷ و ۳۷۹۔

سات گڈھ کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد سدہوٹ آکر قلعداران سدہوٹ کی سلک ملازمت میں داخل ہوئے، چٹ پٹہ ان کی جاگیر تھی۔ آخر زمانہ میں اپنی جاگیر میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔ ارکاٹ میں انتقال ہوا محلہ اسد پور میں مدفون ہیں۔ سنہ وفات معلوم نہیں مگر ۱۱۶۲ھ تک زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔[1]

ان کی کئی ایک مثنویوں کا پتہ چلتا ہے جن کی صراحت حسب ذیل ہے:۔

۱۔ روضۃ الشہدا۔ یہ ملا حسین واعظ الکاشفی کی فارسی "روضۃ الشہدا" کا ترجمہ ہے۔ مثنوی دس مجلسوں میں منقسم ہے۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے، اس میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف کے متعلق مختلف اصحاب نے اپنی معائنہ کردہ کتابوں سے مختلف سین کا اظہار کیا ہے۔ مگر اب ڈاکٹر زور کی تحقیقات کے لحاظ سے اس کی تصنیف ۱۱۳۷ھ میں ہوئی ہے۔[2]

۲۔ روضۃ الانوار۔ یہ بھی کسی فارسی کا ترجمہ ہے۔ اس میں آنحضرت صلعم کی سیرت کا بیان ہے۔ اس کی تصنیف ۱۱۵۹ھ میں ہوئی ہے۔[3] اب نایاب ہے۔

۳۔ روضۃ العقبیٰ۔ اس کی تصنیف ۱۱۶۲ھ میں ہوئی ہے۔[4]

۴۔ دعائے فاطمہؓ۔ اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں[5] ہے۔

۵۔ مثنوی رتن وپدم۔ اس میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ اس کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی تصنیف 'روضۃ الشہدا' کے پہلے ہوئی ہے۔

'روضۃ الشہدا' کے نسخے اکثر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ کتاب طبع بھی

---

[1] ولی کے حالات ہم کو ان کے ایک رشتہ دار سے معلوم ہوئے ہیں اور طبقات الشعراء میں بھی ان کا ذکر ہے جس میں ولی فیاض ہی نام لکھا گیا ہے۔

[2] تذکرہ مخطوطات نمبر ۳۱

[3] رسالہ معارف نمبر ۱۔ جلد ۴۵۔ مضمون غلام مصطفیٰ خاں۔

[4] " " " "

[5] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

ہو چکی ہے۔ مگر اب مطبوعہ نسخے نایاب ہیں۔

دوسری مثنویاں نایاب ہیں۔ ان کے ایک ایک نسخہ کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مثنوی ۲، ۴ پروفیسر غلام مصطفےٰ خاں کے پاس اور مثنوی ۳ انڈیا آفس میں موجود ہے۔ ۵ کے کسی نسخہ کا پتہ نہیں چلتا۔

ولی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھا۔ ان کی مثنویوں کے اشعار کی تعداد دس ہزار سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی تصانیف میں مذہبی رنگ زیادہ ہے لیکن پھر بھی شاعرانہ خصوصیات اور نکات سے خالی نہیں ہیں۔

ہم نے 'یورپ میں دکھنی مخطوطات' میں 'روضۃ الشہدا' کا فارسی سے مقابلہ بھی کیا ہے۔ جس سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ولی نے کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے وہ شاعری میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔

ولی کا نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے :-

۱۔ روضۃ الشہدا :-

کروں نامہ کوں بسم اللہ سوں آغاز — اجھوں تا میں فصاحت میں سرافراز
مراد ن کیا او سے جن یک سخن میں — بندایا جیو دم کے رشتہ سوں بدن میں
کروں میں مجلس دویم پر غم — وفات فاطمہؓ کر کر مرقم
خدیجہ سوں جو اولاد پیمبرؐ — اتھے سب دو پسر ہور چار دختر
نہی تھی فاطمہؓ سب دختراں میں — واچنیا چاند جیوں سب اختراں میں
شکم میں ماں کے تھا جوان کو آرام — رکھے حضرتؐ نے اون کو فاطمہؓ نام
نبوت سوں نبیؐ کے پانچوے سال — ولادت کا ہوا نیر دیکھ سال
خدیجہؓ نے بشارت یوں سنائے — قبیلے کو زناں کوں سب بولائے

بزاں طارق کا بیٹا یک عمر تھا — جد کے فن میں خر سا بے خبر تھا
اونے اکبر کا آئیں وار کھایا — جہنم میں پدر کوں جا میلایا
دوجا تھا طلحہ کر طارق کا فرزند — اتھا ملعون ہاتی سا تنومند
جل اپنے باپ ہور بھائی کے غم سوں — تڑپ شہزادے پر دیا یا منم کوں

سو اکبر کا گریباں ہات سوں دھر ۔۔۔ منگیا تھا کھینچ کر سینے زمیں پر
تلک اکبر نے جلالی کر نہر سات ۔۔۔ مٹے ملعون کے گردن اوپر ہات
پکڑ قوت ستے ایسا مروڑے ۔۔۔ جو گردن کی رگاں ہور ہاڑ توڑے

یکس پر چلائے تول نیزے ۔۔۔ ہوئے دونو میں گولا گول نیزے
گئے پس منمانی تور دونو ۔۔۔ کھڑے نیزے سوں تیرہ جور دونو
دونو تھے نیزہ بازی میں ہنرمند ۔۔۔ دونوں بھی بات کرتے سوں ہے بند
کسی پر کوئی کچھ سر سبز نہ ہورے ۔۔۔ کسی کا ہات کسی پر ورنہ ہوے
تلک شمشیر لے علم کر ۔۔۔ سٹیا سمعاں کے نیزے کوں قلم کر
اونے بھی ہات ڈالیا تیغ پرواں ۔۔۔ ولے ہاشم نے کچھ فرصت دیاناں
کیا بھی وار اس پر ہانک کر کر ۔۔۔ سٹیا دیں زیں لک دو تیماں کر کر
جب اس خواری سوں او سمعاں ہوا ہے ۔۔۔ [2] بڑا افسوس موزیاں کوں ہوا ہے

ولیکن شاہ کا او دبدبہ دیک ۔۔۔ صلابت ہور عالی مرتبہ دیک
قدم شوخی سوں آگے نا رکھے کوئی ۔۔۔ نہ انکھیاں کھول کر مکھ پر دیکھے کوئی
سو ہونا چار تب سب نابکاراں ۔۔۔ لگے کرنے کوں شہ پر تیر باراں
ترنگ اوپر سوں اوترے شاہ شبیر ۔۔۔ کہ نا تیزے کوں ناحق نا لگے تیر
او تھا جدو پدر کی یادگاری ۔۔۔ کلر کے کروں چپ او سکے خواری
دیکھے جب کافراں نے شاہزادا ۔۔۔ ترنگ کوں سٹ ہوا ہے یک پیادا
دلاور ہو گئے بہانے کو تیر ان ۔۔۔ لگے شہ چپ کھڑے کھاتے کوں تیراں
پشانی پر لگیا یک تیر کاری ۔۔۔ او کھاڑی سو ہوا لہوواں سے جاری
بھرا دین لہو میںنے اوس بات سرور ۔۔۔ ملیں اوس لہو کوں لے مکہ سات سرور[1]

۲۔ روضۃ الانوار۔

کیے یو نقل حضرت عمر خطاب ۔۔۔ ہوا معراج کا جس دن خوشی باب

۱؎ روضۃ الشہدار۔

کیا حضرت رسول اللہ سوں میں سوال ‌ ‌ نہانی راز ہا کا کچھ کرو فال
سو فرمائے کہ امت کی شکایت ‌ ‌ کیا منجات یوں دو رب عزت
کہ عصیاں ورزیں سب مل بخلوت ‌ ‌ کریں دو انجمن میانی اطاعت
ولے میں پردہ پوشی میں ہوں ستار ‌ ‌ ہوں قائم بخشش رحمت سوں غفار
علی مرتضیٰ سوں ہے یو منقول ‌ ‌ سخن راز نہانی کا یو مدلول
گنہ کرتے تھے امتہائے پیشیں ‌ ‌ عذاباں ترت ان پر تھے سو تعیں
کہ بعض غرق ہو در آب طوفاں ‌ ‌ ہو گیتے آب رودِ نیل غرقاں
کیتاں کوں صیحۂ جبریل سوں مار ‌ ‌ ہوا بعضیاں اپر باراں سنگ سار
کیتے غرق زمیں میں مثلِ قاروں ‌ ‌ چلے جاتے اچھوں تحت الثریٰ کوں
کیتاں کے تیں سو مسخ صورتاں کر ‌ ‌ ہوئے تلپٹ کتے از باد صرصر
کیتاں کوں بھیس سمیت اٹھا کو مارے ‌ ‌ جہنم کے لیے دو باٹ سارے
ولیکن تجھ امت کوں یا محمدؐ ‌ ‌ بدی ان کی کون کرنے کی ستی رد
تری امت ہیں منجھ کوں بہوت پیاری ‌ ‌ غضب ہور قہر سوں یو ہیں کناری[1]

روضۃ العقبیٰ

ہو اللہ السمیع الحی و قادر ‌ ‌ ہو الرب البصیر البطن و ظاہر
ہو الجبار و قہار و معدل ‌ ‌ ہو الستار و غفار و مفضل

الٰہی توں رہے بینا و دانا ‌ ‌ یو میری ضعف ہمت پر تو انا
کیا تالیف یو میں مختصر قال ‌ ‌ ترے محبوب پیغمبر کا احوال
سو حالِ آخرت سب اسمیں لایا ‌ ‌ سگل خوف در جایاں کوں سنایا
وعید و عد لایا ہوں جمع کر ‌ ‌ وعیداں سو ڈریں وعدہ پو دل دھر
کیا میں فارسی دکھنی میں منظوم ‌ ‌ کہ تا ہووے ہریک نوں ترت معلوم
الٰہی توں ہے غفار و عطا کوش ‌ ‌ ضعیفاں کا غلط سہو و خطا پوش[2]

---

[1] از رسالہ معارف
[2] " " "

۴۔ رتن پدم :۔

خدایا تو ہے پاک پروردگار | ترن کا رو آتا رو اچھے آثار
حماست خاں امیر ایک نامور تھا | سکونت گاہ اس کوں سات گڑھ تھا
اتھا اداہل دردو نیک اعمال | رفاقت میں اتھا میں اس کے خوشحال
قضار ادان سوں ہو قسمت سوں بخاست | سو آیا میں طرف کڑپہ کے دہر خواست
نواب عبدالمجید ابن عبدالحمید ایک | اتھا واں نامور صوبہ سعید ایک
سواد بحر شجا پروانہ لکھ کر | سلک نوکراں میں منسلک کر
تعین کرہ مجکوں سدہوٹ کو روانہ | کیا وہ صاحب شیریں زمانہ
سو حسب الحکم میں سدہوٹ کو آیا | رنگارنگ واں تماشے میں نے پایا[1]

۵۔ مثنوی دُعائے فاطمہؓ :۔

حکایت عجب یک سُنو دردمند | سیں تو کھلے دل کے قفلاں کے بند
سنو اس کیئں کان دے دل سوں سب | کہتے ہیں محمدّ رسولِ عرب

کیے مشورۃ جب صحابہ کرام | کیے فاطمہ کن کہہ سب تمام
سُنے فاطمہؓ جب ہوئے بے قرار | چلے سات یاراں کے حضرت کی ٹھار
لیے سات اپس قرۃ العین کوں | حسن ہور حسین ہر دو سعدین کوں[2]

---

(۲۰) **عشرتی** سیّد محمدّ خاں نام اور عشرتی تخلص تھا۔ عالمگیر کے عہد میں موجود تھے۔ ان کی شرافت اور نجابت کے لحاظ سے بادشاہ نے قدردانی فرمائی۔ جاگیر اور منصب سے سرفراز کیا۔ ان کی اولاد آصفی دور میں باعزت عہدوں پر ممتاز رہی۔

حیدر آباد ان کا وطن تھا۔ اسی جگہ انتقال ہوا ہے۔ شاہ راجو حسینی کی گنبد میں

---

[1] اُردوئے قدیم

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ ۲۷۰

شمال کی طرف مدفون ہوئے[1]

عشرتی پُرگو شاعر تھے۔ متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :۔ دیپک پتنگ، چیت لگن، نیہ درپن، ان کے علاوہ غزلیں بھی پائی جاتی ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔

۱۔ مثنوی دیپک پتنگ :۔

کہ اے گل مجے آگ تجہ بن ہے بن	کہ گھر تجہ بجن بن دسی جیوں سجن
جگت میں تجہ سوں میرا نام ہے	کہ تجہ سور بن دن میرا شام ہے
تسوں کہائے حسرت میرے لالہ زار	بغیر تجہ ہے منج سیج میں پھول خار
اے تج سوں میرے حوض میں نیر ہے	تیرے باج نت خاک منجہ سیر ہے
اے تج سوں میرا حاصل ہر مدّعا	اگن تجہ بنا مجہ کوں بادِ صبا
تسوں بخت میں زیر مجہ زور میں	ہے تجہ میکر باج آرام مجہ گور میں
اے تجہ شمع تے بزمِ انوار ہے	بغیر تجہ میکر دل بنے نار ہے
اے تجہ سوں تج ہے مجکوں راز ہور نیاز	نہ تج بن لغیر سوز دستا ہے ساز
نہ ہو بیکسر اسٹ کہ مجہ دل یو خار	جدائی کے پردے کا نہ چھیڑ تار
نہ کر بے وفائی، وفادار ہو	میری دیپک زاری نہ بیزار ہو[2]

نیہ درپن

طبل بجتے تھے ہور رنسنگ و پُرغم	دمامے ہر گدھن بجتے تھے دھم دھم
مگت ہووے تلنگ و دوہر کے رن سور	اُبلتے تھے غضب سوں جیونکہ سمدور
اٹھے یوں منتظر جو ہووے گھتر	نکالیں میاں سوں کینے کا خنجر
گھرک لے ہات میانے ایک بار	کرپن جواہر آپس کا آشکار
... ...	... ...
دلیراں نے صفاں آراستہ کر	دیئے تھے مردمی کے دادیک سر

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۳۷۰۔

[2] اُردو شہ پارے صفحہ ۲۸۲۔

پڑے ہر تن اوپر داراں ستے غار — بدل پانی کے نکلیا لہو کا انگار
لگاتی چھاتی سو چھاتی ہو کر گل چوز — ستے سر ہور سینا ہور پات پک توڑ
کرے گرزاں کے ایسے دھات سوں کا — پڑے ہٹے دہرت کوں پاتال لگ غار
زرہ پوشاں بڑے ہور رن میں پامال — بڑے جیوں میں بھیس اپراں بے حال
کریا یوں پھوڑ ہر یک بات کا تیر — کہ چومیا ہات ہر ایکس کا رہ گیر
دھنگ جب کھینچنا ہر ایک کماندار — چلا کھتا زہانہ اس کوں سو بار
دسے یوں پاکھراں سوں ہست کا دل — کہ جیسا نیر بھر بادل دیا چل
دسے زخمیاں کا عکس اس میں رگت سوں — رکھایا جیوں شفق بادل منے سوں[1]

غزل کا نمونہ

قیامت کا کٹھن دن ہے نبیؐ مجھ آسرا دینا
گنہ منجھ سر پہ لوسنگین ہے نبیؐ منجھ آسرا دینا
رکھیا غفار سر آکر مبارک اس قدم اوپر
دونوں نیاں سوں انجواں بھر نبی منجھ آسرا دینا

کمینہ عشرتی بولے دنیا میں اس پری جھوٹی
جنے مشکل وتی کھولے محی الدین قطب ربانی[2]

---

(۲۱) روحی[3] زوال حیدر آباد (۱۰۹۸ھ) کے وقت کا ایک مشہور شاعر روحی ہے روحی حیدر آباد کے پیرزادوں میں شامل تھے۔ تفصیلی حالات بدست نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری کا تذکرہ برہان پور کے ایک مرثیہ گو ہاشم علی نے کیا ہے۔

ہزار حیف نین شاعران دکھن — سو روحی و مرزا، و قادر بہتن

---

[1] اردو شہ پارے، صفحہ ۲۸۲۔ (کتب خانہ سالار جنگ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔)

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۴۷۔

روحی کے مرثیوں کے علاوہ غزلیات اور مخمس بھی ملتے ہیں، ایک مخمس کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

نس دن سجن تجھ درس کا آدھار ہوتا کاش کے
پل پل منیں ہے یہ من یک بار ہوتا کاش کے

جانا ہمن مہ رُخ کنے بسیار ہوتا کاش کے
واقف ہمارے حال پر دلدار ہوتا کاش کے

یو درد دل کا تجھ انگھین اظہار ہوتا کاش کے
گل وصل تیرا اے سجن اچھتا سدا سنسار میں

دل شاد پھرتے عاشقاں تجھ حسن کے بازار میں
جلتا نہ پروانہ کہیں اس سوز کے آزار میں

زاری نہ کرتے بلبلاں اس درد کے گلزار میں
گلشن محبّت کا اگر بے خار ہوتا کاش کے

پاتا تمہاری خاک پا جگ میں ہماری آبرو
تیری برہ سوں اے سجن پھرتا ہوں حیراں کو بکو

پرداز دل کا تجھ انگھیں بولیا اتا ہیں مو بمو
صد جاں اگر ہوتے مجھے تھی دل منے یو آرزو

یو جیو قرباں تجھ اوپر صد بار ہوتا کاش کے
میٹھے بچن سن پیو کے آتا ہے یوں مجھ من منے

روحی نہ ہوئے ایک تل جدا تس دن رہوں رشن منے
سُن یو لطافت کے بچن طاقت نہیں سوسن منے

ایسے سخن شیریں اوپر غنچے کے تئیں گلشن منے
تیری ثنا خوانی بدل گفتار ہوتا کاش کے

روحی کے مرثیے اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں موجود ہیں جو ادبی حیثیت سے قابلِ قدر ہیں، ایک مرثیہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آج غم ناک ہیں چمن کے گُل بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گُل

غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں ‏ نرگس ولالہ یاسمن کے گُل
یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں ‏ لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گُل
جب سُنے شہ کی بات مجلس میں ‏ جل بوجھے شمع انجمن کے گُل
نفسِ پا دیکھ دل ہوس رکھتا ‏ سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گُل
خوش لگے تجھ طبع سہن اے روحی
دل کے باغاں منے سخن کے گُل[1]

فرماں سوں جب شاہ کے قنبر لے آیا ذوالفقار
لے نام بسم اللہ کا تب شہ اوچایا ذوالفقار
روحی تجے جس وقت کچھ مشکل اچھے تو صدق سوں
کہہ لَا فتیٰ اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفِقَار[2]

---

(۲۲) محمّد بن رضا

محمّد بن رضا کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے، صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعہ دار سدھوت عبدالنبی خاں (۱۱۲۰ھ تا ۱۱۶۷ھ) کے زمانہ میں موجود تھا اور قصیدہ بردہ کو دکھنی نظم میں ترجمہ کیا تھا، کلام کا نمونہ پیش ہے:-

حمد حق کا کر اوّل تو صفحہ دل پر رقم ‏ نام پاک اس پاک کا ہے زینت لوح وقلم

اے محبّ کر یاد توں ہمسایہ شہر سلم
جگ کے انجواں سوں ملا جاری کیا لہو دم بدم
یا چلی ہے، بادِ خوش بو کاظمہ کے شہر تے
یا چمک بجلی کی دیکھا رات از کوہ ظلم

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] " " "

کیا ہوا تجھ چشم کوں جو بس کہے تو رویں زیاد
کیا ہوا تجھ دل کوں جو کیں ہوس ما ہوے ندیم

چاہے عاشق گر چُھپادے عشق تو چُھپتا نہیں
دل جلے جب آگ سوں ہور جگ اچھیں کے غم سوں نم

عشق میں تو اشک نیں پڑتے نشاں یار دیکھ
یاد کر کوہ و شجر کیوں چشم ہوئیں بیخواب جم

ہو تو راضی اے خدا بو بکرؓ ہور فاروق سوں
ہور عثمانؓ ہور علیؓ سوں سعی جو انہا صاحب کرم

آل ہور اصحاب ہور سب تابعیں سوں جو اتھے
صاحب تقویٰ و صافی ہور تمکن و کرم

شاخ جھاڑاں کی ہلادے جب تک باد صبا
خوش کرے گا اونٹ کے تیں سارباں کر نغم

بخش یارب توں گنہ قاری کے ہور شارح کے سب
بخش سامع ہور کاتب کیتیں توں اے صاحب حرم

خادمِ آلِ محمدؐ، بو محمد بن رضا رحمتِ باری تعالیٰ اس پر ہوے دم بدمؐ

(۲۳) محمد حیدر سدہوت کا ایک باکمال شاعر تھا، خود کو ابن جعفر سے شہرت دی تھی۔ عبدالحمید خاں قلعہ دار سدہوت کے دربار کا شاعر تھا۔
ابنِ نشاطی (قطب شاہی شاعر) کی مثنوی "پھول بن" کو تین سو شعر کا اضافہ کرکے اس داستان کو طویل کیا ہے، اس اضافہ کی مثنوی کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے، جو اشعار اضافہ کیے ہیں اس میں ہمایوں فال اور سمبر کی شادی کی داستان ہے۔

ؔ انڈیا آفس اور کتب خانہ سالارِ جنگ میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو :۔

محمدّ حیدر جعفر زباں کھول · نچھل دریا سوں دل کے دریچن رول

نواب عبدالنبی خاں کا ہے فرزند · نواب عبدالرحیم کا وہ ہے دلبند
کرم کے بحر کا رخشاں گہر ہے · نواب بھول خاں کا وہ جگر ہے
نواب عبدالحمید ہے نام اس کا · عدل انصاف ہے جم کام اس کا

وزیر کوں بہوت لشکر دے کر سنگات · روانہ تب کیا نامہ بھی دے ہات
وزیر اس شاہ کن نے تب وداع ہو · چلیا ہے جلد شہزادے طرف دو
ہر یک منزل مراحل قطع کرتا · ہر یک جنگل و بستی سوں گذرتا
کتے دن راہ چل کر اس وضع سوں · وہ شہزادے کے آ پہونچا شہر کوں
سو شہزادے کو نامہ شاہ دیئا · زبانی بھی سگل اظہار کیتا

شب گشت آئی جلوہ گر ہو · نہ تھی شب بلکہ رشک روز تھی دو
فلک پر آکر شاہ روم تا شام · کیا جاری سگل اطراف احکام
گیا مغرب میں پھر کرنے کو شاہی · چڑیا تخت فلک پر بدلا ہی
ہوا روش جب وہ شاہ گلرنگ · بھریا سب جگ منے آکر لشکر زنگ

مٹھائی بہوت خوش بادام کی کر · جو سیویاں ہور سموسے بھی رکھے بھر
مٹھائی میں ستے سموسے بہوت خوب · اتھا بادام کا حلوہ بھی محبوب
ترنجی ہور نارنجی مرّبا · رکھے پیٹھے کا ہور بھی آم کا لیا
اسے انگور انجیر و انار اں · پھنس ہور آم خربوزے بھی تھے واں
اسے تربوز اورشہ توت مرغوب · ہر یک میوہ اتھا یک سے یک خوب

تداں فارغ ہوئے سب کوں دھلا ہات · عطر دانیاں بھی لائے پان خوش دھات

گلاب و عطر گل سب کو زدے پان   ادک سمدیاں کیں سب سوں دے ماں
تداں خلعت کیں لائے ہیں نادر   اتھے خلعت یک سے تے یک فاخر
دے ہریک کوں اس کا مرتبا ایک   نہیں باقی رہیا مجلس میں کوئی یک[1]

---

(۲۴) بیچارہ ان کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ گول کنڈہ کے باشندہ تھے اور عالمگیر کے زمانہ میں دہلی بھی گئے تھے۔

پی سے جدا ہونا نہ تھا چاہا خدا یا یوں ہوا
جز صبر کچھ چارہ نہیں، بیچارہ ہور رہنا پڑا

تخلص کو جس طرح استعمال کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

(۲۵) طالب[2] مرزا طالب نام، گول کنڈہ کے رہنے والے عالمگیر کے زمانہ میں موجود تھے۔

ہمنا کے خوں چشم سے آلودہ کب کمے   وہ پگ جسے گرانی ہے رنگ حنا سیتی

---

(۲۶) فراقیؔ سید محمد نام اور فراقیؔ تخلص، یہ اور ان کے اجداد بیجا پور کے متوطن تھے، فراقیؔ دورِ عادل شاہی کے آخری زمانہ میں موجود تھے، اورنگ آباد بھی گئے۔ پھر جنوبی ہند میں ویلور آکر اقامت کرلی، آپ کے خاندانِ طریقت کی بیعت عرصہ تک جاری تھی، صاحبِ عرفان و سلوک گھرانہ رہا، علمی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی، علمِ منطق، معانی سے بخوبی واقف تھے۔

اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ فراقیؔ اپنے وقت کے بڑے صوفی تھے اور تصوّف میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" دستیاب ہوئی ہے۔ اس

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔
[2] تذکرہ میر حسن
[3] " "

میں حشر کے دن کے حالات کا نہایت تفصیل سے تذکرہ ہوا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ غزل بھی لکھا کرتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سے کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوٹے

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمدؐ کی گلی بہتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا

عبث خوباں کی گلیوں میں عمر توں صرف نہ کر اے دل
مدینے کی زیارت کوں گیا ہوتا تو کیا ہوتا

ارے مجنوں ہوا بدنام توں لیلیٰ کو دل دے کر
اگر میرے نبیؐ کو دل دیا ہوتا تو کیا ہوتا

ازل کی دین میں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں
نبیؐ کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا

منجہ اِس مکتب مجازی میں جو عشق اُستاد نہ ہوتا
تو میرے دل کی کثرت کا سبق برباد نہ ہوتا

نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقی کوں
اگر علم حدیثِ مصطفیٰ ہوتا تو کیا ہوتا

'مرۃ الحشر' کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

گگن کا دیا سامناں تان کر	شفق کی کسوئی نے افشان کر
دیا تھا رب چاروں عناصر کے رچا	تو پکڑی ہے ایسی عمارت قرار
زمیں کا کیا فرش ہموار صاف	سٹیا دھوپ کا تس پہ باریک غلاف

ل تذکرہ میر حسن

ک بیاض مملوکہ اہلیہ محمد غوث صاحب ایم۔اے

فراقی تخلص ہے میرا مدام
ولے اصل سیّد محمّد ہے نام

تو اپتاج کہا بس نہ ہے کچھ دو جا
گنہ گار ہے پے تو جنّت میں جا

رضا دے رکھے سرورِ کائنات
میرے سرپر اپنا شفاعت کا ہات

میرا ہوئے جب اس دھات خوشحال میں
میں اتنا چہ آخر کوں بولوں بچن[1]

خدا کے عجائب ہیں قدرت کے کھیل
نکسی کی بھی ہے عقل کا تسی کوں میل

جلکچہ ہے سو او عقل تے بہار ہے
اوس کی نچہ پاتا سزا وار ہے

ہماری سمجھ میں نہ آتا ہے او
ہمارا نہ دل کنہ پاتا ہے او

خدا جس ہدایت دیا سو دیا
مرے ہیں تو ماں باپ فرزند کوں کیا

کتے ہیں محمّد علیہ السّلام
کیا یاجوں ناجوج لشکر تمام

کریں گے دو صف ایک یاجوج سے
دوجی صف کوں ماجوج لے گا سبگات

او یاجوں جور سب سیاہی کنشت
اپھنگے بہتی تلپتی قد یک بلشت

او یاجوں ہور لگ سب تکتاں
درازی میں ہوئیں آٹھ گز کے قداں

سنا ہوں کہ واقع ہے یو بھی حدیث
نہ مرجائیں گے کوئی انو میں خبیث

جینے تیں تلک یک سو سو بشر
کو ہن نہ اپھی اس کو مرنے کا ڈر

دیکھو کاں تلک بول یو جانے کے
تعجب ہوں دنیا میں کیوں مانے کے

او چار نکی ناپاک دو و دید سیر
ہریک کا نو ہر شہر ہور ہر نگر

جدرا کہ اتریں گے نزدیک دور
کریں گے او چاروں طرف میں فتور

او جس ملک میں آئے لشکر کا دل
ملا کر اٹے ناک میں سب کھتدل

او اترے نجس آکے دریا اوپر
تو سب تر ہو جائے گا خشک تر

ندیاں ہور بایاں کون کس بھتیں حساب
او یک پیاسے ہیں ہو کہ جادیں خراب

جو کچھ چیز ہے خوب دنیا منے
کریں گے او ضائع بڑے ہور تھے

بزاں آکہ بیت المقدس کے بہار
کریں گے اپس میں اپے یوں بچار

(مراۃ الحشر)

---

[1] مراۃ الحشر کتب خانہ آصفیہ مثنوی نمبر ۲۵۰

(۲۷) **تیم احمد** تیمؔ[1] احمد نام اور یہی تخلص کرتا تھا۔ برہان پور سے تعلق تھا۔ ایڈنبرا میں اس کے سات مرثیے ہیں، مرثیوں کے سوا غالباً کسی اور صنفِ سخن میں اس نے طبع آزمائی نہیں کی۔ مرثیہ کا نمونہ پیش ہے:۔

حیف گھائل ہے حسین تن تیرا　　چشم پُرخوں ہے پیرہن تیرا
تو کہاں ہور کیدھر ہے تن تیرا　　کیوں بسیرا ہوا ہے رن تیرا

نہیں ملتا بوند کس کیتیں پانی
سخت طفلاں کے سر پو حیرانی

حیف اصغر نے تجکوں رومانی　　جگ سوں پیاسا گیا تن تیرا
تیر لگ لکھ سوں لہو ہوا ہے ہے　　وا مصیبت میں بال پن تیرا

اے ہے توں دلبرِ حسین، کے اصغر
آج روتا نہیں توں ہت کر

---

(۲۸) **ندیم** سید شاہ ندیم اللہ حسینی المتخلص بہ ندیمؔ بیجاپور کے باشندے تھے۔ فتح عالمگیری کے بعد مشہور ہوئے۔ باقر آگاہؔ نے آپ کے کلام کی تعریف کی ہے اور عرفان حقیقی کی چاشنی سے آپ کا کلام مملو ہونے کی صراحت کی ہے[2] افسوس ہے کہ ہم کو آپ کے مرثیوں کے سوا کوئی کلام نہیں ملا۔ مرثیہ کا نمونہ پیش ہے:۔

ہے ہے اصغر ابن حسینؑ سُونا تیرا پالنا
رو رو بانو کرتے ہیں بین، سُونا تیرا پالنا

تجہ بن بانو ہیں بے حال لہویں بکھرے سر کے بال
کہتے ہے ہے میرا لال سونا تیرا پالنا

تھا توشہ کا من کا چاد مجھ دکھیا کے من کا بھاؤ
کاری ہے مجھ دل پر گھاؤ سونا تیرا پالنا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] دیباچہ مثنوی گلزار عشق۔

تھا جو تجھ پر بیسا گھات مجھ کوں بی لیجانا سات
اصغر مجہ سوں کر کچھ بات سُونا تیرا پالنا

تھا مجہ دل میں ارمان سالگرہ کرتی ساماں
تجھ کون تھا یہ برس ندان سُونا تیرا پالنا

چھاتی کوں کس لاؤں میں کس کو دودھ پلاؤں میں
اصغر تجہ کو کہاں پاؤں میں سُونا تیرا پالنا

گودی میں اب کس کوں سوں کس کوں تجہ بن پوپی دوں
گور میں جا کر سویا توں سُونا تیرا پالنا

کیوں کر دیکھا تیرا سُکھ، تجھ پر بھاری ہر دم دُکھ
جیو لے اب کیا ہے سُکھ سُونا تیرا پالنا

تجہ بن جوگن کا بھیس راکھ لگا موں کھولے کیس
تجہ کو ڈھونڈھوں دیس بہ دیس سُونا تیرا پالنا

دُکھ کی کنتھا پہنوں تن من کی دھوتی جالوں میں
تجہ بن مجہ کون گھر ہے سونا تیرا پالنا

غم سوں تیرے رووں زار اصغر اصغر کروں پکار
جینا مجہ کوں ہے دشوار سُونا تیرا پالنا

آج ندیم اس غم کے ہیں کرتا انجھواں بھر کر نین
اصغر شہ کے نور العین سُونا تیرا پالنا[1]

---

(۲۹) شاہ طاہر سیّد طاہر شاہ نام اور آپ کے والد کا نام سیّد عبداللطیف تھا، کرنول آپ کا وطن تھا۔ شاہ طاہر کو اپنے والد سے بیعت حاصل تھی، کچھ عرصہ تک شاہ عبداللطیف نے ادھونی میں بھی قیام کیا تھا۔ عالمگیر نے آپ سے ملاقات کی خواہش بھی کی تھی مگر آپ نے ملاقات نہیں کی، شاہ طاہر

---

[1] اُردو شہ پارے۔

ہمیشہ عوام کی خدمت میں مصروف رہا کرتے تھے، آپ کی دو کتابیں مشہور ہیں۔ ایک 'کنز النفایس' اور دوسری 'خوان یغمان' پہلی کتاب فقہ میں ہے اور دوسری کتاب مختصر لغت ہے، اس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ ۱۱۱۵ھ میں شاہ طاہر کا انتقال ہوا۔

ستے کا داب زرکمرو بازو بندرا | دان دری و ملوچ کہ زبید بہ بازواں
یکدانہ گلسری و گلو بند پلکری | داں گوشوارہ کوئی کہ شد زینت زناں
پختاک دھانس طوق کہ پوشند در گلو | اے طوق مہر تو بگلوئے دلست وجاں

مسی سو دانت چھلنہ و گلگونہ کونکم است | مہندی حنا بتازی بود ھار سو چماں

قہوہ عقار تازی و تنبول برگ پان | پس رنگ کات فوفل و پوپل سپاریاں
چنا سفید آجک و ساجور فارسی | جلد عشق پیچہ بدری بود سیاں[1]

---

(۳۰) شاہ عبدالرحمٰن

شاہ عبدالرحمٰن قادری اسی دور کے شاعر ہیں۔ بیجا پور کی تباہی کے بعد برابر کا رخ کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے فرزند شاہ عالم کے مقربین میں کچھ دن رہے، پھر دلی چلے گئے۔ وہاں کے قیام کے زمانہ میں روز جمنا کی سیر کو جاتے، وہاں امام حسینؓ کے حالات میں درد انگیز فارسی اشعار سنتے۔ اس کا اس قدر اثر ہوا کہ ایک طویل مثنوی جو سولہ ہزار شعر پر مشتمل ہے قلمبند کر دی اس کا نام باغ حسینی رکھا۔ (۱۱۴۱ھ) اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ خانقاہ عنایت الٰہی میں موجود ہے[2]

شاہ عبدالرحمٰن کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوئے۔ شاہ عبدالرحمٰن کے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

---

[1] خوان بغرا

[2] دکھنی ادب میں تاریخ۔ ڈاکٹر زور، صفحہ ۱۱۲۔

جو اس وقت میں تھا بجاپور شہر — سو اس شہر کی تھی یہاں میں خبر
اتھے بادشاہ واں کے صاحب عدل — نہ تھا ایک رتی کام کا کیں نکل
جتی خلق واں کی وضع و شریف — سخی، مہرباں ہور بھوتی تکلیف
مبرا تھے سب چھند قریباں ستے — اتھے معتقد وہ فقیراں ستے
جو آویں بزرگاں مرے شہر میں — رکھیں کر وطن اپنا آرا سیں
اتھا نام اس شہر کا ہر دیار — تو آویں خبر سن کے عالم اپار
خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا — اسی کرم سوں وہ منصور تھا
ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگ زیب — کیے اس کے لینے کے تئیں کئی فریب
دے بھیج فوجاں کو اوّل عتاب — جو جا کر کریں ملک سارا خراب

پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے
لیے شہر ہور ملک سب غضب تھے

شاہ صاحب کی یہ نظم ان کی جرأت اور صاف گوئی کی ایک مثال ہے جو اصحاب بیجاپور اور گول کنڈہ کی سلطنتوں کے علاوہ نظم و نسق، علم دوستی، اُردو کے فروغ کو اچھی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے لیے عالمگیر کا دکن کو فتح کر کے تباہ و برباد کر دینا ایسا المیہ تھا جس پر وہ خون کے آنسو بہایا کرتے تھے۔

---

(۳۰) جلیل

عبدالجلیل نام اور جلیلؔ تخلص، حیدر آباد کا ایک مرثیہ نگار شاعر ہے۔ اس کا دور ۱۱۰۰ھ کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے۔ تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ صرف یہ پتہ چلتا ہے ہر سال محرّم میں مرثیہ لکھا کرتا اور ان کو عاشور خانوں اور مجالس سیّدالشہداء میں پڑھا کرتا۔ اس کے دو بھائی بھی تھے۔ جلیل ایک امیر خانخانہ کا متوسل تھا۔ جلیل کے مرثیے طویل اور غزل نما ہونے کے علاوہ ایک مرثیہ مسدس بھی ملتا ہے، اس سے واضح ہے کہ مرثیوں کو مسدس میں لکھنے کا طریقہ جلیل نے جاری کر دیا تھا۔ جلیل کے مرثیوں کا ایک قلمی نسخہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ مرثیے ردیف وار جمع کیے گئے ہیں۔ مرثیوں میں وہی امور ظاہر ہیں جو قطب شاہی دور اور اس کے بعد مغلیہ دور میں دکھنی مرثیوں کی

خصوصیت رہی ہے، یعنی حضرات علی اصغر کا ماتم، قاسم کی شادی اور ماتم، علی اکبر اور حضرت عباسؓ کی شہادت، بی بی زینب کی بے کسی و بے بسی وغیرہ۔

جلیل کے مرثیے طویل بھی ہیں اور مختصر بھی، طویل مرثیے سو سو شعر کے ہیں۔ ان میں مرثیہ کی خصوصیات کے ساتھ ادبی جواہر بھی پائے جاتے ہیں۔

مرثیوں کا نمونہ پیش ہے:-

مدینہ میں اے بادِ صبح جانا — حسینؓ ابنِ علیؓ کا دکھ سنانا
انجھو کی اس اوپر دریا بہانا — نبیؐ زہراؓ کے روحانیاں رلانا

کہہ اس سرور کے سر کی سرگذشت اب
مکے سوں کربلا تک سر بسر سب

کنا اس کے تیماں کے سکھے لب — بہ ملک شام قیدی کر لے جانا
وطن سوں جور اعدا سوں اہت دل — مکے میں بھی نہ پایا چین ایک پل
دغا کے بھیجے نامے کوفیاں مل — خلافت کاج اس شہ کوں بلانا
بھجانا شہ کا مسلم خط وہ پڑھ کر — ہزاروں کرنا بیعت اس کے ہت پر
بلانے کے وہ شہ کوں کوفہ اندر — کتابت ہت سوں مسلم کے لکھانا
کرنا اس کو شہید اور اس دو طفلاں — دے حارث ہانیہ ان کا سو کٹانا

یا نبیؐ شمع انجمن تیرا — یا علیؓ یا بتولؓ تن تیرا
جانشین بھائی یا حسن تیرا — نبیؐ عربی ہیں ست وطن تیرا

جوراں بی بی سوں بولیاں رہ کر
تجھ حسینؓ اب گیا حسنؓ سا مر

سنگ نازاں کے تجھ گرا چندر — بن چندر سور ہے گگن تیرا
بھر کے لہو نیچ بی بی اپنے تین — کربلا کرتی رو رو بین
اے مرے جیو کے پیارے حسین — بے سراب کیوں پڑا ہے تن تیرا
گھیرے اے چاند تجکو راس و ذنب — کرسی و عرش کے ملائک سب
مل نماز خسوف کرتے اب — دیکھ دسویں رین گہن تیرا

سپہر غلغلا چندر کا اُٹھا وامصیبتا عاشور شور حشر کیا وامصیبتا
برج نبیؐ کا نور ڈوبا وامصیبتا تارا علیؓ کے کا ٹوٹا وامصیبتا
بی بی کا پھول جھڑکے پڑا وامصیبتا

جوں دھر شفق کے لہو کا برسنے لگا سحاب دیوارِ صبر ڈھا کے گیا دل کا گھر خراب
بجلیاں پڑیاں ہیں آہ کہاں سینہ ہوئے کباب سرخاکسار خوں پیویں زغم ابنِ بوتراب
کرتی ہے آج بادِ صبا وامصیبتا

اوّل چلا کے تیر بہ فوجِ حسین آپ ملعوں عمر پلید کمایا بڑا جو پاپ
لعنت کرے ہمیشہ اسے سعد اس کا باپ لرنے سوں نت جدی سورج کے بدن سب بھاپ
ازبس یو غم اگن میں تپیا وامصیبتا

آیا وہی کا چاند اب غم کا جنم ہوا ہے
اس بار غم سوں دیکھو چندر بھی خم ہوا ہے
کی صبح نے گریباں چاک از غمِ شہیداں
دامان گل انجھوں کی شبنم سوں غم ہوا ہے
مکھ کیتے لوح کالا رکھتا کہ ہے قلم اب
ماتم میں شہ کے دیکھا لوح و قلم ہوا ہے
روتے بجا محمدؐ عشرت سے غم سوں ندن
سب انبیا کے دل میں بھاری الم ہوا ہے
حوّا و سارہ مریم پرساوے کتیں اے زہرہ
تجہ رونا دیکھ نس دن غم ہم کو جم ہوا ہے
عترت کے غم میں رونا کر یاد مصطفیٰؐ کا
امت پہ فرض دس دن یو غم ختم ہوا ہے
ملک عرب عجم تہیں سارا یو غم سوں رونا
اس حادثہ سوں برہم ملک عدم ہوا ہے

نہیں کچھ جلیل کوں ڈر اعدا کی دشمنی سوں
سر دینے شہ کے پگ پر ثابت قدم ہوا ہے[1]

---

(۳۲) ذاکر اسی دَور کا ایک مرثیہ گو ذاکرؔ ہے، اس کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔ البتہ قیاس ہے کہ وہ سعادت اللہ خاں (گورنر ارکات) کے زمانہ میں موجود تھا اور عبداللہ اس کا نام تھا۔ سعید نامہ میں لالہ جسونت رائے نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جامعہ نظامیہ (حیدرآباد) میں اس کے مرثیوں کا ایک قلمی مجموعہ موجود ہے، ذاکرؔ طویل مرثیہ قلمبند کرتا تھا اور ہر مرثیہ میں ایک شہید کربلا کا تذکرہ تھا، اس کے مرثیوں میں منظر نگاری کا اچھا نمونہ ہمدست ہوتا ہے۔ منظر نگاری کے ساتھ واقعہ نگاری بھی خوب کرتا ہے، مرثیوں کا نمونہ پیش ہے۔

نماز شام جب سرور گذارے — یہی ستر انفر حاضر تھے سارے
دیکھے جب سید الشہدا یہ حالت — کہ وہ بذات قوم پر ضلالت
مکر دنیا کی قیمت معتبر جان — معاویہ کوں بیچے دین و ایمان
کہے حضرت حسن کو اے برادر — جہاں سب ہے تمہارے سوں منوّر
تمہارا ہور ہمارا کوئی مددگار — نہیں اس شہر میں کوئی یار غم خوار
نہ بابا سر پونا جد مصطفےٰ ہیں — وطن میں ہم غریب بے نوا ہیں
ہمیں اس شہر میں ہیں سخت حیراں — غریباں، دل جلے، خاطر پریشاں
چلو نانا کے اب روضہ میں جاویں — برہنہ سر چلیں رو رو بلاویں
چلو اُمّت کا شکوہ سب سُنا دیں — یہ حالت درد دل کی سب دکھا دیں

دیگر

لکھوں گر شرح رہ کی داستاں کا — سیہ ہوئے روز نامہ سب جہاں کا
روایت ہے کہ شاہنشہ کا لشکر — جب آپہونچا ہے کوفے کے برابر
اندھیری رات سوں تھا دشت تاریک — کہ وہاں جنت کی رہ ہوگئی تھی باریک

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

ہُوا پر تیرگی یوں تھی کہ مردم کیے اوس رات دن کی راہ بھی کم

اندھارا صبح کی آنکھوں سوں یو تھا کہ وہ بھی بھول گئے مشرق کا رستا

لہو ٹپکے قلم سوں وصف شب میں کہ جیو محشر کا دن ہو شب کے سیمیں

زباں پر وصف شب کے گر قلم لائے تمتہ صفحۂ محشر پورہ جائے

مگر تھی وہ شبِ اندوہ ظلمت نبیؐ کی آل پر صبح قیامت

دیگر

دیکھے جب تشنہ لب اہلِ حرم کوں دل آزردہ امام محتشم کوں

دیکھے پیاسوں سوں ہیں اطفال بیتاب پڑے ہیں زرد ہو جیوں دربی آب

پڑی تھی ہوک کی گرمی کے مارے دلاں بیتاب جیو سیماب سارے

ننھے اطفال سارے شیر خوارہ پڑے سنگ دل ہو پارہ پارہ

نہ وہاں کھانا نہ پانی تھا میسّر پس آوے مادراں کوں دودھ کیونکر

پڑے ہیں یک طرف بھایاں ہو مقتول خزاں کی تیغ سوں جیوں پھول

جنگل میں یک طرف سارے محبّاں دوبے ہیں لہو میں جیو لالہ کے پھولاں

کیں دیکھے تو کوئی اعضا جدا ہے کسی کا کاٹ سر کوں لے گیا ہے[1]

تیسرے دَور کی نثر

تیسرے دَور کی نثر کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے، دکن میں اُردو کی تیسری طباعت تک ہم کو اس دَور کی نثر دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ البتہ چوتھی طباعت میں ایک نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔

آج ہم ایک سے زیادہ نمونہ پیش کر سکتے ہیں، مگر افسوس ہے کہ اب تک کوئی نثر کی ادبی کتاب ہمدست نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ تصوّف، فقہ اور تفسیر وغیرہ یعنی اسلامیات کے عنوان کی نثروں کا نمونہ ملتا ہے۔ ممکن ہے کبھی آئندہ مزید نثر کے نمونے مل جائیں۔ نمونہ ترجمہ

---

[1] مخطوطہ مراثی ذاکر کتب خانہ جامعہ نظامیہ حیدرآباد۔

معرفت السلوک جو ۱۱۲۵ھ میں محمد ولی اللہ قادری نے کیا ہے، شاہ ولی اللہ قادری کے والد شاہ حبیب اللہ قادری تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب سید عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے، شاہ حبیب اللہ قادری، شاہ مرتضیٰ قادری بیجاپوری کے مرید اور خلیفہ تھے، بیجاپور سے اپنے فرزند ولی اللہ کے ہمراہ حیدر آباد آئے، نورالدین خاں گوپاوی آپ کے مُرید اور بڑے معتقد تھے۔ شاہ ولی اللہ کا انتقال ۱۱۵۷ھ میں ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔

"صفت ہور سرانا بے غایت ہور شکر کرنا بے نہایت ثابت ہے۔ اوس واجب الوجود کوں جو ممکن الوجود کوں، ممتنع الوجود کے دائرے میں پیدا کیا ہور اپنے واجب الوجود کوں اس دونو وجود سوں موجود ہور ظاہر کیا۔"

"…. ہور حق کے بات کے تمام مدعی اس کے بیان کرنے میں کہلانا مطلوب ہور مرغوب سب سالکان ہور طالبان کا آوے، ہور سالک جو جلتہات حق کے بات کا ہے سو اس شرح تے فایدہ لینہارا ہوے، ہور نانوں اس رسالہ کا معرفت السلوک رکھا، اناں امید حضرت ذوالجلال کے درگاہ تے دوہست جو یو رسالہ مقبول ہور منظور صاحب دلاں کے نظر میں ہوئے۔"

تفسیر سورۃ اذا جاء

افسوس ہے کہ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر زور صاحب کی صراحت کے بموجب ۱۱۵۰ھ کے قبل اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو صراحت فرمائی ہے، وہ حسبِ ذیل ہے:

"رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بجائے خود ایک کتاب ہے اور اس کا مصنف کوئی دکھنی عالم ہے جس نے قرآن اور حدیث کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جس کو لکھنے کی بھی اچھی مہارت حاصل ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن یہ رسالہ دکھنی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ دکھنی مفسروں نے قرآن شریف کی تفسیریں کس شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھیں[1]۔"

نمونہ عبارت:۔

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات نمبر ۲۲۶۔

"پیغمبر صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم کے بھیجنے میں خدائے تعالیٰ کی یہ حکمت تھی کہ مکارم اخلاق کو تمام کرنا اور بنا کلمۂ توحید کی مضبوط کرنا اور دین اسلام کو ظاہر کرنا اور خلایق کو ہدایت کرنا۔ جس وقت کہ یہ امور بوجہ احسن تمام ہوئے تو خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول صلعم پر یہ آیت نازل کی :-

... ...

جس وقت کہ یہ سورہ نازل ہوئی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہٗ سُن کر روئے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے پوچھا کہ اے عباس! تم کس واسطے روئے ہو۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ اس کے نازل ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے تیئں دنیا سے سفر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

... ...

اور جو شخص کہ سورت کے تیئں خواب میں پڑھا تو خدائے تعالیٰ اوس کو دشمنوں پر فتح دے گا اور تمام مشکلات اوس کے حل ہوئیں گے اور بعضے کہتے ہیں کہ یہ خواب دلالت کرتا ہے موت کے نزدیک ہونے پر۔"

تبصرہ

تیسرے دَور کی نظم ونثر پیش ہو چکی ہے۔ اس سے شعراء کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس دَور کا پہلا اور زبردست شاعر وَلی ہے۔ دوسرے شعراء اس کے ہم عصر ہیں۔ ان میں سے بعض شعراء اس دور کے بعد بھی زندہ تھے۔ مثلاً وَلی ویلوری، وَجدی، مجرمی وغیرہ۔ مگر چونکہ ان کا اکثر کلام اسی دَور میں تصنیف ہوا ہے اور وہ اسی زمانہ میں مشہور ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کا ذکر اسی دَور میں کرنا ناگزیر تھا۔

دورِ ماسبق کی طرح اس دور میں بھی دکھنی شعراء نے اپنے کمال کا اظہار مثنویوں کے ذریعہ کیا ہے۔ مگر اسی دور سے ایک نئی شاعری کا آغاز ہوا۔ یعنی مثنوی کے بجائے غزل کہی جانے لگی۔ وَلی اورنگ آبادی نے اس کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس کے ہم عصر شاعروں نے اسکی پیروی نہیں کی مگر زمانہ مابعد میں اس کی پیروی ہونے لگی۔ دکھنی شعراء غزلوں میں اپنے زورِ بیان اور کمالِ فن کا اظہار کرنے لگے۔

چونکہ وَلی خود ایک صوفی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اس وقت کا ماحول بھی صوفیانہ

تھا۔ اس لیے ولی کا کلام تمام تر تصوّف ہے اور اس کے تتبع کرنے والوں نے بھی پوری طرح پیروی کی ہے اور اس زمانہ کی مثنویاں بھی زیادہ تر تصوّف ہی میں رنگی ہوتی ہیں۔ وصال العاشقین، غوث نامہ، منصور نامہ (ذوقی) من لگن (بحری) تحفہ عاشقاں، منطق الطیر، باغِ جانفزا (وجدی) سب تصوّف میں ہیں اور جو مثنویاں عشق و عاشقی اور قصّہ کہانیوں کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ مثلاً عشقِ صادق (ضعیفی) گلشنِ حسن و دل (مجرمی) وغیرہ بھی تصوّف سے مملو ہیں۔

ادبی حیثیت سے اشرف کی مثنوی "جنگ نامہ حیدر" اور ولی ویلوری کی "پدماوت" قابلِ ذکر ہیں۔"

زبان کی تدریجی ترقّی کے لحاظ سے اس میں صفائی کا ہونا ناگزیر تھا چنانچہ دورِ ماسبق کے کلام سے اس زمانہ کا کلام صاف ہے۔ اگرچہ بعض مثنویوں میں صفائی نہیں ہے، مگر عام طور سے اس زمانہ کی مثنویاں صاف ہیں۔

مرثیوں کا بھی اس زمانہ میں رواج تھا۔ خاص مرثیہ گو کے علاوہ دوسرے شعراء بھی مرثیہ کہا کرتے تھے۔ چنانچہ خود ولی نے مرثیے کہے ہیں۔ ذوقی کے کئی ایک مرثیے ہیں۔ تیم احمد، اشرف بھی مرثیے کہا کرتے تھے۔ بلکہ تیم احمد تو مرثیہ گو ہی تھا۔ اس کے علاوہ ولی ویلوری کی "روضۃ الشہدا" گویا تمام تر مرثیہ ہی ہے۔

اس زمانہ کے مرثیے اور نوحے، سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں۔

اس زمانہ کی نثر کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ زبان صاف ہو چکی ہے۔

چوتھا دور

سنہ ۱۱۳۶ھ تا سنہ ۱۲۲۰ھ

اُردو سلطنتِ آصفیہ

عالمگیر نے دکن کی فتح کے بعد اپنے سب سے چھوٹے فرزند کام بخش کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد خانہ جنگی برپا ہوئی اور شاہ عالم بہادر شاہ کو دہلی کا تخت و تاج نصیب ہوا۔ دکن بھی اس کے زیرِ حکومت آ گیا۔ بہادر شاہ کے صرف چار سالہ حکومت کے بعد جہاں دار شاہ اور پھر فرخ سیر یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔ فرخ سیر کے عہد میں نواب نظام الملک آصف جاہ دکن کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

کچھ عرصہ کے بعد جب حکومت رفیع الدولہ، رفیع الدرجات کے بعد محمّد شاہ کے حصّہ میں آئی تو آصف جاہ کو دکن سے سنبھل اور مراد آباد پر بدل دیا گیا اور دکن کی صوبہ داری پر حسین علیخاں کو مامور کیا گیا۔ اس زمانہ میں مغلیہ حکومت پر زوال آ چکا تھا، شیرازۂ حکومت درہم برہم ہو گیا تھا۔ سکھ، مرہٹے اور راجپوت سر اُٹھا چکے تھے۔ بادشاہ چند امیروں کے ہاتھ کٹ پتلی کی طرح تھے۔ نظام الملک جو مراد آباد سے مالوہ کی صوبہ داری پر منتقل کیے گئے تھے، آئے دن کی بدانتظامی سے تنگ آ کر دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس اثناء میں سیّدوں کا آفتابِ عروج غروب ہو گیا۔ محمّد شاہ نے نظام الملک کو دکن سے طلب کر کے قلمدانِ وزارت آپ کے سپرد کیا۔ (سنہ ۱۱۳۴ھ) آپ نے ملک کا انتظام شروع کیا تھا کہ نادر شاہ نے اپنا نادری حملہ کیا۔ سلطنتِ مغلیہ کی حالت گو نہایت کمزور ہو گئی تھی۔ تاہم نواب نظام الملک نے جان توڑ کوشش کی کہ بگڑی ہوئی حالت درست ہو جائے۔ مگر محمّد شاہ کو لوگوں نے

آپ سے بددل کردیا۔ آپ نے دُوری مناسب تصوّر کی اور بادشاہ سے اجازت لے کر دکن کی طرف متوجہ ہوئے۔ (۱۱۳۶ھ ہجری)

آپ کے وزارت دہلی کے زمانہ میں عماد الملک مبارز خاں کو دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا جب آپ واپس ہوئے تو شکر کھیرہ کے مقام پر اس کے سپہ سالار عالم علی خاں سے مقابلہ ہوا[1]۔ مگر آپ منصور و مظفر اورنگ آباد میں داخل ہوئے۔ اس طرح آصف جاہ کی حکومت کا آغاز ہوا۔ سلاطینِ آصفیہ کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۔ نواب آصف جاہ اوّل	۱۱۳۶ھ تا ۱۱۶۱ھ
۲۔ نواب ناصر جنگ	۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۴ھ
۳۔ نواب مظفر جنگ	۱۱۶۴ھ تا ۱۱۶۴ھ
۴۔ نواب صلابت جنگ	۱۱۶۴ھ تا ۱۱۷۳ھ
۵۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی	۱۱۷۳ھ تا ۱۲۱۸ھ
۶۔ نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث	۱۲۱۸ھ تا ۱۲۴۴ھ
۷۔ نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع	۱۲۴۴ھ تا ۱۲۷۳ھ
۸۔ نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس	۱۲۷۳ھ تا ۱۲۸۵ھ
۹۔ نواب میر محبوب علی خاں غفران مکان آصف جاہ سادس	۱۲۸۵ھ تا ۱۳۲۹ھ
۱۰۔ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع	۱۳۲۹ھ تا ۱۳۶۸ھ

آصف جاہ اوّل کے بعد آپ کے صاحبزادے نواب ناصر جنگ نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مگر آپ کے بھانجے مظفر جنگ ہدایت محی الدین خاں نے فرانسیسیوں کی تائید سے آپ کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ باہم صلح پر جنگ کا خاتمہ ہوگیا تھا لیکن بعض مفسدوں نے ناصر جنگ کو شہید کردیا اور مظفر جنگ حکمران بنے۔ مگر ان ہی مفسدوں نے ان کو بھی قتل کردیا۔ اس کے بعد آصف جاہ کے تیسرے فرزند نواب صلابت جنگ مسند نشین

---

[1] ترکِ آصفیہ۔

ہوئے (۱۱۶۴ھ) فرانسیسیوں نے عروج حاصل کرلیا۔ مرہٹوں نے سر اُٹھایا اور ایک بڑے حصۂ ملک پر قابض ہو گئے۔ گیارہ سالہ حکمرانی کے بعد صلابت جنگ کے حکومت سے کنارہ کش ہونے پر ان کے چھوٹے بھائی نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی جانشین ہوئے ابتداءً فرانسیسیوں سے آصف جاہ ثانی کو اتحاد رہا۔ مگر آگے چل کر انگریزوں نے رسوخ پیدا کرلیا اور محمّد علی خاں والا جاہ صوبہ دار ارکاٹ کی کوشش سے انگریزوں سے آپ کی دوستی مستحکم ہوگئی۔ متعدد مرتبہ آپ نے عساکرِ آصفی سے انگریزوں کی مدد فرمائی۔ آپ نے ملک کا باضابطہ انتظام فرمایا۔ ایک طویل حکمرانی کے بعد ۱۲۱۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی جو لڑائیاں مرہٹوں سے ہوئیں ان سے بعض نمک حرام اسیروں اور غدّار وزراء کی وجہ سے قلمرو آصفی کے حدود کم سے کمتر ہو گئے۔ انگریزوں سے جو معاہدے ہوئے اس کی انہوں نے پابندی نہیں کی اور بالآخر ۱۸۰۳ء میں جو معاہدہ نظام اور انگریزوں میں ہوا۔ اس کی رو سے سلطنتِ آصفیہ کی حالت ایک باجگزار ریاست کی ہوگئی۔ انگریزی فوج کی چھاؤنی سکندر آباد میں قائم ہوئی اور ریزیڈنٹ کا قیام شہر حیدر آباد میں ہوا۔ ایک وسیع قطعہ زمین ان کی اقامت گاہ کے لیے دی گئی اور ۱۸۰۶ء میں رزیڈنسی کی عمارت تعمیر ہوئی۔

آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند نواب سکندر جاہ حکمران ہوئے۔ مہاراجہ چندولال اگرچہ پیشکار کے عہدہ پر مامور تھے۔ مگر دیوانِ وقت منیر الملک کی نااہلی کے باعث دیوانی کے کام پر بھی حاوی ہو گئے۔ انگریزی فوج کی تنخواہ وقت پر ادا ہونے لگی۔ ریاست قرضدار ہوتی گئی۔ ۱۲۴۴ھ میں نواب سکندر جاہ کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب ناصر الدولہ چھوٹے آصف جاہ حکمران ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں مہاراجہ چندولال خدمت سے علیحدہ کیے گئے۔ پھر سراج الملک دیوان کے انتقال پر نواب مختار الملک دیوان یعنی وزیر اعظم بنائے گئے۔

مختار الملک دیوانی پر جب مامور ہوئے تو جوان تھے مگر اپنی قابلیت اور تدبیر کے باعث ریاست کی گری ہوئی حالت کو سنبھالا اور اب سلطنتِ آصفیہ ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ (۱۲۷۳ھ، ۱۸۵۷ء میں نواب ناصر الدولہ کا انتقال ہوا اور ان کے فرزند نواب افضل الدولہ مسند نشین ہوئے۔ مسند نشینی کے کچھ عرصہ بعد ہی ۱۸۵۷ء میں جنگ

آزادی ہوئی۔ اگرچہ حکومتِ آصفیہ نے یار وفادار کی حیثیت سے انگریزوں کو مدد دی۔ مگر قلمرو آصفیہ کے عوام نے جنگ آزادی میں پورا حصہ لیا اور اپنی بساط کے مطابق انگروں سے مقابلہ کیا۔[1]

۱۲۸۵ھ میں افضل الدولہ پانچویں آصف جاہ کا انتقال ہوا اور آپ کے اکلوتے فرزند نواب میر محبوب علی خاں صغر سنی میں جانشین ہوئے۔ انتظامِ ملک ایک ایجنسی کے سپرد ہوا۔ سنہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں نواب مختار الملک وزیر اعظم کا انتقال ہوگیا، مختار الملک نے اپنے دَورِ وزارت میں حکومتِ آصفیہ کو ایک شائستہ اور ترقی یافتہ سلطنت بنانے میں پوری جدوجہد کی اور آپ کی یہ سعی بڑی حد تک کامیاب رہی۔

سنہ ۱۳۰۱ھ میں میر محبوب علی خاں کو پورے اختیارات کے ساتھ قلمرو آصفی کا حضور نظام تسلیم کرلیا گیا۔ گورنر جنرل لارڈ رپن نے حیدر آباد آکر مراسم مسند نشینی انجام دے۔

میر محبوب علی خاں سنہ ۱۳۲۹ھ م سنہ ۱۹۱۱ء تک حکمرانی کرتے رہے، آپ کے زمانہ میں حکومت کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی۔ حکومتِ آصفیہ کی سرکاری زبان فارسی سے اُردو کر دی گئی، ریاست کے اہم شعبہ جات پولیس، عدالت، مال گذاری، خزانہ، فوج، طبابت، تعلیمات تعمیرات، غرض ایک مہذب اور متمدن حکومت کے لیے جو سر رشتے لازمی ہیں ان کی طرف پوری توجہ کی گئی۔ ان امور کو انجام دینے میں شمالی ہند اور جنوبی ہند کے اصحابِ علم پیش پیش رہے، بعض خود غرض اور مفاد پرست اصحاب کی وجہ سے ریاست کو جیسی چاہیے ویسی ترقی نہ ہوسکی، انگریزی عہدہ داروں کے قدم مضبوط ہوتے گئے۔ حضور سے زیادہ رزیڈنسی کی خوشنودی پیشِ نظر رہنے لگی۔ غرض نواب میر محبوب علی خاں کا اٹھائیس سالہ دَورِ حکومت اگر ایک طرف ریاست کی ترقی کا مرقع پیش کرتا ہے تو دوسری طرف کمزوریوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں رمضان (۱۳۲۹ھ سنہ ۱۹۱۱ء) میں مسندِ حکومت آصفی پر ساتویں آصف جاہ کی حیثیت سے متمکن ہوئے اور عرصۂ دراز تک حضور نظام اور آصف جاہ سابع بنے رہے۔ آپ کے دَورِ حکمرانی کی تاریخ درخشاں بھی ہے اور تاریک بھی، تابناک

---

[1] تاریخ آزادیٔ ہند۔

بھی ہے اور افسوسناک بھی، جامعۂ عثمانیہ کا قیام، جہاں اُردو کے ذریعہ تمام علوم ادب اور سائنس کا انتظام کیا گیا تھا۔ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر آباد میں عالیشان کالج زنانخانے، کتب خانے، تالاب بنائے گئے۔ غرض وہ کون سا سرشتہ ہے جس میں ترقی نہیں ہوئی اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بعض سرشتے برٹش انڈیا کے صوبوں سے بہتر ہو گئے۔

شخصی حکومت سے جمہوریت کی صورت پیدا کرنے کے لیے جو امور انجام دے گئے وہ پوری طرح بار آور نہیں ہو سکے، خود غرض ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھنے والے بعض غداروں نے حکومت کو نقصان پہونچایا۔ انگریزی حکومت نے یار وفادار کی وفاداری کی خدمات کی قدر نہیں کی۔ اپنی سیاست سے حکومت آصفیہ کے بقا کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد حیدر آباد کی رعایا کے ذہن بھی تقسیم ہو گئے۔ غرض ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن ہوا اور ستمبر ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۷ھ میں حکومتِ آصفیہ کا خاتمہ ہو گیا اور حکومتِ حیدر آباد قائم ہوئی اور نواب میر عثمان علی خاں کو راج پرمکھ بنایا گیا۔

۱۹۵۶ء تک میر عثمان علی خاں جو حکومت حیدر آباد کے راج پرمکھ کی حیثیت سے حکمراں تھے لسانی حیثیت سے صوبوں کی تقسیم ہونے سے راج پرمکھ سے بھی علیحدہ ہو کر ایک شہری بن گئے اور آندھرا پردیش کی ریاست قائم ہو گئی۔ پورا تلنگانہ یعنی تلنگی بولنے والے اضلاع، ایک حکومت کے تحت کیے گئے اور اس حکومت کو آندھرا پردیش سے موسوم کیا گیا۔

(۲)

اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ آصف جاہ اوّل نے جب دکن میں اپنی سلطنت قائم کی تو تلنگانہ کا پورا علاقہ مہاراشٹر کا ایک وسیع حصّہ اور کرناٹک کے ایک بڑے حصے کے علاوہ تامل علاقہ بھی آپ کے زیرِ نگیں تھا، مگر آپ کے بعد حدود ممالک کم سے کمتر ہونے لگے، مہاراشٹر کا بڑا حصّہ مرہٹوں سے متعلق ہو گیا۔ تامل علاقہ اور تلنگانہ کا کچھ علاقہ اولاً انوار الدین خاں اور پھر ان کے فرزند والا جاہ کے خاندان میں چلا گیا۔ کرناٹک کا ایک حصّہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے زیرِ تصرّف ہوا۔ آندھرا کے وسیع ملک پر جو شمالی سرکار سے موسوم تھا۔ اولاً فرانسیسیوں اور پھر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اسی طرح

حکومتِ آصفیہ کے حدود تلنگانہ کے آٹھ نو اضلاع، مہاراشٹر کے پانچ اور کرناٹک کے تین اضلاع میں محدود ہوگئی تھی۔

اس موقع پر آندھرا کے چند اضلاع یعنی کرنول، کرپہ، سدہوت وغیرہ کی مختصر تاریخ بیان کرنا ضروری ہے۔ ان اضلاع پر عادل شاہی دور میں بہول خاں ساونوری اور عالمگیر عہد میں اسماعیل خاں بعض اضلاع پر حکومت کرتے رہے ...... جب آصف جاہ نے دکن میں آصفی پرچم لہرایا تو ان اضلاع کے پٹھان حکمرانوں نے آپ کی اطاعت کرلی اور پھر ناصر جنگ کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا۔ مگر جب ناصر جنگ اپنے بھانجے ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی لڑائی سے کامیاب واپس ہوئے تو راستہ میں بعض امیروں نے غدّاری کی اور ناصر جنگ کو شہید کردیا۔ اس کے بعد مظفر جنگ بھی ان ہی کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنے۔ اس طرح کرنول، کرپہ وغیرہ افغان خاندانوں کے زیرِ تصرّف رہا کیے بعد دیگر کئی اشخاص یعنی عبدالنبی خاں، عبدالمجید خاں، عبدالحمید خاں، محسن خاں، عبدالمجید خاں، عبدالحلیم خاں وغیرہ حکومت کرتے رہے۔[1] کچھ عرصہ تک ٹیپو سلطان کی حکومت میں یہ علاقہ رہا اور جب ٹیپو سلطان شہید ہوگئے تو پھر سے آصفی حکومت میں شامل ہوگیا لیکن ۱۲۱۵ھ میں نظام کی جانب سے انگریزی فوج کی تنخواہ میں انگریز کمپنی کو دے دیا گیا۔ غرض کہ شمالی سرکار کے آندھرا کے علاقہ کے ساتھ یہ اضلاع بھی انگریز کمپنی کی حکومت میں شامل ہوکر صوبۂ مدراس میں ضم ہوئے تھے۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوگیا اور ہندوستان کو آزادی مل گئی تو بدستور صوبۂ مدراس میں شمالی سرکار کے اضلاع کرپہ، کرنول، سدہوت وغیرہ شامل رہے، آندھرا کے جاں بازوں نے آندھرا کے علیحدہ صوبہ بننے کی جدوجہد کی اور کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ھ میں لسانی تقسیم میں پورا آندھرا پھر سے ایک ریاست بن گیا۔

(۳)

نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اوّل بڑے مدبّر، عقلمند، ذی علم اور علم و ہنر کے قدردان تھے۔ اس لیے آپ کا سادہ مگر بارعب دربار باکمالوں کا ملجا و ماویٰ تھا، جب

---

[1] تذکرۃ البلاد والحکام مخطوطہ، نشانِ حیدری و حدیقۃ العلم

آپ دکن کی جانب روانہ ہوئے تھے تو بہت سارے اہلِ کمال بھی ہمرکاب ہوئے۔ ان اصحاب نے دکن میں اقامت کرلی اور یہاں بس گئے اور کئی اصحاب علم وفن ایسے تھے جنہوں نے دہلی کے سونی ہونے پر دکن ہی کو اپنا ملجا پایا ہندوستان کا مشہور ادیب جس کی عربی قابلیت کا لوہا سبحۃ المرجان کے باعث عرب بھی مانتے تھے۔ یعنی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی آپ ہی کے زمانہ میں اورنگ آباد تشریف لائے اور یہیں سے دارالبقا کا راستہ لیا۔

حکومتِ آصفیہ میں زبان اُردو کو بڑی ترقّی نصیب ہوئی۔ نہ صرف بڑے بڑے شعراء نام آور پیدا ہوئے اور نظم ونثر کی کتابیں تصنیف ہوئیں بلکہ دیگر مراتب بھی طے پائے ہیں جن سے اُردو کی ترقّی میں مدد ملی۔ ان کی قدرے تفصیل بے محل نہیں ہوسکتی۔ فارسی کی تقلید میں دکھنی شعراء کے تذکرے بھی لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۱۶۴ھ میں خواجہ خاں حمید نے گلشن گفتار[1] کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا۔ افضل بیگ خاں نے ۱۱۶۵ھ میں اپنا تذکرہ لکھا۔ اس کے بعد ۱۱۶۸ھ میں خواجہ عنایت اللہ فتوت نے اپنا تذکرہ ریاض حسنی[2] اور ۱۱۷۵ھ میں لالہ لچھمی نرائن شفیق نے اپنا تذکرہ چمنستانِ[3] شعراء لکھا۔ ان سب کے بعد ۱۱۹۳ھ میں اسد علی خاں تمنّا نے اپنا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد اور بھی تذکرے لکھے گئے۔ ان تذکروں میں نہ صرف جنوبی ہند کے شعراء کا حال لکھا گیا ہے بلکہ شمالی ہند کے شعراء[4] کو بھی جگہ دی گئی ہے اور بعض شعراء کے متعلق ایسی ایسی معلومات جمع کی گئی ہیں کہ وہ زمانہ مابعد کے شمالی ہند کے تذکروں میں دستیاب نہیں ہوتیں۔

آصف جاہ اوّل کے بعد بھی اہلِ علم اور اصحابِ فن کی سرپرستی ہوتی رہی۔ نہ صرف سلاطین آصفیہ بلکہ امرائے عظام اور جاگیردار ان بلند مقام نے شعراء اور اصحاب ہنر کی

---

[1] سیّد محمد صاحب ایم۔ اے۔ عثمانیہ نے اس کو مرتب کرکے مکتبۂ ابراہیمیہ کی جانب سے شائع کیا ہے
[2] اس تذکرہ کا ایک مخطوطہ دفتر دیوانی ومال سرکار نظام کے کتب خانہ میں ہے۔ ہم نے اس پر تفصیل سے مضمون لکھا ہے جو رسالہ "ہندوستانی" میں شائع ہوا ہے۔
[3] انجمن ترقی اُردو نے اس تذکرہ کو شائع کردیا ہے۔
[4] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ ہم نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے (رسالہ معارف)

قدردانی اور دستگیری کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ چنانچہ ارسطو جاہ جو ۱۱۵۷ھ سے ۱۲۱۸ھ تک وزیر اعظم بنے رہے۔ شعراء کی سرپرستی کے لحاظ سے بھی مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے سیاسی کارناموں کے ساتھ ساتھ تہذیب اور تمدّن علم وفضل کی آبیاری سے بھی دکن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ ان کی بارگاہ ہر علم وفن اور اصحابِ ذوق کا مرکز بنی ہوئی تھی ان کی سخن فہمی اور علم دوستی کے واقعات سے تاریخ دکن پُر ہے۔ دوسرے زیادہ شعراء کی سرپرستی کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ جو قصائد اور قطعات ان کی مدح میں موزوں کیے گئے تھے ان کے ضخیم مجموعے مرتب ہوئے ہیں جو "مجموعۂ فصاحت"[1] اور خزینۂ سخن کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کو اس دور کے ایک باکمال صاحبِ فن مورخ شاعر اور ادیب شاہ تجلّی نے اسمٰعیل یار جنگ کی فرمائش سے مرتب کیا ہے۔ ان میں شعراء کے تخلص کے لحاظ سے ردیف وار قصائد اور قطعات ہیں۔ یہ مجموعے ۱۲۱۵ھ میں مرتب ہوئے ہیں۔

دوسرے اُمرائے دکن مثلاً شمس الامراء، مہاراجہ چندولال وغیرہ کا تذکرہ آگے آتا ہے، ان اصحاب ذوق کی سرپرستی سے دکن کی سرزمین علم وفن اور تہذیب وتمدّن کا مرکز بنی رہی۔ جو تمدّن پیدا ہوا وہ مغلیہ تمدّن کی یاد دلاتا رہا۔ اور جو کلچر وجود میں آیا وہ ہندو مسلم کے اتفاق اور اتحاد کا انمول گنجینہ تھا۔

اس دور میں شاعری، مصوّری، موسیقی کی جو ترقّی ہوئی اس کے اظہار کے لیے ہمارے مختصر اوراق کافی نہیں ہیں۔ ہر عنوان کے لیے ایک ضخیم مقالہ درکار ہے۔ سلطنتِ آصفیہ کی اگرچہ سرکاری زبان اولاً فارسی تھی اور علماء کا ایک بڑا حصّہ فارسی میں اپنے کارنامے پیش کرتا تھا۔ فارسی گو شعراء موجود تھے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ عام طور سے اُردو کی بھی ترقّی ہوتی رہی۔ شعراء اُردو اور ادیب اپنے کارناموں سے اُردو کے خزانہ کو پُر کرتے رہے قصائد لکھے گئے۔ غزلیات کے دیوان مرتب ہوئے، مثنویاں لکھی گئیں۔ مرثیے مرتب ہوئے۔ غرض کہ باغ اُردو سرسبز اور شاداب ہوتا گیا۔ اس کے بعد یعنی ۱۲۲۰ھ کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جبکہ اُردو کی ترقّی کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھا اور اُردو زبان میں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں

---

[1] راقم نے اس کتاب پر تفصیلی مضمون قلمبند کیا ہے۔ جو مقالات ہاشمی میں شامل ہے۔

سے سائنس کی کتابوں کے ترجمے کی ابتدا ہوئی۔ اُردو کا پہلا علمی رسالہ شائع ہوا تو وہ بھی دکن سے اور اُردو کی یونیورسٹی قائم ہوئی ہے تو سلطنتِ آصفیہ ہی کے ہاتھوں، درحقیقت زبانِ اُردو پر سلطنتِ آصفیہ کا جو احسان ہے وہ احاطۂ تحریر سے خارج ہے اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کو جو کچھ ترقی نصیب ہوئی وہ تمام اسی سلطنت کی آبیاری کے باعث ہوئی۔

(۴)

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اُردو زبان کا یہ دَور ۱۱۳۶ھ سے ۱۲۲۰ھ تک تعلّق رکھتا ہے جبکہ دکن کی مسندِ حکومت پر آصف جاہ اوّل اور آصف جاہ ثانی کی حکمرانی رہی۔

اس زمانہ میں نہ صرف اورنگ آبادہی علم و فضل کا مرکز تھا یہاں گولکنڈہ و بیجاپور کے اہلِ کمال کے ساتھ دہلی کے اہلِ کمال بھی موجود تھے بلکہ برہان پور اور حیدرآباد بھی شعر و سخن کے مرکز بن گئے تھے۔ خصوصاً آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں جب حیدرآباد سلطنتِ آصفیہ کا دارالسلطنت قرار پایا تو اب دکن کے اہلِ کمال حیدرآباد ہی میں جمع ہو گئے اور ایک زمانہ آیا کہ برہان پور اور اورنگ آباد کی جگہ بھی حیدرآباد ہی نے لی تھی۔ کرپہ، سدھوت اور کرنول بھی اُردو مرکز رہے۔ غرض کہ اس دَور کے شعراء نہ صرف اورنگ آبادی ہیں بلکہ برہان پور اور حیدرآباد وغیرہ سے بھی تعلّق رکھتے ہیں۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ اس دَور کے شعراء اور مصنّفین کو پیش کرتے ہیں تاکہ اُردو کی ترقّی میں ان لوگوں نے جو خدمتیں کی ہیں وہ واضح ہو جائیں۔

اس دور میں عہدِ قطب شاہی و عادل شاہی کے کئی ایک الفاظ متروک ہو گئے۔ مگر پھر بھی بیسوں لفظ وہی استعمال ہوتے تھے مثلاً:-

بن	بجائے	بجائے	بھئی	بجائے	بھی
کنے	″	پاس نزدیک	غمناک	″	غمگین
کبھو	″	کبھی	بر	″	تن۔جسم
پاناں	″	پہونچنا	ٹک	″	تک
ناہوے گا	″	نہ ہوگا	کن	″	کس
جان	″	معشوق	کوں	″	کو

سجن	بجائے	معشوق	نت	بجائے	ہمیشہ
تجہ لب	”	تیرے لب	کسو	”	کسی
توں	”	تو	مجھ	”	منھ
جیوں	”	جب	سیں	”	سے
ہور	”	اور	اپس	”	اپنا

اس دور میں صدہا شاعر ہوئے جنہوں نے دادِ سخن دی اور اپنے کلام کو یادگارِ زمانہ چھوڑا۔ ان شاعروں میں بیسیوں ایسے ہیں جو دربار کے امیر اور صاحب مال و دولت تھے۔ بیسوں ایسے ملیں گے جو صاحب حال وقال تھے۔ پیری مریدی ان کے گھرانے کی میراث تھی۔ کوئی رند نظر آئے تو کوئی صوفی وقت ہوگا۔ غرض ہر طبقہ نے میدانِ شعر و سخن میں جولانی کی ہے۔ ان کی تعداد جن کے حالات دکھنی تذکروں[1] میں مندرج ہیں تقریباً دو سو ہوتی ہے۔ ان کے ناموں کی فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے۔ اس لیے صرف چند افراد کے تذکروں پر اکتفا کیا جائے گا۔

اس دور کے پہلے دکن میں عام طور سے مسلسل نظم مثنوی کا رواج تھا اور ہر ایک شاعر کوئی نہ کوئی مثنوی اپنی یادگار چھوڑتا تھا۔ لیکن اب ولی کے بعد ایک عام تغیر ہو گیا اور شعراء غزل کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے۔ ولی کی پیروی میں غزلوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور شعراء نے غزلوں کے دواوین زیادہ سے زیادہ مرتب کرنے شروع کیے۔ اس کے ساتھ مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور رباعی کی مشق بھی انہوں نے جاری رکھی۔

سلاطینِ قطب شاہی اور عادل شاہی کی طرح سلاطینِ آصفیہ نے بھی اردو میں شعر کہے ہیں۔ سب سے پہلے ان کے کلام کو پیش کیا جاتا ہے۔

---

(۱) آصف — نواب میر قمرالدین آصف جاہ اوّل فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ فارسی میں بہ کثرت کلام ہے۔ آصف اور شاکر آپ کا تخلص تھا۔

---

[1] گلشن گفتار، ریاض حسنی، تذکرۂ تمنا، چمنستان شعراء، ان میں سے نمبر ۱-۳-۴ شائع ہو گئے ہیں اور صرف نمبر ۲ ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔

عبدالقادر بیدل سے اصلاحِ سخن لی ہے۔ اُردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

کالی نہ کھو کوئی میرے دلبر کوں حسد سے
مجھ دل کی کلی بیچ دعا کی یمنی ہے[1]

شمیم کاکلِ مشکیں سے جب میں اونگ گیا
تو آئے کہنے لگے اس کو سانپ سونگ گیا

میں تنہا نہ تن بلکہ جاں بیچتا ہوں   یہ ہستی کی ساری دکاں بیچتا ہوں

دُور سے سمجھتا تھا میں منجاف کی تحریر ہے
پاس جا دیکھا تو خوں عاشق کا دامنگیر ہے

ادھر دیکھو تو کس نازو ادا سے یار آتا ہے
مسیحا کی موئی امت کو ٹھوکر سے جلاتا ہے

کس طرح سے ماہِ نو انجم کے عقدے وا کرے
ہوویں جہاں لاکھوں گرہ وہاں ایک ناخن کیا کرے

جی سے کہہ دو کہ آہِ سرد کے ساتھ   ٹہلتے ٹہلتے چلے تو چل نکلے

اس گلبدن کے غم میں رونا ہے عین حکمت
کرتی ہیں ضعیف دل پہ آنکھیں گلاب پاشی[2]

---

[1] ریاض حسنی (تذکرہ نسوت) و تذکرہ تمنا۔

[2] رسالہ نوائے ادب بحوالہ تحفۃ الشعراء فن تذکرہ فارسی نمبر (۱۲۲) کتب خانہ آصفیہ۔

(۲) ناصر آصف جاہ اوّل کے خلف الرشید نواب ناصر جنگ شہید المتوفی ۱۱۶۴ھ بھی فارسی کے شاعر تھے۔ ایک سے زیادہ دیوان موجود ہیں، آپ نے اُردو میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :-

نین تیرے شکار کرتے ہیں — دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رو جب سنگار کرتے ہیں — آرسی پر بہار کرتے ہیں
کسی بے داد سوں چمن میں آج — پھول سارے پکار کرتے ہیں
اہلِ دل گریۂ ندامت سیں — سیر ابرِ بہار کرتے ہیں
چشمِ بد دُور کہ دلبریں سارے — اپنے ناصر کوں پیار کرتے ہیں[1]

یار خورشید جہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا — ذرہ ذرے میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

مجھے بہاری گلی وال ہگویا خوش نہیں آتا
کھٹکتا ہے کلیجے میں وہ باریک سروالا[2]

اے کبوتر جا کے کہہ یوسف کو گو ہر سے نکل
چاہ سے تیرے زلیخا ہو گئی ہے باؤلی[3]

روزِ بد میں کس نے ہے یار در فافت کی اُمید
گر زوال آتا ہے ٹل جاتا ہے سایہ ساتھ سے[4]

اب بعض دیگر شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] تذکرہ فتوت۔
[2] تذکرہ شفیق۔
[3] بیاض مملوکہ مولوی [illegible] الدین مرحوم۔
[4] طبقات الشعراء۔ شوق۔

(۱۳) سراج سیّد سراج الدین سراج اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ درویش منش صوفی صافی تھے۔ ۱۱۲۷ھ میں تولّد اور ۱۱۷۷ھ میں انتقال فرمایا۔ بہت پُر گو شاعر تھے، صرف چار سال کے عرصہ میں ضخیم دیوان مرتب کیا جس کے پانچ ہزار شعر ہیں۔ اس میں ردیف وار غزلیں مثنویاں مخمس، ترجیع بند، رباعیات سب کچھ شامل ہے۔ مضامین کی شگفتگی، خیالات کی بلندی اور پھر کلام کی صفائی اور سادگی سے حیرت ہوتی ہے۔ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ کے شاعر ہیں۔ شمالی ہند کے تذکرہ نویس میر حسن اور میر کسی شاعر حمزہ کو ان کا استاد قرار دیتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ دکن میں کوئی شاعر اس تخلص کا نہیں گذرا۔ جہاں تک کہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے سراج کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔

سراج نے اپنے کلیات کے علاوہ ایک مثنوی "بوستانِ خیال" بھی یادگار چھوڑی ہے کلیات سراج پروفیسر سروری کے اہتمام سے شائع ہو گیا ہے۔ 'بوستان خیال' کے مخطوطے کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں۔ سراج کے کلام نے خود ان کی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی، ان کی غزلوں سے ایک طرف مجلسِ سماع میں صوفیا کو روحانی غذا بہم پہنچتی تھی تو دوسری طرف اہلِ ذوق کے لیے لطف و مسرت کا ساماں ہوتا غرض کہ دکھنی شاعروں میں سراج اپنی آپ نظیر تھے۔ ذیل میں نمونۂ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

بنئ سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن سرو کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کرو
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی یونہی دھری رہی

تری جوشش حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں عیاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دل بینوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

کافر ہوا وہ رشتۂ زنار کی قسم
تجھ زلف حلقہ دار کے ہر تار کی قسم

ہرگز مریضِ ہجر کو بن وصل نہیں علاج
اس کی ادا کی نرگسِ بیمار کی قسم

تیرے بھوؤں کی یاد نے ٹکڑے کیا ہے دل
ہے ذوالفقار حیدرِ کرّار کی قسم

درشن دکھا کے آتشِ غم کو میرے بجھا
میں تشنہ لب ہوں درشنِ دیدار کی قسم

اس گلبدن کے شوق سے گلشن میں اے سراج
گلزار لالہ زار ہے گلزار کی قسم

یار کا دیدار پا کر اے سراج　　شکر رحمٰن کر کہ تو واصل ہوا

اے سراج اپنی خودی کو بے خودی میں محو کر
شغل جاری رکھ ہر یک دم میں ہو الرحمٰن کا

تجھ قبا پر ہے نرگسی بوٹا　　گویا نرگس کا پھول ابھی ٹوٹا
لعل تیرے بھوؤں کی سنچی میں　　کیوں نہ یاقوت کو کہوں جھوٹا
عشق میں شوخ سنگدل کے سراج　　شیشہ ناموس ننگ کا پھوٹا

تو احد ہے، نام تیرا احمدِ بے میم ہے　　زیب پایا تجھ صفت سوں ہر ورق قرآن کا

دھوپ میں غم کے عبث جی کو جلایا افسوس
پیو کے سائے میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا
سب جگت ڈھونڈ پھرا پیو کو نہ پایا ہرگز
دل کے گوشہ میں مکاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

کیا شرابِ محبت نے دل کے خم میں جوش　　عجب نہیں جو قیامت تلک رہوں مدہوش

جامِ مئے الست سے بیخود ہوں اے سراج　　دورِ شراب شیشۂ پر دل سے کیا غرض

ہر قطرہ اشک درد کا بحرِ عمیق ہے　　مردم ہمارے چشم کا اس میں غریق ہے

الٰہی آہ کو آتش فشاں کر　　میرے آنسو کے پانی کو رواں کر

دریائے قناعت میں آزاد ہو جو آیا　　درکار نہیں ہرگز کشتی میں اسے لنگر

رُباعی

تجھ غم میں ہے رنگ زرد باناں میرا　　دشوار ہے ہر کسی کو پاناں میرا
درکار نہیں کہ تجھ گلی میں جاؤں　　آناں تیرا ابھی ہے جاناں میرا[1]

سراج اور میر کا زمانہ ایک ہی ہے، شاہ سراج کی کئی غزلیں میر کے ہم ردیف ہیں
بعض کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

عشق نے خوں کیا ہے دل جس کا　　پارۂ لعل اشک ہے تس کا
چشمِ ساقی کے وصف لکھتا ہوں　　لے قلم ہات شاخِ نرگس کا

---

[1] سراج کا کلام دیوان قلمی کتب خانہ آصفیہ سے لیا گیا ہے۔

بے کسی مجھ سیں آشنا ہے سراجؔ　　نہیں تو عالم میں کون ہے کس کا

میرؔ کی ایک اور غزل ہے:-

میرے سنگِ مزار پر فرہاد　　رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد

سراجؔ کی غزل ہے:-

تجھ جدائی میں اے بہارِ مُراد　　خوب لگتی نہیں چمن کی یاد

(میرؔ)

موند آنکھیں سفرِ عدم کا کر　　بس ہے دیکھا نہ عالمِ ایجاد

(سراجؔ)

نظر آیا ہے قد ترا مجھ کوں　　سرو آزاد گلشنِ ایجاد

(میرؔ)

ہر طرف ہیں اسیر، ہم آواز　　باغ ہے گھر ترا تو اے صیّاد

(سراجؔ)

دل ہمارا ہے مرغ دست آموز　　رحم لازم ہے اس پہ اے صیّاد

سراجؔ کی مثنوی کا نمونہ:-

دو ہی بے خودی نے کیا تھا ہجوم　　دو ہی کشورِ دل میں تھی غم کی دھوم
دو ہی آہ و زاری مرا کام تھا　　دو ہی حال کیا صبح، کیا شام تھا

---

(۴) صمصامؔ قبل[1] ازیں میں نے بیان کیا ہے کہ زبان اُردو میں ہر کس و ناکس نے طبع آزمائی کی ہے۔ امیرؔ سے لے کر ایک خانہ نشین فقیر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ایک طرف خانہ سراجؔ جیسے ایک آزاد منش درویش نے اُردو کی خدمت کی ہے تو اسی طرح اپنے وقت کے دیوان میر عبدالحیٔ خاں صمصام الملک نے بھی اس کی خدمت بجا لانا اپنے لیے باعثِ فخر تصوّر کیا ہے۔ عبدالحیٔ خاں کو آصف جاہ نے قلمدان وزارت سرفراز فرمایا تھا۔ اورنگ آباد ان کا وطن تھا۔ ۱۱۴۲ھ میں تولد

---

[1] فتوت۔

ہوئے اور سنہ ۱۱۵۰ھ ان کا سنہ وفات ہے۔[1] صارم تخلص تھا۔

میں مدّت کے بعد ایک دم جو سویا دیکھوں تو مجھ کنے ہے صنم گویا

سجن تجہ زلف میں ہل ہل رہا ہے ہمارے ہاتھ میں کب دل رہا ہے
نہیں کُھلتا بہار و باغ سوں دل یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

ازبسکہ تم اب عشق کی سیکھیں گھاتیں سب بھول گئے شادی کی باتیں

مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں دہاں کرتا
کہاں اس کا خدا کی سوں اے یارو[2] بجاں کرتا

---

(۵) **اَعظم**[3] سید اعظم نام، اَعظم تخلص، برہان پور وطن تھا اور ولیؔ کا زمانہ دیکھا تھا۔

دل شمع نمن گل ہو جلانا مزہ جانا
معشوق کے اسرار چھپانا مزہ جانا

کعبہ کی عبادت میں حلاوت نہیں پایا
محراب میں تجھ بھوں کی دوگانا مزہ جانا[4]

---

(۶) **اَبدال** مرزا ابدال بیگ نام، اَبدال تخلص، برہان پور کے رہنے والے تھے حمیدؔ نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن

[2] " " "

[3] گلشنِ گفتار۔

[4] " "

دل جب سیں تجھ عشق میں مجھ سے جدا ہوا	بھڑکا، جلا موا، نہیں معلوم کیا ہوا
کیا بے وفا ہے دل کہ تری یک نگاہ سیں	بیگانہ ہو کے مجھ سے ترا آشنا ہوا
کوچے سے آہ آج پری رو کے دل مرا	آیا نہیں ہے پھر کے اسے کیا بلا ہوا
سینے میں آہ، دل میں طپش، اشک چشم میں	شہرائے عاشقی کا مرے جا بجا ہوا
غمزہ سیں مارتا ہے جلاتا ہے ناز سیں	کیا ملکِ حُسن کا صنما تو خُدا[1] ہوا

---

(۷) غضنفر — غضنفر حسین کا بھی یہی زمانہ ہے۔ قدیم شعراء کی طرز پر ایک مثنوی بھی لکھی ہے، جو جنگ نامہ عالم علی خاں سے موسوم ہے۔ اس میں آصف جاہ اوّل اور عالم علی خاں کے واقعاتِ جنگ تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ رسالہ اُردو[2] میں یہ مثنوی شائع ہوئی ہے۔ شاعر کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہیں :۔

اوّل حمد واجب ہے کرتار کا[3]	دو عالم کے وارث خریدار کا
قضا اور قدر جس کے ہے ہاتھ میں	نہیں شک شبہہ کچھ کسی بات میں

ہر آن آ پڑی مار تلوار کی	بڑے زور کی اور بڑے مار کی
عزیزاں گئے چھوڑ سارے نکل	نمک کی شرط نار کھے گئے نکل
جدھر دیکھتا ہے اودھر مار مار	کیا جو رضا پاک پروردگار
سٹیا ہات ہت سوں شمشیر پر	سو مارے دیکھو جھٹکہ ہووے اوپر
لہو لال موں کے اوپر یہ چلا	اودھر کا اودھر جابہ جا یہ چلا
لئے ڈھان موں پر اپس کو چھپائے	ایدھر کا اودھر مارکوں موں چکائے[4]

---

[1] گلشنِ گفتار

[2] جنوری ۱۹۳۲ء۔

[3] رسالہ اُردو کی مطبوعہ مثنوی کے علاوہ مخطوطہ مملوکہ عبدالمجید صاحب وکیل کنٹر دیکھا گیا۔ یہ مثنوی انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع ہوگئی ہے۔

(۸) شاہ میر

اس دَور کے ایک صوفی اور شاعر شاہ میر ہیں۔ آپ کا نام سیّد محمّد حسین تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری کی اولاد میں شامل تھے۔ ۱۰۸۱ھ میں تولّد ہوئے۔ یعنی آپ کا بچپن بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا آخری دَور ہے، کئ انقلاب آپ کی نظر سے گذرے۔ ۱۱۸۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کو اپنے والد سے بیعت اور خلافت حاصل تھی۔ آپ کے مُریدوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ایک سو پانچ سال کی عمر ہوئی۔ آپ کا مزار تلپول ضلع اننت پور (آندھرا) میں واقع ہے ۵ جمادی الثانی کو ہر سال آپ کا عُرس ہوتا ہے۔

شاہ میر کی نظم اور نثر کی کئی ایک تصانیف دستیاب ہوتی ہیں جن میں سے اسرار توحید، رسالہ غیبت، رسالہ قادریہ، عقائد صوفیا، دیوان قابلِ تذکرہ ہیں۔ یہاں نظم کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

ذات کو ہر شے کے تمئیں ہے انقلاب — اور صفت کو انفکاک و انسلاب
جوں کہ آب آتش نہووے عکس نیز — سلب نا ہوئے حرق آتش غرق آب
تا ہووے صرف عدم محض وجود — حال بے داری نہووے حال خوب
نام مبدل، ذات متغیر صفات — بہ عقاید سنت دراہ صواب
ذات کو ہر دم تلبّس ہے ولیک — صورت ہر وصف سے لے کامیاب

اے دل پچھاں تن کو تیرا ہے سرا یہی — ماوا یہی، معاد یہی، ملتجا یہی
پہچان لے تو جینے تک اس تن کی ماہیت — مقصد یہی، مُراد یہی، مدّعا یہی
نا بوج اپنے تن کو ہوئے ہیں بہت خراب — غفلت یہی، حجاب یہی اور عمٰی یہی
کامل ہیں معرفت میں وہ کہتے ہیں تن کی بات — مبدا یہی، معاد یہی، منتہا یہی
ہے تاجران طالق معنی کو بے گمان — دریا یہی، جہاز یہی، ناخدا یہی
جو طالبان نقد حقیقت ہیں ان کے تئیں — پارس یہی، تجار یہی، کیمیا یہی
جامع ہے تن ترا، یہ مجازِ حقیق ہے — پانی یہی، سراب یہی اور ہوا یہی
اس تن کو حق سمجھ کے تو مشغول رہ مدام — روزہ یہی، نماز یہی اور دُعا یہی

... ...

کہتا ہے میر پیر کے ارشاد سوں نہ آپ　　اللہ یہی، رسول یہی، رہنما یہی

تیرا خدا ہے جو کہ ترے سے جدا نہیں　　جو کوئی جدا ہے تجھ سے او تیرا خدا نہیں
ہے آفتاب روز سے یک دم نہیں جدا　　گر ہو جدا تو جان وہ شمس الضحیٰ نہیں
تیرا نبیؐ نہیں ہے ترے سے علیحدہ　　جو ہے علیحدہ، وہ پیغمبر ترا نہیں
جیسا کہ اصل چھاؤں سے یکدم نہیں جدا　　گر ہو جدا تو اصل اوس چھاؤں کا نہیں
جو رہنما ترا ہے ترے ساتھ ہے مدام　　گر ہو نہ تیرے ساتھ، ترا رہنما نہیں
بیدل کے ساتھ جو کہ رہے دلربا مدام　　نا ہوا گر وہ ساتھ ترا دلربا نہیں
کہتے ہیں جس کو خلق محمدؐ وہ ہے خدا　　یعنی خدا جدا وہ محمدؐ جدا نہیں[1]

---

(۹) **خاکی**[2]　سید محمد قادری نام اور خاکی تخلص تھا۔ ولی کا زمانہ دیکھا ہے۔ دیوان ہنوز شائع نہیں ہوا۔ ریختی میں[3] بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مرحوم مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شیروانی کے کتب خانہ میں ان کا دیوان موجود ہے۔

پیا بن اے سہیلی انجنوں سے مکھ دھوتی ہوں
تجھی میں متمنع گھرا اندھارا دیکھ روتی ہوں
رہوں کیوں ابتدا میں میں وے جب انتہا مجھ کو
فانی الشیخ ہو کر میں بقا باللہ ہوتی ہوں[3]

---

(۱۰) **محرم**[4]　محمد ماہ نام، محرم تخلص، معظم خاں خطاب تھا۔ شجاعت خاں صوبہ دار برار کے فرزند تھے۔ شفیق نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔

---

[1] نوائے ادب جولائی ۱۹۵۲ء

[2] قنوت۔

[3] تذکرہ ریختی تمکین

[4] چمنستان شعرا شفیق۔

شاخ کی مینا کو کس شوخی سے لاتی ہے بہار
گُل پہ شبنم نہیں اس کو مے پلاتی ہے بہار

نزاکت بس کہ رکھتا ہے وہ دلدارِ جہاں آرا
صفائی آئینہ ہے باز اس کے عکس عالی کا

---

(۱۱) داؤد مرزا داؤد نام اور داؤد تخلص۔ اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد بلخ سے آئے تھے۔ داؤد کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی دکن اور شمال کے تذکروں میں ان کا تذکرہ موجود ہے، ۱۱۶۸ھ میں داؤد کا انتقال ہوا۔ ان کے دیوان کے مخطوطات حیدر آباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ڈاکٹر خالدہ صاحبہ نے دیوان کو مرتب کرکے ادارہ ادبیات اُردو کی جانب سے شائع کیا ہے۔

داؤد کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولی کا تتبع کیا کرتے۔ بعض کا خیال ہے کہ ولی کے شاگرد بھی تھے۔ ان کے فرزند جمال اللہ عشق بھی اچھے شاعر تھے۔ داؤد کے کلام کا نمونہ پیش ہے :-

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں آج سرو قامت کو
ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا

قانون شفا نطق میں ہے یار کے موجود — اے دل نہ ہو محتاج طبیباں کی دوا کا

مرا احوال چشم یار سے پوچھ — حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ
مرے حالِ پریشاں کی حقیقت — صنم کے زلف کے ہر تار سے پوچھ
مری ہر ایک صدائے راہ کا پیچ — سجن کے چہرۂ بلدار سے پوچھ

آتش عشق سوں ترے جل جل — دل ہوا دل ہوا کباب کباب[1]

---

[1] از دیوان داؤد۔

جگ ہے مشتاق پیو کے درشن کا کس کوں نیں احتیاج درپن کا

صاف دل ہے جو آرسی مانند نت ہے حیراں جمال روشن کا

گرچہ ہونا ہے عیب پوش جہاں کسب کر اختیار سوزن کا

کیوں نہ ہو عاشقی میں خوفِ رقیب ہر سفر میں خطر ہے رہزن کا

زہد زاہد ہے خوف محشر سوں تاب نامرد کوں کہاں ان کا

خاک ہے یار کی گلی مت چھوڑ گرچہ کچھ مدعا ہے دامن کا

صبر کر ہجر میں توں اے داؤد دیکھنا ہے اگر سریجن کا

دیکھ لٹکا سجن تری لٹ کا اوس کی ہر مو بمو میں دل اٹکا

آبِ تیغ نگہ کے پیاسے کوں کم نگاہی کی مار مت پٹکا

غمزہ تیرا عجب سپاہی ہے جس کی دہشت سوں بوالہوس سٹکا

عشق کا زہر اوس سوں کیوں اوترے ناگ تجہ زلف کا جسے چٹکا

ہوش داؤد کا ہوا لٹ پٹ دیکھ کر تیری ناز کا لٹکا

کھول اے شوخ زلف پرچیں کوں رشتۂ کفر و سبحۂ دیں کوں

کیوں نہ دیکھوں سجن ترے رخسار شوق گل ہے مدام گل چیں کوں

نور خورشید کا ہوا ہے زرد دیکھ تیرے لباسِ زرّیں کوں

کوہ کن سر پہ مار کر تیشہ جان شیریں دیا ہے شیریں کوں

جو کہ رنگیں خیال ہوئے داؤد وہ پڑھے تیرے شعرِ رنگیں کوں

---

(۱۴) عاشق

میر یحییٰ عرف عاشق علی خاں المتخلص بہ عاشقؔ، برہان پور وطن تھا۔ آصف جاہ اوّل کی رفاقت میں اورنگ آباد آ گیا اور یہاں ہی عمر گذار دی۔ علم و فضل اور انشا پردازی کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح شعرگوئی میں پوری مہارت تھی۔ فتح علی گرویزی، علی ابراہیم خاں وغیرہ نے ان کا حال لکھا ہے۔ شیداؔ سے تلمذ تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری نے بھی اپنے تذکرہ میں

ان کا ذکر کیا ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو میں ایک مختصر دیوان موجود[51] ہے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

صفحۂ دل پر کتابت کر کے بسم اللہ کا ۔۔۔ تحفۂ صلوات لکھتا ہوں رسول اللہ کا
بضعۃ منی جسے فرمائے ہیں حضرت رسولؐ ۔۔۔ جی سیں کہلاتا ہوں بندہ خاص اس درگاہ کا

ولی سن یہ غزل عاشق کہتا اگر ہوتا ۔۔۔ رہا کر سگ ہو تو دایم نبیؐ کے آستانے کا

جب ملے شیدا سا کوئی اوستاد صاحب معرفت ۔۔۔ خوب ظاہر ہوئے عاشق بھید عشق اللہ کا

یارو شفق میں ڈوب گیا آفتاب سب ۔۔۔ دیکھ اوس صنم کے طرۂ زرتار کی لٹک
عاشق جو گُل رخوں میں نہیں ہوش کیا عجب ۔۔۔ سُن یار کی زباں سیں مجھ اشعار کی لٹک

تنگ کرتا ہے سریجن کا تغافل رنگ رنگ
پیچ دیتا ہے پریشانوں کو کاکل رنگ رنگ[52]

جام کو لب سے آشنا مت کر ۔۔۔ نام اوس کا پیا کٹورا ہے

ہر ایک ساغر کے پیچھے چومنا تپہ دہن اوس کا
گزک عاشق علی خاں کو مستی میں بھاتی ہے

ہات پر ہات میرے دھر کے چلے آنا سات
دیکھ طالع کے مدد آج پڑی برسا ہات

---

[51] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۶۹۔

[52] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۶۹۔

جس وقت جان نکلی مجھ پاس کوئی نہ آیا
شمشیر تیری ایک دم بیٹھی تھی میرے سر پر

ہیں شہیدِ کربلا سب سُرخ پوش مصطفےٰ کی آل کا کیا رنگ ہے[1]

---

(۱۳) ایماؔر عاشق علی خاں ایماؔر، خوشحال خاں ان کے نانا کا نام ہے۔ خوشحال خاں کا عالمگیری عہد میں بادشاہ کے زمرۂ منصبداران میں شمول تھا۔ ایماؔر نظام الملک آصف جاہ کے منصب داروں میں شامل تھے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی سے بھی واقفیت تھی۔ شعرگوئی اور تاریخ گوئی کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ۱۱۷۲ھ سنہ وفات ہے۔[2]

طبیبِ عشق سیں پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا

عاشق نہیں ہے تجکو کچھ خوفِ معصیت کا دوسی رضا بنیں گے امام ضامن اپنا

کیوں نہ گھبراوے وہ کمان ابرو واسطے جس کے کھینچتے ہیں چلے[3]

---

(۱۴) عاصیؔ نور محمد[4] نام، عاصیؔ تخلص، برہانپور کے باشندہ تھے۔ ان کے باپ عالمگیر کے زمانہ میں کاشغر سے برہان پور آئے تھے۔ آصف جاہ اوّل کے ایک صوبہ دار نصیر الدولہ کی ملازمت اختیار کی۔ عاصیؔ کی یہاں

---

[1] تذکرہ محبوب الزمن صفحہ ۸۴۳۔

[2] ” ” ”

[3] تذکرہ شعرائے دکن گلزار آصفیہ۔

[4] فتوت وشفیق۔

پیدائش ہوئی۔ کم عمری میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ شاعری شروع کی۔ محمّد علی تسلیم کی شاگردی اختیار کی۔ نصیر الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا اس کی بنا پر داروغۂ قلمدان بنائے گئے۔ نصیر الدولہ کے انتقال پر راست آصف جاہ کی سرکار سے عاصی کا تعلق قائم ہو گیا۔ اور پھر ناصر جنگ اور صلابت جنگ کے زمانہ میں بھی سرکار آصفیہ کے نمک خوار رہے۔ ۱۱۷۵ھ میں انتقال ہوا[1]۔ چند مثنویاں تصنیف کیں جن میں سے خلاصۃ المعات اور انواع العلوم کا پتہ چلتا ہے[1]۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

تجھ غم کی آگ دل میں رکھا ہوں چھپکے میں — ڈرتا ہوں تا فلک نہ اُڑے یہ شرر کہیں

تجھ قد کی جب سے نقل کیا ہے چمن میں جا — دیکھا نہ تب سے سرو نے روئے ثمر کہیں

سمجھے ہیں ہم کہ اب کہیں تم نے ہے دل دیا — بیٹھے کہیں ہو، بات کہیں ہے نظر کہیں

کیا ظلم ہے اے سوئی پلکوں والے — آہستہ سیو زخم ہیں دل کے آئے[2]

---

(۱۵) مہر

مہر علی[3] نام اور مہر تخلص تھا۔ کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ مرزا محمّدی بیگ مرزا سے اصلاحِ سخن لی ہے۔ سراج اورنگ آبادی سے ہمعصری تعلق ہے۔ ان کی رنگین خیالی اور خوش فکری کی شفیق نے بڑی تعریف کی ہے۔ ۱۱۷۸ھ میں انتقال ہوا۔

خاک ہونا کیمیائے عشق کی تدبیر ہے — پارۂ بیتابئ دل مارنا اکسیر ہے

آبروپائی شجاعت نے عطائے فخر سے — موج نقش بوریائے جوہرِ شمشیر ہے

مہر سے ذرہ فلک ہے اس کے پرتو کا شہود
جلوۂ شاہِ جہاں بے شبہ عالمگیر ہے

۱۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔
۲۔ تذکرہ شعرائے دکن فنوت۔
۳۔ شفیق [illegible]

زاہدِ خشک کو شراب نہ دو — آگ دو خار و خس کو آب نہ دو

سوزِ دل سے آہ کی بہر کی اُٹھاؤں تو سہی
خرقۂ پشمینۂ زاہد جلاؤں تو سہی

پڑھ نماز یار تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ
تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی[1] اپنی نبیڑ

اسی مضمون کو تقریباً ایک صدی بعد خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ دہلوی (متوفی ۱۲۷۱ھ) نے یوں ادا فرمایا ہے ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو — تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

یہ توارد بہت دل چسپ ہے۔

---

(۱۶) عاجزؔ عارف[1] الدین خاں عاجزؔ دکن کے مشہور شاعر ہیں۔ ان کے باپ اورنگ زیب کے عہد میں بلخ سے ہندوستان آئے تھے۔ عاجزؔ کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ دربارِ آصفی میں باریابی کا شرف حاصل تھا منصب بھی حاصل تھا۔ فوج کے بخشی بنائے گئے تھے۔ فارسی اور اُردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ ان کی یادگار ایک مثنوی "لال و گوہر" اور دیوان ہے۔ یہ دونوں کتب خانۂ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ یورپ[3] میں بھی ان کے نسخے موجود ہیں۔ ادارہ ادبیاتِ اُردو میں بھی ان کا ناقص دیوان موجود ہے۔ دکن کے ہر ایک تذکرہ نویس نے ان کا ذکر بڑی تعریف سے کیا ہے۔

بعض اصحابِ مثنوی "لال و گوہر" کو عاجزؔ کی تصنیف اس لیے خیال نہیں کرتے

---

[1] شفیق و تمنا

[2] حمید، فتوت، شفیق و تمنا

[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۵۲۵

کہ وہ صاف اور سادہ زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ مگر عاجزؔ کے کلام کی یہ کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ وہ تمام تر سنگلاخ زمینوں میں ہی ہوتا ہو۔ ان کے دیوان میں دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ ۱۱۸۵ھ میں عاجزؔ کا انتقال ہوا۔ عاجزؔ اپنے عہد کے ایک باکمال شخص تھے۔ ان کی مثنوی "لال و گوہر" بڑی مشہور مثنوی ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانۂ آصفیہ، ادارہ ادبیات اُردو اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں موجود ہیں۔ عاجزؔ اپنے زمانہ میں استادِ سخن تسلیم کیے جاتے تھے۔ نمونہ کلام درج ہے ؎

مثنوی لال و گوہر

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی ‫ ‫ عطا کر مجھ کو یاقوتِ معانی
سخن کا لعل دے میری زباں کو ‫ ‫ دُرِ معنی سے بھر میرے بیاں کو

کروں میں دشت کی کیوں کر صفت کو ‫ ‫ زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار ‫ ‫ اجل کا کھیت تھا وہ دشت خونخوار
بیابانِ عدم کے تھا برابر ‫ ‫ وہاں تھا جہاں عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی ‫ ‫ وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی باد تھی شوریدہ صرصر ‫ ‫ وہاں کی کنکری تھی مثل اخگر
بگولا تھا وہاں دن رات قائم ‫ ‫ وہاں چکر سرا اندھی تھی قائم
کبھی سردی سیں ہر ہر کانپتا تھا ‫ ‫ کبھی گرمی سیں دم ہر ہانپتا تھا

کبھی روتا تھا نیستاں کو نظر کر ‫ ‫ غرض ہر حال میں کہتا تھا گوہر

الٰہی کب دلِ غمگیں ہمارا شاد ہووے گا ‫ ‫ یہ اُجڑا شہر یارب کس گھڑی آباد ہووے گا

اداسیں گر ہماری بزم میں وہ فتنہ ساز آوے ‫ ‫ بجا کر مہر کا دف چرخ کھا کھا کر گرے زہرا

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا ظہورِ حق کو دیکھا، خوب دیکھا، باضیا دیکھا

تمہارے پنجۂ رنگیں کو گر چمن دیکھے اُڑے گلوں ستی رنگِ بہار ہاتوں ہات

نہ پیچ و تاب ہوا سے ہے آب میں گرداب
یہ میری اشک کے آگے کرے ہے جیحوں رقص

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اجڑا سمجھوں مشت خاک اپنی اُڑا کر اسے صحرا سمجھوں

ہے عاشقوں کو پند و نصیحت سے احتیاط مستوں کو جیسے واعظ کے صحبت سے احتیاط

اس کے ہم دامِ محبت میں پھنسے ہیں عاجز بال جس شوخ ستمگر کے گھنگروالے ہیں

تم بن اب آہ دل میں لگی ہے کھٹ پٹ
آنکھوں سے اشک پل پل گرتے ہیں لال پٹ پٹ

---

(۱۷) درگاہ[1] درگاہ قلی خاں المتخلص بہ درگاہ مومن الدولہ سالارِ جنگ بہادر خطاب تھا۔ خاندان قلی خاں کا فرزند تھا۔ خاندانِ نواب سالارِ جنگ کے آپ ہی مورثِ اعلیٰ ہیں۔ آصف جاہ اوّل نے آپ کی سرپرستی فرمائی اور جس وقت آپ کی عمر صرف چار سال کی تھی، جاگیر اور منصب سے سرفراز فرما دیا تھا۔ بیس سال کی عمر سے آپ آصف جاہ اوّل کے ہمرکاب رہنے لگے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ مرحوم کے زمانہ میں آپ کے مدارج میں مزید ترقی ہوئی۔ خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ ایک زمانہ تک صوبہ خجستہ بنیاد کے صوبہ دار رہے۔ ۱۱۷۹ھ میں خدمت سے

---

[1] تمنّا

علیحدگی اختیار کر کے اپنی جاگیر میں گوشہ نشین ہو گئے۔ ۱۱۸۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ جاگیر سے لاش اورنگ آباد لائی گئی اور باپ کے مقبرہ میں دفن کیے گئے۔ فارسی کے آپ اچھے شاعر تھے۔ اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر مرثیے کہا کرتے تھے۔ کتب خانہ سالارِ جنگ میں آپ کے مرثیے موجود ہیں۔

نمونہ قصیدہ

پڑی ہے آ کے گلے ناگہاں بلائے سفر
سفر نہیں ہے سفر بل سقر سے ہے بدتر

زبان خامہ ہے اس کے بیان میں عاجز
ہے جس کا شمۂ کلفت حساب صد دفتر

اسیر پنجۂ تعذیب صامت و ناطق
غریق لجۂ تخریب ہے گا سب لشکر

نہیں ہے تختۂ بازار پر اناج کی جنس
نہ محلّہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر

گیہوں کی جنس ہے نایاب مثلِ آدم خوب
مثل میں نظر آتی نہیں ہے اب تو

مگر ذخیرہ کیا ہوئے ماش خوروں نے
ہے دال ان کی رکاکت پہ باکمال ہنر

ہوا ہے قحط سے دیکھو دو باجرا عالم
نہیں ہے ہمّت اک جو کسی میں بل کمتر

... ...

اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند
کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر

کھڑا ہے آ کے سرہانے پہ پیر نورانی
لطیف عنصر و خوش منظر و خجستہ سیر

کہا کمالِ عنایت سے کیا ہے فکر تجھے
ہے تیرے کام کا حامی امامِ جنّ و بشر

شہ سریر کرامت امیر کلّ امیر
ولیٔ حضرتِ مولیٰ وصیِّ پیغمبر

امامِ جنّ و ملک تاجدار ملک و ملک
کہا ہے لحمک لحمی جسے شہِ سرور

فزوں جو حدِّ بشر سے ہے منقبت اس کی
ہوا ہے مشرقِ خاطر سے مطلع دیگر

جنابِ اقدسِ حیدر ہے وصف سے برتر
یہاں ہے وصف سے عاجز لبِ زبانِ بشر

مراد بندۂ درگاہ روز ہے کہ کرے
ابوتراب کی تربت کی خاک کحل بصر[1]

بغیر اوس کے کہو، کون شاہ مردان ہے
خدا نے سیف دیا اور رسول نے دختر

---

[1] دہلی بارہویں صدی ہجری میں۔

پکھراج غم سے زرد زمرد ہے زہر نوش   موتی کے دل میں چھید ہے نیلم سیاہ پوش

اس دکھ سے اس دل یا قوت ہے خموش   مرجاں لہو و لعل بدخشاں لہو لہو

فریاد کرکے شاہ شہیداں کہے خدا   چھوٹے بڑے شہید ہوئے کوئی نیں رہا
جینا ہے تلخ ہائے نہیں زندگی روا   ہے گا وداع اہلِ حرم سخت اب بلا
کلثوم و شہربانو و زینب یہ ماجرا   سُن کر گرے ہیں پاؤں پہ مل پچھاڑ کھا
جاتے کہاں ہور چھوڑ ہمیں وا مصیبتا   ہم سب کریں گے جان تیرے پاؤں پر فدا
اے وارثِ غریباں بہر خدا مرد   بے یار و، بے برادر و بے آشنا مرد[1]

---

(۱۸) **حاجی**[2] میر اکبر علی نام اور حاجی تخلص، رمل میں کافی مہارت تھی۔ مظہر، تاباں اور سودا کا زمانہ دیکھا ہے۔

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال توں
غصّے کی تیری ہم نے یہ نظریں پچھانیاں

بھٹکتے باغ میں پھرتے ہو کیوں اے عندلیبو تم
چمن میں گل ہزاروں ہیں وے اس گل کو آؤ دیکھو

چشم شہلا دیکھ اس کی ہو گیا مخمور دل
کیوں کر بھولے مجھ سے ایسے نرگستان کی بہار
اس کے دامِ زلف میں حاجی ہوا پابند آج
ہے پریشاں جس کے آگے شبستاں کی بہار

---

[1] بیاض مراثی
[2] چمنستانِ شعراء

کل تو پیارے گھر میں تم آؤ گے یا نہیں
اپنا جمال ہم کو دکھاوگے یا نہیں
جلتا ہوں جیوں سپلند تمہارے فراق میں
آتش کو دل کی جان بجھاوگے یا نہیں[1]

---

(۱۹) رحمت خواجہ رحمت اللہ نام، رحمت تخلص، ایک صوفی بزرگ تھے جو دکن میں مشہور رہیں۔ خواجہ صاحب تورانی الاصل تھے اور سادات حسینی سے تھے۔ آپ کے والد، آصف جاہ اوّل کے ہمراہ دکن میں آئے تھے، اس کے بعد بیجاپور کے ایک گاؤں بگاؤں میں اقامت کرلی، رحمت اللہ یہاں تولد ہوئے۔ جوان ہوکر حاکم کرنول کی ملازمت میں شامل ہوئے۔ مگر جب سیّد علوی بیجاپوری کے مُرید ہوئے تو دنیا ترک کردی۔ مکّہ معظمہ گئے وہاں سید اشرف مکّی سے فیضِ باطنی کا اکتساب کیا۔ واپس ہوکر مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے کرپہ آئے۔ یہاں ادوگیر کے قلعہ دار عبدالقادر خاں نے آپ کے نام پر رحمت آباد، آباد کیا، ادوگیر میں خواجہ رحمت اللہ کا انتقال ہوا۔ خواجہ رحمت اللہ" نائب رسول اللہ" کے نام سے مشہور ہوئے[2]

خواجہ صاحب شاعر تھے، چند مثنویاں آپ کی یادگار ہیں۔ ان میں سے ایک 'تنبیہ النساء' ہے۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے اس میں عورتوں کے لیے نصیحتیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے کئی نسخے کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو، کتب خانہ سالارِ جنگ وغیرہ میں موجود ہیں[3]۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

حمد بے حد ہے اوسی سبحان کو — جو کیا پیدا جسم اور جان کو
وہ جہاں کا خالق ودائم ہے او — سب فنا آخر کے تیں قائم ہے او

---

[1] چمنستان شعراء۔

[2] اولیاء دکن جلد اوّل صفحہ ۳۶۳۔

[3] تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۱۷۰۔ کتب خانہ سالارِ جنگ وضاحتی فہرست۔

بد رسم اون کے چھڑانے کے بدل — میں کیا مشترک رسم سارے نقل
کفر کے چن چن رسم .بولیا ہوں میں — شک وشبہ کے سب گرہ کھولیا ہوں میں
جو سخن سانچا اتھا .ر حق تمام — بے ملاحظہ ہو گیا مطلق تمام
فاضلاں کو بات ، یہ نایاب ہے — جاہلاں کے تیں جگر میں لات ہے

نام تنبیہ النسا، اس کا دھروں — مشرکاں کے رسم سب ظاہر کروں
یا الٰہی اپنی رحمت فضل کر — رات اور دن رحمت اللہ کے اوپر

خواجہ صاحب نے معاشرتی اور مذہبی برائیوں کو نہایت سخت اور بلیغ الفاظ میں واضح کیا ہے اور نہایت عریاں الفاظ میں ان کو بیان کیا ہے انہوں نے .بُرے رسوم اور رواج کی بُری طرح خبر لی ہے اور مذمت کرتے ہوئے مضحکہ اُڑایا ہے طنز نگاری کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

سن سُہاگن بات میری رکھ فام — دیکھو تو فقہ عقائد میں تمام
سب کتاباں میں نکاح مذکور ہے — رسم تیرا کس میں نہیں منظور ہے
بد کے عار دس نوشہ کو جواز — دوزخی مت ہے چھوڑا روزہ نماز
کیسے رسماں ڈھونڈ کر کاڑی ری تو — کانکی زسو کی پوجاری .بنی ری تو
رقص شادی میں کرانا ہے گناہ — بی مراسن کو بلانا ہے گناہ

... ...

ویسے بی بی کا نکاح ایسا ہوا — کہا سب تو یہاں جو کرتے چلو ہا

---

(۲۰) ہدایت

ہدایت اللہ خاں شمالی ہند کے باشندہ تھے۔ حیدر آباد آکر یہاں ہی مقیم ہو گئے۔ پہلے امیر بیگ کے ملازم ہوئے۔ پھر شمس الامرا، کی پائیگاہ میں منتقل ہوئے۔ شمس الامرا، کی سرپرستی حاصل رہی ۔ قصائد اور ہجو دونوں لکھا کرتے، قصائد میں ہدایت اور ہجو میں افسق تخلص کرتے تھے ان کے قصائد تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں ، اس میں آصف جاہ ثانی کے عہد کے بعض حالات درج ہیں۔ ۱۱۹۶ھ کے لکھے ہوئے قصائد کا ایک مجموعہ ادارہ

ادبیات اُردو میں موجود ہے[1]۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :۔

ایسا بلند جس کا وہ عشرت محل ہے خاص — اطلس سے آسماں کے جسے سائباں رہے
کھیچے سواد صحن کا اوس کے بیاں اگر — مشتاق اوس کو دیکھنے باغ جناں رہے
قامت سا گُلرخوں کے ہر یک جس کا سرو سبز — فیض نسیم صبح سے جلوہ کناں رہے
آب و ہوا کے جس کی تفرج کے خرچ سے — ہر غنچہ دل کا گُل سا شگفتہ وہاں رہے
قالیں کے جس کے فرش کا گلزار دیکھ کر — نرگس کی چشم وا بہ سوئے آسماں رہے
احمر، بنفشہ، سوسن و سنبل چمن چمن — زیب روش سے فرش کے کمتر نشاں رہے
بارِ ثمر سے مجرے کو خم ہووے ہر نہال — رونق فزا جب اس میں وہ شاہ جہاں رہے
رقصاں بمثل حور کے ہر اہلِ رقص وہاں — طاؤس سا یہ زیب مسرت کناں رہے
ایسی طرح سے بزم طرب گرم ہوئے وہاں — ہر عندلیب بخوشی غزل خواں رہے

اس قصیدہ کا مطلع ملاحظہ ہو :۔

ہے دل میں جب تلک کہ مرے تن میں جاں رہے
اور تر دہن میں فضلِ خدا سے زباں رہے

ارسطو جاہ وغیرہ کی ہجو کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

حال پہ برفرعون ساغرلے میں جو بڑ چور ہے
سر پہ اوس کی قبر میں نت آتشِ آمود ہے

ایک دن اہلِ سپہ کورہ میں یوں دیکھا رواں
زرہ تن میں اور سر اوپر ہر اک کے خود ہے

کروں کیا مشرب و مذہب کا ذکر اب اوس کے
نہ شیعہ اور سُنی نہ نطفۂ اکفیر

نہ شیخ، سیّد و مرزا، نہ قوم افغاں میں
جولاہا ذات کا مومن بنام وہ ہے شریر

حریف اپنے ہے محسن کا آشناکش وہ
غریب اور حرامی دراصل جیوں عصفیر

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ (۱۲۱)

(۲۱) **فضلیؔ** شاہ فضل اللہ فضلیؔ اورنگ آبادی، یہ اور ان کے باپ سید عطا اللہ غازی الدین خاں فیروز جنگ کے ساتھ مدتوں رہے۔ فضلیؔ کے اشعار میں ایہام زیادہ ہوتا تھا۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے قصہ "پریم لوکا" اور قصہ "برہ بیوکا" اردو مثنویاں ہیں۔ فن سلوک میں بھی ایک رسالہ موسوم "زاد راہ" ان کی تصنیف ہے۔ ۱۱۸۴ھ میں انتقال ہوا۔

دیکھ کر ترے پاؤں کی مہندی مجکو تلوؤں سے آگ لگی

اے کبوتر جا کہہ یوسف کو کوئیں سے نکل تجہ بنا رو رو زلیخا ہوگئی ہے باؤلی

رکھا ہوں نیم جان جاناں تصدق تجھ پہ کرنے کو
کیا سب تن کو درپن، اچھو درشن بنا ہوں

دو بھواں دیکھ کر کہا میں یوں دو گھڑی رات دن میں آتی کہوں

---

(۲۲) **یارؔ** نواب منور الدولہ احمد یار خاں بہادر ممتاز جنگ امراء دربار آصفی سے تھے۔ احمد یار کا تخلص یارؔ تھا۔ شاعری کا بڑا شوق تھا۔ فقر دوست تھے۔ ۱۱۸۵ھ میں انتقال ہوا۔

بہار گلشن خوبی چمن میں آیا ہے کہاں ہے جام، کہاں ہے شراب کا شیشہ

گریباں چاک، مطعون جہاں، بدنام عالم ہوں
پڑے خاک اس طرح کی ہائے رسوائی کے جینے میں

۱؎ حمید، نوت۔

۲؎ شفیق، تمنا۔

صنم نے میرے سخن کو سن سن کہا کہ اتنا نہ مضطرب ہو
جو ابتدا کو نہیں سمجھتا تو کیا خبر ہوگی انتہا سے

مجھ سے پوچھا کہ کہو تم میں وفا ہے کہ نہیں
میں کہا تم تو کہو تم میں جفا ہے کہ نہیں

ہمارے دل کو ناحق خوب رو ہر دم جلاتے ہیں
کہیں بُت بتکدے کے بھی برہمن کو ستاتے ہیں[1]

---

(۲۲) شیدا[1] نوازش علی خاں بہادر نام و خطاب اور شیدا تخلص تھا۔ نواب نظام علی خاں کے میر سامان تھے۔ متعدد ضخیم مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے ایک "اعجاز احمد" نام آنحضرت کی سیرت ہے اور دوسری 'روضۃ الاطہار' واقعات کربلا پر لکھی ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۱۷۳ھ ہے۔ گلشن ایمان کے نام سے تیسری مثنوی لکھی ہے، شیدا بڑے پُرگو شاعر تھے۔ ان کی ضخیم مثنویوں سے ان کی پُرگوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اعجاز احمد کی زبان کے بہ نسبت 'روضۃ الاطہار' کی زبان زیادہ صاف ہے اور اسلوب میں بھی روانی ہے۔ یہ مثنوی بارہ مجلس پر منقسم ہے اس کی کئی خصوصیات ہیں۔ مثلاً یہ کسی فارسی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مصنف کی ذاتی اُپج ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف تاریخی حالات ہی کو منظوم نہیں کیا ہے۔ بلکہ معجزے اور روائتیں بھی بیان کی ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ دکنی مثنویوں کی یہ آخری یادگار ہے اس کے بعد جو مثنویاں دکن میں لکھی گئی ہیں وہ شمالی ہند کی فصیح اُردو میں لکھی جانے لگیں' اعجاز احمد' کا حجم 'روضۃ الاطہار' سے زیادہ ہے۔ یہ مثنوی کئی حصّوں میں منقسم ہے۔ "گلشن ایمان" میں نعتیہ قصائد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اوّل الذکر دونوں مثنویاں

---

[1] چمنستان شعرا و تمنّا۔

[2] قدرت۔

کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ، کتب خانہ سالارجنگ اور کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو وغیرہ میں موجود ہیں۔ مگر آخر الذکر یعنی گلشنِ ایمان نایاب ہے۔ شیدا شاہی عاشور خانہ کے منتظم بھی تھے۔ انہوں نے عزاداری اور مرثیہ خوانی کو بہت ترقی دی تھی۔ علم و مغفر وغیرہ کی نگرانی بھی شیدا کے ذمہ تھی۔ 'اعجاز احمد' کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

اے ساقی مجھے دے توں جامِ ہلال — کہ ہے بدر کی جنگ کا اب خیال
نہ وہ جام جس سیتی ہووے خمار — کرے بلکہ اسرار کا راز دار
قلم کا یہ میری ہلالی تراش — اسے بدر کی فتح کا ہے تلاش
سُنو اے محبّانِ نصرت شعار — ہوا بدر کا کس طرح کارزار
کہ پہنچی نبی کوں خبر ناگہاں — کہ نکل ہے کعبہ سیں کب کارواں
گراں جنس ہے سات اون کی تمام — وہ پہنچتی ہیں جانے کیئیں ملک شام
بوسفیاں ہے اس کارواں میں امیر — ہوئے ہیں رفیق اس کے کئی یک شریر

لکھے راویاں ہے روایت صحیح — میں کرتا بیاں ہوں سُنو تم صریح
کہ بیٹھے تھے اک دن امام الرسولؐ — مہاجر و انصار حاضر تھے کل
یہودی اک آتا ہے با احتشام — تھا نام اس کا عبداللہ ابن سلام
شرافت میں اس سا نہ تھا دوسرا — اتھا عقل میں، علم میں وہ رسا[1]

دیکھے عباس سرور کے علمدار — موئے بھائی پڑے سارے ہیں یکبار
کسی کا سر نہیں ہے تن کے اوپر — کسی کے ہاتھ کٹ گئے ہیں سراسر
کسی کا تن ہے سب زخموں سے چوُر — پڑا نزدیک کوئی ہے، کوئی دور

عمر دیکھا کہ پانی سے چلے ہیں — بہادران کے آگے سے ڈھلے ہیں

---

[1] اعجاز احمد۔

اگر پیویں گے یہ پانی وہ پیاسے — کریں گے جان سے ہم کو وہ نراسے
سو مروانے کو ایک سرور کے تیئں — وہ بھیجا چار ہزار سوار دے دکھیں
گرے عباس رضؓ پر ایک باری — لڑائی آ پڑی اس وقت بھاری

ہوا جب ختم یہ مضمون ماتم — کہا تاریخ ہاتف مجلس غم
کیا چاہو تم آسانی سے ازبر — اگیارا سو برس تھے تب تہتّر
ارے شیدا دعا پر اب زباں کھول — جناب حق میں اپنا مدّعا بول[1]

چمن کے گل گشت کو نکتا یوں گھر سے جب خوش خرام نکلا
تیرے بھواں کے ادا دیکھنے کو ہلال کرتا سلام نکلا
اگرچہ کہتے تھے قمریاں سب چمن میں آزاد سرو سا نہیں
جب ہم نے تحقیق کرکے دیکھے تمہارے قد کا غلام نکلا

---

(۲۴) قیاسی

سیّد عبداللہ نام اور قیاسی تخلص تھا۔ ۱۱۶۴ھ میں ایک مثنوی طوطی نامہ کے طرز پر لکھی تھی جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔

پوچھی لعل ہیرے ہیں تیرے کنے — کہیا نیں ہیرے لعل میرے کنے
ہے بازو کے دو کانداراں کیتیں — بلا کرے آیا بزاں ان کوں دیں
کتک دھات کے او جواہر لے آئے — بہوت بے بہا بیش نادر لے آئے

... ...

کیتک وقت لگ شہر سارا پھر آئی — بہوت کرکے ماندے سو یک ٹھار لائی
ہزار ایک کوچے میں بھڑ کل اکتا — دو تینوں کوں اس جائے اوپر بٹھا
کبھی یاں اچھو گھر میں جاتی ہوں میں — تمارے لیے پیسے لے آتی ہوں میں

---

[1] روضۃ الاطہار

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۵۰۰۔

کہ ایسائی بتائی اونا در بچّہ	جکوئی دیکھ بولیں ہے آدمی سچّا
عجب صنعتی سوں بنائی اوسے	کہ کپڑے او بتاں پنائی دسے
کہی جان اہے جو نہری کی دوکان	اے دائی لجا مجکوں دو ہی ٹھکان
بچے کوں لے کر اپنے گود کے بیچ	سنوار سر اُپر برتے کون و پنچہ
لے کر دائی کوں سات نکل بہار	چلی ڈولتے ٹھکے سوں جوں گلعذار[1]

---

(۲۵) دردمند[2] محمّد فقیہ دردمند اودگیر (بیدر) کے رہنے والے تھے۔ دہلی جاکر مرزا مظہر جانِ جاناں کی شاگردی کی۔ ان کا ساقی نامہ مشہور ہے ان کے ساقی نامہ کے متعلّق رسالہ اُردو[3] میں تفصیل سے مضمون شائع ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

ہے غم سے رقیبوں کے میرا دل ناشاد	اس دہر سے جاتے ہیں سبھی عیش بیاد
پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر	سنگ آباد لیگ سخت آیا فریاد

ساقی نامہ

کہ میں جا بلب ہوں پیالے کی طرح	لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح
ادا سے مہکنے کی تج کو قسم	نشے سے بہکنے کی تج کو قسم
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں	تجھے اپنے سوگند کھانے کی سوں
جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام	تو اتنا کرو ے ظالموں کے امام
کہ اسی سرکشی سیں نہ کر پائمال	مرے خوں کو مے کی طرح کر حلال

(۲۶) سامی[4] غلام قادر نام اور سامی تخلص تھا۔ اورنگ آباد کے باشندے تھے شاعری میں خوب ملکہ تھا۔ خوش نویس بھی تھے۔ ان کے والد کو

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] " " "

[3] بابت جولائی ۱۹۲۶ء

[4] چمنستان شعراء، ریاض حسنی، فتوت۔

آصف جاہ اوّل کے زمانہ میں نو ہزاری کا منصب حاصل تھا۔ سامی نے ایک مثنوی "سرو شمشاد" نام لکھی تھی جس کے سات ہزار شعر تھے۔ ایک اور قصہ 'طالب و موہن' نام لکھا تھا۔ شفیق نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ خصوصاً "سرو شمشاد" سے انہوں نے بڑا تاثر حاصل کیا ہے۔ 'سرو شمشاد' کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہے۔[1]

کہ اے شمشاد باغِ بے قراری	گلِ رنگیں بہارِ غم گساری
پس از آداب شوق بیقراراں	کہ دستِ ہجر سیں ہیں اشک باراں
وو ابرو کو سلام اس قدِ خم سے	نگہ کو دیدہ بوسی چشم نم سے
ہمیں کیا جاؤ چل کر باغ دلبتاں	کہ ہے کنجِ قفس ہم کو گلستاں
طبیبوں کو عبث دیتے ہو آزار	بنے ہیں ہم غمِ ہجراں کے بیمار
زبس ہیں روز و شب مشتاقِ دیدار	یہ دو مخمور ہیں گوشہ میں بیمار

شہر خجستہ بیچ ہمیشہ بہار ہے ہر کوچہ و گلی میں دیکھو لالہ زار ہے

---

(۲۷) عزلت

سیّد عبدالولی نام اور عزلت تخلص تھا۔ شاہ سعد اللہ کے فرزند ہیں ۱۱۰۴ھ میں تولّد ہوئے۔ اپنے والد سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اپنے وطن سورت سے نکل کر اورنگ آباد آئے۔ پھر دلی اور مرشد آباد کی سیر کی۔ دلی میں ایک عرصہ تک قیام رہا۔ پھر اورنگ آباد آئے اور یہاں سے حیدر آباد کی راہ لی۔ حضور نظام کے دربار میں باریاب ہوئے۔ نواب آصف جاہ ثانی کی ان پر خاص عنایت تھی۔ خطاطی موسیقی، مصوّری اور شاعری میں کمال حاصل تھا۔ بڑے رنگین مزاج اور زندہ دل تھے۔ صوفی منش اور فقیر بے ریا تھے۔ رجب ۱۱۹۸ھ میں انتقال ہوا۔ دکن اور شمالی ہند کے ہر ایک تذکرہ نویس نے ان کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔ مثنوی راگ مالا، دیوان، ساقی نامہ، بارہ ماسی وغیرہ۔ اوّل الذکر کتب خانہ

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۲۔

آصفیہ حیدر آباد کے علاوہ یورپ میں بھی موجود ہیں۔ شاعری، مصوّری، نقاشی، خوش نویسی اور موسیقی میں جو مہارت حاصل کی تھی اس کو عام کرنے کے لیے اپنے گھر میں مدرسہ قائم کیا تھا اور شائقینِ فن کو مصوّری، موسیقی اور خوش نویسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ عزلت نہ صِرف اپنے زمانہ میں مشہور تھے بلکہ زمانہ مابعد میں ان کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستاد کا نام روشن رکھا تھا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :۔

جل ہوا کا جل کس نیں کی طوطیا کے واسطے
خوں ہوا کس کے ہاتھوں کی حنا کے واسطے

دیکھتا ہوں جمع کر خاطر پریشانی کی راہ
کر رہا ہوں کس کے کوچے کی صبا کے واسطے

اس عرق ریزاں ذقن کی چاہ کا ہوں میں مریض
سیب کا شربت ہے یہ میری دوا کے واسطے

شورِ بلبل سی عدم کے خواب سیں جاگیں گے لوگ
مت دھرو گل کو کسی کی قبر اوپر خدا کے واسطے

مثل عزلت بابِ عرفاں خود بخود تجھ پر کھُلے
دل کو جیوں آئینہ روشن کر خدا کے واسطے

قتل عزلت سے نہ منکر ہو کہ گل کے مانند لب پہ ہنستا ہے ترے خون نمایاں تیرا

آج دل بے قرار ہے میرا کس کے پہلو میں یار بے میرا[1]

خدا کے حمد میں کہتا ہوں ہر دم کیا ایک حرف سیں جس نے دو عالم

درود مصطفےٰ وآل واطہر کہوں ہووے مو بمو اپنا زباں کر

---

[1] شفیق۔

عمارت ایک سرکوب فلک تھی — در و دیوار میں مہ کے جھلک تھی
مرصع تخت پر بیٹھا جواں ایک — کہ دولت اور طرب کا کامراں ایک
قبا دلچسپ تھی سبز اس کے بر میں — کلاہ سر مغرق تھی کہ سر میں
خطِ سبز اس کے روشن تھا نمایاں — تعجب ہر کا تھا گل سر ریحاں
اور اس کے گود میں تھی اک پری رو — منہ اس کا فتنہ خیز اور زلف جادو

بارہ ماسی

دلِ بے عشق عالم میں کہاں ہے — جو سچ بولوں تو نام عشق جاں ہے
چکوریں ماہ کی قربان ہیں باشوق — گلے میں قمریوں کے سرو کا طوق
سمندر کو ہے آتش آبِ حیواں — گل مکدن ہے کا البر ماہِ تاباں
جو بلبل ہے تو گل اوپر فدا ہے — پتنگا شمع کے منہ پر جلا ہے
ہوا ہے کوہ کن شیریں کا مفتوں — ہلاکِ جلوۂ لیلیٰ ہے مجنوں

---

(۲۸) **لطفیؔ**[1] میر لطف علی نام اور لطفی تخلص تھا۔ درویش محمد خاں صوبہ دار کے نواسے تھے۔ ایک مثنوی 'بہلول صادق' لکھی تھی اس کا ایک نسخہ یورپ[2] میں ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے ؎

بیان کرتے ہیں وے مرد صادق — وفا محبوب کا اور مرد عاشق
عشق کے بات سن کر تجھ ہوس ہے — وفا معشوق سیں نادرست ہے
شہر ہے ایک ہندوستان میں خوش — کہ ہے مشہور اس نامی بنارس
یہی ہندواں کا وے قبلہ ہوا ہے — تمام عالم میں شہرت ہوا ہے

تجھ عشق کے اگن میں شعلہ ہو جل اٹھا جی — دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے

---

[1] شفیق

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

میں عشق کی گلی میں گھائل پڑا ہوا ہوں جوبن کا ماتھا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے[1]

---

(۲۹) مہتاب لالہ موہن[2] لال نام اور مہتاب تخلص تھا۔ اپنے عہد کے باکمال شاعر تھے۔ ۱۲۰۰ھ میں انتقال ہوا۔

تشنہ لب ہوں، شراب کی سوگند جل گیا جی، کباب کی سوگند
ہر گھڑی تو قسم نہ کھا جھوٹی تجکو دل کی کتاب کی سوگند
بے سخن ہوں ترا دہن دیکھے یار حاضر جواب کی سوگند
دل صاحب ہے کیا پریشاں آج زلف کے پیچ و تاب کی سوگند
دُور کر اب حجاب کو اپنے چادرِ ماہتاب کی سوگند[3]

---

(۳۰) حمید خواجہ[4] خاں نام اور حمید تخلص، ترکتاز خاں قوی جنگ والد کا خطاب تھا اور اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ عارف الدین خاں عاجز سے اصلاحِ سخن لیا کرتے تھے۔ موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا۔ ۱۱۶۵ء میں ایک مختصر تذکرہ شعرائے اُردو کا مرتب کیا۔ جو گلشنِ گفتار سے موسوم[5] ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ موجودہ معلومات کے لحاظ سے شعرار دکن کا یہ پہلا تذکرہ ہے۔

حمید کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

زلفِ خم ہو کے لٹک جان کے سب کان میں رات
موبہ مو کھول کہے حال پریشاں میرا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] شفیق۔

[3] محبوب الزمن۔

[4] نسوت۔

[5] سید محمد صاحب ایم۔اے عثمانیہ نے اس کو مرتب کیا اور مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد سے شائع ہوا۔

مجھ کو دیتا ہے نگاہوں سیں و بالا د بالا

جسے پلکوں نے بر نچھو سے سنبھالا بھالا

(۳۱) **محمود** | سیّد محمود نام اور محمود تخلص۔ مصنفینِ یورپ نے ان کی تصانیف
کو عارف الدین خاں عاجز سے ملا دیا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم پوری
طرح ان کے حالات سے باخبر نہیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے وہ ایک مذہبی آدمی تھے۔
سیّد خوندمیر شاہ سے بیعت تھی۔ غالباً ان سے خلافت بھی حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے
بیان کیا ہے کہ جب اس نے ایک فارسی قصّہ پڑھا تو اپنے مرشد کی اجازت چاہی کہ اس کا
ترجمہ دکھنی زبان میں کرے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ مرشد کی روحانی مدد کے بغیر یہ کام ان سے
ختم نہ ہوگا۔ ان کی دو مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک "ظفرنامہ" سے موسوم ہے اور ۱۲۰۴ھ میں
تصنیف ہوئی ہے اور دوسری 'ملکۂ مصر' ہے جو ۱۲۰۶ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ ان کی تصنیف
کے سنین خود مصنف نے بیان کیے ہیں۔ چنانچہ 'ظفرنامہ' کی تصنیف کی صراحت حسب
ذیل ہے:

خدا مقصود حاصل کرے میرا
ظفرنامہ کیا انجام سارا

کیا اتمام جب شہ کا انجم
تو بارہ سو پہ تھا سالِ چہارم

ملکۂ مصر کی تصنیف:

سنہ بارہ سو چھ اوپر تمام
کیا ہوں جو اس وقت پایا نظام

ظفرنامہ میں محمد بن حنیفہ کا قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے سیوک اور لطیف
قطب شاہی عہد میں اس قصہ کو منظوم کر چکے ہیں۔ ظفرنامہ کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔
نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

کروں نامے کو حمدِ رب سوں آغاز
فصاحت میں رہوں دائم سرافراز

خدا کے نام سوں نامے کوں اتمام
کروں میں تا کہ ہو جلدی سوں اتمام

بجا لا کر اوّل آداب و تسلیم
کہے تجھ حکم ایں سے ہفت اقلیم

ادب سے جو کھڑے چاروں ودنی احاد
ہر ایک نطاب کو اپنے تب کے آمال

کہے محبوب تم پتی ہو حسن داکے
چراغ و مشعل و راد ہوا سکے

ہمیں بہت روز سے آئے تم پاس — کرو دل کو ہمارے مثلِ الماس
کہا اک نے کہ اے سردار عالم — میرا سب ماجرا بر حسبِ عالم
مجھے ہے ایک دخترِ نیک اختر — ہوئی بالغ، نہیں مجھ کو میسّر
نہیں وسعت مجھے اس کو بہانا — نہیں اک وقت کا مجھ گھر میں کھانا
اگر امداد مجھ ہووے کم و بیش — کروں دختر کا اوّل کاج در پیش
برائے حق مجھے اب کچھ عطا کر — میرا یہ عرض سُن حاجت روا کر
مجھے درکار ہے دینار چھ سو — کہا میں مدعا دل کا اتھا سو

قصّہ 'ملکۂ مصر' بھی ایک فارسی کا ترجمہ ہے۔ فارسی کتاب ۱۲۰۶ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ بعض اصحاب نے قصّہ 'ملکۂ مصر' کو قصّہ 'فیروز شاہ' سے موسوم کیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں بالکل علیحدہ قصّے ہیں۔ اوّل الذکر مثنوی نایاب ہے۔ کتب خانہ ادارہ ادبیات میں ایک نسخہ موجود[1] ہے۔ 'ملکۂ مصر' کا نمونہ حسب ذیل ہے[2]۔

کہوں میں ثنا صفت اس کا اوّل — بنایا ہے جوں یو جگت بے بدل

سُنو اے عزیزاں کتا ہوں سو بات — نہ سمجھو گے بعضی حکایت کی دہات
کہوں اب قصّہ سب کون اظہار کر — کتے ہیں کہ تھا شاہ یک بخت ور
دھرے نام سلطان فیروز شاہ — اتھا مصر کا شہر سو تخت گاہ
تھی بیٹی نہ تھا اس کوں فرزند سو — اچھے شاہ ایسے ساۃ دل بند ہو
ملے گا اچھے ناؤں اس تار کا — اتھا جگ میں شہرت اس اوتار کا

---

(۳۲) شفیق

لالہ لچھمی نرائن شفیقؔ دکن کے مشہور مصنّف اور شاعر ہیں۔ ان کے والد رائے منسارام آصف جاہ اوّل کے عہد میں معزّز عہدہ پر سرفراز تھے۔ صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۹۱۔

[2] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

شفیقؔ ۱۱۵۷ھ میں تولد ہوئے[1]۔ رواجِ زمانہ کے موافق عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ کم عمری سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ مولانا غلام علی آزادؔ بلگرامی سے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ پہلے صاحبؔ تخلص تھا۔ پھر شفیقؔ قرار دیا۔ فارسی اور اردو، دونوں میں مشقِ سخن کی ہے تاریخ سے خاص ذوق تھا۔

تصنیف و تالیف کا بڑا شوق تھا۔ کئی ایک کتابیں ان کی یادگار ہیں "گلِ رعنا" شعرائے فارسی کا اور "چمنستانِ شعراء" شعرائے اردو کا تذکرہ ہے۔ ۱۱۷۵ھ اس کتاب کا سنہ تالیف ہے۔ یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں شمال اور دکن کے دو سو تیرا شعراء کا ذکر ہے۔ شفیقؔ نے مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی وغیرہ غرض سب اصنافِ سخن میں جولانی دکھائی ہے 'تصویرِ جاناں' ان کی ایک مشہور مثنوی ہے۔ ایک دوسری مثنوی معراج نامہ ہے۔ ۱۲۲۳ھ میں شفیقؔ کا انتقال ہوا۔ تصویرِ جاناں کی مثنوی شائع ہوگئی ہے[2]۔

کلام کا نمونہ پیش ہے :۔

قصیدہ

یک زبردست ہے میرا والی ۔۔۔ یک قوی دل ہے میرا پشت و پناہ

حق و باطل ہے سامنے جس کے ۔۔۔ یوں عیاں جس طرح سفید و سیاہ

یعنی نواب میر احمد خاں ۔۔۔ اسد الملک حضرت عالی جاہ

باپ جس کا نظام دولت و دیں ۔۔۔ جد ہے جس کا جناب آصف جاہ

مثنوی ساقی نامہ

ارے ساقی اے روح بخش جہاں ۔۔۔ ارے ساقی اے جان کے تن کے جاں

---

[1] مولانا عبدالحق صاحب نے چمنستانِ شعراء کے مقدمہ میں ان کا سنہ پیدائش ۱۱۵۸ء لکھا ہے۔ (صفحہ ۲) اور چمنستان شعراء ۱۱۵۷ھ کی تصنیف ہے۔ (صفحہ ۱۶) ظاہر ہے کہ یہ سنہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس سنہ کو کتابت کی غلطی بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ 'مقدمات عبدالحق' میں بھی یہی سنہ لکھا گیا۔ خود مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر اس تذکرہ کی ترتیب میں ہوئی اس لیے صحیح سنہ پیدائش ۱۱۵۷ھ ہے۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے یہ شائع ہوئی ہے۔

[2] رسالہ تجلی حیدرآباد میں شائع ہوئی تھی اب سالار جنگ بورڈ کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

ترے دیکھ کر یہ تغافل کے ڈھنگ
بھر آئی ہے چھاتی مری بے درنگ

تری گردشِ چشم بس ہے مجھے
یہی دُور کی اب ہوس ہے مجھے

دو پیالے مجھے دے کے مت بھول جا
کہ ہوں بحر نوش اب میں فضلِ خدا

دے شیشے پہ شیشے گھڑے پر گھڑے
پلا اس طرح وا چھڑے وا چھڑے

تجھے نا کہوں تو کہوں کس سے اب
تجھے مجھ سے اغماض کیا ہے سبب

... ...

شہِ گل کا یہ اذن اب عام ہے
کہ لب ریز بہتر ہے جو جام ہے

غمِ مے سے لالہ چمن میں جو داغ
بھرا اپنے خوں سیتی اپنا ایاغ

... ...

پیج مت رواں ہے بادِ صبوح
کہ نکلی چلی جاتی ہے گل کی روح

بہار آئی، جنوں نے سر اٹھایا ہے خدا حافظ
نسیمِ صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

ہمیں کنجِ چمن میں چھوڑ کر صیاد جاتا ہے
خدا جانے وہ ہم سے خوش ہے یا ناشاد جاتا ہے

عاشقی نے کر دیا دونوں جہاں میں نام ور
مر گئے ہیں ورنہ مجنوں سے یہاں لاکھوں کروڑ
اب یقیں کی یاد میں صاحب مگر روتا ہے ابر
کوکتی ہیں کویلیں اور شور تو کرتے ہیں مور

پنجرے میں ہمیں نہ آنا تھا
کیا کریں یہاں بھی آب و دانہ تھا

اس کی جا کر گلی میں کھویا وقر
اب میں جانا کہ وہاں نہ جانا تھا

ایک دن وہ نظر پڑا صاحب
جس لیے شب کو تلملانا تھا

تب کہا چشم کو میں اے کم بخت　　وصل میں اشک یہ بہانا تھا
اس کی تصویر آئی آنکھوں میں　　پاؤں اس کے مجھے دھلانا تھا

قتل پر کس کے چلا ہے یہ ستم گار کہ بس
آستینوں کو چڑھا کھینچ کے تلوار کہ بس
آخری دم ہے ٹک اک دیکھ بھلا اے ظالم
بے طرح آج تڑپتا ہے یہ بیمار کہ بس

کس طرح بیمار دل کی ہم شفا چاہیں کہ آج
پڑ گئی ہے اس کی آنکھوں سیتی میخانے میں دھوم
کوئی گریباں چاک، بیدل کاں بسے گا صاحبا
کوہ میں فرہاد و مجنوں کو ہے ویرانے میں دھوم

ہر جہت بادِ صبا کے یہ قدم کا فیض ہے　　مرقد بلبل پہ گل جوں چراغاں ہو گئے

---

(۳۳) ایجاد مرزا علی تقی خاں نام، ایجاد تخلص اور نقد علی خاں خطاب تھا۔ خاندان قاچار سے تھے۔ سلیمان صفوی کے وزیر شیخ علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ آصف جاہ اوّل کے زمانہ میں ان کے باپ نقد علی خاں دیوانی بادشاہی میں ملازم تھے۔ ایجاد بھی اسی زمانہ میں مامور ہو گئے۔ اولاً کوتوالی لشکر اور پھر باپ کی خدمت ملی۔ صلابت جنگ کے زمانہ میں داروغہ فیل خانہ اور آصف جاہ ثانی کے عہد میں صاحبزادہ نواب انتظام الدولہ نصرت جنگ کے اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ ۱۱۹۴ھ میں حیدر آباد میں گوشہ نشین تھے۔ فارسی نظم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اُردو اگرچہ ان کی مادری زبان نہیں تھی تاہم اُردو کے بھی اچھے شاعر تھے۔ کلیات کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

ایجاد بٹیہ رہ تو نجف کی زمیں میں　　نقشِ قدم ہو خاک رہِ بوتراب کا

ہم اسیروں کو ترے زلفوں سے ہے دل بستگی
کون کافر چاہتا ہے ایسے داموں سے نجات

تربت پہ میری شمع اگر تو نہ لائے گا
جلتا رہوں گا حشر تلک میں کفن کے بیچ
تجھ لب سا کوئی عقیق نہ پایا سہیل نے
راتوں کو چراغ لے ڈھونڈا یمن کے بیچ

بیٹھا ہوں ترے ابروخم دار کے نزدیک
سر اپنا رکھا ہوں اسی تردار کے نزدیک
بکتا ہوں زرمہر کو بازار وفا میں
ان مولوں گراں نہیں ہوں خریدار کے نزدیک

کسے دریا سا دل اپنا ہم اے دلدار دیتے ہیں
ہر اک کو ہم کہاں یہ گوہر شہوار دیتے ہیں

رکھا ہوں اس دلِ نازک کو جان کر شیشہ
جس احتیاط سے رکھتا ہے شیشہ گر شیشہ

گلگشت کی خبر جب ترے چمن میں پاتی
باد صبا خوشی میں پھولوں نہیں سماتی[1]

ایجاد کے قصیدہ کا نمونہ :-

پھر میں نہ جانوں کیا ہے زمانے کا اقتضا	دل جس کا دیکھئے تو ہے اس عصر میں خفا
فکروں میں چور منعم و درویش ہیں سبھی	اندوہ میں تمام ہیں کیا شاہ، کیا گدا
فصلِ خزاں و موسم گندہ بہار ہے	رنجور کر رہی ہے مزاجوں کو یہ ہوا

---

[1] تذکرہ تمنا

اس فتنۂ زمانہ واس روزگار سیں
اے دل توں اعتقاد میں اپنے خلا نہ لا

والی ہمارا شاہ رسالت پناہ ہے
جو ہم کو آبرو سیں ہر اک دور میں رکھا

دیباچہ امامت و سرلوح باب علم
یعنی علی وصیٔ بلا فصل مصطفےٰ

دلدل کو حق تمہاری سواری میں دیکھ کر
تم پر سلام بھیج کہا اس کو مرحبا

اس کے بدن کا پوست ہے نازک چنوں گل
اس کا عرق گلاب ہے، غنچہ ہے تھوتھنا

اس گلبدنی کے داغ کو لالہ نے دیکھ کر
حسرت سیں دل میں داغ ہوا تھا لہو پیا

رہوار جب چلا ہے ٹھنڈی پڑ گئی نسیم
صرصر کو اپنی گرم روی سیں جلا دیا

اوّل قدم ہے اس کا ازل دوسرا ابد
جلدی کے پھر پیا دوں کو عرصہ نہیں رہا

......

اے شہسوار دوش نبیؐ کیا کروں بیاں
اس روضۂ مبارک عرش آستان کا

قرباں ہے اس مکاں و مکیں پر سخن کا جال
اس جائے پر دل اہل معانی کا ہے فدا

......

احباب انہوں کے خورم و شاداں رہیں مدام
اعداء انہوں کے خوار و پریشاں رہیں مدام

---

(۴۴) قاسم

شاہ قاسم اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے۔ شفیق نے اپنے تذکرہ میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ سراج، عاجز، داؤد کے ہم عصر تھے، آپ کے والد کا نام شیخ عبداللہ تھا، عبداللہ انصاری کی اولاد میں شامل تھے۔ آپ کا اصل وطن برہان پور تھا وہاں سے اورنگ آباد اور پھر حیدر آباد آگئے۔ شاہ فقیر علی چشتی سے بعیت حاصل تھی۔ متوکل زندگی بسر کرتے تھے، بقول فتح علی گردیزی آپ کو عزلت سے تلمذ تھا دیوان مرتب کیا تھا۔ چنانچہ اس کے تین نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ دو نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جن کا تذکرہ ہم نے مخطوطات کی فہرستوں میں کر دیا ہے۔

آصف جاہ ثانی کے عہد میں ایک سال قحط پڑا تھا۔ نماز استغفار پڑھنے کے لیے آصف جاہ، علماء اور مشائخین کے ہمراہ پیدل پرانی عیدگاہ گئے، نماز پڑھی، دعا مانگی، اس کے بعد اس قدر پانی برسا کہ موسیٰ ندی کو طغیانی آگئی۔ (۱۱۸۵ھ) اس

واقعہ کا تذکرہ شاہ قاسم نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔ شاہ قاسم کے انتقال کا صحیح سن معلوم نہیں ہوتا۔ بہرحال سن ۱۱ھ کے آخر یا سن ۱۲۰ھ کے اوائل آپ نے وفات پائی۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

اوگل رو کے سیہ زلفوں سے ڈرتا ہے ہمارا دل
گلابی باغ میں یہ بے طرح کے ناگ چھوڑے ہیں

میرا دل خوف کرتا ہے تری بانکی نگاہوں سے
نہ ڈالے حق کسی کو کام ان چشم سیاہوں سے
رہوں کب تک میں ڈانواں ڈول ایسا ڈوبتا ترتا
نکالے حق تعالیٰ مجھ کو ان الفت کی چاہوں سے
اثر کرتا نہیں اس سنگ دل پر درد کیا کیجئے
وگرنہ قلعۂ لنکا اُڑا دوں دم کی آہوں سے

دل تمہارا مجھ سے گر بیزار ہے   خوش رہو میرا بھی اللہ یار ہے

نہ میرا درد دل جانا کسی نے   نہ یارو مجھ کو پہچانا کسی نے

بھرا ہے دل میں میرے توپخانہ آہوں کا
نہ ہو یہ قلعہ سیں شلق آپ ایک دم چھوٹے
شاہ قاسم وو خط سبز کے بن سینے میں
طوطی بن بن میری آہوں کے نکلتے ہیں پڑے
قطرۂ اشک یوں اُڑتا ہے میرا چشم سے لال
جس طرح صبح کو تالاب سے سرخاب اُڑے

دنگ ہو گئے باغ میں نرگس تری آنکھوں کو دیکھ
یہ کہاں سے آئے ظالم نرگسِ بیمار سُرخ

بجن کے داؤ میں آیا ہوں قاسم — نین کرتے ہیں مجھ سے گھاٹ پر گھاٹ

دیکھ میٹھے لب ترے نازک بدن — شاہ قاسم بھول گئے دہلی کے سیب

جگر ایسا ہے غم سے تختہ خوں — گویا دیکھو حنا کا پات پر پات

عاقبت کا نہ خوف کر قاسم — تو چلا جا پمیبری کی طرح

ان بُتوں کی مجھے صحبت سے نکال — یارب اس شیشۂ ساعت کو سنبھال

---

(۳۵۱) **مہربان** میر عبدالقادر مہربان تخلص، ان کے اجداد نیشاپوری تھے۔ ۱۱۵۰ھ میں مہربان کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ حافظ قرآن تھے۔ عربی اور فارسی کی بہت اچھی قابلیت تھی۔ شاعری میں مولانا غلام علی آزاد سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ شفیق نے ان کی نازک خیالی کی بڑی تعریف کی ہے۔ شاعری کے علاوہ نجوم اور جفر سے بھی واقف تھے۔ ترکی بھی جانتے تھے۔ پہلے رنگین تخلص کرتے تھے۔ مگر اس کے بعد مہربان تخلص قرار دیا۔ بقول تمنا، مہربان عربی میں بھی شعر کہتے تھے، کئی ایک کتابوں، کے مصنف ہیں۔ ۱۱۹۱ھ میں زندہ تھے۔[1]

مرا دل لے جانے کو دلبر تمہیں ہو — جفا جو ہو ظالم ستم گر تمہیں ہو
جواہر کے دیکھنے سے کیا مجھ کو حاصل — مرے حق میں اب لعل گوہر تمہیں ہو

---

[1] چمنستانِ شعرا و تذکرہ تمنا۔

معلوم نہیں یہ دلِ وحشی کہاں گیا　　چل مبتلا اب اوس کی کہیں جستجو کریں

شکستہ خاطرِ عاشق نہ کر ظالم تغافل سے　　مرا آئینۂ دل ہے ترا اسبابِ خود بینی[1]

آہ کیوں کریں شکستہ دلاں　　ٹوٹی انگلی بھی کہیں چٹکتی ہے

خدا محشر میں لیوے داد قاتل سے مرے لیکن
سبب جس دل کے میں مارا گیا اس سے خدا سمجھے[2]

---

(۳۶) **بیکلؔ**

میر[3] عبدالوہاب نام اور بیکلؔ تخلص تھا، علاوہ ازیں فارسی میں افتخار تخلص کرتے تھے۔ ان کے دادا بخارا سے آئے تھے۔ دولت آباد میں اقامت گزیں ہوئے۔ بیکلؔ کی پیدائش یہاں ہی ہوئی۔ بیکلؔ کو آزاد سے تلمذ حاصل تھا ایک تذکرہ شعراء موسوم "بے نظیر" انہوں نے تالیف کیا تھا جو نایاب ہے۔ ۱۱۹۴ھ میں زندہ تھے۔

برسے ہے ابرِ رحمت ساقی کدھر ہے ملنا
ہنگام بادہ خواری جواب نہیں تو پھر کب
جاتا ہے وہ کہ جس سے تھا لطفِ زندگانی
آتی اجل ہماری جواب نہیں تو پھر کب

سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا　　سُرخ و سفید ماٹی کی مورت ہوئی تو کیا[4]

---

[1] تذکرۂ تمنّا۔

[2] تذکرۂ شفیق۔

[3] شفیق و تمنّا۔

[4] تمنّا

آج پھر دل تڑپ میں آیا ہے کس پری کی جھڑپ میں آیا ہے

کوئی اس خورشید رو کے نا مقابل ہو سکا
چاند نکلا ہے کرے گا کیا اُجالا دیکھئے

کوہ بھی ہنگامِ بارش میں عروسِ وقت ہے
سر پر اس کے سہرہ مروارید کا ہے آبشار[1]

---

(۳۷) عروج میر[2] بہاؤالدین حسین خاں عروج، ان کے والد کا نام ضیاء الدین حسین خاں رنگین تھا۔ عروج کی پیدائش ۱۱۷۵ھ میں اورنگ آباد میں ہوئی۔ نورالدین دلؔ سے تحصیلِ علم کی اور اولاً ان سے ہی شاعری میں اصلاح لی۔ اس کے بعد بلیغ سے اصلاح لینے لگے۔ ایک تذکرہ شعراء "خزاں وبہار" کے مصنف ہیں۔ کتب خانہ نظامیہ حیدر آباد میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ ۱۱۹۴ھ تک زندہ تھے۔

روئے خوب اس کو دیا حق نے ہمیں بختِ سیاہ
اس طرف صبحِ وطن شامِ غریباں اس طرف

یوں ظلم ارے پیارے کہ تو کیا کرے گا عاشق کوئی بچارا کیوں کر جیا کرے گا

---

(۳۸) انور محمد سیف اللہ نام اور انور تخلص، اورنگ آباد کے رہنے والے، اسد علی خاں تمنّا کے ہم درس تھے۔ عربی اور فارسی کی بہت اچھی قابلیت تھی۔ میر انوار الدین دلؔ کے شاگرد تھے۔ تمنّا نے ان کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ ۱۱۹۴ھ تک زندہ تھے۔

---

[1] چمنستان شعراء بحوالہ تحفۃ الشعراء۔
[2] تذکرہ تمنّا۔

مگر گنجِ شہیداں کا باغباں تھا اس بیاباں میں
جو لختِ دل سوا کچھ اوگتا نہیں اس خیاباں میں

ہے نمایاں رُخ پہ تیرے خطِ ریحاں آج کل — مور کے قبضہ میں ہے ملکِ سلیماں آج کل
عاشقوں کے قتل پر امروز فردا خوب نہیں — دیکھ لیں ہوجائے گا کافر مسلماں آج کل

آرسی کو مت دکھا مژگان وابرو ہم دگر — خنجر و شمشیر شیشہ میں لڑاتا ہے کوئی

ہوگئی گرد ترے دام کی خوشبو صیاد — بالِ بلبل سے مگر نکہتِ گل کرتے تھے

عصمت کا لاف مارنہ گل میرے یار سے — بدنام تو بھی ہے گا چمن میں ہزار سے[1]

---

(۳۹) تمنّا — اسد علی خاں تمنّا، اورنگ آباد وطن تھا۔ صمصام الملک اور ارسطو جاہ کے درباری شاعر تھے۔ حیدر آباد میں اقامت کرلی تھی۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ ثانی کی مدح میں بھی قصیدے پیش کرتے تھے۔ اسد علی خاں تمنّا کے متعلق واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک خوب صورت اور حسین جوان تھا اور جوانی میں اس کا انتقال ہوا، لطف النساء بیگم امتیاز (جس کا تذکرہ آگے آتا ہے) اس کی شریکِ زندگی تھی، تمنّا کا انتقال ۱۲۰۴ھ میں ہوا ہے۔

تمنّا کی شاعری اس کی کم عمری ہی میں جس طرح مشہور ہوگئی تھی اس سے اس کی اعلیٰ شاعری کا ثبوت ملتا ہے۔ تمنّا کا دیوان نایاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ اور کتب خانہ آصفیہ میں ایک نسخہ ہے۔ شوقؔ اورنگ آبادی، آشفتہ اورنگ آبادی جیسے شعراء اس کے شاگرد تھے۔ تمنّا نے مشکل قافیوں اور

---

[1] تذکرہ تمنّا

[2] تذکرہ تمنّا و مجموعہ فصاحت۔

سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور اچھے سے اچھے شعر موزوں کیے ہیں، جس سے اس کی شاعری کی عظمت اور قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے اور اس کے باکمال شاعر ہونے کا اعتراف ضروری ہے۔ تمنّا کے دیوان میں اولاً مناقب کا عنوان ہے۔ اس میں حمد و نعت و منقبت اور مناجات کے عنوان ہیں اس کے بعد غزلیات اور پھر قصائد شامل ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

چھوڑا کے کفر و عصیاں کا دوراہا
دکھا دے راہِ عرفاں بادشاہا
بچا رکھ نفس شیطاں سے الٰہا
الٰہی معذرت خواہا پناہا

نہ کس طرح سے پھنسے مرغ دل مرا صاحب
اِدھر کو دام خط، اُدھر کو جال کاکل کا

سوارِ توسنِ سنجاب نکلا
غبارِ خاطرِ احباب نکلا

کبھی شیوۂ سوز و گداز کیا
کبھی جلوۂ ناز و نیاز کیا
مرا روز اسی نے سیاہ کیا
شبِ زلف کو جس نے دراز کیا

نہ ہے لطف و کرم، نہ ہے مہر و وفا
وہی طرزِ ستم، وہی رسمِ جفا

ہوں باغ باغ گلبدنوں کی بہار دیکھ
لب واہ زلف واہ، ہے چشم سیاہ واہ

تیرے کوچے میں ہم آنکھوں سے چلے ہیں آ دیکھ
راہ سب کرتے ہوئے اشک فشانی کاٹے

مت کہو کہ جیب چاکوں کی دیتے ہیں داد ہم
دامن کو کھینچ لیتے ہیں قاتل سے ہی ابھی

اس کا بوسہ لیا میں نے تو جھڑک کر بولا
چھوڑ دے بس میرے ہونٹوں کی دھڑی جاتی ہے

عنایت اور بھی کچھ ہوگی یا نہیں کہہ دے
تو بوسہ دے کے عبث دل کو چاٹ دیتا ہے
وہ تیرے ناز کو میرے نیاز کو پہونچے
جو حسن و عشق کو آپس میں بانٹ دیتا ہے

اللہ دل کا کوئی نہیں محرم ترے سوا داغِ جگر تجھی کو دکھاتا کبھو کبھو

جائے عبرت ہے یہ دنیا، نہ اٹک زلفوں میں کفِ افسوس کو اے دل تو یہاں سے مل چل

خیالِ زلف نے دل مثلِ شانہ خاک کیا رکھے ہے زخم مرا مشک ناب پہلو میں

شگفتگی سے جو کشتی میں تو سوار ہوا کنول کا ہوگیا دل باغ باغ پانی میں

کون دل ہے ترا کافر جو نہیں ہوتا نرم میرے رونے پہ تو پتھر بھی پگھل جاتا تھا

دل زندگی سے اپنا اُٹھا ہے ابھی ابھی بیٹھا تھا میرے پاس وہ ظالم ابھی ابھی

ترکیبِ سخن اپنی نرالی ہے تمنا ڈھب لاتے ہیں کب بندۂ درگاہ کسو کی

تمنا کے قصائد کے چند شعر ملاحظہ ہوں، پہلا قصیدہ حضرت امام سجّاد کی مدح میں ہے۔

کہا میں ایک دن اوس سے کہ او ستم ایجاد جفا و جور کہاں تک، کہاں تلک بیداد
کئی دنوں سے یہ احوال ہے کہ واقف نہیں سرورِ دل ہے کدھر اور کدھر ہے خاطرِ شاد

نہ رات کو مرے نالوں پہ رحم ہے تجھ کو
نہ میرے حال پہ الطاف ہے نہ مہر و کرم
تباہ کیوں نہ ہو ایسے مزاج سے فریاد
یہ کہہ کے وہاں سے ہو رخصت چلا بیاباں میں

نہ میرے بخت ہی کرتے ہیں ان دنوں امداد
نہ اگلی باتیں جو بھولی ہیں اپنی وہ ہی یاد
یہ دل کا شیشہ ہو کس طرح بیضۂ فولاد
کہ شہر کو کروں ویران دشت کو آباد

آصف جاہ ثانی کی مدح کے چند شعر :-

شکر صد شکر خدائے رنگ بخش جہاں
حسبِ خواہش دُور کرتا ہے زمیں یہ آسماں
ہیں اس آثار شفق پر صبحِ سطحِ باغ دیکھ
صحنِ گلشن پر طنابِ سُرخ کیا ہے سائباں
سبزۂ رو ئیدہ فرشِ سبز مخمل بے گماں
ہو کے فراش نسیمِ صبح دم جاروب کشاں

....

دست بستہ ہیں خیابانِ چمن میں صف بہ صف
نذر کے خاطر کھڑے ہیں منتظر گل کے خواں
شادی سال تولد ہو مبارک سالہا
شادماں ہیں جشن سے جس کے ہر اک پیر و جواں
دوستوں کو فتح و نصرت عیش و اقبال و ظفر
ہو بحقِ احمدِ مختار و شاہِ دو جہاں

....

سمع اشرف میں پہنچے خبر اطراف سے
خاک ذلّت پر گرا دشمن فلاں ابن فلاں

سنبل کا طُرہ ہووے اور زینتِ خیاباں
جاں زلف کا حلقہ شانہ گرہ کشا ہو
شاعر ہو اور رنگیں مضموں ہو دست بستہ
پائے نگار ہو اور رنگینیٔ حنا ہو
قمری ہو اور صنوبر، پروانہ اور چراغاں
میں اور حصول میری خاطر کا مدعا ہو
وہ مدعا کہ جس پر پڑھتا ہوں قطعۂ نو
ممدوح سے اجابت مداح سے دعا ہو[1]

---

(۴۰) تجلّی

تجلّی[2] علی شاہ نام اور تجلّی تخلص، امرائے دربار آصفی سے تھے۔ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے ساتھ شاہی سفروں میں

---

[1] مجموعۂ قصائد۔

[2] گلزار آصفیہ و محبوب الزمن۔

ہمرکابی کا شرف حاصل تھا۔ علمی لیاقت مسلمہ تھی۔ تزک آصفیہ زندہ یادگار ہے جو دکن کی معتبر تاریخ ہے۔ فارسی اور اُردو میں شاعری کی ہے۔ ۱۲۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:

گر وصل گلبدن دے مجھے ایک بار دست — ہر مو سے بہر شکر ہوں پیدا ہزار دست
اس زلف مشکبار پہ جی تک کروں نثار — دیوے یہ بخت تیرہ جو بہر نثار دست
ہر چند خاکساری کو میری ہے دست رس — دامن تلک یہ تیرے ہی ہے رعشہ دار دست

... ...

لکھتا ہوں اور مطلع رنگیں حضور میں — مضمون ہزار دیوے ہے بے اختیار دست
ایسا دیا ہے علم میں تجھکو ذفار دست — باندھے سپہر رو بروجیوں کو مسار دست
زرپاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب — رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست
یکدست جو ہے تجھکو زمانے میں اقتدار — پایا تھا کون ایسا شہریار دست
بذل وسخا وجود وکرم فیض ولطف خلق — کھوے ہیں تیرے سامنے یہ ہفتاد دست

... ...

جب تک گہر فشاں رہے نیساں کا دست فیض — ریزش میں ہو ترا زر و سنا ہوار دست
مانند گو سپند ہوں قرباں ترے عدو
احباب کو دے عید کا نت روزگار دست [1]

---

(۴۰) ایمان [2]

شیر محمد خاں ایمان نے بھی اس دور میں شہرت حاصل کی تھی۔ ان کے بیسیوں شاگردوں نے میدان سخن میں ناموری حاصل کی ہے۔ حیدرآباد ان کا وطن تھا۔ عاقل خاں باپ کا نام ہے جو وقائع نگاری کی خدمت سے سرفراز تھا۔ باپ کے بعد ان کو یہ خدمت ملی۔ ارسطو جاہ دیوان دکن کے ساتھ سفر وحضر میں بطور مصاحب رہا کرتا۔ شعر گوئی کا خاصہ ملکہ تھا۔ تجلی سے تلمذ حاصل تھا۔ صاحب تصنیف

---

[1] مجموعہ فصاحت۔

[2] تذکرہ آصفیہ۔

تھا اور نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ قصائد، مثنوی اور غزل میں اچھی مشق حاصل تھی ۱۲۲۵ھ کے بعد انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

گئی فصل ہے نوجوانی کی اب — ہوس کس لیے زندگانی کی اب
یہاں دل سے دل مل گیا نامہ بر — نہیں بات باقی زبانی کی اب
کہاں کا وہ فرہاد اور بے ستون — یہ باتیں ہوئی ہیں کہانی کی اب
لے آیا ہے اک کوہ کن جوئے شیر — کوئی نہر تو لادے پانی کی اب

گر نہ اٹکی ہو تری زلفِ گرہ گیر میں جاں
آہ جاتی رہے یک نالۂ شب گیر میں جاں

آبِ حیواں سے بجھا ہے مگر اس کا پیکاں
تازہ پڑتی ہے ترے تیر سے نخچیر میں جاں

آوے جس دم کہ تو اعجازِ مسیحائی پر
بات کہتے میں پڑی قالبِ تصویر میں جاں

دیت اس قاتل بے رحم سے کیا لیجیے گا — اپنی ہی آنکھوں سے اب خون بہا لیجیے گا
اس قدر سنگدلی تم کو نہیں ہے لازم — کسی مظلوم کی گاہے تو دعا لیجیے گا

ایمان کے قصیدے بھی مشہور ہیں، ایک قصیدہ سے انتخاب پیش ہے:۔

ہوا ہے آج کی شب ماہتاب کا یہ وفور — کہ شش جہت کو جو دیکھو ہے ایک عالم نور
زمیں جو دیکھو تو ہے خوان نقرۂ گویا — ہے آسماں سے ہی سرپوش نقرہ کا ظہور
ہے بسکہ دامنِ صحرا پہ نور پاشی ماہ — ہر ایک کوہ ہوا، کوہ۔ برف سے مشہور
فلک پہ گویا ہزاروں ہلال ہیں پیدا — جو دیکھو بحر میں کشتی ہے ۔۔۔۔ بھور
برنگ برق ہے ہر ایک موج تابندہ — بساں ہالہ ہے گرداب بے قصور و قنشور

... ...

لکھوں کچھ اور بھی ایمان آب نقرہ سے — جو ہو دی خامۂ الماس اور لوح بلور
کہ ایک لطیفۂ مضمون خاص کا اظہار — ہے ایسی طرز کی تمہید سے مجھے منظور

کہ فیض عام ہے یہ ایک روشن اختر کا — ہیں جس کے عہد میں اب شاد کام سب جمہور
امیر اعظم و عالی ہمم ارسطو جاہ — وزیر شاہ دکن فخر قیصر و فغفور
بہ بزم ثانیٔ جمشید و کیقباد نسب — ہو روز رزم معارک مظفر و منصور
بہ بدل مثل فریدوں بعدلتِ کسریٰ — جہاں کشائی میں مثلِ سکندر و تیمور

... ...

دعا پہ ختم میں کرتا ہوں اب قصیدہ کو — الٰہی تا رہے یہ گردشِ سنین و شہور
برنگِ صبح رہیں رو سفید تیرے دوست — سیاہ رو ہوں عدو تیرے جیوں شبِ دیجور[1]

مثنوی برق تاب

عجب برسات کی ہے فصل پیاری — کہ جس کا فیض ہے عالم میں جاری
لکھوں کس رنگ سے تعریف اس کی — کہ کاغذ خود بخود ہوتا ہے ابری
اگر صفحہ پہ کھینچوں جدولِ سیم — رواں ہوتی ہے مثلِ جوئے تسنیم
ہر اک نقطہ سے قطرہ ہووے پیدا — بنے ہر سطر اشکِ موج دریا

... ...

ہے آتش سنگ میں بھی بس کہ نایاب — شرر کی جائے نکلے قطرۂ آب
سمندر کی یہ سنتے ہیں زبانی — ہوا جاتا ہوں میں بھی پانی پانی
یہ دشتِ دہر میں بارش کا اثر ہے — کہ خارِ خشک بھی مژگانِ تر ہے
خطِ جادہ ہے ازبس رُود پُر آب — ہوا ہر نقشِ پا مانند گرداب
زمیں او پر ٹھہرتا سنگ ہے کب — شناور ہے بساں سنگِ پشت اب
زمیں گیری محال ازبس ہوئی ہے — پڑے پھرتی ہے ترتے اب بط مئے[2]

---

(۴۲) **فتوت**[3] — خواجہ عنایت اللہ فتوت بھی امرائے دربار آصفیہ سے تھے۔ باپ کا نام خواجہ عبدالرحمٰن اور خطاب اعتماد الدولہ لشکر جنگ تھا۔ ان

---

[1] مجموعہ قصائد در مدح ارسطو جاہ مخطوطہ۔

[2] مجموعہ فصاحت۔

[3] ریاض حسنی و تذکرہ تمنا۔

کے اجداد بدخشاں کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد اولکہ (چاندہ) میں اقامت کی، اس کے بعد ان کے دادا خواجہ آفتاب اورنگ آباد آرہے۔ سلطنتِ آصفیہ کی جانب سے جاگیر اور منصب ملا۔

فتوتؔ کے باپ کو موسیقی سے خاص شوق تھا۔ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ۱۱۶۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ فتوتؔ کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ بچپن سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ سید سراج الدین سراجؔ سے تلمذ حاصل تھا۔ 'ریاض حسنیؔ' کے نام سے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ۱۱۸۶ھ میں مرتب کیا ہے۔ محرّم ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا۔

تجھ تبسّم کا اگر غنچۂ خنداں پھوٹے
قتل ہونے سیں شہیدوں کے گلستاں پھوٹے

جو ہوا زلفِ پریشاں کے محبت میں شہید
قبر پر اس کی بجا سبزۂ ریحاں پھوٹے

نام شیریں ہے مرے دل کا وظیفہ ہر دم   شورشِ آہ کو میں تیشۂ فرہاد کیا

اب تلک چاک گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا   غنچۂ دل کبھو خنداں نہ ہوا تھا سو ہوا

مجھ کو کچھ خوف نہیں گرمیٔ محشر کا سجن   ہوں گا مشہور ترے سایہ پناہوں کے بیچ

ہو گا طوفان اشک خونیں سے مرے   مردم چشماں اے الحفیظ

بزم سے شعلہ صفت گروہ زرہ پوش اوٹھے
دلِ سوزاں سے مرے آہ شرر جوش اوٹھے

یہاں تلک مجھ سے ہے فرہاد کو ربطِ قلبی
دمبدم نالہ مرے دل سے ہم آغوش اوٹھے

لہ سنٹرل ریکارڈ آفس حیدر آباد دکن میں ایک نسخہ ہے اس پر ہم نے ایک مضمون لکھا ہے جو مقالات ہاشمی میں شریک ہے۔

ملک زرازلف کے لٹ جان فتوحت کھولو کیا بچا ہوئے جو یہ شام غریباں پھوٹے

میں قرباں ہوں ترا اے جان جرأت اس کو کہتے ہیں
نگاہِ دیدۂ بسمل ہوں حیرت اس کو کہتے ہیں

تیرے ابرو کے مقابل نہ رہا وہ رتبہ ماہِ نو واسطے تعظیم کے خم ہے کہ نہیں

عیشِ بہار و رنگِ خزاں دیکھ مر گئے بلبل نے اپنا کام جو کرنا تھا کر گئے

میں خواب میں ہوا ہوں ہم آغوش گلبدن کیا دیکھتا ہوں صبح کو ہے گا کنار سُرخ

کیا رہا اے دل دوانے وحشت میں جانے کا لطف
لے گیا مجنوں نے اپنے ساتھ ویرانے کا لطف[1]

---

(۴۳) کاظم

صوفی شاہ نام اور کاظم تخلص، اورنگ آباد میں اسد علی خاں تمنّا کے ہم درس تھے۔ تمنّا نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ اقلیم سخن را ناظم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

جب میں اے شوخ تجھے بر میں سراپا کھینچا تب سیں خمیازہ میں پھرتا ہوں میں کھنچا کھینچا
لام زلف و الف قد کو ترے دیکھ صنم صفحۂ حسن پہ کونین کے میں لا کھینچا
صبح ساقی کے قدم سے ہوئی عشرت کی مری ہاتھ ساغر کا پکڑ گردنِ مینا کھینچا

مجھ دل کا شیشہ آج یہ کہتا صدا گرا پھر جان سے اٹھا جو نظر سے گرا گرا
کیا پوچھتا ہے یار مری موت و زندگی مشتِ غبار تیری ہوا میں اڑا گرا

---

[1] تذکرہ تمنّا۔

گلزار ہو رہی ہے گلی آج یار کی	ازبس ہمارا خونِ جگر جا بجا گرا

زلف کو اوس نے پیچ و تاب دیا	دین و آئیں کو میں جواب دیا

آزاد نہیں ہوں حلقۂ زنجیر زلف سیں	کاظم گلے پڑی ہے مرے کس بلا کی شر[1]

---

(۴۴) کاظم کاظم علی نام، کاظم تخلص، حیدرآباد کے ایک صاحب ذوق امیرزادے تھے۔ کنک گھری کے نواب میر جنگ کے داماد حضرت اوجالا شاہ کے مُرید تھے۔ کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کاظم فطری شاعر تھے۔ ان کا کلیات جو ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس کلیات میں عام دواوین کی ترتیب کے خلاف زمانہ تصنیف کی ترتیب سے نظمیں، غزلیں، مرثیے اور مثنویاں وغیرہ درج ہیں۔ کلام میں آورد اور تصنّع نہیں ہے بلکہ آمد ہی آمد معلوم ہوتی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ مثنوی روزگار:۔

ظلم بیدادی ہمیشہ گرم ہے	بادشاہِ مملکت کیا نرم ہے
ایسے ظالم چوطرف پھیلے ہیں یار	اون کے یہاں جانے کسی کو نہیں ہے بار
ہاں مگر پاجی غلاماں پیش ہیں	مال وزرسے سب طرح دو بیش ہیں
جنگ دولہ ہوگئے پاجی سبھی	اون نے باباموش نا مارے کبھی

... ...

خلق عالم اوس کے ہاتھوں سے ہوا	نائب دجّال خر پیدا ہوا
بارہویں صدی کے سب آثار ہیں	سیّد و اشراف سارے خوار ہیں

دوسری مثنوی:۔

---

[1] گل عجائب تذکرہ تمنا۔ صفحہ ۱۲۹ تا ۱۴۹

[2] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۲۱۰

قیامت تک ہے میرے ساتھ پیارا — عجب ہے باوفا دلبر ہمارا
خدا اوس کو رکھے نت آبرو سے — حیا و خوش دلی اور سرخرو سے
ہے کاظم جان و دل سے اس کا عاشق — وہ پیاری کا وہی تھا خوب لائق

اوجالا شاہ کی مدح :-

شفیع و حامیٔ روز جزا اوجالا شاہ — ولی دُوائی ہر دوسرا اوجالا شاہ
خدا کی راہ کے ہیں پیشوا اوجالا شاہ — حبیب و عاشق حق بے ریا اوجالا شاہ
صحبت مرشدِ من بے ریا اوجالا شاہ

امین دین ہیں پانچوں کے رہبر کامل — صفا ہیں، پاک ہیں، فاضل ہیں حق مستی شامل
مراد شاہ گدا ہیں گی اوستی حاصل — عجب وہ شاہ قناعت ہے رب ستی واصل
صحبت مرشدِ من باخدا اوجالا شاہ

---

(۴۵) ضیاؔ — مرزا عطا نام اور ضیاؔ تخلص تھا۔ برہان پور کے ایک موضع میں ۱۱۳۴ھ میں ولادت ہوئی۔ خاندان برلاس سے ان کا تعلّق تھا اور ان کے نانا میر برہان اللہ سادات حسینی سے تھے۔ سن شعور کو پہنچ کر اپنے قصبہ سے نکلے، برہان پور میں سکونت اختیار کی۔ تحصیلِ علم میں مصروف ہوئے۔ جب شاہ سراج الدین اورنگ آبادی برہانپور آئے تو ان کے شاگردوں میں شامل ہو گئے۔ پھر اورنگ آباد آکر آزاد بلگرامی سے درس لینے لگے۔ اسد علی خاں تمنّا نے ان کو اپنا ہم درس اور خواجہ تاش بتایا ہے۔ میر حامد یار خاں مخاطب بہ ارسلان جنگ (جو رکن الدولہ میر موسیٰ خاں کے رشتہ دار تھے) کی سرکار سے ضیاؔ کو تعلّق تھا۔ شعر گوئی میں اچھا ملکہ حاصل تھا۔ ان کے کلام کی تعریف، شفیقؔ اور تمنّاؔ دونوں نے کی ہے اور دونوں نے ان کا حال قلمبند کیا [1] ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

تجھے کیا یاد ہے ساقی وہ عالم بے حجابی کا — ادھر تو جام کا ہنسنا ادھر رونا گلابی کا

اے ساقی دل میں پھرتا ہے خیال اس بے حجابی کا — وہ ہی ساغر کا چلنا اور کھڑا رہنا گلابی کا

---

[1] چمنستان شعراء۔ صفحہ ۵۵۲۔ گل عجائب۔ صفحہ ۶۷۔

تری آنکھوں کو ساقی دیکھ شاید جان جاتی تھی
گلابی بیٹھی منہ میں جام کے پانی جو آتی تھی

دیکھتے ہی اس کے خط کی شان دل مُرجھا گیا
اس دھوئیں کو دیکھ آنکھوں میں اندھارا چھا گیا

رنگ اُڑ گیا سمن کا نرگس بھی تک رہی ہے
گلشن میں گلبدن بن کھچڑی سی پک رہی ہے

اُٹھا دے اب تو اے ساقی تقیّد بے حجابی کا
کہ کیا ضبطِ سخن سے پیٹ پھولا ہے گلابی کا

جو تم کو منہ سے کبھی اوس نے باوفا نہ کہا
میاں غضب نہ ہوا کچھ بھلا بُرا نہ کہا

کیا بات ہے کہ جس کو رکھے دل میں گانٹھ باندھ
گر بے وفا کہا تو کہا، کیا بُرا کہا

ہمیں جو پوچھو تو محوِ ظہور شائق ہیں
کوئی ہو صوفی، کوئی شیخ یار عاشق ہیں
کسو زمانے میں یہ رسم تھی، پر اب وہ کہاں
کہ دور چلتے ہیں اور صحبتیں موافق ہیں

آزمانا تیغِ ابرو کا اگر مرکوز ہے
فکر اتنی کیا ہے بسم اللہ ظالم ہم تو ہیں

اللہ باقی من کُلّ فانی
کس کام کا میں کس کام کا تو
دل تو لیے ہیں صاحب ضیاؔ سیں
مارو گے پھر کیا جی سیں کسی کو

اے بتو تمہارے دل پر ہوا مرا گمراہ
لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

گر چشمِ فتنہ گر کو تغافل سے زیب ہے ۔ پر اے میاں کبھی تو کریں گے نگاہ بھی[1]

---

(۴۶) مبتلاء

الف خاں المتخلص بہ مبتلاء، اورنگ آباد ان کا وطن تھا، جوانی میں کسی پر فریفتہ ہو گئے اور اس کی وجہ سے مجنوں کا سا حال بنالیا تھا۔ تمنّا کے دوست تھے، رفتہ رفتہ پھر اچھے ہو گئے۔ شفیق ان کو جوان صالح کہتا ہے اور کلام کی تعریف کی ہے:۔

دن بدن کیوں زرد رو اور ناتواں ہوتی ہے یہ
کچھ دوا کر باغباں اس نرگسِ بیمار کی

ظاہر میں عشق و حسن میں اتنا ہی فرق ہے ۔ تم نے جفا و جور کیے، ہم دُعا دیئے

گہ ناز، گہ عتاب، گہے جنگ، گہ غضب ۔ دلبر ہے ان دنوں میں دل آزار بے طرح

مرا دل لے جانے کو دلبر تمہیں ہو ۔ جفا جو ہو، ظالم، ستمگر تمہیں ہو
جواہر کے دیکھے سے کیا مجھ کو حاصل ۔ مرے حق میں اب لعل و گوہر تمہیں ہو
مثالِ طلا دل کو آتش میں غم کی ۔ تپاتے ہو، کستے ہو، زرگر تمہیں ہو
نگاہِ تلطف ہے مجھ پر تمہاری ۔ اے آرام جاں بندہ پرور تمہیں ہو
کیے مبتلا دل کو کس کس ادا سے ۔ نظر میں ہو صاحب فسوں گر تمہیں ہو

معلوم نہیں کہ یہ دلِ وحشی کہاں گیا ۔ چل مبتلا اب اس کی کہیں جستجو کریں

شکستِ خاطرِ عاشق نہ کر ظالم تغافل سے ۔ مرا آئینۂ دل ہے تیرا اسبابِ خود بینی

---

[1] شفیق و تمنّا۔

[2] چمنستان شعراء ۳۰۲ صفحہ۔ گل عجائب صفحہ ۱۴۹۔

(۴۷) افسر سیّد نوازش خاں رازؔ کے فرزند تھے۔ اورنگ آباد وطن تھا۔ ہر مشاعرہ میں اپنی غزلیں سُناتے تھے۔ تمنّاؔ سے بڑی دوستی تھی، اس لیے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔[1]

یہ نہ سمجھو کہ میرا چاک گریبان ہوا — زخم دل پردہ نشیں تھا سو نمایان ہوا
حسنِ یوسف کی نہیں چاہ مجھے سُننا ہے — چاند صدقے ترے مکھڑے کے میں قربان ہوا

قاتل لہو سے غسل تو دے کر لپیٹیو — ہم بسملوں کی نعش گلابی کفن کے بیچ
روشن نہ کیجو شمع کو زنہار دیکھنا — پروانہ ساں جلوں گا ابھی انجمن کے بیچ
افسرؔ دل و جگر گئیں جل مل نہ جاتے ہائے — بے طرح شعلے آہوں کے بھڑکے ہیں تن کے بیچ

عشق میں شیریں کے ناحق جی دیا اے کوہ کن
کس سے سیکھا تھا تمھارے ظالم ایسی مرجانے کی طرح

کیا جانیے کہاں ہے ہمارا غریب دل — بیچارہ دل، ستم زدہ دل، بے نصیب دل

محفل میں دل جلوں کی، نہ لاؤ چراغ کو — روشن کرو نہ کوئی میرے دل کے داغ کو
گر ایک شب سحر کو نکالوں جگر سے آہ — مرغ چمن جلا دوں گا میں تیرے باغ کو

مرے جو سینۂ سوزاں سے آہ نکلے ہے — زبانِ شمع سے جوں شعلہ واہ نکلے ہے

---

(۴۸) آشفتہ خواجہ ابوطالب خاں نام اور آشفتہ تخلص تھا۔ خاندانی امیر تھے۔ باپ خواجہ اشرف خاں بہادر غضنفر جنگ اور دادا عماد الملک مبارز خاں تھے، جن سے فتحیاب ہو کر آصف جاہ نے دکن کی حکومت قائم کی تھی۔ آشفتہ

---

[1] گل عجائب۔ صفحہ ۱۰۔

علمی قابلیت بہت اچھی رکھتے تھے۔ شعر و سخن کا بھی پاکیزہ مذاق پایا تھا۔ دوست نواز دوست پرست اور علمِ مجلس سے پوری طرح واقف تھے۔ تمنّا سے تلمّذ تھا۔ خود کہتے ہیں[۵]

استاد فلاطونم و شاگرد تمنّا   آشفتہ دو عالم شد یکساں زمن امروز

وہ اپنے گھر سے مستِ شراب نکلے ہے   طلوعِ صبح کا جوں آفتاب نکلے ہے

آتا ہے کہاں غنچہ کو یہ ڈھنگِ تبسّم   جو لب پہ نمایاں ہے ترے رنگِ تبسّم

میں کب سے ترا طالبِ دیدار کھڑا ہوں   رسوا شدۂ کوچہ و بازار کھڑا ہوں

کرنا ہے اگر قتل تو پھر دیر کی کیا وجہ   حاضر ہوں ترے روبرو جلّاد کھڑا ہوں

ٹکڑے کر اپنے دل کو اے بلبل سحر کے وقت

غنچوں کے چاک کرنے کو بادِ صبا چلی

پھر مزا کیا رہا مرا صاحب   بات جب امتحان پر آ رہی[۵۲]

---

(۴۹) خیالؔ

محمّد طاہر المتخلص بہ خیالؔ، اورنگ آباد کے متوطن تھے۔ میر نور الدین دلؔ اور محمّد یوسف اللہ انورؔ سے عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم پائی۔ حیدر آباد میں درس و تدریس میں مشغول تھے۔ خیالؔ کے ساتھ رخشاں بھی تخلص تھا۔

ہم ان دنوں میں تو اور ہی معاش رکھتے ہیں   نہ فکر دنیا، نہ دیں کا تلاش رکھتے ہیں

یہ میرزا منشی ہے دماغ میں اپنے   کہ بوئے گل سے ہمیشہ خراش رکھتے ہیں

گہے ملول و گہے شاد ہر طرح رخشاں

ہم اپنی زندگی اب اس قماش رکھتے ہیں

---

۵۱ گل عجائب صفحہ ۱۶ تا ۱۸

۵۲ شفیق

دیوانہ کوئی دل میں تیرے راہ کیا کرے　　سنتا نہیں تو کس کی کوئی آہ کیا کرے
آتے ہوں ساتھ آہ کے کٹ جس کے سخت دل　　پھر پھر وہ آہ اے میرے اللہ کیا کرے[1]

---

(۵۰) سالم[2]

محمد کرم بخش نام اور سالم تخلص تھا۔ ذکار سے تلمذ رکھتے تھے۔ قصبہ پیپری کے قاضی تھے۔ عربی کی بڑی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ تمنا ان کی شاعری کی بڑی تعریف کرتا ہے اور اپنے تذکرہ کو ان کے ہی ایماء سے مرتب کرنے کا اعتراف کیا ہے[3]۔

میں نے دل اب تو ترے ہاتھ دیا یا قسمت　　کام جو مجھ سے نہ ہونا تھا ہوا یا قسمت
کوئی دن خوب سی ہم نے بھی مچالیں دھومیں　　اب وہ ہم ہی ہیں نہ وہ دل ہی رہا یا قسمت
ایک تھا مجھ طرف آنے سے تجھے عذر حیا　　تس پر اب پانوں کو باندھی ہے حنا یا قسمت

جس طرح کھیت کو شاداب رکھے ہے شبنم　　سبز ہے حسن تیرا یوں عرقِ شرم کے سات

خوبرویوں کو نہیں پردے میں ہرگز اعتبار　　دُر صدف کی قید سے نکلے پہ پاتا ہے وقار

دیکھیے آتا ہے قاتل کس طرف خنجر بکف　　ایک میں ہوں سو تو آپی بے رہا ہوں سر بکف
کس بُتِ طامع سے لے خورشید سودا ہے تجھے　　ہر سحر دیکھا تو آتا ہے لیے تو زر بکف

مجھے تو نے عبث کیوں نیم بسمل کر دیا قاتل　　نہ جیتا ہوں نہ پورا مر چکا یہ کیا کیا قاتل

حجاب دختر رز کو تجھی سے نہیں زاہد　　جہاں گئی ہے تو بے پردۂ سبو نہ گئی

---

[1] گل عجائب صفحہ ۴۹۔۵۰
[2] 〃 〃 ۶۱۔
[3] 〃 〃 〃

کبھی نظریں چُرا کر مسکرانا کچھ نگہ کرنا ۔۔۔ غرض کیا لطف ہے جب آشنا سے آشنا ہوئے

اک جان ہے سو اب تک تجھ بن ترس رہی ہے
پھر پوچھتا ہے پیارے کیا کیا ہوس رہی ہے

---

(۵۱) عشرت خواجہ ابوالبرکات خاں نام اور عشرتؔ تخلص تھا۔ نواب لشکرِ جنگ کے فرزند تھے۔ سیّد شاہ سراج الدین کے شاگردوں میں شامل تھے۔ حیدر آباد میں سکونت تھی۔

ہجر کے درد مصیبت نے کیا از بس اُداس ۔۔۔ سر گئیں، آنکھیں گئیں اور دل علیٰ ہٰذا القیاس

میں ہوا جب سے تری نرگسِ خفتاں سے جُدا ۔۔۔ تب سیتی خواب ہوا دیدۂ حیراں سے جُدا

گلشنِ دل میں اگر سروِ خراماں گزرے ۔۔۔ اشکِ خونی سے گلستاں میں طوفاں گزرے

ارے دل تیرے ٹکڑے ہیں کہاں آنسو کے دانے ہیں
مگر آنکھیں ہمیں نیں ہیں کہ یہ سارے بہانے ہیں

عشرتؔ مدام مدِّ نظر رکھ یہی دُعا ۔۔۔ دل جائے، جان جائے، پہ ہرگز نہ جائے آنکھ[۲]

---

(۵۲) قدر خواجہ محمّد منعم خاں المتخلص بہ قدرؔ، ان کے اجداد ہمدان آئے تھے۔ ان کے دادا خواجہ عبداللطیف اورنگ آباد میں متوطن ہوئے۔ قدرؔ کی پیدائش اسی مقام پر ہوئی۔ ان کے والد خواجہ عبدالغنی خاں صمصام الملک کے سررشتہ

---

[۱] گل عجائب۔ صفحہ ۶۴۔

[۲] ،، ،، ۹۶۔

میں ملازم تھے۔ قدرؔ علم وفن میں کافی دست گاہ رکھتے تھے۔ سوانح دکن کے نام سے اونہوں نے تاریخ لکھی ہے جو مستند تاریخوں میں شمار ہوتی ہے اور فارسی میں ہے۔ قدرؔ کو شاہ معین الدین تجلّی سے تلمذ حاصل تھا۔ تمنّاؔ سے یارانہ اور خلوص تھا۔ دونوں حیدرآباد میں ہم محلّہ تھے۔

کوہ کن کی اک جان مفت گئی تیشہ سے ہات شیریں کے لگا تو بھی نہ تارِ دامن

ساقی گیا ہے روٹھ کے ہم سے ہزار حیف آتی ہے کیوں تو دھوم سے اب کے بہار حیف

آب و رنگ نازکی کو گُل سے پوچھا چاہیئے شیوۂ دیوانگی بلبل سے پوچھا چاہیے

تختِ شاہی ہے زمرّد کا دوانے کے لیے مینھ برسنے سے نہیں سبز ہے رنگِ صحرا

صحنِ چمن میں مہکے جو ساقی ہوا چلی تجھ بن گھٹا بھی آئی سو ہم کو رُلا چلی
بلبل ہوئی ہے دام میں صیّاد کے اسیر غنچوں کے کان کھولنے بادِ صبا چلی
لالہ نہیں ہے کوہ پہ فرہاد کی ہے قبر شیریں نے آکے اوس پر چراغ جلا چلی

نہ چُھپ سکی مرے مرنے کی بات اے قاتل کہ بوئے قتل جہاں میں شتاب پھوٹے ہے[1]

---

(۵۳) ہوشؔ غلام امام الدین علی نام اور ہوشؔ تخلّص، ان کے دادا خواجہ کمال بڑے پایئے کے بزرگ تھے اکثر رؤسا دکن آپکے معتقد تھے۔ ہوشؔ صرف شاعر نہیں بلکہ نقّادِ سخن تھے۔ آپکے اجداد کا وطن احمد نگر تھا شفیقؔ آپکے کلام کی تعریف کرتا ہے اور اپنے دوستوں میں شمار کیا ہے۔

نہ پایا دل کی وحشت نے جہاں میں کہیں مکاں اپنا
رمِ آہو کے سائے میں ہے باندھے آشیاں اپنا

---

[1] گل عجائب۔ صفحہ ۱۳۴

اے دل جا کہہ یہ پیچ و تاب کا ان خوش دماغوں کو
لکھو موجِ نسیم نکہتِ گُل پر بیاں اپنا

منتشر نہیں زلف پر چیں چہرۂ دلدار پر
زنگ کے لشکر نے دیکھو روم پر شب خون کیا
جوشِ سودا دیکھ مجھ میں نازنیں فصاد نے
نشترِ مژگاں سے جاری فیض دل کا خوں کیا

شعلہ رو کے خالِ مشکیں کے سوا ہم آج تک   آگ پر ٹھیرا ہوا اسپند کہیں دیکھا نہیں

دیکھ چشم مست ساقی، خواب میں بیخود ہوا   میری آنکھوں سے شراب ناب کھینچا چاہیے[1]

---

(۵۲) بے جان

لالہ جے کشن المتخلص بہ بے جان، اورنگ آباد میں رہا کرتے اور شاہ سراج الدین سراج سے تلمذ حاصل تھا۔ صلابت جنگ کی فوج میں ملازم تھے۔ شفیق سے دوستی تھی۔ ایک مرتبہ رخصت کے وقت ایک غزل موزوں کی جس کا مقطع یہ تھا ؎

تری یادِ کمر سے یوں عدم میں مل گیا بے جان
کہ قالب بھی نپادے گر کوئی اس کا کفن کھولے

شفیق کا بیان ہے پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

یار مہندی بھرے ہاتھوں سے اگر ہوئے طبیب   شاخِ نبضِ دلِ بیمار سے مرجاں ہوجائے

نگہ کی جوت بجلی کی نیں سیتی نمایاں ہے
اندھاری رات میں بجلی بھی چمکے ہے خدا حافظ

---

[1] چمنستان شعراء صفحہ ۹۹، ۶۰

باغ میں کرے نرگس عرضِ حال گر اپنا　　آنکھ کی اشارت سے تب جواب دیتا ہے

کیوں نہ حاصل ہوے خوشی جگ میں　　دلِ بے جاں میں جان آیا ہے[1]

(۵۵) ہُنر

سید احمد نام اور ہُنر تخلص تھا۔ عشرتی کے فرزند تھے۔ کئی مثنویاں ان کی یادگار ہیں۔ ایک "نیہ درپن" ہے جو ۱۱۴۴ھ میں قلمبند ہوئی ہے۔ یہ مثنوی ابنِ نشاطی کے "پھول بن" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ایک دعوت کا سماں ملاحظہ ہو:-

بچھائے چاندنی کا فرشِ زرمل　　کہ جیسا چاندنی میں تے جھفا جل
بچھائے سوزنِ نہاں زرباف کی صاف　　ہے اس گل سورجِ بلبل کو انصاف
روپہری اور سنہری مسنداں پر　　صدر میرے رہے جیوں سورو چندر
اتنے پروار تکیے پرنیاں باف　　پریاں کے گال جیسے نازک ہور صاف
سرنگ آسماں گیریاں تھیں شفق سی　　اتھی گلدار جیوں کھن کے طبق سی
رکھے پھولاں سو بھر اس ٹھار گلداں　　رکھے تھے پان سیتے پھر تنبول داں
جڑت کے شمع داں ہیں شمع کافور　　نوے چندیتوں لگن ہیں گھن کے پُرنور
قندیلاں کے دکھن جھمکے سُہانے　　انگوراں کے جھڑے خوشہاں کے دانے
دلویاں سوں کنگراں ایسے سہنارے　　کہ جیوں قوسِ قزح میانے ستارے
طبق طور کی خوشبو سوں بھر　　ہزاروں چاند تھے جیوں انہیں کے ابر

(۵۶) رسا

مرزا جان نام اور رسا تخلص تھا۔ اس دور کے استادِ سخن تھے۔ فارسی اور عربی میں عالم و فاضل تھے۔ ادیب کامل سمجھے جاتے تھے۔ زمانہ دراز تک آصف جاہ کے دار الانشاء میں مامور تھے۔

(۵۷) سید شاہ عبد القادر

سید شاہ عبد القادر فی الحال کرنول کے شاعر ہیں۔ قابل آپ کا تخلص تھا۔ عربی، فارسی پر کامل عبور تھا۔ فارسی

---

[1] چمنستانِ شعراء۔ صفحہ ۵۹، ۶۰۔

اور اُردو میں شاعری کرتے تھے، آپ کی شاہ قدرت اللہ سے بیعت اور خلافت حاصل تھی، ۱۲۱۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ کرنول میں مدفون ہیں، آپ نے دیوان مرتب کیا تھا اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں قلمبند فرمائی ہیں، جو عورتوں کی زبان یعنی ریختی میں ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

شوق جس کو ہے وصالِ یار کا — دل میں اس کے نیں خیال اغیار کا
حاضر و ناظر ہے یارِ دل رُبا — ٹک خبر رکھ مطلع الانوار کا
ظاہر و باطن کے مکتب میں سدا — درس ہے نت یار کے دیدار کا

جامِ جہاں نما تھا باطن میں دل ترا — کیوں بیچتا ہے مفت تو حرص و ہوا کے ہاتھ

محمدؐ ظاہر و باطن محمدؐ — محمدؐ ہے دو عالم کا سبب ساز

دو جہاں کی شکل ایک تنکے میں دستی ہے عیاں — سانچ ہے تحقیق کر یہ بے کلی شاہاں کے بیچ

عارفاں کو وصل حق ہر آن ہے — زاہداں کی نیں گلی ہے دال آج

کنت و کنزا سے جو ہوا محروم — وصل کے ہاٹ کا ہوا بقّال

گنجِ خفی سوں عشقِ خدا جب شوق پکڑ اظہار ہوا
تب غائب تھا اب حاضر ہو یکبارگی سنسار ہوا

دل مرا محوِ انا تھا مجھے معلوم نہ تھا — سالکِ راہ صفا تھا مجھے معلوم نہ تھا

---

(۵۸) شاہ غلام حسین

شاہ غلام حسین ایلچ پور (برار) کے ایک صوفی بزرگ تھے۔ آپ کے والد غلام حسن تھے، جو نظام الدین

اورنگ آبادی کے خلیفہ شاہ اسمٰعیل چشتی کے مُرید تھے۔ شاہ غلام حسین کے اجداد اللہ آباد سے برار آئے تھے اور برار میں بس گئے۔ ایلچ پور دکن کی عماد شاہی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور عرصہ تک علم و فن کا مرکز بنا رہا۔ شاہ غلام حسین کا خاندان اسی زمانہ میں یہاں آیا تھا۔ شاہ غلام حسین کا انتقال ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں ہوا، آپ کی ایک تصنیف "لگن نامہ" ہے جس میں تصوّف کے مسائل درج ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ایک دوسری تصنیف "یک رنگ نامہ" ہے، ان دونوں مثنویوں کے متعلق محبی ڈاکٹر نعیم الدین صاحب نے نوائے ادب بمبئی میں تفصیلی صراحت فرمائی ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

تمنّا کوں اے سہیلیاں میٹھے بچن سُناؤں ملک کان دھر سنو تو پھولوں تمن ملاؤں
پیو کے اپر تمہیں سب تن من اپسکا وارو پیو کو سمجھ کے دل میں ایک دم نکو بسارو
پیو کے چرن کے ماٹی سرمہ نین میں بہاؤ مثل عبیر اس کو ماتھے اپر لگاؤ
جوبن پو ہو رہی کیوں بدمست اے دوانی جوبن کے آونے میں چلنے لگی اوتانی
پیو جاج کوئی سانچہ ساتی ملے نہ دوجا کیوں تجکوں اے دوانی دنیا کا عشق سوجا
جوبن ڈھلے گا تیرا جیوں دوپہر کا سایہ دو دن کی زندگی میں جوبن رہے نہ مایا
اس مایکے کے گھر سوں ہرگز نہ دل لگانا جانا ہے سامریکوں آخر وہی ٹھکانا
پھر مایکے کے گھر میں آنا نہیں دوبارا کچھ سات اپنے لے چل سامرے کے ٹھارا
جب سامرے کے گھر میں پیو سوں ملاپ ہووے تب مایکے کے گھر کی سینے سوں باد دھووے
ساس اور سامری گھر بچکوں نہبا کے چلنا گرتے نہیں اپنے ست کو نبہا کے چلنا

یک رنگ نامہ ایک مختصر مثنوی ہے اس میں ہندو مسلم کو اتفاق سے رہنے کی ہدایت کی ہے۔

یہ دونوں جھنے ایک جاگہ سوں آئے جگت میں مسلمان ہندو کہائے
کمہار ہے کمہار ایک ماٹی کے بھانڈے ہوا کوئی مُلّا، ہوا کوئی پانڈے
دونوں جھنے کیوں بھٹکتے چلے ہیں کدھر سوں کدھر کو بہکتے چلے ہیں
مسلمان مسجد میں سجدے کو جاویں او ہندو بھی پوجا کو دیول میں جاویں
زبان جوڑے ماٹی کی دیوار دیکھیں اپس گھٹ کو چھانے تو دیوار دیکھیں

مُسلمان تسبیح لمبی سپھرا دیں | اوہندو بھی مالا بھگل کے دکھا دیں
دکھاتے ہیں لوگوں کو دانے سپھرا کر | الپس منکا منکا پھیریں ہرا کر
مُسلمان اللہ کا نام بولیں | ہندو بھی ہر ہر جپیں رام بولیں
زباں سوں کہیں دل سوں اپنے بسادیں | وہ حاضر کو غائب سمجھ کر پکاریں[1]

---

(۵۹) باقر

شاہ باقر حسین، باقر تخلص، صوبہ دار ایلچ پور برار۔ صلابت خاں کے درباری شاعر تھے۔ صلابت خاں آصف جاہ ثانی کے دور میں برار کے صوبہ دار تھے۔ دکن کے اکثر صوبہ دار علم دوست اور علم وفن کے شائق رہے ہیں۔ شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی ان کا معمول تھا۔ شاہ باقر کے متعلق کوئی تفصیلی معلومات بدست نہیں ہوئیں صرف اسی قدر معلوم ہوتا ہے وہ صلابت خاں کے دربار سے متوسل رہے، دیوان مرتب کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ شاہ باقر ایک مذہبی شخص تھے صوفی منش بزرگ تھے، ان کے مرشد کا نام شاہ حسین تھا، دیوان میں کئی جگہ باقر نے اپنے مرشد کا تذکرہ نہایت ادب اور تعظیم سے کیا ہے، اپنے سرپرست صلابت خاں کے متعلق بھی غزلوں میں ذکر کیا ہے۔ افسوس ہے شاہ باقر کے متعلق اس سے زیادہ حالات معلوم نہیں ہوئے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

اے باقر تو سجدہ میں ہر دم رہا کر | حسین تو تجھ کو عیاں دیکھتے ہیں

شاہِ حسین پیر کا میں کیا بیاں کروں | باقر کو دو جہاں سے آزاد کر دیا

کیا بخشش صلابت پہ یہ حیدر کا ہوا ہے
صورت کو حسینی کے ہے آنکھوں میں جمایا

اسمٰعیل خاں شہید پہ تم نے کرم کیا | دہنِ صلابت خان کو پاشاں کر دیا

---

[1] یک رنگ نامہ مملوکہ ڈاکٹر نعیم الدین رسالہ نوائے ادب اپریل ۱۹۵۶ء۔

ساقی نہ دے پیالہ مجھے اب شراب کا　　پروہ نہیں رہا ہے مرے پر حجاب کا

گرچہ ہے بازار کثرت کا بھرا چاروں طرف
پر ترے دیدار میں اور کام مجھ کو کر رہا

جلوہ تو ترے نور کا ہر شے میں بھرا ہے　　طالب میں جو دیکھا وہی مطلوب میں دیکھا

خیالِ روح کچھ ہم سے بیاں نہیں ہوتا　　بغیر دیکھے سے اس کی اماں نہیں ہوتا

لحمک لحمی جب کہا ہے رسول　　شان میں یہ علی کی ہے امداد

تو تو میری آنکھ میں رہتا ہے ہردم ہر گھڑی
میں تیرا ہوں دل سے عاشق تو میرا دلدار ہے

کوئی عاشق کے صدقے ہے کوئی گلفام کے صدقے
دیا ہے جام مجھ کو، میں ہوں اس صد جام کے صدقے

مردے زندہ ہوئے ہیں اس کے گھر سے　　لن ترانی کا وہاں اشارا ہے
وحدت و کثرت ہے مقام درے　　غافلوں کا تو وہ بشارا ہے

باقی نے اوٹھایا ہے مزہ عشق میں تیرے
مستی کا نشہ دلبرِ مجوب میں دیکھا

---

(۶۰) **ذرّہ**

بالاجی ترمبک نام اور ذرّہ تخلص تھا۔ رسا سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک ان کے موجود رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔

کتب خانہ آصفیہ میں خود ان کا قلمی دیوان موجود ہے۔ غزلیں عموماً چار چھ شعری ہیں۔ دو مثنویاں بھی لکھی تھیں۔ ایک 'مظہر نامہ' اور دوسری لطیف سے موسوم تھی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔
ادارہ ادبیات نے کلام شائع کر دیا ہے۔

اس جانِ ناتواں کا مسیحا کب آئے گا　　مجھ دل موسوی ید بیضا کب آئے گا

نہ بولی شمع اتنا ہائے پروانے کے ماتم پر　　کہ تھا یہ ہمدم اپنا، یار اپنا، جاں نثار اپنا

پیر ہادی نے یوں کہا ذرّہ　　جب تلک ہے جہاں میں تو خوش باش

بے وفاؤں سے وفا کرتے ہیں ہم　　حق محبّت کا ادا کرتے ھیں ہم

ذرّہ بھی اپنے رنگ میں خورشید طبع ہے　　مضموں کا اس کے رنگ پڑا ہے رسا کے ہاتھ

کھو دیا اعتبار آنکھوں نے　　دل دیا ایک بار آنکھوں نے

ایسے خوابوں کو دل نہ دے زنہار　　تیرا دنیا میں کیا خدا ہی نہیں[1]

---

(۶۱) پروانہ شاہ ضیاء الدین نام، پروانہ تخلص، شاہ سراج الدین سراج کے معتقد، شاگرد اور منظورِ نظر تھے۔ برہان پور وطن تھا۔ پروانہ صوفی تھے اور مُرشد سراج پر پروانہ کی طرح نثار تھے اور فنافی السراج ہو گئے تھے۔ پروانہ کے متعلق تحسین سروری نے رسالہ اُردو کراچی میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ پروانہ نے غزلیں بھی کہی ہیں اور مثنوی بھی لکھی ہیں۔ بمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

چشم جان کے اے مرے شمع و چراغ　　دل ہے پروانہ کا تیرے غم میں داغ

---

[1] ادارہ ادبیات اُردو نے ان کا کلام شائع کیا ہے۔

ڈھونڈتا ہوں تجھ کو ہر محفل میں میں
بلکہ ہر یک جسم میں اور دل میں میں
نے میں میرے دل کے ہے تیرا نوا
بزم میں تو ہے تری خالی ہے جا
دھن میں ترے وصل کی مجھ تار میں
ہے صدا مستی کی اس ہشیار میں
بلکہ مجھ پردے میں تیرا راز ہے
ساز تیرا ہے، ترا آواز ہے
کاسۂ سر میں میرے طنبور وار
آرزوئے وصل تیری کے پکار

ہے عشق گلبدن کا جس دن سے مجھ کو سودا
صحرا ہے باغ مجھ کو اور باغ ہے گا صحرا
ہے دل میں تو ہمیشہ کس طرح تجھ سے ملنے
رہتی ہے یہ ہمیشہ دل میں مرے تمنّا
رقیباں ہو گئے مغلوب سارے
مرے طالع کا غالب ہے ستارا

دل ترے عشق میں کیا کیا نہ کیا
سب کیا غیر کا سودا نہ کیا
نہ کیا کعبے کا دل جا کے طواف
اور بُت خانہ کی پوجا نہ کیا
نہ ہوئی اس کی جہاں میں شہرت
عشق میں خود کو جو رسوا نہ کیا
نہ ہوا یار کا دیدار اوسے
دل کو جو عرشِ مُعلّا نہ کیا
داغ پروانہ ہوا جل کے تمام
جان جانے کی وہ پروا نہ کیا

تالاب میں تین کے خوش آب کا تماشا
اور اس میں اشکِ گلگوں سرخاب کا تماشا
آنکھوں میں اشک میرے کرتے ہیں رقص تجھ بن
اے سرو دیکھ جو میں گرداب کا تماشا
سید سراج تجھ بن پروانہ ہے گا بے کل
آتش میں دیکھ آ کر سیماب کا تماشا

تشنۂ وصل ہے جو کوئی کی بیتاب ہوا
آب تیغ کفِ قاتل سیتی سیراب ہوا
جل کے خاکسترِ اکسیر ہوا پروانہ
مثل سیماب دو جلتے میں نہ بیتاب ہوا[1]

---

[1] رسالہ اُردو کراچی ماہ اپریل ۱۹۵۱ء مضمون تحسین سروری۔

(۶۲) بہم چند

لالہ بہم چند نام اور یہی تخلص کرتے تھے۔ دیوگدھ (خاندیش) کے قلعدار برہان شاہ کے متوسل رہے۔ شاہنامہ کا ترجمہ ۱۲۰۷ھ میں کیا۔ پانچ سال کی مدت میں اس کو مکمل کرنے کی صراحت کی ہے۔ بہم چند کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

سنو اے سخن سنج دانش پناہ — ذکر بادشاہ ہے کیومرث شاہ
کیا جس نے بنیاد تخت اور تاج — نہیں تو جہالت میں نہ تھا یہ رواج
رہے کوہ میں سات انبوہ کے — چرم چارپایوں کی پوشاک سے
سیامک اسم اس کو فرزند تھا — شکل خوب محبوب دل بند تھا
تھا ایک دیو دشمن کیومرث کا — اسے ایک فرزند مکّار تھا
وہ آیا کیومرث کی جنگ کو — گراں فوج دیووں کی لے جنگ کو
سیامک جو فرزند تھا بادشاہ — سو آکر مقابل ہوا باسپاہ
لڑا دیو بچہ ستے ذات سے — ہوا اس مکوں بجنگی ہات سے
یہ کہہ کر شتابی سے ڈالا کمند — سو رستم نے سر کو بچایا زبند
پیندار خشکی سر میں آوہ طناب — سو رستم نے چاہا نکالوں شتاب
کمند پکڑ کو کی انچا اسنے — ادھر اس نے کھینچ جو اپنی کنے
کیا زور دونوں نے ٹوٹا ادھر — گرا زمین کا موس ہے خوار تر
چھپا پھر جو گھوڑے پہ ہونا بلند — سو رستم نے ڈالا گلے میں کمند

نقارے بجے اور سجے پہلوان — ہتھوں پر کھلے ہفت رنگی نشاں
ہوئے ہر دو لشکر مقابل کو جب — پوچھا پہلوانوں سے خاقاں نے تب
کہو کوں رستم سے لڑنا ہے اب — سو کاموس جنگی ہوا تیز تب
نکل اپنے لشکر سے گھورا کدا — بلایا ورستم کو میدان میں آ

---

(۶۳) عشق

مرزا جمال اللہ نام اور عشق تخلص، مرزا داؤد کا فرزند تھا اور شاہ غلام قادر سامی سے تلمذ تھا۔ اولاً اورنگ آباد میں قیام تھا۔ پھر حیدر آباد آکر بس گیا۔ ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ عشق کا حال اور نمونہ کلام مرقع سخن جلد دوم میں

تفصیل سے درج ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

آتشیں روتیرے آگے تاب کب لاتی ہے شمع
رشک سے تجھ حسن روز افزوں کے جل جاتی ہے شمع

چاندسی صورت کے آگے تیرے شرماتی ہے شمع
دیکھ روشن مکھ ترا بے نور ہو جاتی ہے شمع

سینہ بریاں، چشم گریاں، آہِ سوزاں، دل تپاں
کس قدر جلنے کا پروانہ کے غم کھاتی ہے شمع

خاطر سے غبار ہو گئے ہم — جتنا کہ ہنسے تھے رو گئے ہم
اے عشق بقول درد سچ ہے — کچھ لائے نہ تھے کہ کھو گئے ہم

---

(۶۴) متین

میر مہدی نام اور متین تخلص تھا، برہان پور کے متوطن تھے۔ ان کے والد محمد امین دربار آصفی میں مقرب شاہی تھے، شاعر بھی تھے اور بیدل سے تلمذ حاصل تھا۔ متین کی علمی قابلیت نہایت عمدہ تھی۔ شاعری میں شاہ سراج سے اصلاح لیا کرتے، شفیق نے ان کا تذکرہ کیا ہے، متین کے مرثیہ کا نمونہ پیش ہے:۔

کہے بتول نے آکر مرے یتیم حسین — شکیب و صبر کے مظہر مرے یتیم حسین
جفا کشیدہ و بے سر مرے یتیم حسین — دیا توں سر کوں رضا پر مرے یتیم حسین
اودھر کوں تیرے گلے سے ہوا لہو جاری — ادھر کوں میں نے جگر کے لہو سے کی زاری
ادھر تو خاک پر پڑیا ادھر میں دکھیاری — اے ناز پرور و دلبر مرے یتیم حسین
مری اجل کا نبی خواب میں کہے انداز — ہوا نہ مجکوں الم دل ہوا یہ غم سے گداز
دھوویگا کون مرے بن تری یہ زلف دراز — سو تجکوں مارے جفا گر مرے یتیم حسین
کہی تھی وقت اجل میں علی کو یہ گفتار — کہ تم حسین کو لے جاؤ اب دکھا دیدار
رو دے گی روح مری گر اٹھے گا آہ وہ مار — غریب و بیکس و بے گھر مرے یتیم حسین
اوّل تو غم سے محمدؐ کے تھی میں خاک بسر — نین میں اشک و گر دل بنا تھا جوں اخگر
ترے جو حلق کو دیکھا ہوا دو نیم جگر — سرور جان پیمبر مرے یتیم حسین

ہوا الم سیتی محسن کے دل مرا پر داغ گداز دود سے آہوں کے بن رہا تھا دماغ
ترے میں آتشِ غم سے جلی مشال چراغ
اے رشکِ ماہِ منور مرے یتیم حسین

گیسو تمہارے بکھرے ہوئے رُخ پہ ہیں گواہ
کیا کیا لیے ہو سر پہ پریشانیِ اسلام
کہتا ہے صبح اُٹھ کے متیں صاف دل سیتی
آئینہ دار جوہر انسانیِ اسلام
زندگانی خاک ہے جو تم چلے سر کے چھتر
ڈھل پڑے آنسو کیسے جب اشک ....
طلب نگاہوں سے کرتے ہیں رو کے ہردم آب
سراب کا بھی جہاں احتمال مشکل ہے
مذبوحِ کربلا ہو تم اے آہوئے حرم
تم کو ہوتی ہے مرگ بیا بانی اسلام

ایک دن وہ تھا کہ تھے سجدہ میں نانا غمگسار
جب ہوا پیارا نواسا پیٹھ پر آ کر سوار
ایک دن یہ ہے کہ ظالم سر لیے اوس کا اُتار
ہائے محتاجِ کفن لوہو سے افشاں ہے حسین

کہی زینب نے رو رو کر اے میرے مبتلا عابد
کہ ہے بیمار تو، مجھ کو لگے تیری بلا عابد
چلے ہیں تس اوپر لے کر تجھے زنجیر پا عابد
چھڑا دے ظالموں کی قید سے تجھ کو خدا عابد
پدر تیرا سو تھا ٹکڑا مرے دل اور کلیجے کا
محمدؐ نے جسے گودی میں کس کس چاؤ سے پالا
ہماری آج آنکھوں میں قیامت ہو گئی برپا
سروں کا دیکھ کر نیزے اوپر عالم نما عابد[1]

---

[1] رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۶ء

اس دَور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور میں ہم کو ایک خاتون شاعرہ کا دیوان بھی بدست ہوا ہے، چنانچہ اس کی صراحت کی جاتی ہے :-

---

(۶۵) امتیاز لطف النساء بیگم نام اور امتیاز تخلص تھا۔ حیدرآباد وطن، ماں کا بچپن میں انتقال ہوگیا اس لیے شاہی خاندان میں پرورش ہوئی۔ اسد علی خاں تمنا سے بیاہی گئی مگر جوانی میں بیوہ ہوگئی۔ مذہبی شغف کے لحاظ سے شاہ عطاء اللہ کی مُرید ہوئی اور حج سے مشرف ہوئی۔

اس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اس میں اس نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ دیوان اس نے چھتیس سال کے سن میں مرتب کیا ہے۔ اس لیے اس کی پیدائش ۱۱۷۶ھ میں قرار پاتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے مرنے کا کوئی سنہ معلوم نہیں ہوا۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے جس میں اصنافِ سخن کے جملہ اقسام پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ دیوان کے علاوہ اس کی ایک ضخیم مثنوی "گلشنِ شعرا" سے موسوم ہے اور اس کے آٹھ ہزار شعر ہیں۔ ان سے امتیاز کی پُرگوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ امتیاز کا دیوان اپنے عہد کی ایک اچھی تصویر پیش کرتا ہے۔ سماجی امور کو اُجاگر کیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے اولاً مثنوی کا انداز۔

تو عشقِ حقیقی سے مدہوش ہے	شرابِ محبّت سے بے ہوش ہے
عطا وہ کیے معرفت کا کلام	عطاء اللہ سچہ میرے مُرشد کا نام
امین الدین اعلیٰ جو ہیں ان کے جد	وہ علمِ حقیقی کے ہیں مجتہد
جہاں تک زمیں ہے، وہاں تک امیں	ہیں سب اولیاء میں وہ مثلِ نگیں
یہ قصّے کو میرے تو مقبول کر	پڑھے اور سُنے کوئی اہلِ ہُنر
جو اس وہم میں دل نپٹ کٹ گیا	جو اک بی بی نے یہی مجھ سے کہا
جو لطف النساء سچ ہے تیرا ہی نام	ترے شعر کا شہرہ تا روم و شام

غزلیات کا نمونہ :-

میں نے جب خواہشِ شراب کیا	محتسب کا جگر کباب کیا
امتیاز اب تیرا لقب ہم نے	جاں فدائے ابو تراب کیا

امتیاز آہ وہ کافر نے جلا خاک کیا　　گلشنِ عشق کا دل میں جو گل بوٹا تھا

تڑپ کر جان دیتا ہے ارے قاتل ذرا آجا　　ہے رخصت کوئی دم میں ہائے یہ بسمل ذرا آجا

محو ہو دیکھ کے جلوے کو جمالِ ازلی　　نقدِ جاں لے کے خریدی، میں خریدار بنا

شہہ دکن ہے آصف جاہ ثانی نامدار　　دادِ فریاد رس جس کو بنایا کردگار

دلِ بیتاب کو میرے نہیں آرام کہیں　　جب تلک ہو نہ ہم آغوش گل اندام کہیں

جامِ جہاں نما تو میرے ہاتھ آچکا　　عشقِ صنم میں نوش نہ کیوں جامِ جم کروں

مے پرستاں ہیں کدھر ساقیِ سرشار کہاں　　دھوم رنداں ہے کدھر بادۂ گلنار کہاں

شیشۂ دل میں ہمارے وہ پری رہتی ہے　　عقل انساں کی جسے دیکھ دھری رہتی ہے

میرے جگر میں آہ و نالوں کی کیا کمی　　پھر جستجو میں اوس کے خیالوں کی کیا کمی

جی میں آتا ہے کہ دل اب سیرِ صحرا کیجیے　　چھوڑ کر بستی کو وادی کا تماشا کیجیے

ہم سے نہ پوچھے جو کہے لذّتِ وصل　　عمر گذری ہے ہمیں ہجر میں مرتے مرتے

پریشاں راہ پر ظالم کے ہو بیٹھا ہے دل کب سے
کہ شاید بوئے زلفِ عنبریں اس تک صبا لادے

دیکھلائی کس مزے سے اب کے بہار ہولی
..... کھیلے ہیں سب جمع ہو کر گلعذار ہولی

ساری پری رخاں مل کیسی مچائیں موجیں
رنگ زرد و سرخ لے کر کھیلیں نگار ہولی

سونے کی تھالیوں میں رکھ کر عبیر و ابرک
اوپر سے قمقموں کے ہے مار مار ہولی

سارے طوائفوں نے ناچے ہیں کیا مزے سے
اندر کا ہے سبھا دیکھ ہے بے قرار ہولی

جب راگ کا سماع کر گاویں ہیں کس ادا سے
نکلے ہے منہ سے اون کی بے اختیار ہولی

نہ سمجھیں کفر کو کیا ہے نہ کچھ جانے مسلمانی　　ہمیں دیر و حرم یکساں عبث سب کو ہو حیرانی

کشورِ عشق میں شاہی کا میرے ڈنکا ہے　　نوبتِ وصل کے بجوانے میں کچھ دھوم سی ہے

قصائد کا نمونہ :-

جب کہیں آتا نظر وہ چہرۂ گلنار ہے　　سلسلہ ہوتا ہے برپا ایک آتش بار سے
دیکھنے میں ہے مزہ یا کچھ دکھانا لطف ہے　　جی میں آتا ہے کہ پوچھو ساقیٔ سرشار سے
ڈرتے ڈرتے کہہ دیا کہہ کر کہا دیجو جواب　　کچھ تو فرماؤ کہ تا معلوم ہو اظہار سے
سنتے ہی رو رو کہا سن لے اے غافل مزاج　　مجکو آتی ہے ہنسی اس تیرے استفسار سے

مرثیہ گو

اب ہم اس دَور کی مرثیہ گوئی کو پیش کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ہنوز لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تھا اور نہ اس کا رواج۔ البتہ دکھنی مرثیے دہلی تک پہنچ چکے تھے اور وہاں کی مجالس عزا کو اشک بار کرتے تھے۔ یوں تو دکن کے شعراء نے دوسرے اصنافِ سخن کے ساتھ مرثیے بھی کہے ہیں۔ مگر بعض شعراء نے صرف مرثیہ گوئی اپنا میدان قرار دے لیا تھا۔ اس لیے ایسے شعراء کا کلام علیٰحدہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔

اس دَور کے مرثیہ گو شعراء کی فہرست بھی طویل ہے۔ مگر ہم صرف چند مرثیہ گو شعراء کو پیش کرتے ہیں تاکہ اس زمانہ کے مرثیوں کا اندازہ معلوم ہو سکے۔

(۱) رضیؔ حافظ رضی الدین اس دَور کا زبردست مرثیہ گو شاعر ہے۔ مصنّف "گلشنِ گفتار" (خواجہ خان حمید) نے اس کو ولیؔ اورنگ آبادی کا شاگرد بتایا ہے۔ شاید یہ صحیح نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ دکن کے دوسرے تذکروں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ رضیؔ کے مرثیوں کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ البتہ اڈنبرہ یونیورسٹی کے کتب خانہ کی بیاض میں اس کے نو مرثیے شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رضیؔ کے مرثیے عام طور پر دکن میں مشہور تھے۔ اس کے مرثیوں پر تضمین لکھی جاتی تھی اس کے مرثیوں میں ادبیت نہیں پائی جاتی، ان کا اصلی جوہر سوز و گداز اور مرثیہ پن ہے۔

غم سوں ہے بے قرار میرا دل — دُکھ سوں ہے زار زار میرا دل
گلشنِ غم میں ہے شہیداں کے — لالۂ داغدار میرا دل
نت شہیداں کے زخمِ غم سیں — شق ہے جوں ذوالفقار میرا دل
غم کی بجلی پڑی ہے جب ستے — تب سوں ہے شعلہ زار میرا دل
نیم بسمل نمن تڑپتا ہے — ہو کے غم کا شکار میرا دل
گردِ غم سوں امام کے اے رضیؔ — کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

نہیں رہتی معلوم رازِ حق تعالےٰ کا سبب
نورِ چشم ساقیِ کوثر بہت ہے مضطرب
چشم ترے فرات اوپر کھڑے جب تشنہ لب
نوح کا طوفاں مگر اس وقت ہوتا آشکار[1]

---

(۲) قادر قادر تخلص کے شعراء حیدر آباد اور بیجا پور دونوں جگہ ہوئے ہیں۔ بیجا پور کے قادر کا زمانہ علی عادل شاہ ثانی کا عہد ہے۔ حیدر آباد کے اس قادر کا زمانہ اس کے مابعد کا ہے۔ ۱۱۴۹ھ میں تو یہ بقید حیات تھا، مگر ۱۱۶۹ء کے قبل فوت ہو چکا تھا۔ اس کے ثبوت میں قادر کا یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

سنہ اگیارہ سو اوپر انچاس سال سبز بانا قادر کا لہو میں لال[2]

برہان پور کا مرثیہ گو ہاشم علی اپنے مرثیہ میں کہتا ہے ؎

ہزار حیف نیں شاعرانِ دکھن سو روحی و مرزا و قادر نہیں

ہاشم علی ۱۱۶۹ھ میں زندہ تھا۔ اس لیے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قادر اس کے قبل انتقال کر چکا تھا[3]۔ جہاں تک معلومات ہوئے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ قادر صرف مرثیہ گوئی کرتا تھا۔ اس کے نام کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ بعض اس کو غلام قادر سے موسوم کرتے ہیں اور بعض میر عبد القادر سے، یہ آخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے۔ قائم نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ میر عبد القادر قادر تخلص حیدر آباد کے باشندے تھے۔ اکثر مرثیے مشہور ہیں۔ صاحبِ دل تھے۔ صغیر سنی سے فقیرانہ انداز تھا۔ جب پچاس سال کے ہوئے تو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان کے مرثیوں سے ان کی علمی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ علمِ نجوم اور علمِ ہندسہ میں بھی ان کو خاص مہارت تھی۔ ان کے مرثیے تسلسل مضامین، سادگی اور انسانی جذبات کی ترجمانی کے لحاظ سے

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] " " " صفحہ ۲۳۶۔

[3] " " " " ۱۳۸۔

قابلِ تعریف ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کے مجموعوں کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہوا ہے۔ اڈنبرا وغیرہ کی بیاض میں ان کے متعدد مرثیے موجود ہیں۔[1]

ہوا شہرت محرم میں یو غم ہے شاہ عالی کا
کہ ہے فرزند پیارا وہ دونو عالم کے والی کا

چھپایا ہے دیں کا چندر کہ جس کے سوگ سوں جگ پر
فلک ہر ملک میں تانے شمیانا رات کالی کا

ستارے سب یہ قدسیاں نے ملا کر سب گگن اوپر
حسیں کے عرش کوں بھانڈ ہے منڈف موتیاں کی جالی کا

نہیں یو اشک شبنم سوں کھولے ہیں آہ کے گل ہو
دیکھو غم کے چمن میا نے لطافت غم کے مالی کا

قیامت کا نپنا قادر تزلزل جب کرے ظاہر
مجھے تقوی تب آخر ہے حسینا سرورِ عالی کا

محرم یو غم ہے لہل ہائے ہائے
ہوا شور ماتم سگل ہائے ہائے

شفق میں رنگیا سور کا پیرہن
بہکا کر گگن میں انچل ہائے ہائے

حسینا کوں کہاندے پو سلائے نبی
کریں پیار سب تے اوّل ہائے ہائے

حسینا کی خدمت کوں سورج خواص
کرن کا کرے مور چل ہائے ہائے

ان پر ظلم کے ستارے گرے
کہ مریخ، زہرہ، زحل ہائے ہائے

روویں فاطمہؓ ہور خدیجہؓ، نبی
یو تقدیراں کی آئے جل ہائے ہائے

نبیؐ کے گھراں کا دیا گل ہو گیا
خدایا توں کر یو عدل ہائے ہائے

کیا شہ اوپر ظلم نا حق بے گناہ
تو محشر کے صف میں خجل ہائے ہائے

سدا غم میں روتا کھڑا قادرا
دنیا خواب چھوتا سہل ہائے ہائے

---

[1] بیاض مملوکہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم۔

(۳) امامی[۱]

لعامی برہان پوری کا مُہرکنی کا پیشہ تھا، مگر مرثیہ کہنے میں بڑا نام پیدا کیا اس کا اسلوبِ بیان بہت دلچسپ اور دلکش ہے۔ وہ اکثر گفتگو کے طور پر لکھتا ہے اور اپنے مرثیوں میں ڈرامائی اثر پیدا کرتا ہے۔ اس کے مرثیے اڈنبرہ کی بیاض میں موجود ہیں۔ کوئی اور مجموعہ دستیاب نہیں۔

محشر میں جب محمدؐ شاہِ زمن اوٹھیں گے
سب انبیائے مرسل پرغم حزن اوٹھیں گے
حیدر علی لوہوسوں آلودہ تن اوٹھیں گے
لیتے لوہو کے ہلکاں ہے ہے حسن اوٹھیں گے
آلودہ خاک وخوں میں دندان مصطفےٰ لے
لوہوسوں تر بتر سب دستار مرتضےٰ سے
ٹکڑے حسن کے دل کے جاما حسین کا لے
تربت سے فاطمہؓ جب لے یو برن اوٹھیں گے

... ...

دریائے غم میں ہرگز کرنا نہیں غواصی
ہرچند تو امامی عالم منی ہے عاصی
اُمید تو قوی ہے، پائے گا تو خلاصی
کرنے کیتیں شفاعت جب پنجتن اوٹھیں گے

کیا ظالماں نے ظلم بے حساب آج
مظلوم کربلا ہیں عالی جناب آج
اس غم سو مومناں کو ہوا پیچ و تاب آج
گویا علی کے گھر کا کھولا غم کا باب آج
تھا آئینہ رسولؐ کو درشن حسین کا
ہے وہ جفا کی گرد میں درپن حسین کا
زخماں کے جواہراں دسے تن حسین کا
دستا ہے جوں شفق میں ظلِ آفتاب آج
کیوں عرش فرش پر نہ گرے بے قرار ہو
کیوں تاب لا سکے نہ فلک دیکھ ظلم پر
مینا سے قد کوں شہ کے شکستہ کیا دیکھو
سنگین دلاں نے ظلم کی پی کر شراب آج[۲]

---

(۴) ہاشم علی[۳]

ہاشم علی برہان پوری بھی اس دَور میں بلند پایہ مرثیہ گو شاعر ہو گزرے ہیں۔ ۱۱۶۹ھ تک ان کے بقیدِ حیات رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۱۴۳ھ میں وہ خاصا مرثیہ گو مشہور تھا۔ اور اس کے اعتقاد کے مطابق اس کے مرثیے

---

[۱] تذکرہ فتوحات
[۲] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔
[۳] " " "

سننے کے لیے آنحضرت صلعم خواب میں تشریف لایا کرتے۔اڈبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اس کے مرثیوں کا ایک مجموعہ بصورتِ بیاض موجود ہے جس کو اس نے دیوانِ حسینی سے موسوم کیا ہے۔اس میں ردیف وار مرثیے ہیں۔یہ مرثیے مربع، مخمس، غزل نما سب کچھ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ ہاشم علی ایک باکمال مرثیہ گو تھا۔اس کے بعض مرثیے مکالمہ کی طرز کے ہیں جن کے باعث ان مرثیوں میں جان پیدا ہوگئی ہے۔

آج پُر خوں کفن ترا اصغر ‏ آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گلبدن ترا اصغر ‏ حیف یو بالپن ترا اصغر

کیوں ہیں زلفاں کے بال تاروں تار
کیوں گلے سیں لوہو کے جاری ہار
تجہ کوں سوتے کبھی نہ لگتی بار
حیف یو بالپن ترا اصغر

اوٹھ گلے کا لوہو دھولاؤں میں ‏ نیند آتی تجے سولاؤں میں
چل ترا پالنا جھولاؤں میں ‏ حیف یو بالپن ترا اصغر

جلوہ سیں اٹھ کے رن کو چلا تب کہی دولہن ‏ دامن پکڑ کے لاج سوں انجھراں بھرے نین
مت چھوڑ کر سدہارو تم اس حال میں ہمن ‏ تم بِن رہے گا ہائے یہ سونا بھون مرا
کیسی یو کدخدائی و کیسی ہے یو برات ‏ آتا فراق تم سوں یہ جلوہ کی آج رات
گھر کوں لے گئے ہو نہ بولے ہو ہم سوں بات ‏ دیکھا نہیں جمال کوں بھر کے نین مرا
اس کربلا کے بن میں اکیلی میں کہوں رہوں ‏ تجہ باج میں جہاں میں پھر امید کیا دھروں
جد کے مدینے کیونکر میں اس ٹھار سے پھروں ‏ تم اپنے ساتھ لے کے دکھاؤ وطن مرا
جاتے ہو چھوڑ رن کی طرف مجہ کوں تم رولا ‏ نہیں شرم کا ہنوز یہ سرسوں گھونٹ کھلا
کرتے نہیں محبت و جاتے میاں بھولا ‏ اس زندگی سوں آج بھلا ہے مرن مرا

. . . .

مجہ کوں نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار ‏ تیرے فراق سات میں جاتا ہوں اشکبار
میں کیا کروں صلاح نہیں حکم کردگار ‏ حق نے کیا ہے رن میں مقرر رہن مرا

ہے داغ دل میں تیری جدائی کا کیا کروں　　نہیں ہے امید رن سے پھر آ کر تجے ملوں
جو کچھ ہوا ہے مقدروں میں راستی کہوں　　وعدہ ہوا ہے حشر میں تم سوں ملن مرا

وہ دو صغیر موت آپس کی دیکھے عیاں　　کہتے تھے بیکسی سوں کہ اے حارث الاماں
زلفاں کوں کاٹ نیچ ہمن کوں جو بندیاں　　منظور ہے اگر تجے سیم و طلا کتیں
مُسلم ہوا شہید ہمارا سو تھا پدر
ہے ماں ہماری آج مدینہ میں منتظر
توں کر رحم سوں ہماری یتیمی پہ کر نظر
اُمید رکھ شفاعتِ روز جزا کیتئیں
ہر چند کرتے عجز وہ طفلان خورد سال　　اوں کوں کہا لعین بد افعال بدخصال
ہے گی نجات تم کوں میرے ہاتھ سوں محال　　بھیجوں گا آج تم کو میں دار البقا کتیئں
دھوئے ہیں ہاتھ تب وہ اسیران جان سیں
قطع امید کر کے وہ سب خان مان سیں
روتے گئے وہ رانده ہر دو جہان سیں
مہلت دے ہم کوں سجدہ کریں تا خدا کیتئیں
فرصت نماز کی وہ شقی نے نہیں دیا　　شمشیر از نیام نکالا وہ بے حیا
ہر ایک کہیں کہ سر میں توں اول میری لگا　　نہیں تاب دیکھنے کا مجھے مر جدا کیتئیں[1]

---

(۵) **قائم**　میر محمد قائم نام اور قائم تخلّص، برہان پور کا باشندہ تھا۔ حمید اور شفیق نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک مثنوی بھی ان کی یادگار ہے۔ ان کے کئی ایک مرثیے اڈنبرہ کی بیاض میں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے ان کے کلام میں ادبیت کے ساتھ سوز و گداز بھی تھا۔

تجھے فاطمہ آ بولا دیں حسین　　ترے بن کیتا تلملا دیں حسین

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

ڈھونڈیں بے خودی سوں نپاویں حسین   رودیں ہاتھ مل حیف کھاویں حسین

کہیں مرے جیو کے پیارے کہاں   مجھے چھوڑ اکیلا سدھارے کہاں
دیکھو مجہ دکھی کے دو کھیارے کہاں   سبب کیا نہیں آج آویں حسین

پل سہتا مرے گود میں وہ سدا   ہوا نیں کبھو مجھ سوں یک تل جدا
ہوا کس بلا میں وہ جا کر ملا   کہ نہیں آ مجھے مکھ دکھاویں حسین

دریغا مجھے چھوڑ بیچارا ہوا   اکیلا کہاں جا بچارا ہوا
یو غم اس کے جیو میں انگارا ہوا   لگے دل و سینے آ بجھادیں حسین

ہے قائم غلامی میں امّید وار   گناہاں میں غرق گرچہ ہے بے شمار
ہے محشر کوں حامی مرا برقرار   شفاعت جو کر کر چھوڑاویں حسین[1]

---

(۶) **نظر** نظر کا ذکر کسی دکھنی تذکرہ میں نہیں ہے۔ مگر منشی کریم الدین[2] نے ذکر کیا ہے کہ سیّد محمد علی نام اور نظر تخلص اورنگ آباد کے مشہور شاعر تھے۔ ہر آٹھویں روز مشاعرہ کیا کرتے۔ درویش منش آدمی تھے۔ دو پہر تک طالب علموں کو درس دیا کرتے اس کے بعد شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اڈنبرہ میں ان کے بعض مرثیے ہیں۔

یاراں ہزار حیف رسولِ خدا نہیں
اور فاطمہ علی و حسن مجتبا نہیں
تنہا حسین رن میں کوئی آشنا نہیں
بازو نہیں، رفیق نہیں، دلربا نہیں

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] طبقات الشعراء

اصغرکوں شہ نے گود میں لے کر منگے جو نیر
ملعون نے جواب میں مارا ستم کا تیر
بے داد کیا کیا تری تقصیر یو صغیر
سیانا نہیں، زبان نہیں، دست و پا نہیں

کہنے لگا ہے جب سوں الم کے نظم میں بیت
دنیا کوں دل سوں سہٹ کے توں بول اس الم میں بیت
دو جگ میں نیں نظر کوں بجز حب اہل بیت
مقصد نہیں، مراد نہیں، مدعا نہیں[1]

---

(۷) سیدن سیدن کے متعلق ہمیں کچھ معلومات نہیں ہیں۔ اڈنبرہ میں اس کے مرثیے ہیں۔ اپنے ایک مرثیہ میں موت کو شادی کی صورت میں پیش کیا ہے:۔

ماہ محرم میں دیکھو چندا ہو مالی آئیا
تارے گگن کے گوندکر سہرا جو شہ کوں لائیا
کنگنا ستم کا باندکر روکہ او بٹنا کوں لگا
حیرت کی چوکی کے اوپر انجھواں سے تن نہلائیا
وولا حسینا چھتر تنگ سر ڈال مکھنا نور کا
سارے براتی سات لے دولہن کوں بہیانے ڈھائیے
باجے بجنتر دیں کے غم کے نفیریاں کا ہے غل
ملعون لشکر مل سی منڈف تیروں کا چھائیا
اپنے یو جیو کوں وار کر دیوے دھنگا نا سیس کا
ہر یک نے شہ کے سنگ سوں خلعت سہانی پائیا
قاضی قضا کا عقد بن کر ختم شرطاں شرعیاں
ڈھال کے خواناں کرانگیں شمشیر چو بہا کھائیا

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

تھا برداشت کربلا ظلمات بحر خون کا
ہیں پیاس میں طفلاں سکل پانی ستیں ترسائیا[1]

---

(۸) شرف

شرف کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ہے۔ اڈنبرہ کی بیاض میں اس کے مرثیے موجود ہیں۔ نمونہ پیش ہے:۔

سیج جھولے کی میں نہاتی تھی — آج بالک مرا نہیں دستا
بالے اصغر کوں تب جھولاتی تھی — باس اس کی مجھے بھی آتی تھی
جب دولارا وہ نیند بھر سوتا — ظالماں سنگدلوں نے مارا تیر
دودھ پینے کو میں جگاتی تھی — سخت فولاد اون کی چھاتی تھی
پھوپیاں سب صدقے اس کے جاتیاں تھیاں — تیر گزرا گلے سوں اصغر کے
چاؤ سوں جب اسے اوچاتی تھی — ہائے کس دکھ سوں جان جاتی تھی
میں جب اصغر کوں گود میں لیتی — شاہ بھر کرلے آئے اصغر کوں
پھولے میں آنگ میں سماتی تھی — بولے رو کر اتنی حیاتی تھی
پانی بن خشک ہو گیا ہے شیر — آج جنگل میں توں اکیلا ہے
دیکھ اصغر کوں تلملاتی تھی — رات دن میں تری سنگاتی تھی
آج کہہ کیا پوکاروں کہہ مجھ کوں — تب میں اصغر کی ماں کہلاتی تھی
شہر بانو کے شور کی آواز — اے شرف لامکاں کو جاتی تھی[2]

---

(۹) برہان

اس دور کا ایک اور مرثیہ گو۔ برہان ہے۔ سیدی برہان ان کا نام تھا۔ ان کے کلام میں حبِ اہلِ بیت کی نظمیں ہیں۔ اپنی نظموں میں خود ستائی بھی بہت کرتا ہے۔ ادارہ ادبیات اردو میں ان کا کلام موجود ہے[3]

---

۱ اردو شہ پارے۔

۲ اردو شہ پارے۔

۳ تذکرہ مخطوطات۔ صفحہ ۲۹۳

جس وقت علمدار نے چمکا کے پھریرا — میدان میں آیا
نقارہ کیا فوج میں تب اور دو مارا — واں تیغ بجایا

فارغ ہوا جو حضرت اکبرؑ نماز سے — در دشت کربلا
کوئی کہے او سٹھے ہیں پیغمبرؐ نماز سے — در دشت کربلا

چوتھے دَور کی نثر

اب اس دَور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں تصوّف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ شعرائے باکمال کا کلام تمام تر تصوّف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے حضرات مشائخین نظام نے نثر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار مناسب خیال فرمایا جس کے باعث تصوّف میں کئی ایک کتابیں لکھی گئیں۔ ذیل میں ایک کتاب سے اس کی عبارت بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہے جس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ نثر کی ترقی کس رفتار پر تھی۔

شاہ ولی اللہؒ معرفت السلوک۔ شاہ ولی اللہ قادری خلف اکبر شاہ حبیب اللہ قادری نے معرفت السلوک لکھی ہے۔ افسوس ہے کہ سنہ تالیف معلوم نہ ہوسکا۔ مگر اسی دَور کی کتاب ہے۔ کیونکہ شاہ صاحب کا انتقال محرّم ۱۱۵۷ھ میں ہوا ہے۔ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کے ارشاد سے اس کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ قادری اپنے والد کے بعد ان کے جانشین ہوئے تھے۔ شاہ حبیب اللہ قادری صاحب کا سنہ انتقال مصنّف "مشکوٰۃ النبوۃ" کو بھی معلوم نہیں ہے۔ بہر حال سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نہایت مقبول تھی و ہر کثرت سے لکھی جاتی تھی۔ میری[3] نظر سے دو نسخے گذرے ہیں۔ ایک ۹ جمادی الاول ۱۱۹۵ھ

---

[1] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی مصنّف علی الموسوی قادری۔

[2] فارسی کتاب کا نام بھی معرفۃ السلوک ہے جو شیخ محمود قدس سرہٗ کی تالیف ہے۔

[3] کتب خانہ آصفیہ میں دونوں نسخے موجود ہیں۔

کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرا اس سے قدیم ہے جس کا سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا۔

یہ کتاب تصوّف میں لکھی گئی ہے۔ واجب الوجود نفس امارہ، نفس لوامہ، توحید افعالی توحید وجودی وغیرہ عنوانات کے تحت اپنی کتاب کو ترتیب دی ہے۔ قرآن شریف، حدیث اور قصّوں سے اپنے دعویٰ کو ثابت کیا ہے۔ نمونہ درج کیا جاتا ہے:۔

"صفت ہور سرانا بی غائت ہور شکر کرنا بی نہایت ثابت ہے، اس واجب الوجود کوں جو ممکن الوجود کوں ممتنع الوجود کی دائرہ میں پیدا کیا ہور اپنی واجب الوجود کو اس دونوں وجود سوں موجود ہور ظاہر کیا۔ بزرگ ہے بزرگی اس کی ہور عام ہی نعمت اس کی۔"

من عرف نفسہ فقد عرف ربہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

"من عرف نفس فقد عرف ربہ، کے بیان میں بیان کروں ہور اس کی شرطاں کی شرح کوں عیاں کروں، کیا واسطہ کہ شرمن عرف نفسہ، فقد عرف ربہ کے نکتین کے تحقیق کرنا بہوت مشکل ہے کیا واسطہ کہ یو کام صاحبِ دل کا ہے، نہ ہر ایک بے دل کا ہے ہور عارفاں نے اس بات میں بہوت کتاباں لکھی ہیں نفس لوامہ یعنی نفس ملامت کرتھارا۔ بری فعلان پر نفس لوامہ قلب سبب کے تعلق ہے یعنی سالک نے جس وقت سب باطن کے ہیں ہلن جلن کوں قلب پنیب میں کھینچا جو دو نفس امارہ کی ہلن جلن تھی اگرچہ نفس امارہ کیا تھا اما باس اس کی باقی رہی تو نور بچتا ہی جو اس کوں نفس لوامہ دُور کرے۔ نفس لوامہ نفسِ امارہ کی برعکس ہے۔ دو حکم کرتھارا بڑی صفتاں پر ہی جیونکہ کبر، کینہ، حرص، حسد، غصّہ، عداوت ہور حکم کر نھارا خوب صفتاں پر ہی جیونکہ تواضع ہور علم رضا ہور صبوری اخلاص ہور محبّت۔

بولتا ہے کمترین مرید ہور والپس ترین شاگرد جاروبکش درگاہ عالی بارگاہ ابالی عاجز فقیر الحقیر محمّد ولی اللہ حکم کیے منجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیاء کے بری اتقیا کے ہور صدر نشین محمّد مصطفےٰ کے صاحبِ شریعت ہور طریقت کے دربار حقیقت

ہور معرفت کے وارث محمد رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری باقی رکھی اللہ العالی انوکوں۔"

نمونہ نثر شاہ میر شاعری کے سلسلہ میں شاہ میر کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ موصوف نے تصوف میں کئی کتابیں نثر میں لکھی ہیں، ان میں سے ایک کتاب "اسرار التوحید" ہے اس کتاب میں فلسفہ اور نفسیات پر بحث کی گئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"اے عزیز وجود دو وضع کا ہے، ایک واجب الوجود، دوسرا ممکن الوجود، واجب الوجود اسے بولتے ہیں جو وہ خود بخود آپ سے آپ قائم ہے، ہمیشہ تھا، ہور ہمیشہ رہے گا، ہور وجود حق تعالیٰ کا ہے۔ یعنی خدا کی ذات ہور صفات کو واجب الوجود کہتے ہیں، ہور وہ قدیم ہے، ہور غیر مخلوق ہور باقی ہے، ہور دائم ہے، ممکن الوجود دو بھانت ہے، ایک جوہر دوسرا عرض جوہر قایم بنفسِ خود کو کہتے ہیں اور عرض قائم بالغیر کوں کہتے ہیں، ہور جوہر پانچ وضع کا ہے۔ اوّل عقل، دوسرا نفس، تیسرا جسم، چوتھا ہیولا، پانچواں صورت عقل .... مجرّد اور تنہا مادے سے اپنی ذات میں اور فعل میں نہیں، کس واسطے کہ محتاج ہے۔"[1]

آپ کی دوسری کتاب رسالہ حقایق ہے۔ یہ ایک مختصر رسالہ علمِ تصوف میں ہے جس کے مُصنّف حضرت شاہ میر ہیں۔ ۱۱۹۷ھ کا نسخہ میری نظر سے گذرا ہے۔ یہ کتاب فارسی وحدت الوجود کی کتاب سے ترجمہ کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ مختلف مقامات سے درج ذیل ہے:۔

"لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْئٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ یعنی کوئی چیز اس سریکا نہیں ہور اور کسی سریکا نہیں یعنی مخلوقات کی صفاتاں سوں ہور لوازمات سوں پاک ہور منزہ ہور برتر ہی۔ اے عزیز موجود دو صفت کا ہی ایک واجب الوجود، دوسرا ممکن الوجود۔"

"قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ جو خدائے تعالیٰ فرمایا یعنی میں معبود نیں بلکہ تمہاری

---

[1] اسرار التوحید مخطوطہ۔

ساعبد ہوں خدا کی نسبت ہور خدا نیں بلکہ بندہ ہوں۔ خدا کا رسول ہوں ہور تمیں مجد سوں ہی ہور میں خدا سوں ہوں، یعنی تمیں میری نور ہیں ہور میں خدا کا نور ہوں اپس سوں مجکوں جُدا مت جانو ہور مجھی اپس میں دیکھو ہور سمجھو کہ خدائے تعالیٰ منت رکھیا ہی تمنا پر اس بات کا کہ لقد منّ اللہ

"حضرت شاہ حقایق آگاہ. برہان الملّت والدین قدس سرہٗ فرماتی ہیں فرد آدم نور نبی کا پاک۔ تاکہ صورت برقع خاک پس اس نور کوں تن کی تعلّق سوں روح رکھتی ہیں اور لور تن میں آکر روح ہوا بعد از اپنی نورانیت ہور روحانیت کوں بسر کر بشریت کی صفتاں سوں موصوف ہوکر محل خطرات ہور بعد از عالم مثال پیدا کیا۔ مثال کے جسم لطیف کوں بولتی ہیں جیسا کہ خواب میکا تن یعنی تمثل ہور نمائش تمثل کا معنی اپسکوں اپنی منکی میر مکی صورت سوں دیکھنا جیسا جبرئیل علیہ السّلام وحیہ کلبی کی صورت یا مور کی صورت لے کر حضرت کی مجلس میں آتی ہیں۔"

اب ہم ادبی کتابوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں اگرچہ ان کی تصنیف کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہے مگر بعض شہادتوں سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی دَور کی نثر ہے۔

اخلاقِ ہندی[1]

ایک اور نثر کی کتاب "اخلاق ہندی" ہے۔ اس کے بھی مصنّف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"دو عورتاں ایک بچّے کے واسطے لڑتے تھے۔ ہور شاہد دونو نہیں رکھتے تھے۔ اور دونو عورتاں لڑتے ہوئے قاضی کے پاس گئے۔ ہور انصاف چاہی قاضی جلّاد کو حکم دیا۔ اس بچّے کو دو ٹکڑے کر کر اس دونوں عورتوں کو دی۔ ایک عورت یہ بات سُن کر خاموش رہی۔ دوسری عورت گریہ ہور واویلا کر کے پکاری جو واسطے خدا کے بچّے کے دو ٹکڑے مت کر اگر ایسا ہی انصاف ہی بچّے کو میں چہیتے نہیں۔ قاضی تب یقین سمجھا جو ماں بچی کے یہی ہے بچا اس کو دیا ہور دوسری عورت کو کوڑے مار کر چلا دیا۔"

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔ صفحہ ۵۶۵۔

طوطی نامہ اس عہد میں طوطی نامہ کے کئی ترجمے دکھنی زبان میں ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کے مترجمین کے نام معلوم نہیں ہوئے۔ (۱) ابوالفضل کے طوطی نامہ کا ترجمہ :۔

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے۔ عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔

"پچھے سیں تعریف صاحبِ زمانہ کے اور زمیں کے یعنی خدائے کے تعریف کے لبعد ازاد پچھے سیں تعریف صاحبِ جاں اور تن پیدا کرنے ہارے کے .... چلنے ہارے میرے راہ بندگی کو یعنی رکھنے ہارے کو وہ کون ابوالفضل بیٹا شیخ مبارک اوس کے تیں پاکِ حکم بادشاہی جاری ہونے کے پایا۔ یعنی بادشاہ حکم فرمایا۔ یہ کتاب کیتی یعنی طوطی نامہ کو سات عبارت تازی کے ساتھ روشن تھوری عبارت کے نقشِ ترتیب کا دیوے۔"

"بیچ شہر یک کے شہران ہندوستان کے سوداگر نیک تھا۔ اوس کا نام مبارک تھا۔ آرزو فرزند کی نہایت رکھتا تھا۔ یکایک آواز دینے ہارا فضل خدائے عالم کا خوش خبری اس بات کی دیا وہ بات یہ ہے تمہیں خوش خبری دیتے ہیں۔ سات فرزند نیک کے بیچ کان اوس مبارک سوداگر کے .... سوداگر اس مبارک حوصلہ کے تیں یعنی اوس فرزند کو میمون نام رکھا۔ جب خطِ رخسار اوس کے اوگیا یعنی میمون کو خطِ داڑی کا نکلیا اور عمر اس میمون کی اٹھارہ برس کو پونچی۔ بیچہ وقت مبارک کے سات خجستہ نام والی عورت کے شادی کیا۔"

(۲) سیّد محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ کسی غیر معروف شخص نے ۱۱۴۲ھ میں کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ جامعۂ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے[1]۔

عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔

پچھے سیں طرح طرح صفت وثنا پیدا کرنے میں زمین و آسمان کے کیفیت

---

[1] فہرست اُردو مخطوطات سروری، صفحہ ۱۸۱۔

حقیقت یو ہے کہ داستان قصہا و حکایات حضرت بخشی رحمہ اللہ کو بیچہ طوطی نامہ
کے ساتھ عبارت سخت و دقیق کے لکھے۔ اس کیتیں مفصل بیان داز واسطے
معلوم ہونے تمام لوگاں کو محمد قادری نیک کرے اللہ تعالیٰ مرتبہ ان کا

... ...

تمام احوال شارو کا اور عاشق ہونا خجستہ کا اوپر ایک جوان کے اور مرنا شارو
کا دست سوں خجستہ کے اوّل سوں آخر تک میمون سو کہا میمون اسی وقت
خجستہ کیتیں مار ڈالا ہلاک ہوگیا۔"

۳۔ سید محمد قادری کے طوطی نامہ کا دوسرا ترجمہ۔ اس کے مترجم کا نام بھی نہ معلوم ہوسکا اور نہ سنہ ترجمہ کی اطلاع ہے۔ البتہ ۱۲۱۰ھ کی کتابت ہے اس سے واضح ہے کہ اس کا پہلے ترجمہ ہوا ہوگا۔ اس کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود[1] ہے۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"پہلی کہانی یہ کیفیت میمون اور خجستہ کی اور خرید کرتے ہیں۔ میمون ایک
طوطی کے۔ اور ایک تاجر کی طوطی کی کیفیت اور مینا کی حکایت یوں ہے۔
دانایاں اور عقلمند اس طور سے بیان کیے ہیں کہ آگے کے زمانہ میں ہند کے
ایک شہروں میں سے ایک شہر میں کوئی سوداگر تھا۔ صاحب مال اور ہمت
نام اوس کا مبارک تھا۔

... ...

میمون کہا کیا کیفیت ہے تو ہی بول۔ طوطا تمام احوال ہوا سو خجستہ کا کہا
ایک جوان پر اور مارے جانے میں شارک کے اوّل سے آخر تک میمون سے
کہا۔ میمون اوس وقت خسجہ کو نصیحت کیا۔"

نثری داستانیں

اس دور میں کئی نثری داستانیں مرتب ہوئی ہیں چنانچہ جن داستانوں کا پتہ چلا ہے وہ درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) سنگھاسن بتیسی (۲) قصہ معظم شاہی و چہنز ریکھا (۳) قصہ ملکہ زمان و کام کندلہ

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات صفحہ ۳۳۳۔

(۴) قصہ کام روپ،

افسوس ہے ان داستانوں کے متعلق تفصیلی معلومات ان کے مصنف اور سنہ تصنیف وغیرہ کے متعلق ہمدست نہیں ہوئے۔ پھر بھی ہم کو، جو معلومات ہوئے ہیں ان کی صراحت کے ساتھ نمونہ عبارت پیش کردی جاتی ہے۔

(۱) سنگھاسن بتیسی، اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں لالہ للولال نے اس کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا، مگر دکن میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ دکھنی مترجم کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ اس داستان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ نمونۂ عبارت یہ ہے:۔

"یوں نقل کرتے ہیں کہ ایک شہر عظیم الشان اور آبادان نام اس شہر کا دہارانگر مشہور تھا اور قلعے اوس کے نہایت خوبصورت اور دروازے بہت مضبوط تھے۔ آدمی ہر قوم کے اس شہر میں زیادہ تھے۔ جمعیت اور دولت سے محفوظ رہتے تھے، سونا، روپا، جواہر اور لال موتی، الماس، گھوڑے اور ہاتھیوں کا شمار نہ تھا۔ بہوت خوبی اور زینت سے زندانی کرتے تھے۔ ہر ایک محلّے اور راستوں میں محل اور حویلیاں نقاشی فرما کر رنگین اور آراستہ کیے تھے، تمام عالم زمانے کے حادثے اور آفتوں سے امینت پا کے عیش و عشرت سے رہتے تھے، اوس شہر میں راجہ بھوج نام ایک راجہ تھا۔"

اسی داستان کا ایک اور نمونہ:۔

"پوتلی اوّل کی جب راجہ بھوج تخت کیتیں طرف داہارانگر کے لے گیا۔ یک باندی خبردار کو بلاکر ساعت حاصل کیا کہ اوس تخت پر بیٹھے۔ یک پُتلی نام اوس کا چنپا تھا، یک مرتبہ کہی کے اے راجہ بھوج، یہ تخت راجہ بکرماجیت کا ہے جو کوئی اس مانند راجہ کے سخاوت کرے وہ لائق ہے کہ اس تخت پر بیٹھے، راجہ پوچھا وہ حقیقت سخاوت کی کس طرح ہے تب پتلی کہی کہ روچلپن نام شہر کا ہے نہایت آباد اور خوش آب و ہوا رکھتا ہے۔

(۳) قصّہ معظم شاہ و چیتر ریکھا۔

افسوس ہے کہ اس داستان کے مصنّف کا نام معلوم نہیں ہوا اور نہ صحیح تصنیف کا پتہ چلا۔ صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ اسی دُور کی داستان ہے اور دکن میں مرتب ہوئی ہے۔

عبارت کا نمونہ پیش ہے :-

"آغاز داستان معظم شاہی بادشاہ کہتے ہیں کہ چین کے ملک میں ایک بادشاہ تھا کہ نوشیرواں کے سے عدالت اور حاتم کے سے سخاوت اوس کی ذات میں تھی اور اوس کے وقت میں رعیت آباد اور خزانہ معمور، لشکر مرفع الحال اور غریب غربا ایسے چین سے گذراں کرتے اور خوش رہتے تھے۔ ہر ایک گھر میں دن عید اور رات شب برات تھی۔ اس بادشاہ کو ایک بیٹا تھا نام اس کا معظم شاہ تھا۔"

(۴) قصہ ملکہ زماں و کام کندلہ :-

یہ داستان بھی اسی دور میں مرتب ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بھی مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ البتہ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب انگریزوں کو تعلیم دینے کے لیے دکن میں مرتب ہوئی ہے اور اس کے مترجم نے واضح کیا ہے کہ اس داستان کو ایک فارسی مثنوی جواہر سخن سے کرناٹکی زبان (دکھنی) میں منتقل کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

"کہتے ہیں کسی ملک میں ایک شہر آباد ہے، وہاں کے بادشاہ کا نام کام بخش۔ او بادشاہ بڑا عادل اور شجاعت و سخاوت میں بے نظیر۔ اس عصر کے بادشاہان اور سلاطین پر جمیع امور میں بزرگی رکھتا تھا، ملک میں خزانہ اور لشکر بہت تھا مگر کوئی اولاد اس کو نہ تھی، اس کو ایک وزیر تھا، وہ بھی لاولد تھا۔ بادشاہ اور وزیر رات دن درگاہِ الٰہی میں اپنے کو فرزند ہونے کی خاطر دعا مانگتے اور فقراں سے اعانت چاہتے۔ مدام درویشاں اور مساکین کی خدمت گذاری کرتے۔ کیتک روز کے بعد خدا کا فضل وزیر اور بادشاہ پر ہوا۔ ہر دو کی عورتاں کیتی حمل اور دونوں کو فرزنداں تولد ہوئے، بادشاہ اپنے نورِ چشم کا نام کامراں اور وزیر اپنے فرزند کا نام کام سنج رکھا اور دونوں ایک جگہ پرورش ہونے لگے۔

(۵) قصہ کام روپ۔

اس نام کی ایک کتاب فورٹ ولیم کالج میں کندن لال نے ۱۸۴۹ء میں ترجمہ کیا ہے۔ مگر زیرِ بحث داستان دکن میں مرتب ہوئی ہے اور ہمارے پیشِ نظر مخطوطہ ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء کا لکھا ہوا ہے، ظاہر ہے اصل داستان اس کے پہلے مرتب ہوئی ہوگی۔ بہر حال اسی دور کی یہ داستان ہے۔ افسوس ہے اس کے مصنف کا بھی پتہ نہیں چلا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے :-

"سراندیپ کا ایک راجہ تھا، اس کو مال و دولت حاصل تھا، مگر اولاد نہیں تھی ایک فقیر کی دعا سے اس کو لڑکا تولد ہوا۔ اس کا نام کنور کام روپ رکھا گیا، جب وہ چودہ سال کا ہوا اس کے لیے ایک باغ تیار کیا گیا، کام روپ کو شکار کا شوق تھا۔ اس لیے تمام قسم کے جانور اس محل میں فراہم کیے گئے تھے۔ تاکہ صبح کو شکار کرے اور شام میں محفلِ نشاط گرم رہے۔ شہزادے کے ساتھ اس کے چھ رفیق تھے، ان میں ایک وزیر کا لڑکا، دوسرا پنڈت کا لڑکا، تیسرا حکیم کا لڑکا، چوتھا مصوّر کا لڑکا، پانچواں جوہری کا لڑکا، چھٹا موسیقی داں کا لڑکا تھا۔ ایک رات کام روپ خواب میں ایک حسینہ کو دیکھ کر عاشق ہوگیا۔ معشوق کی تلاش میں شہزادہ اور اس کے تمام رفقا روانہ ہوئے۔

ان تمام داستان کے قلمی نسخے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہیں، کوئی داستان اب تک طبع ہو کر شائع نہیں ہوئی ہے۔

تبصرہ صفحات ماقبل میں اس دَور کا کلام پیش ہوچکا ہے۔ ہر صنف سخن، مثنوی قصیدہ، غزل، رُباعی اور مرثیہ وغیرہ کا انداز معلوم ہوچکا ہے۔ اسی طرح نثر نگاری کا اسلوب بھی پیش ہوچکا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وَلی کی پیروی میں غزل کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور کمالِ شاعری کا اظہار غزلوں میں ہونے لگا۔ اس کے ساتھ قصیدہ گوئی کا رواج بھی زیادہ ہوگیا اور بے شمار قصیدے لکھے گئے۔

غزل گوئی وَلی کی پیروی میں شروع ہوئی تھی۔ وَلی کا کلام تصوّف پر مشتمل تھا۔ اس لیے اس عہد کے اکثر شعرار کا کلام زیادہ تر تصوّف ہی میں رنگا ہوا ہے۔ قصیدے کے جو لوازم ہیں ان کا اظہار ان کے قصیدوں سے بخوبی ہوتا ہے۔ اس دور میں مرثیہ کو بھی خاصی ترقی ہوئی اور مرثیوں میں تاثر پیدا کرنے کی قوت بڑھانے کے لیے ہندوستانی معاشرت کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا اور عربی کے بجائے ہندوستانی رنگ میں واقعات کربلا پیش کیے گئے۔ حضرت علی اصغر اور حضرت قاسم کے متعلق ان مرثیہ گویوں نے زیادہ توجہ کی ہے اور مختلف پیرایوں میں ان بزرگوں کے حالات و واقعات دہرائے ہیں۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ کا کلام صاف اور تشبیہہ و استعارہ کی بے جا بہتات سے پاک ہے اور اگر تشبیہیں دی گئی ہیں یا استعار

کو کام میں لایا گیا ہے تو عام فہم۔ ان لوگوں کے کلام میں اکثر تکلّف نہیں ہوتا۔ معمولی باتیں سیدھے سادہ طریقہ پر عام فہم تشبیہات کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔

پُرانے الفاظ جو اب بالکل متروک ہیں ان کے کلام میں بہت نظر آئیں گے مثلاً نت، کبھو، جاگہ، جانو، غمناک، برہ نا ہووے گا، اپس، کسو وغیرہم لیکن جو لفظ استعمال کیے گئے ہیں وہ نہایت صفائی اور کمال سے جڑے ہوئے معلوم ہوں گے۔ کلام میں فارسی اور عربی الفاظ مناسبت سے شامل کر دیتے ہیں جس سے ان کے کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے اور معمولی شعر کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ مثلاً :۔

اے ضیاؔ۔ انہی تمناؤں سے دل بالکل اُٹھ گیا
عشق کی راہ میں تسلیم و رضا لازم ہے

جامِ مئے الست سے بیخود ہوں اے سراؔج — دورِ شراب شیشہ پرل سے کیا غرض

امامِ جنّ و بشر تاجدار ملک و ملک — لکھا ہے لحمک لحمی، جسے شہِ سرورؐ

گریباں چاک مطعونِ جہاں، بدنامِ عالم ہوں
پڑے خاک اس طرح کی ہائے رسوائی کے جینے میں

ادھر تو تم بھوؤں کو تان کر تیوری چڑھاتے ہو
ادھر میں دل میں بسم اللہ بسم اللہ کہتا ہوں

پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر — سنگ آباد لیک سخت آیا فرہاد

زر پاشی تیری دیکھ کے ہر صبح آفتاب — رکھتا ہے اپنے چہرہ پہ ہو شرمسار دست

ان کے کلام میں فارسی کے ایسے محاورے نظر آئیں گے جو کسی تبدیل و تحریف کے بغیر اُردو میں آ گئے تھے مثلاً سر کرنا، سر کردن سے۔ خوش لگنا خوش آمدن سے۔

عشق کو خوش لگی ہے رسوائی　　نہ چھپا آخر آشکار ہوا

بحالتِ جمع مونث فعل لاتے تھے مثلاً "لائیاں آئیاں" وغیرہ۔

رشکِ گلگوں آنکھیں بھر بھر لائیاں　　آہ تجھ بن یہ بہاریں آئیاں

رکھتا ہے آج قتل کا دل میں خیال توں　　غصّے کی تیری ہم نے یہ نظریں پچھانیاں

دکن میں جو الفاظ روزمرہ بول چال میں کام آتے ہیں ان میں سے اکثر شمالی ہند کے اصحاب کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر یہ الفاظ یہاں قدیم سے مستعمل ہیں۔ مثلاً "کرکے" "بعداز" وغیرہ یہ الفاظ اکثر اس وقت شمالی ہند کے اساتذہ نے بھی استعمال کیے ہیں۔ مثلاً "بعداز"

سوز کہتا ہے ؎

ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا　　رہے گا مرگ کے بعداز مزار میں رونا

"میں کہا" قائم کہتا ہے۔

میں کہا، عہد کیا کیا تھا رات　　ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

ان کے علاوہ بول چال کے اکثر الفاظ جو جنوبی ہند میں مستعمل تھے ان کو شمالی ہند کے شعراء نے بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً ٹک۔ بن۔ کھڑی۔ سجن۔ کن نے۔ کرے ہے۔ نپٹ۔ آئیاں۔ مچائیاں۔ کبھو وغیرہم۔

(میر)

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

(انجام)

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

(سوز)

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ اے مست خواب　　دہر نے کن کن کا کیا خانہ خراب

لہ مقدمہ گلشن ہند

(میر)

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد یہ پاؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے

(سودا)

کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

(امید)

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے در و دیوار سے اب صحبت ہے

(آبرو)

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن
عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا

(قائم)

کبھو دکھا کے کمر اور کبھو دہاں مجھ کو نپٹ بتنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

(تاباں)

سن فصل گل خوشی ہو گلشن آئیاں ہیں کیا بلبلوں کو دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

(حاتم)

لگن میں بجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گزرا
شمع رو رو کے ساری رات سرتا پا کھڑی جلیاں

(میر)

دل سے شوخ رخ کبھو نہ گیا جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

(حاتم)

نہ پہنچے آہ نالہ گوش تک اس کے کبھو اپنا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنی نارسائی کا

بہرحال ان تمام نمونوں سے اس امر کا بخوبی ثبوت ملتا ہے کہ جو الفاظ دکن میں استعمال ہوتے تھے وہ شمالی ہند میں بھی مستعمل تھے۔

اس دَور کی نثر میں مقفیٰ عبارت کی طرز موقوف ہو چکی تھی۔ زیادہ تر اخلاق اور
تصوّف کی طرف لوگ مائل تھے۔ مگر اس کے ساتھ داستانوں کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا۔
کئی طویل داستانیں لکھی گئی ہیں، جن میں ان امور کو بیان کیا گیا ہے جو منظوم داستانوں کے
موزوں رہے ہیں، یعنی بادشاہ کو اولاد نہ ہونا، فقیر کی دُعا سے صاحبِ اولاد ہونا، بڑا ہونے
کے بعد عشق میں مبتلا ہونا اور کامیابی کے لیے سرگرداں اور بالآخر کامیابی اور بامراد واپسی
اس تفصیل کے بعد ہم اس دور کو ختم کرتے ہیں۔

پانچواں دَور

از ۱۲۲۰ھ تا ۱۳۰۱ھ

آصف جاہ ثالث، آصف جاہ رابع، آصف جاہ خامس

اب ہم ایک ایسے دَور میں قدم رکھتے ہیں جب کہ دہلی سُونی ہوچکی ہے اور اس کے ارباب کمال ایک طرف لکھنؤ کا رُخ کرتے ہیں تو دوسری طرف ان کو سرزمینِ دکن اپنی قدردانی کی کشش سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اس زمانہ میں دکن کی عنانِ حکومت نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے ہاتھ میں آئی پھر نواب ناصر الدولہ آصف جاہ رابع اور ان کے بعد نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس فرمانروائی کرتے رہے۔ میر عالم اور مہاراجہ چندو لعل[1] جیسے ذی علم یہاں کی مسندِ وزارت پر سرفراز رہے۔ امیر کبیر شمس الامراء جیسا علوم کا قدردان، اہلِ علم کا محسن و مُربّی امیر پائیگاہ تھا۔ مہاراجہ کا نام شعر و سخن کے لیے اور شمس الامراء کا نام تراجم کی ابتدا کے لیے تاریخِ دکن میں ہمیشہ جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

مہاراجہ چندو لال کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی اور ہر وقت ان کے دربار میں اس کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے دُور دُور سے اہلِ کمال اپنے محبوب وطن کو ترک کرکے دکن آتے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیتے تھے۔ نصیرؔ، مشتاقؔ، حفیظؔ وغیرہ اسی زمانہ میں حیدر آباد آئے۔

شاہ نصیرؔ استاد ذوقؔ نے چار دفعہ یہاں کا سفر کیا اور آخری مرتبہ جو آئے تو ایسے

---

[1] اگرچہ مہاراجہ چندو لال باضابطہ وزیرِ اعظم مقرر نہیں ہوئے بلکہ پیش کار سلطنت آصفیہ تھے۔ مگر ایک عرصہ دراز تک دیوانی پر کوئی مامور نہیں تھا بلکہ آپ ہی اس کا کام بھی کرتے تھے۔

آئے کہ دکن ہی کو اپنا مدفن کرلیا۔ یہاں آپ کے بہت سارے شاگرد تھے جنہوں نے ملکِ سخن میں نام پیدا کیا۔

مہاراجہ چندولال نے بہ کمال قدردانی ذوقؔ کو کئی ہزار روپے بھیجے اور انہیں حیدرآباد طلب فرمایا۔ مصرع "طرح" بھی اپنے مشاعرہ کا بھیجا۔ ذوقؔ نے حاضری سے معذرت چاہی اور اسی زمیں میں دو غزلیں روانہ کیں جن کا مطلع اور مقطع درج کیا جاتا ہے :۔

مطلع

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

مقطع

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوقؔ لیکن اب نہ جا
عالمِ مضموں میں طرزِ تفتہ جاناں چھوڑ کر

مطلع

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

مقطع

گرچہ ہے ملکِ دکن میں اِن دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دِلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اسی طرح غالبؔ نے بھی یہاں کے ذوقِ علم کے باعث اپنے آنے کا قصد کیا۔ مہاراجہ چندولال کے دربار کے ایک مشہور شاعر حفیظؔ دہلوی بھی تھے جنہوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہہ دیا تھا اور دکن ہی کو وطن کرلیا تھا۔ حفیظؔ کے کلام کے جادو نے مہاراجہ کو بھی مسخّر کرلیا تھا۔ مہاراجہ آپ کے کلام کے بے حد دلدادہ تھے۔ شہیدیؔ مرحوم کا خیال تھا کہ مبصّرانِ سخن کے نزدیک آج کل فنِ شعر میں صرف تین شخص ہیں۔ یعنی ناسخؔ لکھنؤ میں شیخ حفیظؔ دکن میں اور شیخ ذوقؔ دہلی میں۔ غرضیکہ حفیظؔ اپنے زمانہ کا اُستادِ سخن تھا جس نے دکن کو اپنا ملجا و ماویٰ بنالیا تھا۔ حفیظؔ کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔

لبِ جاناں سے جی اُداس آیا ہم کو آبِ بقا نہ راس آیا

ہمارے دل میں یہ دردو الم کا جوش رہا
کہ سینہ داغوں سے دوکان گل فروش رہا

خیال کاکلِ مشکیں پہ مجھ کو دوش رہا　　کہ مثلِ کعبہ مرا دل سیاہ پوش رہا

چاک سینہ ہو گیا دل سے صدا آنے لگی
کھلتے ہی اس در کے جنت کی ہوا آنے لگی

تس پہ تشہیر کیا قاتل بیچارے کو　　آپ فرمایئے قبلہ اسے کیا کہتے ہیں[1]

حفیظ کے دیوان کے قلمی نسخے کتب خانہ آصفیہ. کتب خانہ سالارِ جنگ وغیرہ میں موجود ہیں مگر اب تک ان کا کلام شائع نہیں ہوا۔

اسی زمانہ میں شاہ کمال نورالامرار کے ہمراہ لکھنؤ سے حیدر آباد آئے اور اپنے جمع کیے ہوئے مواد سے تذکرہ شعرار مجمع الانتخاب قلمبند کیا، اس کا قلمی نسخہ جو پندرہ سو صفحات سے ضخیم ہے سالارِ جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس تذکرہ میں شاہ صاحب نے دکن کے بھی چند شعرار کا تذکرہ کیا ہے۔ افسوس ہے یہ تذکرہ بھی اب تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے، اس دور میں مہاراجہ چندو لال کے مشاعرے اور نواب شمس الامرار کی علمی اور سائنسی تحقیقات اصحابِ علم کے ذوق کا دلچسپ سامان مہیا کرتے تھے۔

خواجہ میر درد کے شاگرد مشتاق دہلوی بھی مہاراجہ کے مصاحب تھے ان کا ایک شعر دستیاب ہوا ہے۔

جس کو چتون تری تیکھی نظر آئی ہو گی
بے اجل اس نے کنی ہیرے کی کھائی ہو گی[2]

---

[1] گلزار آصفیہ۔

[2] 〃 〃 ۔

اس دَور میں انگریزی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ سائنس کی کتابیں اُردو زبان میں منتقل ہونے لگیں۔ اور دیگر علوم وفنون کی کتابیں کثرت سے تصنیف وتالیف ہوئیں۔ اسی دَور میں علمی رسالے بھی شائع ہونے شروع ہوئے اور عام طور سے اُردو کا رواج ہو چلا۔

چوتھے دَور کے بہت سے الفاظ اس دَور میں متروک ہو گئے۔ مثلاً:۔

ہور، کون، سون، تون، ٹک، نیں، سیں، کنے وغیرہ۔ اس کے بجائے اور، کو، سے، تو تک، نہیں، پاس وغیرہ الفاظ کا استعمال ہونے لگا۔ لیکن پھر بھی جو الفاظ فصاحت کی کان سمجھے جاتے تھے آج متروک ہیں۔ مثلاً:۔

بولیا	کہا	کیجو	کیجئے	کبھو	کبھی
بھلا	اچھا	انی	چوٹی	پہنٹ	خالص، بہت
بر	جسم	بھار	باہر	کتیں	اس کو
کسو	کسی	کاہے کو	کیوں	بعداز	بعد میں
بن	بغیر	تلے	نیچے	پو	پر

اس دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، شمالی ہند کے شعراء اور اصحابِ کمال کے آنے کی وجہ سے یہاں کی دکھنی زبان کا رواج کم ہو گیا اور اس کے بجائے شمالی ہند کی اُردو زبان نظم اور نثر میں استعمال ہونے لگی۔

پانچویں دَور کی نظم

اس دور کے شعراء کی صرف فہرست بھی خاصی طویل ہو سکتی ہے اس لیے صرف چند شعراء کا تعارف کرایا جائے گا۔ بطورِ نمونہ بعض شعراء کا کلام مختصر صراحت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) شاداں

مہاراجہ چندولال المتخلص بہ شاداں کی پیدائش ۱۱۸۹ھ میں ہوئی اور آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں تعلقدار کرور گیری کے عہدہ پر

لہ گلزار آصفیہ۔ تذکرہ شعرائے دکن وغیرہ۔

سرفرازی پائی اور زمانہ مابعد میں ترقی کرتے ہوئے پیشکار سلطنتِ آصفیہ ہو گئے اور اسی پیشکاری کے زمانہ میں کئی سال تک دیوانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۲۶۱ھ میں آپ نے اس دارِ فانی سے کوچ فرمایا۔

آپ بڑے مخیّر تھے اور آپ کی داد و دہش بہت مشہور تھی، آپ نہ صرف سخن فہم اور قدردان اہلِ علم تھے بلکہ خود بھی ایک باکمال اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ شاداںؔ کا اُردو اور فارسی کلام مشہور ہے۔ آپ کا کلام نہایت سنجیدہ شگفتہ اور پسندیدہ مضامین کا ذخیرہ ہے۔ کلام کی رنگینی اندازِ بیان کی جدّت اور تخیل کی بلند پروازی قادر الکلامی کی شاہد ہے آپ کے کلام کا زیادہ حصّہ معرفت اور تصوّف سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے دو دیوان ہیں اور شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جملہ اصنافِ سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ شاداںؔ کے دربار میں بیسیوں شعرائے نامدار جمع رہتے تھے ان میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:۔

مولوی ابو تراب، مولوی محمد حسین، مولوی غلام حسین، ملّا محمد، حفیظ دہلوی فائقؔ حاجی محمد علی ساغرؔ، مرزا محمد طاہر تبریزی، حسین علی خاں ایمارؔ، حافظ تاج الدین مشتاقؔ، ذوالفقار علی خاں صفاؔ، میر عنایت علی ہمّتؔ، امیر الشعراء، امیر احمد علی شہیدؔ، ظہورؔ، اکرمؔ، میر مفتونؔ وغیرہ۔ ان میں سے بعض صرف فارسی کے شعراء ہیں اور بعض اُردو میں دادِ سخن دیا کرتے تھے۔

مہاراجہ کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ۔۔۔ کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا
خوش نہیں آتا ہے مجھ کو راگ سننا غیر کا ۔۔۔ کان میں نغمہ بھرا ہے بس اسی طنبور کا

دل کو سمجھ رہا ہوں میں دلدار کی متاع ۔۔۔ اپنی جو ہے متاع وہ ہے یار کی متاع

موحد ہے تو یکتائی سے مت ٹل ۔۔۔ نہ کہہ اپنی زباں سے دوسرا ہے

ہمیں کیا کام ہے دونوں جہاں سے ۔۔۔ ترا ملنا ہمارا مُدّعا ہے

پابگل ہے سرو جس کی خوش خرامی دیکھ کر ۔۔۔ میں ہوں دیوانہ اسی کی نرگسِ مخمور کا

اس کے آنے کی خبر سُن کیوں نہ شاداں شاد ہو آج ہے کچھ اور ہی عالم دلِ مسرور کا

بندہ ہوں دل و جان سے میں اپنے صنم کا سایہ ہے مرے سر پہ تو اس کے ہی قدم کا

خورشید میں ہے نور تری مہر و عطا سے یہ وجہ ہے ہر ذرہ جو خورشید سے چمکا

جب غنچے نے سر اپنا گریباں سے نکالا بُلبل نے قدم پھر نہ گلستاں سے نکالا

شاداں تو سُنا یار کو اک مطلع رنگیں گر آج کرے تجھ سے وہ گفتارِ محبّت
ہے کام یہاں عاشقِ صادق کا وگرنہ اُٹھتا ہے کسی سے یہ بھلا بارِ محبّت

کرتا ہے کوئی خیر تو ایمان کے باعث ایمان ملا اس کو یہ قرآن کے باعث

باغباں خود لُٹا رہا ہے دیکھ بھر لے جھولی کو تو ثمر سے آج

جامۂ یار کو کیا جامۂ گل سمجھا ہے خار کی طرح سے تو دامنِ دلدار نہ کھینچ

دل کو جب تک نہ کچھ علاقہ ہو کوئی لکھتا ہے بے سبب کاغذ

تو ہر اک شے میں ہے اور پھر ہے منزہ سب سے
کبھو شاداں کو دکھا دے گا تو اپنا دیدار

خوبرو معشوق پر شاداں کا یوں آتا ہے دل
جس طرح جائے پتنگا دوڑ کر سوئے چراغ

نیکی کا کوئی کام آیا نہیں مجھ سے　　کیا ہووے گا انجام میرا کچھ نہیں معلوم

تو ہی غفار ہے مجرم ہوں تیرا　　خطا کیوں کر نہ ہو آخر بشر ہوں

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقتِ صبح صادق کو
اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبح صادق کو

پردۂ چشم اٹھا دیدۂ تحقیق سے دیکھ　　جب یگانہ وہ ہوا کوئی نہیں بیگانہ

مہاراجہ کے کلام سے ظاہر ہے کہ آپ پر صوفیانہ رنگ کس قدر غالب ہے۔ جب قدرداں اس طرح صاحب کمال ہو تو کیوں نہ عام طور پر شعر و شاعری کا چرچا ہوگا۔ عام و خاص ہر ایک کو اس سے دلچسپی تھی۔ صاحب سیف بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ چنانچہ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا ؎

کون کہتا ہے اسے پاؤں سے پاپوش اُتار

جملہ حاضرینِ دربار کو اس پر مصرع لگانے کا حکم ہوا۔ ہر ایک نے تعمیل کی ایک سپاہی بھی حاضر تھا اس نے اجازت چاہی اور عرض کیا :۔

صاحبِ عرش بلائے جسے پاپوش سمیت
کون کہتا ہے اسے پاؤں سے پاپوش اُتار

سپاہی کو فوراً انعام سے سرفراز کیا گیا۔ مہاراجہ کے حالات اور کلام سے متعلق جامعۂ عثمانیہ سے ثمنہ شوکت صاحبہ نے مقالہ مرتب کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

اب ہم اس عہد کے دوسرے شعراء کو پیش کرتے ہیں۔

(۲) ایماء

ایماء تخلص کے ایک شاعر کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ یہ دوسرے ایماء ہیں۔ ان کا نام حسین علی خاں تھا۔ اورنگ آباد ان کا وطن تھا۔

لہ گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن (تذکرہ شعراء دکن)

بقول صاحب گلزار آصفیہ کیا بلحاظ فصاحت و بلاغت اور کیا بلحاظ لطفِ کلام اور کیا بلحاظ شیریں سخنی اور ترکیب بیان آپ اپنے وقت کے ناصر علی تھے۔ راجہ چندولال کے مصاحبوں میں تھے۔ پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی۔ ۱۲۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ بوقتِ انتقال ساٹھ سال کی عمر تھی۔

آصف جاہ ثالث نواب سکندر جاہ نے ایک مرتبہ اس فارسی شعر پر تضمین کی فرمائش کی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ایمار نے حسبِ ذیل تضمین کی :۔

ایمار میں ساکنانِ چمن سے کیا سوال　　ہم بھی تو تھے خزاں میں تمہارے شریکِ درد
کیفیتیں بہار کی ہم سے بھی کچھ کہو　　اردی بہشت ودے کی ہوئی کس طرح نبرد
غنچہ نے مسکرا کے دیا چٹ وہیں جواب　　تو نے سنی نہیں کسو استاد کی فرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد[1]

ایمار کے قصائد کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

بے زر جہاں میں کچھ نہیں آتا بکار دست　　بدتر ہے آستین سے بے اقتدار دست
باغِ جہاں سے ہم کو ثمر کچھ نہیں ملا　　خالی ازل سے لائے تھے مثلِ خیار دست
جی میں ہزاروں حسرتیں ازبسکہ رہ گئیں　　زانو سے آشنا ہے سدا بار بار دست

گریز

غیر از گرہ گرہ میں میرے کچھ نہیں رہا　　لایا ہے پیچ میں ستمِ روزگار دست[2]
میں اوس کی دستگیری کا اُمیدوار ہوں　　ایک دست پر سے صدقے ہے جسکے ہزار دست
یعنی وہ کون اعظم الامرا ہے جس کا نام　　ہر امر میں اوسی کا ہے حاجت برار دست

باقی تیری سواری کا آتا ہے سربلند　　پہنچائے آسمان تک اس کا سوار دست

---

[1] گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن (تذکرہ شعرار دکن)

[2] مجوعۂ فصاحت۔

خوبیٔ سیاہ سینہ کی اس کے میں کیا کہوں ملتا ہے جس کو دیکھ کے ابر بہار دست

... ...

صدقے سے پنجتن کے تیرا پنجہ در رہے یکدست تیرے دست کو دے کردگار دست

ماہی سے ماہ تک تیرے زیر نگیں رہیں آیمار دعا کرے ہے اٹھا بار بار دست[1]

---

(۳) احسان

میر عباس علی خاں نام اور احسان تخلص، ان کے والد سہام جنگ یکے از امرائے دربار آصفی۔ احسان کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اس کے ساتھ پتنگ بازی، کبوتر بازی اور مرغ بازی سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۲۳۰ھ میں انتقال ہوا۔ ان کے قصائد بھی مشہور ہیں اور اسی طرح ہجوگوئی میں بھی شہرت حاصل کی تھی۔[2]

کہے گی خاک تو پیغام اے صبا میرا ہوائے یار میں دم ہے ہوا ہوا میرا

جو مر بھی جاؤں نہ کہیو مری وفات کا ذکر وفا کے نام سے چڑھتا ہے بے وفا میرا

اندھیری رات کو میں روز عیش سمجھا تھا چراغ تو نے جلایا تو دل بجھا میرا

تمہارے زلف کا شامت زدے کو سودا ہے بلائے عشق میں دل ناگہاں پھنسا میرا

کسی نے پوچھا ہے احساں غلام کس کا ہے

لبوں پہ لا کے تبسم کو یہ کہا میرا

آستیں سے تری باہر جو کلائی ہوتی شمع فانوس سے باہر نکل آئی ہوتی[3]

قصیدہ

گرچہ[4] مشہور تو ہے رتبۂ انساں گوہر لیک گوہر میں بھی ہرگز نہیں یکساں گوہر

---

[1] مجموعۂ فصاحت

[2] گلزار آصفیہ

[3] تذکرہ شعرائے دکن۔

[4] مجموعۂ فصاحت۔

کیوں نہ پاپوس کریں اوس کو حرفِ عقل تمام | جس کو فطرت کا دیا حضرت سبحاں گوہر
یعنی نواب فلک رُتبہ وزیر اعظم | صدف بحر کیانی کا وہ تاباں گوہر
جس کو اکثر کہیں اوس کا ہے وہ گرد دامن | بخش دے پل میں جو سائل کو ہزاراں گوہر
نذر کو عید مبارک کے ولا تازہ رقم | کیجئے آج کوئی مطلع رخشاں گوہر
آبداری میں وہ ہو شستہ و روشن ایسا | جس کی خجلت سے رہے بحر میں پنہاں گوہر
اور اشعار بھی یوں اوس کے مسلسل ہوویں | جس کا ہر مصرعہ و ہر لفظ ہو غلطاں گوہر
جس گھڑی پھرے تو لے مہر درخشاں گوہر | لعل صدقے ہو دل وجان سے قرباں گوہر

---

(۴) قیس[1]

محمد صدیق قیس المتوفی ۱۲۳۰ھ شیر محمد خاں ایماں کا ہمشیر زادہ ہے اور تلمذ بھی اس سے حاصل تھا۔ راجہ چندو لعل اور شمس الامراء نے یومیہ مقرر کردیا تھا۔ وقائع نگاری کی خدمت بھی سپرد تھی۔ ریختی میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد بھی مشہور ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی ضخیم دیوان موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے قیس کے متعلق ایک مقالہ شائع کیا ہے۔

بر میں جو وہ سیم بر نہیں ہے | اپنی بھی ہمیں خبر نہیں ہے
بستے ہیں اسی سے کعبہ و دیر | کس جا پہ وہ جلوہ گر نہیں ہے
ہستی سے عدم کو کوچ کرنا | اتنا تو بڑا سفر نہیں ہے
اُڑ جائیں ہم ایک پل میں اس تک | پر کیا کریں ہم کہ پر نہیں ہے
سودا زلفوں کا تو کرائے قیس | ہم کو تو یہ دردسر نہیں ہے

جب اُٹھ کے اپنے گھر کو وہ رشکِ قمر گیا | یک تازہ اور داغ کلیجہ پہ دھر گیا

بعد از فنا بھی ہم کو رہا پاس یار کا
دستِ دعا کے جائے ہے سبزہ مزار کا

---

[1] گلزار آصفیہ اور تذکرہ شعراء دکن۔

تیرے عارض کے اگر سامنے آجائے سحر　　عکس پیدا کرے آئینۂ تصویر میں گل

نکالیں گے ہم اپنی حسرتِ دل　　جو بات آوے کسو دن رات کو تم

ہمارے چاک گریباں کا ناصحا تجھ سے　　ہزار شکر کہ اک تار بھی سیا نہ گیا
وہ ذائقہ لبِ لیلا کے بوسہ کا اے قیس　　مثال شیریں کی لذت کو تو چکھا نہ گیا

وہ چاہے نہ چاہے قیس ہم کو　　پر بندۂ جاں نثار ہیں ہم

جب کہ وہ آئینہ رو پہنے ہے چن کر آستیں
ہر شکن سے اپنے دکھلاتی تھی جوہر آستیں
گل میں یہ بو ہے، نہ غنچہ میں، نہ مشک و عطر میں
جس قدر اس گلبدن کی ہے معطّر آستیں

بے قراری ہے دردِ فرقت ہے　　سانس لینے کی کس کو فرصت ہے

گردشِ چشم سے کیا ساغرِ جم چرخ میں ہے　　چرخ کو بھی جو میں دیکھا تو بہم چرخ میں ہے

قصیدہ

کیا نخلِ دعا نے دوستو کس کی ثمر پیدا　　ہوئی گویا کفِ بیضائے موسیٰ سے سحر پیدا
عبارت خانۂ مشرق سے رہباں فلک نکلا　　رُخِ پُر نور سے ہے جس کے سجدے کا اثر پیدا
ملا صندل جبیں پر صاف شماشی گردوں نے　　نہ ہوتا چرخ کو تا صبحِ محشر دردِ سر پیدا
ہمارے آسماں کا جلوۂ پرواز رنگیں ہے　　شعاعی نور زر سے کیے کیا بال و پر پیدا
مبارکباد کی ہے دھوم رقاصاں عالم میں　　کیا ہے زہرۂ اظہر نے دو آہنگ تر پیدا
قمر سے تا عطارد پائے کوبے مستی تاروں کی　　بساطِ اطلس اخضر جبیں ہے سر بسر پیدا
چمن نے اس خوشی میں حلۂ گلرنگ پہنا ہے　　کہ جس کے ہر رگ و ریشہ سے ہے تحریرِ زر پیدا

نسیم صبح یوں پھرتی ہے لہراتی گلستاں میں — غبارِ راہ میں ہو جوں برید خوش خبر پیدا
سجا ہے ہر قدح لالہ کا اتنا شبنم ترسے — کہ ہو جوں حقہ یاقوت میں عقد گہر پیدا
نکالے ہیں ریاحین طرفہ ترشاخِ صنوبر سے — ہوا ہے بید مجنوں بھی چمن میں بارور پیدا
مرصّع پوش ہے شمشاد سر سے تا قدم ایسا — ہوا پر حلقۂ قمری سے ہے طوقِ کمر پیدا
ترانے گا رہی ہیں بلبلیں یوں شاخ گلبن پر — کہ ہر ہر کے ترنم میں ہے آہنگ دگر پیدا

سُنا جس نغمۂ ترکو بھی اس سے تر روشن ہے
ہوا نواب کے دل بند کو لختِ جگر پیدا[1]

ریختی ملاحظہ ہو:۔

ہوتی ہوں ترے قربان میرے کوکا — منہ پر تو دوشالہ کو مت تان میرے کوکا

سچ کہہ تو میرے سر کی قسم ہے تجھے ددا — سچا نہیں ہے یہ تو ہے جھوٹا ازار بند

راحت افزا سے کہو یہ اجی گلشن بولو — ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بیسن بولو

کاہے کو پہنوں گی باجی میں تمہاری انگیا — ایک سے ایک میرے پاس ہے بھاری انگیا

مجھ کو رخصت دے اب میرے گھر سے — لے کے بیسن اصیل آئی ہے

ایسا نہ ہو محل میں کوئی دیکھ لے تجھے — باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازار بند[2]

---

(۵) سحر محمد[3] خلیل خاں۔ محمد جلیل خاں کے فرزند ہیں امرائے دربار آصفی سے تھے۔ خانی و بہادری کا خطاب اور منصب دوہزاری سے سرفراز تھے۔

---

[1] دیوان قیس مخطوطہ
[2] " " "
[3] طبقات الشعراء مؤلفہ کریم الدین۔

حضرت آصف جاہ ثانی اور نواب ارسطو جاہ اور مہاراجہ چندولال کی مدح میں کئی ایک قصیدے لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ دکن کے کسی قدیم اور جدید تذکرہ میں ان کا بیان نہیں ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

یارب دے اس کا یوں مجھے بوس و کنار دست
لب لب سے بر سے بر گلے میں ہور ہار دست

نشہ میں اب کی کریئے گا سیرِ بہار دوست
دے کر بدست لالہ رخِ مشک بار دست

... ...

گل چو طرف کھلے ہیں غزل خواں ہے عندلیب
رنگینیوں میں رکھتے ہیں صورت ہزار دست

بولا تجھے خبر نہیں ہاں اور ہنس پڑا
بے اختیار دست پہ اپنے وہ مار دست

دیوانہ کوئی بشر ہے پری کا اثر سحر
دل یار میں مگر ہے تیرا اور بکار دست

نواب کامیاب ہے جشنِ غدیر میں
عید سعید دی ہے عجب ادے کار دست

گُل مل ہے، شور و غل ہے، تجمل ہے ٹھاٹ ہے
کر کر جلوس بیٹھا ہے وہ حملہ دار دست[1]

---

(۶) **چندا** اسی دور میں ایک مشہور طوائف ماہ لقا بائی بھی شاعرہ ہوئی۔ چندا تخلص تھا۔ ۱۱۸۷ھ میں اس کی پیدائش ہوئی۔ اس کا باپ صلابت خاں تھا۔ جس کو شاہ عالم کے زمانہ میں بسالت خاں کے خطاب سے ممتاز کیا گیا تھا۔ راج کنور بائی گجراتن اس کی ماں تھی۔ چندا کی علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ موسیقی کے ساتھ شعر

---

[1] مجموعہ فصاحت۔

کہنے کا شوق تھا۔ شیر محمد خاں ایمان سے اصلاح لیا کرتی تھی۔ صاحب گیر و منصب تھی۔ بڑے بڑے امراء اس کے موسیقی کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور اس کی تعریف میں نظم کہتے تھے۔ چنداؔ کی فرمایش سے دکن کی ایک تاریخ "تاریخ دل افروز" کے نام سے مرتب ہوئی ہے۔

چنداؔ کو مردانہ کھیلوں، تیراندازی، گھوڑے کی سواری، ورزش وغیرہ میں بھی کافی مہارت تھی۔ ارسطو جاہ کے حکم سے ۱۲۱۳ھ میں اس کا دیوان مرتب ہوا ہے[1]۔ اس کے اخلاق نہایت پسندیدہ تھے۔ نماز کی سخت پابند تھی۔ روزانہ قرآن پڑھا کرتی تھی۔ ۱۲۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا ہے[2]۔ راجہ راؤ رنبھا کی ملازمت میں ایک عرصہ تک رہی۔ کوہ مولا کے قریب اس کا مقبرہ موجود ہے[3]۔ اس کی ایک سوانح بھی "حیاتِ ماہ لقا" کے نام سے غلام صمدانی خاں گوہر نے شائع کی ہے اور ثمینہ شوکت صاحبہ نے بھی "مہ لقا" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔

آتا نہیں ہے خواب میں بھی یار اب تلک ‏ ‏ ہیں منتظر کی دیدۂ بیدار اب تلک
سب میکدے میں مست ہیں پر ایک تجھ سوا ‏ ‏ دیکھا نہ ایسے دور میں ہشیار اب تلک
دیکھا رقیب ساتھ تھا گلرو کا تب سے آہ ‏ ‏ کھٹکے ہے دل میں وہ بھی مرے خار اب تلک

توقع ہے یہی چنداؔ کو ہر دم دین و دنیا سے ‏ ‏ نہ بھولیں گے علی والی تجھے امداد سے ہرگز

ساقی دے مجھ کو جام مئے ارغوان بھر ‏ ‏ افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جان بھر

مشک سے مطلب نہیں اس کو نہ عنبر سے غرض ‏ ‏ ہے جسے صبح و مسا اس زلفِ دلبر سے غرض

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] حیات ماہ لقا۔

[3] " " "

ملتے ہیں توقع پر تری غیر سے کم ہم — رکھتے ہیں ترے دور میں یہ چشمِ کرم ہم
معروضہ یہ چندا کو ہے نت شاہ نجف سے — دیکھیں نہ کبھو گردشِ افلاک سے غم ہم

قتل پر کس کے آج ہولی ہے — تو سن حسن پر سوار شراب

بنایا یار کی صورت کو وہ نقاش قدرت نے — کھچے نقشہ نہ ایسا مانی و بہزاد سے ہرگز

چشمِ کافر بھی ہے اور غمزۂ خونخوار بھی ہے — قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے[1]

---

(۷) کمتر — کمتر[2]، شاہ کمتر ایک صوفی بزرگ تھے۔ عموماً مرثیہ موزوں کرتے تھے اساتذہ کے ہزاروں شعر حفظ تھے۔ حتیٰ کہ مثنویاں بھی نوکِ زبان تھیں ۱۲۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ مؤلف محبوب الزمن نے ایک شعر نمونتاً دیا ہے۔

برمیں جو آج اپنے وہ زہرہ جبیں نہیں — وہ کیا نہیں کہ ہم نے یہ جانا کہ ہم نہیں

اڈنبرہ یونیورسٹی کی بیاض میں کمتر کے مرثیے موجود ہیں۔[3]

گل محمدؐ کے چمن کا یا حسین — سورۂ حیدر گگن کا یا حسین
جم رکھو شہ مجھ اوپر اپنا کرم — ہوں ترا بندگان، کمتر یا حسینؑ

کہے فاطمہ آج نیارا حسین — پڑیا جگ میں غم کا اندارا حسین
زمیں سوں گگن تک دھلارا حسین — تجھے ظلم سوں مل کے مارا حسین

کمیناں میں کمتر کمینہ غلام — ہے طالب تمہارا میں حضرت امام

---

[1] دیوان چندا مخطوطہ۔
[2] تذکرہ شعرائے دکن ص۴۹۷
[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۱۷۶۔

علیک الصلوٰۃ و علیک السّلام — کرم جگ پوسارا تمہارا حسین[1]

---

(۸) ناطق — ناطق اسی دور کا شاعر ہے۔ مگر افسوس ان کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں۔ اونہوں نے ۱۲۴۰ھ میں ایک مثنوی "قصّہ شہیداں" کے نام سے لکھی ہے۔ اس میں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے زمانہ کا ایک تاریخی واقعہ نظم کیا ہے۔ مذہبی مناقشہ نہیں تھا۔ پر مہدیوں اور سنّیوں میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا ناطق خود مہدوی ہے اور اس ہنگامۂ کارزار میں شریک رہا ہے۔ اس ہنگامہ کی پوری تفصیل اس مثنوی میں ملتی ہے۔

اگر حمد خدا میں دو جہاں ہے	ادا کوئی کر سکے ہمّت کہاں ہے
نہ پشہ اڑ سکے عرش بریں تک	نہ چمٹی جا سکے ہفتم زمیں تک

تھا ایک صوفی میاں بے دین یارو	بھتیجا قاضئ بارور کا او
مصدق قاضی رہا ور کے ہیں	جہنم میں مگر پونچا دہے ہیں
حسد اس بات کا صوفی رکھا تھا	پچا جس روز سے اس کا موا تھا
او ظاہر مہدیوں سے آشنا ہو	تھا رہتا راز دار خاں پتہ میں او
کہا ایک روز اوس نے لعل خاں کو	مراد خاں بوڑے اور لیسین خاں کو

اوسی گھر کا ہے خانہ زاد ناطق	رہے گا قبر میں بھی شاد ناطق

اس مثنوی سے سوا صدی پہلے کے حیدر آباد کی معاشرت، تمدن اور خصوصیات ہتھیار لباس وغیرہ کی پوری صراحت معلوم ہوتی ہے۔

(۹) اُلفت — محمد علی شاہ نام اور الفت تخلص، اسی دور کے شاعر تھے۔ امامیہ مذہب کے پیرو تھے۔ عربی اور فارسی کی بڑی اچھی قابلیت تھی۔

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۳۲۶۔

[2] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۸۔

کئی مثنویاں لکھی تھیں جن میں سے "دین دیپک" اور "ایمان درپن" کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو میں موجود ہیں[2]، اوّل الذکر مثنوی میں امامیہ عقائد کے پانچ اہم مسائل یعنی توحید، عدل، نبوّت، امامت، معادحشر کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر الذکر مثنوی میں ایک قصہّ منظوم کیا گیا ہے۔

ابتدا

کروں حمدِ اللہ سے ابتدا یہ نام کے تئیں میں بنام خدا
کروروں لکھا اوس کو شکر و سپاس کیا گوہر علم العام ۰۰۰۰؟

دوسری مثنوی

محمد علی اب تو مطلب طرف زباں کھول جل بحث مذہب طرف
سبب اس رسالے کی تالیف کا بیاں کر یہ نسخے کی تصنیف کا
کہ احمد علی نور چشم ایک روز کیا مجھ سے اظہار وہ دلفروز
جو ہے حسنیہ کا رسالہ جلیل ہے بحثِ مذاہب میں روشن دلیل

وہ غاصب اتحادِ دینِ حق کا عنید وہ ملعون کا نام ہارون رشید
جو موسیٰ کاظم تھے ہفتم امام کیا ہے شہیدان کو دے زہر جام
موالی سادات اکثر وہ زشت چنایا بہ دیوار جیوں سنگ و خشت
وہ ملعون پر تا بہ روز جزا ہزاراں سے نفرین ولعنت سدا

---

(۱۰) **مرزا** محمد مرزا نام اور مرزا تخلص، حیدر آباد کے مشہور مورخ اور شاعر شاہ تجلی علی تجلّی کے فرزند تھے۔ کافی قابلیت بہم پہونچائی تھی۔ صدارت کے عہدۂ تک ترقی کی تھی۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ چھ ہزار شعر کی مثنوی چند ماہ میں قلمبند کردی۔ یہ مثنوی 'حملہ حیدری' سے موسوم ہے۔ اس کی پہلی جلد ذوالفقار علی خاں صفا نے لکھی ہے۔ مرزا کے متعلق

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۸۔

[2] " " " ۱۸۶۔

تفصیلی معلومات کسی مورخ یا تذکرہ نویس نے نہیں لکھے ہیں۔ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں وہ بقید حیات نہیں تھے۔

ولا ذکر کر نام پروردگار | کہ لاکھوں حصاروں کا ہے یہ حصار
جو وہ ہے تو کافی ہے پٹی کے اوٹ | نہیں تو کرے کام آوے نہ ٹوٹ
جو دیوار اونچی بنائی تو کیا | فلک کو منڈلی لگا دے تو کیا
عبث کر کے شدّاد وضع بہشت | کیا شہرۂ خلق ایک نام زشت

اور اس سمت سے وہ شہ نامور | مدینہ سے نکل بفتح وظفر
ہوا راہبر کو یہ حکم نبیؐ | کہ یوں ڈالے اب راہ اس فوج کی
کہ غطفان و خیبر کے ہو درمیاں | ذریں دیکھ لشکر کو غطفا نہاں
نہ فرصت ملے ان کے تئیں یک بیک | نہ خیبر کی اونسے بن آوے کمک
یہ سُن کر زمیں بوس ہوا راہبر | چلا فوج کو یوں ہی لے راہبر
جو خیبر کے سرحد میں پہنچا وہ جا | صحابہ سے عباد کو وہاں ملا
دیئے اوس کے ہمراہ کر بیس مرد | ہر ایک شیرِ میدان روز نبرد

---

(۱۰) شوق

محمد علی خاں المتخلص بہ شوقؔ، اورنگ آباد میں ۱۱۸۱ھ میں تولّد ہوئے ان کے اجداد مشہد کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد عبدالسلام خاں ۱۱۸۵ھ میں حیدر آباد آ کر بس گئے۔ شوقؔ کی تعلیم و تربیت حیدر آباد میں ہوئی۔ حیدر آباد آنے کے دو تین سال بعد ہی شوقؔ کو داغ یتیمی اُٹھانا پڑا۔ آصف جاہ ثانی نے اس ہفت سالہ لڑکے کو آبائی منصب اور جاگیر سے سرفراز کر دیا۔ شوقؔ کے استاد مشہور و معروف بزرگ شاہ محمّد وزیر تھے۔ چودہ سال کی عمر سے شوقؔ نے شاعری کا آغاز کیا۔ تمنّا سے تلمّذ حاصل تھا۔

شوقؔ کی ایک طویل مثنوی "چہار درویش" ہے۔ اس کے کئی ہزار شعر ہیں۔ ۱۲۲۵ھ میں یہ مثنوی شوقؔ نے تصنیف کی ہے۔ اس کا ایک ناقص الآخر صفحہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود[1]

---

[1] تذکرۂ اردو مخطوطات صفحہ ۹۱۱۔

ہے۔ کتب خانہ سالار جنگ میں مکمل نسخہ موجود ہے۔ شوقؔ کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے
اپنے استاد تمناؔ کی مدح کرتے ہیں۔

کہو کیا بیاں اوس کا مشہور تھا | کہ وہ شعر کا موسیٰ طور تھا
مزاج رسا اور فہم بلند | مضامیں کا تھا وہ تو ترجیع بند
درست اس سے تھی ریختہ کی بنا | وہی چار عنصر رُباعی کا تھا
ہر ایک اس کے دیواں کی بیت الغزل | قصیدے سے رکھتی تھی معنی کا بل
تھا اس کا ہر اک مصرعِ انتخاب | زلال کی ہے منتخب جو پُر آب

قصہ کی ابتدا

تھا صحرائے محشر سا وہ ہولناک | تھی سوزندہ جوں آگ اوس جا کی خاک
وہاں کی تو لوءہ تیغ سے تیز ہے | وہاں کی ہوا تو شرر بیز ہے
ارے ساقی کرم خوش رو دل | ، ہے تخمیر مے سے مرا آب و گل
نہ موقوف رکھ بات تو کام سے، | نہ محروم کر شیشۂ و جام سے
پلا ساقیا وہ مئے پر فتوح | کہ پھر جس کی پینے سے ہو تازہ روح
سخن مختصر طول کر ماجرا | کروں عرض یہ حاصلِ مدّعا
دُعا میں تھے مشغول باصدق دل | بصد عاجزی شاہ و درویش مل
اجابت کا تھا اوس گھڑی فتح باب | یکایک ہوئی وہ دُعا مستجاب
حرم سے اوٹھا ذوہیں شادی کا غل | بجانے لگے تالیاں جزو کل
دیا آستانے سے خواجہ سرا | شہنشاہ کو مژدہ فرزند کا
ہوا پہلے شادی سے بیہوش شاہ | پھر آخر کو آیا جو وہ رو براہ
تعجب ہو خواجہ سرا سے کہا | خواصوں سے یہ کس کو پیدا ہوا
کیا عرض وہ شہ کی خاص حرم | کہ جس پر کئی دن سے تھا پیار کم
نہ تھی الغرض باریابِ سلام | حمل تھا اوسے شاہ کا لا کلام

(۱۲) **کافی** | میر[1] عباس علی خاں بہادر المتخلص بہ کافیؔ، مشاہیر حیدر آباد سے تھے۔ بیگن پلی کے جاگیرداروں سے ان کا تعلق تھا۔ فارسی عربی کے ساتھ ہندی میں بھی کافی

[1] گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن۔

لیاقت حاصل تھی۔ اعلیٰ حضرت اور مہاراجہ چندولال کی مدح میں آپ کے قصائد مشہور ہیں۔ مہاراجہ کے زمرۂ مصاحبین میں شامل تھے۔ ۱۲۳۷ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام پیش ہے:-

لگا دی سوزشِ داغِ جگر نے آگ سب تن میں
ہوا آخر یہ شعلہ برقِ سوزاں اپنے خرمن میں

بھرا اس چشم میں کس شوخ کا تھا شوقِ نظارا
کہ جیوں سیماب تڑپے ہے مرا ہر اشک دامن میں

جنوں سے کیوں نہ ہو ربطِ قدیمی مجھ کو اے ناصح
کہ آغوشِ پری گہوارہ تھا میرا لڑکپن میں

الٰہی یاد میں کس بُت کی ہوں میں مضطرب خاطر
کہ ہے ناقوس کا نغمہ صدائے دل طپیدن میں

نہیں کچھ پیچ و تاب مرگِ مجنوں طوق کو تنہا
دلِ زنجیر بھی ہے رات دن سرگرم شیون میں

رگِ مجنوں سے وقتِ فصد یہ گرمی نکل آئی
کہ نشتر موئے آتش دیدہ تھا انگشت رگ زن میں

شب جو نقشہ چشم میں اس شعلہ رو کا پھر گیا
اب تلک جیوں موئے آتش دیدہ ہے تارِ نظر

---

(۱۳) **سخن** میر[1] غلام مصطفیٰ نام سخن تخلص تھا۔ لالہ لچھمی نارائن شفیق کے شاگرد تھے۔ ۱۱۸۷ھ میں تولد ہوئے۔ وفات کا صحیح سن معلوم نہیں۔ ۱۲۳۹ھ تک ان کے زندہ رہنے کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] گلزار آصفیہ۔

اورنگ آباد سے حیدر آباد آنے پر آصفی شہزادوں اور مدارالمہاموں کا تقرب حاصل ہوا۔ قصائد اور غزلیں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان[1] غیر مطبوعہ ہے۔

اُستاد نے جس دم نقطہ نقطہ درس وفا تکرار کیا
دیوانہ کیا صد عاقل کو، مدہوشوں کو ہشیار کیا
عشاق کیا عشاقوں کا، مشتاق کیا مشتاقوں کا
محبوب کیا محبوبوں کا، دلداروں کا دلدار کیا

معذور ہمیں اب رکھیے گا آجائے جو منہ پر راز دروں
اک جام پلا کر ساقی نے سرشار مئے اسرار کیا
اسرار حقیقت مستی میں بے خواست زباں پر جب گذرا
اکثر نے کیا انکارِ سخن اور بعضوں نے اقرار کیا

خال اس سُرخ گال میں کالا ٭ مثل لالہ ہے لال میں کالا
رنگ اس دل جلے کا مت پوچھو ٭ ہو گیا حال حال میں کالا

کچھ سبب اجتناب کا نہ کھُلا ٭ راز خشم و عتاب کا نہ کھُلا
کس کی زلفوں نے دل کو پینچ دیا ٭ پیچ اس پیچ و تاب کا نہ کھُلا
مبتلائے محاسبہ تو ہوئے ٭ پر خلاصہ حساب کا نہ کھُلا
آہ مافی الضمیر آج تلک ٭ دل خانہ خراب کا نہ کھُلا
فائدہ کیا مطالعہ سے سخن ٭ جبکہ مطلب کتاب کا نہ کھُلا

سو طرح کی آفتیں اب عشق میں ہوویں تو ہوں
جان ہی سے اپنی جب گذرے تو پھر ڈرنا ہے کیا

مثنوی صریر سخن

تجھ کو لازم ہے اے نسیم بہار ٭ کیجیو اتنا سب کے گوش گزار
ہیں جہاں تک کہ دوستانِ سخن ٭ اور جتنے ہیں قدر دانِ سخن

---

[1] کتب خانہ آصفیہ

پہلے ان کو سلام کہہ دینا   بعد اتنا پیام کہہ دینا
کیا لکھوں شرحِ داستانِ شوق   کیا لکھوں قصۂ بیانِ شوق
سوزِ ہجر اپنا کیا کروں اظہار   گردشِ روزگار نے اک بار
کیا شروعِ بہار میں مجھ کو   نشۂ انتظار میں مجھ کو
دوستانِ وطن سے دُور کیا   بوستانِ وطن سے دُور کیا

قصیدے کا نمونہ

جلوۂ حسن شقایق کے کہوں کیا میں مثل   آتش طور بھڑکتی ہے بہر دشت وجبل
رنگ ہے رنگِ چمن پر کہ تماشا کے لیے   شاہدِ نکہتِ گل آئی ہے پردہ سے نکل

... ...

قوتِ نامیہ یہ اور ہے عیدا یسے کا   باور کیوں نہ خلایق کا ہو بھر نخلِ امل
یعنی نواب فلک قدر امیرِ اعظم   جس کی ہمت کا جہاں میں یہ کچھ قدر و محل

... ...

تا کجا شرح کروں میں ترے اوصاف کو اب   خرق عادت سے غرض کم نہیں یہ حسنِ عمل
اک وہ اعجاز پیمبر تھا کہ پیدا ہوتے   گر پڑے خاک میں وہیں لات وہبل
اور ترا فیض قدم تھا کہ یکا یک یکبار   گر پڑا بام سے سرکردۂ کفار دغل

... ...

شجرۂ دولت و اقبال ہمایوں تیرا   گلشنِ دہر میں لایا کرے پھول اور پھل
اور اعدا کا تیری صرصرِ دوراں سے مدام   بے گل و بے بر و بے برگ رہے نخلِ امل[2]

---

(۱۴) سجّاد

میر سجّاد علی خاں بہادر نام اور خطاب، سجّاد تخلص، کافی کے بھائی ہیں۔[1] شعر و سخن میں بھائی کے قدم بہ قدم تھے۔ مہاراجہ چندولال کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا۔ سنہ ۱۲۴۰ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام پیش ہے:

---

[1] مجموعۂ فصاحت۔

[2] گلزار آصفیہ۔

دعویٰ کرے جو خال لبِ دلربا سے مشک ۔۔۔ تا حشر منفعل رہے اپنی خطا سے مشک
ہے جو مریض خال و خطِ یار اے مسیح ۔۔۔ بہتر ہے اس کے حق میں تمہاری دوائے مشک

گر نہ ہو مے تو بہار عین خزاں ہے مجھ کو ۔۔۔ نکہتِ تختۂ گل موج دخاں ہے مجھ کو
ناصحا مغز خراشی تو عبث کرتا ہے ۔۔۔ پند سننے کی تری تاب کہاں ہے مجھ کو

---

(۱۵) **شرر** محمد[1] اکبر خاں المتخلص بہ شرر خاندانی حکیم تھے۔ صحت طلب خاں خطاب ملا تھا۔ مہاراجہ چندو لال کے مصاحبین میں شامل تھے۔ جاگیر اور منصب سے سرفراز کیے گئے۔ نازک مزاج اور تیز طبیعت تھے۔ خود مہاراجہ سے کسی بات پر روٹھ گئے اور پھر اُدھر کا رُخ نہ کیا۔ شرر کو میر اسد علی خاں تمنّا سے تلمذ حاصل تھا۔ دیوان غیر مطبوعہ یادگار ہے۔

دروازہ دل کا الفتِ اصحاب سے کھلا ۔۔۔ رستہ یہی ہے عشق کے دار السلام کا

اس قدر غفلت شرر کیا کام کی ۔۔۔ خوف اب کچھ بھی تجھے ہے گور کا

ریختہ لکھ دیا اک یار کی خاطر شرر ۔۔۔ عقل کرتے رہی اغیار کی توبہ تلا

دل گیا ہے کدھر نہیں آتا ۔۔۔ اس کی کوئی خبر نہیں لاتا
جس طرف دیکھتا ہوں کرکے نگاہ ۔۔۔ تجھ سوا کوئی نظر نہیں آتا
چاک کو دل کے جو کرے رفو ۔۔۔ وہ نظر بخیہ گر نہیں آتا

نسیم جا کر چمن میں کہیو تو بلبلوں کو سلام میرا
درود پڑھتا ہوں روئے گُل پر یہی قفس میں ہے کام میرا

---

[1] گلزار آصفیہ

ہمیشہ مخمور و مست ہوں میں، ہے خواب میں بھی خیال ساقی
شراب اُلفت خمیر شیشہ یہ دیدۂ تر ہے جام میرا
شرر تخلص ہو جانتے ہیں یہ سارے معشوق اور عاشق
سراج و پروانہ[1] ساں ہے روشن ہر ایک مجلس میں نام میرا

کالی گھٹا چمن پہ ابھی آئے جھوم کر　　گر رُخ پہ اپنے کھول دے وہ نو بہار زلف

ہم دُور سے وہ صورت اللہ دیکھتے ہیں　　جس طرح آسماں پر سب ماہ دیکھتے ہیں

مریضِ عشق کو درماں کی احتیاج نہیں　　بغیر شربتِ دیدار کچھ علاج نہیں

کیا قہر کیا تو نے شرر اس کو دیا دل　　کرتا ہے کوئی دوست کو دشمن کے حوالے

پروانہ ساں دل کیوں نہ ترے عشق میں جل جائے
گر شمع بھی صورت تری دیکھے تو پگھل جائے

---

(۱۶) ہمت

خواجہ ہمت علی خاں ہمت بھی مہاراجہ چندو لال کے درباری شعراء میں شامل تھے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔

حرم اور دَیر کا معبود نار و نور کا خالق　　وہی جلوہ نما نظارہ میں ہے دونو عالم کا

کچھ ایسا بارِ نزاکت سے قد ہے لہراتا　　کہ جیسا بوجھ ہو ڈالی پہ چار پھولوں کا

اچھوتا کسی کو نہ زنہار چھوڑا　　لپیٹا جسے زلف نے مار چھوڑا

---

[1] شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی اور ان کے مرید اور شاگرد پروانہ کی طرف اشارہ ہے۔

مہندی کا کل بہانہ تھا، ہے آج غسل کا　　　وعدہ وفا ہو وصل کا کب حیلہ جو کے ساتھ

دیکھو نہ عزیزو دلِ ناکام کی صورت　　　دکھلاؤ مجھے میرے دلارام کی صورت

مجھے اس صنم کا حضور ہے تری بندگی میں قصور ہے
ارے شیخ تو ہے بخود غلط نہ خودی سے پہنچے خدا تلک

کافر بتوں کے بندے کہتے ہیں لوگ ناحق　　　ایمان اور ہمت میں دیندار ہم تم

ہوا ہے تیغ نگہ سے شہید یاد آیا　　　جوانا مرگ وہ جنت مکاں دلِ مرحوم

مثل منصور جو حق بات کہے سر نہ رہے　　　راست گو کا یہی انجام ہے اللہ اللہ[1]

(۱۷) جولاں

میر حسن علی خاں نام اور جولاںؔ تخلص تھا۔ حیدرآباد ہی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار مشاہیر میں تھا بقول صاحب محبوب الزمن آپ کو شعر گوئی میں کسی سے تلمذ نہیں تھا۔ کلام لطافت و شیرینی کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔ چندولال اور ارسطو جاہ کی مدح میں قصیدے بھی کہے ہیں۔ آپ کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔

قصیدہ

ہے زبس نیرنگیٔ دوراں سے دل زار و نزار
شیشۂ ساعت سا نت رہتا ہے خاطر پر غبار

---

[1] مجلہ مکتبہ ماہ آذر ۱۳۳۹ھ

[2] مجموعۂ فصاحت۔

دور میں اس وضع بد کے ایک دم فرصت نہیں
در پئے ایذائے مردم ہے زبس لیل و نہار

... ...

سیر کرتا ہی میں پھرتا تھا چمن میں ناگہاں
کہہ دیا دل سے مرے ایک بار مجکو یہ پکار
لے کے خامہ کے تئیں لکھ وصف ایسے شخص کی
تاکہ جلدی سے تری ہوویں سب ہی اجرائے کار
بات کے سنتے ہی میں نے اوس گھڑی مطلع کیا
تب کیے سب نے پسند اوس کو، جو کوئی تھے ہوشیار
معدن جود و سخا مخزنِ تدبیرِ کار
زور بازوئے شجاعت سیف ملک نامدار[1]

چمن میں دہر کے گلچیں عجب ہے جور و ستم
برنگِ لالہ دلوں میں ہے سب کے داغِ اَلم
اب ایسی جام میں ساقی شرابِ ارغوانی بھر
کہ جس کو دیکھ کے زاہد کے منہ میں آئے پانی بھر[2]

---

(۱۸) واقف واقف کے متعلق کوئی معلومات نہیں ہیں۔ اس نے قدیم شعرا کی تقلید میں ایک مثنوی لکھی ہے جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اس مثنوی کا نام "چندربان" ہے۔ اس کی تصنیف ۱۲۲۷ھ میں ہوئی ہے۔ ۱۲۵۸ھ کا لکھا ہوا مخطوطہ میری نظر سے گذرا ہے[3]

---

[1] مجموعۂ فصاحت۔

[2] محبوب الزمن۔

[3] کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔

کلام کا نمونہ پیش ہے :۔

کرم سے اپنی اے ساقیِ وحدت پلا مجھ کو تو صہبائے محبت
ساقی دے مجھے جامِ طہورا کہ تا دیکھوں خدائی کا ظہورا
ہوا اس کی نشہ سے مست و سرشار رہوں ہر آن تیرا محوِ دیدار
مجھے رکھ ہر گھڑی تو مست و مخمور کہ دیکھوں تا میں تیرا جلوۂ نور

اگرچہ میں بھی تو اہلِ دکن ہوں نہیں کچھ ہند کا صاحبِ سخن ہوں

ولی ہند سے اپنی حسبِ مقدور بیاں کرتا ہوں سنیے اس کا مذکور

قطع فارسی کا میں کیا ہوں روایت ہر دو قصوں سے لیا ہوں
کہیں بولا حکایت کر زیادی کیا ہوں اپنی بھی پچھ اُستادی
پس از شکرِ خدا تاریخ کا شکر مجھے لازم ہے کہ کرتا اب یہاں ذکر
زمانہ ان کا نو و سال کا ہے نہیں کچھ آج کل اور حال کا ہے
سنہ ہجری سے دیکھا میں نے فی الحال تھا بارا سو پہ ستائیسواں سال

---

(۱۹) **محکم** روضۃ الشہداء[1] نام، ایک منظوم کتاب واقعاتِ کربلا میں لکھی ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۱۲۳۱ھ ہے۔ محکمؔ کے حالات سے ہم واقف نہیں ہیں مختصر نمونہ درج ہے۔ محکمؔ کو دربارِ میر عالم سے تعلق تھا۔

روایت ہے کہ اک دن شاہِ اُمت نپٹ غمگین تھے بحرِ شفاعت
سو جبریلؑ امیں ویسے میں آئے سلام حضرتِ عزت سُنائے
حسینؓ ابن علیؓ کی دیک صورت لگے جبریلؑ رونے بے نہایت
بہن زینبؓ کو تب بُلوا کے سرورؐ لگے رو رو کے کہنے ہائے خواہر

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں اس کا مخطوط موجود ہے۔

حسنؑ کا خاک میں ملتا ہے اب گھر | چلا قاسم بنا کٹوانے کو سر
مجھے اس بیاہ کی اک آرزو تھی | دولہن دولہا کی سہرا دیکھنے کی
اسے اب خیمہ گاہ میں تم لے جاؤ | مرے قاسم کیتیں نوشہ بناؤ

مرا مرتا ہے بچہ اب پیاس سے آج | میں بانکی کھڑی ہوں ہو کے محتاج

دہائی تم کو دیتی ہوں نبیؐ کی | بجھا دو تشنگی اصغر علی کی
مصیبت مجھ بہو پر پڑی ہے | مرے اصغر کو اب ہچکی لگی ہے
رہائی شاہ نے جب کچھ نہ پائے | یکایک فوج میں گھوڑا چلائے
چلانے جب لگے اعدا پہ تروار | ہوی وہاں سینکڑوں لاشوں کی انبار
چلائی تیغ جب وہ شاہ یثرب | لگے پھر کانپنے ارض و سما سب
وہی ظالم سیہ رو شمر آیا | گلے پر شاہ کے خنجر چلایا

---

(۲۰) **ظہور** مرزا عابد اللہ بیگ نام، ظہور تخلص۔ حیدر آباد کے شاعر اور مہاراجہ چندولال کے درباری شعراء میں منسلک تھے۔ بلکہ ان کے شاگرد بھی تھے۔

افیون کے نشہ سے بھی تو واقف نہ تھے ظہور | اب بھنگوں میں پینے لگے بستے بستے بھنگ

---

(۲۱) **آفاق** فریدالدین نام اور آفاق تخلص تھا۔ شمس الامراء کے ملازمین میں شامل اور دو سو روپیہ ماہوار پاتے تھے۔

بنتے جو ہو مثل گل چاک جگر جائے | اور برنگ صبا جلد گذر جائے
سب سے ہے بہتر یہی آپ کی گر جائے | گلشن الفت سے دل لے یہ ثمر جائے
داغ بدل جائے دست بسر جائے

۱۔ گلزار آصفیہ۔

کیا کہوں تجھ سے دلا طرفہ ہے ایک ماجرا　　نکہتِ گل کا کیا گیا آگے نکل قافلہ
پہلے تو وہ رنگ تھا اب یہ نیا گل کھلا　　کر کے ہمیں پیشوا کہتی ہے بادِ صبا
میں کوئی دم چلی آپ ٹھہر جائیے

قصیدہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

برق کی دیکھی ہے ابر بہاری میں چمک　　دل لگا کہنے کہ لا جلد مئے ناب دگزک
چھوڑ کر یوں مجھے مخمور نہ جا اے ساقی　　تجھ سے کہتا ہوں سنا کیا نہیں تو نے اب تک

ہے جوش فصلِ گل سے گلستاں بہار پر　　نازاں ہے گل کا تار گریباں بہار پر
مضمون شعر تازہ نہ کس رنگ سے بندھے　　جب ہو خیال قافیہ سنجاں بہار پر
لکھتا ہوں وصف گلشنِ مہر سپہر جاہ　　کس رنگ سے نہ ہوئی قلم داں بہار پر
نواب شمس الامرا ہی رہے مدام ...　　اوس کے سبب ہے گلشن دوراں بہار پر

---

(۲۲) صفا ذوالفقار علی خاں نام اور صفا تخلص۔ لکھنؤ سے دکن میں آکر بس گئے تھے۔ اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ میر تقی میر جیسے استاد سخن سے ان کو تلمذ تھا۔ حیدر آباد میں میر عالم پھر راجہ چندولال اور شمس الامرا کی سرکار سے تعلق رہا۔ قصائد، غزلیات، مثنویاں مشہور ہیں۔ حملہ حیدری، ایک ضخیم مثنوی کو فارسی سے اردو میں منظوم کیا ہے۔ قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

ایک شہادت نامہ بھی قلمبند کیا جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ ایک مثنوی "چھو منتر" بھی لکھی ہے۔ ۱۲۶۰ھ میں صفا کا انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

حسنِ گفتار نے طوطی کو قفس میں ڈالا
بھاڑ میں ڈالیے کیا ایسی زباں دانی کو
غنچہ و گل سے غرض کیا مرغ حسرت زار کو
آنکھ جو کھولی تو دیکھا صورتِ صیاد کو

لہ شمس الامرا کا علمی کارنامہ۔ صفحہ ۱۰۳۔

ایک نالہ کر دکھاؤں خرچ گنج نہاد کو
کیا کروں یارا نہیں دیتا جگر فریاد کو

بعد مرگ اپنے وصیّت ہے تمہیں اے دوستو
سونپ دینا میری مشتِ خاک دوشِ باد کو

ہم اپنے حال میں تھے وہ خیال میں اپنے
ادھر آہ رہے اور ادھر واہ رہے

اے صفا کوچۂ محبّت میں کوئی میری طرح سے خوار نہ ہو

جب ترقی ہو تنزل تو بھلا کیا ہونا قطرہ ہوتے جو تمہارہ گیا دریا ہونا
پیرِ نا بالغ اگر ہو کے جیا مرد تو کیا اس کو یکساں ہے جواں مرد کہ بڈھا ہونا
رتبۂ فکر تو اب عقل سے گذرا ہے صفا ایک زنجیر کا باقی ہے بکھیڑا ہونا[1]

---

(۲۳) ہمدم رائے گلاب چند نام، ہمدم تخلص۔ نواب شمس الامراء کی سرکار میں پیشکار تھے۔ احسن اللہ خاں بیان دہلوی سے تلمّذ حاصل تھا۔ ۱۲۱۵ھ میں ان کا کلیّات مرتّب ہو چکا تھا جس کو ان کے فرزند چھوٹو لال زیبؔ نے ۱۲۸۰ھ میں طبع کر کے شائع کیا ہے۔ کلیّات میں مثنویاں، غزل، قصائد سب کچھ شامل ہیں۔ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمدم بلند مرتبہ شاعر تھے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:

نہیں ہے ایک طرف پر زمانۂ نیرنگ
جو دم میں کچھ ہے تو دم میں کچھ اور ہی ہے رنگ

خوشی حصول ہے گاہے گہے خفا ہے دل
کبھو فسردہ ہے خاطر کبھو ہے دل پر اُمنگ

---

[1] دیوان صفا۔ مخطوطہ۔

جہاں میں سلسلہ توام ہے شادی و غم کا
ہنسے سے جو اسے روتے ہیں کچھ نہیں ہے درنگ

لکھ ایسے شخص کی تعریف نام سے جس کے
خوشی سے غم ہو مبدل نہیں کچھ اس میں درنگ

وہ کون یعنی ثریا جناب شمس الملک
کہ شمس الامراء بہادر ہے اور تیغ جنگ

جم اقتدار سکندر حشم سلیماں قدر
نظامِ سلطنت وزیب مسند اورنگ

غزلیات

جوشِ چشمِ پُر آب میں دیکھا ہم نے دریا حباب میں دیکھا

چشموں کا تیرے جس کو میخانہ نظر آیا وہ مے سے محبّت کا مستانہ نظر آیا

ہمدم بنا ہے میرا دیوان ایک مرقّع جو شعر کھینچتا ہوں تصویر کھینچتا ہوں

بظاہر جاگتا تو ہوں نظر پر کچھ نہیں آتا
برنگِ دیدۂ تصویر ہوں میں خوابِ حسرت میں

نگہِ شوق کام کرتی ہے کارِ عاشق تمام کرتی ہے[1]

---

(۲۴) ملک غلام امام خاں نام ہجر اور ملک تخلّص تھا، تاریخ رشید الدین وغیرہ کے مصنّف ہیں۔ ان کا تفصیلی حال نثر نگاروں کے بیان میں آئے گا۔ یہاں ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔ قصیدہ کا نمونہ ملاحظہ ہو ؂

---

[1] دیوان ہمدم۔ کتب خانہ نواب ظہیر یار جنگ۔

کہاں ہے ساقیِ خوش وضع یاسمین اندام
کہاں ہے ساغر و مینا کدھر مئے گلفام
کہاں شراب کہاں ہے کباب شغل کہاں
کہاں ہے شربتِ دیدارِ یارِ دل آرام
کہاں ہے طبلہ دفانوں نیچک و طنبور
کہاں ہے یار بد عصر تانیس مقدام

... ...

ہے ابن ابنِ امیر کی شادی
ملا دلوں کو جو امیدوار تھے آرام
وہ کون جس کو کہ خورشید دولہ کہتے ہیں
ہے تیغ جنگ دمِ جنگ معرکہ میں نام
پدر ہے اس کا فلک رتبہ اقتدار الملک
خسر ہے شاہ دکن مالکِ رقاب انام
یہ قصد ہے کہ یہاں اس کی دھوم دھام کروں
پر اس طرح کہ کہیں واہ سن خواص و عوام
ہنوز تھا یہ زباں پر طرف ہاتف کے
ہزار رنگ سے فرحت فزا ہوا الہام
سخن ہے راست مرا عید کے ہیں یہ ایام
خوشی پہ آکے مجھے دے ہے ہر طرف سے پیام
ہر ایک صبح پہ عاشق ہے صبح عید صیام
ہر ایک شام پہ نوروز کی نثار ہے شام[1]

---

(۲۵۱) لائق

بدر الدین خاں نام، لائقؔ تخلص اور امیرِ جنگ امیر الدولہ خطاب تھا۔ آصف جاہ کے میرِ ساماں تھے۔ آپ کے جدِّ اعلیٰ آصف جاہ اوّل کے ہمراہ دکن آئے تھے۔ لائقؔ خاندانی امیر اور جاگیر دار تھے۔ ان کو شعر و سخن کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ ۱۲۶۶ھ میں انتقال ہوا۔[2]

آپ کے مزاج میں نفاست تھی۔ بہت سلیقہ مند تھے۔ خوش اخلاق اور صاحبِ مروّت تھے۔ شاہی تقاریب اور شادی بیاہ کے مواقع پر اہتمام ان کے ہی ذمّہ ہوتا تھا۔ اپنے ان فرائض کو وہ نہایت سلیقہ سے انجام دیا کرتے تھے۔[3]

کلام کا نمونہ پیش ہے :-

خوش دماغوں کو میرا احوال پہنچے اس لیے
نام پیغام اپنا نکہتِ گل میں گھٹ

---

[1] تاریخ خورشید جاہی۔
[2] تزک محبوبیہ
[3] گلزار آصفیہ۔

عشق نے حسن و وفا کو بسکہ دگرگوں کیا
قیس کو لیلیٰ کیا، لیلیٰ کیتیں مجنوں کیا

تابشِ خورشید تاباں سے ہوا گر سنگ لعل
گرمیٔ داغِ جگر نے دل بشر کا خوں کیا

اگر کھینچی کبھو نقشہ میری اس ناتوانی کا
زمیں پر گر پڑے خامہ لرز کر ہاتھ مانی کا

میری بالیں پر شب کو کوئی بیتاب آیا تھا
چراغِ آتشیں میں جائے روغن آب آیا تھا

دردِ دل کا حال ہم اب راز کر سکتے نہیں
ضعف ہے اتنا کہ بس آواز کر سکتے نہیں

اُلفتِ صیّاد سے کہتا ہے ہر مُرغِ اسیر
گو قفس ٹوٹے پہ ہم آواز کر سکتے نہیں

بات جو آئے زباں تک اس کو لائق روک لے
کیوں کہ اہلِ راز افشا راز کر سکتے نہیں

اپنے مطلب کے ہم سیانے ہیں		گو ترے سامنے دیوانے ہیں
جب ہوا یار آشنا لائق		پھر تو بیگانے بھی یگانے ہیں

قتل کرنے کو بس ہے تیرِ نگاہ
تیغ کیوں آپ کے تو ہات ہے آج[1]

---

[1] دیوان لائق۔ مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ۔

(۲۶) **قربان** حاجی سید قربان حسین نے ایک مثنوی جنگ نامہ امیر حمزہ کے نام سے ۱۲۵۷ھ میں لکھی ہے۔ ان کے حالات تاریکی میں ہیں نمونہ پیش ہے :-

شہنشاہ کی بیٹی تھی اس مجھار — اتھا نام اسے جگ میں مہر نگار
امیر کی شجاعت کو سن جگ منے — اتھی بہت حمزہ پو عاشق اتے

کہتے تھی ایک آدمی سوں ایک ماجرا — اتھا نام اس کا جو خواجہ سرا
اسے دیکھ حمزہ کو اس حوض پر — گیا شاہ زادی کو جلد دینے خبر[1]

---

(۲۷) **فیض** اس[2] دور کے ایک زبردست شاعر فیض ہیں۔ آپ کا نام میر شمس الدین ہے۔ آپ کے والد مولوی محمد رحمت اللہ آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں دہلی سے حیدر آباد آئے۔ فیض کی پیدائش ۱۱۹۵ھ میں بارہ میں ہوئی۔ آپ کے علم و فضل سے تمام دکن نے فیض حاصل کیا ہے۔ آپ کی تصانیف بہ کثرت اور شاگرد بے شمار ہیں۔ فیض کا شمار امرائے دربار آصفی میں ہے۔ منصب اور جاگیر سے سرفراز تھے۔

فیض کو حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ مشتاق خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ اس طرح فیض کا کلام اسکول دہلی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ مگر اس کے ساتھ لکھنؤ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔

آپ کا کلام نہ صرف نزاکت اور لطافت کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے بلکہ زبان کی صفائی اور سادگی کے لحاظ سے بھی قابلِ ستائش ہے۔ فیض اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی تھے۔ حلقہ ارادت وسیع تھا۔ تبلیغ و تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۱۲۸۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں دیوان طبع ہو چکا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :-

---

[1] اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔

[2] گلزار آصفیہ۔ صفحہ ۴۵۲۔

کفر جو تھا دین مرا ہوگیا — بُت بھی نصیبوں سے خدا ہوگیا
کیسی دوا مجھ کو مسیحا نے دی — درد محبت کا سوا ہوگیا
موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے — فیضؔ تو پہلے ہی فنا ہوگیا

حرم میں دیر میں جب کوئی رو برو آیا
مجھے یقین ہوا بس تو ہی کہ تو آیا
کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں، ہے کہ انصاف
ادھر میں نکل آیا اُدھر تو آیا
اڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے
مگر نہ قبضہ میں دامانِ آرزو آیا

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں — جو بُت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے
تقاضا دیت کا مگر فیضؔ ان سے — خدا سے کوئی خوں بہا چاہتا ہے

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم
صنم ہم، دیر ہم، بت خانہ ہم، بت ہم، برہمن ہم
درو دیوار ہے نظروں میں اپنے آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے آپ اپنا درشن ہم
نہ قیل وقال سے مطلب، نہ شغل اشغال سے مطلب
مراقب اپنے رہتے ہیں جھکا کر اپنی گردن ہم
کب اُٹھتے ہیں اُٹھانے سے کسی شیخ و برہمن کے
درِ دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم
ہوا اے فیضؔ معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

خطِ جادو ہوں یا میں نقش پا ہوں　　غرض افتادگاں کا رہنما ہوں
جو ناکارہ ہوں یا میں کام کا ہوں　　تمہارا ہوں بھلا ہوں یا بُرا ہوں
عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ　　بہت راتوں جگا تھا سو رہا ہوں
نہ کر اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار　　ابھی اے فیضؔ مر مر کے جیا ہوں

بُتِ غنچہ لب پھر ہنسا چاہتا ہے　　خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے
کسی بُت سے دل کچھ کہا چاہتا ہے　　خدا جانے کیا کیا سُنا چاہتا ہے

کل سے پھر جی نڈھال ہے اپنا　　آج جینا محال ہے اپنا

سرِ راہ گالیاں کھانے کھڑے ہو　　ارے میاں فیضؔ کیا چکنے گھڑے ہو

دھوم ہے نرگسِ شہلا کے خریداروں کی　　دفن ہے لاش جہاں چشم کے بیماروں کی

ہے انانیت ہر اک انسان میں　　کہہ گیا ہے کچھ فرشتہ کان میں

---

(۲۸) خاموش

شاہ معین الدین شاہ خاموشؔ۔ بیدر کے یہ رہنے والے صابریہ طریقہ کے بزرگ تھے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے۔ آپ کے مرشد علاؤ الدین شاہ علی صابر چشتی تھے۔ ان کے آپ خلیفہ بھی تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بارہ سال تک آپ عالم سکوت میں رہے۔ اس کے باعث خاموش مشہور ہو گئے۔ آصف جاہ رابع ناصر الدولہ کے زمانہ میں آپ حیدر آباد آئے اور مکہ مسجد کی عقبی خانقاہ میں مقیم ہوئے۔

۱۲۸۶ھ میں خاموشؔ کا انتقال ہوا۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔ آپ کے کلام پر بھی

لہ تذکرہ اولیائے دکن مؤلفہ عبد الجبار ملکا پوری۔

اسکول دہلی کا رنگ غالب ہے۔

شکل انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا | حق سے ناحق میں جُدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
مطلعِ دل پہ مرے چھایا تھا زنگار خودی | چاند بدلی میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا
ایک مدت حرم و دَیر کو ڈھونڈا ناحق | سیمبر بر میں چھپا تھا مجھے معلوم نہ تھا

چمن میں رہتی ہے بلبل ترس ترس کے پاس | یہ شور کرتی ہے، ہوتا قفس قفس کے پاس
لبوں پہ آہ، تڑپ دل میں، دم ہے مستی میں | عجب اے لیل ادا ہے جرس جرس کے پاس
نہ قید کر ہمیں صیاد موسم گل میں | کبھو تو اپنا لے چل قفس قفس کے پاس

آشیاں اپنا گلستاں سے اُٹھائے بلبل | باغ کو چھوڑ دے جنگل کی ہوائے بلبل
باغباں کا ہے ستم دوسرے صیاد کا ظلم | جان ان دونوں کے ہاتھوں سے بچائے بلبل
چہچہے کرتی ہے کیا اس سے نہیں کچھ حاصل | مثلِ پروانہ پہ رو بال جلائے بلبل

... ...

کفر کافر کو بھلا، شیخ کو اسلام بھلا | عاشقاں آپ بھلے اپنا دلارام بھلا

ستم کو ترے کب ستم جانتا ہوں | عنایات لطف و کرم جانتا ہوں
دو عالم کی ہستی ہے موہوم ساری | جسے دیکھتا ہوں عدم جانتا ہوں

اگر شکلِ گل ہوں اگر خار ہوں میں | گلستانِ قدرت کا اظہار ہوں میں
تحیّر مجھے ہے، تری جستجو ہے | تو آئینہ سا خود میرے رو بہ رو ہے

ہم گرچہ نہیں لائق دربار تمہارے
مشہور تو ہیں بندۂ سرکار تمہارے[1]

---

[1] دیوانِ خاموش۔

(۲۹) ربط

بالاؔ پرشاد نام، ربطؔ تخلص۔ ان کے آباد اجداد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ اوائل عمر میں یہ حیدرآباد آئے۔ یہاں ہی ان کی پرورش ہوئی اور راجہ خوشحال چند کی دختر سے بیاہ کیا اور راجہ خوشحال چند کی وفات کے بعد ان کی خدمت سے سرفراز ہوئے۔ شاعری کا بڑا شوق تھا۔ لکھنؤ کے اہلِ کمال آپ کی شاعری کے معترف تھے۔ عام طور سے محفلوں میں آپ کی غزلیں گائی جاتی تھیں۔ مرنے کا سنہ معلوم نہیں ہے کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

تصویر اگر شمع رسالت کی لکھوں میں خامہ سے نکل جلوۂ شق القمر آوے

تاب و تواں و صبر گئے دل کے ساتھ ساتھ
محفل اٹھی ہے صاحبِ محفل کے ساتھ ساتھ

مرے کفن لپیٹے ہوئے پھر رہے ہیں ربط
مرنے کے اشتیاق میں قاتل کے ساتھ ساتھ

یوں تو وہی صحیح منکر ہیں مرے قتل سے آپ
سرخیٔ پنجۂ نازک کو حنا کہتے ہیں

وہ جو خنجر مرے مژگاں کی طرح ہے پرخوں
یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے اسے کیا کہتے ہیں

---

(۳۰) تمیز

بدرالدین خاں تمیزؔ۔ شمس الامراء امیر کبیر کے فرزند ہیں۔ صفر ۱۲۲۰ھ میں تولد ہوئے اور ۱۲۶۹ھ میں انتقال فرمایا۔ آصف جاہ رابع نواب ناصرالدولہ نے آپ کو رفعت جنگ معظم الدولہ کے خطاب سے سربلند فرمایا تھا۔ بڑے دلاور اور شجیع تھے۔ حافظ قرآن تھے۔ علوم و فنون کے قدرداں اور خود بھی صاحبِ علم و فن تھے۔ شاعری کا شوق تھا۔ فیضؔ کے شاگرد تھے۔ دیوان موجود ہے جس میں ہر قسم کا کلام

؎ گلزار آصفیہ و محبوب الزمن۔
؎ " " " "

شریک ہے۔ ہنوز آپ کا دیوان طبع نہیں ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

نالۂ دل کا مرے اس کو اثر اچھا ہوا ۔۔۔ شورش وہ اور بھی برہم ہوا نازک مزاج

شبنم کو رُلا دینا اور گل کو ہنسا دینا ۔۔۔ یہ باد صبا تُو نے کیا شغل کیا پیدا

سب محو ہوئے لوگ زلیخا کو غش آیا ۔۔۔ یوسف جو گیا مصر کے بازار میں بکنے

میں بگولے کی طرح عشق میں برباد رہا ۔۔۔ قیس جنگل میں رہا کوہ میں فرہاد رہا

سارے خوبوں سے مرے یار کی ہے شان جدا ۔۔۔ اس کا عالم نظر آیا مجھے ہر آن جدا

کیوں نہ دیجے اسے شراب بہت ۔۔۔ ہم سے رکھتا ہے وہ حجاب بہت

اس پری کی جو شبِ وصل میسّر ہو تمیز
لب پہ لب سینہ پہ سینہ رکھوں اور گال پہ گال

صبر پر دل کے کھوکس کے یہ شبخوں ٹھہرا ۔۔۔ پان کھا، مسّی لگا آپ جو تیار ہوئے

گیا باغ میں صبح جیوں غیرتِ گل تُو دیکھ اس کا رُخ اور قامت قیامت
ہوا اس اُڑ گئے بلبل و قمریوں کے گل و سرو کا دل خیا بان کھینچا

قصیدہ کا نمونہ (جو باپ کی مدح میں کہا گیا ہے۔)

چلی صبح ہوتے جو بادِ بہار ۔۔۔ تو کچھ نیند سی آگئی ایک بار
نظر آئی اک مہ جبیں خواب میں ۔۔۔ کہ خورشید ہو جس کے رُخ پر نثار
کروں حسن کا اس کے کیا میں بیاں ۔۔۔ اسے دیکھ کر دل ہوا بے قرار

مصفّٰی تھے رخسار آئینہ سال — جبیں اس کی تابندہ تھی ماہ وار
مہِ نو کی تفسیر تھیں ابرویں — کہیئے تو وہ تھی تیز دم ذوالفقار

... ...

میں آئی ہوں یہ تجھ کو دینے نوید — ذرا خواب غفلت سے ہو ہوشیار
میں اس کی گرہ سال کی رکھ خبر — جو نواب ہے آج با اقتدار
کہیں ہیں اسے شمس الامرا تمام — ہے مانند شمس اس کا نام آشکار

... ...

دُعا پر بس اب ختم کردے تمیز
وہ زندہ رہے تا بہ روز شمار

---

(۳۱) مکھن [1] راجہ مکھن لال، مہاراجہ چندولال کی طرف سے عرض بیگی تھے۔ اس حیثیت سے ان کو راجہ کا خطاب ملا۔ شاعری کا کافی مذاق تھا۔ ۱۲۶۰ھ میں عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اُردو رُباعیوں میں کیا ہے۔ یہ جس قدر دشوار امر تھا وہ ظاہر ہے مگر راجہ صاحب نے نہایت آسانی کے ساتھ اس میدان کو طے کیا ہے غالباً اُردو میں اس طرح کے سب سے پہلے مترجم یہی ہیں۔ دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"اس نومشق سخن خوشہ چیں ارباب کمال راجہ مکھن لال کو مدّت سے یہ تمنّا تھی کہ عندالفرصت اپنے ترجمہ رُباعیات فارسی حضرت عمر خیام کا کہ اس بزرگ کے کلام میں سراسر حقیقت اور معرفت تر روشن کرتی ہے۔ خلاصہ اس کا زبان اُردو میں موافق اپنے استعداد کے رشتۂ تحریر نظم میں لادے اگرچہ اس راقم آثم کو اتنا سواد اور مواد زبان ریختہ میں نہیں تھا کہ ترجمۂ کلام اس بزرگ کے کہ فیض ظاہری اور باطنی اس میں متصور ہے اس مترجم کو بھی فایدہ نصیب ہو۔"

رُباعی

جب عشق ہو پستی و بلندی پھر کیا — ہے بے خردی تو ہوشمندی پھر کیا

---

[1] گلزار آصفیہ۔

رکھ طاق میں یار تو مریدی پیری — رندی میں خیال ارجمندی پھر کیا

پہلے غم ہجر گرمیٔ محفل تھا — چندے برکات شوق ہم منزل تھا
اے یار اب آکے دیکھ تربت کو مری — یہ مشتِ غبار کچھ دنوں دل تھا

جز عشق نہ کھو عزیز اپنی اوقات — زاہد سے نہ کر خراب ایّام حیات
ناجنس سے وہ بنا ہے مزار رقیب — تو طالبِ ذلت نہ وہ خواہان صفات

گذری جو کبھو بہ لطف ساقی یہ عمر — صحبت میں بتوں کے بے نقابی یہ عمر
واللہ پھر رہے گی نہ حسرت دل میں — کاٹیں گی بہ عیش و لطف باقی یہ عمر

کعبہ میں جو ہم مطیع اسلام ہوئے — یا دیر میں ہم حریفِ اصنام ہوئے
ہے ہے ہمیں کچھ اس کا نتیجہ نہ ملا — بس دیر و حرم میں مفت بدنام ہوئے[1]

مکھن لال کا جو دیوان ہے اس میں غزلیات کے بجائے ترجیع بند اور مخمس ہیں، ان میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور پنجتن پاک کی مدح ہے۔ مرثیے بھی ان کی یادگار ہیں، وہ اپنے زمانہ کی نیرنگیوں سے پریشان رہے۔ اپنے ماحول، گرد و پیش کے حالات نے ان کو دنیا سے متنفر پیدا کر دیا تھا۔ ایک مسدس میں انہوں نے اپنے زمانہ کے حالات قلمبند کیے ہیں۔

رباعیات کا نمونہ پیش ہو چکا ہے۔ اب کچھ اور کلام ملاحظہ ہو۔

ہوا ہے شیر غضنفر بند زنجیروں میں آہن کے
رکھے لا تاج شاہی سر اوپر ادبار کو دن کے
ہوئے نابود سارے بلبلاں اور پھول پھولن کے
بھرے ہیں کرگس و زاغ و زغن صحنوں میں گلشن کے

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

مچایا بوم دھوم دھام یا محبوب سبحانی

سند باد پا پالاں کے نیچے ہو رہیا نالاں
گدھے موتی کے مالے ہیں بیٹھے گل میں ہو نازاں

نبات و شکر و قند و عسل ہے قسمتِ ناداں
رہا عاقل نیں کہا خونِ جگر افسوس سے حیراں

وہ رسولؐ خاص خدا کے ہیں — وہ چراغ بزمِ ہدیٰ کے ہیں
وہ محیط صدق و صفا کے ہیں — وہ امیر ملکِ بقا کے ہیں
وہ شفیع جرم و خطا کے ہیں — وہ سپہر لطف و عطا کے ہیں

بلغ العلیٰ بکمالہٖ، کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ، صلو علیہ و آلہٖ

---

(۲۲) ذکاء محمد حبیب اللہ ذکا کی پیدائش ۱۲۴۴ھ میں مدراس میں ہوئی۔ اس کے بعد حیدرآباد آئے اور باقی زندگی یہاں بسر کی۔ ۱۲۹۱ھ میں انتقال ہوا۔
ذکا کی علمی قابلیت مسلّمہ تھی نظم و نثر میں خوب مہارت حاصل تھی۔ افسوس ہے کہ ان کا کلام اب تک جمع نہیں کیا گیا۔ متفرق طور پر بعض رسالوں میں[2] شائع ہوا ہے۔

ذکا نے غالب سے استفادہ بھی کیا۔ غالب کو بھی ان کی قابلیت کا اعتراف تھا۔ چنانچہ انہوں نے ذکا کے متعلق لکھا ہے۔

"یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں، کسی امیر کا نہیں، کسی شیخ شیاد کا نہیں، یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بہ نظر دشمن دیکھتا پس جب تملق نہیں، مدارا نہیں تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف و میل کہوں گا۔ نثر میں نعمت خاں عالی کے طرز

---

[1] محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن۔
[2] رسالہ تحفہ و ترقی شہاب۔

کا احیار کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اس سے بہتر دیا ہے۔ قصائد میں انوری کا چربہ اُٹھایا ہے، مگر طبیعت نے اچھا زور دکھایا ہے۔ غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ ذکا، سخنور، ہمہ داں و یکتا نکتہ طراز معنی آفریں، صد آفریں، صد ہزار آفریں"

غالب کی ایک درخواست جس کا مطلع۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہاں دار آفتاب آثار

ہے۔ بہت مشہور اور مقبول ہے۔ اس قسم کی ذکا کی درخواست کے کچھ اشعار نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں۔

اے خداوند کار بندہ نواز   فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی ترے آگے   گر میں چلاؤں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف   ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا   کسی صورت سے ملازم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت   جس میں درماہ ہوئے بیش قرار
ہے مری ذات میں وہ استعداد   کہ نہیں شیوا میرا استعدار
کون سا کام جو نہ دوں انجام   کون سا گھاٹ جو نہ اُتروں پار

پس ذکا دیکھی تیزی لسانی
باادب ہے یہ آصفی دربار[1]

عاقل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا   یعنی کہ میں اندیشۂ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پچھلی سے جو رخصت کی سنا دی   مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا اُمیدِ قتل
ایک کاٹھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیے

---

[1] رسالہ ترقی۔

تمام ہوگیا کام اپنا رونے رونے میں — بہانا اشک کا بس موت کا بہانا ہوا

سجدے سے سر اٹھائے تجھے دیکھتے نہیں — بندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے

---

(۳۳) ہوش [1] مرزا عبداللہ بیگ ان کے والد مرزا قاسم بیگ دولت آصفیہ کے اعلیٰ عہدہ دار تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں دیوان تصنیف کیا۔ جبکہ ان کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ ۱۲۷۶ھ میں دیوان طبع ہوا ہے [2]۔ عشقیہ غزلوں کے ساتھ اخلاقی غزلیں بھی کہا کرتے تھے۔

رفاقت دے گی کب دولت ہماری — چلی جائے گی بس تنہا سواری
ارے غافل ذرا شرماگنہ سے — جہاں تک ہو سکے کر اشک باری

پھرتا ہے ہر طرف تو جسے ڈھونڈتا ہوا
وہ جانِ جاں ہے تجھ میں ہی اے دل چھپا ہوا
محبوب گر خدا ہے تو دولت پہ کیوں ہے غش
باطل تمام اس سے تو دعوے ترا ہوا
دونوں جہاں سے ہوش اسے کچھ غرض نہیں
جس شخص کا کہ دل ہے خدا سے لگا ہوا

مال و زر کا ہے تو شیدا کس لیے — جب حق کا اس پہ دعویٰ کس لیے
مار اے دل نفس امارا کو مار — سانپ ہے یہ اس کو پالا کس لیے

آیا ہے تپ ہجر سے دم لب پہ ہمارا — اے رشکِ مسیحا خبرے گیر خدارا

---

[1] رسالہ تحفہ

[2] دیوان ہوش کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دل نالاں کے تو نالوں کو ذرا گر سن سوز اس درجہ کہاں تیرے مزامیر میں ہے

ترے واسطے ہوش نے سب کو چھوڑا مگر تجھ کو بے رحم کیا یاد ہوگا

رخ پہ گیسو کا بکھر کر نہیں آنا اچھا ابرِ خورشید درخشاں پہ نہ چھانا اچھا

اے ہوش کیوں نہ چرخ رکھے تجکو چرخ میں تقصیر ہے یہی کہ تو صاحبِ ہنر بنا

پوچھتے ہیں جو ہوش کیا ہے ان کو کچھ رحم آگیا ہوگا

وہ بولے دیکھ کر آئینہ میں رخِ روشن لگی ہے کیسی خدایا یہ آگ پانی میں

سنگ دل ہو کیسے اللہ کی پناہ مر رہا ہوں رحم کچھ آتا نہیں

یہ جاں کیوں ڈھونڈتی پھرتی ہے تن میں حضرتِ دل کو
وہ چھپ کر گیسوؤں میں اس بتِ پُرفن کے بیٹھے ہیں[1]

---

(۲۴) **عصر** میر احمد علی حضرت فیضؔ کے شاگرد اور صاحبِ دیوان شاعر ہیں دیوان ۱۲۸۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ میں قلمی دیوان موجود ہے جو نہایت ضخیم ہے جس میں اکثر غزلیں طویل ہیں۔ ۱۳۲۰ھ کے بعد انتقال ہوا۔

گل کر دیا چراغ تمنا بجھا دیا میرے طرف سے اس کو کسی نے لگا دیا
روشن رہا چراغِ کرم کا سدا دیا جو چاہا مانگا آپ سے ہم نے لیا دیا
اے عصر جانتے ہیں ہم قافیہ عروض فیضِ جنابِ فیضؔ نے شاعر بنا دیا

---

[1] دیوان ہوشؔ۔

کام کب تدبیر سے ہو جب نہ ہو تقدیر سے　　طالع بیدار میرا رات بھر سویا کیا

جلا کے لالہ رُخوں نے بنایا راک کا ڈھیر　　دھواں نہ نکلا دلِ داغدار سے باہر
غریقِ بحرِ محبت ہوں عصرؔ بعدِ فنا　　گرا نہ لاش بھی اپنے کچھار سے باہر

صدمہ فراق کا ہے مجھے وصلِ یار میں　　عالم خزاں کا ہے مری فصلِ بہار میں
کیا کام ہے ہمیں لبِ دریا کے سیر سے　　اشکوں سے اپنے رکھتے ہیں دریا کنار میں
مدفن مرا مرے لیے گلزار بن گیا　　زیرِ زمیں بھی چین سے ہوں میں مزار میں

حشر برپا ہے ان کی قامت سے　　باج لیتے ہیں وہ قیامت سے
وہی ان کا شفا کا نسخہ ہے　　بات خالی نہیں ہے حکمت سے[1]

---

(۳۵) ہم رنگ عزیز اللہ نام اور ہم رنگ تخلص تھا۔ والد کا نام میر عالم حسینی ہے اورنگ آباد کے باشندہ تھے۔ ان کے حالات کسی تذکرہ میں نہیں ہیں۔ ان کی ایک مثنوی جو "دو دولیہ" سے موسوم ہے۔ ۱۲۲۳ھ میں اس کی تصنیف ہوئی ہے۔ اس مثنوی میں نصائح ہیں جو قرآنی آیات سے اخذ کی گئی ہیں بکلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے۔ قرآن کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ اس کے قلمی نسخے ہمدست ہوئے ہیں۔

اے پرستارِ جہانِ پُرجفا　　اے گرفتارِ نگارِ بے وفا
بھول کر غافل نہ ہو یادِ وطن　　کانسی دل کی سُن اے پیماں شکن
موطن اصلی کیتی اے بوالفضول　　یاد کر یکسر گیا کیوں دل سے بھول
وہ عجب ہے شہر بانو روضیار　　جس کے آگے ہیچ ہے سقفِ سما

---

[1] دیوان عصرؔ۔

[2] تذکرہ اُردو مخطوطات۔ صفحہ ۶۳۔ جلد دوم۔

بورے اس کی خاک کے عنبر سے خوب　　پانی اس کا شہد اور شکر سے خوب

آہ صد افسوس ہے یہ زندگی　　بندگی کچھ نہیں بڑی شرمندگی
لذّت دنیا میں ہوئی سب عمر کم　　بہر عقبیٰ دل کبھو بولا نہ قم
پرورش میں نفس کے کئی ماہ و سال　　عمر ضائع سب ہوئی اندر قیل و قال
خوب کی اس نفس کے تو بندگی　　رائیگاں ہم رنگ تیری زندگی[1]

---

(۲۶) **صاف** میر حیات الدین نام اور صافؔ تخلص، حافظ شمس الدین فیضؔ کے فرزند تھے۔ شاعری کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ اپنے باپ کے انتقال کے چھ سال بعد ہی جوانی کے عالم میں ۱۲۸۹ھ میں انتقال فرمایا۔ صافؔ کا مختصر دیوان ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ ان کو اپنے باپ سے تلمّذ حاصل تھا۔ ان کے ہی دبستان سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں مشکل زمینوں میں ہیں لیکن اس سے ان کے کلام کی روانی اور شگفتگی میں فرق نہیں آیا ہے۔ اس سے ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

گل بنا ہے ساغر مل باغ میں　　پیجیئے مے بے تامّل باغ میں

یہ چار دن کی ہوا ہے بہار خندۂ گل　　نہیں ہے بادِ صبا اعتبار خندۂ گل
یہی ہے گریۂ شبنم کی وجہ اے بلبل　　نہیں چمن میں ثبات و قرار خندۂ گل
امید امید میں بلبل نے دی قفس میں جان　　ہزار حیف نہ دیکھی بہار خندۂ گل

چھوڑ کر جائیں کہاں صیّاد کو　　ہم قفس کو جانتے ہیں آشیاں

دکھ ہے الفت کے خریداروں کو　　دیکھ آیا کرو بیماروں کو

---

[1] تذکرہ اُردو مخطوطات ۔ صفحہ ۶۳ ۔ جلد دوم ۔

کہتے ہیں ہم مست پی پی کر شراب   تا ابد آباد ساقی کی دُکاں

خاکساری میں کیا ملا ہے مزا   یہ لو چھیے اپنے پائمالوں سے

نہ گُل سے کام نہ بلُبل سے کچھ غرض مجھ کو   میری بلا سے اگر موسم بہار آیا[1]

---

(۳۷) حیدر

فقیر اللہ نام اور حیدر تخلّص تھا۔ حافظ شجاع الدّین کے مُرید تھے۔ ان کی دو مثنویاں مشہور ہیں" تناول" جو ۱۱۴۴ھ میں لکھی گئی ہے۔

حیدر ایک صوفی بزرگ تھے۔ ان کی زبان میں اس زمانہ میں بھی دکنی اثر ہے جب کہ تمام دوسرے شعراء کا کلام شمالی ہند کی زبان میں نظر آتا ہے۔

"نظم انور" دو ہزار سے زیادہ شعر کی مثنوی ہے۔ اس میں چار بہنوں یعنی نرگس، سنبل، نسترن اور یاسمین کی داستان نظم کی گئی ہے۔ حیدر کے صرف دو شعر ہمدست ہوئے جو درج کیے جاتے ہیں۔

رہے پہلے توصیف یزداں اہم   تصانیف پر تو کروں میں رقم
کہ محمود حامد ہے کل کائنات   او ہے ذات اوس کی تمامی صفات

---

(۳۸) ہدایت

محمد ہدایت علی خاں نام، ہدایت تخلّص، خاندانِ آصفی سے تعلق تھا، باپ کا نام میر معزالدین خاں المخاطب شرف یاب جنگ ہمایوں جاہ تھا۔ فیض کے شاگرد تھے۔ کلیّات مرتب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ کلیّات میں غزلیات، مثنوی، مخمس، رُباعیات اور فرد شامل ہیں کلیّات شائع نہیں ہوا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

مثنوی

تیرا احمد کرنے کو جانِ جہاں   زمیں میں بھی ذرّوں کو طاقت کہاں

---

[1] مرقع سخن صفحہ ۱۰۷۔ جلد اوّل۔

تری ذاتِ اقدس ثنا سے بری ۔ بری ہے، بری ہے، بری ہے بری
کروں نعت احمد کی کہہ کر احد ۔ کہ ہے خاص وہ نورِ ذاتِ صمد
وہ ہے احمدی آئینہ سرمدی ۔ کہ دکھلا دیا صورتِ ایزدی
خودی کا کبھی مجھ کو ہوتا ہے غیب ۔ کبھی اپنی ہستی سے ہوتا ہے عیب
سو ناگاہ سودا کی حالت ہوئی ۔ خموشی سے اس دم خجالت ہوئی
یہاں تک ہوا دردِ دل جوش زن ۔ نہیں ہو سکا مجھ سے ضبطِ سخن

رُباعی

جلوہ جو دیکھے اس کے تجلیٔ نور کا ۔ ہو جائے ہوش باختہ غلمان و حور کا
طاقت کہاں ہے دیکھتے اس یار کی جھلک ۔ جس سے کہ سب پہاڑ جلا کوہ طور کا

مرا عشق جب تجھ پہ اظہار ہو گا ، تجھے درد و غم بھی تو بسیار ہو گا

میں نے غیروں کا تو سپھر گھر میں بلانا چھوڑا ۔ تو نے آنکھیں نہیں ہر آن ملانا چھوڑا

کہتے ہیں دل جلوں کی رکھتی ہے آہ تاثیر ۔ یا ربّ دُعا ہماری اب مستجاب کرنا

غم ترا ذاتِ محبّت کو ہدایت ہو گا ۔ کوئی دل سوز مؤدت نہ رہا میرے بعد

ہم قفس میں بند ہیں گلشن میں آتی ہے بہار ۔ کیوں گرفتاروں کا ناحق دل دکھاتی ہے بہار

حُسن کا پاس ادب کب عشق کو درکار ہے ۔ چاہیے عاشق کو کرنا دلبراں سے اختلاط

قاتل تو ذبح کر دھوتا ہے ہات کیوں ۔ کب چھوٹتا ہے میری لہو کی حنا کا ہاتھ

دل تو ہے صاف ترا، پر ہے کدورت لیکن ۔ تیرے کوچہ میں صنم خاک اُڑانے سے کام

ساقی دے جام ہردم میخوار ہیں تو ہم ہیں　　گر مست ہیں تو ہم ہیں، سرشار ہیں تو ہم ہیں

حیف صد حیف وہ حبیب نہیں　　سوز ہجراں کا یہاں طبیب نہیں

لگی جو عشق کی تیری کٹاری　　صنم کرتا ہوں جب سے آہ وزاری

دام زلفوں سے تو نہ کر آزاد　　گر یہ تدبیر کچھ لبھائی کی

دل کسی سے لگے خدا نہ کرے　　گر لگے تو کبھی جدا نہ کرے

دل کی صفائی مانگ ہدایت بقول درد　　آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

گلہ میں اب تو ہدایت کھلی ہے اپنی زباں　　قسم وفا کی تجھے محض بے وفا کہیے

---

(۳۹) جوہر　ملک محمود نام، جوہر تخلص، بیگن پلی علاقہ کرنول وطن، مشاہیر نوابط سے تعلق تھا، صاحبِ علم وفن تھے۔ کرنول کے والی کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ آپ کا پورا خاندان یعنی فرزند غلام حسین گوہر تخلص، پوتے غلام حیدر شہوار تخلص بھی شاعری کرتے، جوہر کا قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ ایک مثنوی اشتیاق نامہ بھی آپ کی تصنیف ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالارِ جنگ میں ہے، جوہر کے کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

چاہ میں اوس مہِ کنعاں کی جو میں ڈوب رہا
میری آنکھوں کی مدد گریۂ یعقوب رہا

قیامت کا مجھے کیا ہے ڈر اپنے دل کو اے جوہر　　بھروسہ ہے پیمبرؐ کا، بھروسہ ہے پیمبرؐ کا

بوسہ دے لبوں کا تو کہا چشم کالے لے — شکر سے بھی شیریں ہے یہ بادام محبت

آج آنے سے تیرے میرا ہوا گھر آباد — تا قیامت رہے تو اور تیرا گھر آباد

تم آؤ، بیٹھو مرے لال، لال آنکھوں میں — رکھوں گا پتلی سا تم کو سنبھال آنکھوں میں

اس چشم پر خمار میں جو ہر نہیں ہے دل — یک سوختہ کباب ہے جام شراب میں

یوں دُرِ اشک غمِ شاہ نجف سے نکلے — ایسے موتی نہ کبھو صاف صدف سے نکلے

عجب اپنی ہی ہے شکل اوس کے عشق میں جو ہر — نہ طاقت وصل کی ہے مجھ کو نہ تابِ جدائی ہے

غنچہ لب گلعذار سیمیں بر — لالہ رو سرو قد پری پیکر
شوق تیرا تو بس کہ ہے مجھکو — ماجرا اپنا کیا کہوں تجھ کو

دن تو حق میں میرے قیامت ہے — رات بھر کیا کہ ایک شامت ہے
جان پر ایسی اضطراری ہے — شکل سیماب بے قراری ہے
جی کسی جائے پر نلگتا ہے — بھس کیا دل جگر سلگتا ہے

... ...

خال عارض بھی روز تاتل ہے — جان جیسے مجھے نہ یک تل ہے
تیرے منہ تو مجھے تکیا ہے دنگ — آئینہ دیکھتا ہوا ہے ننگ
طرفۂ رُخ کے چاہ میں ہر دم — پانی پانی ہوا ہوں جوں شبنم
لب و دنداں کا رنگ کیا کہیے — موند لے اپنے مونہہ کو استے
رنگ مسّی سے یو جو ہو بس کا — کیوں نہ جی پھڑ پھڑ آوے وہاں سب کا
تیرے چاہ دقن کی چاہ مجھے — کیا کہوں کس قدر ہے آہ مجھے

وہ تیرا شوق و آرزو یکسر — لوح دل پر ہے میرے نقش حجر
یاد وہ جوشش عشق ہے تیرا — نت اس میں خیال ہے میرا
غرض اب کیا کروں کہوں کیا میں — کہہ نہیں سکتا حال اپنا میں[1]

---

(۴۰) **احسن** — سید احسن علی نام، احسن تخلص۔ مچھلی بندر وطن، حیدر آباد آکر ایک جاگیردار احمد علی خاں کا متوسل بنا، قدیم شعراء کے طرز پر گلزار مختار نام ایک ضخیم مثنوی قلمبند کی۔ اس میں حمد و نعت وغیرہ کے بعد سالار جنگ مختار الملک کی مدح، ان کی شجاعت، سخاوت، علم دوستی وغیرہ کا تذکرہ کر کے ان کی نسبت، شادی، مراسم شادی تقریبات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، یہ مثنوی اپنے عہد کے رسم و رواج اور سماجی رسومات کی گویا تاریخ ہے جو کلچر کی تشریح کرتی ہے۔ یہ مثنوی شائع نہیں ہوئی۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ احسن نے حیدر آباد میں کوئی شہرت حاصل نہیں کی۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

پلا جام مے اس طرح ساقیا — کروں سیر نقار خانہ کی جا
جلو خانہ تھا تختۂ لالہ زار — تھی گلزار قدرت کی او پر بہار
پچھیں ریت تھے اس طرح جلوہ گر — ستاروں کی جیسی چمک چرخ پر
یہ اطراف تھے ٹیٹیوں کی پھبن — کہے تو کہ لالہ کا پھولا چمن
اگر بھولے پتا پڑے کاہ کا — تو آنکھوں سے چن لے دلہن کہربا
کیے ٹیٹی باں سے بہانے بنا لے — گل و بوٹہ ابرک کے انپر چڑھائے
کہوں اور کیا ٹیٹی یوں کا میں حال — بندھے سیلے تھے سر بسر لعل لعل

... ...

خوشی سے وہ دے ساقیا جام مے — کہ ہنگام دولہ کے جلوہ کا ہے
کہے شاہ بیگم اصیلوں سے جاؤ — بلا کر وہ باجے سے دولہ کو لاؤ
کہ ہیں نیک یہ ساعتیں بس تمام — بھلا رسم جلوے کا ہوا نصرام

---

[1] اشتیاق نامہ جوہر۔ مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

یہ سن کر خوشی سے اصیلوں نے جا | محل میں جو دولہ کو لائیں مبلا
بہن ڈال آنچل کو بالائے سر | کی دولہ کو مسند پہ لا جلوہ گر
کھنچا بیچ میں پردہ زر کا جو ہیں | دولہن کو اودھر لا بٹھائے وہیں
تو میراث نے ہاتھ سے ڈھول کی | وہیں ٹونے جلوہ کے گانے لگی
وہ صندل جو دولہ کے ہاتھوں اٹھائے | بنی کے وہیں مانگ میں بسر پھرائے
وہ دولہ دُولہن کو دوپٹہ اُڑھا | دیئے مصحف و آرسی لادیکھا
ہوا جب ادا رسم وہ یا سرور | تو کیبے بیچ میں سے وہ پردے کو دُور
چبانے لگی ڈومنی جب نبات | مذاقوں سے چلنے لگے پھر تو بات[1]

---

(۴۱) شوق

غلام رسول بیگ نام، شوق تخلص، اس دور کے اسی تخلص کے شاعر کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ دوسرے شوق ہیں جن کا نام غلام رسول بیگ تھا۔ میر عالم اور مہاراجہ چندولال کے دربار ی شاعر تھے اور ان کے مشاعروں میں شریک رہا کرتے، ضخیم دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کا قلمی نسخہ جامعہ نظامیہ حیدر آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

یہ مرغ دل کیتی بس ہے جال کا کل کا | ہوا ہے دام مجھے بال بال کا کل کا

اوس شوخ کی بھولی باتوں پر نادان سمجھ تو بھول پڑا
اے شوق بہت تو پختہ تھا، کیا کام توں خام کیا

زخم سینہ کو اور گریباں کو | ہو گیا چاک پر رفو نہ کیا

حرف شکوہ کا زباں سے منہ پر ترے لائیں کیا
حال دل جو کچھ ہے اپنا ترے تیں بتائیں کیا

---

[1] گلزار مختار مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

شمشیر سے ابرو کے ہوا قتل جو کوئی — مقتول کو لازم ہے تیرے دیویں کفن سرخ

اے شوق ہے کرشمہ دلِ داغدار میں — سبزے کی جائے اوگتی ہے لالہ مزار پر

والیِ کونین ہے وہ بادشاہِ مرسلاں — شوق ہے ذات نبی سے دین و ایماں کو فیض

ہے دلبری لازم تجھے عشاق کی دلبر — منظور تو رکھ ان کی سدا پرورشِ دل

دام زلفوں کے تم جو چھوڑے ہو — آئے اب آپ کے شکار کے دن

رواں ہے فیض کا چشمہ وہ میر عالم کا — شہر میں نہر ایک جاتہ زمیں نکلی

عشق میں جو تیرے ہوئے ہیں شہید — گور دیکھتے ، نہ وہ کفن دیکھتے

قدموں کے پاس شوق کو رکھنا امام دیں — مجھ کو چھوڑا بلا سے ، بُلا کر بلا مجھے

غمِ ہجر میں مجکو ایک عمر گذری — یہ ناشاد کو شاد کر جائیے

جانِ شیریں دیا فرہاد، موا لیلیٰ پہ قیس — شوق کیا ظلم کیے ان ستم ایجادوں نے

شوق کے شعر پہ مشتاق ہو سارے شاعر — کہہ اوٹھے واہ سبھی جتنے تھے محفل والے

پانچویں دَور کی نثر

اس دور کی نظم کی ترقی میں جس طرح مہاراجہ چندولال نے مربیانہ توجہ فرمائی اسی طرح

نثر کی ترقی میں نواب امیر کبیر شمس الامراء ثانی کی سرپرستی یادگار رہے گی۔

شمس الامراء کے مورثِ اعلیٰ ابوالخیر خاں تیغ جنگ ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں آپ شاہی ملازمت میں داخل ہوئے اور خانی کے خطاب سے ممتاز کیے گئے۔ آصف جاہ اوّل کے عہد میں کارہائے نمایاں انجام دے کر اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے اور منصب چہار ہزاری دو ہزار سوار عطا ہوئے۔ نواب ناصر جنگ اور نواب صلابت جنگ کے عہد میں بھی آپ وفا شعارانہ خدمات برابر انجام دیتے رہے۔ اس زمانہ میں بھی آپ کو اعلیٰ خدمت کے صلے میں امام جنگ کے خطاب کے ساتھ جاگیر اور منصب میں بھی اضافہ ہوا۔ آخر ۱۱۲۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کے دو فرزند تھے، بڑے ابوالبرکات خاں امام جنگ اور دوسرے ابوالفتح خاں تیغ جنگ، امام جنگ کا عالمِ جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ابوالفتح خاں کو باپ کی زندگی میں بھی ابوالخیر خاں تیغ جنگ کا خطاب عنایت ہوا اور کچھ عرصہ بعد شمس الدولہ شمس الملک اور شمس الامراء کے خطابات سے سربلندی حاصل ہوئی۔ لاکھوں کی جاگیریں سرفراز ہوئیں۔ آپ اپنی شائستہ فوج کے ساتھ ہر وقت آصف جاہ ثانی کے حضور میں حاضر رہا کرتے۔ آپ کی یہ فوج جمعیت پائیگاہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ آصف جاہ ثانی کے قلم دان وزارت سے سرفراز فرمانا چاہا مگر آپ نے اس کو قبول نہ کیا اور سپاہیانہ زندگی کو ترجیح دی۔ آپ کے حسبِ سفارش نواب ارسطو جاہ کو قلمدان وزارت ملا۔ ۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو آپ نے انتقال کیا۔

اگر ایک طرف آپ نے میدان ہائے جنگ میں شجاعت اور دلاوری کے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں تو دوسری طرف داد و دہش کی بھی بہت ساری مثالیں یادگار چھوڑی ہیں۔ صداقت اور راست بازی آپ کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھا۔ آپ کے فرزند محمد فخرالدین خاں تیغ جنگ شمس الامراء ثانی امیر کبیر ہیں۔ ۱۱۹۴ھ میں آپ کی پیدائش برہان پور میں واقع ہوئی۔ والد کے انتقال کے وقت آپ نہایت کم سن تھے۔ اس وقت سے نوازشات شاہی آپ پر مبذول ہوتی رہیں۔ دامادی کے اعزاز سے مشرف ہوئے۔ لاکھوں کی مزید جاگیریں عطا ہوئیں۔ ۱۲۷۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ درگاہ برہنہ شاہ صاحبؒ (حیدر آباد) میں دفن ہوئے۔

آپ بہت بڑے علم دوست اور اہلِ علم و فن کے قدر دان تھے۔ اپنے صرفہ سے

حیدر آباد میں بیسوں مدرسے قائم کیے جن میں مدرسۂ فخریہ اب تک باقی ہے۔ ان مدرسوں میں قابل مدرسین بیش قرار تنخواہ کے ساتھ مامور تھے۔ صدہا طلبہ نے علوم نقلی اور عقلی کی دستار فضیلت باندھی۔ ہر طالب علم کے لیے وظیفہ مقرر فرمایا تھا۔ علم وفن کی ترویج کے لیے شعراء اور مصنّفین کی ہمّت افزائی کا سلسلہ بھی الگ جاری تھا۔ تصنیفات پر صلہ اس طرح دیا جاتا کہ ان کی محنت وکاوش کا پورا معاوضہ ہو جاتا۔[1]

مؤلفین ومصنّفین کے نام پر منصب اور تنخواہیں جاری فرمائیں۔ فیض، قیس، آفاق، شہرت وغیرہ آپ کی سرکار سے معقول طور پر بہرہ مند تھے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کا سب سے بڑا اور مہتم بالشّان کارنامہ جو تاریخ اُردو میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ یہ ہے کہ آپ نے ہی سب سے پہلے مغربی زبانوں سے سائنس کی کتابیں ترجمہ کرائیں۔ ۱۲۴۲ھ میں اس کام کا آغاز ہوا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ نہ تو علی گڈھ کی سائنٹیفک سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کسی اور نے اس جانب توجہ کی تھی۔

ارباب کمپنی نے بمقام کلکتہ اُردو نثر میں قصّہ کہانیوں وغیرہ کی کتابیں مرتّب کرائی تھیں یہ کارنامہ ان دنوں تاریخ ادب اُردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا ہے لیکن نواب شمس الامراء امیر کبیر نے زبان اُردو کی جو خدمت کی ہے۔ اس کا مرتبہ ان قصّہ کہانیوں کے کارناموں سے زیادہ درخشاں اور زیادہ سودمند ہے۔ شمس الامراء امیر کبیر نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں ان کی تعداد تقریباً پچھتر ہے۔ "ستہ شمسیہ" کے دیباچہ میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ نقل کرنے کے قابل ہے۔

"نیاز مند درگاہ ایزدی کا محمّد فخر الدّین خاں المخاطب شمس الامراء اس طور پر گذارش کرتا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علوم فلاسفہ کی جو زبان فرنگ میں مرقوم ہیں۔ یہ سبب میلان طبیعت کے نسبت اس طرف شوق رکھتا تھا۔ میری سماعت میں آئیں۔ اس جہت سے چند مسائل ان کے ازبر تھے اور اگرچہ بعضے علوم فلاسفہ زبان عرب وعجم میں بھی مشہور ہیں۔ چنانچہ علم جر ثقیل اور علم المناظر وغیرہ مگر اس قدر سستے نہیں کہ جیسا اب اہل فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجۂ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعض علوم اہل فرنگ میں ایسے

---

[1] گلزار آصفیہ و تاریخ رشید الدین خانی

رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سُنا چنانچہ علم آب اور ہوا۔ اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ، اس واسطے مدّت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدہ کے لیے ایسی کوئی کتاب مختصر، جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصت قلیل میں اس کے معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ میسّر ہووے۔ کس واسطے کہ اگر بڑی کتابوں کا ترجمہ ہوگا تو طالبوں کے ذہن پر اس کے مطالعہ کا بار ہوگا اور مختصر رسالوں کے دیکھنے سے ان کی طبیعت آشنائے علوم ہو جائے گی۔ پس طالبین از خود ارادہ مبسوط کتابوں کے دیکھنے کا کریں گے۔ چنانچہ ان دنوں میں حسبِ مدّعا چند رسالے مختصر علوم فلاسفہ کے بطریق سوال و جواب کے لکھے ہوئے، یووی رنٹ چالس صاحب کے انگریزی زبان میں جو ۱۸۱۸ء میں بیچ شہر لندن کے چھاپے گئے تھے، بہم پہنچے"۔

نواب شمس الامراء کے دارالترجمہ کی بعض کتابیں حسبِ ذیل ہیں :۔

(۱) اُصول علمِ حساب۔
(۲) رسالہ کسور اعشاریہ
(۳) ستہ شمسیہ۔ اس کے چھ حصّے ہیں جو چھ شعبوں سے متعلق ہیں۔
(۴) رسالہ علم و اعمال کرہ
(۵) رسالہ منتخب البصر
(۶) کمسٹری کا رسالہ
(۷) رسالہ کمسٹری۔
(۸) رسالہ خلاصہ ادویہ
(۹) نافع الامراض
(۱۰) ترکیب ادویہ
(۱۱) رسالہ حیوانات مطلق۔
(۱۲) رسالہ موتی کے چونکانے کا
(۱۳) رسالہ ارمیری۔
(۱۴) شمس العلاج
(۱۵) تعلیم الصبیان
(۱۶) فوائد الصبیان
(۱۷) افضل الادب آصفیہ
(۱۸) شمس الہیئت
(۱۹) رسالہ علم خراط
(۲۰) ہندسہ بانوتر۔
(۲۱) انوار بدریہ
(۲۲) تذکرہ رشدیہ۔

ان تمام کتابوں کی تفصیل اور نمونہ نثر ہم نے اپنی تالیف موسومہ "شمس الامراء کے علمی کارنامے" میں صراحت سے پیش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شمس الامراء نے اُردو زبان میں مغربی علوم کو منتقل کرنے کی ابتدا کی اور کئی بہترین کتابیں آپ کی وجہ سے اُردو میں

ترجمہ ہوکر طبع اور شائع ہوئی ہیں۔ اب بلحاظ سنہ اس دَور کی نثر کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔
اس دَور میں نہ صرف سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ کئی فن کی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ تفسیر، فقہ، تاریخ، سوانح، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، منطق وغیرہ ہر ایک فن کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں۔

مِصباح الصّلوٰۃ[1] مولوی قادر علی نے اس نام سے ایک کتاب عربی سے ترجمہ کی ہے جو ۱۲۳۲ھ کی مرتبہ اور فقہ حنفی پر مشتمل ہے۔ اس کی عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"انسان بالغ پر جاننا فرض کا فرض ہے اور جاننا واجب کا واجب ہے، اور جاننا سنت کا سنت ہے اور جاننا مستحب کا مستحب ہے ..... صاحب مفتاح الصّلوٰۃ نے معتبر کتابوں سے لکھا ہے کہ جو شخص کہ فرائض اور واجبات نماز کی نہیں جانتا ہے۔ نماز اس کی روا نہیں۔ شیخ ابوحفص کبیر فرمائے کافر ہوئے نعوذ باللہ ..... رکھنا ہاتھوں کا نیچے ناف کے سنّت ہے۔ کیفیت اس کی یہ ہے کہ منکٹ کو باویں ہات کی سیدھے ہات کی انگوٹھی اور کن انگلی سے پکڑ لیوے اور تین انگلیاں اپر منکٹ کی رکھے اور باطن سیدھے ہات کا اس اپر ظاہر باویں ہات کی لاوے۔"

انوارِ سہیلی[2] یہ بھی عجیب مقبول عام کتاب ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ دکن میں بھی سنہ ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء میں یہ کتاب دکھنی زبان میں طبع ہوئی ہے اس کے مترجم جن کو مؤلف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ میاں محمّد ابراہیم ہیں۔

ان کے ذاتی حالات خود انہوں نے اس کتاب کے دیباچہ میں ظاہر کیے ہیں۔

"جب میں نے اپنا عجز و انکسار بتلایا تب حضرت دل سے خطاب مستطاب ہوا کہ اے میاں محمّد ابراہیم بن ملک حسین خاں بن شیخ محمّد بیجاپوری جمعدار

---

[1] کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

[2] یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ یورپ میں متعدد مخطوطات ہیں۔ ان کی تفصیل یورپ میں دکھنی مخطوطات سے ہوسکتی ہے۔

دکھنی ہزار سواری تو نے کہا کہ اگر کسو نے مجھ سا نفیر زبان اور کثیف دوراں اس جہانِ بے پایاں میں بغور تمام ملاحظہ کیجیے تو بھی اس کا دستِ ارادت دامنِ مقصود تک نہ پہنچے اور پنجۂ مطلب رشتہ امید کو نہ اینچے۔"

چین کے ملک کے ادرس چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا اس کا نام ہمایوں فال ہور اسے ایک بڑا پکا وزیر تھا۔ اس کا نام خجستہ رائے ہمایوں فال ایک بار خجستہ رائے کو سات لے کر شکار کو گیا وہاں سوا لٹتے دھوپ پڑی تھی۔ ایک پہاڑ کی انی پو جھاڑاں تھے۔ چھاؤں کی خاطر خجستہ رائے کو سات لے کر اس چھاؤں تلے جا بیٹھا اور دیکھا تو کیا کہ ایک جھاڑ اس کا کھوڑ کا ہور بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر شہد کی مکھیاں پوتی بند نے اندر گھستے اور بہار نکلتے ہیں۔ ہمایوں فال خجستہ رائے سوں پوچھا یہ کیا ہوں گا اُنے بولیا یہ شہد کی پوتی ہے۔ بادشاہی عملاً فعلاً سگل ان کے ہاں ہے۔ جمشید نے بادشاہی کرنا ان سوں سیکھیا ہمایوں فال بولیا ارے میاں وزیر دنیا بڑی کھٹ کھٹ کی ہے اس سوں بہتر ہے کہ سب چھوڑ دے کر کونا پکڑنا۔ خجستہ رائے بولیا تمہارے سوں عالم کا بھلا ہوتا ہے۔ تمنا کونا پکڑ کو کیا نفع۔ عدالت سوں بادشاہی کرے تو دنیا میں ہور دین میں دونو جگہ بھلائی ہو۔"

خاک کو ہور گگن کو تم دیکھو	اس کو آرام ہے اور اس کو سفر
مال و دولت سفر سوں ملتی ہے	اور ملتا ہے کی سفر سیں ہُنر
جھاڑ جلتا تو اپنی جاگہ سیں	اوسے کا جور اس پہ ہور ند تیر

بائیکو بھی بولی سو یہ بات سچ ہے جس کا حق اسے ڈالنا اچھا ہے۔ ہور خدا پر بھروسہ رکھنا سوں بھلا ہے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ ہمنا دے گا۔

مرغوب الطبع[1] یہ کتاب فارسی قصّہ "کامروپ" کا ترجمہ ہے۔ جس کو سیّد حسین علی خاں نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا ہے۔ سیّد حسین علی خاں حیدر آباد کے طبقۂ جاگیرداروں میں شامل تھے۔ اپنے لڑکوں کے لیے کئی ایک فارسی قصّوں کو اردو میں منتقل کیا ہے وہ فارسی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے اور خوش نویس بھی تھے۔ عبارت کا

---

[1] ادارہ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔

نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

"ہزار ہا شکر، لکھو کھا حمد جناب حق تعالیٰ جل شانہٗ میں کہ بشر کو زینتِ نطق سے آراستہ کیا۔ واسطے ادا کرنے حمد وثنا کے۔ لیکن انسان کو کہاں طاقت ہے جو عہدہ بر آ حمد کا ہووے اور اوس کی حمد کے میدان میں قلم کے گھوڑے کو جولان دیوے ۔۔۔۔۔۔ آغاز داستان کہا بولنے والے عجائب روزگار اور داستان لینے والے نادر زمانے کے ایسی نقل کرتے ہیں کہ بیچ شہر اودھ کے جو شہروں سے ہند کے ہے اور ثانی اوس کے کوئی شہر زمانہ میں نہیں تھا۔ زمانہ گذشتہ میں وہاں کا ایک راجہ تھا۔ راج بنسی اوس کا نام تعریف اوس کے بادشاہت کی اور دولت وحشمت کی ملکوں میں مشہور تھی، اور ویسا بادشاہ دوسرا کسی ملک میں نہیں تھا۔"

چار درویش

اس کو بھی سید حسین علی خاں نے ۱۲۵۰ھ میں فارسی سے ترجمہ کیا ہے اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ اپنے فرزند ولایت علی کی خواہش اور فرمائش پر اس کا ترجمہ کیا گیا ہے چنانچہ عبارت کے نمونہ میں اس کی صراحت کی گئی ہے۔

"بندہ کو پانچ فرزند تصدق پنجتن پاک عطا فرمائے ہیں۔ بندہ ان کو اپنے حواس خمسہ جانتا ہے اور پنجگانہ میں جناب الٰہی سے اون کی صحت کی دعا مانگتا ہے ۔۔۔۔۔۔ غرض ان میں سے برخوردار نے کہا کہ بندہ چاہتا ہے کہ اس قصّے کو زبانِ اُردو میں آپ قلمبند فرمادیں کہ خواص وعام اور وضیع وشریف سمجھیں ۔۔۔۔۔۔ ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا اور خدا کا رسول، بادشاہ شہر روم اوس کا دارالسلطنت عادل، دانا اور باذل، اوس کے عہد میں باز کا مقدور نہ تھا کہ صعوہ کو بدنظر دیکھے ۔۔۔۔۔۔ وارث تاج وتخت کا کوئی اب تک پیدا نہ ہوا۔ جب اولاد نہیں تو اس دولت دُنیا کو لے کر کیا کروں۔ یہ تخت وتاج تجھ کو مبارک ہو۔ میں اس حجرہ سے باہر نہ نکلوں گا۔ جب تک اللہ تعالیٰ مجھ کو اولاد سے سرفراز کرے۔ وزیر باتدبیر نے عرض کیا۔ حق تعالیٰ سایۂ دامن دولت کو خانہ زادوں کے سر پر قائم ودائم رکھے۔"[1]

---

[1] ادارہ ادبیات اُردو میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ (۱۳۰)

ہمیشہ بہار یہ بھی اسی مؤلف سید حسین علی خاں کی کتاب ہے۔ بہار دانش کا ترجمہ ہے۔ جو ۱۲۵۰ھ میں مرتب ہوا ہے۔ اونہوں نے اس کتاب میں اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ انگریزوں کی فرمایش سے بہت سی کتابیں ہندی میں ترجمہ ہوئی ہیں لیکن اب تک شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا ترجمہ نہیں ہوا ہے اس لیے اپنے دوستوں کی فرمایش پر یہ کام انجام دیا۔ اسی سلسلہ میں اونہوں نے نواب ناصرالدولہ آصف جاہ (رابع) کی بھی مدح کی ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

حمد ثنا زبانِ بشر سے ادا نہ ہو — قاصر زباں ملائک ہفت آسماں کی ہے
اوسکی ثنا رقلم جو لکھے تاب ہے کہاں — یہ دو زباں سے خواہش اوسے سو زباں کی ہے

حمد و ثنا جناب جہاں آفرین کی زبان بشر کو قدرت نہیں جو بیان کرے اور اگر قلم جرأت لکھنے کی کرتا ہے تو زبان شق ہو جاتی ہے ...... کتاب "بہار دانش" شیخ عنایت اللہ نے زبان فارسی میں بہوت عبارت رنگیں و مسلسل و دقیق و نقلیں عجائب و کہانیاں نادر اور نصیحیں جو وزیر و امیر و حکیم و ندیم و امرا و اعیان جہاندار سلطان کے تیئں بے وفائی عورتوں کی کی بھتیں لکھیں ہیں۔ اکثر اوقات مجلس میں شغل اوس کتاب کا رہتا تھا اور سب اہل محفل کو جو بہرہ علم سے رکھتے تھے۔ بشاشت حاصل ہوتی تھی اور لاعلم اوس کی فہم کی لذت سے محروم رہتے۔ کئی صاحبوں نے کہے کہ اگر اوس کا ترجمہ زبان ہندی) سے ہو تو سب باعلم و بے علم کی سمجھ میں جو یہ کہانیاں و نقلاں جو رنگین ہیں آئیں گی اور کئی منشیوں نے بہت سی کتابیں فارسی کی بموجب انگریزوں کے ترجمہ ہندی سے جو قریب الفہم ہوتا ہے کیے ہیں ...... عہد میں مسند نشیں نواب کیوان جناب معلا القاب رستم زماں حاتم دوراں۔

ہست کیواں جناب و انجم سپاہ — زیب بخش سریر و چتر و کلاہ
جانشین سکندر ثانی — ناصرالدولہ یعنی آصف جاہ

...... مترجم اس کا سید حسین علی خاں جو زاد و بوم بھی شہر فردوس رشک ہے ...... 'ہمیشہ بہار' نام رکھا۔"

شاہزادہ بلا نصیب مجنوں کے مانند آوارہ جنگل چرانے کا ہوا شوق وصال میں قدم

مارتا ہوا۔ بہوت مشکلیں اوٹھا ایک جائے آپہونچا دیکھا کہ دریائے عظیم ہے اور پہاڑ سے موجیں مارتے ہیں اور کنارہ اس کا معلوم نہیں ہوتا اور وہ مشتاق وصال یار جاننا چاہتا تھا۔"

ستہ شمسیہ یہ رسالے جو سائنس کے متعلق ہیں۔ ۱۲۵۳ھ میں طبع ہوئے ہیں یہ وہی رسالے ہیں جو شمس الامرا امیر کبیر کے حکم سے انگریزی اور فرانسیسی سے ترجمہ ہوئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

کشش ثقل کے بیان میں

استاذ۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیت وحقیقت سے کلیہ عمدہ کی آگاہ کروں۔ جس کو کشش ثقل کہتے ہیں اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعیدہ باہمدیگر تجاذب رکھتے ہیں اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام ثقلیہ کے زمین پر۔" "تلمیذ کلاں۔ گولی کا ہاتھ سے گرنا اور اینٹ کا چھت سے ساقط ہونا اور سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا۔ یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں۔"

"استاذ۔ ہاں یہ سبب اسی قوت کے ہیں جس کو ثقیل تعبیر کرتے ہیں پس وہ اجسام جس میں کچھ بھی میل ہے۔ اگر ان کو کوئی تھامنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر قریب عمودوار گریں گے اور اس میل کو جو نتیجہ اور حاصل ثقل ہے جسم کے اجزا ہیں وزن کہتے ہیں یہیں سے ہے کہ ثقل اور وزن متفاوت ہیں۔ کیوں کہ وزن ایک جسم معین کا واسطے ناپنے وزن دوسرے جسم کے استعمال نہیں لاتے۔ جیسا وزن سنگ ترازو کا تھا برامتحان وزن غلے وغیرہ کے استعمال کرتے ہیں۔"

"ستہ شمسیہ" جس کی عبارت کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ طبعیات کے چھ شعبوں پر منقسم ہے۔ یعنی پہلی جلد میں جر ثقیل، ہیولا اور اس کے اقسام کشش اور اس کے اقسام کا بیان ہے۔ دوسری جلد میں علم ہیئت کا تذکرہ ہے، تیسری جلد میں علم آب کا بیان ہے۔ چوتھی جلد علم ہوا سے متعلق ہے۔ پانچویں جلد میں انعکاس، نور، نور کے اجزا، قوس قزح کا تذکرہ ہے۔ چھٹی جلد میں برق اور مقناطیس کا بیان ہے، غرض کے طبعیات کے کئی اہم

اصول اس میں درج ہیں۔

اس کتاب کا حجم بارہ سو صفحے سے زیادہ ہے اور چار مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ آخری مرتبہ ۱۳۱۲ھ میں دہلی میں طبع ہوئی۔ اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اُردو میں علمِ سائنس پڑھنے کا کتنا شوق ہو گیا تھا۔

جو اصحاب عصرِ حاضر میں بھی اُردو کو تہی مایہ تصور کرتے ہیں ان کے لیے یہ عمل خصوصیت سے قابلِ غور ہے۔ جب آج سے سوا سو سال پہلے سائنس کی کتابیں اُردو میں منتقل ہوتی تھیں اور اصطلاحات کی دشواری دامن گیر نہیں تھی تو اب اس میں کیوں دشواری محسوس کی جاتی ہے جو کام نواب شمس الامراء نے ۱۲۵۳ھ میں آغاز کیا تھا اس کا تکمیلہ جامعہ عثمانیہ میں ہوا۔ مگر افسوس اب جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی زبان میں تبدیلی ہو گئی۔

رسالہ اعمال کرہ

یہ کتاب بھی امیر کبیر شمس الامراء کے اہتمام سے موصوف کے دار الترجمہ میں ترجمہ ہوئی ہے مگر ترجمے نے تالیف کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس میں جغرافیہ اور ہیئت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں ۱۲۵۶ھ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ چار باب میں کتاب منقسم ہے۔ پہلے مقالہ میں تعریفات۔ دوسرے میں جغرافیہ تیسرے اور چوتھے میں ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ درج ذیل ہے :۔

"قطبین عالم دے دو طرفین محور کی ہیں کہ جہاں زمین کی سطح نے اس محور کو قطع کیا ہے۔ ان میں سے ایک شمالی ہی اور دوسرا قطب جنوبی اور مقابل ان ہی دو نقطوں کی آسمان کے دو قطب واقع ہیں۔"

"سوال۔ جون کی دسویں کو آفتاب کون کون مقام میں عمود دار رہتا ہے اور کون کون مقام میں طلوع اور غروب نہیں ہوتا۔

جواب :۔ " سندلیہ اور کلکتہ اور آدا اور مکا در جزیرہ چین وغیرہ میں آفتاب عمود دار رہتا ہے اور منطقہ بردہ شمالی میں کمنزئی اور گرین ندیہ اور کیپ میں غروب نہیں ہوتا اور منطقہ مبردہ جنوبی میں اس جگہ کو جہاں تمام بحور ہیں طلوع نہیں کرتا۔"

انیسواں زلزلہ ۱۷۴۶ء میں شہر کلوا جو پیرو کے ملک سے متعلق ہے اور اس

شہر میں پانچ ہزار سپاہی سکونت کرتے تھے۔ اسی طرح سے ہوا تھا کہ ناگاہ
وہاں کی زمین صدمہ کھانے لگی جو لوگ سوتے تھے ان کو زمین کا صدمہ معلوم
ہوا اُٹھنے نہیں پائے کہ دریا اس طغیانی سے بلند ہوا کہ اس کی موجیں اس شہر پر
سے گذریں تمام آبادی ڈوب گئی۔"

زحل کا بیان۔ یہ سیارہ مدھم روشنی سے نظر آتا ہے اور آفتاب سے بہت
دُور ہے اور باستعانت بہتر آلہ دوربین کہ اہلِ علم کو اس سیارے کی پیٹی کے
دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے اور یہ پیٹی اس سیارے کی اطراف تمام مہ
ایک حلقہ روشن ہے اور اس حلقہ کے باہر سات قمر گردش کرتے ہیں اور
ان اقمار میں سے ایک قمر اس حلقہ کی سطح پر حرکت کرتا ہے۔"

بہار دانش کی حکایتیں

بہار دانش کی کئی ایک حکایتوں کا اُردو میں ترجمہ
ہوا ہے یہ دوسرا ترجمہ ہے اس کے مترجم محمد اسمٰعیل
ہیں جن کو انگریزی فوج سے تعلق تھا اور انگریزوں کو تعلیم دیا کرتے۔ یہ ترجمہ بھی اسی غرض
سے ہوا ہے کہ انگریزوں کو اُردو کی تعلیم دی جائے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"قدیم دنوں میں بیچ ملک ہند کے ایک سوداگر بہوت بڑا ہور عمدہ تھا اوسے
چہار بیٹے تھے تین لائق ہور ایک بڑا نالائق کہ تمام دن ہور تمام رات
بیچ نشہ شراب کے مست رہتا و جشن یاری میں مشغول۔"

"بہوت پیسے باپ کی اس بدکام میں خراب کیا۔ باپ اوس کا نالائقی دیکھ
کر بہت نصیحت زیادہ حد سیں کیا۔ ہور دوسری لوگاں کی موں سے سُنی کہنی
فرمایا آخر اس کی دل میں ہرگز یہ نصیحت ماں باپ کی ہور خوشی اقربا کی سرمو
برابر اوس کی خاطر نالائق میں جاگا نہ لی۔"

"ایسا کہتی ہیں کہ گیلان کی سرحد میں ٹیک جہاری بہوت بڑی تھی اور اس
جہاری میں ٹیک تالاب بہوت عظیم تھا کہ اکثر کبی کبی اوس تالاب کی
قافلی اور ترقی تھی۔ قضای الٰہی ییک روز اس تالاب پر ٹیک قافلہ بہوت برا
کہ ہزاروں اونت اور خچر اور گھوری تھی۔ اس اونٹوں میں سے ایک اونٹ
سفید زخمی ہوکر چلنے سے رہ گیا تھا۔ قافلہ والی لاچار ہوکر اوس اونٹ کو

چھوڑکر جنگل میں چلی گئی۔"

خاتمہ

"اور اونت کو حکم کیا کہ بموجب آگی کی تمام دن چر کر رات کون دیوری پر حاضر رہو اور بادشاہ اپنے محل میں پہنچ عیش و عشرت میں مشغول ہورہا۔"

ترجمہ گلستاں اس دور میں گلستاں کے بعض ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ ان کے مترجم مختلف اصحاب ہیں افسوس ہے ہم ان کے ناموں سے واقف نہیں۔ یورپ[1] میں ان ترجموں کے مخطوطات موجود ہیں۔ بطور نمونہ کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے:۔

"کہ عاقلاں کہی ہیں جو کوئی بات جاں سیں دھودی جو کچھ کہ دل میں آدی سو کہی جب عاجز ہوتا ہے آدمی لمبی ہوتی ہی زبان اس کی کہ عاجز بلی پہلنگ مارتی ہی اوپر کتے کے بادشاہ پوچھا کہ کیا کہتا ہی یک وزیروں سیں نیک خصلت کا کہا اے صاحب ان کہتا ہی غصیکوں کہانے والی ہور تقصیر معاف کرنے والی ہور احسان کرنے والی لوک کتیں خدائے تعالی دوست رکھتا ہے بادشاہ کوں اوپر اوس کی رحم آیا ہور ارادی سیں اوس کی خون کے گذریا۔"

اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"جہاں ای بھائی نا رہی سات کسی کی دل بیچ جہان کون پیدا کرنی باریکی بند کہ بس یہی مت دی ٹیکا ہور بیت اوپر ملک دنیا کی کیا واسطی۔"

بعض اور قصے یورپ[2] میں انار رانی اور قصہ بندگا نعالی کے نام سے دو مخطوطات ہیں۔ اگرچہ ان کے مترجم کے نام معلوم نہیں مگر بلا شک وشبہ یہ بھی اس زمانہ کی نثر کا نمونہ ہے۔ اس لیے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات۔

[2] " " " "

[3] " " " "

"کہنے ہارے خبروں کے ہور عاقلاں آگے کے کہے ہیں کہ بیچ ملک ہندوستان کے ایک بادشاہ تھا کہ سخاوت اور جواں مردی اور عدالت میں مانند اس کے دنیا میں کم اور خزانے اور سونا روپا اور زر و جواہر اور اسباب و سپاہ حد سے زیادہ تھے۔"

"لاکن اوس بادشاہ کو سواری اولاد کی بیچ دل میں آرزو نہیں تھی .....
اور ہمیشہ واستے اولاد کی بیچ درگاہ خدا یتعالی کی دست بدعا تھا اور رات ہور دن یاد میں اللہ کے رہتا۔"

"جو شخص کہ اس باغ کو آتا اوس باؤلی کی طرف گذرتا اوس پھول کو دیکھ کر تورنی کی خاطر قصد کرتا لاکن وہ پھول کسے کی ہات نہیں پڑتا ایسے طرح سے یہ بات تمام شہر میں مشہور ہوئی اور رفتہ رفتہ ان چاروں شاہزادوں کوں خبر ہوئی واستے سیر کے اس باغ کون چاروں شہزادی ملکو گئے۔"

"انار رانی کو دیک کر بہت خوشی ہوئی اور چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن کی شادی بڑی دھوم سے کیے۔ بعد ازاں شہزادہ اور انار رانی باقی عمر بیچ عشق اور عشرت کی گذاری۔"

تاریخ رشید الدین خانی[1]

یہ ایک ضخیم تاریخ ہے جس کو غلام امام خاں نے شمس الامراء امیر کبیر ثالث کے حکم سے مرتب کیا ہے۔ ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب بڑی سائز کے (۷۹۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ ایک مقدمہ تین دفتر اور خاتمہ پر کتاب تقسیم کی ہے۔ مقدمہ میں راجگان ہند کے حالات دفترِ اوّل میں سلاطین دہلی کے حالات دوسرے دفتر میں اسلامی سلاطین دکن کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے دفتر میں مشاہیر کے حالات مندرج ہیں۔ اس دور کے آخر انگریزوں کا دکن میں آنا اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے جنگ کے مفصّل واقعات بیان کیے ہیں۔ اگرچہ کتاب ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی چنانچہ بہادر شاہ کے حال میں لکھا ہے:۔

---

[1] کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ راقم الحروف کے پاس بھی اس کا نسخہ ہے۔

سلطنت دہلی کو بہادر شاہ وقت کے جلوس سے ان اوراق کے تحریر تک کہ آخر ذی حجہ ۱۲۳۸ھ ہے، سولہ برس چھ مہینے پچیس دن ہوتے ہیں۔"

تاریخ کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ آصف جاہ اوّل کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"نواب چونکہ بہ نفس نفیس جمیع مقدمات مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے مگر بعض ندمانے فی الجملہ ان کے آرام کا خیال کر کے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لیے عرض کیا۔ نواب نے خدمتِ دیوانی کے لیے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ متدین کو تجویز کر کے جن کا نام راقم کو تحقیق نہیں ہوا اس عہدہ کا مژدہ ان کو پہنچایا۔ محمد ابو الخیر خاں بہادر جو ایک دُور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے انہوں نے اس کو نامناسب جانا اور شب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سپرد ہونے والا تھا۔ ابوالخیر خاں درِ دولت پر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی، نواب باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ناوقت آنے کا کیا سبب ہے؟ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا چاہتے ہیں اس بات کا خیال کرتا ہوں۔ شاہ جہاں آباد میں جب بادشاہ سلامت کو اس تقرری کا علم ہوگا تو وہ یقین کریں گے۔ آصف جاہ کبیر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہو گئے ہیں اور یہ بات نامناسب ہوگی تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں ابو الخیر خاں۔ نے عرض کیا، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ دربار کے وقت بجائے عرض بیگی کے بندہ کو اعلان کا حکم ہو فدوی اس وقت کچھ حکمتِ عملی کر گذرے گا۔ صبح کو جب اعلان کا حکم خان موصوف کے لیے ہوا تو خان موصوف نے اس معتمد علیہ کا نام زبان فارسی میں ندا کی کہ از خدمت صوبہ داری برہان پور فلاں شخص سرفرازی یافت ہر چند ناواقف لوگ معہ خدام کے کہتے رہے نہیں اعلان دیوانی کا حکم ہے مگر چوبدار نے حسبِ ایما خان موصوف جلد مجرا ادا کر دیا اور نذر پیش کرا دی۔"

اس دفتر کو غفران منزل نواب ناصر الدولہ کے حالات پر اس طرح ختم کرتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ سنہ جلوس سے ۱۲۶۹ھ کے اسی ماہ کے آخر تک نواب صاحب کی مدت سلطنت ۲۵ سال ایک ماہ گیارہ روز ہوتی ہے۔ سن

حضرت کا ۵۱ سال کا ہے"۔

تذکرہ وانوار بدریہ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے شمس الامرا، امیر کبیر ثالث بھی ایک علم دوست امیر تھے۔ آپ کے علمی کارنامے آج تک زندہ ہیں۔ نواب صاحب کو علمِ ریاضی سے خاص شغف تھا اور اس میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ یہی شوق ان کتابوں کی تصنیف کرانے کا باعث ہوا ـــــ یہ دونوں کتابیں ریاضی سے متعلق ۱۲۸۱ھ میں مرتب ہوئی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

تذکرہ :۔ " ایک روز جناب اقتدار مآب اقتدار الملک اقتدار الدولہ محمد رشید الدین خاں نواب امیر کبیر شمس الامرا نے ایسا فرمایا کہ علم ہندسہ میں کوئی نسخہ ایسا نہیں کہ جس کی تعلیم سے مبتدیوں کو فی الجملہ بصیرت حاصل ہو اور پائے شوق دراز اگر کوئی لکھے تو کیا بہتر ہے اور یادگار زمانہ نظر بریں اس ذرّہ بے مقدار شاہ علی متوطن قلعہ ادھونی نے چند اشکال ہندسی کو اس مختصر میں جمع کر کے موسوم بہ تذکرہ پیش کیا۔"

" علم ہندسہ وہ علم ہے کہ اس میں بحث ہے احوال مقادیر ثلثہ سے یعنی خط و سطح و جسم تعلیمی کہ مشترک ہیں متصلہ قار الذات ہیں جو ان کی جنس ہیں بلکہ موضوع بھی اس علم کا اور یقینیات کو پہنچایا جلی دینا۔"

اس رسالہ میں اقلیدس کی ۴۸ شکلیں ثابت کی گئی ہیں۔

نمونہ انوار بدریہ جاننا چاہیے کہ وے نسبتیں جو اقلیدس میں مذکور ہیں اگرچہ کثیرۃ فواید ہیں بہتر از شکل عروس ہیں لیکن معانی میں باوجود نزاکت ایسی قلیل ان کا الفاظ کہ جن کا سمجھنا مبتدیوں کو بغایت دشوار بلکہ منتہیوں کو بھی اس لیے ان کو اس ذرۂ بے مقدار شاہ علی ساکن قلعۂ ادھونی نے زبان ہندی میں بعبارت سلیس مع امثلہ عددی ترجمہ کیا۔"

"مقادیر دو نصف کی جو مراتب میں برابر اور نسبت میں ایسے ہوں کہ وہ مقدار میں ایک صفت کے وہ نسبتہ ہو جو ہر دو مقدار میں صفت آخر کی ہے پس اطراف ہر صفت کے نسبت دینے کو اوساط نسبت مساوات کہتے ہیں۔"

تاریخ خورشید جاہی

شمس الامراء نواب رشید الدین خاں امیر کبیر ثالث کے فرزند تیغ جنگ نواب محی الدین خاں سر خورشید جاہ امیر کبیر رابع بھی اپنے والد ماجد کی طرح علم دوست تھے۔ آپ کے حکم کی بنا پر غلام امام خاں نے تاریخ خورشید جاہی مرتب کی۔ گویا اسے تاریخ رشید الدین خانی کا تتمہ کہنا چاہیئے اگرچہ اس کی ترتیب جداگانہ ہے کیونکہ بجائے سلاطین کے حالات کے صوبوں کے حالات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے اس کے علاوہ اولیاء اللہ اور شاہان ایران وغیرہ کے سوانح حیات بھی شامل کر دیئے ہیں۔ چہاردہ سالہ کیفیت کا من ابتدائے ۱۲۷۰ھ لغایتہ ۱۲۸۴ھ مفصل بیان ہے۔ غرض بہ حیثیت مجموعی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ مقدمہ میں علم تاریخ کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد مورخ کے اوصاف ظاہر کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اس کو تعصب سے پاک اور واقعات بے کم و کاست بیان کرنا ضروری ہے۔ مدح و ذم میں افراط و تفریط نہ کرنی چاہیے بلکہ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرنا چاہیے۔ طرز عبارت سلیس، تکلفات سے منزہ، سہل الماخذ، قریب الفہم ہونا چاہیئے۔ مورخ کو ضروری ہے کہ دیانت آثار و امانت شعار ہو اس کا کلام سراپا صداقت ہو۔ اس کے افعال میں راست بازی ہو، واقعات میں عموماً اور حالات سلاطین میں خصوصاً اس کے بیان پر لوگ پورا اعتماد کر سکیں۔

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے کہ صوبہ جات کے حالات سے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ صوبہ جات ہند کو ۲۷ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے صوبہ کا محاصل خارج کا ذکر کیا گیا ہے پھر اس کی مفصل کیفیت قلمبند کی گئی ہے مثلاً صوبہ خجستہ بنیاد کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

"اس صوبہ کو ملک مرہٹہ کہتے ہیں پس زمانہ میں نظام شاہیہ کے صوبہ احمد نگر قرار پایا۔ صاحب نسخہ جدید لکھتا ہے کہ زمانہ سابق میں نام اس کا دیوگڈھ تھا اور عہد میں راجہ بھوج کے دہارا کہا کرتے تھے۔ جب فخر الدین جونا شاہ دہلی نے تمام دکن پر قبضہ کیا تو قلعہ دیوگڈھ کا نام دولت آباد رکھا۔ اور دار السلطنت اپنا فرمایا۔ بعدہٗ جب نوبت فتوحات دکن کی اورنگ زیب عالمگیر کو پہنچی۔ نزدیک ہمایوں موضع کھڑکی میں ۱۰۶۸ھ میں ایک شہر کمال

لطافت و استحکام کے ساتھ آباد کر کے نام اس کا خجستہ بنیاد اورنگ آباد رکھا۔ وہاں میوہ ہر قسم کا ہوتا ہے مگر نیشکر کمال نازک، شیریں اور بزرگ ہوتا ہے اور کیلا اور ناریل، کیوڑا اپان اور ترنج بکثرت ہیں۔ واضح ہو کہ دولت آباد ایک سنگ ہے۔ ترشیدہ سر بفلک کشیدہ اور اس کو ایسا تراشا ہے کہ اس کی صفائی سے پاؤں پھسلتے ہیں ارتفاع اس کا ۱۴۰ گز ہے۔ خندق اس کی عمیق تیس گز ہے۔ سنگ خارا میں پانی پہنچا ہے۔ کسی نے تعریف میں کہا ہے ؎

حصارے کہ مثلش ندیدہ است کس
بود قلعۂ دولت آباد و بس

چند اور نثری داستانیں

اس دور کی مختلف کتابوں کا جو نثر میں لکھی گئی ہیں۔ تذکرہ کر دیا گیا ہے اب ہم خصوصیت سے اس دور کی چند نثری داستانوں کا تذکرہ کرتے ہیں، جن داستانوں سے ہم واقف ہیں یکے بعد دیگر ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

(۱) قصہ بہرور سوداگر :۔

اس داستان کے مصنف یا مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا، زبان کے لحاظ سے اسی دور کی داستان ہے اور دکن میں مرتب ہوئی ہے۔ نمونہ عبارت حسب ذیل ہے :۔

"روایت کرنے ہارے اور خبر دینے ہارے اور کہانی بیان کرنے ہارے اپنے نقل کہی ہے کہ شہروں سے بیچ شہر ہندوستان کے سوداگر تھا۔ صاحب دولت اور خوب صورت اور بہوت نعمت اور بزرگیاں، نیکیاں میں نامور تھا نقل لائے ہیں کہ نام اس کا بہرور اور ارادہ سفر کرنے کا کیا۔"

(۲) قصہ سوداگر :۔

اس قصہ کی مترجم ذہنوبی ہیں اور اونہوں نے اس کو ۱۲۶۷ھ میں ترجمہ کیا ہے۔ اس داستان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ خانوں کی پہلی داستان ہے۔ اور دکن میں مرتب ہوئی ہے۔ اگرچہ ذہنوبی کے متعلق ہمیں کوئی معلومات ہمدست نہیں ہوئے مگر یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کو داستانوں کا شوق تھا اور اسی شوق کے مدنظر اس داستان کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

عبارت کا نمونہ :-

"روایت کرتے ہیں اور لکھنے والے یوں لکھتے ہیں کہ ملک سرندیپ میں ایک سوداگر تھا اور مال و متاع اوس کے پاس ایسا تھا کہ اوس زمانہ میں کوئی بیوپاری یا مہاجن اوس کے برابر نہیں تھا اس پر حق تعالیٰ کی عنایت سے چار بیٹے تھے ہر ایک حسن و جمال میں بے مثال تھے۔ غرض سولہ برس کی عمر میں علم دانائی و علمِ اوستادی سے کامیاب ہوا اور فن سپہ گری میں طاق ہوا اور یک دم حقِ تعالیٰ کی یاد سے تغافل نہیں رہتا تھا اور خوراک سوائے درد کائی کے کچھ نہیں کھاتا تھا اور ماں باپ اوس پر بہوت جاں نثار اور خویش سب چاہتے تھے۔ غرض تینوں بھائی اپنے بیوقوفی سے اس کے دشمنی میں تھے اور قابو ڈھونڈتے تھے کہ کوئی وقت ایسا ہمیں ملے کہ اس کو نیست و نابود کریں[1]۔"

(۳) قصہ تمیم انصاری :-

یہ داستان کئی اصحاب نے دکھنی نظم میں لکھی ہے، جن میں سے بعض کا تذکرہ اوراقِ گزشتہ میں ہوچکا ہے، یہ نثری داستان ہے جس کو سیّد محی الدین نے ۱۲۵۵ھ میں حیدرآباد میں غلام نبی صاحب خطیب مکہ مسجد کی منظوم دکھنی سے نثر میں منتقل کیا ہے۔ سیّد محی الدین صاحب کا حیدرآباد میں ۱۲۶۴ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کا اصلی وطن بہار تھا، مگر حیدرآباد آکر متوطن ہوگئے تھے۔ یہ داستان شائع نہیں ہوئی ہے اس کے قلمی نسخے کتب خانہ سالارِ جنگ میں موجود ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے :-

"ایک شب تمیم انصاری اپنی حلالہ کے ساتھ ہم بستر ہوئے بعد فراغت کے واسطے استنجا کرنے کے باہر گئے اور اپنی حلالہ کو کہا جلد گرم پانی کرو۔ اتفاقاً اس وقت وہا ایک دیو حاضر تھا اوس نے سُنا۔ تمیم انصاری کو جو حالتِ جنابت میں دیکھا اوٹھا لے گیا، ہر چند اوس نیک بخت بی بی صاحبِ عصمت نے تلاش کیا اور بہت روئی اور بلبلائی کہیں تمیم انصاری کی خبر نہ ملی۔ ہر روز، ہر شب یہی دعا درگاہِ الٰہی میں کرتی تھی، جب چار برس گذرے اور

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

قوت کی طرف سے کمال حیران پریشان ہوئی۔ اپنے بچوں کو جو چھوٹے چھوٹے تھے ہمراہ لے کر دار الخلافت میں گئی۔ وہ وقت حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہٗ کا تھا، وہ حاضر ہوئی۔ اس وقت وہاں اصحاب جناب رسول مقبولؐ کے حاضر تھے۔ عرض کی یا خلیفہ رسول اللہ چار برس ہوئے کہ خاوند میرا نمیم انصاری اصحاب رسول صلعم کا تھا، غائب ہوگیا ہے اور قوت کی طرف سے بہت عاجز و محتاج ہوں اور یہ بچے معصوم مارے فاقوں کے حیران و سرگرداں ہیں۔ کچھ خبر میرے خاوند کی معلوم نہیں کہ اب تک جیتا ہے یا مرا ہے اگر اجازت ہو تو میں دوسرا شوہر کروں اور فاقوں سے نجات پاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ نے پوچھا کہ شوہر تیرا کس وقت اور کہاں سے غائب ہوا ہے، کہی ایک شب واسطے احتیاج ضروری کے صحن خانہ میں نکلا تھا جو غائب ہوگیا ہے[1]

الف لیلیٰ اگرچہ الف لیلیٰ کے کئی ترجمے ہوئے ہیں، جن میں سے بعض دکن میں بھی ہوئے ہیں۔ زیر بحث ترجمہ دکن میں ہوا ہے افسوس ہے کہ اس کے مترجم کا نام معلوم نہیں ہوا، یہ ترجمہ سنہ ۱۲۲۰ھ کے بعد ہوا ہے۔ اسی لیے اس دور میں اس کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ میں ہے اور صرف ایک سو راتوں کی داستان ہے جو جلد اوّل سے موسوم ہے۔ نہیں معلوم کتنی جلدوں میں اس کو مکمل کیا گیا تھا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے :۔

تجب اٹھائیسویں رات ہوئی تو دنیازادے نے کہا بھئی شہزاد تھوڑی رات باقی رہ گئی ہے۔ اگر آنکھ نہ لگ گئی ہو تو کوئی بات کہہ سناؤ اتنی رات بھی کٹ جائے اور کل وعدہ بھی کیا تھا۔ اس نے شروع کیا کہ اے بادشاہ جم جاہ بغداد میں ایک پلّہ دار مجرّد تھا، جس کی شادی نہ ہوئی تھی اس کا معمول تھا کہ ٹوکرہ لے کر بازار میں جا کھڑا ہوتا تھا، جب کوئی مزدور کی تلاش میں اسے بلاتا تو وہ ٹوکرہ لے کر حاضر ہوتا، اس کا کام کر کے اپنی مزدوری مانگ

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

لیتا، پھر جا کے بازار میں کھڑا ہوتا۔

ایک دن اپنی عادت سے بازار میں ٹوکرہ لیے ہوئے کھڑا تھا، ایک عورت صاحبِ جمال، خوش وضع، خوش خصال آ کے کھڑی ہوئی۔ برقع اُٹھا کے ترچھی نگاہ سرمگیں آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کے بہت شیریں زبانی اور خوش الحانی سے کہا کہ او پلّہ دار ٹوکرا لے کر میرے پاس آ، وہ سنتے ہی لوٹ پوٹ ہوگیا۔ فوراً ٹوکرہ لے کر حاضر ہوا۔ بولا کیا سعادت کا دن ہے۔ وہ آگے یہ پیچھے ہوئے، اس نے ایک دوکان پر جا کے دروازہ کھٹکھٹایا اس میں سے ایک نصرانی نکلا۔ اس عورت نے ایک دینار دیا اور بوتلیں شراب کی لے کر ٹوکرہ میں ڈال دیں اور کہا اُٹھالے، ٹوکرہ لے کر اس نے کہا بہت اچھا، ٹوکرہ اٹھا پیچھے ہولیا، بولا، کیا سعادت کا دن ہے کیا برکت کا روز ہے، آگے بڑھ کے ایک دوکان پر ٹھہرے۔ وہاں سے سیب، ناشپاتی، انار، آلو بخارا، انجیر، لیموں اور کئی میوے اور خوشبو، چنبیلی، نرگس، گلاب، بابونہ، گل لالہ، بیلہ اور چند پھول لے کے سب ٹوکرے میں ڈال کر کہا اُٹھالے، پھر قصاب کے دوکان پر جا کر چار سیر گوشت مانگا۔ اس نے عمدہ گوشت کاٹ کر حوالہ کیا اور پانچ سیر چربی مانگی، اس نے وہ بھی دی، اس نے دام دیئے اور لے کر سب ٹوکرہ میں رکھ کر کہا اُٹھالے، اس نے اُٹھا لیا اور ساتھ ہولیا، بولا واہ واہ کیا سعادت کا دن ہے۔ آگے جا کر حلوائی کی دوکان پر جو درکار تھا لیا، لڈو، پیڑے، کھاجے، جلیبیاں، امرتیاں اور مٹھائی جو مرغوب تھا، لے کے ٹوکرے میں رکھ دیئے اور کہا پلّہ بردار اُٹھا ٹوکرہ۔[1]

اُردو میں علمی و طبّی رسائل اور ہفتہ وار اخبار کی اِجرائی

اس دور میں اشاعتِ علوم کے لیے اُردو میں علمی اور طبّی رسالے شائع ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۲۷۵ھ (۱۸۵۹ء) میں ایک طبّی سہ ماہی رسالہ جاری ہوا، اس میں یونانی اور ڈاکٹری طب کے مضامین اُردو میں شائع

---

[1] مخطوطہ کتب خانہ سالار جنگ۔

ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ حکومت آصفیہ کے مڈیکل کالج کے پرنسپل کی ایڈیٹری میں شائع ہوا کرتا تھا، اس رسالہ میں مریضوں پر عمل جراحی کرنے اور ان کے صحت یاب ہونے کی رپوٹیں اور طبی مفید معلومات وغیرہ بھی شائع ہوتے تھے۔

اس رسالہ کے چند نسخے کتب خانہ سالار جنگ اور کتب خانہ آصفیہ میں بھی موجود ہیں۔ راقم الحروف کے کتب خانہ میں بھی اس رسالہ کے دو نسخے ہیں۔ اس رسالہ کے متعلق میرا ایک تفصیلی مضمون بھی "ہماری زبان" علی گڑھ میں شائع ہوا ہے[1]۔ رسالہ کی عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"ایک عورت[2] قوم سے اہلِ اسلام کے عمر اس کی قریب پچیس سال کی ساکن قصبہ بیڑ کی نام اس کا پاپابی شہر شوال المکرم ۱۲۷۰ھ کو نزدیک اس فدوی کے آئی اور ایسا بیان کی یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے اور دن بدن ترقی پر ہے، القصہ اس فدوی نے اوّل اس بے چارہ کو بے ہوش کر کے یومول آٹری ٹرنیسکنٹ سے باندھ کر ایک امکپاسپل سے بیضاوی شکل کی مانند چیر کر پوست کو تشریح کر کر اس رسولی کو امانت نکال لیا اور ذرا بھی مادہ رسولی کا رہنے نہ دیا۔ بعد از آٹری وغیرہ کو باندکو لب زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اڈی زف پلاسٹر کے تسمے لگا دیا اور انٹی فلوجسٹک رجمٹ کے حال پر رکھا۔ چند روز میں عنایتِ الٰہی سے وہ بیمارہ درست ہوگئی اور وہ رسولی دو اونس چار ڈرام تھی۔"

"فاسفور ہیڈروجن۔ یہ بھی بے رنگ اور شفاف گاس ہے اور حیوانی مادّوں کی سڑاوٹ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی بُو ایسی ہے جیسا کہ بوشیدہ مچھلی کی بُو ہے۔ یہ گھاس بھی انسان کی جان اور صحت کو بہت مضر ہے اور اہلِ کیمیا اس کو ایسی پاکی سے تیار کر سکتے ہیں کہ تیار ہوتے ہی فوراً سُلگ کر جل جاتا ہے[3]۔"

---

[1] رسالہ طبی حیدر آباد۔

[2] " " " "

[3] رسالہ طبی جلد سوم نمبر ۱۴ ماہ رجب ۱۲۷۹ھ

رسالہ مخزن الفوائد

مولوی سید حسین بلگرامی (نواب عماد الملک) نے ۱۲۹۱ھ میں اس نام سے ایک رسالہ شائع فرمایا تھا جو علمی، اخلاقی مضامین پر مشتمل تھا۔ تاریخ، فلسفہ، سائنس ادب اخلاق وغیرہ کے اچھے اچھے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے مضمون نگار نواب محسن الملک، نواب سرور جنگ، مولوی مشتاق حسین وغیرہ اصحاب تھے۔ رسالہ جلد اوّل نمبر (۹) ماہ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کے مضامین کی فہرست نموتاً درج کی جاتی ہے۔

مضمون	مضمون نگار
صحت	سید باقر علی خان بہادر
پانی اور ہوا کا بیان	(مؤلف سید حسین بلگرامی)
اُردو معلّٰی	مرزا قربان بیگ سالک
امام مہدی جعلی	مشتاق حسین
داستان نہم نیرنگ زمانہ	آغا مرزا بیگ
سلطنت اسلامیہ	سید مہدی۔

یہ رسالہ سرکاری دار الطبع میں طبع ہوا کرتا تھا۔ مضامین کا انتخاب نمونہ کے طور پر درج ہے:۔

"میرا گمان ہے کہ یہ زبان ابتداہی میں اچھی طرح مروّج ہو جاتی مگر خاص لوگوں کی اس طرف توجہ نہ ہوئی فقط لشکری لوگ اس کے محتاج الیہ رہے بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ زبان اکبر کے زمانہ میں نکلی۔ بعض جہانگیر کے لشکر کو اس کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ فلر صاحب نے تاریخوں سے لے کر شاہ جہاں کا زمانہ لکھا ہے۔ شکسپیئر صاحب اور آلیٹ صاحب سکرتر نے اپنی اپنی تالیفات میں اکبر سے پہلے ثابت کیا ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ اُردو زبان عجموں کی نکالی ہوئی ہے۔ یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے اس لیے لشکروں میں تنہا عجم ہی نہ تھے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ پہلے یہ طریقہ عجمیوں نے نکالا۔ اپنی زبان میں عربی کی لفظ اور جملہ ملائی۔ اس صورت میں عجمی لوگ اس طریقہ کے موجد ہو سکتے ہیں نہ زبان اُردو کے۔" (اُردو معلا۔ سالک)

"یہ تو معلوم ہو چکا کہ الجزوں کے ٹھنڈے ہو کر بھاپ کی شکل میں جانے

سے ابر پیدا ہوتا ہے جب تک انجرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں۔ اس وقت تک ابر ہی ابر پیدا ہوتا ہے مینہ نہیں برستا مگر جب آمد انجروں کی زیادہ ہوتی ہے اور سرعت کے ساتھ تہہ پر جمنے شروع ہوتی ہے اس وقت پانی کے ذرّے جن سے یہ ابر مرکب ہے۔ دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے بننے لگتے ہیں اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں اور مینہ برسنے لگتا ہے۔"

ہفتہ وار اخبار

اس دور کی خصوصیت ایک یہ بھی ہے، ہفتہ وار اخبارات کی اجرائی ہونے لگی، چنانچہ جو اخبار اس دور میں جاری ہوئے وہ یہ ہیں:۔

شمار	نام اخبار	ایڈیٹر	سنہ اجرائی
۱۔	آصف الاخبار	نارائن راؤ	۱۸۷۸ء
۲۔	شفیق	سید حسن رضوی	۱۸۸۰ء
۳۔	ہزار داستان	محمد سلطان عاقل	۱۸۸۳ء
۴۔	شوکت الاسلام	حاجی فرقان	۱۸۸۳ء
۵۔	معلم شفیق	محب حسین	۱۸۸۴ء

افسوس ہے کہ ان اخبارات کے فائل ہمدست نہیں ہوئے۔

نارائن راؤ صاحب کے حالات بھی دستیاب نہیں ہوئے، یہ امر خصوصیت سے قابلِ تذکرہ ہے۔ حیدرآباد کا پہلا ہفتہ وار اُردو اخبار جاری کرنے والے ایک ہندو بزرگ تھے جن کی مادری زبان اُردو نہیں تھی، یہ صرف حیدرآباد کے ماحول کا اثر اور عوام کے ضروریات کے باعث ہے کیوں کہ عام بول چال کے علاوہ اُردو کو ادبی حیثیت بھی حاصل ہو گئی تھی اس وجہ سے جب ہفتہ وار اخبار کی اجرائی ہوئی تو وہ تلنگی یا مرہٹی کے بجائے اُردو میں ہوئی۔

سید حسن رضوی شمالی ہند کے ایک صاحبِ علم تھے، حیدرآباد آ کر انہوں نے ہفتہ وار اخبار "شفیق" کے نام سے جاری کیا، افسوس ہے اس اخبار کا فائل بھی ہمدست نہیں ہوا، اس لیے اخبار کے متعلق کوئی تفصیل نہیں کی جا سکتی۔

تیسرا ہفتہ وار اخبار "ہزار داستان" ہے، اس کے ایڈیٹر محمد سلطان صاحب عاقل تخلص کرتے تھے اور غالبؔ کے شاگردوں میں شامل تھے، مالک رام صاحب نے اپنی کتاب "تلامذہ غالبؔ" میں ان کا حال قلمبند کیا ہے۔

اخبار ہزار داستان دو سال کے بعد ہفتہ وار کے بجائے روزانہ شائع ہونے لگا جس کی صراحت صفحات آیندہ میں کی گئی ہے، چونکہ ہزار داستان کے متعلق چھٹے دور میں تفصیل کی گئی ہے اس لیے یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بہرحال اس دور میں اُردو کو جو ترقی ہوئی اس میں یہ ایک امر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو اخبارات کی اجرائی ہونے لگی۔

تبصرہ اس دَور کی نظم و نثر کا نمونہ پیش ہو چکا ہے اور کلام کا جو انداز بیان اور طرزِ ادا تھا اس کو بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ اس دَور میں سب سے اہم تغیر یہ ہوا کہ دکھنی زبان تحریر کے لیے بالکل معیوب سمجھی جانے لگی اور اس کے بجائے دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ کمال کے یہاں جمع ہو جانے کے باعث عام طور سے اسلوبِ بیان میں فرق ہو گیا۔ زبان میں صفائی کے ساتھ ساتھ تکلف زیادہ ہو گیا۔ تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جانے لگا۔ کلام میں مبالغہ ہونے لگا۔ الفاظ کے استعمال میں بھی تغیر ہوا۔ مثلاً بُلبل کو سوداؔ نے کہیں مذکر اور کہیں مؤنث باندھا ہے۔ لکھنؤ کے متاخرین یعنی آتشؔ اور رندؔ مذکر باندھتے ہیں[1]۔ سوداؔ کہتا ہے:-

سُنتے ہے مُرغِ چمن کا تُو نالہ اے صیاد
بہار آنے کی بلبل خبر لگا کہنے

آتشؔ

سیرِ چمن کو چلیے بلبل پکارتے ہیں

رندؔ

جانور کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل

اہلِ دکن کو ایک زمانہ دراز تک اکثر مؤنث باندھتے ہیں۔ مثلاً ولیؔ کہتے ہیں:-

میرے سخن کو گلشنِ معنی کا بوجھ گل   عاشق ہوتی ہے بلبلِ رنگین بیان آج

---

[1] مقدر گلشنِ ہند

مگر اس دور میں کبھی مذکر باندھتے ہیں اور کبھی مونث مثلاً خاموش کہتے ہیں :۔

بیٹھ اک جائے تو بس کر کے تصورِ گل کا　　کیوں اُڑے پھرتی ہے ہر جھاڑ کی ڈالی بلبل

فیض کہتے ہیں :۔

رتبہ معراج دیتا ہے ہراک کل جزو کو
آشیاں تک بلبل اُڑ جاتی ہے بال و پر سمیت

خاموش

گُل ہنسا تو ہنسا دیا کس نے　　رویا بلبل رُلا دیا کس نے

دَورِ سابق میں غزلوں میں تصوف کا رنگ زیادہ تھا۔ حقایق اور معارف کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اب عشق و عاشقی کی طرف طبیعتیں زیادہ مائل ہوگئیں۔ معشوق حقیقی سے سروکار نہ رہا۔ گو بعض شعراء مثلاً شاداں، فیض اور خاموش وغیرہ کی شاعری تصوف سے ہی مملو ہے مگر عام طور سے اس طرف رُجحان باقی نہیں رہا۔

اس دَور میں لوگ نثر کی جانب زیادہ متوجہ ہوگئے۔ دَورِ سابق میں صرف تصوف اور فقہ کی کتابیں لکھی جاتی تھیں تو اب تاریخ فلسفہ ریاضی، ہندسہ، ہیئت، کیمیا، طبیعات سب کچھ نثر میں لکھا جانے لگا۔ کئی داستانیں لکھی گئیں۔

اس زمانہ میں شمالی ہند میں ہنوز مقفیٰ عبارت کا دستور تھا۔ اگرچہ غالب نے اپنے خطوط سے جدید طرز کی ایجاد شروع کی تھی مگر عام طور سے اس کا رواج نہ تھا۔ اس کے برخلاف دکن میں عام طور سے مقفیٰ عبارت کا قاعدہ متروک ہو چکا تھا۔

اس دَور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انگریزی زبان سے فنون کی کتابوں کا ترجمہ ہونے لگا اور اس سے اُردو کا سرمایہ زیادہ ہونے لگا۔ ۱۲۵۳ھ میں اس قسم کی کتابیں طبع ہوئی ہیں اور سائنس کا ذخیرہ پہلے پہل اُردو میں آیا گو کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے بعد یہ کام شروع ہوا مگر سائنس کی کتابوں کا ترجمہ ہونا درحقیقت ایک کامیاب کوشش تھی۔

اس دَور میں علمی رسالوں اور ہفتہ وار اخباروں کی اِجرائی سے اُردو کی ترقی میں اضافہ ہوا اور بیش بہا مضامین عام فہم زبان میں استفادہ عام کے لیے رسالوں میں شائع ہونے لگے۔

طبیّ تعلیم نہ صرف اُردو زبان میں ہونے لگی بلکہ اس کے متعلق ایک رسالہ بھی شائع ہونے لگا۔

غرض کہ اس پانچویں دور میں اُردو کو خاص ترقی ہوئی اور گویا سن رشد کے قریب پہنچ گئی۔ اب ہم اس دور کو ختم کرتے ہیں۔

چھٹا دَور

از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۶ھ

اب ہم زبان اُردو کی ترقی کے اس دَور میں پہنچ چکے ہیں جبکہ یہ زبان عالم شباب کے ابتدائی مراحل طے کرنے میں مصروف تھی۔ اس دَور کے بڑے حصّہ میں اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں غفران مکان آصف جاہ سادس کی حکمرانی تھی اور ۱۳۲۹ھ میں ان کے انتقال کے بعد اعلیٰ حضرت سلطان العلوم آصف جاہ سابع نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی مگر جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔

اس دَور کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جبکہ سرکار آصفیہ کے دفاتر کی زبان مکمل طور پر فارسی کے بجائے اُردو قرار دی گئی۔ دکن کی اس دَور کی کشش مقناطیس نے اطرافِ ہند کے اساتذہ اُردو کو اپنے دامنِ عاطفت میں کھینچ لیا اور حیدرآباد علم و فن کا مرکز بننے لگا۔

زبانِ اُردو کو جو ترقی اس دَور میں نصیب ہوئی اس کے اسباب مختلف ہیں مثلاً اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا۔ دوسرے بیرون ملک کے اُردو کے باکمال شعراء اور مصنّفین کی سرپرستی ہونا۔ تیسرے دکن کے باکمال شعراء کا اپنے کمالِ فن سے باغِ اُردو کی آبیاری کرنا۔ چوتھے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا تالیف و تصنیف ہونا، پانچویں دفترِ علوم و فنون کا قیام اور سلسلۂ آصفیہ کا آغاز، چھٹے اخبارات اور رسائل کی اجرائی، ساتویں علمی انجمنوں کا قیام۔ یہ تمام اُمور ایسے ہیں جن کے باعث اُردو کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔

اُردو کا سلطنتِ آصفیہ کی سرکاری زبان قرار پانا

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی زبان کی ترقی

اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ زبان اس ملک کی کاروباری زبان کے ساتھ ساتھ سرکاری زبان بھی نہ ہو۔ چنانچہ انگریزی زبان ہی کو لیجیے، اس کو اس وقت تک ترقی نصیب نہیں ہوئی جب تک کہ فرانسیسی زبان کے بجائے انگریزی کا تفوق نہ قائم ہوگیا۔ زبانِ اُردو کی یہ خوش قسمتی تھی کہ سلطنت آصفیہ نے عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کی طرح اس کو اپنے دربار کی سرکاری زبان قرار دیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اولاً ۱۲۸۸ھ میں یہ مسئلہ پیش ہوا اور اس وقت صرف اتنی اجازت دی گئی کہ نظمار عدالت کی رائے ہو تو وہ گواہوں یا اہلِ معاملہ سے اظہار اُردو میں قلمبند کریں۔ اس کے بعد ۱۲۹۳ھ میں ایک قدم اور بڑھایا گیا اور نظمار عدالت کی رضامندی کی قید اٹھادی گئی اور وہ اپنی درخواست خواہ اُردو میں پیش کریں خواہ فارسی میں۔ عدالت کے ساتھ اسی زمانہ میں دفاتر مال اور بندوبست اُردو میں کر دیئے گئے۔ ۱۲۹۵ھ میں اس گشتی کے مطالب اور زیادہ وسیع کیے گئے اور حکم دیا گیا کہ فیصلوں میں بھی اظہارات بجنسبہ اُردو میں لکھے جائیں اور جب کبھی تمہید فیصلہ یا تجویز میں ان اظہارات اور عبارتوں پر استدلال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو بجنسبہ وہی عبارت نقل کرنی چاہیے جو مظہرین کی زبان سے اظہار میں لکھے گئے ہوں۔

۱۳۰۱ھ میں جب دیکھا گیا کہ دفاتر میں دو عملی ہوگئی ہے اور امسلہ میں فارسی اور اُردو مخلوط ہوجاتی ہے اور کوئی دفتر فارسی میں مراسلت کرتا ہے اور کوئی اُردو میں، کسی ناظمِ عدالت کا فیصلہ تمام تر اُردو میں ہوتا ہے تو کسی کا فارسی اور اُردو سے مخلوط۔ اس دو عملی کو دُور کرنے اور نقائص کو مٹانے کے لیے ایک خاص گشتی ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء[1] میں جاری ہوئی اور اس میں تفصیل کے ساتھ تمام اُمور کا اظہار کیا گیا اور اب تمام دفاتر مکمل طور سے اُردو میں منتقل ہوگئے۔

۲۔ بیرونِ سلطنت آصفیہ کے شعرار اور مصنّفین کی سرپرستی اس دور میں

سلطنت آصفیہ نے اُردو کی سرپرستی اس طرح بھی فرمائی کہ ہندوستان کے مشہور شعرار اور مصنّفین کو اپنے ملک میں طلب کرلیا یا ان کو ماہوار و منصب جاری فرمادی تاکہ یہ ارباب

---

[1] جریدۂ غیر معمولی سرکاری عالی مورخہ ۲۲ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ۔

کمال اُردو کے خزانہ کو مالا مال کرتے جائیں۔ اس زمرہ میں سب سے پہلے جہان اُستاد فصیح الملک، بلبلِ ہندوستان مرزا داغ دہلوی ہیں جو دربار رام پور کو خیر باد کہہ کر یہاں متوطن ہو جاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت غفران مکان آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں کی اُستادی کی عزت حاصل ہوئی اور خطاب فصیح الملک بلبل ہندوستان جہان استاد سے بجا طور پر مفخر و ممتاز کیے گئے۔ دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ قرار پاتی ہے۔

داغ کے کلام کی سادگی اور عام مذاق میں اثر پیدا کرنے والی غزلیں ہندوستان میں عام طور پر مقبول ہوئیں اور حقیقت یہ ہے کہ سادگی میں ادائی کلام وہ مزا دے جاتا ہے جو داغ اور صرف داغ کا حصہ ہے۔

شاہ نصیر کی طرح داغ بھی یہیں پیوند زمین ہو گئے۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ داغ نے یہاں بسر کیا۔ اس لیے میرا مضمون نامکمل ہوگا۔ اگر کچھ نمونہ ان کے کلام کا پیش نہ کیا جائے۔

دل لے کے اس کی بزم میں جایا نہ جائے گا
یہ مدعی بغل میں چھپایا نہ جائے گا

دونوں دشمن ہیں بشر کے آسماں ہو یا زمیں
فتنہ گر بالائے سر ہے ستمگر زیر پا

مجھ سا نہ دے زمانہ کو پروردگار دل
آشفتہ دل، فریفتہ دل، بے قرار دل

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھ کو — اور پھر ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھ کو

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغؔ نام نہیں

دی مؤذن نے شبِ وصل اذاں پچھلی رات
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا

دستِ ہوس بڑھا کر کیوں مرتبہ گھٹایا
سمجھی نہ یہ زلیخا دامن ہے پارسا کا

مدت سے لگ رہی تھی لبِ بام ٹکٹکی
تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج [1]

داغؔ کی طرح امیرؔ کو بھی حیدرآباد کی خاک کھینچ لائی۔ رام پور سے یہاں پہنچے۔ لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا سے منہ پھیر لیا۔ قالب بے جان سپردِ خاک ہوگیا۔ روح پاک نے فردوس بریں کا راستہ لیا۔

امیرؔ کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ آپ کا کمال غزلوں اور قصیدوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے اُردو شاعری میں نعت کا جس قدر مرتبہ آپ کے کلام کو حاصل ہے کسی کو میسر نہیں۔ عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا آپ کا مسدس اپنا آپ نظیر ہے۔

آہوں سے سوزِ عشق مٹایا نہ جائے گا آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

وہ بیکس ہوں نہیں ہے کوئی میرے غمگساروں میں
فقط اک دل ہے سو وہ بھی تمہارے جان نثاروں میں

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا
لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

---

[1] دیوان داغ

موباف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا　　آنچل لٹک رہا ہے عروس بہار کا

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

لاش پہ غربت یہ کہتی ہے امیر　　آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے[1]

داغ اور امیر کی طرح اُردو کے مشہور ناولسٹ پنڈت رتن ناتھ سرشار پر بھی حیدرآباد کی کشش نے کام کیا۔ سرشار کا مدتوں یہاں قیام رہا۔ کئی سال تک رسالہ "دبدبۂ آصفی"[2] کی ایڈیٹری کرتے رہے۔

پنڈت سرشار کی تصنیفات اُردو کے بہترین ناول فسانے خیال کیے جاتے ہیں مختلف طبقوں کی بول چال اور معاشرت کا دلچسپ خاکہ ہو بہو کھینچنا آپ ہی کا حصہ تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے زبردست انشاء پرداز ناولسٹ مولوی عبدالحلیم شرر کی زندگی کا بہت بڑا حصہ حیدرآباد میں بسر ہوا۔ اُردو ہی کی خدمت کے ضمن میں انہوں نے یہاں کے دائرہ ملازمت میں بھی شرکت کی۔

ان اصحاب کے علاوہ ہندوستان کے مشہور یگانہ آفاق مرثیہ نویس انیس اور ان کے قابل جانشین ہر سال محرم میں آتے اور اپنے جاں سوز مرثیے سناتے رہے[3]
رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے مشہور مضمون نگار نواب محسن الملک مولوی میر مہدی علی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین، مولوی چراغ علی المخاطب نواب اعظم یار جنگ۔ اور مولانا نذیر احمد حیدرآباد سے وابستہ تھے۔ اور مدتوں اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یہ مایۂ ناز بزرگ حیدرآباد میں اقامت گزیں رہے۔
شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے "تمدن عرب" اور "تمدن ہند" کا یہیں ترجمہ کیا۔

---

[1] دیوانِ امیر
[2] رسالہ دبدبۂ آصفی مہاراجہ بہادر کی سرپرستی میں جاری ہوا تھا۔
[3] ایشائی شاعری۔

نواب عماد الملک مولوی سیّد حسین بلگرامی اسی سرزمین میں عمر بسر کرتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔

علامہ شبلی نعمانی ایک زمانہ تک حیدر آباد میں ناظمِ علوم وفنون رہے۔ ان کی اکثر کتابیں مثلاً الغزالی، الکلام، علم الکلام، موازنہ انیس ودبیر وغیرہ یہیں عالم وجود میں آئیں ان کی تقریباً تمام تصنیفات وتالیف دولتِ آصفیہ کی علم پروری اور معارف نوازی کی مرہونِ منّت اور ان کا بڑا حصّہ سلسلہ آصفیہ میں داخل ہے۔

مولوی ظفر علی خاں نے "خیابان فارس اور معرکہ مذہب و سائنس وغیرہ کا یہیں ترجمہ کیا۔ مولوی عزیز مرزا نے سالہائے دراز یہاں زندگی بسر کی۔

نواب وقار نواز جنگ مولوی وحید الزماں نے احادیث کی کئی ایک کتابوں کا ترجمہ کیا۔ غرض ہندوستان کے ان مشہور و معروف مصنّفین اور ممتاز انشار پردازوں کی زندگی اس طرح دکن میں بسر ہوئی تو کیا ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا جنوبی ہند کی اردو کے ساتھ کوئی تعلق قائم نہیں کیا جا سکتا؟

ان کے علاوہ سلطنتِ آصفیہ نے بڑے بڑے اداروں کو گرانقدر امداد دی ہے مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ندوۃ العلماء دیوبند، اسلامیہ کالج لاہور وغیرہ۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے زمانہ میں ۱۳۳۶ھ تک جن ارباب علم کو ماہوار مقرر ہوئی یا سابقہ ماہوار میں اضافہ ہوا ان کی مختصر تفصیل یہ ہے:-

مدیر پیسہ اخبار لاہور کو سالانہ ایک ہزار، تصانیف امیر خسرو کی طباعت کے لیے پندرہ ہزار، شفقت علی خاں شاہجہاں پوری کو دوسو روپیہ، صلۂ تصنیف حبیب احمد خاں صاحب کو تصنیف کتب کے سلسلہ میں پانچ سو، عبدالرؤف صاحب شوقؔ کو مثنوی مرقع رحمت کے لیے پانچسو روپیہ یکمشت اور پانچ سو جلدوں کی خریداری کا حکم۔ سیّد سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ کی بیوہ کے لیے پانسو کلدار، فرید احمد صاحب عبّاسی کو بصلۂ تصنیف پانسو۔ بنگلور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کو دس ہزار سالانہ، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کو سالانہ چھ ہزار تصانیف کے لیے یکمشت (ایک لک مع صلہ) ایک لاکھ اکھتّر ہزار پانسو روپیہ۔

محب الحق صاحب بانکی پوری کو پانسو یکمشت اور پچاس روپیہ ماہوار۔ عبداللہ خاں

صاحب کی کتابوں کے لیے پانسو یکمشت۔ سید یٰسین علی صاحب مصنف تفسیر کو پچاس روپیہ ماہوار۔ سید محمد حسین صاحب اغلب موہانی کو تصنیفات کے صلہ میں پچاس ماہوار مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کو پانچ سو ماہوار، ظفر علی خاں کو چھ سو اور ان کے لڑکے اختر علی کو ماہانہ دو سو روپیہ۔ عبداللہ خاں صاحب کمنڈوی کو دو سو روپیہ ماہوار۔ انجمن ترقی اُردو کو وضع اصطلاحات کے لیے سالانہ تیس ہزار روپیہ کی امداد دی گئی۔[1]

اس تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ اس دور میں کس طرح شعراء اور مصنّفین کی ہمّت افزائی اور سرپرستی کی گئی ہے۔

۳۔ اس عہد کے شعراء اور ان کا کلام

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ سلاطین عادل شاہی اور قطب شاہی کی طرح اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں نے بھی اُردو میں طبع آزمائی فرمائی، آپ کا تخلص آصف تھا۔ حضرت داغ کو آپ کی اُستادی کا فخر حاصل تھا۔

آپ کو جملہ اصناف نظم پر قدرت حاصل تھی۔ علاوہ غزلیات وغیرہ کے "تعلیم فوج" "اصلاح فوج" وغیرہ کے متعلق آپ کی مختلف اور متعدد اخلاقی نظمیں ہیں۔ رعایا کے مختلف فرقوں کے سپاس ناموں کے جواب میں آپ نے اپنی سال گرہ کے موقع پر نہایت عمدہ و بے مثل نظمیں اکثر و بیشتر سنائی ہیں۔ ذیل میں آپ کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

طاعت[2] کے بعد جو ہے اطاعت کا پائے بند
دنیا و دیں میں وہ نہ کبھی ہوگا شرمسار

ماتحت مانے حاکمِ اعلیٰ کے حکم کو	یوں اہلِ روزگار کی ہو طرزِ روزگار
مالک سے کام رکھے، نہ رکھے کسی سے کام	اوس کا اسی میں نفع اسی میں ہے افتخار
لغزش نہ ہو وگرنہ گرے گا وہ سر کے بل	تھامے رہے عنانِ اطاعت کو استوار
اس کو بھی ہو یقین عنایت اسی طرح	سرکار کو ہے جیسے سپاہی کا اعتبار

---

[1] عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔

[2] تزک محبوبیہ جلد اوّل۔

رہیں ساز و ساماں سے اپنے دوست — جو ہو تیغ بجلی، تو گھوڑا پری
کرے مشق اس فن کی جس فن میں ہو — یہی آدمی کی ہے دانش وری
ہنر ور سے ہے سلطنت کا نمود — ہُنر ہی سے ہوتی ہے نام آوری
بنایا حکیموں نے تھا آئینہ — ہوی شہرت صنعِ اسکندری
جو ہو نگے قواعد میں چالاک و چپت — تو پھر کیا نہ ہوگی ہنر پروری
تمہاری طرف سے وفاداریاں — ہماری طرف سے کرم گستری

دُعا یہ ہے آصف کی اس فوج پر
رہے سایۂ دامنِ حیدری

طلبہ کو علم کے متعلق جو توجہ دلائی ہے اس کے بعض شعر بھی ملاحظہ ہوں۔

علم کی قدر کرو، قدر کرو، قدر کرو — تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبعِ سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار و رموز — دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اس کی دوا اور دوا بھی اکسیر — کہ جہالت بھی ہے منجملۂ امراضِ مقیم
طالبِ علم ذکی اور ہو استاد شفیق — کیوں پسندیدہ نہ ہو ایسی تعلم تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے — علم کی وجہ سے تھی حضرتِ لقماں بھی حکیم
قابلِ صحبتِ شاہاں و سلاطیں ہے وہی — عزت اس کی ہے جو کہلائے زمانہ میں فہیم
دین و دنیا میں جو پھیلی تو اسی کی خوشبو — مشکِ اذفر کی تہ، عنبرِ سارا کی شمیم
ایسی دولت کے لیے کوشش و محنت ہے ضرور — گرچہ تقدیر عطا جس کو کرے ربِّ کریم
یہ جو آصف نے کہا غور سے اسکو سمجھو — علم وہ شئے ہے کہ اللہ کا ہے نام علیم[1]

ایک نظم کا مطلع ہے :-

مجھ کو مبارک اور میرے دوستوں کو بھی — سامان جشنِ عیش ہے فرحت کے واسطے

اسی نظم کا آخری شعر خصوصیت سے قابلِ ملاحظہ ہے :-

آصف کو جان و مال سے اپنے نہیں دریغ
گر کام آئے خلق کی راحت کے واسطے

---

[1] تزکِ محبوبیہ۔

اخلاقی نظموں کی طرح آپ کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابلِ داد ہیں۔ اشعار کے ملاحظہ سے واضح ہوگا کہ لطفِ زبان، ترکیب کی خوبی، فصاحت مضمون، محاورات روزمرہ ہر پہلو سے لایقِ صاد ہیں۔ داغ ہی کی طرز میں آپ غزل کہتے رہے اور اس میں مشق ایسی مشق بہم پہنچائی کہ آپ کی غزل اُستاد کے ٹکر کی غزل ہوتی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر کلام الملوک ملوک الکلام ہوتا ہے۔

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہاتھ
واہ واہ وزدِ حنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

فاتحہ پڑھتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن ۔۔۔ جب میرا دستِ ہوس قبر سے باہر نکلا
مل گئیں خاک میں کیا میری وفائیں ظالم ۔۔۔ حرفِ انکار زباں سے ترے کیوں کر نکلا
واہ کیا لطف ہوا وصل کی شب ان کے قریب ۔۔۔ غیر سے وعدہ کا کاغذ سرِ بستر نکلا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف
وہ شاہِ حسن سہی، شہر یار ہم بھی ہیں

واہ اے شانِ کریمی ترے صدقے قرباں ۔۔۔ جس گنہگار کو دیکھا وہ گنہگار نہ تھا
لیجئے غیر سے دو دن بھی نباہی نہ گئی ۔۔۔ آپ کے ذہن میں آصف تو وفادار نہ تھا

لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر ۔۔۔ اڑ کر غبار سامنے دیوار ہوگیا

لو اور سنو کہتے ہیں وہ دیکھ کے مجھ کو ۔۔۔ یہ شخص بلاشبہ ہے دیوانہ کسی کا
آصف کا ہے یہ قول سُنیں صاحبِ غیرت ۔۔۔ احسان نہ لے ہمتِ مردانہ کسی کا

وصل میں تلخ بھی دشنام مزا دیتے ہیں ۔۔۔ کوسنے والوں کو ہم دل سے دُعا دیتے ہیں
ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں ۔۔۔ مرد جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھا دیتے ہیں

ان حسینوں سے کوئی خون کا دعویٰ نہ کرے — خوں بہا دیتے نہیں خون بہا دیتے ہیں

رہے ہر دم میں ہر دم یاد تیری — جدھر دیکھوں ادھر بس تو ہی تو ہو
مقابل یوں ملے جب حسن کی داد — ادھر یوسف ادھر بے پردہ تو ہو

یہ دل آشنا اور وہ نا آشنا ہے — بھلوں سے بھلا اور بُروں سے بُرا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا تو کیا ہے — زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزا ہے — یہ شیشہ دھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
کریں بت کدہ سے عبث قصد کعبہ — یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر — زمیں فتنہ گر ہے فلک فتنہ زا ہے
یہ کافر حسیں اک جگہ جمع ہوں گے — جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے
بہت دُور ہے منزلِ دوست اے دل — جو یہ طے ہوئی پھر خدا ہی خدا ہے
ہمارے بھی ہے امتحاں میں یہ آصف — لگانا ہی دل کا سراسر خطا ہے

محشر میں کون دوست ہو مجھ داد خواہ کا
دل اپنی راہ کا ہے، جگر اپنی راہ کا
پانی بہا سکے، نہ زمیں جذب کر سکے
قاتل چھپے گا خون نہ مجھ بے گناہ کا
جب آئے وہ خیال میں آئے نہ خواب میں
دشوار نازکی سے ہوا پھیر راہ کا
یہ ہاتھ سے چرائے تو وہ آنکھ سے چرائے
دزدِ حنا سے چور ہے بڑھ کر نگاہ کا

چھٹے دَور کی منظم

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے کہ اس دَور میں ۱۳۲۹ھ تک مرحوم اعلیٰ حضرت غفران مکان کی حکمرانی رہی اور ۱۳۲۹ھ میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے عنانِ حکومت سنبھالی۔

اس دَور کے شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں سے ایک حصّہ تو ایسے شعراء کا ہے جن کا انتقال ۱۳۲۹ھ یا اس سے قبل ہوا اور دوسرے شعراء وہ ہیں جنہوں نے یا تو ۱۳۲۹ھ کے بعد انتقال کیا ہے۔ یا وہ ساتویں دَور میں بھی زندہ ہیں ہم دونوں کی تفصیل علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔

شعرائے عہد محبوبی

اولاً ان شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جن کا انتقال ۱۳۲۹ھ کے قبل یعنی مرحوم اعلیٰ حضرت غفران مکان کے عہد میں ہوا یا ان کی زندگی کا بڑا حصّہ اس زمانہ میں گذرا ہے۔

(۱) اقبالؔ

معین الدین نام، اقبالؔ تخلص اور اقبال یار جنگ خطاب تھا۔ ایک عرصہ تک کشنر انعام کے معزز عہدہ سے ممتاز رہے۔ اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع اور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی اتالیقی کا فخر بھی حاصل ہوا تھا۔ علمی قابلیت مسلمہ تھی۔ شعر و سخن کا خاص مذاق تھا۔ ۱۳۲۱ھ میں انتقال ہوا۔

دے کے جاں لعل لبِ یار کا بوسہ لیں گے
اتنی قیمت پہ بھی سودا یہ بہ مشکل ٹھہرا

باغِ جنّت میں بڑے لطف سے کٹ جائیگی
اپنا معشوق جو وہ حور شمائل ٹھہرا

ناتواں قیس میں اب طاقتِ رفتار نہیں
اپنا ناقہ کہیں اے صاحبِ محمل ٹھہرا

بڑھ گئی حد سے شبِ وصل میں گستاخیٔ شوق
روکا ہر چند ادب نے نہ مرا دل ٹھہرا

اشک آنکھوں سے جو بہہ جاتے تو طوفاں ہوتا
جوشِ سیلاب مگر تا لبِ ساحل ٹھہرا

اپنا دل مشق صفا سے ہو منوّر آئینہ
اونکا عکسِ رُخ ہو آئینہ کے اندر آئینہ

دیکھے گر ساقِ بلوریں کو نگاہِ صاف سے
بالیقیں ہوجائے خود حیران و ششدر آئینہ

بوسہ جب اقبال نے مانگا تو اک انداز سے
ہنس کے فرمانے لگے ہوگا مکدر آئینہ

حیف یاروں نے پسِ مرگ رفاقت چھوڑی
ساتھ ہیں اپنے فقط حسرت و ارماں اب تک
سرکشوں کے لیے راحت نہیں دنیا میں کبھی
نہ تھما ایک جگہ گنبدِ گرداں اب تک

ہے دمِ مرگ بھی دل میں ترے اُلفت کا خیال
گھر میں مہمان کے موجود ہے مہماں اب تک[1]

---

(۲) باقی گردھاری پرشاد المتخلص بہ باقیؔ: راجہ محبوب نواز ونت بہادر خطاب تھا۔ خاندانی امیر تھے۔ شاعری کا خاص مذاق تھا۔ فیضؔ کے شاگرد تھے اُردو اور فارسی کلام شائع ہوچکا ہے۔ اُردو دیوان جو" بقائے باقی "کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ مختصر ہے مگر کلام کی خوبی کے باعث ممتاز ہے۔ دیوان کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

توشۂ آخرت، کیشو نامہ، لغت افضل التصحیح، قصائد باقی کلیات، یادگار باقی دیوان بقائے باقی، مثنوی صنائع البدائع، بہار عام، پرنس نامہ، مکتوبات منظوم ضرب الامثال آئینۂ سخن، پیرایۂ عروض، کنوز التواریخ، تنبیہات باقی وغیرہ۔ ۱۳۱۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ شستگی، سلاست، برجستگی، ان کے کلام کے جوہر ہیں، ان کے کلام میں لکھنؤ کے شعراء و متاخرین کا رنگ نظر آتا ہے۔ محاورہ اور روزمرّہ کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

آگ دیتا ہوں جگر کو دل سے حقِ ہمسایہ ادا کرتا ہوں

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم۔
[2] تزک محبوبیہ و تذکرہ شعرائے دکن ملکاپوری۔

آہ سوزاں ہو اگر شعلہ فگن پانی میں
آگ کی طرح سے پیدا ہو جلن پانی میں

نئے صدمے اسے دیتے رہیں گے — ابھی دل کا کریں گے امتحاں ہم

بوسے اوس لب کے لیا کرتا ہوں — مرضِ دل کی دوا کرتا ہوں

ایک گل میں بھی نہیں بوئے وفا باقی ہے
ان دنوں گلشنِ عالم کی ہوا بدلی ہے

گوشۂ عزلت میں رہتا ہوں میں عنقا کی طرح
خلق میں شہرہ ہے گمنامی سے میرے نام کا

---

(۳) اشہر

مرزا غلام سجّاد نام، اشہر تخلص، ان کے اجداد قطب شاہی عہد میں طہران سے آئے تھے۔ آصفی عہد میں بھی جاگیر سے سرفراز کیے گئے اشہر کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق گھر پر عربی فارسی کی تعلیم پائی۔ اوائل عمری سے شاعری کا شوق ہوا۔ منشی تفضّل حسین عطا کے شاگرد ہوئے، عطا حضرت فیض کے ہم عصر اور بلند پایہ شاعر تھے۔ اشہر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتے۔ جملہ اصنافِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تھی۔ مرثیہ گوئی کی خاصی مشق تھی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہوں کشتۂ رفتار کسی آفتِ جاں کا — دینا مرے لاش کو کفن آبِ رواں کا
اس ماہ کی فرقت نے کیا ہے مرا دل چاک — احباب کفن دیں مرے لاش کو کتاں کا
رہنے دے مجھے کوچۂ دلدار میں واعظ — مشتاق میں حوروں کا ہوں نے باغ جناں کا
سینہ پہ لحد میں بھی کسی من کا ہے پتھر — آرام پس از مرگ بھی قسمت میں کہاں کا

پھر فصلِ بہار آئی ہے اے بلبلِ شیدا
پھر لطف ہے اب نوحہ و فریاد و فغاں کا

ابرو پہ نہ بل آئے اگر دل پہ لگے زخم
تیر و تبر و خنجر و شمشیر و سناں کا

وہ سو گئے جا کر لحدِ تنگ میں آخر
شکوہ جو کیا کرتے تھے تنگیٔ مکاں کا

دل نے مجھے رسوائے جہاں کر دیا کمبخت
بیٹھا مرے پہلو میں تھا دشمن یہ کہاں کا

جنّت میں پہنچتے ہی جواں ہو گئے اشہر
اللہ رے تشوّق تمہیں حورانِ جناں کا

مرثیہ کا کچھ نمونہ یہ ہے :-

سجادہ سے ابھی نہ اُٹھے تھے شہِ اُمم
مشرق سے مہر کا جو چمکنے لگا علم

فرمایا غازیوں سے یہ شہ نے بصد حشم
کمریں کسیں مجاہدِ راہِ خدا بہم

مشتاقِ جنگ اسلحہ تن پر سنوار لیں
غافل بھی کوئی ہو تو صدا دیں پکار لیں

جس وقت ہو چکا علمِ پاک جلوہ گر
گردن اُٹھا کے فوج پہ حضرت نے کی نظر

دیکھا کہ دست بستہ جوانانِ پُر جگر
باندھے سلاحِ جنگ کھڑے ہیں اِدھر اُدھر

اپنے مقامِ خاص پہ حق کا ولی نہیں
موجود ساری فوج ہے لیکن علی نہیں[1]

---

(۴) پاس[2] محمد حفیظ الدّین نام، پاسؔ تخلّص، حضرت فیضؔ کے شاگرد تھے۔ سرکار عالی کے سلک ملازمت میں شامل تھے۔ تحصیلداری کی خدمت کے بعد وظیفہ پر علیحدہ ہوئے، اپنے وقت کے بہت اچھے شاعر تھے۔ استاد کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے، مطالب سے زیادہ الفاظ اور طرزِ ادا پر زور دیتے تھے۔ تشبیہ اور استعارہ کو شاعری کی جان قرار دیتے ہیں۔ بڑے پُر گو شاعر تھے۔ ۱۳۳۱ھ میں انتقال ہوا۔

جنّت میں کب نصیب ہیں دنیا کی لذّتیں
زاہد کی بندگی کو ہمارا سلام ہے

---

[1] مرقعِ سخن جلد دوم صفحہ (۱۲۷ تا ۱۲۳)

[2] تزکِ محبوبیہ۔

اے پاسس علم شعر تو دشوار ہے مگر — موزوں طبیعتوں میں ہمارا بھی نام ہے

ہے دل میں بے شمار غم و حسرت و اَلم
اس مختصر مکان میں کیا اژدہام ہے
وہاں قید ایک دل تھا یہاں سینکڑوں پھنسے
زلفوں سے بڑھ کے حضرتِ واعظ کا دام ہے

اس مہروش کے حسن نے دھبہ لگا دیا — جاتا ہے داغ بھی کہیں رخسارِ ماہ سے
کشتہ کیا نگاہ نے آنکھوں کے سامنے — ثابت ہوا ہے قتل مرا دو گواہ سے
ہم مثلِ نقشِ پا جو زمیں پر گرے تو کیا — وہ دیکھتے نہیں کبھی نیچی نگاہ سے
بدلی کو دیکھتے ہی بدل جائے گا مزاج — کب تک بچیں گے حضرتِ زاہد گناہ سے

قتیلِ تیغ تبسم تو ہم ہوئے لیکن — کسی نے ہنس کے نہ پوچھا کہ سر یہ کس کا ہے[1]

---

(۵) نقش نصیر الدین نام، نقش تخلص، شمس الدین فیض کے شاگرد تھے، حیدر آباد وطن تھا، فیض کے شاگردوں میں جن اصحاب کو امتیاز حاصل تھا، ان میں نقش بھی شامل تھے۔ سنہ۱۲۶۰ھ میں تولد ہوئے۔ فارسی اور اُردو کی بارہ تیرہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، ایک تذکرہ شعراء "عروس الاذکار" کے نام سے لکھا تھا، جو نایاب[2] ہے۔
نقش کی وفات کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہوا، ۱۳۰۱ھ تک بقید حیات رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ نقش اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، دیوان مرتب کیا تھا

بتوں کے عشق میں اللہ سے شرمار ہا ہے دل — کہ ہے غیرت فزائے تجلۂ یوسف حجاب اس کا

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم۔

[2] رسالہ اُردو جنوری ۱۹۵۶ء۔

زلفِ سیہ کا اوس کی ہے تار تار سودا
ہے حسبِ حالِ میرے اک سر ہزار سودا

نکل گھر سے اگر ہے طالبِ قدر — کہاں قیمت صدف میں ہے گہر بند

ہے وہ آب اس ابروئے خمدار پہ — مار دے تلوار کو بھی دھار پر

میرے نالہ کو اثر ہے کہ نہیں — نخلِ ماتم کو ثمر ہے کہ نہیں

اسی ٹٹی کی آڑ دل میرا — کھیلتا ہے شکار پہلو میں

جانِ شیریں عشق میں کھوتا ہے کیا — سنگ مثلِ کوہ کن ڈھوتا ہے کیا
جو صبا کرتی ہے خاک اپنی خراب — بال بیکا زلف کا ہوتا ہے کیا
تیر گی ہو، محو دل غفلت نہ کر — جھٹ پٹے کا وقت ہے سوتا ہے کیا

ترے رُخ سے زلفوں کی یوں میل ہے — کہ سورج مکھی پر امر بیل ہے

اوس کی زلفوں میں پھنسا ہے جو مثالِ شانہ
دیکھتا ہوں دلِ صد چاک سے حالِ شانہ

وصفِ زلفِ دراز میں اوس کے — قینچی کی طرح ہر زبان چلے

---

(۶) جوشش[1] — حکیم وزیر علی نام، جوشش تخلص اور سلطان الحکما رخطاب تھا۔ جس طرح طب میں ماہر تھے اسی طرح شاعری میں کمال رکھتے تھے۔

---

[1] تزکِ محبوبیہ۔

شہید دہلوی سے تلمذ حاصل تھا۔ آپ کا دیوان اور ایک مثنوی شائع ہوئی ہے۔ ۱۳۲۷ھ میں انتقال ہوا۔

میں ہوں مدت سے آشنا تیرا — جان و دل سے ہوں مبتلا تیرا
ہاتھ پائی ہوئی کسی سے مگر — چاک ہے دامنِ قبا تیرا
مجھ کو دیتا ہے گالیاں ناحق — سچ تو کہہ کیا بُرا کیا تیرا
توں تو اک بار بھی نہ یاد کیا — جوشؔ بھرتا ہے دم سدا تیرا

غیروں پہ کرو لطف و عطا اور زیادہ
یہاں اوس کے عوض ہم پہ جفا اور زیادہ
ضد اوس کی سمجھتے تھے لڑکپن کا ہے باعث
وہ شوخ جوانی میں ہوا اور زیادہ
سمجھا تھا تسلّی تیرے نظارہ سے ہوگی
دیکھے سے ہوا شوق مرا اور زیادہ
میں نے جو وفا اپنی بیاں کی تو وہ بولا
اے جوشؔ نہ حق اپنا جتا اور زیادہ

---

(۷) خرّم

سیتل پرشاد نام اور خرّمؔ تخلص تھا۔ کائستھ سکسینہ قوم سے تھے آپ کے اجداد کرا مانک پور سے آئے تھے۔ ۱۲۳۹ھ میں ولادت ہوئی۔ فارسی میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ حضرت فیضؔ کے شاگرد تھے۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۳۰۰ھ کے اوائل میں انتقال ہوا۔

جس کو دیکھو آشنا ہے دولت و اقبال کا
بے کسی میں کون ساتھی ہے کسی کے حال کا
میں شرابی ہوں لبِ میگوں کا بوسہ دیجیے
کیا میں افیونی ہوں جو دیتے ہو بوسہ خال کا

میں نے تو سر دے دیا، دل دے دیا اور جان دی
تم بھی کچھ دے دو تصدق حُسن کے اقبال کا

مجنوں چلا گیا یوں ہی لیلیٰ کے شہر تک   حالِ فراق کہتا ہوا ساربان سے

قبر میں بھی لخلخہ ہے یار کا   خاک بھر دوں فرشتوں کو جواب

بگولہ میری مٹی کا اُڑا جاتا ہے گردوں تک
کہ بعد مرگ بھی مجھ کو تلاشِ نام دلبر ہے

خجالت سے ہوا خورشید کا رُخ زرد اے خرّم
لگایا اس بتِ مہوش نے جب ماتھے پہ کوکو کو

چلاتے کیوں ہو مجھ پر آپ ہر دم تیغ ابرو کو
نہ ماریں ناتواں پر لٹ لپٹیں اپنے گیسو کو

نہ دل دیجیے گا غیروں کو بہت پچتاؤ گے پیارے
یہ ہیرے پر کی چڑیاں ہیں، یہ شکر کے کوڑے ہیں[1]

---

(۸) رنج | میر محمّد علی المتخلص بہ رنج، میر عالم بہادر کے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ ۱۲۶۰ھ میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ حضرت داغ سے تلمذ حاصل تھا۔ عربی فارسی کے ساتھ انگریزی سے بھی واقف تھے۔ سالار جنگ ثانی وزیر اعظم

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم (دفتر ۷ صفحہ ۵۷)
[2] تزک محبوبیہ یادگار ضیغم۔

کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ دیوان شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام پیش ہے :۔

کرتے ہیں اب وہ غم مرے غم کا   شکر پروردگار عالم کا
دل نے بھی مجھ سے بے وفائی کی   کیا کرے کوئی ایسے ہمدم کا
جس کو حبِ ابوتراب ہے رنج   خوف اس کو نہیں جہنّم کا

ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہے ہم کو   جوانی کسی کی، لڑکپن کسی کا
مجھے اپنے رونے کا رونا ہی ہے   کہیں تر نہ ہو جائے دامن کسی کا

عیش کے لطف میسّر مجھے اس دن ہوتے
وہ نو پہلو میں مرے دو بُتِ کم سِن ہوتے

راحت و آرام دُنیا میں کہاں   قید خانہ ہے یہ مومن کے لیے

کوچۂ یار کی ہے وہ عظمت   بادشاہوں نے بھی گدائی کی

دل اور جگر دونوں تڑپے جو شبِ فرقت
کچھ اس کو سنبھالا ہے کچھ اس کو سنبھالا ہے

---

(۹) رمز

بہاری لال المتخلص بہ رمز، ان کے اجداد دہلی سے آئے تھے۔ رمز کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی۔ حضرت فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ فیض کے انتقال کے بعد مجذوب ہو گئے۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ حالتِ جذب ختم ہو گئی۔ کیوں کہ آپ نے چھیاسٹھ سال کی عمر میں اپنے استاد فیض کے حالات قلم بند کیے تھے۔ ۱۳۲۵ھ میں انتقال ہوا۔ ترک علی شاہ ترکی نے ان کے انتقال کے متعلق لکھا ہے کہ فیض کے عرس میں مشاعرہ ہو رہا تھا اور رمز اپنا کلام سُنا رہے تھے۔ جب ذیل کا شعر پڑھا گیا اس وقت رمز کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

چو دل شد مستقل کن ہر چہ خواہی　　کنوں گویم چہ رمز ایں کن کہ آں کن

رمزؔ اُردو، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ کلیات طبع نہیں ہوا ہے۔ سات ہزار سے زیادہ شعر ان کے طبع زاد ہیں۔ کلام سے واضح ہوگا کہ ان میں بے ساختگی ہے۔ تصنع اور آورد نہیں ہے۔ کہتے ہیں بعض مرتبہ ایک رات میں سو سو شعر موزوں کر دیتے تھے۔

عاشق نہیں دُنیا میں کسی رشکِ چمن کا
گل خوردہ ہوں میں عارضِ سبزان دکن کا

جواہر میں تُلے گا یہ فسانہ عشق کا میرے
چھپے گا بعد میرے قصہ بن کر لعل و گوہر کا

خلاقِ لامکاں میرے دل میں مکیں ہوا　　بیت الحزن مقابلِ عرشِ بریں ہوا

ہیں جذب میں اور حال ہے مستانہ ہمارا　　لبریز مئے عشق ہے پیمانہ ہمارا

پھری آنکھ ہم سے جب اے یار تیری　　تو چشمِ زدن میں گیا پھر زمانہ
تری بے وفائی نے کی یہ نصیحت　　کسی سے نہ زنہار دل کو لگانا

ہے شام و سحر یوں مجھے تقدیر سے جھگڑا　　جیسا کہ ہو دیوانے کو زنجیر سے جھگڑا

یار تو محفل سے اُٹھ کر کیا گیا　　شمع کے اوپر اندھیرا چھا گیا

---

(۱۰) **شعلہ**　　میر کاظم علی خاں شعلہ، رجب ۱۲۵۲ھ میں آپ نے حیدر آباد میں ولادت پائی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی میں بھی

لہ تذکرہ شعرائے دکن ملکاپوری۔ تزک محبوبیہ۔ یادگار ضیغم۔

مہارت تھی۔ اپنے والد میر احمد علی خاں شہید سے ہی تلمذ حاصل تھا۔ شہید مہاراجہ چندولال کے زمانہ میں امیر الشعراء سے ملقب ہوئے تھے۔

شعلہ کا کلام فصاحت و بلاغت اور لفظی و معنوی صنائع اور بدائع سے مرصع ہوتا تھا۔ سرکار عالی کی سلک ملازمت میں داخل تھے۔ عدالتِ فوجداری سے تعلق تھا۔ ۱۳۰۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دو فرزند تھے۔ سید نوازش علی لمعہ اور سید نادر علی رعد جن کا حال آگے آتا ہے۔

گر وصل بھی ہو جاتا، اک بار تو کیا ہوتا
دامن مجھے قاتل کا دامانِ قضا ہوتا

وہ شوق شہادت ہے سو بار اگر مرتا
قاتل ہی کی جانب کو لاشہ بھی پھرا ہوتا

کیوں رشتہ محبت کا توڑا ہے عبث ظالم
یوں قتل کیا ہوتا کچھ تسمہ لگا ہوتا

پائی نہ شہادت جب دعویٰ ہے دیت کا کب
گر خون بہا ہوتا تب خون بہا ہوتا

اے ابرِ کرم گر تو رحمت سے برس جاتا
یہ مشتِ غبار اپنا ہرگز نہ اُڑا ہوتا

سنتے کہ نہ سنتے وہ، کہنا تھا ہمیں لازم
آتے کہ نہ آتے وہ شکوہ تو کیا ہوتا

اس شعلہ بھبوکہ کی شب کو جو کہیں زلفیں
سورہ کو دخاں کی دم لے شعلہ کیا ہوتا

ہوس میں بوسۂ لب کی اگر مروں گا میں
تو بعدِ مرگ رہے گا کھلا کفن میں دہن

جو شب کو چہرہ میرے رشکِ ماہ کا چمکا
چھپا یا ماہ نے اپنا وہیں گہن میں دہن

زبان خمسہ نظامی کی ہو گئی شعلہ
ہوا جو بار مرا وصفِ پنجتن میں دہن

سنگدل میرے گل اندام کو کہتے ہیں جو لوگ
ان کے ہو جائیں زبان اور دہن پتھر کے

---

(۱۱) شایق

میر[1] اعظم علی نام اور شایق تخلص تھا۔ حیدر آباد کے امیر اور مولویانہ گھرانے سے تھے۔ عمدۃ العلماء نواب محبوب نواز الدولہ کے نواسے

---

[1] تزک محبوبیہ۔

تھے۔ ایک عرصہ تک عدالت دار القضاء کے ناظم رہے۔ عربی اور فارسی میں ید طولے رکھتے تھے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کا پورا دیوان نعت سے معمور اور عشق النبی میں ڈوبا ہوا ہے۔ عام طور سے آپ کی نعتیہ غزلیں مقبول تھیں۔ عموماً نعت خوان آپ ہی کا کلام پڑھتے تھے۔ آپ نے ٹھمریوں میں بھی نعت کہی ہے۔ مائل سے آپ کو تلمّذ تھا۔ ۱۳۱۵ھ میں انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :-

آشنائی کا تو اس عہد میں دیکھا ہے یہ رنگ
منہ پہ ہے صبح وطن شامِ غریباں دل میں

وہ تو اک آپ کا دیوانہ ہے بھولا بھالا
آپ کیا سمجھیں ہیں شائق کو مری جاں دل میں

زلف کس کی دیکھی بھالی جائے گی ہم سے یہ ناگن نہ پالی جائے گی
اک نہ اک دن ہوگا ظالم بھی خراب آہ مظلوموں کی خالی جائے گی
حُسن کی دولت پہ اِتنا خوش نہ ہو بات سچ ہے آنے والی جائے گی
شائق اتنی فکر کیوں ہے عمر کی چیز جو ہے جانے والی جائے گی

محبت بڑھتے بڑھتے عشق ہو جائے یہی دانہ بنے خرمن خُدا کا

دیکھ کر طاقِ حرم تھام کے دم بیٹھ گیا خم ابرو ترا جب قبلۂ من یاد آیا

ہے درد کبھی آہ و فغاں اور کبھی نالا اے ہجرِ نبیؐ ان سے پڑا ہے مجھے پالا

سازِ وحدت آئینہ بنے گا سامنے نورِ احمدؐ جب مرے دل میں چمکتا جائے گا

نہ کیوں بسمل ہو ہر ہر تیغِ ابروئے محمّدؐ کا
لیا ہے پہلے بسم اللہ کہہ کر درس ابجد کا

دُعا شایق کی ہو مقبول بہرِ پنجتن یاربّ
مدینے میں بنوں جا کر مجاورِ پاک مرقد کا

ہوں وہ دکھنی کہ دکن ناز سے یہ کہتا ہے
کرسیِ ہند پہ کوئی ترا بازو نہ ہوا

دل مرا تُو نے لیا ہے مجھے دے دل اپنا
فیصلہ یوں ہو تو کچھ حاجتِ ضامن ہی نہیں

سوئے طیبہ جو چلے راہِ حرم بھول گئے
دیکھ کر تیری گلی باغِ ارم بھول گئے

اے لباسِ زُہد و تقویٰ آخری تسلیم لے
ان گناہوں سے ہماری خوب عریانی ہوئی

مر مٹوں اس طرح اے شایق غمِ شبیر میں
بے نشانی خود نشاں بن جائے نام ایسا تو ہو[1]

---

(۱۳) فیاض

محمدؐ فیاض الدین نام، فیاض تخلص، مشرف جنگ خطاب امرائے دربار آصفی سے تھے۔ فیض سے تلمّذ حاصل تھا۔ آپ کو فطری طور سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور بہت ساروں نے آپ کی شاگردی کی۔ صاحبِ تصنیف تھے۔ ۱۳۲۶ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے فرزند محمدؐ عزیز الدین خاں عزیز کا ذکر آگے آتا ہے۔ فیاض کا کلام سادہ اور اندازِ بیاں دلچسپ، نزاکتِ تخیل بھی قابلِ داد ہے۔

نہیں ہے جب تمہارے کام کا دل
تو میرے سر پہ دے مارو مرا دل
تصوّر ہر گھڑی رہتا ہے تیرا
کبھی خالی نہیں رہتا مرا دل

---

[1] دیوان شایق مطبوعہ۔
[2] تزک محبوبیہ۔

عجب عالم ہے قاتل کی گلی میں | پڑے ہیں جا بجا سر جا بجا دل
نئی بیداد کرتے ہیں وہ ہر دم | کہاں سے لاؤں میں ہر دم نیا دل
نہیں وزدِ حنا مٹھی تو کھولو | مرا دل ہے، مرا دل ہے، مرا دل
کہاں دیتے ہیں دل لے کر کسی کا | مجھے معلوم ہے سرکار کا دل

جیتا نہیں ہے یاں کوئی زخمی کٹار کا | مارا ہوا ہوں میں بھی تو مژگانِ یار کا
نا قدر دانیوں سے زمانے کے آج کل | لیتا نہیں ہے نام کوئی روزگار کا
ہوتا ہے بے کسی میں کہاں کوئی آشنا | بیگانہ خود ہے سبزہ بھی اپنے مزار کا
اک جام اور دے کہ چڑھا جاؤں ساقیا | آتا چلا ہے وقت پھر اب کچھ اوتار کا

---

(۱۳) شوکت

غلام رسول نام اور شوکت تخلّص، ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اسلام کی خوبیوں نے آپ کے دل پر اثر کیا۔ اسلام سے مشرف ہوئے۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ شعلہ سے تلمّذ رکھتے تھے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے۔ کلام میں دلچسپی اور اثر ہے۔

دوپٹہ گر ملے اس گل بدن کا | تردد کیوں کریں اپنے کفن کا
دلِ مضطر سے میرے ڈر تو یہ ہے | نشاں خالی نہ ہو ناوک فگن کا

آگاہ مجھے کر دے تو اسرارِ نہاں سے | راز ایک نہ پوشیدہ رہے کون و مکاں کا
کونین سے کھویا ہے مجھے عشقِ بتاں نے | افسوس رہا میں، نہ یہاں کا، نہ وہاں کا
شوکت ہے تو کس فکر میں کر یادِ الٰہی | دم بھر کا بھروسہ نہیں اس جسم میں جاں کا

اعلیٰ بنے ہیں اسفل، اسفل بنے ہیں اعلیٰ | بیداد ہو رہے ہیں شاہ زمن، زمن میں
معشوق بے وفا ہیں اے دل تو ہوش میں آ | کیوں جان کھو رہا ہے ذکرِ دمن دمن میں

جھگڑا ہو صاف کیجے اقرارِ وصل کا | فتنہ ہر اک طرح کا تمہاری نہیں میں ہے

دیکھا جسے اوٹھا کے نظر بے خبر کیا　　جادو بھرا ہوا نگہِ نازنین میں ہے

آئینہ ہے آپ کے مقابل　　اچھی ہے لڑائی دوبدو کی
ہے جامہ دری سے کس کو مہلت　　فرصت ہے کسے یہاں رفو کی[1]

---

(۱۴) **شوق**

غلام محمد عرب المتخلص بہ شوقؔ۔ آپ کا خاندان آصف جاہ ثانی کے عہد میں یمن سے آکر رائچور میں مقیم ہوا۔ جاگیر و منصب سے سرفرازی ہوئی۔ شوقؔ کی پیدائش ۱۲۶۲ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ عربی اور فارسی میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ فارسی میں عبدالعلی والہ .. اردو میں عاقل دہلوی سے تلمذ تھا۔

مرضِ عشق کی شدت ہی سہی　　عوضِ مرگ اذیت ہی سہی
ہم بھی فریاد کریں گے سرِ حشر　　ہاں قیامت میں قیامت ہی سہی
اے فلک غم نہیں کردے برباد　　شوقؔ ناکام کی تربت ہی سہی

اون سے شب ملنے کا پھر پیغام ہے　　صبح سے بہتر ہماری شام ہے
کیوں بگڑتے ہو سوالِ وصل پر　　یہ بھی کیا گالی ہے کیا دشنام ہے
کیا چھپانے سے کہیں چھپتا ہے عشق　　شوق تیرا حال طشت از بام ہے[2]

---

(۱۵) **صحو**

آغا محمد و اور ابوالعلائی۔ حیدرآباد کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کی ذات مرجع رشد اور ہدایت تھی۔ شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ۱۲۵۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۳۲۴ھ میں رحلت فرمائی۔

حضرت صحوؔ نے بالارادہ کبھی شعر نہیں کہا بلکہ حالتِ کیف میں جو زبان سے موزوں

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۶۔ صفحہ ۸۷، ۸۸

[2] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۷۔ صفحہ ۹۱، ۹۲۔

الفاظ نکل گئے وہی اشعار ہوئے۔ اکثر محفلِ سماع کی پُر اثر کیفیات سے متاثر ہوکر وجدانی کیفیات کے تحت آپ کی شاعری ہوتی تھی جو تمام تر تصوّف پر مملو ہے۔ آپ کا دیوان شائع ہوچکا ہے۔ جس میں غزل اور کچھ نظمیں ہیں۔ نمونۂ کلام پیش ہے :۔

بے خیالی خیال ہے میرا	لا اُبالی، کمال ہے میرا

صحوؔ محتاج در پہ حاضر ہے	زور پر بخت نارسا ہے آج

پردۂ ہیم میں چھپے ہیں حضور	ہم سے نزدیک ہیں نہیں کچھ دور

مضطر ہے تن میں دل مرا سیماب کی طرح	مرتا ہوں یار ماہیٔ بے آب کی طرح

میرا حالِ دل ہے سُنانے کے قابل	کروں کیا نہیں ہے چھپانے کے قابل

مجھے ظاہر کیا ہے آپ چھُپ کر	خدایا خاک میں مجھ کو ملا دے

لبریز جام محفلِ مستاں میں رہ گیا	عالم نشہ کا دیدۂ حیراں میں رہ گیا
یاں جستجو میں اوس کی ہر اک صبح و شام تھے	مخزن کسی کا خانۂ انساں میں رہ گیا
پہچانتے نہیں ہیں ابھی تک وہ آپ کو	جھگڑا ابھی تو گبر و مسلماں میں رہ گیا
وحشت کو میری دیکھ کے گھبرا گیا ہے وہ	دستِ جنوں بھی چاک گریباں میں رہ گیا
ہرگز یقیں نہ ہوگا مری بات کا اوسے	کیا ہوگیا صحوؔ کو ہاں نہیں میں رہ گیا

---

(۱۶) مائلؔ

ڈاکٹر احمد حسین[۱] المتخلص بہ مائل، حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے۔ شمالی ہند کے مشہور شعراء میر، سودا، انیس، جرأت، امیر اور داغ وغیرہ

---

[۱] مرقع سخن جلد دوم صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۶۔
[۲] تذکرہ شعرائے دکن و تزکِ محبوبیہ۔

کے جواب پر ان کی طویل غزلیں قابلِ ملاحظہ ہیں۔ وصفی کے شاگرد تھے۔ نظم میں کئی کتابیں شائع کی ہیں۔ بقول مؤلف تزک محبوبیہ جس مشاعرہ میں آپ شریک ہوتے اس میں جان پڑجاتی تھی۔ مائل کے کلام سے اُن کے اُستاد فن ہونے کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ بلندیٔ خیال، صفائیٔ زبان، رنگینیٔ مضمون اور تاثیر وغیرہ کے لحاظ سے قابلِ تحسین ہے۔ ۱۳۲۳ھ میں مائل کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

تھام کر دل وہ بھی روئیں اک بار اتنا تو ہو — میرے نالوں میں اثر پروردگار اتنا تو ہو
لامکاں پر چھت بنے اونچا غبار اتنا تو ہو — خاک ہوتی ہے عروجِ خاکسار اتنا تو ہو
ہنس پڑے وہ دیکھ کر پروردگار اتنا تو ہو — آنکھ سے ٹپکے محبت دل میں پیار اتنا تو ہو
نالۂ آتش فشاں کب تک یہ ٹھنڈی گرمیاں — جل بجھے کون و مکاں تو شعلہ بار اتنا تو ہو
اے خدا مجھ کو بنا دے اب تصوّر غیر کا — ان کے دل میں جا کے آوں اختیار اتنا تو ہو
وہ اُدھر بیخود رہے اور میں اِدھر بیخود رہوں — لطف اے مائل دمِ بوس و کنار اتنا تو ہو

وحدت کی ہر ادا میں کروڑوں بناؤ ہیں — کثرت ہے سلسلہ تری زلفِ دراز کا

دوزخ کو دیکھتے ہی ترے مست خوش ہوئے — سمجھے یہاں بھی گرم ہے بھٹی کلال کی

ساری دُنیا کے گنہ میں نے کیے واہ رے میں — پھر بھروسہ مجھے اللہ کا اللہ رے میں

دل میں آ کر نقاب اُٹھائی ہے — خُود نمائی خدا نمائی ہے

نزاکت میں غضب کی ہاتا پائی ہوتی جاتی ہے
کہ دم چڑھتا ہے پھر زور آزمائی ہوتی جاتی ہے

منصور کی آواز مرے لب پر گر آئے — قطرہ میں بھی دریا کا تماشا نظر آئے

مستانہ جوانی تری اے فتنہ گر آئے | ہر بات میں ہو گھات نظر میں اتر آئے
کیا صبر ہو کیا چین ہو جب وہ نظر آئے | دل تھام لیا، جان چلی، اشک بھر آئے

مزا دیتا ہے مائل کو ترا سینہ، ترا چہرہ | یہ کچھ کافر جوانی کا، وہ کچھ بھولے لڑکپن کا

مائل خدا سے مانگنے کی خو نہیں گئی | پیدا ہماری قبر سے دستِ دعا ہوا

محبّت نے مائل کیا یہ کسی کو | کسی پہ کسی کو، کسی پر کسی کو

وہ کافر ہوں رہوں محشر میں بھی میں کفر پر قائم
خدا کے سامنے سجدہ کروں تصویرِ جاناں کو

---

(۱۷) وزیر

صاحبزادہ[1] میر وزیر علی نام اور وزیر تخلّص۔ خاندانِ آصفیہ کے ایک ممتاز فرد تھے۔ برقرار جنگ آصف یار الدّولہ، آصف یار الملک خطاب تھا۔ ۱۲۶۸ھ میں تولّد ہوئے۔ نواب افضل الدّولہ آصف جاہ خامس کی دامادی کا آپ کو شرف حاصل تھا۔ شوال ۱۳۲۹ھ میں انتقال ہوا۔ شاعری کا خاص شوق تھا۔ اولاً فیضؔ سپہر عصر کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا کلام صوفیانہ ہوتا تھا۔

پہنچے کنارِ گور کے ہم جاں بلب صنم | پورا کیا قرار نہ بوس و کنار کا
دیکھا ہوں خودی ہی میں خدایا ترا جلوہ | ظلمت میں پتا مجھ کو ملا آبِ بقا کا
وہ دیکھ لے جا کر بُتِ سفّاک کا کوچہ | جو عمر میں دیکھا نہ ہو میدان قضا کا
کھاتا ہوں ہوا کوچۂ جاناں کی ہمیشہ | بھوکا نہیں رضواں تری جنّت کی ہوا کا

کیوں کر نہ مجھ کو دے زرِ مضمون نذر فکر | سلطاں ہوں میں وزیرِ سخن کے دیار کا

---

[1] تزکِ محبوبیہ و تذکرہ شعرائے دکن۔

کرتا ہوں ذکر زلف میں اوصاف روئے یار — کعبہ کو جا رہا ہوں شوالہ کی راہ سے
صورت پرست رہتے ہیں معنی سے بے خبر — واعظ ہو دُور کیوں نہ حقیقت کی راہ سے
پیشِ نظر لحاظ ہے افشائے راز کا — قاصد کا نام لیتا ہوں تارِ نگاہ سے

کب ہاتھ میں ہے باگ میرے اختیار کی — ہے جب سے انتظار کسی شہ سوار کی[1]

---

(۱۸) مزاج حکیم محمد مظفر الدین خاں، مزاج تخلص، حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ ۱۲۴۱ھ میں تولد ہوئے۔ ۱۳۱۶ھ میں انتقال ہوا۔ بڑے پُرگو شاعر تھے۔ چار دیوان مرتب کیے تھے۔ ان کے کلام میں سادگی، صفائی، سلاست پائی جاتی ہے۔ نیز یاس و حرماں نصیبی بھی موجود ہے۔

کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

جان گئی عشق میں کچھ غم نہیں — حقِ محبت تو ادا ہوگیا

موت سر پر ہے گور میں ہیں پاؤں — لے کے پھر تخت و تاج کیا کیجیے

لو خوشی سے میں جان دیتا ہوں — تم نہ رنجیدہ ہو خدا کے لیے

عشق میں ہم کو خیال اپنا کبھی آیا نہیں — آپ کو کھویا نہ جب تک یار کو پایا نہیں

اس بحرِ کم ثبات میں ہوں ہمدمِ حباب — ساحل کی آرزو، نہ سفینے کی آرزو

پیدا بتوں کے عشق سے عشقِ خدا ہوا
آئینۂ مجاز حقیقت نما ہوا

---

[1] تذکرہ شعرائے دکن۔

کیا خاک منہ دکھائیں خدا کو ہم اے مزاج — ہم سے نہ کوئی کام، یہاں کام کا ہوا

صیاد تفرقہ ہو تجھے بھی یہی نصیب — بلبل کہیں ہے، باغ کہیں، آشیاں کہیں

کام کرلو مزاج کرنے کے — زندگی کا کچھ اعتبار نہیں[1]

---

(۱۹) **معلی** — محمد مظفر الدین نام اور معلی تخلص، آپ کے اجداد عالمگیر کے زمانہ میں دکن میں آکر بس گئے۔ معلی کی پیدائش ۱۲۵۵ھ میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی بڑی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ شیخ حفیظ کے فرزند حیدر سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی اور اُردو زبانوں میں شعر کہا کرتے۔

عشق ہے دل میں ہمارے احمد بے میم کا — داغ، اپنا پھول ہے گلزار ابراہیم کا

خاکساروں کو ہے راحت، سربلندوں کو ہے رنج — ہے زمیں آرام سے اور آسماں گردش میں ہے

دنگ ہیں آئینہ میں اپنے لقا کو دیکھ کر — بُت بنے بیٹھے ہیں وہ صنم خدا کو دیکھ کر

نہ غم سے نالہ و فریاد کرنا — ہے لازم خاطرِ صیاد کرنا
نہیں پوچھا کبھی بھولے بھی ہم کو — بُتِ کافر تجھے کیا یاد کرنا[2]

---

(۲۰) **مہر** — محمد وزیر الدین نام۔ مہر تخلص۔ حیدر آباد میں ۱۲۷۹ھ میں تولد ہوئے، آپ کے اجداد آصفی عہد میں منصب و جاگیر سے سرفراز تھے۔ پُرگو شاعر تھے۔ کئی دیوان مرتب کیے تھے۔ ۱۳۲۵ھ کے بعد انتقال ہوا۔

---

[1] مرقع سخن جلد دوم۔ صفحہ (۱۰۱ تا ۱۰۶)

[2] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۷۱، صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸۔

کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لبِ فریاد سے نکلا　　　تڑپ کر جب کوئی نالہ دلِ ناشاد سے نکلا
نہ حسرت کم ہوئی دل کی نہ زاری چشمِ گریاں کی　　　وہی ہے جوشِ دل کیا حوصلہ فریاد سے نکلا
نہ ملتی گشتگانِ عشق کو منزل قیامت تک　　　پتا راہِ اجل کا خنجرِ جلاد سے نکلا
وہ بسمل ہوں کہ مرنے تک رہا مرنے پہ ثابت میں　　　جزاک اللہ زبانِ خنجرِ فولاد سے نکلا

جہاں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے ہر سو لوگ وحشت کو
پتا آخر کو مہرِ خانماں برباد سے نکلا

یہ سینہ وہ نہیں جس میں تمنّا آ کے پھر جائے
یہ حسرت وہ نہیں اپنی کہ اپنے دل سے نکلے گی

وہ پردے میں ہیں جب تک آرزو بھی دل میں ہے مخفی
وہ جس دن گھر سے نکلیں گے تمنّا دل سے نکلے گی

خواہاں نہیں شفا کے مریضانِ می فروش
مے پی رہی ہیں طاق پہ شیشے دوا کے ہیں

آنکھوں کی ہے خطا نہ تیرے حسن کا قصور
یہ سب فساد ایک دلِ مبتلا کے ہیں[1]

---

(۲۱) ناجی سید اصغر حسین المتخلص بہ ناجی ۱۲۵۶ھ میں ولادت ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ تفضل حسین عطا سے تلمذ حاصل تھا تاریخ گوئی میں اچھا ملکہ تھا۔ مرثیہ، سلام وغیرہ کہا کرتے۔ ۱۳۳۰ھ میں وفات پائی۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ ناجی کے کلام میں واقعہ نگاری کے ساتھ روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ نوحہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اے یارو کیسی چل گئی صرصر چمن چمن　　　لوٹا گیا ریاضِ ہمیبر چمن چمن

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ۱۷ صفحہ (۱۶۱، ۱۶۳)

ہر عندلیب پیٹتی ہے سر چمن چمن ۔ برپا ہے ماتمِ گلِ حیدر چمن چمن

بہلاتی تھی بہشت میں اصغر کو یوں بتول ۔ پھرتی ہوں تم کو گود میں لے کر چمن چمن
بھوکے ہو تین روز کے پیتے نہیں ہو کیوں ۔ جاری ہیں نہریں دودھ کی اصغر چمن چمن

دادی سے گر خفا ہو تو دادا کے پاس جاؤ ۔ لے کر پھریں گے ساقیِ کوثر چمن چمن

کہتے تھے شب قتل یہ مشتاق شہادت ہوئے گی سحر کب
یارب ہمیں مرنے کی تمنا ہے نہایت ہوئے گی سحر کب
بیٹھے ہیں تری راہ میں لٹا دینے کو گھر بار، ہیں دوش پہ سر بار
کب دیکھیں گے سیرِ چمنِ گلشنِ جنت ہوئے گی سحر کب
کب شمر و عمر کو تہِ شمشیر کریں گے، کب خوں میں بھریں گے
کم حشر کے دن سے نہیں اس شب کی طوالت ہوئے گی سحر کب
کیسی یہ شب آئی ہے کہ کٹتی ہی نہیں ہے گھٹتی ہی نہیں ہے
اس شب کی ہے اک اک گھڑی ہم کو قیامت ہوئے گی سحر کب
دنیا کی تمنا نہیں جینے سے ہیں بے زار، مرنے پہ ہیں تیار
پیاسے ہیں بہت چشمۂ کوثر کی ہے چاہت ہوئے گی سحر کب
ناجی شب عاشور سحر تک رہے خنداں کہتے تھے یہ ہر آن
انصار دل و جان شہنشاہِ رسالت، ہوئے گی سحر کب

---

(۲۴) نامی

عبدالغفور خاں المتخلص بہ نامی۔ حیدرآباد میں ۱۲۸۲ھ میں تولد ہوئے۔ دس سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہوا۔ اردو، عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے اردو میں حضرت داغ اور فارسی، عربی میں سنادالملک سید علی شوستری

لہ مرقع سخن جلد اول صفحہ ۲۱۷ تا ۲۲۸۔

سے شرفِ تلمذ رہا۔ طب اور علمِ جفر کا اچھا ملکہ تھا۔ خوش نویس بھی تھے۔ نظم و نثر کی تیس اکتیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔

نامی کے کلام میں معاملہ بندی، سلاست، شیرینی اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ نازک خیالی اور حُسنِ ترتیب، مضمون آفرینی کے جوہر بھی موجود ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہوئی ہیں غصہ سے لال آنکھیں غضب کے تیور بدل رہے ہیں
بھویں تنی ہیں، کھنچا ہے خنجر، یہ میرے ارماں نکل رہے ہیں
لگی ہے اب آگ کچھ انہیں بھی جو غیر سے بے وفائی دیکھی
خدا کی قدرت کا ہے تماشا جلانے والے بھی جل رہے ہیں

میں کسی ایک کا تو ہو جاؤں — کوئی میرا ہوا، ہوا نہ ہوا

آہ کرتا ہوں مگر آہ میں تاثیر نہیں — اور تقدیر سے بنتی کوئی تدبیر نہیں

دل جل کے خاک سوزِ محبت سے ہو گیا — اب آہ بھی کروں تو نکلتا دھواں نہیں

آخر جلا جلا کر نامی کو مار ڈالا — ارمان جی کا نکلا منت بر آئی تیری

کٹی عمر جس کی وفاداریوں میں — وہی بے وفا، بے وفا جانتا ہے

حال وہ حال ہے جو قابلِ اظہار نہیں — درد وہ درد ہے جو لائقِ تحریر نہیں

جس دن سے تری دُھن ہے لو تیری لگی جب سے — ہے وصل سے بھی بڑھ کر مجھ کو مری تنہائی
ہم کہتے نہ تھے نامی چاہو نہ حسینوں کو — بدنامی ہوئی کس کی، کس کی ہوئی رسوائی

حضرتِ دل آپ کیا آئے قیامت آگئی　　یہ بلا ہے میرے سر پر آپ کی لائی ہوئی

لگائیں جس سے دل وہ اک بُتِ پُرفن نکلتا ہے
سمجھتے دوست ہیں جس کو وہی دُشمن نکلتا ہے

آئینہ دیکھ کے زُلفیں تو بناؤ اپنی　　آج دیکھو تو میں لیتا ہوں بلائیں کیونکر

بھروسہ کرتے ہو پھر اس کی بات کا ناحق　　کہ ایسا وعدہ تو اس نے ہزار بار کیا[1]

---

(۲۳) واصل

محمد احمد اللہ نام، واصل تخلص، ۱۲۷۰ھ میں تولد ہوئے۔ حیدرآباد میں نشوونما ہوا۔ وصفی لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا۔ حیدرآباد میں داغ کے پہلے وصفی کی ہی شہرت تھی، واصل نے مثنوی کے سوا تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لطفِ زبان، تخیل کی بلندی، ان کے کلام کے جوہر ہیں، بیان کی نزاکت اور معنی کی لطافت کے لحاظ سے بھی ان کا کلام مزین ہے۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:۔

عشقِ احمدؐ کے سوا باقی جو کچھ ہے ہیچ ہے　　عالمِ فانی میں سب کچھ ہے، مگر کچھ بھی نہیں

جلوۂ رحمتِ عالم ہے یہ کچھ طور نہیں　　دیکھ موسیٰ ہمہ تن چشمِ تمنا بن کر

مدحِ شہِ دیں سے یہ ملی نعمتِ عظمیٰ　　باتوں میں ہے تاثیر زباں میں ہے اثر آج

مری وحشت سے عالم یہ ہے یثرب کے بیاباں کا
کہیں ٹکڑا ہے دامن کا، کہیں پُرزہ گریباں کا

---

[1] مرقع سخن۔ جلد دوم۔ صفحہ (۲۱۱) تا ۲۱۵

جنہیں عشق سرورِ دیں ہوا انہیں ہر بلا میں مزا ملا
کوئی دل کے زخم سے شاد ہے، کوئی اپنے زخمِ جگر سے خوش

کیوں بجھ نہ جائے دل کہ ہے پروانۂ نگاہ   گنبد کے ہر چراغ سے دُور اور شکستہ پر

اسے مارا، اسے تاکا، ادھر دیکھا، ادھر گھورا   عجب شوخی ہے کیا کہنا تمہارے چشمِ پُرفن کا

مانا کہ تم سے کھُل نہیں سکتے قبا کے بند   اچھا جو دستِ شوق ہمارا مچل گیا

بے نیازی ہو چکی، بندہ نوازی کیجیے   اک ذرا ہنس دیجیے عاشق کو نالاں دیکھ کر

ہم ناتواں کہیں کیا، کیونکر اُڑے ہوا پر   اُڑ کر گرے زمین پر، گر کر اُڑے ہوا پر[1]

---

(۲۴) ولاؔ

احمد عبدالعزیز نام، ولاؔ تخلّص اور شمس العلماء عزیز جنگ خطاب تھا اہلِ نوایط سے تھے۔ حیدر آباد کے پُرگو شاعر اور نثّاری کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ چوبیس سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ۱۲۷۲ھ میں ولادت اور ۱۳۴۲ھ میں انتقال ہوا۔ فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دونوں زبانوں میں کلیّات مرتب ہوا ہے اور دونوں زبانوں میں آنحضرتؐ کا سراپا قلمبند کیا ہے۔ کئی اُستادانِ سخن سے تلمّذ رہا جن میں راقمؔ، سنجرِ طہران، داغؔ اور جلیل بھی شامل ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

ہم رو رہے تھے بزم میں جب چل رہا تھا دَور   اشکوں کو دل نے بادۂ احمر بنا دیا

غم سے بھر آئی آنکھ تو پینے لگے ہم اشک   ضبطِ الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا

---

[1] مرقع سخن جلد دوم، صفحہ (۱۵۹ تا ۱۶۸)

جو بزم میں تیری خدا خدا کر کے　　سنبھلنے پائے نہ تھے کہہ دیا خدا حافظ

بوسۂ لب میں ہے تکرار　　لینا ایک نہ دینا دو

مستی میں تری نرگسِ مخمور کا ہمسر　　محفل میں کبھی ساغرِ جم ہو نہیں سکتا

منصوبہ ہائے دل تو بہت کچھ تھے رات دن　　کرنے کا تھا خیال مگر کچھ نہ کر گئے

بہنے لگی جو سیل مرے اشک رواں کی　　پانی پہ بنا نقش جہانِ گزراں کا

شعرائے دورِ عثمانی

اب ہم اس دور کے ان شعراء کا تذکرہ کرتے ہیں جو ۱۳۲۹ھ کے بعد فوت ہوئے یا ہنوز بقیدِ حیات ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اسی دور میں مشہور ہوئی۔

(۱) امجد

اس دور کے زبردست اور باکمال صاحبِ فن شاعر حضرت سید احمد حسین امجد ہیں۔ اگرچہ رباعیات کے باعث آپ عام طور سے شہرت رکھتے ہیں مگر درحقیقت دیگر اصناف سخن بھی بہترین خیالات اور اعلیٰ جذبات کا نمونہ ہوتے ہیں۔

آپ کی پیدائش حیدرآباد میں غالباً ۱۳۰۳ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد صوفی رحیم علی تھے جن کا انتقال آپ کی کم سنی کے زمانے میں ہی ہوگیا۔ والدہ محترمہ نے آپ کی پرورش فرمائی۔

مدرسہ نظامیہ، مدرسہ دارالعلوم میں امجد کی تعلیم ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد استاد فلسفہ مولانا سید نادر الدین مرحوم سے جو علامہ عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ تعلیم کی مزید تکمیل کی۔

طغیانی رودِ موسیٰ ۱۳۲۶ھ میں آپ کا سارا کنبہ جو والدہ، بی بی اور دختر پر مشتمل تھا دریا برد ہوگیا۔ صرف ایک ذات امجد اس طوفانِ بلا سے بچ گئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں مدرسی کی خدمات پر آپ کا پہلا تقرر ہوا۔ اس کے بعد دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہوئے اور بعد تکمیل پچپن سالہ وظیفہ حاصل ہوا۔ ۱۲ر شوال ۱۳۸۰ھ کو انتقال ہوا۔ درگاہ شاہ خاموش میں مدفون ہیں۔

چودہ سال کی عمر سے امجد کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ابتداً چندے حبیب کنتوری اور ترکی کو اپنا کچھ کلام بتایا مگر اس کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی چونکہ آپ فطرتی شاعر ہیں اس لیے بھی کسی استاد کی ضرورت نہ تھی۔ نظم و نثر کی کئی کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں جو حسب ذیل ہیں :-

ریاض امجد حصہ اوّل و دوم، رباعیات امجد حصہ اوّل، دوم و سوم، خرقۂ امجد، نذرِ امجد، حج امجد، جمالِ امجد، حکایاتِ امجد، گلستانِ امجد، پیامِ امجد۔

اڈیٹر صاحب رسالہ معارف نے آپ کے کلام کی حکمت اور معرفت کے مدِّنظر حکیم الشعراء سے آپ کو ملقب کیا ہے۔ آپ کے کلام پر ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی ایک دوسری تالیف[1] میں روشنی ڈالی ہے۔

حضرت امجد کی شاعری حسن و عشق، گل و بلبل کے جھوٹے تذکروں اور بے سر و پا خیالی کرشموں سے خالی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

نہ ذکرِ بلبل و گل ہے نہ داستانِ بہار ۔۔۔ نہ وصفِ سنبل و ریحاں نہ مدحِ بادِ شمال
نہ کوئی لطفِ زباں ہے نہ خوبیٔ مضموں ۔۔۔ نہ حسن و عشق کا قصہ، نہ شاعرانہ خیال

مگر تیسرا مصرع صرف مصنّف کا خیال ہے اور ان کا مشرقی انکسار ہے ورنہ مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ حضرت امجد کا کلام نہ صرف لطفِ زبان کی حیثیت سے واجب التّعظیم ہے بلکہ خوبیٔ مضمون کے اعتبار سے بھی قابلِ تحسین ہے۔

حضرت امجد کی شاعری، تین امور کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ سادگی، نازک خیالی اور تاثر، بہترین کلام کے یہی تین جوہر ہیں جو امجد کی شاعری میں خصوصیت سے نظر آتے ہیں۔

"دُنیا اور انسان" ایک طویل نظم ہے جس میں دُنیا اور اہلِ دنیا کی حرص و ہوا، طمعِ زر، بغض و حسد کا نقشہ پاکیزہ روزمرہ میں نہایت خوبی اور عمدگی سے کھینچا ہے۔ اس نظم کے بعض بند حسبِ ذیل ہیں:۔

اب سُنو غور سے اے مال پہ مرنے والو ۔۔۔ جھوٹ سچ بول کے اس پیٹ کے بھرنے والو
بُلبلا پانی کا بن بن کے ابھرنے والو ۔۔۔ ناک چوٹی میں گرفتار سنورنے والو

آپ بیتی ہے یہ سب غیر کا افسانہ نہیں
قصۂ حمزہ نہیں، حالتِ بیگانہ نہیں

وہ مسافر نظر آیا جو تمہیں صحرا میں ۔۔۔ سمجھو وہ تم ہی جو آئے ہو اس دُنیا میں
شیر بپھر دیکھا اچانک جو اسی اثنا میں ۔۔۔ نقشۂ خوف کھچا مردمکِ بینا میں

چڑھ گیا شاخ پہ جس ڈر سے مسافر مضطر
اور یہ منہ کھولے ہوئے بیٹھ رہا زیرِ شجر

---

[1] حضرت امجد کی شاعری۔

قبر سمجھو کہ جو ہے منتظرِ ہر انساں   آپ کچھ سمجھے بھی کیا چیز ہے وہ شیر زیاں
کہ کسی روز تو آئے گا یہ جائے گا کہاں   شیر سا قبر بھی ہے کھولے ہوئے اپنا دہاں
اس کا سب نازو تبختر نہ بھلادوں تو سہی
ہڈیاں پیس کے چورا نہ بنادوں تو سہی
ملک الموت ہے وہ سانپ جنابِ عالی   عمر سمجھو اسے جس شاخ پہ اس نے جا لی
شہد کا چھتہ ہے دنیا سببِ پامالی   رات دن چوہے جو ہیں کاٹ رہے ہیں ڈالی
وائے برشامتِ اعمال مگس کے مانند
طمعِ شہد میں ہم ہوگئے بالکل پابند
نفسِ بدکار نہ اعمال سے شرماتا ہے   نہ لحد کا کبھی بھولے سے خیال آتا ہے
چھوڑکر دین کو دُنیا کی طرف جاتا ہے   حلق تک صبح و مسا لقمۂ تر کھاتا ہے
پھنس کے دُنیا میں زر و مال کا ہو رہتا ہے
طلبِ جاہ میں کیا کیا غم وہم سہتا ہے[1]

نظمِ قیامت صغریٰ امجد کی شاعری کا ایک زبردست نمونہ ہے۔ یہ نظم طغیانی رودِ موسیٰ ۱۹۰۸ء کے واقعہ پر لکھی گئی ہے جس میں حضرت امجدؔ مع اپنے خاندان کے گرفتارِ بلا ہوئے تھے۔ سوائے ذاتِ امجد کے ان کے خاندان کا کوئی دوسرا فرد اس طوفانِ بلا سے جانبر نہ ہو سکا۔ ان واقعات نے اس نظم میں عجب کیفیت پیدا کردی ہے۔

بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں   وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں
وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں   گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی
تھی زندگیِ خرد و کلاں نقش بر آب آہ   دم لینے کی طاقت نہ تھی سستانے کی تاب آہ
طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ   کرتی تھی الگ سیلِ رواں خانہ خراب آہ
جاں لینے کو ہر اک متنفس کے بڑھی تھیں
بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں

---

[1] ریاضِ امجد

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا سیلاب فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا

شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدۂ پرنم بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم

سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے
حیرت تھی کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

آپ کی ایک نظم جو تصوّف میں ہے سہ رنگی تصویر سے موسوم ہے۔

(۱) پہلا رنگ نہایت ہلکا غنچۂ ناشگفتہ کی طرح پاک اور برف کی طرح بے داغ تھا۔

سُن کتھا میری اچھی سہیلی رات میں سو رہی تھی اکیلی
آئی خوشبو مجھے عطر کی سی چھو گئی سانس مجھ کو کسی کی
چھا گئی مجھ پہ بدلی کرم کی بند آنکھوں میں بجلی سی چمکی
ہو گیا فضل باری تعالیٰ آیا گھر میں مرے عرش والا

(۲) دوسرا رنگ نہایت شوخ مگر کچّا دھوپ میں اُڑ جانے والا۔ میری انتہائی مسرّت اور اس کے معنی خیز تبسّم پر شامل تھا۔

محو دید رُخ یار ہوں میں خواب میں ہوں کہ بیدار ہوں میں
اب جلے آگ میں میری سوتن میں تو باندھوں گی دامن سے دامن
غم کدے میں مرے عید ہوگی اب تو آٹھوں پہر دید ہوگی

(۳) تیسرا رنگ نہایت گہرا اور پختہ دھونے سے بھی نہ دُھلنے والا خون کی طرح جسم کی رگ رگ میں دوڑنے والا تھا۔

میں اس وجد میں جھومتی تھی اپنی قسمت کا مُنہ چومتی تھی
ناگہاں اک ذرا آنکھ جھپکی کڑکڑا کر گری غم کی بجلی
ہائے تقدیر نے رنگ بدلا پھر یہ دیکھا کہ اس کو نہ دیکھا
اس نے جلوہ دکھایا ہی کیوں تھا جانے والا پھر آیا ہی کیوں تھا

بیٹھے بیٹھے مراجی جلایا چھپنے والے نے کیوں منہ دکھایا
اب وہ ہم ہیں نہ وہ ہم نشیں ہے ہائے سب ہو کے پھر کچھ نہیں ہے

ایک تضمین ملاحظہ ہو :-

فرقت میں جاں برباد ہے آیا ہے اب آنکھوں میں دم
جا کر سنائے کون انہیں افسانۂ بیمارِ غم
پیغام بر ملتا نہیں بے چارہ و بے کس ہیں ہم

ان نلت یا ریح الصبا یوماً الی ارض الحرم
بلغ سلامی روضۃ فیہ النبی المحترم

کیا شکل کھینچی واہ واہ قربان ترے دستِ قضا
پڑھتے ہیں جس کو دیکھ کر حور و ملک صلِّ علیٰ
کیا رنگ ہے، کیا روپ ہے، کیا حسن ہے نام خدا

من وجہہ شمس الضحیٰ من احذہ بدر الدجیٰ
من ذاتہ نور الھدیٰ من آکفہ بحر الھمم

کیا پوچھتے ہو ہمدمو، ہم سے محبت کا مزا
دل چاک ہے، ٹکڑے جگر، تن زخمی تیغِ جفا
سننا دہانِ زخم سے رہ رہ کے آتی ہے صدا

اکبادنا مجروحۃ من سیف ھجرا لمصطفیٰ
طوبیٰ لاھل بلدۃ فیہ النبیُّ المحترم

پیراہن دل چاک ہے، ٹکڑے ہے جیب و آستیں
جینے سے جی بیزار ہے ہونٹوں پہ ہے جانِ حزیں
اچھے مسیحا بے رخی بیمار سے اچھی نہیں

یا رحمۃ للعالمیں ادرک لزین العابدیں
محبوس اید الظالمیں فی الموکب والمزدحم

آپ کی غزل بھی تصوف و فلسفہ کا معدن حقیقت اور اصلیت کا خزانہ ہوتی ہے۔ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے ان

سے وہ رازِ پنہانی جلوہ نما ہوتے ہیں جن تک رسائی اور پردہ دری ہر ایک کا کام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی اس راز کو افشا کرتے ہیں جو دیدۂ بصیرت رکھتے ہیں۔ آپ کے کلام میں جہاں اصلیت ہے وہاں ان میں سادگی اور عام فہمی بھی ہے۔ وہ ایسے نہیں ہیں جن کے سمجھنے کے لیے کلامِ غالبؔ کی طرح شرح کی ضرورت ہو۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ عام فہم اور صاف ہیں اور پھر فلسفہ اور تصوف کے مشکل ترین مسائل کے حامل بھی، وہ تخیل کے لحاظ سے بلند سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور اس کے باوجود اصلیت سے دُور نہیں، رنگینی اور لطفِ زبان سے خالی نہیں۔ آپ نے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ معمولی بول چال کی زبان کس طرح غزل کا بارِ امانت اُٹھا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا ۔۔۔ کوئی تم سا نظر نہیں آتا

ڈھونڈتی ہیں جسے مری آنکھیں ۔۔۔ وہ تماشا نظر نہیں آتا

جیتے جی اپنے اس کو دیکھوں گا ۔۔۔ مجھے ایسا نظر نہیں آتا

ہو چلی انتظار میں یہ عمر ۔۔۔ کوئی آتا نظر نہیں آتا

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے ۔۔۔ جو ہے اپنا نظر نہیں آتا

جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں ۔۔۔ دینے والا نظر نہیں آتا

زیرِ سایہ ہوں اس کے اے امجدؔ ۔۔۔ جس کا سایہ نظر نہیں آتا

نالۂ جانِ خستہ جاں عرشِ بریں پہ جائے کیوں
میرے لیے زمین پر صاحبِ عرش آئے کیوں

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ، درد کو اور کیوں بڑھاؤ
نسبتِ ہو کو توڑ کر کیجیے ہائے ہائے کیوں

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ مرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں

امجدِؔ خستہ حال کی پوری ہو کیوں کر آرزو
دل ہی نہیں جب اس کے پاس مطلبِ دل بر آئے کیوں

دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ
دیکھ لیا رُخِ حسیں اس درِ نیم باز سے

حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب ہم کو پائے بوسی کا
بندگی میں یہ کبریائی ہے

رکھ دیا قدم پہ سر جب انہیں خفا پایا
خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردے کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

وہ کرتے ہیں سب چھپ کر تدبیر اسے کہتے ہیں
ہم دھر لیے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

رُباعیات کے چند نمونے پیش ہیں :۔

صنعت تری ہر خار دکھاتا ہے
ہر غنچہ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یارب
پتّہ پتّہ ترا پتہ دیتا ہے

ضائع نہ کر مانہ سرفروشی کو مری
مٹی میں ملا نہ گرمجوشی کو مری
آتا ہوں کفن پہن کے اے ربّ غفور
دھبّہ نہ لگے سفید پوشی کو مری

پیکِ اجلِ خانہ خراب آتا ہے
برباد کُن شیب و شباب آتا ہے
اے ملکِ عدم کے جانے والو ٹھہرو
اک آبلہ پا بھی ہم رکاب آتا ہے

رُخ مہر ہے قد خطِ شعاعی کی طرح
ہے گلہ امت میں وہ راعی کی طرح
اس خاتم انبیا کا آخر میں ظہور
ہے مصرع آخر رُباعی کی طرح

ہر گام پہ ٹھکرا کے گرا جاتا ہوں
نقشِ کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں

اب تُو ہی سنبھال میرے دینے والے　　میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی　　طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو　　حضرت اتم سے دیا سلائی اچھی

گردش میں یہ گرد بار آخر کب تک　　طرح کون و فساد آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن　　اضداد میں اتحاد آخر کب تک

حضرت امجد کے متعلق کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

---

(۲) امیر[1]

سید حسین علی خاں امیر ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔ ۱۲۷۰ھ میں تولد ہوئے۔ اولاً محمد سرفراز علی صفی سے اصلاح لیا کرتے تھے اس کے بعد داغ کے شاگرد ہوئے۔ آپ کا کلام اپنے اُستاد کے رنگ میں ہی ڈوبا ہوا ہے جعفر ۱۳۵۷ھ میں انتقال ہوا۔

ہمیشہ ہم ٹھہر سکتے نہیں ہیں دیر و کعبہ میں　　وہیں جانا پڑے گا ہم کو رہتے تھے جہاں پہلے

روکے سے نہیں رکتے ہیں ارباب اولعزم　　دریا میں سڑک بن گئی موسیٰ کے قدم سے

اُٹھو امیر بُت نے دیا ہے کہیں جواب　　کیا بیٹھے باتیں کرتے ہو پتھر کے سامنے

دن گذرتا ہے بے قراری میں　　رات کو کب قرار آتا ہے

رندوں کی پھر کشاکش رندانہ دیکھیے　　بند ایک دن اگر درِ میخانہ رہ گیا
جنگل ہو، کوئے یار ہو، یا ہو کوئی مقام　　دل لگ گیا جہاں وہیں دیوانہ رہ گیا

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم۔

لیلیٰ رہی نہ قیس، نہ شیریں، نہ کوہکن — دنیا میں حسن و عشق کا افسانہ رہ گیا
ساقی نے خالی جام عطا جب کیا مجھے — لبریز ہو کے عمر کا پیمانہ رہ گیا
صبح شب وصال گیا کوئی اے امیر — شیشہ بغل میں، ہاتھ میں پیمانہ رہ گیا[1]

کعبہ کی جو عظمت ہے مرے دل کی وہی ہے — اس گھر کا مکیں اور نہ اس گھر کا مکیں اور[1]

---

(۳) آزاد

محمد حسین آزاد بھی حیدر آباد کے باشندے ہیں۔ ۱۲۹۷ھ میں تولد ہوئے۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ شاعری میں حضرت امجد سے آپ کو تلمذ تھا۔

آپ کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے جو شوخی اور ظرافت سے مملو ہے اور اکبر الہ آبادی سے ملتا ہے۔ مگر جیسا کہ حضرت امجد نے تحریر فرمایا ہے:۔

"اگر مرحوم اکبر کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اسی طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے۔ ان کی تمام نظمیں اپنے خاص رنگِ ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہیں[2]۔"

خیالات آزاد کے نام سے آپ کے کلام کے دو حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ موجودہ زندگی کے اخلاقی معایب کو محسوس کرنے اور اصلاح معاشرت کے لیے کارآمد ہو سکتا ہے۔ بالک نور بان، مسدس آزاد وغیرہ آپ کی دوسری تصانیف ہیں، ۱۳۸۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

یہ مِس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مَس

غضب کا ہے جوبن بلا کا ابھار — مِس فتنہ زا کے یہ سولہ برس
یہ سب کچھ ہی اس سے حاصل ولا — عبث تجکو اس کی ہوئی ہے ہوس
یہ کس برتے پر اس کا عاشق ہوا — نہ ہوگی یہ مفلس کی فریاد رس

---

[1] دیوان امیر۔

[2] خیالات آزاد حصہ دوم۔

تُو دیتا ہے دل اور وہ لیتی نہیں — کہ دل اس کی نظروں میں ہے خار و خس
نہ دلدار ہے یہ، نہ ہے دلرُبا — یہ زردار ہے زر رُبا ہے یہ بس
یہ مس ہے نہ پگھلے گی زر کے بغیر — یہ مس ہے نہ ہوگی کبھی ٹس سے مس

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لے جائیں
جدھر دیکھو ادھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا

لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت
لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

سفارش کا اسے تم بھول کر ٹٹو نہیں کہنا
ہوا سے باتیں اب کرنے لگا گھوڑا سفارش کا

ترقی کا نتیجہ قابلیت سے نہ نکلے گا
لگاؤ گے نہ تاوقتیکہ تم جوڑا سفارش کا

سفارش نے تو اونچے اونچوں کو نیچا دکھایا ہے
بڑا ہی سورما ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا

یہ دل گردہ ہمارا دیکھو پیشِ داورِ محشر
قیامت میں بھی دامن ہم نے کب چھوڑا سفارش کا

---

(۴) بازغ — عبدالحیٔ نام اور بازغ تخلص، صیغۂ مالگزاری میں ملازم تھے۔ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام پاکیزہ ہوتا تھا۔ رسالہ صحیفہ میں مدتوں ان کا کلام شائع ہوتا اور خراجِ تحسین حاصل کرتا رہا۔

خود فراموشی کا عالم مجھ پہ تھا چھایا ہوا
اس طرح سے میں تری محفل میں تھا گویا نہ تھا

وہ چوچلے سخن کے جو تھے لازمِ سخن — بازغ نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے دیواں میں کھدیے

موت کا مجھ پہ ہے احسان کہ آئی شبِ وصل　　غم سے میں چھوٹ گیا فکرِ سحر ہی نہ رہی

اثر کا میرے نالوں نے نشاں تک بھی نہیں پایا
گئے عرش بریں تک اور ساتوں آسماں ڈھونڈے

تصویرِ شاعری

یہ ماحصلِ الفت و عشقِ شعراء ہے　　خاصے ہیں تنومند مگر حال بُرا ہے
تمغائے تفاخر ہوی رسوائیِ عالم　　اس عشق کی سرکار سے کیا رتبہ ملا ہے
مفروضہ ہیں اشکال تو اُلفت ہے کہاں کی　　تصویر جو خالی ہے تو پھر عشق ہی کیا ہے
معشوق بھی پھر وہ کہ محالات کا مجمع　　ہر عضو میں ہر جنس کا اک جوڑ لگا ہے
فندق لب و پستہ دہن و سیب زنخداں　　میوے کا ہے انبار کہ یارِ شعراء ہے
ابرو ہیں کماں، تیر مژہ اور نگہ تیغ　　وصفِ رُخِ جاناں ہے کہ سامانِ وغا ہے
غنچہ دہن و گل بدن و سرو سہی قد　　دلبر کا سراپا ہے کہ اک باغ لگا ہے [1]

---

(۵) آصفی

میر اسد علی خاں نام، آصفی تخلص، نظام یار جنگ حسام الدولہ حسام الملک خان خاناں خطاب، امرائے دربار آصفی سے تھے۔ آصف جاہ اول کے ہمراہ آپ کے اجداد دکن میں آئے اور جاگیر و مناصب سے سرفراز ہوئے۔ شاہ نواز خاں صمصام الملک جو مولف ماثر الامراء کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہینگے آپ کے اجداد میں شامل ہیں۔ ۱۲۷۱ھ میں آصفی کی ولادت ہوئی اور ۱۳۴۵ھ میں انتقال ہوا۔ آپ کے کلام میں مرثیہ، سلام اور قصیدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ پند و نصیحت بھی آپ کے کلام میں موجود ہے۔

ایک دن خاک میں ملنا ہے ضرور　　شوکت و شان نہ دکھلایئے گا

اے غافلو نہ سمجھو رہنے کی جا ہے دنیا　　ہم اس میں میہماں ہیں مہماں سرا ہے دنیا

---

[1] رسالہ حیدرآباد۔

نہ آیا کبھی آصفی دل بتوں پر　　کٹی عمر میری خدا کہتے کہتے

اپنے عصیاں پہ ہمیں چاہیے رونا دن رات　　دیر تو ہوگی دعاؤں کا اثر ہونے تک

مستِ مئے ولائے جنابِ امیر ہوں　　عالم ہے دل میں آنکھ میں شیشے کا جام کا

مدد میں غیر سے کس طرح آصفی چاہوں　　بجز علیؓ کوئی مشکل کشا نہیں ہوتا

گھر سے جب بہرِ سفر حضرت شبیرؑ چلے　　سر کٹانے کے لیے مالکِ تقدیر چلے

آئے گا چین مجھے ہجر پدر میں کیوں کر　　جی لگے گا میرا کیا جانئے گھر میں کیوں کر

عزیز قتل ہوئے اس جناب سے پہلے　　ستارے ڈوب گئے ماہتاب سے پہلے[1]

---

(۶) آزاد یہ دوسرے آزاد ہیں، گورسرن بلی نام اور آزاد تخلص، قوم کے کائستھ اور ایک مشہور خاندان کے فرد ہیں۔ آپ کے دادا توکل تخلص اور والد اوج تخلص کرتے تھے۔ چچا انور تھے۔ اس طرح آزاد خاندانی شاعر ہیں۔ آزاد کو منا من کنتوری سے تلمذ تھا۔ جملہ اصنافِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ زیادہ تر تصوف میں خیال آرائی کی ہے۔

ہر ذرۂ کونین ہے گھر ذاتِ خدا کا　　قبلہ ہے مگر نام فقط قبلہ نما کا

پھر نہ پلٹی وہ صدا اس گنبد دوّار سے
نعرۂ منصور کیا باہمتِ مردانہ تھا

---

[1] مرقع سخن جلد دوم۔ صفحہ (۱۷۱ تا ۱۷۶)

دعوے جنہیں آزاد تھے یاں نام ونشاں کے
عالم میں نظر آتے ہیں بے نام ونشاں آج

تعلق دو جہاں سے اُٹھ گیا ہو
دمِ آخر لگی ہو لَو خدا سے

زباں زد ہے سب کے فسانہ ہمارا
وہاں ذکر ہے غائبانہ ہمارا

ممکن نہ تھا کہ چیر کے دکھلائیں دل تمہیں
قطرہ لہو کا اک سرِ مژگاں بنا دیا

پُتلیاں آنکھوں میں ٹھہریں ہو کے محوِ حُسنِ یار
نقشِ حیرت ہوگئیں تصویرِ جاناں دیکھ کر

راضی کسی طرح پہ کریں گے ہم اپنا دل
وعدہ ملے جو چین کا ہم کو قضا کے بعد

آئے ہیں تیرے در پہ کریں کیا سوال ہم
ہم آپ عرضِ حال ہیں صورت سوال ہے[1]

---

(۷) توفیق[2] سید جلال الدین توفیق۔ سادات مہدویہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۲۸۲ھ میں حیدر آباد میں تولّد ہوئے۔ عربی اور فارسی میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ عروض معانی اور بیان سے پوری طرح واقف و ماہر تھے۔ خطاطی میں کمال حاصل تھا۔ نستعلیق، نسخ، شفیعہ اور شکستہ میں پوری طرح مہارت تھی۔ اپنے باپ سید ابراہیم تصدیق سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ غالب اور مومن کی طرز کے مقلد تھے۔ ۱۳۳۹ھ میں آپ کا انتقال

---

[1] مرقع سخن جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۳ تا ۳۱۷)

[2] تزک محبوبیہ۔

ہوا۔ دُنیائے شاعری میں توفیقؔ کا ایک خاص درجہ ہے ان کی غزلیں اپنی رنگینیٔ خیال و عاشقانہ مضمون آفرینی و لطف زبان، شوخیٔ بیان اور حسن و ادا کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہیں۔

توفیقؔ نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا کلام زیادہ تر غزل پر مشتمل ہے اور یہ غزلیں تمام تر تصوّف اور فلسفہ سے مملو ہیں۔ اُردو شاعری میں خواجہ میر دردؔ کا کلام تصوّف کے لحاظ سے سب سے بلند و بالا ہے اس کے بعد کسی نے غزل میں اُن کا رتبہ حاصل نہیں کیا۔ مگر توفیقؔ کا کلام ان کے نقشِ ثانی کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ازل سے ناز پرور ہوں خرامِ ناز پرور کا
میری ہستی سہرا کرتی ہے دم آشوبِ محشر کا

یہ بخشی خیرگی تابِ جمالِ روئے ساقی نے
بنا ہر نقش می شاغر میں پردہ چشمِ ساغر کا

لیے پھرتا ہے ساتھ اپنے غبارِ خاک کی صورت
مرے سینہ میں ہر جوشِ نفس جھونکا ہے صرصر کا

رہے سلامت جو خاکساری کبھی تو اپنی ہوا بندھے گی
کبھی تو اٹھیں گے گرد بن کر، کبھی تو اونچا غبار ہوگا

تیرہ کامی کی بدولت کج ادائی بڑھ گئی ۔۔۔ پیچ کھا کر لب پہ نالہ زلفِ پُر خم ہوگیا
وائے رسوائی کہ بعدِ مرگ بھی لاشہ مرا ۔۔۔ میرے ہی دامان رسوائی میں کفنایا گیا
رونے والا کون تھا توفیقؔ میری قبر پر ۔۔۔ ابر آکر چار قطرے اشک کے برسا گیا

قطرہ دریا میں تو دریا ہے نہاں قطرہ میں ۔۔۔ میں اک عالم میں ہوں مجھ میں ہے اک عالم پیدا

گرایا بارِ غم نے اس طرح خاکِ مذلت پر ۔۔۔ نہ اُٹھے ہم زمیں سے بیٹھ کر دیوار کی صورت

وہ زار ہوں کہ کسی کو نظر نہ آؤں گا　　نہاں خود اپنی نگاہوں سے ہوں نظر کی طرح

تنِ زار پر مرے داغوں کا کچھ عجب طرح کا ہجوم ہے
کچھ عجب طرح کی بہار ہے کئی گل شگفتہ ہیں خار پر
میں خیال خنجرِ ناز سے ترے بچ گیا تو بھی خیر کیا
تری یاد قامتِ دل رُبا مجھے کھینچ ڈالے ہے دار پر

بلا کش ہوس دید روئے یار ہوں میں　　اسیر گیسوئے شب ہائے انتظار ہوں میں
حجاب ناز ہے ان کو مجھے حجابِ عدم　　سرِ مزار ہیں وہ اور سرِ مزار ہوں میں
سبک ہوں خاک میں مل کر بھی اس قدر توفیق　　اٹھوں کبھی جو زمیں سے تو اک غبار ہوں میں

وہ شکستہ حال ہوں میں کاتب تقدیر نے　　حرف بھی لکھے شکستہ نامۂ تقدیر میں

زبانِ زخم سے پوچھو زبان درازیٔ تیغ　　مرے بیان کا گر تم کو اعتبار نہیں

سرِ محشر کسی کی یادِ قامت لے کے جاتے ہیں
قیامت ہے قیامت میں قیامت لے کے جاتے ہیں
عزیز گردشِ وحشت ہوں اے توفیق مر کر بھی
بگولے سر پہ میری خاک تربت لے کے جاتے ہیں

سر میں چکر، پاؤں زخمی، بال و پر ٹوٹے ہوئے
دام سے صیاد کے یوں آئے ہم چھوٹے ہوئے
پاؤں میں گردش ہو اور گردش میں ہو لطفِ خلش
آبلے ہوں، آبلوں میں خار ہوں ٹوٹے ہوئے
اب کہاں توفیق وہ فریادِ بے تابی کا زور

دم بھی ہے اُلجھا ہوا، نالے بھی ہیں ٹوٹے ہوئے

---

(۸) **حلم** محمد[1] جمال الدین نام، حلم تخلص اور صادق جنگ خطاب تھا۔ نیرالدین خاں صادق جنگ ثانی کے فرزند تھے۔ مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ طبقہ امراء میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے مڈل کا امتحان درجہ اعلیٰ میں پاس کیا چونکہ اس زمانہ میں طبقہ امراء کے لیے یہ ایک نایاب امر تھا۔ اس لیے سرآسمانجاہ مدارالمہام کی جانب سے جریدہ میں اس پر اظہار خوشنودی فرمایا گیا۔ آصف جاہ سابع کے مصاحبوں میں داخل تھے۔

شاعری کا خاص مذاق تھا، مائل سے تلمذ رکھتے تھے، ہندی سے خوب واقف تھے شایق کی طرح انہوں نے بھی ٹھمریاں لکھی ہیں اور اس کا مجموعہ "پیت کی ریت" کے نام سے حال میں آپ کے فرزند نے شائع کیا ہے۔ ان کی زبان شستہ اور صاف ہے۔ ۱۳۴۶ھ میں حلم کا انتقال ہوا۔ حیدرآباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

غزل

چشمِ ساقی کی بدولت اک جہاں مدہوش ہے
میکدے سے مدرسے تک شورِ نوشا نوش ہے

بزم میں ساقی کی مستی کا کچھ ایسا ہے اثر
عقل کی ہے عقل گم اور ہوش بھی بے ہوش ہے

ہویتیں چشمِ بصیرت سے اگر دیکھے کوئی
پردے ہیں اسمی مسمّیٰ اس میں خود روپوش ہے

دیکھنا ہے کچھ اگر تو بند آنکھیں کیجیے
بات کرنا ہے تو اس قابل لبِ خاموش ہے

زندگی ہوتی بسر ہے حلم کی کس لطف سے
شاہدِ مقصود سے دن رات ہم آغوش ہے

---

[1] تزکِ محبوبیہ۔

ٹھمری دھناسری (سہ پہر دن)

دُور نہیں میں پاس ہوں سب کے   مبیرکو کوئی ڈھونڈھو تو
پھیر و جدھر مکھ سامنے ہوں میں   کھول کے آنکھیں دیکھو تو
حلمؔ نہیں میں اور ہی کچھ ہوں   جانو ، بوجھو ، سوچو تو

شاہانہ (دو پہر رات)

یہ کام کسو کی یاری ہے   میں اور مورا یار بھلا
سانچ کہت ہوں سن ری مائیں   ہر پل مورے سنگ ہے سائیں
ہر گھٹ میں واکی پرچھائیں   خلوت سے بازار بھلا
ہتی گھوڑا اونٹ چڑہت ہوں   دھن دولت سب پاس کہت ہوں
بھولی کب جگ دھندے میں   حلمؔ کو اپنا کار بھلا

---

(۹) دلؔ محمد حیدر نام اور دلؔ تخلص ، فلاطون جنگ لقمان الدّولہ اشرف الحکماء خطاب تھا۔ ۱۲۷۷ھ میں تولّد ہوئے اور ۱۳۴۱ھ میں وفات پائی، حیدرآباد ہی میں ڈاکٹری کی تعلیم پائی۔ ۱۲۹۹ھ میں اس کا امتحان پاس کیا۔ اولاً شمس الامراء کے یہاں ملازم ہوئے۔ پھر خانگی طور پر علاج کرتے رہے اس کے بعد حضرت غفران مکان کے اسٹاف سرجن مقرر ہوئے بیش قرار تنخواہ خطاب اور اعزازات سے ممتاز ہوئے۔ شاعری کا خاص مذاق رکھتے تھے۔ حفیظ الدّین پاسؔ[1] سے تلمّذ حاصل کیا تھا۔ تصوّف کا خاص شوق تھا اسی شوق نے شاعری کی طرف مائل کیا ہے۔ سوانح جامیؔ ، نماز دلؔ وغیرہ کتابوں کے مصنّف ہیں۔ دیوان غیر مطبوعہ ہے۔

دل کا آنا ، جی کا جانا ہوگیا   آنکھ لڑجانا بہانہ ہوگیا
تذکرے ہوتے ہیں اب تو جابجا   یار کا میرا فسانہ ہوگیا
پھنس گیا زلفوں میں دل اچھا ہوا   بے ٹھکانے کا ٹھکانا ہوگیا

---

[1] پاسؔ فیضؔ کے مشہور شاگرد تھے۔

میخانہ میں کرنا مجھے دفن اے مرے ساقی ‌ ‌ مٹی سے مری ساغر و پیمانہ بنانا

بے کسی حسرت وارماں کا ہے ہمراہ ہجوم ‌ ‌ دیکھو کس شان سے نکلا ہے جنازہ دل کا

دل کو جلا دیا ہے، مشعل بنا لیا ہے ‌ ‌ دل ہی کی روشنی سے پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں

کوئے قاتل میں چلو، جو ہو سو ہو ‌ ‌ جان اک دن جانے والی جائے گی

دل کو اندازِ نظر نے نظر انداز کیا ‌ ‌ آنکھ صبح سے نہ بدل آنکھ بدلنے والے[1]

---

(۱۰) ذہین

سید غلام مصطفےٰ ذہین بھی اسی دور کے ایک نام آور اور مشہور شاعر تھے۔ ۱۳۴۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا کلام بھی عشق و عاشقی گل و بلبل کے افسانوں سے پاک ہے۔ عموماً اخلاقی مضامین آپ نظم کرتے تھے۔ کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ الفاظ صاف و شستہ، ترکیبیں دل نشیں ہوتی ہیں۔ مسلسل نظمیں جن میں قوت فکر کا پورا امتحان ہوتا ہے۔ بہت اچھی لکھتے تھے۔ اخلاقی نظموں کے ساتھ معرفت اور تصوف میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ ذہین پُر گو شاعر تھے۔ حیات طفلی کے ہر ایک پہلو پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصہ اور واقعہ کے پیرایہ میں اخلاقی باتیں بیان کی ہیں۔ بچوں کی روزمرہ ضروریات پر ان کی اچھی نظمیں ہیں۔

انسان

او بشر! او خاک کے پتلے تجھے اتنا غرور ‌ ‌ تیرے ہی ہم جنس اور پھر تو ہی ہے ان سے نفور
نشۂ زر نشۂ زر کی طرح کیوں چڑھ گیا ‌ ‌ ہو گئی الٹی سمجھ، کیوں کیا ہوا تیرا شعور
کر خدا کا شکر کیا تھا، کیا سے کیا تو ہو گیا ‌ ‌ جو ہے کرنا آج کر لے کل تو ہے روزِ نشور
ہو کے انساں پھر کرے تو ہی جفا انسان پر ‌ ‌ کیا یہی ہے آدمیت کا شعار اے بے شعور

---

[1] دیوان دلؔ مخطوطہ۔

شیریں کلامی

عجب چیز ہے تُو بھی شیریں کلامی — کہ شیدا ہے تجھ پر ہر اک خاص و عامی
مٹاتی ہے رنج و غم تلخ کامی — بناتی ہے دُنیا میں لوگوں کو نامی

بن آتے ہیں سب کام تجھ سے جہاں کے
تجھی سے ہیں دل شاد خرد و کلاں کے

ترے دم سے دُنیا میں خلق و مُروّت — ترے خلق سے لطف و اکرام و راحت
ترے لطف سے فیض و جود و عنایت — ترے فیض سے رحم و انسان و رحمت

تری رحمتیں سایہ گستر جہاں پر
ترا سایہ ظِلّ ہما سے ہے بڑھ کر

غزل کا نمونہ :-

سب ہیں فانی کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
اک خدا کو ہے بقا دونوں جہاں کچھ بھی نہیں

کرتی ہے عیب و ہُنر کو آشکارا گفتگو — جوہرِ انساں کا ہے آئینہ گویا گفتگو

زندگانی کا زمانے میں بھروسہ کیا ہے — جُز فنا ہونے کے انساں میں رکھا کیا ہے

بھلائی کیے جا شرافت یہی ہے — اطاعت یہی اور طاعت یہی ہے
نکوئی میں کر نام شہرت یہی ہے — بھلائی کے کر کام راحت یہی ہے

سخت دشوار ہے انسان کی پہچان ذہین — دوست کہتے ہیں کسے آپ نے سمجھا کیا ہے
چشمِ کرم بشر سے ذلّت کا سامنا ہے — اللہ سے طلب کر جو تجھ کو مانگنا ہے

عطا کر قناعت کی دولت کریم — نہیں مجھ کو قاروں کا زر چاہیے
ہر اک کام میں کیجیے پہلے سعی — پھر اس کا خدا سے ثمر چاہیے

حیات و خرد کی سی نعمت ملی　　پھر اب کیا تجھے اے بشر چاہیے

سُنتے تھے لامکاں ہے یا رب مکان تیرا
ڈھونڈا جو اپنے دل میں پایا نشان تیرا
شمس و قمر ہیں تیرے اور بحر و بر ہیں تیرے
ہے یہ زمین تیری، یہ آسمان تیرا

---

(۱۱) شاد

راجہ کشن پرشاد نام شادؔ تخلص، یمین السلطنت بہادر، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی خطاب، مہاراجہ چندو لال کے پوتے، نرندر پرشاد کے آپ نواسے ہوتے ہیں۔ ۱۲۸۱ھ میں تولّد ہوئے۔ مدرسۂ عالیہ میں تعلیم پائی، عربی، فارسی اور انگریزی میں کافی مہارت پیدا کی۔ خوش نویسی میں یدِ طولیٰ حاصل کیا۔ نانا کے جانشین اور جاگیرات پیشکاری سے سرفراز ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ میں پیشکاری کے ساتھ معین المہام فوج بھی بنائے گئے۔ ۱۳۱۹ھ میں مدار المہامی سرفراز ہوئی۔ ۱۳۳۰ھ میں اس خدمت سے سبکدوشی حاصل کی مگر پھر ۱۳۴۵ھ میں صدارتِ عظمیٰ کی جلیل القدر عظمت پر سرفراز ہوئے۔

شاعری کا خاص مذاق تھا۔ داغؔ اور آصفؔ کی شاگردی کی ہے۔ آپ کے دربار میں شعراء اور مصنّفین کا ہمیشہ جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ ایک زمانہ تھا۔ امیرؔ، جلیلؔ، ظہیرؔ دہلوی، سرشارؔ وغیرہ آپ کے زمرہ مصاحبین میں شامل تھے اور پھر فانیؔ بدایونی، ہوشؔ، بیگمؔ، محویؔ، غبارؔ ثاقبؔ، صغیرؔ وغیرہ آپ کے دربار میں رسائی رکھتے تھے۔ شادؔ کا کلام صوفیانہ خیالات سے مملو ہے۔ ہندو اوتاروں کی شان میں صوفیانہ نقطۂ نظر سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں وہ اُردو میں ایک جدید اضافہ ہے۔

اب تک آپ کے کلام کے کئی ایک مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں شادؔ کے کلام سے معلوم ہو گا کہ کیا بلحاظ نزاکت، خیال و لطفِ زبان اور کیا بلحاظ ندرت جذبات و پاکیزگی حسیات قابلِ تعریف ہے۔ ۱۳۵۹ھ / ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ ملاحظہ ہو:-

کافر نہ کہو شادؔ کو ہے عارف و صوفی　　شیدائے محمدؐ ہے وہ شیدائے مدینہ

احمد کے در پہ اس لیے میں جبہ سا رہا — سجدے کے لائق اور کوئی آستاں نہ تھا
معراج میں حضور جو مدعو خدا کے تھے — خلوت تھی کوئی اور وہاں میہماں نہ تھا

کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی — رنگ شاد، اب عاشقانہ ہو گیا

بال کھولے ہوئے اے گیسوؤں والے آجا — آجا آجا، مجھے دامن میں چھپا لے آ جا
خوف یہ ہے کہ نہ ہو نوح کا طوفاں برپا — رونے سے پہلے مجھے یار منا لے آ جا

گزرتے ہیں جی سے گذر جانے والے — بہت یاد آتے ہیں مر جانے والے

کسی کا یہاں حال کیا ہو رہا ہے — خبر بھی ہے اور بے خبر جانے والے

مرا اور تیرا افسانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
وہی دو دل میں یارانہ جو پہلے تھا سو اب بھی ہے
مبارک شاد، زاہد کو یہ جھگڑا کفر اور دیں کا
مرا مشرب فقیرانہ، جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

ہوا نہ حال پہ وہ شوخ مہرباں فریاد — الٰہی یوں ہی گئی میری رائگاں فریاد
ستم رسیدہ ہوں ایسا کہ میری حالت پر — زمین آہ کرے اور آسماں فریاد
زمیں پہ آہ جو کھینچی فلک پہ جا پہنچی — خدا کی شان کہاں سے کہاں گئی فریاد
جفائیں لاکھ سہیں اور سہے ہزار ستم — نہ آئی ضبط محبت سے تا زباں فریاد

تجھے الفت نہیں مجھ سے، یہ تم نے کیا کہا مجھ سے
گلہ مجھ کو ہے تم سے، جیسے ہو تم بے وفا مجھ سے

خموشی کس لیے ہے بات کیوں مجھ سے نہیں کرتے
قسم ہے میرے سر کی سچ کہو روٹھے ہو کیا مجھ سے

ادھر باغباں دشمن ادھر تاک میں صیاد
ہے اک گل کے لیے بدلی، زمانے کی ہوا مجھ سے

میں اپنا آپ عاشق ہوں، میں اپنا آپ ہوں معشوق
حقیقت میری کیا جانے کوئی میرے سوا مجھ سے

طلب کرتا ہوں جو اس سے عطا کرتا ہے وہ مجھ کو
بحمد اللہ راضی شاد ہے میرا خدا مجھ سے

مثنوی

ساقی دے جام ارغوانی — جس سے ہو اُمنگ پر جوانی
لا جلد پلا دے دیر کیا ہے — رندوں کے لیے سبھی روا ہے
طاقت نہیں مجھ کو کر توانا — خم منہ سے لگا نہ کر بہانا
اس وقت وہ صبح دل کشا ہے — پھولوں کی بہار جانفزا ہے
نکہت ہے گلوں کی روح پرور — ہے آج مشام جاں معطر
آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں — مدح خواجہ میں کچھ کہوں میں
لازم ہے مجھ کو نغمہ سنجی — رکھتا ہے یہ آرزو مزاجی
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں — مداح حبیبِ مصطفےٰ ہوں

چند رُباعیات پیش کی جاتی ہیں جو بلحاظ حُسن و خوبی اپنی آپ نظیر ہیں۔

پانی جو برس رہا ہے یہ رحمت ہے — کیا شان ہے معبود کی کیا قدرت ہے
دھوتا ہے گنہ گاروں کے سارے اعمال — یہ بندہ نوازی ہے عجب حکمت ہے

ہرگز نہیں ہم رنگ بدلنے والے — ہیں مرد نہیں بات سے ٹلنے والے
حساد کو کیوں رشک نہ ہوگا اے شاد — جلنے کے لیے آئے ہیں جلنے والے

جیسا کہ میں نے قبل ازیں لکھا ہے مہاراجہ کو تاریخ نویسی کا بھی خاص ملکہ ہے طوالت کے خیال سے صرف ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جس کو آپ نے اعلیٰ حضرت

آصف جاہ سابع کی تخت نشینی کے موقع پر موزوں فرمایا تھا۔

سلامت رہیں میرے آقا الٰہی ۔ بقا جن کے دم سے ہے ملکِ دکن کی
وہ آقا جو ہیں مسند آرائے دولت ۔ شہِ ذی فتوت مہِ کامگاری
سعید جہاں میر عثمان علی خاں ۔ امیروں کے سلطان، غریبوں کے والی
ہوئے جلوہ آرا جو تختِ پدر پر ۔ تو سب نے کہا جان میں جان آئی
یہی شاہ محبوب کے جانشین ہیں ۔ انہیں سے ہے خستہ دلوں کی تسلی
خدا کے کرم سے ہے امید ہم کو ۔ کہ یہ نونہالِ گلستانِ شاہی
اب جد کے نعم البدل ہوں گے ثابت ۔ رہے گا جہاں ہو کے ان کا فدائی
رعایا کے دل کو مسخر کریں گے ۔ بصد دل نوازی بصد چارہ سازی
خلایق کے محبوب ہو کر رہیں گے ۔ پدر کی طرح سے با تائید باری
ہوا خواہ خرم ہوں بدخواہ پُر غم ۔ بڑھے عمر اقبال میں ہو ترقی
یہ تاریخ دے نذر لے شاد چل کر ۔ مبارک ہو سرکار مسند نشینی

---

(۱۲) رسا غلام مصطفیٰ نام اور رسا تخلص، حیدرآباد میں تولد ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی، کم عمری سے شعرگوئی کرنے لگے، حضرت داغ سے تلمذ تھا۔ ممتاز تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ جملہ اصنافِ سخن میں مہارت تھی۔ ضخیم دیوان غیر مطبوعہ ہے۔ رسا کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی نہیں ہے مگر پُر اثر ہوتا ہے۔ نمونہ کلام حسبِ ذیل ہے ؎

شوخی سے بچا دل تو پھنسا دامِ حیا میں ۔ سَو طرح کے انداز ہیں ظالم کی ادا میں
کس منہ سے کروں میں ستم و جور کا شکوہ ۔ وہ دیکھتے ہیں میری وفاؤں کو جفا میں
میں وصل کا خواہاں وہ مری مرگ کے طالب ۔ اب دیکھیے ہوتا ہے اثر کس کی دُعا میں

ناکامِ محبت کو تدبیر سے کیا حاصل ۔ پہلو سے مرے بچ کر تقدیر نکلتی ہے
افسردہ رسا ہیں ہم اس درجہ شبِ فرقت ۔ جو آہ نکلتی ہے دلگیر نکلتی ہے

ناامیدی سے تباہی خانۂ دل کی ہوئی ورنہ ارمانوں سے کیا آباد یہ ویرانہ تھا

وصل کی کوئی تدبیر نکالی ہوتی میں ہوں مجبور مگر آپ تو مجبور نہیں

ایسا مٹا کہ نام و نشاں تک نہیں رہا کیوں اے فلک میں مظہرِ شانِ ظہور تھا

نہ مارا تیغ سے تم نے ادا سے کر دیا بسمل کوئی تلوار کیسی ہے، کوئی تلوار کیسی ہے[1]

---

(۱۳) رعدؔ میر نادر علی نام، رعدؔ تخلص، خاندانی شاعر ہیں، آپ کے والد شعلہ کا تذکرہ ہو چکا ہے، عربی اور فارسی کی اچھی قابلیت تھی، اُستاد الملک سیّد علی شوستری سے استفادہ کیا تھا، حکمت کرتے تھے، اولاً اپنے باپ اور پھر نظم طباطبائی سے تلمّذ رہا۔ نظم و نثر میں کئی کتابیں لکھی ہیں، جملہ اصنافِ سخن میں مشقِ سخن تھا۔ اُستادِ سخن بن گئے تھے۔ اُردو کے مشہور اساتذہ کے رنگ میں کلام موزوں کرتے اور کامیاب رہتے تھے۔ دردؔ، مومنؔ، غالبؔ، ریاضؔ وغیرہ کے رنگ میں ان کا کلام قابلِ قدر ہے۔ ۱۳۶۳ھ میں انتقال ہوا۔

طالب تو بے شمار ہیں میرے سوا مگر مطلوب دوسرا نہیں تیرے سوا مجھے

حالِ دل سے وہ میرے واقف ہے حاجتِ نامہ و پیام نہیں

باوفا ہو کہ بے وفا لیکن دوست آخر عدو سے بہتر ہے

دل گیا، جان گئی، سب ہوئے مہماں رخصت
نہ گئی، پر نہ گئی تو شبِ فرقت نہ گئی

---

[1] مرقعِ سخن جلد اوّل۔ صفحہ (۲۲۹ تا ۳۰۴)

نہ کر خیال کبھی رعدؔ آشنائی کا　　اگر کیا ہے تو صدمہ اٹھا جدائی کا

حالتِ یاس میں تسکین دلِ زار تو ہے　　نہ سہی وصل، مگر وصل کا اقرار تو ہے

ہوں بے خودیٔ شوق سے رسوائے محبت
کرتا ہوں نہاں راز تو ہوتا ہے عیاں اور

اہلِ دلا پہ گرتی ہے برقِ بلائے ناز　　لیکن متاعِ صبر طلب گار دیکھ کر

رعدؔ اپنی بات کی کیا بات ہے　　وہ نہیں سنتے کہے جاتے ہیں ہم

میں نے مانا کہ تم مسیحا ہو　　یہ تغافل تو زہرِ قاتل ہے[1]

---

(۱۴) سعیدؔ میر تراب علی خاں نام، سعیدؔ تخلص اور تراب یار جنگ خطاب ہے۔ ۱۳۰۲ھ میں حیدر آباد میں ولادت ہوئی۔ میر داور علی خاں بہرام الدولہ کے فرزند ہیں۔ تعلیم اور تربیت حیدر آباد میں ہوئی۔ حکومتِ آصفیہ کی مختلف خدمات کو انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ سعیدؔ کا کلام صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ عموماً غزل گوئی کرتے ہیں۔ البتہ اس کے ساتھ سلام اور مرثیہ بھی موزوں کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:-

لذتِ درد نہیں، لذتِ فریاد نہیں　　اب وہ پہلی سی جفا اے ستم ایجاد نہیں

خدا کا شکر ہے آنسو ٹپک پڑتے ہیں آنکھوں سے
مصیبت ٹوٹتے جب دیکھتا ہوں اپنے دشمن پر

---

[1] مضمون راقم رسالہ آجکل اکتوبر ۱۹۴۵ء

تری تیغِ ادا کے اے ستم گر کھلے جوہر ہمارے امتحاں سے

نہیں اب آہ کرنے کی تمنّا ملیں وہ لذتیں ضبطِ فغاں سے

سعید ان کے تیور یہ بتلا رہے ہیں ستم آج ہیں ناروا ہونے والے

مری تقدیر کے جتنے ستم تھے ملے کچھ آپ سے کچھ آسماں سے

دیکھا گیا نہ آپ سے یہ اور بات ہے بسمل کا حال دید کے قابل ضرور تھا

شہ کے سینہ پر سکینہ مدّتوں سوتی رہی
ایک دن آیا کہ سب خوابِ پریشاں ہوگیا

ناتوانی عابدؑ مضطر کی اور منزل کڑی
کس قیامت کی تھی حسرت دیدۂ زنجیر میں

ایک پیاسے کی لڑائی نے یہ ظاہر کردیا
کس شجاعت کا اثر تھا فاطمہؓ کے شیر میں[1]

---

(۱۵) حسرت مولوی عبدالقدیر المتخلص بہ حسرت، حیدر آباد کے مشہور مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی، پنجاب یونیورسٹی سے امتحانات مولوی فاضل اور منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی، مدرسہ دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا ہوئی اور جامعۂ عثمانیہ میں صدر شعبۂ دینیات کی خدمت

---

[1] مرقع سخن جلد اوّل۔ صفحہ (۲۵۵ تا ۲۶۰)

سے وظیفہ حاصل کیا۔ صاحبِ حال بزرگ تھے، ارشاد و ہدایت کے ساتھ شاعری بھی فرماتے ہیں۔ [illegible] میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ۱۲۸۸ھ میں ولادت ہوئی ہے۔ طویل عمر ہوئی۔ ۱۲[illegible]ھ/۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔ عربی، فارسی، اُردو، ہندی کے شاعر ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ [illegible] ہے:-

یاد نگہِ مست میں تھا بے خبر ایسا
بیکار رہے ساغر و مینا مرے آگے

آدمی آدمی سے ملتا ہے
تم ملوگے تو کیا بُرائی ہے

تیرِ نگاہ بے پناہ خنجرِ غمزہ جاں ستاں
مجمعِ عاشقاں میں آمشقِ فنونِ ناز ہو

ساقی میں تیرے دست کرم پر نثار ہوں
اک جام اور دے میں ابھی ہوشیار ہوں

عشق ہے دل لگی نہیں، کھیل نہیں، ہنسی نہیں
دل کو خود اپنے ہاتھ سے دے کے یہ ہائے ہائے کیوں

جان دینے کا محبّت نام ہے
عشق کرنے کو کلیجہ چاہیے

ہوا بھی میں یا نہیں ہوں اے حسرت
آج تک طے یہ مسئلہ نہ ہوا

نیستی میں ہوں نہ ہستی میں ہوں
بے نشانی ہے نشانی میری

جستجو میں ان کی ہم خود کھو گئے
چاہتے کیا تھے مگر کیا ہو گئے

مرقعِ سخن جلد دوم۔ صفحہ (۲۳۹ تا ۲۴۴)

(۱۶) **شباب**

میر معین الدین علی خاں نام اور شباب تخلص تھا، خاندان آصفی سے تعلق رکھتے تھے۔ صاجزادہ کہلاتے تھے۔ ۱۲۹۸ھ میں تولد ہوئے۔ مدرسہ اعزہ میں جو اس زمانہ میں صاجزادوں وغیرہ کی تعلیم سے متعلق تھا تعلیم پائی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہو گیا۔ حبیب کنتوری سے تلمذ حاصل کیا۔ حبیب کنتوری کے انتقال کے بعد ضامن کنتوی سے اصلاح لینے لگے۔ پھر خود ہی اُستادِ سخن بن گئے۔ دیوان مرتب ہو چکا تھا مگر اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ شباب کا کلام، زبان کی لطافت، سادگی اور طرزِ ادا کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہے۔

ہم کو دونوں جہان سے کھویا — یا خدا ہو بُرا محبّت کا

کسی کا جلوہ دل کے آئینہ میں دیکھ لیتا ہوں — میں کوہِ طور پر اے حضرتِ موسیٰ نہیں جاتا

کہتے ہیں اپنے چہرے سے سرکا کے زلف کو — لو آج آفتاب گہن سے نکل گیا

ہم اور ستم شعار کہیں، سر بسر غلط — یہ آپ کی زباں ہے ہماری زباں نہیں

آپ اُف اُف جو کر رہے ہیں شباب — کیا کلیجے کے داغ جلتے ہیں

اللہ رے شوق دید میں قبلہ نما بنا — آنکھیں اسی طرف کو پھریں تم جدھر گئے

وہ بے قرار ہو کے چلے آئے میرے گھر — تردید نارسائیِ آہِ رسا تو کی

اس کے اُٹھ جانے سے برہم ہو گیا سامانِ عیش — شمع جل کر بجھ گئی اور خاک پروانہ ہوا

دن نکل آئے جو اُٹھے شب کو وہ رُخ سے نقاب
گیسوئے مشکیں بکھر جائے جو دن میں شام ہو[1]

---

[1] مرقع سخن جلد دوم صفحہ (۲۵۷ تا ۲۵۹)

(۱۷) **شہید** میر مہدی علی المتخلص بہ شہید، شہید یار جنگ خطاب ۱۳۰۳ھ میں تولد ہوئے۔ آپ کے دادا سید زین العابدین ہمدم طبا طبائی شیراز سے آئے تھے اور مہاراجہ چندولال کی استادی کا شرف حاصل کیا تھا۔ شہید کو شاعری کا ذوق ورثتاً ملا۔ اولاً نوحہ اور سلام موزوں کرتے اور پیارے صاحب رشید لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے پھر نظم طبا طبائی سے بھی مشورہ سخن لیا۔ مرثیہ، رباعی کے ساتھ غزل بھی موزوں کرتے رہے مگر کچھ عرصہ بعد غزل گوئی چھوڑ دی۔ نمونہ کلام حسب ذیل ہے:-

بجھا گیا ستم ایجاد شمع تربت بھی | ہمارے غم میں کوئی ایک اشکبار نہ تھا

بہت آج کل آئینہ دیکھتے ہو | تمہیں ہوگی اپنی نظر دیکھ لینا

نکلتا نہیں دم عجب کشمکش ہے | خدا جانے کیا دل میں اب آرزو ہے

کیا ہے ابر نے چھڑکاؤ صحن گلشن میں | جو خاک چھانیے ملتا نہیں ذرا سا غبار
گلوں کا رنگ جو کھلتا ہے سرخ ہے پانی | ہے نہر باغ کی گردن پہ آج خون بہار
ہوئی نہ صحن گلستاں میں آج طغیانی | بہا ہے پھوٹ کے نرگس کی آنکھ کا پانی
گلوں کی پتیوں پہ قطرہ ہائے شبنم ہیں | خدا کی شان کہ ٹھہرا ہے آگ پر پانی
نمو کا جوش زلیخا کا ہاتھ بن کے رہا | کہ صحن باغ سے ظاہر ہے چاک دامانی
کثرت گل کا اثر یاد رہے عمر بھر | ایک اٹھائیں اگر پھول اٹھ آتے ہیں چار

بے کار کی جستجو سے کیا ملتا ہے | دل میں الفت ہو پھر پتا ملتا ہے
اقرار تو کرلے اپنی نادانی کا | بندہ ہو جا تو پھر خدا ملتا ہے[1]

---

[1] مرقع سخن جلد دوم، صفحہ ۳۳۹ تا ۳۴۴۔

(۱۸) صفی

محمد بہاء الدین نام لیکن بہبود علی سے مشہور ہیں۔ صفی تخلص ہے۔
اورنگ آباد ان کا مولد ہے جہاں سنہ ۱۳۱۱ھ میں ولادت ہوئی۔
عربی وفارسی کی تعلیم پائی۔ ایک آزاد اور سیدھے سادے مسلمان ہیں، کچھ غزلیں ضیاء کچھ کلام فروغ کو بتایا پھر چند غزلیں کیفی کو بتائیں۔ اس لیے کیفی کے شاگرد مشہور ہیں ضخیم دیوان مرتب ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیات زبان کی شستگی، خیالات کی ہمواری اور روانی ہے، کیفی داغ کے شاگرد تھے اور صفی نے کیفی کی شاگردی کی۔ اس لیے داغ کا رنگ بھی ان کے یہاں ملتا ہے، مگر چونکہ گویا چھن کر پہنچا ہے اس لیے بہت لطیف اور نازک ہوگیا ہے۔ ان کے بیان میں بلند پروازی نہیں ملتی۔ روزمرّہ اور محاورہ بندی میں نفیس شعر ملتے ہیں۔ حسنِ بیان ہے ان کا زیادہ کلام سہل ممتنع ہے۔ تشبیہ واستعارہ کی ندرت بھی پائی جاتی ہے۔

صفی نے نظمیں بھی موزوں کی ہیں مگر غزلوں کے مقابلہ میں ان کی مقدار نہایت قلیل ہے۔ یہ غزل گو شاعر ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے اور رسالوں میں بھی اپنا کلام شائع کرنے نہیں دیتے۔ ان کی خودداری اور قناعت پسندی مشہور ہے صفی کا انتقال ۱۹۵۴ء میں ہوا۔

دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی

جفا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا قیامت آئی یا اس فتنۂ قامت کو شباب آیا

صفی کی جان بچ جائے تو بس ہے اس کے کوچہ میں
وہاں سے زندہ آیا تو سمجھ لو کامیاب آیا

ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لیے ترے ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے

وہ چھیڑ بھاڑ کے دیتا ہے "سنتے ہیں" وہ کب دے گا
جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید چھیڑ سے

وہ کون سا صدقہ ہے جو ہم پر نہیں ہوتا   لیکن نہیں ہوتا انہیں باور نہیں ہوتا

آفتیں ڈھائیں غضب برپا کیا   خیر تم نے جو کیا اچھا کیا

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے   کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

گریۂ اشک سے یاں رخصتِ بینائی ہے
اور وہ پوچھتے ہیں "آنکھ تیری آئی ہے"

معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا   لوگوں کو بُرا کام بھی کرنا نہیں آتا

دوستی عاشقی نہیں ہوتی   عاشقی دل لگی نہیں ہوتی

خدا سے دولتِ دُنیا صفی میں کیا مانگوں   غضب ہوا جو مرا کام بے رعا نہ ہوا

تیرا خیال کیا اِدھر آیا اُدھر گیا   جیسے ہَوا کے گھوڑے پہ کوئی سوار تھا

ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

جیتے جی بھی ہوتے ہیں انسان پر لاکھوں عذاب
کیا بتاؤں ان کی گنتی کیا کروں ان کا حساب

ایک ان میں قرض، وہ بھی قرض سودی کی بلا
جس کو یہ لپٹی ہوا پھر اس کا گھر کا گھر خراب

چیز پر، تنخواہ پر، جائداد پر قرضہ ملا
وہ بھی جس کی تین میں گنتی نہ تیرہ میں حساب

تلو میں سنتر ہاتھ آئے تو بڑی دولت ملی
کم ہوگیا اب سر کا سودا اور دل کا پیچ و تاب

ایسے پیاسے کی طرح مقروض کی حالت ہوئی
دوڑے جو پانی سمجھ کر اور وہ نکلے سراب[1]

---

(۱۹) عزیز محمد عز الدین خاں نام، عزیز تخلص اور عزیز یار جنگ بہادر خطاب مشرف جنگ المتخلص بہ فیاض کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۳۶۸ھ میں انتقال ہوا۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی۔ بامذاق شاعر تھے۔ داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ کلام دلچسپ اور دل آویز ہوتا ہے کلام کی صفائی اور شستگی قادر الکلامی کے شاہد ہیں۔ اب تک دو ضخیم دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ اُستاد کے رنگ میں آپ کا کلام رنگا ہوا ہے۔ سنہ ۱۳۶۸ھ میں انتقال ہوا۔

حُسن پر روزِ ازل سے دل مرا دیوانہ ہے
پھول پر بلبل ہے، شمعِ بزم پر پروانہ ہے

بادۂ وحدت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے
نعرۂ اللہ اکبر نغمۂ مستانہ ہے

گرد کلفت سے مُعرّا، شست وشو سے بے نیاز
میری عریانی بھی گویا خلعتِ شاہانہ ہے

یاالٰہی ہو نہ جائے حشر کا دن مختصر
سرگزشتِ عمر کا میری بڑا افسانہ ہے

ساقیٔ پیماں شکن پر میکشوں کا زور کیا
گردشِ تقدیر گویا گردشِ پیمانہ ہے

برق کا بھی خوف مجھ کو بادِ صرصر سے بھی ڈر
آڑے سیدھے چار تنکے نام کا کاشانہ ہے

منتظر ہیں بادہ کش بارانِ رحمت کے عزیز
سامنے شیشہ دھرا ہے ہاتھ میں پیمانہ ہے

---

[1] مرقع سخن جلد اوّل صفحہ (۳۶۰ تا ۳۷۰)

اضطرابِ دل و جگر دیکھو	لوٹتے ہیں اِدھر اُدھر دیکھو
دل مرا دیکھ کر جگر دیکھو	اس کی اِ ک د نجر دیکھو
دھجیاں ہیں مری گریباں کی	جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھو
رازِ غیروں پہ آشکار نہ ہو	میں اِدھر دیکھوں تم اُدھر دیکھو
بے وفا کون، باوفا ہے کون	ذرا تم دل میں سوچ کر دیکھو
دیکھتا ہوں نگاہِ ناز کو میں	تم ادھر دیکھو یا اُدھر دیکھو
بُت کدہ سے اُٹھو عزیز چلو	دوسرا اور کوئی گھر دیکھو[1]

---

(۲۰) عظمت

عظمت اللہ خاں کے والد نعمت اللہ خاں صاحب دہلی کے باشندے تھے وہ جس وقت حیدرآباد آئے عظمت اللہ خاں کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اس طرح عظمت اللہ خاں کی پرورش اور تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی اور حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ ۱۸۸۶ء پیدائش کا سنہ ہے اور ۱۳۴۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور مددگار ناظم تعلیمات کی خدمت پر مامور تھے۔

عظمت اللہ خاں کا عین عالمِ جوانی میں مرضِ دق سے انتقال ہوا۔ ان کے عالمِ جوانی کی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی شباب کے عالم میں تھے۔ ان کی شاعری اور انشاء پردازی ان کے مذاق اور کردار کے مظہر ہیں ظرافت اور شوخی ان کے لوازمہ زندگی تھے۔ اُردو شاعری میں ان کا خاص درجہ ہے کیونکہ انہوں نے اُردو شاعری کے لیے پھر قدیم ہندی بحروں کا انتخاب کیا اور ان کے بعد ہی لوگوں نے اسی طرف توجہ کی اور اب عام طور پر ایسی نظمیں بھی مقبول ہیں۔ مرحوم کی نظمیں گو تعداد میں مختصر ہیں مگر اپنی خوبیوں کے لحاظ سے گرانقدر قرار دی جاسکتی ہیں۔

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا	مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا	مرے جی کو یہ آگ جلا سی گئی

---

[1] دیوان عزیز

مرے تایہ کے پوت تھے تم سبھی ہم　　رہے ایک جگہ، پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم　　انہیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جاں غریب بڑی　　کبھی بھول کے دُکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی، نہ کسی سے لڑی　　مری باتوں نے گھر ہی کو موہ لیا

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا　　مرا دھیان کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا　　مجھے کھیل میں بھی تو کیا نہ دُکھی

مرے سر میں تمہارا ہی دھیان بسا　　مری چاہ کے راج دُلارے بنے
تمہیں دیوتا مان کے من میں رکھا　　مری بھول سی آنکھوں کے تارے بنے

میرا چنّا ابھی سے ہے اس پر فدا　　یہ مکھولی ہے موہنی میری بہو
یہ چچی کا کہا میرے دل نے لکھا　　وہیں دوڑ گیا مرے منہ پر لہو

اسی بات کے گھر میں چرچے ہوئے　　سبھی کہتے تھے مجھ کو تمہاری دُلہن
مجھے تم نے بھی اپنے لگائے گلے　　کئی بار کہا مری پیاری دُلہن

ہوئے پڑھ کے بچنت تو عہدہ ملا　　ہوا گیان کا گن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا　　لگے مینہ کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایہ بڑے تھے زمانہ شناس　　بڑے اونچے گھرانے میں ٹھہرا پیام
گیا ٹوٹ سا جی، گئی ٹوٹ سی آس　　مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمہاری دُلہن　　میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جُتی

کوئی اور تھی گو مری پیاری دُلہن　　کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرا آخری وقت ہے آن لگا　　کوئی اور تمہاری ہے پیاری دُلہن
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان بسا　　نہ بنی پہ رہی ہوں تمہاری دُلہن

مجھے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

سُندر صورت سُندر ہی ہے رنگت گوری یا کالی

اندھرا دیس کی سندر پتری کالی کوئل سی کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اڈا ھت میں لالی
دانت وہ اُجلے موتی کی جلا

بڑی بڑی سی آنکھ غلافی پتلی بھونرا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا
وہ من موہنی مقناطیسی ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو لبھایا

اور سراپا گدرا گدرا سانچے میں ڈھلا لچکیلا
جوشِ جوانی پھٹتا جوبن
بھرا بھرا سا ڈھلا ڈھلا یا وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن

اک موج مچلتی مچلاتی چڑھتی اتراتی لہراتی
وہ گردن کا نفیس ڈھلاؤ
ستیہ مستی کا جوالا مکھ کمر لچکتی بل کھاتی
وہ ہوش رُبا اُتار چڑھاؤ

سندر صورت، سندر ہی رنگت گوری کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈالی
فطرت کے لیے حُسن یہی ہے سج دھج گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی[1]

---

(۲۱) لمعہ

سیّد نوازش علی نام اور لمعہ تخلّص۔ میر کاظم علی شعلہ کے فرزند ہیں۔ ۱۲۸۷ھ میں حیدر آباد میں تولّد ہوئے۔ عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ علمِ طبّ میں بھی مہارت پیدا کی۔ آپ نے باپ سے تلمّذ حاصل کیا۔ اس کے بعد نظمِ طباطبائی سے بھی اصلاح لی۔ کئی ایک کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ایک کتاب اخلاقِ شاعری کے اُصول پر لکھی ہے۔ لمعہ بھی ذہین کی طرح اخلاقی شاعری کی طرف مائل تھے۔ کلام [illegible] اور عیوبِ شاعری سے پاک ہوتا تھا۔

انہیں اس روز سے مشقِ ستم ہے ۔۔۔ نہ تھی جب ابتدا لوح و قلم کی
ترے کوچے کو جب مسکن بنایا ۔۔۔ زیارت کر چکے دیر و حرم کی

بھریں آہیں تو شعلے اور بھڑکے قلبِ سوزاں میں
بہے آنسو تو روغن پڑ گیا سرو چراغاں میں
نہ کیوں ہو خال سے حُسنِ ملیح یار کی شورش
یہی تو کنکری اک رہ گئی ہے اس نمک داں میں

---

[1] رسالہ اُردو۔

اُڑے گا رنگ روئے گل، برنگ بوئے گل آخر
ہم اے لمعہ سبق عبرت کا پڑھتے ہیں گلستاں میں

زنگی اور آئینہ

کسی زنگی نے اک آئینہ رستے میں پڑا پایا
نظر آئی جب اس میں شکل زشت اس کی تو گھبرایا
وہ چپٹی ناک، وہ نتھنے کشادہ، ہونٹ وہ موٹے
وہ چوڑے دانت جن پر ہو گماں غول بیاباں کا
ہوئیں یہ دیکھ کر غصّے سے اس کی لال لال آنکھیں
تھا کالا کوئلہ پہلے بنا اب سُرخ انگارا
لگا بارِسیہ کی طرح کھانے پیچ و تاب اس دم
بُرائی اپنی صورت کی، قصور آئینہ کا سمجھا
رہی بالکل نہ تابِ ضبط جب اس کو تو جھنجھلا کر
زمیں پر آئینہ ٹپکا چڑھا کر ناک بھوں بولا
اسی سے تو کسی نے راستہ میں اس کو پھینکا ہے
نظر آتی ہے اس میں کیا تیری ہیئت بڑا چڑا
جو اپنے عیب سے غافل ہیں ان کی ہے یہی حالت
خفا اے لمعہ ہوں اس سے بتائے عیب جو انکا

---

(۷) کیفی سید رضی الدین حسن کیفی اس دور کے ایک مشہور اور نامور حیدر آبادی شاعر تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں تولد ہوئے اور رجب ۱۳۴۸ھ میں بمقام اجمیر انتقال کیا۔ کیفی ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید نظام الدین حسن آپ کے والد تھے۔

کیفی کی تعلیم مدرسہ دار العلوم میں ہوئی۔ منشی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے کامیاب کیا۔ اس کے بعد کوئی اور امتحان نہیں دیا مگر ذہن رسا تھا جو کچھ پڑھا اس کو جلا دیا۔ کم عمری سے شاعری کا شوق تھا، داغ کی شاگردی کی اور ان کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے تھے

کیفی کو حیدر آباد کا حالی قرار دیا جا سکتا ہے۔ حالی کی طرح کیفی نے قومی اسٹیج پر نغمہ سنجی کی ہے اور ہمارے کانوں میں ہنوز وہ نغمہ سنجی گونج رہی ہے۔ جو مختلف قومی جلسوں میں ان کے خاص انداز میں ہم سُنا کرتے تھے۔ وہ سماں اور وہ جوش کبھی بھلایا نہیں جا سکتا جو مرحوم کی ولولہ انگیز، حیات بخش اور روح پرور نظموں کے سُننے سے پیدا ہو جاتا تھا۔ اگرچہ کیفی دارِ فانی سے گزر گیا مگر اس کا کلام جب تک زبان اُردو اس صفحۂ روزگار پر باقی ہے زندہ رہے گا۔

کیفی کی غزلیں اپنے استاد کے رنگ میں ہیں۔ جو شوخیٔ بیان، لطفِ زبان، حسن ادا، رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے لبریز ہیں۔ آؤ دیکھیں کیفی نے اس گلشن اُردو کی سرسبزی اور آبیاری میں کیا کیا گل بوٹے کھلائے ہیں اور کیسے کیسے نئے پودے لگائے ہیں، کیفی کی تمام نظمیں اپنی فصاحت و بلاغت جدت و حُسن تخیل، واقعہ نگاری روزمرہ غرض کہ ہر خوبی سے ممتاز ہیں۔

جاہلیت کی انسانیت میں امراء القیس اور سموائل کے مشہور قصہ کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے اور سموائل کی وفاداری کو کیا خوب ادا کیا ہے۔

ایک نوخاستہ فرزند سموائل پے صید
اتفاقاً جو کہیں گھر سے گیا تھا باہر
گھر کو واپس جو ہوا دشت سے وہ صید افگن
دست صیاد اجل سایہ فگن تھا سر پر
یعنی اس بچہ کو حارث نے گرفتار کیا
اور سموال سے کہا غیظ و غضب میں آکر
دیکھ! ہے خیر اسی میں کہ وہ دے دے ہتھیار
ورنہ یہ تیغ ہے یہ ہے ترے فرزند کا سر
اس جواں مرد نے خاطر میں نہ لاکر اس کو
غیر کی ملک کو فرزند سے سمجھا بڑھ کر
باپ کے سامنے بیٹے کو تہ تیغ کیا
پھر بھی ناکام پھرا گھر کو وہ ظالم کا پسر

آخری زمانہ میں کیفی کی توجہ غزلوں کی پرانے اور فرسودہ ڈھب کی شاعری سے زیادہ جدید طرز کی شاعری کی طرف تھی۔ حیدرآباد کا کوئی ایسا قومی مجمع نہ ہوتا تھا جہاں کیفی اپنی نغمہ سنجی سے جوش نہ پیدا کرتے ہوں۔

شکر نعمت والی نظم حجاز ریلوے کے افتتاح کی خوشی کے جلسہ میں اور قرضہ حسنہ انجمن معین الاسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی "تعلیم نما" اور "جام حیدری" حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے جلسہ میں سنائی گئی تھی۔ تعلیم نما اگرچہ تعلیم اور حصول علم وغیرہ کے متعلق مناسب حال کانفرنس لکھی گئی ہے اور اس قسم کی بکثرت نظمیں لکھی گئی ہیں مگر جو خاص کیفیت اس نظم میں ہے وہ ملاحظہ ہی سے ظاہر ہوسکتی ہے۔ اسی طرح دوسری نظم "جام حیدری" میں علم کی تشبیہ شراب سے دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ کوئی جدید ایجاد نہیں ہے لیکن جو خاص لطف اس "جام حیدری" میں ہے اور کسی جام میں نظر نہیں آتا۔

لمن اسمی اللہ احمد علی ما علم الاسماء
که آدم را شرف بخشید از تشریف کرمنا

وتسلیم علی من قال للناس طلب العلم
که آدمی بود در علم و عرفاں رغبت بردینا

پس از حمد خدائے پاک و نعت احمد مرسل
مسلمانو! بزرگو! بھائیو! سننا مری سننا

یہ میں کہتا نہیں تعلیم میں ہیں خوبیاں یہ یہ
میں یہ کہتا نہیں ہے بہتری تعلیم سے کیا کیا

میں یہ کہتا نہیں، ہے لکھنے پڑھنے کی ضرورت کیوں
نہ یہ کہتا کہ ہے انداز تعلیم دکن کیسا

نہ میں قرآن سے ثابت کروں گا علم کی خوبی
نہ میں دوں گا حوالہ اب بخاری اور مسلم کا

نہ لاؤں گا دلیل ایسی میں اقوال ائمہ سے
نہ تاریخوں سے یہ ظاہر کروں گا علم ہے ایسا

نہ میں بغداد یونیورسٹی کا تذکرہ کرتا
نہ میں قصہ سناتا ہوں نظام الملک طوسی کا
نہ یہ کہتا گزشتہ دور میں تعلیم کیسی تھی
نہ یہ کہتا کہ چرچا علم کا اگلوں میں کیسا تھا
کہ پہلے تو نہیں ہے خود مجھی کو اتنی آگاہی
اگر ہو بھی تو ان باتوں سے ہے اس وقت مطلب کیا
یہ باتیں سنتے سنتے بھر گئے کان اک زمانہ سے
ہزاروں ایسے لکچر ایسی اسپیچیں سنیں صد ہا
اثر ان ایسی تقریروں میں ڈھونڈو تو نہ پاؤ گے
بجز درد اور دریغا ہائے حیف افسوس واویلا

تمہیں معلوم ہے دیتا ہے عزت کون انساں کو
غذا، کپڑا، حویلی، ہاتھی، گھوڑا روپیہ پیسا
نہیں ہرگز نہیں انساں کی اس سے نہیں عزت
کہ ہے انساں کی عزت کا باعث شان استغنا
اگر تحصیلِ علمی بے غرض تحصیل داری ہو
تو سمجھو ایسے عالم کو ہوا تعلیم میں دھوکا
غرض تعلیم سے یہ ہے کہ اطمینان خاطر ہو
بھروسہ آپ اپنی ذات پر انساں کرے پیدا
وہی تعلیم ہے تعلیم، انساں جس سے انساں ہو
وگرنہ پیٹ بھرنے کے لیے جیتا ہے اک کتا
بس اب کیفیؔ بہت کچھ کہہ چکے آؤ ادھر آؤ
صہ اما تلق من سقوی درع دنیا وا صلھا

کیفی کی ہمہ گیر طبیعت جو ہر صنف میں مساویانہ قادر الکلامی کے جوہر رکھتی تھی۔ چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

ہر چند گناہوں سے کنارا نہ کیا　　پر تُو نے دل آزردہ ہمارا نہ کیا
ہم نے تو جہنّم کی بہت کی تدبیر　　لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا

تقدیر نے تدبیر کا دل توڑ دیا　　پیمانۂ صہبائے طرب چھوڑ دیا
دُنیا تو کبھی ہم سے نہ چھوٹی کیفی　　صد شکر کہ دنیا نے ہمیں چھوڑ دیا

اب غزل کا رنگ ملاحظہ ہو جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیفی کی غزلیں شوخیِ بیان، لطف زبان، حُسنِ ادا، رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے لبریز ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

اسیر دام، زلفِ یار چھُوٹا ہے نہ چھُوٹے گا
طلسم عشق ہے کیفیؔ نہ ٹوٹا ہے نہ ٹوٹے گا

نہ یہ سر محتسب کا ہے نہ یہ رندوں کا ساغر ہے
یہ میرے دل کا چھالا ہے نہ پھوٹا ہے نہ پھوٹے گا

اب بھی شیدا ہے زمانے کا زمانہ تیرا　　ہائے دن سن وہ ترے اُف وہ زمانہ تیرا
ضد لڑکپن کی گئی اب ہے جوانی کا غرور　　نہ رہا وہ، نہ رہے گا یہ زمانہ تیرا
یہ شبِ وصل ہے اے شمع تو ہو جا خاموش　　کہہ نہ دے سوزِ جگر ان سے زمانہ تیرا
کس سے شکوہ ہے شکایت ہے یہ کس سے کیفیؔ　　کوئی بیگانہ یہاں ہے، نہ یگانہ تیرا
میں ہوں دیوانہ، یہ ویرانہ ہے تو کیوں آیا　　کیا یہاں دفن ہے اے شیخ خزانہ تیرا

جی کڑا کر کے رکھو صحن گلستاں میں قدم　　دل نہ غنچوں کے چٹکنے کی صدا سے دہلے

نزاکت کا بُرا ہو وہ سنورنے بھی نہیں پائے
بڑی مشکل سے زلفِ عنبریں تک شانہ آتا ہے

خوشامد اور پھر اتنی خوشامد اس ستمگر کی
تجھے کچھ بھی خیال اے ہمّتِ مردانہ آتا ہے

یہ مستی اور پھر یہ بُت پرستی حضرتِ کیفیؔ　　بھلے مانس اسی پر دعوئ اسلام کرتے ہیں

لاکھ تو چھپ چھپ کے پردوں میں ہماری جان لے
جانتے ہیں ہم بھی تجھ کو تو بھی اتنا جان لے
تیرے وعدے کا بھروسہ کیا ہے اے پیمان شکن
اعتبار آتا نہیں سر پر اگر قرآن لے
یہ سماں، یہ چاندنی اے عاشقِ مطرب نواز
جی پھڑک جائے ہمارا ایسی کوئی تان لے
مار ڈالا، مار ڈالا، لٹ گئے، ہم لٹ گئے
تان لے پھر تان لے منہ پر دوپٹہ تان لے

وہاں تو بزم میں دشمن چلے آتے ہیں دشمن پر　　یہاں فریاد پر فریاد ہے شیون ہے شیون پر
جنوں کے جوش میں ثابت گریباں رہ نہیں سکتا　　مرا احسان رہتا ہے ہمیشہ میری گردن پر
تمنّا اور پھر کیسی تمنّا ان کے آنے کی　　بر آئے گی مگر کب؟ بعد میرے میرے مدفن پر
دلِ بیتاب کو تسکین دیتے جاؤ رہ رہ کر　　کہیں سبقت نہ لے جائے تمہارے چلبلے پن پر
وہی کیفیؔ وہی راستہ ہے آندھی ہے کہ بارش ہو　　چلے آتے ہیں حضرت میکدے سے ایک ہی کن پر

وہ نہ آتے ہیں، نہ آئیں گے، نہ آسکتے ہیں　　ہم بھی کس وعدہ فراموش کی رہ تکتے ہیں

بگڑ کے حضرتِ دل آپ کیا بنالیں گے　　انہیں تو زعم ہے، ہم روٹھ کر منالیں گے

سرِ آرایشِ دستار ذوقِ شانہ رکھتے ہیں　　طبیعت دار عاشق وضع معشوقانہ رکھتے ہیں

کام غیروں سے کوئی بنتا ہے　　جس کا روٹھا اسی سے بنتا ہے

بہت سے کام ہیں اور ہے حیات تھوڑی سی
سوا ننگ حد سے زیادہ ہیں رات تھوڑی سی

دلِ گُم گشتہ کو ڈھونڈا کہیں پایا نہ گیا
وہ یہ کہتے ہیں یہاں کوئی تو آیا نہ گیا
ہائے ہم بھی کوئی انسان ہیں انسانوں میں
ہم سے روٹھا ہوا معشوق منایا نہ گیا
صدمۂ ہجر بھی اک طرح کا احساں ہے مگر
وضعداروں سے ترے وہ بھی اٹھایا نہ گیا

---

(۲۳) مُحب

محب حسین محب تخلص، "حامی حقوق نسواں" کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ حیدر آباد میں یہی پہلے شخص تھے جنہوں نے حقوقِ نسواں اور پردہ کے دُور کرنے کے متعلق توجہ کی اور اپنے لکچروں اور کتابوں سے سالہا سال مسلسل کوشش کرتے رہے۔ خواتین کے لیے ایک علیحدہ نصاب کے لیے متعدد کتابیں نظم ونثر میں بھی لکھیں اور وہ آج سے بہت پہلے زہریلی غزلوں اور فحش نظموں کو مدرسوں کے درس میں سے نکال ڈالنے کے بانی تھے۔

محب ایک کہنہ مشق شاعر تھے، دیوان اور کلّیات شائع ہو چکے ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنی غزلوں میں کن مضامین کو نظم کیا ہے اور زمانہ کے رنگ کے خلاف کس طرح دردِ دل اور قومی نوحہ کو وہ غزلوں میں بیان کرتے ہیں تصوّف سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ خطوط محب ان کے خیالات کا آئینہ ہیں۔

۱۳۴۲ھ میں محب کا انتقال ہوا۔ حیدر آباد میں مدفون ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ہماری قوم بھی ضدی بڑی ہے	پُرانی ریت رسموں پر اڑی ہے
عجب مشاطہ ہے تعلیمِ نسواں	یہی سُرمہ ہے مِسّی کی دھڑی ہے
ہمارے حال پہ روتا ہے بادل	ہمیں بارش یہ اشکوں کی جھڑی ہے

علم کا ہندوستاں میں قدرداں ملتا نہیں فلسفی کا اس جگہ نام ونشاں ملتا نہیں
جس کو دیکھو وہ شالِ آسیا چکر میں ہے چین اک دم بھی بہ زیرِ آسماں ملتا نہیں

لہو کا جام ہے یہ ساغرِ شراب نہیں بھڑکتی آگ کا شعلہ ہے آفتاب نہیں

بیوہ کو وصلِ مرگ کا ارماں نہ ہو تو کیا دُنیا میں کوئی عیش کا ساماں نہ ہو تو کیا

عورتیں کہتی ہیں گھٹ گھٹ کے یہ زندانوں میں کیجیے کس سے بیاں حالِ پریشاں اپنا

درد ہمدردیٔ نسواں کو دکھا ہی دیتے ہوتا ممکن کسی پہلو سے دکھانا دل کا

رواج ورسم پر اچھے بُرے کا سب ہے مدار رہ ثواب نہ سمجھا نہ میں خطا سمجھا

پہن کے جامۂ تہذیب گو بنیں انگریز چھپائے سے نہیں چھپتی گنوار کی صورت

عبادت تو بہت کی حور وجنت کے لیے زاہد کیا ہے بے غرض احساں بھی تو نے تو انساں پر
بڑھاپے میں یہ کمسن بیویاں کیا زیب دیتی ہیں مسلط ایک بوڑھا دیو ہے گویا پرستاں پر

انہیں کی عصمت ہے قابلِ فخر جو ہیں آزاد بندشوں سے
وہ خاک عفت ہے ہو جو حاصل اسیرِ قیدِ فرنگ ہو کر

سخت جانی کا لکھے بیوہ کا کیا حال قلم اس مصیبت پہ تو پتھر کا کلیجہ بھی ہے شق

گیا ہے تا بہ فلک درد آہ بیوۂ ہند یہ اس کے دل کے بخارات ہیں سحاب نہیں

سرک جائیں اعدائے تعلیم نسواں — ہم اب سوئے سیف و قلم دیکھتے ہیں

جب خدا ترجیح دے بیٹی کو بیٹے پر محبؔ — کیوں نہ ہوں مردوں سے پھر بالا و برتر عورتیں

لیے جاتے ہیں جب صناع یورپ کھینچکر دولت — تو پھر خوشحال یہ عسرت زدہ ہندوستاں کیوں ہو

جہالت عورتوں کی زہر ہے اولاد کے حق میں — مگر نافہم اس کو بھی کوئی اچھی دوا سمجھے[1]

---

(۲۴) **مسرور** میر محمد علی المتخلص بہ مسرور، عربی فارسی میں بڑی اچھی مہارت تھی، علوم مذہبی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے چودہ سال کی عمر سے شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ مرثیہ، سلام، نوحہ کے علاوہ رُباعیات اور قصیدہ کی کافی مشق تھی۔ کلام میں سلاست اور بلاغت پائی جاتی ہے۔

دُنیا میں یتیموں کو رُلایا نہیں کرتے — سہمے ہوئے بچّوں کو ڈرایا نہیں کرتے
مہمان کو دیتے ہیں سدا راحت و آرام — پانی کے عوض خون بہایا نہیں کرتے
بازاروں میں بے برقع و بے مقنع و چادر — اک رات کی بیاہی کو پھرایا نہیں کرتے
زنجیر پہناتے نہیں بیمار کو تپ میں — دُرّے تنِ لاغر پہ لگایا نہیں کرتے
گو لاکھ عداوت ہو مگر تیر سہ پہلو — بے شیر کی گردن پہ لگایا نہیں کرتے

درود پڑھ کے یہ پوچھا کہ رہ گئی اک بات — کچھ اور بھی تو ہیں فرزند شاہ خیبر گیر
ہیں ان میں ایسے بھی جوان سے پہلے خلق ہوئے — وہ ہوں گے تیسرے یا یہ ہژبر والی توقیر
کہا کہ یہ تو بہت صاف بات ہے حضرت — کہا ہے تیسرا بیٹا کہ تیسری تصویر
پسر کچھ اور ہے تصویر اور ہی کچھ ہے — بہت لطیف ہے ہاں اس مقام کی تقریر
کمی زیادتی ہوتی ہے باپ بیٹے میں — نظر میں اصل ہی آتی ہے دیکھ کر تصویر

---

[1] دیوانِ محبؔ۔

کہاں علیؓ کی سب اولاد اور کہاں عباسؓ ضرور چاند وہ سب ہیں مگر یہ ماہ منیر

دکھایا حضرت عباس نے جمال پدر علیؓ نے پائی ہے آج اپنی تیسری تصویر[1]

بخوفِ طوالت اسی قدر نمونۂ کلام پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ اس دور کے بیسیوں ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ملک سخن میں اپنے کلام سے چمن بندی کی ہے اور باغ اُردو میں گل بوٹے لگائے ہیں بعض اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں۔

خواجہ محمود خاں غور، احمد علی قاصنی، قطب الدین باطن، افتخار علی شاہ، شاہ وطن معروف علی شاہ فدا، نقش وغیرہ۔

جہانگیر علی خاں انفت، قادر محی الدین سلیم، محمد علی خاں ناظم نذیر علی رنگ وغیرہ

سید امیر اللہ امیر، بجرنگ پرشاد بزمی، رشید الدین خاں رشید، سید میراں سہا شہامت علی خاں شہامت، سید ابراہیم عفو، رشید الدین عالی، صولت جنگ عابد، احمد یار جنگ فانی، سید غلام نبی نظمی، محمد عمر خاں وفا وغیرہ۔

اب بعض ان شعراء کا کلام پیش کیا جاتا ہے جو اگرچہ زاد و بوم کے لحاظ سے دکن کے نہیں کہے جا سکتے مگر بلحاظ اس اصول کے جو میں نے مقدمہ میں بیان کیا ہے۔ دکنی کہلانے کے ضرور مستحق ہیں۔ کیوں کہ ان لوگوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ یہاں گزار دیا۔ ایسے شعراء بھی بہت ہیں مگر ان میں سے بعض کا کلام پیش کیا جاتا ہے:۔

(۲۵) نظم علامہ علی حیدر طباطبائی المتخلص بہ نظم۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر خطاب تھا۔ ۱۲۷۰ھ میں آپ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی اور ننھیال میں پرورش پائی۔ منشی میندو لال زار نے آپ کو تعلیم دی۔ عربی کی تعلیم ملا طاہر نحوی سے حاصل کی مگر اس کی تعلیم قائمۃ الدین سے کلکتہ میں ہوئی۔ شہزادے مرزا کام بخش کی تعلیم کے لیے

---

[1] مرقع سخن جلد اول صفحہ (۳۰۹ تا ۳۲۰)

آپ کا تقرر ہوا اور کلکتہ میں قیام رہا۔ ۱۳۰۵ھ میں جب نواب واجد علی شاہ کا انتقال ہوا تو آپ حیدر آباد آئے اور نظام کالج میں پروفیسر ہوئے۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ سے آپ کا تعلق ہوا اور حضرت آصف جاہ سابع کے شہزادوں کی تعلیم بھی آپ کے ذمہ ہوئی۔ ۱۳۵۲ھ میں حیدر آباد میں آپ کا انتقال ہوا۔

نظمِ طبا طبائی سے کون واقف نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کا کلام بھی شہرۂ آفاق ہے روانی و برجستگی کلام سے جوشِ طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ الفاظ کی تازگی سے کلام میں نگینے جُڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے قصاید مشہور ہیں ان میں سے زیادہ تر سیرت النبیؐ سے متعلق ہیں۔ مثلاً بعثت و فتح مکہ، معراج، ہجرت، غزوۂ بدر وغیرہ۔

ان قصائد میں بلاغت، تشبیہہ و استعارات کا استعمال جس خوبی سے کیا گیا ہے وہ نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ اُردو میں میر انیس کے بعد کسی نے نہیں لکھا ہے۔ حقیقت میں وہ اعجاز ہے۔

قصیدہ بعثت میں تلوار اور گھوڑے کے متعلق تشبیہہ ملاحظہ ہو:

لکھوں ہر تیغ کی خوبی کہ ہر رہوار کی شوخی
جو آفت اس نے برپا کی قیامت اس نے بھی ڈھائی

کرشمے اور اشارے ابروئے معشوق کے اس میں
دلِ عاشق کی اس میں بے قراری ناشکیبائی

چلی وہ ناز سے بن کر تو یہ انداز سے تن کر
اڑایا اس نے سر کافر کا اس نے لاش ٹھکرائی

وہ بجلی کی طرح کوندی، یہ شعلہ کی طرح بھڑکا
دمِ پیکار اس نے خون اس نے خاک برسائی

بہایا اس نے جوں جوں خون اس کے سم ہوئے رنگیں
اُڑائی اس نے جوں جوں خاک اور اس نے جلا پائی

حرارہ جب لیا اس نے یہ کوندے کی طرح لپکا
طرارہ جب بھرا اس نے تو وہ بجلی سی لہرائی

جو اس کی آنچ تھی آفت تو اس کی چال تھی آندھی
لگائی آگ اس نے رزم گہ میں اس نے بھڑکائی

پسینہ میں جو یہ تر ہے تو اُس پر دام جوہر ہے
گہر ریزی جو اس میں ہے تو اس میں گوہر آمائی

ابر کی تشبیہات قصیدہ ذکر جاہلیت و جہاد آنحضرت میں ملاحظہ ہوں۔

اودی اودی یہ گھٹائیں ہیں کہ لیل الیل ۔ بن گئی یا شبِ دیجور سمٹ کر بادل
ابر کہسار میں بال و پرشاہیں کا ہے رنگ ۔ کہ جھکا پڑتا ہے وہ سبزہ سمجھ کر ہریل
کردیا مشک تتاری نے ہوا کو تاریک ۔ بھر دیئے ابر بہاری نے برس کر جل تھل
ہے ابر بادیہ سیہ سرشار و مست و خشمگیں ۔ خنداں رخ و گریاں مژہ روشن دل و تیرہ جبیں

آتا ہے وہ قطرہ لیے، پانی سمندر سے پیے
گذرا جدھر بکھرا دیئے گل ہائے در دریا سمیں

گریہ کناں گوہر فشاں قطرہ زناں دامن کشاں
مانند زلف لہوشاں تاریک و تار عنبریں

دل میں طرب لب پر فغاں، سر برکف و کف بروہاں
انداز میں پیل دماں آواز میں شیر عریں

باطن میں ہے فیض حاتم ظاہر میں ہے طرزِ ستم
دل میں چھپا ذوقِ کرم تیور سے پیدا خشمگیں

اٹھتا ہوا سر سے دھواں آب اور آتش درمیاں
کھینچے ہوئے رنگیں کماں جادو گرِ مندل نشیں

اُٹھتا ہوا سر سے دھواں آب اور آتش درمیاں
کہف و جبل میں یوں جسے گزرے ہیں ایام دلنشیں

انگریزی نظموں کے ترجمے بھی مولانا کی ایک خاص چیز ہیں۔ یوں تو انگریزی نظموں کے اکثر و بیشتر ترجمے ہوئے ہیں مگر مولانا حیدر علی صاحب حیدر یار جنگ طبا طبائی نے جو کمال اپنے ترجموں میں دکھلایا ہے واقعی یہ کہ وہ مولانا ہی کا حصہ ہے۔ مولانا نے جس خوبی و عمدگی سے اکثر مشہور و معروف اعلیٰ درجہ کی نظموں کو بہترین اُردو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے اس کے استاد ان فن معترف و مداح ہیں۔ چند نظموں کے انتخاب

ملاحظہ ہوں۔

"گرے" انگلستان کا ایک نامور شاعر گذرا ہے جس کی شاعری کا مایۂ ناز اس کی مشہور و معروف "اِلے جی" یعنی مرثیہ ہے "الے جی" کا ترجمہ انتہائی خوبی و کمال کے ساتھ مولانا نے "گورِ غریباں" کے نام سے کیا ہے۔

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دُنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اُٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیردیں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دُور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کبھی ایک گنبدِ کہنہ پہ بوم خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکوؤں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں ہیں کچھ، مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن، گز بھر زمیں پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے
چراغاں اور صندل اور گلِ ریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں نمگیرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے
جو خوش آہنگ کوئی قاریٔ قرآں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اگر مدفن پہ رکھنے کو
پلٹ کر اس سے کچھ نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دُعا ہو، فاتحہ ہو، مرثیہ ہو، آہ و زاری ہو
کوئی آواز ان کے کان ہی تک جا نہیں سکتی

الگ ہر نیک و بد سے دُور دُنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکّل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت
اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیرِ لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے، منہ بنائے رنج کی صورت
کہ جیسے دل پہ صدمہ ہے زباں جس سے ہے بیگانہ

خدا بخشے اُسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا
تو نکلا دوست اک آخر خداوند کریم اس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا
کہ روشن ہے خدا پر عالمِ اُمید و بیم اس کا

---

(۲۶) **جلیل**

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل جانشین حضرت امیر مرحوم کو ایک زمانہ جانتا ہے۔ آپ کا کلام کسی تعریف یا تعارف کا محتاج

نہیں ہے۔ ۱۳۶۵ھ میں آپ کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ آپ کی شاعری نے دکن میں اُردو کی ترقی میں جو کام کئے ہیں ان کے مدنظر آپ کے ذکر خیر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

جب ترے عشق کا پھندا مری گردن میں رہا — پھر برابر ہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا
قیس و فرہاد کا بھرتے رہے بہروپ جلیلؔ — یہی سودا تھا، یہی کھیل لڑکپن میں رہا

رات، دل سے مرے اس درد کے نالے نکلے — گھر سے اپنے وہ کلیجے کو سنبھالے نکلے

فتویٰ دیا ہے مفتیٔ ابرو بہار نے — توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے

آج سُنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں
ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ
برہمن کیا ہم اسے پیشِ خدا کہنے کو ہیں
ساری دُنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی — کام کرتی ہے نظر، نام ہے پیمانہ کا
صحبت پیرِ مغاں میں یہ کھُلا راز جلیلؔ — خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

آج سُنتا ہوں کہ دشمن سے گلے مل آیا — اب مرے کام کا تو خنجرِ برّاں نہ رہا

کس کا سر سامنے قاتل کے نہیں خم ہوتا — جھک کے تلوار بھی آداب بجالاتی ہے

موت بھی روٹھ کے بیٹھی ہے مسیحا کی طرح — کس سے پوچھوں کہ علاج شبِ فرقت کیا ہے

جلوۂ حُسن ترا ہوش اُڑا دیتا ہے یہی صورت ہے تو دیدار کی صورت کیا ہے

جو رات بھر تری محفل میں شمع جلتی ہے زبانِ حال سے کہتی ہے داستان میری

شرمِ عصیاں سے تلافی ہوئی مے نوشی کی غرق ہونے پہ بھی دامن نہ ہوا تر اپنا[1]

---

(۲۷) ضامن

سید محمد ضامن صاحب ضامن، عرصۂ دراز سے آپ کا خاندان حیدرآباد میں متوطن ہے۔ آپ کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ رسالہ لسان الملک آپ ہی کی اڈیٹری میں شائع ہوا کرتا تھا:۔

پیمانہ سے رندوں کا پیمانِ ارادت ہے ہر موجِ شراب ان کو محرابِ عبادت ہے

ہے مستحقِ رحمت، زحمت کشِ محرومی رحمت جسے سمجھے ہو، دیباچۂ رحمت ہے

دل میں طوفانِ تمنا نظر آتا ہے مجھے قطرہ جولانگہِ دریا نظر آتا ہے مجھے

رہ کے دُنیا میں بہرحال بسر کرنا تھا تھا ہلاکِ غمِ ہستی جو نہ شاداں ہوتا

حرفِ مطلب وہ جسے محو کیا ہے تو نے کاش میرے خطِ تقدیر کا عنواں ہوتا

موجِ مے برق ہے اور برق ہے سامانِ حیا زندگی یہ تھی کہ پیمانہ سے پیماں ہوتا

دل میں ہوتے نہ اگر خار و خس و بیم و رجا رشکِ فردوس تمنا کا بیاباں ہوتا

کیا کریں کس سے کریں شکوۂ قسمت ضامن

ہوتے کیوں قیدیٔ زنداں اگر امکاں ہوتا

لارڈ ٹینی سن ملک الشعرائے انگلستان کی مشہور مثنوی "انیک آرڈن" کا نہایت عمدہ ترجمہ "شہیدِ وفا" کے نام سے آپ نے لکھا ہے۔ اس کا کچھ نمونہ بھی ملاحظہ ہو:۔

---

[1] دیوانِ جلیل۔

ڈھارس کی یہ گفتگو ہوا کی | چپکی وہ غم زدہ سُنا کی
دل کو ہر طرح سے سنبھالا | اُمید پُرغم کو اُس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا | پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا
اینک کرنے لگا نصیحت | جیسی ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا | تعلیم و رضا کا ذکر لایا
خاموش رہی کہا نہیں کچھ | کچھ اس نے سُنا، سُنا نہیں کچھ
جیسے کوئی گاؤں کی انیلی | بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی
رکھ کر خالی گھڑا تہِ آب | خود بحرِ خیال میں ہو غرقاب
ہو پیشِ نظر وہ یار جانی | بھر کے اسے دیتا تھا جو پانی

حتیٰ کہ گھڑا بھرے چھلک جائے
لیکن یہ سُنے بھی اور نہ سن پائے[1]

---

[1] رسالہ لسان الملک۔

چھٹے دَور کی نثر

اس دَور میں شاعروں کی طرح انشاء پرداز اور مصنّفین کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور ان کی تصانیف کی تعداد کئی ہزار تک پہنچتی ہے۔ اس دَور میں مؤلفوں نے ہر قسم کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، سائنس، لسانیات، تاریخ، معاشیات، دینیات، قانون، طب، ہندسہ تعلیم اور زراعت، غرض وہ کون علم وفن ہے جس پر کتابیں تالیف نہیں ہوئیں۔

جیسا کہ قبل ازیں واضح کر دیا گیا ہے کہ اس دَور کے مصنّفین میں ایک تو وہ اصحاب ہیں جنہوں نے مرحوم اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں بھی شہرت حاصل کر لی تھی اور اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے عنان حکومت ہاتھ لینے سے پہلے ہی اس دارِ فانی سے گذر چکے تھے۔ اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کے زمانہ میں شہرت حاصل کی یا اس زمانہ میں انتقال کیا۔

اس زمانہ کے کئی انشاء پرداز ایسے ہیں جن کا ذکر شعراء کی حیثیت سے ہو چکا ہے مگر وہ جہاں ایک طرف اقلیم شاعری میں ممتاز تھے تو دوسری طرف انشاء پرداز کی حیثیت سے بھی امتیاز حاصل کیا ہے۔ لامحالہ ایسے ممتاز نثر نگاروں کی نثر کا نمونہ بھی پیش کرنا ضروری ہے۔ ایسے اصحاب حسبِ ذیل ہیں:۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر۔ حضرت امجد مدظلہ، نواب عزیز جنگ، مولوی غلام مصطفٰے ذہین مرحوم اور مولوی محب حسین مرحوم، مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم وغیرہ۔

بعض نثر نگار ایسے بھی ہیں جو بحیثیت نظم نگاری نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے مگر محض بخیال طوالت اس کتاب کے حصّہ نظم میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔ لیکن کتاب کے اس حصّہ میں ایسے افراد کا ذکر کرنا ناگزیر ہے مثلاً ملّا عبدالقیوم، مولوی جمال الدین نوری، مولوی سیّد اشرف شمسی، راجہ راجیشر راؤ اصغر، مولوی انوار اللہ خاں انور، مرزا مہدی خاں کوکب وغیرہ۔

ان دونوں طبقوں کے علاوہ بعض ایسے اصحاب ہیں جنہوں نے صرف نثر میں اپنے

آزاد افکار کو قلم بند کیا ہے۔ مثلاً نواب سرامین جنگ بہادر، نواب قادر نواز جنگ مرحوم۔ مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم، مولوی مرتضیٰ مرحوم، مولوی سید خورشید علی صاحب۔حکیم سید شمس اللہ قادری۔ عبدالجبّار ملکاپوری۔ مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب۔ محمّد سلطان صاحب۔ ملاّ عبدالباسط، مختار احمد صاحب، امیر حمزہ صاحب، حافظ محمّد مظہر صاحب، مولوی عبدالسّلام مرحوم۔ نواب فرام جنگ مرحوم، مسٹر سہراب جی کانگا صاحب وغیرہ۔

اولاً طبقہ اوّل کے اصحاب کی عبارت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) حضرت امجد مدظلہ، آپ کی نثر کے متعلق "مکتوبات" امجد[1] "میں تفصیل کی گئی ہے۔ نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"کوئی کہتا ہے، کاش ہم مسلمانوں کو ایسی سادہ اور بے تکلف زندگی کرنے کی توفیق ہوتی، عورتیں مہمان آتیں، ہماری خانگی زندگی اور طرزِ معاشرت سے حیرت رہ جاتیں، نہ کھانے کی فکر، نہ پکانے کا خیال، نہ بیوی کو میاں کا خوف، نہ میاں کی بیوی پر بے جا حکومت، اس پندرہ سال کی طویل مدّت میں میاں نے بیوی سے کسی دن کھانا تک نہیں مانگا۔ نہ بیوی نے میاں سے کسی قسم کی بے جا فرمائش کی، دل میں ہر وقت خوشی کی لہریں اُٹھتی تھیں، صِرف ایک کا وجود، دوسرے کے لیے باعثِ مسرّت تھا، ایک کی بات دوسرے کے لیے سوغات تھی[2]"

"وہ آیا اور اس طرح آیا کہ میں پہچان نہ سکی کیوں کہ وہ رسمی لباس سے عُریاں گرد و غبار میں اَٹا ہوا، سر سے پا تک خاک آلود تھا۔ وہ میری دہلیز پر سر جھکائے کھڑا تھا اور میرے رحم و کرم کا متمنّی، میں پہچان نہ سکی کہ وہ کون ہے لیکن اس کی تباہی اور شکستہ حالی کو دیکھ کر جی بھر آیا۔ میں نے کہا کہ اے شکستہ حال آ، اندر آ[3]"

---

[1] راقم کی ایک دوسری تالیف ہے۔

[2] جمال امجد۔

[3] " "

"جلوے کی گھڑی تھی اور رات کا وقت تھا، دولہا دولہن آمنے سامنے سر نیوڑھائے دولہن تو اپنے دولہا کے بالمقابل ہو کر بھی نہ ہونے کے برابر، وجود میں شانِ عدم دکھا رہی تھی۔ لیکن کشیدہ قامت، نو عمر، نوخیز، حسین مہ جبیں دولہا اپنے تو شاہانہ لباس میں پیشانی پر افشاں، پتلے اور نازک ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمائے جب جلوے کی چوکی پر جلوہ آرا ہوا، ایک بجلی تھی جو چمک گئی۔ ایک جگمگاتا آفتاب تھا جو سارے تماشائیوں کی نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔ یہی نظارہ مجاز میں رنگِ حقیقت دیکھنے کے لیے کیا کم تھا کہ میرا سنول کے دقتیہ گیت نے تو قیامت ہی قائم کر دی، نظریں تو جہ سماعت کی طرف کھنچ گئیں، آنکھیں بند ہو کر کان کھل گئے"[1]

(۲) یمین السلطنۃ مہاراجہ **سرکشن پرشاد** بہادر کی نثر کا نمونہ پیش ہے اب تک آپ نے کئی تصنیفات مختلف فنون میں فرمائی ہیں اور بکثرت آپ کے مضامین اکثر رسالوں میں شائع ہوئے ہیں:۔

"زمانہ اپنی نیرنگی اور تلون مزاجی سے آئے دن کی تبدیلیوں کا اکھاڑا ہے اور اس کی دلفریب نیرنگیاں کل یومٍ ھوَ فی شان کی پوری مصداق ہوتی جاتی ہیں یہی تبدیلیاں اور نیرنگیاں دانشمند اور فیلسوفوں کی چشم دوربین کے منظر ہو کر زمانے کے تغیرات کا ثبوت عین الیقین کی حد تک پہنچاتی ہیں اور اسی درسگاہ عالم سے العالم متغیر کا سبق حاصل کرتے ہیں اور اس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکایا جاتا ہے۔ ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے اس کی قلابازیوں کی چپیٹ میں جو آتا ہے وہ اس کا ہو رہتا ہے۔ البتہ اہلِ بصیرت اس کی تبدیلیوں کو" ہر چہ دانی بدانکہ مظہر اوست" کی صورت میں دیکھ کر معرفتِ الٰہی کا سبق لیتے جاتے ہیں جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے علم و عمل باطل کر دیتا ہے اور تمام عالم پُرنور کا کافور بکھیر دیتا ہے۔ سوتوں کو نیند سے جگا دیتا ہے۔ نکموں کو کام پر لگا دیتا

---

[1] حکایات امجد

ہے۔ طبیعتوں سے سستی کو دُور کر دیتا ہے موجودات عالم کی ہر چیز کو آفتاب کی روشنی میں ہماری نظر کے سامنے کر دیتا ہے تاکہ اس کی دلچسپیوں سے لطف اُٹھانے کا موقع ملے جو لوگ اپنے دین کے پکے اور روشن دماغ ہوتے ہیں اور بصیرت کے چراغ نے جن کے دلوں سے تاریکی دُور کر دی ہے وہ لوگ اللّٰہُ نورُ السّمٰوٰتِ وَ الْاَرض کے ثبوت دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں جَعَلَ النَّھَارَ مَعَاشًا کی جستجو میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں[1]"

(۲) سیّد غلام مصطفےٰ صاحب ذہینؔ

ذہینؔ صاحب کی نثر حسبِ ذیل ہے :۔

"کشورِ تن کا رئیس تختِ صنوبری پر متمکن اعضائے حیات پر حکمران کہنے کو دو حرف کا نام مگر دو جہاں کے کام تفویض ملک سیرت شریعت پر ثابت قدم طریقت پر راسخ دم بصیرت کی عینک لگائے انوار قدرت کو دیکھتا ہے۔ معرفت کا مزا پاتا ہے۔ حقیقت کا لطف اُٹھاتا ہے۔ مگر کوئی دل وفادار ہے کوئی بے وفا کوئی پاک ہے، کوئی نجس، کبھی غمگین ہے، کبھی شاد، کبھی بامراد ہے۔ کبھی نامراد ؎

گہے برتادم اعلیٰ نشیند   گہے بر پشت پائے خود نہ بیند

اہلِ دل کے سینہ میں آفتاب ہے، نااہل کی چھاتی میں داغ۔ عاشق کا دل عاشق سے بیزار اور معشوق کا طرف دار عاشق کے پہلو سے نکل کر اس کو بے دل کر دیا اور اہلِ باطن کے سینہ میں رہ کر صاحبِ دل بنا دیا۔ غرض دل کے ہاتھوں کوئی شاداں ہے کوئی نالاں، کوئی کہتا ہے ؎

ہو جان بھی تو جا کے مداوائے دل کروں
کب تک میں دل پہ ہاتھ دھرے ہائے دل کروں

مولوی محبّ حسین مرحوم

کی عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔
"کسی قوم و ملک کی زبان پر جس قدر

[1] رسالہ ذخیرہ۔

عورتوں کا اثر ہے اس قدر مردوں کا اثر نہیں۔ وہ زبان کی موجد، محافظ اور جلا دینے والی ہوتی ہیں۔ اسی اثر کی وجہ سے ہر ایک قوم کی خالص زبان اس کی زبان مادری کہلاتی ہے جس زمانہ میں قومِ روم کا عروج تھا تو اس وقت اس قوم کی عورتیں اپنے بچوں کو مادری زبان کی تعلیم دیتی تھیں اور نکات فصاحت و بلاغت سکھاتی تھیں۔ رومی عورتیں زبان کے نئے نئے محاورے تراشتی تھیں اور ثقیل الفاظ کو کانٹ چھانٹ کے درست کرتی تھیں۔ نوجوان اشخاص ان کی سوسائٹیوں میں بیٹھ کر زبان کے عمدہ محاورے اور شستہ الفاظ سیکھتے تھے اس وقت ہمارے زمانہ میں محلات کی اُردو زبان مستند سمجھی جاتی تھی، دلّی اور لکھنؤ کی شریف عورتیں اس کی محافظ خیال کی جاتی تھیں۔ میں نے خود جناب نواب مرزا خاں صاحب داغؔ فصیح الملک کو اپنی بیوی سے بعض محاورات دریافت کرتے ہوئے سُنا ہے۔"

---

(۵) مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم

عظمت اللہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے:-

"باری تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت پیدا کرنا ہے، جب تک انسان کے دل و دماغ میں پیدا کرنے کی قوت موجزن نہ ہو، یا دوسرے الفاظ میں جب تک انسان کا تخیل شاعرانہ نہ ہو، خالقِ کائنات کے حسن کا احساس ممکن نہیں، زندگی، نہ صرف پیدا ہونا ہے بلکہ پیدا کرنا بھی ہے ..... تصوّف کا تمام دار و مدار اسی پر ہے کہ محنت اور مصائب کی چوٹیں دل پر ایسی لگائی جائیں کہ دل پکّا پھوڑا، انتہائی صاحبِ احساس بن جائے، درد کی آگ میں دل کو ڈالنے ہی سے انسان کے دل پر کا زنگ صاف ہو جاتا ہے۔ یعنی بے حسی دُور ہوتی ہے۔[1]"

"اچھا اب ہم اٹوائی کھٹوائی کو لیتے ہیں، میاں شباب خاں کی دُلہن آئیں، ساس نے بہو کی چٹ چٹ بلائیں لیں، کیا کرتیں مجبور تھیں، سہری کے مباحث و

---

[1] خواجہ میر درد (رسالہ اُردو)

منازل طے کرنے کے لیے بیٹے اور بہو کو دوبدو چھوڑنا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں۔ جو بیٹے کی دُلہن کہلائے، مگر مسہری کے پارلیمنٹ سے کوری رہے، مگر یہ ناممکن، اچھا بیٹے کی شادی کیوں نہ کریں اس کے گھر کا آباد ہونا اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گودوں کھلانا بھی بے چاری بڑی بی کا اب رہا سہا ارمان تھا، غرض صبر و شکر کرکے رات کاٹی، اپنی بیاہی اور ان بیاہی بیٹیوں اور مصاحب خاص مغلانی سے حملہ اور مدافعت کا مشورہ کیا۔ صبح ہی گربہ کشتن روز اوّل کے کارگر اصول پر پیش قدمی شروع کردی[1]۔"

(۶) نواب عزیز جنگ مرحوم

نواب عزیز جنگ بہادر نے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کا موضوع قانون، تاریخ فلاحت، لغت، ادب وغیرہ جیسے مختلف النوع علوم ہیں۔ آپ کو جو قابلیت اور ہمہ گیری تھی وہ بہت کم اشخاص کو میسّر ہوتی ہے۔ آپ نے جہاں قانون مال گزاری و عطیات و حساب میں قلم کی جولانی دکھائی جاتی ہے وہیں تاریخ اور سیاست کو بھی نہیں چھوڑا ہے جہاں فلاحت و باغبانی میں قابلِ قدر تصانیف مرتب کی ہیں وہاں عملی تجربہ کی خاطر بہت دل کشا باغ بھی تیار کیا تھا۔ اسی طرح کبوتروں کی پرورش پر بھی ان کو عملی توجہ تھی تو ان کے متعلق دوسروں کی آگاہی کے لیے کتاب بھی لکھی آپ کی نثر کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

"مولوی قادر عظیم خاں اپنی تصنیف گلستان نسب میں فرماتے ہیں کہ نائط گفتن اینہا را بہ سبب نسبت فرزندی از وائط نبیرہ جعفر طیّار رضی اللہ عنہٗ است بہ سبب کثرت استعمال واؤ مبدل بنون شدہ محمد قاسم ابن محمد ہاشم تذکرہ مشاہدہ الاصفیاء نے بھی انہیں الفاظ کے ساتھ قوم نایط کی وجہ تسمیہ کو بیان فرمایا ہے۔ اتحاد لفظی سے پایا جاتا ہے کہ صاحب گلستاں نسب نے اسی تذکرہ سے اپنی کتاب میں عبارت نقل کی ہے۔ مصنف گلستاں نسب نے آگے چل کر کتاب کشف الانساب سے استدلال فرمایا ہے جو فاضل متبحر علامہ شیخ جلال الدین سیوطی محدث شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے۔ جس میں

---

[1] رسالہ شہاب۔

شیخ نے اس قوم کو بنو لوائط لکھا ہے اور عبداللہ الوائط کی اولاد قرار دیا ہے۔'
کشف الانساب ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اس قوم کا مقام مدینہ
سے ہجرت واقع ہونے کے بعد موضع وائط میں رہا ہے۔ جو بغداد سے تین
دن کی راہ تھی، مؤلف کتاب کہتا ہے کہ اس موضع کا نام بھی قوم کی وجہ تسمیہ
میں کچھ دخل رکھتا ہے[1]"۔

"متقدمین کے بعد متوسطین کا زمانہ آیا اور ان کے بعد متاخرین کی نوبت آئی
ہر زمانے میں ہر شخص کا ذوقِ طبیعت جدا رہا۔ جس اُستاد نے اپنے کلام
میں جس لفظ کا استعمال چاہا کیا اور جس لفظ کو چاہا ترک کیا۔ لیکن ترک الفاظ
کی یہ دھوم نہ تھی اور نہ کسی نے کوئی رسالہ یا ہدایت نامہ ترک الفاظ کے متعلق شائع
کیا۔ وہ سمجھ رہے تھے یہ رنگ کچھ مستحسن اور سنجیدہ نہیں ہے کہ کسی اور کے
ذوق کو ہم اپنے ذوق کا تابع بنائیں اور کنایتہً استادان سلف کے نام پر
دھبہ لگائیں[2]"۔

---

(۷) مُلاّ عبدالقیوم

مُلاّ عبدالقیوم کا نام حیدرآباد کے قومی کارکنوں کی فہرست میں ہمیشہ دُرخشاں رہے گا۔ آپ کے اجداد کا وطن مدراس تھا۔ آپ کے دادا عارف الدین خاں رونق حیدرآباد آئے۔ ملاّ صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۲۷۰ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی۔ ۱۲۹۴ھ میں مددگاری نظامت تعلیمات سے ملازمت کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنے زمانہ میں اس سررشتہ کی جو خدمت کی ہے وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ آپ نے اصلاح کی جو کوشش کی اس کی بدولت اس سررشتہ کے اخراجات دو لاکھ سالانہ کے بجائے پانچ لاکھ ہو گئے۔ کتب خانہ آصفیہ کا قیام آپ کی سعی و کوشش کا زندہ نمونہ ہے۔ جبری تعلیم کے مسئلہ پر بھی آپ نے کامل غور کیا تھا اور ایک اسکیم مرتب کر لی تھی۔ "استدعار تعلیم جبری" اس زمانہ میں مرتب ہوئی تھی جب کہ ہندوستان میں مسٹر گھوکھلے علمبردارانِ تعلیم جبری نے ابھی اپنا کام شروع بھی نہیں کیا تھا۔

---

[1] حیات دلعز یز۔

مددگاری تعلیمات کے بعد آپ نے مختلف عہدوں پر ترقی پائی۔ ڈپٹی کمشنر انعام ہوئے اور آخری زمانہ میں اوّل تعلقداری پر کارفرما تھے۔ وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے کے بعد رمضان ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔

حجاز ریلوے کی تعمیر کے زمانہ میں آپ نے اپنی حسنِ سعی سے لاکھوں کا چندہ فراہم کیا۔ حیدر آباد کی علمی و ادبی دُنیا کے آپ روح رواں تھے۔ سیاسیاتِ ہندوستان میں آپنے ابتدائی زمانہ میں اہلِ کانگریس سے اتفاقِ رائے کرلیا تھا اور بڑے پُرجوش کانگریسی تھے۔ غالباً آپ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے کانگریس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ بہت بڑا عملی حصّہ بھی لیا۔ مُلّا صاحب اپنی صلح پسندی اور حُسنِ اخلاق کے باعث بہت ہر دلعزیز اور علم و فضل دیانت تقویٰ کے ساتھ زندہ دل بھی تھے۔ آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔ شاعری بھی کی ہے۔ مُلّا تخلص تھا۔

"علمِ سیاست مدن میں یہ امر مسلّمہ و تصفیہ شدہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں محتاجِ معاش ہے اور وجوہِ معاش انسانی بعض طبعی ہیں اور بعض غیر طبعی۔ ذرائع معاش فلاحت صناعت تجارت ہیں اور غیر طبعی ذریعۂ خدمت ہے اس لیے پانچ ہزار سال سے یہ مثال زبان زدخاص و عام ہے "اوتّم کھیتی مدھم بیپار" چاکری کنشت بھیک ندان" اوتم کھیتی اس واسطے ہے کہ انسان اپنی پہلے یا دوسرے درجہ کی ترقی سے جو کھوؤں اور جنگلوں سے نکل کر تمدّنی حالت کی طرف ترقی کرتا ہے تو زراعت پیشہ بنتا ہے اور یہ پیشہ انسان کا فطری و بسیط اور سب سے مقدم پیشہ ہے اس لیے کہ اس کو ابوالبشر آدم کی طرف منسوب کرتے ہیں اور انہی کا ایجاد کردہ اور تعلیم دادہ سمجھتے ہیں اکثر صحرانشیوں اور بادیہ گزینوں کا یہی پیشہ ہے۔ صناع اور حرفت چونکہ مرکبہ اور نظری و فکری ہیں۔ اس سے متاخر اور دوسرے درجہ پر ہیں چونکہ ان میں سے اکثر علمی ہیں جو محتاج نظر و فکر ممارست ہیں اس لیے اہلِ حضارت میں ان کا وجود پایا جاتا ہے نہ کہ اہلِ بداوت میں جب بداوت سے حضارت کے مرتبہ پر انسان ترقی کرتا ہے تو محتاج صنائع و حرفت ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو انسان کی ترقی کے دوسرے درجہ میں شمار کیا جاتا ہے۔"

(۸) مرزا مہدی خاں کوکب

ان اصحاب میں سے ہیں جو حیدرآباد سے سب سے پہلے بغرض تعلیم انگلستان گئے۔ آپ کے کئی مختلف علوم سے متعلق مضامین اور تراجم علمی رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے تھے۔ بعض مستقل کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی تحریر کا نمونہ حسب ذیل ہے، جو "فزیالوجی" کے متعلق ہے۔

"ہرچند یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہم حیوانات نباتات اور احجار (پتھروں) کے ناموں اور ان کی حقیقتوں سے واقف ہوں اور یہ کہ وہ کہاں اور کیوں کر پیدا ہوتے ہیں کن امور میں وہ ایک دوسرے سے مشابہت یا مبائیت رکھتے ہیں کس طرح پر وہ ہمارے لیے مفید و کارآمد یا مُضر ہو سکتے ہیں اور پچھلی صورت میں ہم اپنے آپ کو ضرر سے کس طرح بچا سکتے ہیں اور یہ بھی نہایت دلچسپ امر ہے کہ اجسام بہ سبب قوۃ جاذبہ کے زمین پر کس طرح گرتے ہیں اور روشنی کس طرح منعکس ہوتی ہے اور برق کیوں کر پیدا کر سکتے ہیں لیکن جو چیز ان سب سے زیادہ اہم اور زیادہ دل چسپ ہے وہ یہ ہے کہ ہم خود کیوں کر زندہ رہتے ہیں اور یہ کہ ہم اتنی عجیب و غریب چیزوں کے مشاہدہ کرنے اور بنانے پر کیوں کر قادر ہوتے ہیں اور اس بات کا علم حاصل کرنا لازمی ہے کہ ان جانوروں کی تاریخ کیا ہے جو ہمارے اطراف میں ہیں جن کی زندگی ہماری زندگی سے بہت کچھ مشابہ ہے اور اپنے آپ کو پہچانیں کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ صاف بتلا رہا ہے کہ ہم اپنے خدا کو نہیں پہچان سکتے جب تک کہ ہم اپنے آپ کو نہ پہچانیں۔ پس فزیالوجی وہ علم ہے جس میں بظاہر حیات سے بحث ہوتی ہے یعنی علم، افعال ابدان سے اور یہ لفظ دو یونانی لفظوں سے مرکب ہے فزیس بمعنی فطرت یا طبیعت اور گولوس بمعنی علم یہ قول مشہور ہے۔ العلم علمان علم الابدان و علم الادیان اس میں علم ابدان کو مقدم جانا ہے جس سے اس علم کی شرافت ظاہر ہے .... سانس اندر لینے کے اثناء میں ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ ہماری پسلیاں اُبھر آتی ہیں اور سینہ چوڑا ہوتا ہے اور پیٹ پھولتا ہے جیسے ہی ہوا ناک یا منہ میں سے داخل ہو کر کوشش میں پہنچتی ہے اور

تنفس خارجی میں یعنی سانس چھوڑنے میں اس کا عکس واقع ہوتا ہے پسلیاں دب کر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہیں پیٹ چپٹا ہوجاتا ہے اور چوطرف سینے کی گنجایش گھٹ جاتی ہے اور سینہ میں سے ہَوا اس طرح خارج ہوتی ہے جیسے بھتے سے۔

اگرچہ بھتے کے ساتھ شباہت ہے لیکن وہ قوت جو کہ ہَوا کو شش میں داخل کرتی ہے اور نکالتی ہے بالکل مختلف ہے[1]۔"

---

(۹) مولوی جمال الدین نوری

بھی اِسی دَور کے شاعر اور انشا پرداز تھے۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی تھی عرصہ تک نظام کالج میں پروفیسر رہے۔ کلامِ غالب پر آپ مبسوط شرح قلمبند کر رہے تھے۔ ذیل میں اس کا انتخاب درج ہے۔ ۱۳۴۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے ہر امتحان میں اوّل آئے ہیں۔

غالب کا شعر ہے:-

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

پہلے وہ گرد کے معنی واضح کرتے ہیں اور شعراء کے کلام سے ثبوت دینے کے بعد لکھتے ہیں:-

"طرح طرح کی مصیبتیں جب کسی پر ٹوٹ پڑتی ہیں تو رنج پر رنج دے کر آسمان کا رنگ دکھاتی ہیں اور انقلاب کا عالم نیرنگ انبساط کا رنگ اُکھڑ جاتا ہے اور بہارِ عشرت پر خزاں آتی ہے۔ دل پر غم چھاتا ہے اور شگفتگی پر اوس پڑجاتی ہے۔ جگر بھی جل کر کباب ہوتا ہے اور تازگی خاک میں مل جاتی ہے۔ نہ دل میں خوشی رہتی ہے نہ کلیجہ میں ٹھنڈک، رنج و مصیبت کے ہاتھوں دل و جگر خون ہوجاتے ہیں۔ سینہ پُر خون ہوجاتا ہے اور بہاؤ بڑھ کر دریائے جیجوں شعر کا

---

[1] رسالہ افادہ۔

مطلب یہ ہے کہ آگے مصیبت کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ عیش و نشاط کا عالم تھا اور لطف زندگی کا زمانہ عشرت کے سامان مہیّا تھے۔ رنگ محلوں میں رنگ رلیاں سوجھتی تھیں۔ دَورِ جام چلتا تھا۔ انجام کا خیال نہ آتا تھا۔ خواب راحت میں عمر کٹتی تھی اور زندگی کا مزا آتا تھا۔ اس کے بعد ایک دم سے ہوا بدل گئی اور خوش دلی کا ورق اُلٹ گیا وہ بپتا مجھ پر پڑی کہ غم واندوہ کے بادل گرجنے اور درد والم کے پتھر برسنے لگے چوٹ پر چوٹ کھائی اور صدمے پر صدمہ اُٹھایا اس لیے دل خون ہوگیا، جگر لہو لہان ہوگیا۔ ناسور سے چشمے اُبلنے لگے اور خون کا ایک دریا اُمنڈ آیا اور لہرا کر بہنے لگا۔ اس لیے اب یہ گت بن گئی ہے کہ دل سے لے کر جگر تک دریائے خون کا ساحل ہوگیا ہے۔ روز و شب خونِ جگر پیتا ہوں اور غم کھا کر جیتا ہوں۔ غرض جس راہ گزر میں اب غم کا جوش طوفان خیز اور لہو کا شور انگیز ہے آگے اسی میں غضب کی دلکشا فضائیں اور روح افزا ہوائیں تھیں۔ غم سے فراغ تھا، دل باغ باغ تھا اور جگر بے داغ گویا فصلِ بہار آئی تھی اور دل سے جگر تک تمام رہ گزر گلزار ہوگئی تھی۔ چمن کی شادابی اور گل کی سیرابی شہرۂ آفاق ہوکر ضرب المثل ہوگئی ہے لیکن خوشحالی اور فارغ البالی نے وہ پھول باغ یہاں لگایا تھا کہ سینہ بے غم اور دل خرم کی شگفتگی نے لالہ زار میں آگ لگائی۔ گلستان اِرم پر بجلی گرائی۔ ابر نو روز کی آبرو برباد ہوگئی تھی، ہنگامۂ بہار سرد تھا اور جلوۂ گل گرد۔ مقصد اصلی اگرچہ یہی تھا کہ جلوۂ گل ناچیز اور بے حقیقت ہوگیا تھا لیکن مصنّف نے جلوۂ گل کی گرد رہ گزر میں اُڑا کر ایک لطف مضمون پیدا کیا ہے[1]۔"

---

(۹) مولوی سیّد اشرف شمسی

رسالہ حسن کے مشہور مضمون نگار تھے آپ کے اکثر مضامین پر رسالہ حسن کی جانب سے اشرفیاں نذر کی گئی ہیں۔ صحیفہ ماہواری میں بھی آپ کے اکثر مضامین شائع ہوئے ہیں۔ مدت

---

[1] رسالہ ترقی۔

تک آپ مدرسہ دارالعلوم میں مدرس رہے۔ آخر زمانے میں عثمانیہ کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ محرم ۱۳۴۹ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے جو حکیم الاشراق شیخ شہاب الدین کے حالات سے ماخوذ ہے :-

"شیخ الاشراق کے فلسفی تصانیف سے یہ امر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو ارسطو طالیس کے اکثر اُصول فلسفہ سے سخت اختلاف تھا۔ اگرچہ شیخ نے اپنی کتابوں میں ارسطو کے مسائل ترتیب وار ذکر نہیں کیے ہیں تاہم جس طور پر ان کا ذکر کیا گیا ہے بغیر اعتراض و مواخذہ نہیں چھوڑا ہے۔ کلمۃ الاشراق اگرچہ بظاہر فلسفہ کی کتاب معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہ کتاب فلسفہ ارسطو کا رد ہے یا اس کے فلسفہ کو کمزور کر دینے والی ہے۔ اگرچہ اُصول منطقیہ میں شیخ نے ارسطو طالیس سے زیادہ اختلاف نہیں کیا ہے تاہم بعض مسائل مثلاً مسئلہ تجدید و فصل وغیرہ میں ارسطو کی رائے سے بے حد مخالفت کی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ حقائق و انواع کی تجدید اشیار کے لیے فصول ذاتیہ کی ضرورت نہیں ہے جس جگہ شیخ ارسطو پر فصول اشیار میں مواخذہ کیا ہے اس جگہ پر یہ بحث بھی کی ہے کہ یہ ضرورت نہیں ہے کہ جواہر کے فصول جواہر ہی ہوں بلکہ جائز ہے کہ اعراض ہوں چنانچہ سریر کی حقیقت چند لکڑی کے ٹکڑے اور ہیئت سریر کے سوا کوئی چیز نہیں ہے[1]۔"

راجہ راجیشور راؤ

راجہ راجیشور راؤ بہادر بھی اس عہد کے ایک پُرگو مُصنّف ہیں۔ آپ نہ صرف ایک نثار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں بلکہ شاعری کا بھی خاصہ ملکہ تھا، اصغر تخلص کرتے تھے۔ اسٹیٹ دوم کنڈہ کے آپ والی تھے۔ اسٹیٹ کے کاروبار کے ساتھ آپ کی علمی مصروفیت قابلِ تعریف اور لائقِ ستایش ہے اور پھر آپ کی تصانیف مختلف فنون میں تقسیم ہیں جن سے آپ کی ہمہ دانی کا

---

[1] رسالہ صحیفہ۔

پورا ثبوت ملتا ہے۔ فنِ لغت سے آپ کو بڑی دلچسپی رہی۔ علاوہ شائع شدہ لغتوں کے بلحاظ حروفِ تہجی، عربی، فارسی اور اُردو کی ۲۶ جلدیں مکمل ہیں جن کو ہنوز شائع نہیں کیا گیا۔

آپ کی نثر کا نمونہ پیش ہے :-

دروپدی کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے رحم و کرم کے غمزدہ لہجہ میں التجا کی اور کہا ارے! آج چھتریوں کا پاک دھرم برباد ہو رہا ہے۔ کوئی ہے جو میری حفاظت کرے۔ دروپدی کو روتی ہوئی دیکھ کر پانڈو غصہ سے کانپنے لگے مگر ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ادھر کمینہ وشاسن دروپدی کی چوٹی پکڑ کر برہنہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا ہنسنے لگا۔ اس وقت کرن بھی کہا کیوں دروپدی اب کچھ یاد ہے کہ نہیں؟ سوئمبر کے وقت تم نے بھرے دربار میں سوت کا بیٹا کہہ کر میری بے عزتی کی تھی۔ یہ تمام اسی غرور کا نتیجہ ہے دریودھن نے کہا کیوں دروپدی یاد ہے کہ نہیں جبکہ میں دربار محل دیکھنے کے وقت پانی میں گر پڑا تھا۔ اس وقت تو بھی پانڈوں کے ساتھ کھل کھلا کر ہنسی تھی۔ یہ تمام اسی نخوت کا نتیجہ ہے۔ تمہارے شوہروں نے تم کو جوے میں ہارا ہے اب تم ہماری باندھی ہو۔ آؤ یہاں ہماری بغل میں بیٹھو۔[1]"

---

(۱۱) مولوی انوار اللہ مرحوم

مولوی محمد انوار اللہ نام اور خان بہادر فضیلت جنگ خطاب تھا۔ قلمرو آصفی کے ایک قصبہ قندھار میں بتاریخ ۴ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے جو آپ کے اجداد کا وطن تھا۔ یہاں آپ کے اجداد کابل سے آکر مقیم ہوئے تھے۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی سے آپ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۲۹۵ھ میں آپ مرحوم اعلیٰ حضرت غفران مکان کی تعلیم پر مامور کیے گئے۔ اس کے بعد ۱۳۰۸ھ میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تعلیم کے لیے بھی مقرر ہوئے جس کا سلسلہ ۱۳۲۹ھ یعنی اعلیٰ حضرت کی تخت نشینی تک قائم رہا۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم

---

[1] مہا بھارت۔ صفحہ ۴۴۔

کے زمانہ میں پہلے آپ ناظمِ امورمذہبی بنائے گئے۔ پھر صدرالمہام اُمورمذہبی کی اہم خدمت تفویض ہوئی اپنے انتقال تک اسی خدمت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد برادران والاشان کی تعلیم بھی آپ کے سپرد رہی۔ ۱۳۲۶ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

مدرسہ نظامیہ آپ کی زندہ یادگار ہے۔ علومِ اسلامیہ میں آپ سند تھے۔ سیر، کلام، فلسفہ اور مناظرہ وغیرہ میں آپ نے معرکتہ الآرا کتابیں لکھی ہیں۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:

"کشف کے معنی مرزا صاحب یہ لیتے ہیں کہ اس میں صورتِ مثالی ظاہر ہوتی ہے اگر یہی معنی کشف کے ہیں تو چاہیے کہ اگر کسی چیز کا خیال کرلیا جائے تو اس کو بھی کشف کہیں، اس لیے کہ اس میں بھی آخر صورت خیالی کا کشف ہوتا ہے اور دونوں میں اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اگر بعد تغیّر کے انطباق صورتِ مثالیہ کا صورت خارجیہ پر ممکن ہے تو بعد تحقیق کے صورت خالیہ کا انطباق بھی صورتِ خارجیہ پر ممکن ہے، پھر ایسا کشف جس کو خیال پر بھی فضیلت نہ ہو سکے۔ اس کو کشف کہنا اندھیر ہے۔ تمام اہلِ کشف کا اتفاق ہے جس سے اولیاء اللہ کے تذکرے بھرے ہوئے ہیں کہ جس چیز کا کشف ہوتا ہے اس کو وہ کراۃ العین دیکھ لیتے ہیں اور جو کچھ وہ خبر دیتے ہیں۔ برابر اس کا ظہور ہوتا ہے۔ مگر مرزا صاحب اس کو کیوں ماننے لگے تھے[1]۔"

اب ہم بعض ایسے اصحاب کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے شاعری میں کوئی حصّہ نہیں لیا ہے۔

---

(۱۲) مولوی عبدالقادر مرحوم

راقم کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم غلام محمّد خاں شرف الدولہ غالب جنگ کے فرزند اکبر تھے۔

شرف الدولہ کا تعلق ریاست ارکاٹ سے تھا۔ آپ کا خاندان ان اصحاب سے تعلق رکھتا ہے جو ابتداءً تبلیغ اسلام کے لیے سواحلِ ہند پر تشریف لائے تھے اور پھر گوا اور بیجا پور میں قضائت سفارت وغیرہ مختلف ذمہ داری کی خدمات انجام دیں اور عالمگیر کے

---

[1] انوارالحق۔ صفحہ ۵۹۔

عہد میں مختلف ممالک دکن میں پھیل گئے پھر روسار ارکاٹ کے زمانہ میں ذمہ داری کے مختلف مناصب مثلاً دیوانی اور قضائیت وغیرہ انجام دیئے ہیں۔

مولوی عبدالقادر مرحوم کی پیدائش ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں ہوئی۔ سالار جنگ مختار الملک اوّل کے حسب الطلب حیدر آباد آئے اور ۱۲۹۲ھ میں منصب جالنہ مقرر ہوئے۔ آسمان جاہ کے عہد وزارت میں رجسٹرار بلدہ ہوئے اور اپنے انتقال تک اسی خدمت پر مامور رہے۔

اڑتالیس سال کی عمر میں رجب ۱۳۲۴ھ میں آپ کا بہ مرضِ دق انتقال ہوا۔ مدراس کی مسجد والا جاہی میں مدفون ہوئے۔

حیدر آباد میں قومی زندگی کو نشو و نما دینے میں آپ نے بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ مختلف علمی اور معاشرتی اِداروں کے قیام میں آپ نے خاصہ عملی حصّہ لیا ہے اور بعدِ قیام ان کے کاروبار کو بخوش اسلوبی چلانے میں آپ کے مخلصانہ مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی حیدر آباد کا سن رسیدہ طبقہ آپ کی خدمات سے بخوبی واقف ہے۔ سلطنتِ آصفیہ پر بیرونِ ملک کے اخبارات جو بے بنیاد الزام عائد کرتے تھے اس کا آپ دنداں شکن جواب دیا کرتے تھے۔ مؤلف قلمرو آصفی نے آپ کے متعلق اپنے دیباچہ میں حسبِ ذیل صراحت کی ہے:

"اگرچہ حیدر آباد میں ان کے اخلاق کے مدّاح سیکڑوں نہیں ہزاروں ہیں مگر بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی سے ناواقف رہنے اور مشرقی علوم میں بھی ید طولیٰ نہ رکھنے کے باوجود ان کو حیدر آباد کے تاریخی، سیاسی، تمدّنی، اقتصادی مسائل پر پورا عبور تھا۔ البتہ بے وقت موت سرکاری ملازمت حیدر آبادی خصوصیات کے لحاظ سے ان کو موقع نہ مل سکا کہ ملک کی اس قدر خدمت کر سکیں جس قدر کہ وہ کر سکتے تھے۔"

آپ کی تصانیف کی تعداد بیس سے زیادہ ہے مگر ان میں سے بہت کم شائع ہوئی ہیں عبارت کا نمونہ پیش ہے:

"لارڈ کرزن اپنی اسپیچ میں ریاست کے مقروض ہو جانے کا باعث اس طرح ارشاد فرماتے ہیں کہ حیدر آباد حال میں قحط اور دیگر صدموں سے جیساکہ اور ریاستوں میں ہوا ہے خزانہ کی ابتری کا صدمہ بھی اُٹھا چکا ہے ..... جبکہ قحط سالی کا دورہ ہر مدار لمہام کے عہد میں ضرور ہوتا رہا اور سلطنت نے اس

کے روکنے کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کی با ایں قرضہ کا بار اس قدر نہیں ہوا تھا، تو خود بخود یہ نظر آتا ہے قرضہ کی اصل وجہ قحط سالی نہیں، بلکہ ملکی ضرورتوں سے ناواقف یوروپین نگرانی ہے، اگر مسٹر کرالی یوروپین اُصول کے برخلاف اور مشرقی خیالات کی تقلید میں جس کی بدولت ہماری سلطنت پر یہ اعتراض ہو رہے ہیں فیاضی کا ہاتھ اس قدر نہ بڑھا دیتے اور مسٹر ڈنلاپ انتظام قحط سالی میں عہدہ داران کو شُتر بے مہار کی طرح نہ چھوڑ دیتے جن کی نالائقی و بد دیانتی کی وجہ سے یوروپین نگرانی کی ضرورت بیان کی جاتی ہے اور ان پر پوری نگرانی رکھتے تو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ اس قدر قرضہ کبھی نہ ہوتا اور سلک موجودہ سے (دو لک) زیادہ سلک موجود رہتی۔ اب ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ قحط سالی گذشتہ زمانہ میں بھی موجود تھی، کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں، جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہماری رائے نامہ نگار لندن ٹائمز کی طرح محض خیالی نہیں بلکہ محض واقعات اور صحیح اعداد پر مبنی ہے[1]۔" راقم نے ایک مستقل تصنیف آپ کے متعلق شائع کر دی ہے۔

---

(۱۳) مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم

مولوی مرتضیٰ مرحوم، مولوی صفی الدین مرحوم کے فرزند تھے۔ مولوی صفی الدین مرحوم کی حداترسی صداقت اور حق گوئی سے جدید حیدر آباد بخوبی واقف ہے۔ مولوی مرتضیٰ کی پیدائش ۱۲۹۰ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دار العلوم میں آپ نے تعلیم کی تکمیل کی۔ سارے امتحانات نمایاں اعزاز کے ساتھ کامیاب کیے اور بعض امتحانوں میں کل پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے ہیں۔

بعد ختم تعلیم معتمدی عدالت میں آپ کا تقرر ہوا۔ بوقتِ انتقال مہتمی اوقاف کی خدمت پر مامور تھے۔ یکم رجب ۱۳۲۴ھ کو بہ عارضہ طاعون آپ کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ درگاہ حضرت یوسف صاحب شریف صاحبؒ میں مدفون ہیں۔ ملک کا تعلیم یافتہ وہ کون فرد ہے جس کو مولوی مرتضیٰ مرحوم کی قومی خدمات یاد نہ ہوں۔ معتمد ایجوکیشنل کانفرنس کی حیثیت سے انہوں نے

---

[1] از مضمون لندن ٹائمز اور حیدر آباد۔ مطبوعہ مخزن دکن ۱۹۰۵ء

تمام ملک میں تعلیمی شوق و ولولہ پیدا کرنے میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور کانفرنس کے فنڈ سے صدہا غیر مستطیع طلبہ کو بیش قرار مددودی جس کے باعث وہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔ غرض حیدر آباد کی ترقی تعلیم اور جامعہ عثمانیہ کے قیام میں ان کا عملی حصّہ تھا۔ مؤلف "عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی" نے تفصیل کے ساتھ آپ کے کارنامے بتائے ہیں اور مولوی سردار علی صاحب نے آپ کے علمی کارناموں کی صراحت مشیر دکن میں کی ہے۔ مختلف اخبارات اور رسائل مثل معارف اعظم گڈھ، صحیفہ حیدر آباد میں آپ کے بیسیوں مضامین شائع ہوئے اور نہ صِرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان کے اربابِ علم نے بھی ان کی قدر کی "روح ترقی" اور "تاریخ التاریخ" دو رسالے آپ کی زندگی میں شائع ہوئے۔ تاریخ سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ مفصل تاریخ دکن "حیاتِ تمدّن" کے نام سے مرتب فرمائی تھی، جس کا ایک حصّہ آپ کے انتقال کے بعد "عہدِ سلف" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ راقم نے ایک مستقل تصنیف میں آپ کا حال قلمبند کیا ہے جو شائع ہو گئی ہے۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"روح ترقی کے مبارک سرا پا حقیقت خواب کا جس نے بالآخر حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تعبیری صورت اختیار کی، ایک جزو نظامِ آصفی بھی تھا۔ بیداری کے لیے جس چیز کو ملک کی ضرورت ہے وہ اس کی تاریخ ہے۔ زندہ قومیں اپنی قومیت کا انحصار اسی پر سمجھتی ہیں کہ اپنی تاریخ بچّہ کی گھٹی میں داخل ہو، قوم کا بچّہ آنکھ کھول کر تاریخی سبق لے (بڑا ہو کر اپنے کاموں کی بنیاد رجال قوم کے نقشِ قدم پر رکھے اور مرنے کے بعد اسی سلسلۂ فہرست میں اس کا نام داخل ہو، تاریخ ہی وہ تمام قوم کی زندگی کا محور ہے جس پر ملک کی عزت بنتی ہے.....

"ایسے وقت میں جب کہ فاطر السمٰوٰت والارض یا شاید ہستی مطلق کا جمال جہاں آرا کسی قوم میں بھی صاف نظر نہیں آتا۔ ایسے مقام میں جہاں ہر طرف پہاڑیوں کے جمے ہوئے قطار در قطار تودوں اور سخت زمین کے سوائے کوئی سرسبزی یا دل لبھانے والی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ امین قوم، نورِ دو عالم، حسن مجسّم باسم ربک الذی خلق کی مبارک تعلیم کا آغاز کرتا ہے اور تیرہ سال کی مسلسل کوشش کے بعد جب اس کا صلہ یہ دیکھتا ہے کہ قوم دنیا کو

اسکے وجود سے خالی کرنا چاہتی ہے تو صدیوں کے آبائی وطن سے چھپے چھپے جدا ہوتا اور اسی خطہ کی ایک سرزمین میں جہاں کسی قدر سرسبزی بھی ہے، ہجرت کرتا ہے اب (۶۰۰) قابل جنگ مردم شماری ہو جاتی ہے۔ قوم بہ زور شمشیر اس آواز توحید کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ بدر صداقت (۳۱۳) جانباران راہِ توحید کی ضعیف جماعت میں یہی دعا کرتا ہے"۔ اوالله! اگر یہ چھوٹی سی جماعت آج مارڈالی گئی تو پھر کبھی زمین پر تری عبادت نہ ہوگی۔ محبت حق کی سرشار یہ چھوٹی جماعت اپنے سہ چند دولت اور رسم پرستوں کو کاٹ کے رکھ دیتی ہے[۱]"۔

---

(۱۴) عبدالجبّار مرحوم

مولوی عبدالجبّار مرحوم ملکا پور (برار) کے باشندے تھے۔ حیدرآباد میں اپنی عمر بسر کی۔ مدت تک مدرسہ اعزار کے مدرس رہے۔ آپ حیدرآباد کے ایک مشہور مورخ تھے۔ تذکرہ سلاطین دکن۔ تذکرہ شعرائے دکن (محبوب الزمن) اور تذکرہ اولیائے دکن کے نام سے پانچ ضخیم جلدیں مرتب اور شائع کیں۔

آپ نے تاریخ دکن کے متعلق جو کچھ مواد فراہم کیا ہے وہ اگرچہ عصری معیار پر پورا نہیں اُترتا لیکن جو ذخیرہ آپ نے فراہم کر دیا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت قیمتی ہے زمانہ حال میں تاریخ دکن پر کوئی کتاب آپ کی کتابوں سے مدد لیے بغیر نہیں لکھی جا سکتی ۱۳۴۴ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

آصف جاہ اول کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کے والد ماجد میر شہاب الدین خاں المخاطب بہ غازی الدین خاں فیروز جنگ نے باپ کی رحلت کے بعد رفتہ رفتہ ہفت ہزاری تک ترقی کی اور غازی الدین خاں فیروز جنگ عالمگیری امرا میں اکبر الامرا شمار کیے جاتے تھے۔ عالمگیر آپ کو بڑی عظمت و محبت سے دیکھتا تھا۔ دکن کے معرکوں میں آپ کی جاں نثاری و عرق ریزی و دلیری دیکھ کر فرزندوں سے زیادہ چاہتا تھا۔ جب آپ کی کوشش و جاں فشانی سے بیجا پور کی فتح حاصل ہوئی اس وقت آپ کے خطاب کے

---

[۱] عہد سلف۔

ساتھ فرزند ارجمند کا فقرہ اضافہ فرمایا۔ بیجا پور کے معرکوں میں دکھنیوں نے عالمگیری لشکر میں رسد کی آمد و رفت بند کردی تھی۔ لشکر میں بہ سبب عدم غلہ و دانہ کھلبلی پڑی ہوئی تھی۔ تمام بے قرار و جان بلب ہو رہے تھے۔ عالمگیر رسد کے نہ پہنچنے کی خبر سے نہایت بے چین و بے قرار تھا۔ رات کے آٹھ بجے فیروز جنگ کو بلایا اور رسد پہنچانے کی بابت کہا۔ فیروز جنگ اسی وقت مستعد ہوئے۔ مع جمعیت و رسد ہمراہ لے کر عالمگیری لشکر میں مخالفین سے قتال و جدال کرتے ہوئے قریب چار بجے صبح کے پہنچے رسد لشکر میں تقسیم کردی[1]۔"

---

(۱۵) مولوی سید خورشید علی صاحب

مولوی سید خورشید علی صاحب سابق ناظمِ دفتر دیوانی و مال وغیرہ، حیدرآباد کے مشاہیر اہلِ قلم سے ہیں۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ مدرسۂ عالیہ، سٹی ہائی اسکول اور نظامِ کالج میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ ابتداً معتمدی فینانس میں آپ کا تقرر ہوا مسٹر گلانسی صدرالمہام فینانس کے زمانہ میں آپ نے اپنی کارروائی کی وجہ سے امثال و اقران میں امتیاز حاصل کیا۔ دفتر دیوانی و مال جیسے قدیم دفاتر کی تہذیب آپ کی ہی سعی مشکور کا نمونہ ہے حیدرآباد کو قومی زندگی کو حالاتِ زمانہ کے مطابق ڈھالنے میں آپ نے ابتداءً زندگی سے ہی سرگرمی اور انہماک کا ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا ہے۔ تقریر اور تحریر دونوں میں آپ نے ایک خاص مرتبہ حاصل کیا ہے۔ ہندوستان اور دکن کے مشہور رسالوں مثلاً ادیب الٰہ آباد، مخزن لاہور، زمانہ کانپور، دکن ریویو، ذخیرہ، ترقی (حیدرآباد) میں آپ کے بیش بہا مضامین شائع ہوئے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے "جاپان" اور "گوکھلے من حیثیت انسان" آپ کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:

"بنی نوع انسان اسلام کی تمدنی اصلاحوں کے جس قدر زیر بار احسان ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ غیر اقوام اور غیر مذاہب تک کو اس بات کا اقرار ہے کہ تمدن کو ترقی و تکمیل کے مدارج پر پہنچانے والے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ

---

[1] تذکرہ سلاطین دکن۔

علیہ و آلہ وسلم ہیں۔ اسری، ایرانی، مصری، یونانی اور رومی تمدن اپنے وقت میں اس زمانہ کی حالت کے مطابق اپنی نظیر آپ تھے۔ مگر اب وہ سب گرد روزگار ہیں، صرف ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ لیکن جو عظیم الشان تمدن پیغمبر عرب نے قائم کیا وہ آج تیرہ سو برس بعد بھی اسی طرح کا اہل اور عدیم المثال ہے کہ اس کے سامنے نہ صرف مینوی بابل انیتس۔ صدور، ممفس وتھیس وغیرہ کے گذشتہ تمدن ہی ہیچ ہیں بلکہ موجودہ زمانہ کے دوسرے تمام شائستہ اور ترقی یافتہ اقوام و ممالک بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عورتیں انسانوں اور حیوانوں کے درمیان ایک قسم کی مخلوق سمجھی جاتی تھیں لونڈیوں سے بھی بدتر حیثیت رکھتی تھیں۔ ان پر مردوں کی جابرانہ حکومت قائم تھی اور ان کا مصرف محض ترقی نسل اور مردوں کی ذلیل غلامی تھا۔ ہندو یونانی اور رومی قانون نے عورتوں کو ان کی مستقل شخصیت سے ہمیشہ محروم رکھا۔ یونانی جن کی ترقی و تہذیب کا ایک زمانہ ثنا خواں ہے۔ عورتوں کو ایک کم درجہ کی ذلیل مخلوق اور مردوں کی خدمت گذار سمجھتے تھے۔ محض ایک بچہ پیدا کرنے کی کل سے زیادہ ان کی وقعت نہ تھی ان کی بے قدری و ذلت کی انتہا یہ تھی کہ اگر کسی عورت کے ہاں ناقص الاعضا بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کو مار ڈالتے تھے۔"[1]

---

(۱۶) حکیم سید شمس اللہ قادری

حکیم سید شمس اللہ قادری بھی اسی عہد کے ایک مشہور مؤلف ہیں جنہوں نے اپنی تاریخی قابلیت کی وجہ سے بھی بہت شہرت حاصل کر لی ہے۔ اردوئے قدیم کے علاوہ آپ کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ کو آپ کی تصانیف اور علمی شغف کے باعث سرکار عالی سے بیش قرار منصب جاری ہوئی ہے۔ ہندوستان کے سربرآوردہ رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

"جس زمانہ میں آل سبکتگین کا ظہور ہوا ہے وسط ایشیا میں آفتاب علم و فن

---

[1] رسالہ ذخیرہ۔

اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ قریب قریب اسی زمانہ میں امام بخاری، امام مسلم، ابونصر فارابی، بوعلی سینا، امام رازی ابوالفضل جوہری وغیرہ اسی سرزمین کی مردم خیز بستیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ وسط ایشیا میں اس وقت جو حکومتیں قائم تھیں ان سب کے حکمران عموماً صاحب علم وفن اور علوم وفنون کے مربی و سرپرست تھے۔ ان حکومتوں میں ماوراالنہر کے سامانی حکمران سب سے زیادہ طاقتور اور ذی اثر تھے۔ علمی سرپرستی کے لحاظ سے بھی ان کا پایا بڑھا ہوا تھا اس خاندان کا تیسرا فرمانروا نصر بن احمد (سنہ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء، ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۴ء) بڑا فیاض اور ہنر پرور بادشاہ ہوا ہے۔ اُستاد ابوالحسن رودکی جس کو فارسی شاعری کا ابوالآبار کہتے ہیں اس کے دربار کے ملک الشعراء کے عہدے پر مامور تھا۔ بادشاہ کی فرمائش سے اس نے کلیلہ و منہ کی حکایات فارسی میں نظم کی تھیں اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم کا عطیہ ملا تھا۔"

عنصری اپنے ایک قصیدہ میں لکھتا ہے :۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش ٭ عطا گرفت بہ نظمِ کلیلہ در کشور[1]

---

(۱۷) مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب

مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب حیدر آباد کے ایک قدیم خاندانی منصب دار تھے۔ آپ کی کئی مؤلفہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بستان آصفی جس کی سات جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ حیدر آباد کی مفصل تاریخ ہے۔ سلطنت آصفیہ کے متعلق عام تاریخی حالات اور واقعات جس قدر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں درج ہیں وہ کسی اور کتاب میں درج نہیں ہیں اور کسی کتاب میں ایک جا نہیں مل سکتے۔ ۱۳۵۳ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ راؤ صاحب کی عبارت کا نمونہ پیش ہے :۔

"راجہ رام راج نے سلطان ابراہیم شاہ کے ملک کا کچھ حصہ دبا لیا تھا اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اس جنگ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ لڑائی دریائے کرشنا کے پار مشرقی جانب واقع ہوئی تھی اس میں سلطان ابراہیم کو راجہ سے اس کا ملک

---

[1] رسالہ اُردو۔

واپس مل گیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ایک زبردست فوج بھیج کر قلعۂ ورنگل بھی فتح کر لیا۔[1]

"سر جان شور گورنر جنرل اس زمانہ میں ہندوستان کے فرمانروا تھے۔ ان کی طبیعت کچھ ایسی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ وہ لڑائی کو مطلق پسند نہ کرتے تھے۔ اس وجہ سے مرہٹوں کی ہمت بڑھی اور اُن کی طاقت دن بدن مضبوط ہونے لگی۔ انہوں نے سرکار نظام سے جنگ کی ٹھانی، چنانچہ نواب نظام علی خاں ۱۲ شعبان ۱۲۰۹ھ کو قلعہ کھرڑوالا میں صف آرا ہوئے اور جنگ چھڑی[1]"

---

(۸) سہراب جی

حیدر آباد میں اُردو کی خدمت ایسے اشخاص نے بھی کی ہے جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مگر حیدر آباد کی بود و باش کے باعث اُردو بمنزلہ مادری زبان کے ہو گئی ہے۔ ذیل میں اسی قسم کی ایک خدمت کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شکسپیر کے مشہور و معروف ڈرامہ میکبتھ کا ترجمہ ہے جو "تلاطم ایران" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے مترجم حیدر آباد کے قدیم پارسی خاندان کے بزرگ سہراب جی پستن جی کانگا سابق مددگار معتمد فینانس ہیں۔ اولاً ترجمہ ایک دشوار گذار منزل ہے اور پھر ڈرامہ کا ترجمہ اور بھی خاص حیثیت رکھتا ہے مگر "تلاطم ایران" کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مترجم نے کس محنت اور کامیابی سے اس کو انجام دیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب قابل قدر ہے جو آج سے پینتیس سال پہلے ترجمہ کی گئی ہے۔

ہیروئن اپنے آپ مخاطب ہے:۔

"وہ کوا کس قدر بھاری آواز سے کائن کائن کر رہا ہے جو میری چھت کے نیچے جان کھونے والے فتح علی شاہ کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ انسان کے دلوں میں شیطانی خیالات پیدا کرنے والے اے دیو اور جنو آؤ اور اسی وقت میرے زنانے صفات کو بدل دو اور سر سے پاؤں تک مجھے وحشت انگیز بے رحمی سے بھر دو، میرا خون گاڑھا کر دو اور رحم کے دروازے بند کر دو

---

[1] بستان آصفی۔

تاکہ کوئی خلش یا رحم آمیز خیال میرے خونخوار ارادے کو متزلزل نہ کردے اور اس کی انجام دہی میں معترض نہ ہو۔ اے خونی عفریتو جہاں کہیں تم اپنے غیر مرئی جسموں میں دُنیا کی تباہی کے لیے آمادہ رہتے ہو وہاں سے آکر میری نازک چھاتی میں داخل ہو جاؤ اور میرے دودھ کو زہر بنادو، اے اندھیری رات دوزخ کے کالے سے کالے دھویں سیاہ کفن پہن لے تاکہ میری آبدار اور تیز چھری اپنے کٹے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے اور اے آسمان تو اپنی سیاہ چادر میں جھانک کر یہ نہ کہہ کہ ٹھہرو ٹھہرو یہ کیا کرتی ہو۔"

"امیر عبداللہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے کان میری زبان سے ہمیشہ کے لیے نفرت نہ کریں کیونکہ وہ ان کو ایک ایسی مکروہ خبر سنائے گی جیسی انہوں نے کبھی نہ سنی ہوگی۔ داؤد مرزا۔ ہاں ہاں میں سمجھ گیا۔

امیر عبداللہ:۔ آپ کے قلعہ پر دفعتہً قبضہ کرلیا گیا اور آپ کی بیوی اور بچوں کو ظالمانہ طور پر مار ڈالا۔ یہ بیان کرنا کہ کس طرح پر ان کو قتل کیا ہے۔ گویا ان بے گناہوں کے ساتھ آپ کی بھی جان لینی ہے۔"

اب اُردو کی ترقی کے سلسلہ میں جو اور کام اس دَور میں ہوئے ان کی صراحت کی جاتی ہے:۔

---

(۱) سررشتۂ علوم و فنون کا قیام

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر زبان میں علوم و فنون کی ابتدا غیر زبان کے ترجمہ سے ہوتی ہے اور آگے چل کر انہی ترجموں سے جب معلومات میں وسعت، خیالات میں بلندی پیدا ہوتی ہے تو نئی نئی کتابیں تالیف اور تصنیف ہونے لگتی ہیں اور ملک میں علماء فضلاء کے ساتھ ساتھ موجدین اور بانیاں فن کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ سلطنت آصفیہ میں اس کام کی ابتدا پانچویں دور میں ہو چکی تھی مگر وہ صرف ایک امیر کی ذاتی کوشش تھی اور ملک میں عام طور پر کوئی تعلیمی ہل چل اور ذوق وشوق نہیں تھا اس لیے اس منزل میں چند کتابوں کے ترجمے سے آگے قدم نہ بڑھ سکا۔ اس دَور میں اس کام میں بھی کافی وسعت و ترقی ہوئی۔ اسی غرض سے شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی کی نگرانی میں ایک سررشتہ علوم و فنون کے نام سے

قائم ہوا اور شائع شدہ کتابوں کو "سلسلۂ آصفیہ" کے مبارک نام سے موسوم کیا گیا۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اس محکمہ کے ناظم مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس سلسلہ کے لیے بطور خاص چند کتابیں تالیف و تصنیف فرمائیں۔ علامہ شبلی کے بعد مولانا عبدالغفور خاں صاحب اس دفتر کے انچارج رہے مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ طے پایا کہ اعلیٰ تصنیف یا تالیف کے پیش ہونے ہونے پر صاحب تصنیف یا تالیف کو ایک معقول رقم امداداً دے دی جائے اور وہ کتاب، سلسلۂ آصفیہ میں داخل کر لی جائے۔ اس سلسلہ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

شمار	نام کتاب	فن	نام مصنف یا مترجم	کیفیت
۱	ترجمہ روزنامچہ بے ٹیورنر فرانسیسی	سفرنامہ	عبدالغفور خاں	سلسلۂ آصفی جلد اوّل
۲	〃 〃 〃 حصہ دوم	〃	〃	〃 دوم
۳	نظامِ اکبری	تاریخ	〃	〃 سوم
۴	تاریخ دکن حصہ اوّل	〃	〃	〃 چہارم
۵	〃 〃 〃 دوم	〃	〃	〃 پنجم
۶	الغزالی	سوانح	مولوی شبلی نعمانی	〃 ششم
۷	علم الکلام	فلسفہ	〃 〃 〃	مفتم
۸	تاریخ دکن حصہ سوم	تاریخ	؟	〃 ہشتم
۹	الکلام	فلسفہ	مولوی شبلی نعمانی	〃 نہم
۱۰	الفاروق	سوانح	〃	
۱۱	تاریخ عروج اسلام	تاریخ	مولوی عبدالغفور خاں	

(۲) اخبارات اور رسالے

زبان کی ترقی میں اخبارات اور رسالے بھی غیر معمولی مدد کا موجب ہوتے ہیں۔ زبان کی ترقی اور ادب کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ ہوتا ہے، حیدرآباد میں علمی ادبی اور فنی رسالوں کا آغاز پانچویں دور میں ہوا۔ جس کا تذکرہ صفحات گذشتہ میں کر دیا گیا ہے۔ اس دور میں روزانہ اور ہفتہ وار اخبار شائع ہونے لگے اور ماہوار رسالوں میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔

ہندوستان میں اخباروں کا آغاز انگریزی اخباروں سے ہوا تھا، حیدرآباد میں بھی اخبار کا آغاز انگریزی اخبار سے ہوا ہے، حیدرآباد کا پہلا انگریزی اخبار "دکن ٹائمس" تھا جو ۱۸۶۴ء میں شائع ہونے لگا۔ اس کے بعد چند اور اخبار بھی شائع ہوئے۔

اُردو اخباروں میں پہلا اخبار ہفتہ وار تھا جو سنہ ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا جس کا تذکرہ گذشتہ دَور میں کردیا گیا ہے، اس دور کے ہفتہ وار اخبار اور روزانہ اخباروں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ اس دَور کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ روزانہ اخبار بھی شائع ہونے لگے اور یہ اخبار ہزار داستان ہے جو پہلے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا مگر سنہ ۱۸۸۵ء سے روزانہ شائع ہونے لگا اس کے ایڈیٹر غالبؔ کے شاگرد محمّد سلطان عاقلؔ تھے جو دہلی سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔

روزانہ اخبار

شمار	نام اخبار	نام ایڈیٹر	سن اجرائی
۱	ہزار داستان	محمّد سلطان عاقل	سنہ ۱۸۸۵ء
۲	پیک آصفی	سیّد حسن	سنہ ۱۸۸۵ء
۳	سفیر دکن	سیّد امجد علی اشہری	سنہ ۱۸۸۸ء
۴	مشیر دکن	کشن راؤ	سنہ ۱۸۹۹ء
۵	علم و عمل	محبّ حسین	سنہ ۱۹۰۴ء
۶	صحیفہ	اکبر علی	سنہ ۱۹۱۱ء
۷	معارف	مُلّا عبدالباسط	سنہ ۱۹۱۲ء

ہفتہ وار اخبار

شمار	نام اخبار	نام ایڈیٹر	سن اجرائی
۱	ہزار داستان	محمّد سلطان عاقل	سنہ ۱۸۸۳ء
۲	شوکت الاسلام	حاجی کرتان	سنہ ۱۸۸۴ء
۳	معلم شفیق	محبّ حسین	سنہ ۱۸۸۴ء
۴	اخبار آصفی	محمّد سلطان عاقل	سنہ ۱۸۸۵ء
۵	دکن پنچ	کشن راؤ	سنہ ۱۸۸۷ء

۶	افسرالاخبار	مشتاق احمد	۱۸۸۶ء
۷	خیال محبوب	عبدالسلام عرشی	۱۸۸۷ء
۸	محبوب القلوب	عبدالسلام	۱۸۸۹ء
۹	ملک وملت	سید احمد ناطق	۱۸۹۵ء
۱۰	نظارۂ عالم	قدرت اللہ مضطر	۱۸۹۶ء
۱۱	جامِ جمشید	محمد ابراہیم خاں	۱۹۰۱ء
۱۲	عزیز الاخبار	احمد عبدالعزیز (عزیز جنگ)	۱۹۰۳ء
۱۳	دکھنی	عبدالرحیم	۱۹۰۴ء
۱۴	نظامی	امیر حمزہ	۱۹۰۵ء
۱۵	محبوب گزٹ	پیارے لال	۱۹۰۵ء
۱۶	المحبوب	محمد قاسم	۱۹۰۶ء
۱۷	بیدر گزٹ	؟	۱۹۰۹ء

ماہوار رسالے

اس دور میں جو علمی، ادبی، فنی رسالے ماہوار شائع ہونے لگے ان کی تعداد خاصی ہے اور جو رسالے شائع ہوئے ان میں بعض ایسے معیاری اور مشہور رسالے ہیں جو شمالی ہند میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے، ان کے ایڈیٹر اپنی قابلیت کے باعث نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند میں شہرت رکھتے تھے۔ بعض رسالے مضامین کا معاوضہ بھی ادا کرتے تھے۔ اولاً رسالوں کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے، اس کے بعد رسالوں کے متعلق مختصر صراحت بھی کی جائے گی۔

شمار	نام رسالہ	نام ایڈیٹر	سنہ اجرائی	کیفیت
۱	ادیب	؟	۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۲ء	
۲	معلم شفیق	محب حسین	۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۲ء	
۳	فنون	مشتاق احمد صاحب	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	
۴	گلدستۂ مشتاق	؍؍	۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۳ء	

۵	مذاق سخن	مشتاق احمد صاحب	۱۲۹۹ھ	۱۸۸۳ء
۶	داستان سیاح	سید ابراہیم عفو	۱۲۹۹ھ	۱۸۸۳ء
۷	ارم دکن	سید احمد زید بلگرامی	۱۲۹۹ھ	۱۸۸۳ء
۸	رفیق دکن	عزیز الدین	۱۳۰۱ھ	۱۸۸۴ء
۹	جوہر سخن	عبداللہ خاں	۱۳۰۲ھ	۱۸۸۵ء
۱۰	گل و بلبل	الطاف حسین قابل محمد عباس مہجور	۱۳۰۵ھ	۱۸۸۷ء
۱۱	حسن	حسن بن عبداللہ عماد نواز جنگ	۱۳۰۵ھ	۱۸۸۸ء
۱۲	معلم نسواں	محب حسین	۱۳۱۰ھ	۱۸۹۲ء
۱۳	سحر بیان	مجیب احمد تمنائی	۱۳۱۲ھ	۱۸۹۴ء
۱۴	منتخب روزگار	سید علی رضا	۱۳۱۳ھ	۱۸۹۵ء
۱۵	افسر	محب حسین، عبدالحق	۱۳۱۴ھ	۱۸۹۶ء
۱۶	دل گداز	عبدالحلیم شرر	"	"
۱۷	دبدبۂ آصفی	پنڈت رتن ناتھ سرشار	۱۳۱۵ھ	۱۸۹۷ء
۱۸	شمس الکلام	سید سلیمان	"	"
۱۹	پیام محبوب	غلام حسین دار	"	"
۲۰	میڈیکل جرنل	لقمان الدولہ	۱۳۱۶ھ	۱۸۹۸ء
۲۱	جلوۂ محبوب	غلام ہمدانی گوہر	"	"
۲۲	محبوب الکلام	جلیل حسن	"	"
۲۳	سفیر دکن	امجد علی اشہری	۱۳۱۷ھ	۱۸۹۹ء
۲۴	نسیم دکن	نادر علی برتر	۱۳۱۹ھ	۱۹۰۲ء
۲۵	دکن ریویو	ظفر علی خاں	۱۳۲۱ھ	۱۹۰۳ء
۲۶	افسانہ	"	"	"
۲۷	معیار الانشاء	سراج الدین احمد خاں	۱۳۲۲ھ	۱۹۰۴ء
۲۸	الہادی	غلام حسین داد	۱۳۲۳ھ	۱۹۰۵ء
۲۹	صحیفہ	سید رضی الدین حسن کیفی	"	"

۳۰	ادیب	ظفر یاب خاں	۱۳۲۶ھ	۱۹۰۸ء
۳۱	دکن لا رپورٹ	محمد اصغر	۱۳۲۸ھ	۱۹۱۰ء
۳۲	گلدستہ نادرہ	حکیم نادر علی	۱۳۳۰ھ	۱۹۱۱ء
۳۳	تاج	غلام محمد وفا	۱۳۳۱ھ	۱۹۱۲ء
۳۴	شاہد سخن	گوبند پرشاد	۱۳۳۱ھ	۱۹۱۲ء
۳۵	افادہ	مرزا نظام شاہ لبیب	۱۳۳۴ھ	۱۹۱۴ء
۳۶	ذخیرہ	سید ناظر الحسن ہوش	〃	〃
۳۷	المعالج	حکیم بشیر الدین		۱۹۱۷ء
۳۸	التالیق	عبدالرب کوکب		۱۹۱۷ء
۳۹	رہبر مزارعین	مظہر حسین		۱۹۱۷ء
۴۰	ثمرۃ الادب	عبدالواسع		۱۹۱۸ء
۴۱	شعلہ	سید نوازش علی لمعہ		۱۹۱۸ء

اس تفصیل کے بعد بعض اخبارات اور رسائل کی مختصر صراحت کی جاتی ہے تاکہ مزید وضاحت ہو سکے۔

(۱) اخبار ہزار داستان

یہ اخبار اولاً ہفتہ وار شائع ہوتا تھا اس کے دو سال کے بعد روزانہ شائع ہونے لگا، اس کے ایڈیٹر شمالی ہند کے ایک صاحبِ علم محمد سلطان نام اور عاقل تخلص کرتے تھے۔ ان کو یہ فخر حاصل تھا کہ مرزا غالب کے شاگردوں میں شامل تھے۔ چنانچہ مالک رام صاحب نے اپنی کتاب "تلامذہ غالب" میں جو حالات قلمبند کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:-

"عاقل سید محمد سلطان دہلوی، بزرگوں کا وطن پرسٹ ضلع بارہ تھا لیکن نقل مکان کر کے دہلی میں آ رہے تھے، چنانچہ عاقل یہیں ۱۸۵۴ء کو پیدا ہوئے، فارسی میں منتہی تھے اور عربی صرف و نحو کے بھی چند رسالے دیکھے تھے۔ عاقل جوانی میں بنارس گئے وہاں مرزا قادر بخش صابر گورگانی سے مشورہ کرنے لگے، اُن دنوں حیدرآباد میں مُن برس رہا تھا۔ عاقل نے بھی

قسمت آزمانے کو ۱۸۸۲ء میں دکن کی راہ لی۔ صاحب استعداد ہونے کے علاوہ آدمی موقع شناس تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی لسّانی اور جادو بیانی سے ہر مجلس میں نفوذ حاصل کر لیا اور ایک اخبار ہزار داستان نکالنے لگے ......" (تلامذہ غالب۔ صفحہ ۲۲۶)

روزانہ اخبار ہزار داستان ۱۴ × ۹ سائز کے چار صفحے پر شائع ہوتا تھا۔ تار برقی کی خبریں، پھر اداریہ ہوتا۔ مقامی خبروں کو حیدر آباد دکن کے عنوان سے لکھا جاتا۔ کتابوں پر ریویو اور غزلیات بھی شائع ہوتے تھے۔ عاقل کا انتقال جلد ہی ہو گیا اور ان کا اخبار بھی بند ہو گیا، عاقل کے کلام کا نمونہ اور نثری مضمون جو اخبار میں شائع ہوئے، پیش ہیں:۔

مجھے تو نے ظالم نہ رکھا کہیں کا ۔۔۔ نہ زندہ، نہ مردہ، نہ دنیا، نہ دیں کا
محبّت کا مذکور نکلا کہیں کا ۔۔۔ سُنا تو نے عاقل عجب رات گزری

گذرا ہے کتنی جلد زمانہ شباب کا ۔۔۔ وقفہ ملا نہ ہم کو گِنَن کے حساب کا
پینے لہو کے گھونٹ ہیں پینا شراب کا ۔۔۔ وہ اور دستِ غیر سے پلوائیں مجھ کو مے
عاقل جواب دو سخنِ لاجواب کا ۔۔۔ دہلی کو آج یاد دلاؤ دکن میں تم

اخبار ہزار داستان کے ایک اداریہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"لندن کا ایک اخبار لکھتا ہے کہ مسٹر البرٹ نے وہ آگ جو ہندوستان کے سینوں میں ۱۸۵۷ء سے دبی ہوئی تھی، کریدی، چہ خوش۔ اوّل تو غدر کو اس معاملہ سے کیا نسبت؟ دوسرے ہمارے ہندوستانیوں کے سینہ میں کسی کا کینہ رکھا ہی نہیں جاتا، ایسے صاف دل پیدا کہاں ہوتے ہیں۔ آج تک سرکار کی زیادتیوں کو ماں باپ کی تادیب جانا، ٹیکس پر ٹیکس جاری ہوا، جسم کے کپڑے بیچ کر ادا کیا اور اُف تک زبان پر نہ لائے، جب سُنا یہی سُنا کہ ہماری سرکار، مشفق رعایا پرور اور عدالت گستر ہے، جو کچھ کرے گی ہماری بہتری کے لیے کرے گی، کوئی عہدہ دار کلکٹر سے گورنر جنرل تک ہندوستان میں ایسا نہیں رہا جس کے ہنگامہ تشریف آوری کی تمنا نہ کی ہو اور وقت تشریف بری، اس کے احسانات کا شکریہ اور اس کی جدائی کا غم ظاہر نہ کیا ہو۔" (ہزار داستان)

اخبار سفیر دکن[1] یہ روزانہ اخبار، نہایت مقبول اور مشہور اخبار تھا، اس کے سیاسی مضامین ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مولوی سیّد امجد علی اشہری جیسے مشہور ذی علم اس کے ایڈیٹر تھے، کئی سال تک جاری رہا مگر اشہری صاحب کے اپنے وطن شمالی ہند کو جانے سے اخبار بند ہوگیا۔

مشیر دکن[2] حیدرآباد کا مشہور روزانہ اخبار ہے جو اپنی سلامت روی کے باعث زمانۂ دراز سے اب تک برابر شائع ہورہا ہے، اولاً دکن پنچ کے نام سے ہفتہ وار شائع ہوا کرتا تھا، ۱۸۹۲ء سے مشیر دکن کے نام سے موسوم ہوا۔

اس کے ایڈیٹر کشن راؤ صاحب تھے اور کئی اصحابِ علم کو فراہم کرلیا تھا جن کی وجہ سے اخبار کی بڑی ترقی ہوئی، ایک وہ زمانہ بھی تھا جبکہ صرف مشیرِ دکن ہی تنہا حیدرآباد کا اُردو روزانہ اخبار تھا۔

جس زمانہ میں حیدرآباد میں اخباروں کی نگرانی بالکلیہ کوتوال (کمشنر پولیس) کے ذمہ تھی، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اخبار کے ایڈیٹر سے جواب لیا جاتا اور ادنیٰ صدر، اس ایڈیٹر کو طلب کرکے باز پرس کرتا تھا، ایسے زمانہ میں اخبار کا جاری رکھنا درحقیقت بڑے دل گردہ کا کام تھا۔

بہرحال مشیرِ دکن اسی دور میں روزانہ اخبار کی صورت میں جاری ہوا اور اس دور کے بعد بھی آج تک شائع ہوتا ہے۔

رسالہ حسن[3] حیدرآباد کا مشہور اور نامور رسالہ ہے جس کو اُردو کے معیاری رسالوں میں شمار کرنا چاہیے اس رسالہ کے پہلے شمالی ہند میں بھی کوئی رسالہ سوائے "تہذیب الاخلاق" کے . . . . اس خوبی اور اس معیار کا جاری نہیں ہوا۔ یہ باوقعت علمی، ادبی ماہوار رسالہ مغربی ماہانہ پرچوں کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔ اس کے مضمون نگار ہندوستان اور دکن کے نامور اور مشہور اہلِ قلم تھے اور ایڈیٹر حسن

---

[1] بستان آصفی وغیرہ۔

[2] " " "

[3] سالار جنگ کے کتب خانہ میں اس کے ممبر موجود ہیں۔

بن عبداللہ (المخاطب عماد نواز جنگ) تھے جو حکومتِ آصفیہ کے اعلیٰ خدمات کو انجام دیا کرتے تھے، اسی کے ساتھ رسالہ کی بھی ایڈیٹری کرتے تھے۔

عمدہ مضمون پر ایک اشرفی مضمون نگار صاحب کو دی جاتی تھی۔ رسالہ ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ سے ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ تک جاری ہوتا رہا، غرضیکہ اُردو کی علمی ادبی دنیا میں اس رسالے نے بڑی وقعت حاصل کرلی تھی۔

دکن ریویو یہ بھی حیدرآباد کا ایک مشہور رسالہ تھا جس کے ایڈیٹر مولوی ظفر علی خاں جیسے مشہور صاحبِ قلم انشا پرداز تھے۔ اُردو علم ادب کی جو خدمت اس رسالہ نے انجام دی ہے وہ آج تک مشہور ہے۔ جس طرح رسالہ "حسن" اپنی خوبیوں کے باعث تمام ہند میں مشہور تھا، اسی طرح 'دکن ریویو' باوجود شمالی ہند میں رسالوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہونے کے مقبول اور ممتاز تھا۔

صحیفہ[۱] اولاً مولوی سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے اس رسالہ کو شائع کیا۔ مگر چند ماہ بعد یہ بند ہوگیا۔ اس کے بعد دوبارہ انجمنِ معارف کے زیرِ نگرانی مولوی محمد اکبر علی صاحب کی ایڈیٹری میں شائع ہونے لگا۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام تر مضامین عموماً اہلِ دکن ہی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ علمی دنیا میں اس رسالہ کے علمی اور تاریخی مضامین نہایت شوق و دلچسپی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور اکثر مضامین اپنی خوبی اور دلآویزی کے باعث شمالی ہند کے بعض رسالوں میں نقل ہوتے تھے۔ ۱۳۲۸ھ تک ماہوار شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک موقوف رہ کر ۱۳۲۹ھ سے روزانہ اخبار کی شکل میں شائع ہورہا ہے۔

ماہواری رسالوں میں "ذخیرہ" اور "افادہ" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں نظم و نثر کے بہترین قابلِ قدر مضامین شائع ہوتے تھے دکن اور شمالی ہند کے مشہور منتخب مضمون نگاران رسالوں میں مضمون لکھتے تھے۔

انجمنیں ترقی زبان کا ایک ذریعہ علمی انجمنوں کا قیام بھی ہے جس سے خیالات میں جولانی اور معلومات میں وسعت ہوتی ہے یوں تو حیدرآباد میں متعدد انجمنیں

---

[۱] بستانِ آصفی۔

قائم ہوئیں اور اپنی اپنی حد تک انہوں نے کامیابی سے کام بھی کیا لیکن اس وقت صرف چند مشہور انجمنوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انجمن ترقی اُردو[1]

۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں زبان اُردو کی ترقی کے لیے یہ انجمن قائم ہوئی اس کا مقصد زبان اُردو کی بقا اور اس کی ترقی ہے زبانِ اُردو میں بذریعۂ تراجم و تالیف علمی ذخیرکا اضافہ بھی اس انجمن کا ایک مقصد اعظم ہے۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ نے نہایت خوشی کے ساتھ اس کی سرپرستی قبول فرمائی تھی، اولاً اس کے معتمد مولانا شبلی مرحوم مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر یار جنگ) اور پھر مولوی عزیز مرزا مرحوم اس کے معتمد ہوئے ان کے انتقال کے بعد مولوی عبدالحق صاحب اس کے معتمد بنائے گئے۔

انجمن آج تک قائم اور برابر ترقی کے زینے طے کر رہی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش نے انجمن کی جانب سے اعلیٰ درجہ کی کتابیں شائع کرائی ہیں۔ انجمن کا ایک سہ ماہی رسالہ بھی جاری ہے جس کے بہترین مضامین ہر طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انجمن کی مالی حالت بھی اچھی ہے۔ مستقل آمدنی ہے۔ بہرحال زبانِ اُردو کے بقاء و ارتقاء میں انجمن کی سعی باعثِ تشکر ہے۔ اس انجمن کا قیام بھی دکن میں ہوا۔ اور نشو و نما بھی یہیں ہوئی۔

ایجوکیشنل کانفرنس

اس کانفرنس کا قیام ۱۳۳۲ھ میں ہوا اس کے مقاصد کے منجملہ ایک مقصد اصلاح تعلیم تھا۔ اس کے متعلق کانفرنس کا پروگرام حسبِ ذیل تھا۔

(الف) علوم و فنون کے تراجم اُردو زبان میں کیے جائیں۔

(ب) حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیہ اُردو میں مرتب کرائے جائیں۔

(ج) ملک کی ترقی کے لیے ملکی زبان یعنی اُردو میں ایک موزوں و مناسب حال نصاب تعلیم مہیا کیا جائے۔

(ح) اپنی تعلیم اپنے ہاتھ ہونے کے لیے ایک یونیورسٹی کا قیام، کانفرنس

---

[1] بستان آصفی وغیرہ۔

اپنے نظام العمل میں کہاں تک کامیاب ہوئی وہ ابنائے وطن پر عیاں ہے وہ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کی جانب اوّل روز سے متوجہ ہوئی نہ صرف زبانی تحریکات سے اس نے اپنے قیام کے مدّعا کو پورا کیا بلکہ عملی حیثیت سے بھی توجہ کی۔

کانفرنس نے زبانِ اُردو کی ترقی میں پہلے سالانہ اجلاس میں جس کے صدر رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر تھے۔ حسبِ ذیل تحریکیں منظور کی تھیں۔

(۱) اس کانفرنس کو اُردو میں علوم وفنون کے تراجم وتصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لیے یہ جلسہ سرکارِ عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ محکمہ سررشتہ علوم وفنون کے اخراجاتِ سالانہ عـــــہ بہترین تراجمِ علمی تصانیف اُردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لیے منظور فرمائے جائیں۔

ایک اور تحریک تعلیم صنعت وحرفت کے متعلق تھی جس کا آخری حصّہ یہ ہے:۔

(۲) کانفرنس کی رائے میں انجینیرنگ اسکول کو ترقی دے کر سول مکانکل الیکٹریکل تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جائے جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بندوبست ہو اور عامؔ فائدہ کی غرض سے تعلیم اُردو میں ہونی چاہیے۔

(۳) ایک اور تحریک طبّی تعلیم کے متعلق یہ تھی۔

کانفرنس کی رائے میں طبّی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچانے کی غرض سے کم ازکم سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسبِ سابق اُردو میں ہونا مناسب ہے۔ کانفرنس نے اپنے دوسرے سالانہ اجلاسوں میں بھی ان امور پر توجہ دلانے کا سلسلہ قائم رکھا۔ المختصر اُردو کی توسیع اور ترقی میں اس کا بھی حصّہ رہا ہے اور کانفرنس کی تحریکات کہاں تک بارآور ہوئیں۔ یہ اربابِ علم سے مخفی نہیں ہے۔

دیگر انجمنیں

چند دیگر انجمنوں کا مختصر حال بھی نامناسب نہ ہوگا۔ کیونکہ اُردو کی اشاعت وترقی میں ان مجالس کی علمی صحبتیں بھی ضرور کچھ نہ کچھ اثر پھیلاتی رہی ہیں۔

اقبال کلب[1]

حیدرآباد کی ایک مشہور انجمن تھی جو سن ۱۳۰۱ف میں قائم ہوئی۔ ہر جمعہ کو

---

[1] بستان آصفی۔

اس میں بڑی پابندی سے لکچر ہوا کرتے تھے۔ ملک کے نوجوان اور عمر رسیدہ بزرگ پہلو بہ پہلو تبادلۂ خیالات کرتے اور ایک دوسرے سے استفادہ کرتے تھے۔ کامیاب مقرروں کی تمغوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ عرصۂ دراز تک یہ انجمن کامیابی کے ساتھ قائم رہی اور اس کے سکریٹری افضل علی کے مرنے پر بند ہوگئی۔

عثمانیہ ریڈنگ روم[1]

۱۹۰۴ء میں یہ انجمن قائم ہوئی اس کے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہے۔ مہینہ میں دو ایک مرتبہ لکچر بھی ہوا کرتے ہیں۔ یہ انجمن اب تک اپنا کام کیے جا رہی ہے۔

انجمن ثمرۃ الادب

۱۳۱۲ھ میں یہ انجمن مدرسۂ دارالعلوم میں قائم ہوئی۔ طلبہ میں عام معلومات کی توسیع کا خاص مقصد تھا۔ انجمن کے متعلق ایک کتب خانہ اور دارالاخبار بھی قائم تھا۔ ہفتہ وار لکچرز بھی ہوا کرتے تھے۔ مولوی عبدالباسط، مولوی اکبر علی، مولوی سیّد رضی الدین حسن کیفیؔ اور حافظ محمّد مظہر جیسے اصحاب اپنے زمانہ طالب علمی میں انجمن کے روح رواں تھے۔ اگرچہ مولوی محمّد عبدالقدیر صاحب مدرس دارالعلوم انجمن کے معتمد تھے مگر دیگر اساتذہ کے دلچسپی نہ لینے اور اس کے روح رواں کے اپنی تعلیم ختم کر لینے کے باعث تقریباً تین سال کے بعد انجمن ٹوٹ گئی۔ ۱۳۲۴ھ میں جبکہ مولوی حمیدالدین صاحب بی۔ اے صدر دارالعلوم ہوئے پھر سے انجمن زندہ ہوئی حسب سابق کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم ہوا۔ کبھی کبھی طلبہ کی تقریر بھی ہوا کرتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد انجمن کامیابی کے ساتھ چلنے لگی۔ سرکار سے بھی ماہواری امداد مقرر ہوئی اس کے کتب خانہ میں اُردو کے تقریباً کل مشہور و معروف مصنّفین کی کتابیں جمع ہوگئیں۔ دارالمطالعہ میں اخبارات اور رسائل کی ایک کثیر تعداد آنے لگی جو شاید حیدر آباد کی کسی اور انجمن میں آتے ہوں۔ اب انجمن کے دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لیے عام لکچرز کا سلسلہ مقرر ہوا۔ مہینہ میں ایک مرتبہ عام علمی اور اخلاقی لکچرز ہوا کرتے تھے۔ مقررین میں نہ صرف مشاہیر اہلِ ملک ہی ہوتے تھے بلکہ شمالی ہند کے مشہور و معروف اصحاب بھی تقریریں کیا کرتے تھے۔

---

[1] بستان آصفی۔

اس کے بعد حلقۂ قرآن کے نام سے ہر ہفتہ ایک جلسہ ترتیب دیا جاتا تھا، جس میں صرف قرآن شریف کے متعلق اُردو میں تقریر ہوتی تھی۔ قیامِ انجمن کے چوتھے سال ایک علمی اور اخلاقی ماہوار رسالہ بنام ثمرۃ الادب بھی جاری ہوا۔ غرض پانچ سال کے عرصہ میں انجمن نے کافی ترقی کی تھی۔ لیکن اس کے بعض سرگرم ارکان کے سلسلۂ تعلیم کے ختم ہوجانے کے سبب یہ انجمن ختم ہوگئی اور اس کا کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کی "یونین" میں شامل کرلیا گیا۔ انجمن کے بار ثانی کے زمانۂ حیات میں چار سال تک اس کی معتمدی کے فرائض راقم کے ذمہ تھے۔

تبصرہ

ہم معلوم کرچکے ہیں کہ دکن میں اُردو ادب کے پہلے زینے کا آغاز مثنویوں سے ہوا۔ پھر غزل گوئی کا دور شروع ہوا۔ بعد ازاں دکھنی ادب پر دلی و لکھنؤ کی زبان نے اپنا نہایت زبردست اثر قائم کرلیا۔

جس دور پر اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ دکھنی شعرأ غزل کے میدان سے نظم و مثنوی کی جانب پھر رجوع ہوئے۔ غزل گوئی بھی متروک نہیں ہوئی لیکن یہ امر ضرور واقع ہوا کہ زبان اور اسلوب میں نمایاں اور بیّن فرق پیدا ہوگیا۔

اگر ایک طرف قدیم طرز کی غزل گوئی میں باقی، پاس، شعلہ، شایق، فیاض، مائل، شاد، امیر، توفیق، عزیز اور کیفی وغیرہم کا نام پیش کیا جاسکتا ہے تو جدید شاعری کے لیے محب، کیفی، امجد، ذہین، بازغ، لمعہ، عظمت کا کلام نمونہ ہے۔ یوں تو دکن میں جدید شاعری کا آغاز پانچویں دور کے اواخر سے ہی شروع ہوگیا تھا۔ عبداللہ بیگ ہوش پہلے شخص ہیں جو اپنی غزلوں میں عشق و محبت کے قدیم افسانہ کو چھوڑ کر اخلاقی مضامین نظم کرنے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہنوز مولانا حالی نے اپنی جدید شاعری کی بنا نہیں ڈالی تھی۔

اس زمانہ میں ہوش کی پیروی نہیں کی گئی اور نہ اس قسم کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس دور میں مولانا محب حسین اور حضرت کیفی نے خاص طور سے جدید شاعری کی تعمیر میں حصہ لیا اور ان کی پیروی میں کئی اصحاب اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور واقعہ نگاری اخلاق، فلسفہ اور تصوف سے اپنے کلام کو بھر دیا۔ نیچرل شاعری اور اس کے ساتھ قومی نظمیں بھی ان کی شاعری کے طغرائے امتیاز بن گئے۔

اگر ایک طرف داغ دہلوی، امیر مینائی، میکش تھانوی، ظہیر دہلوی، انیس و دبیر وغیرہم کے

شاگردوں اور متبعین کا سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف فیض کے شاگردوں، باقی، پاس، مائل، فیاض، عزیز وغیرہ کے مشاعروں کی گرم بازاری ہوئی اگر ایک طرف کیفی کی قومی نظمیں ہمارے جلسوں کو جوش میں لاتیں اور مجالس کو گرماتی تھیں تو دوسری طرف حضرت امجد کی تصوف کی نظمیں اور تظمین ارباب حال کے لیے جذب و وجد کا سامان بن گئیں۔ اسی زمانہ میں ایک طرف ذہین اور ملعہ کی اخلاقی شاعری چمکی تو دوسری طرف عظمت اللہ خاں کی ہندی آمیز نظموں کو بھی فروغ ہوا۔ آزاد کی ظریفانہ شاعری کی بنا قائم ہوئی۔ نظم طبا طبائی کے قصیدے ذوق کے قصیدوں کی یاد تازہ کراتے تھے تو توفیق کی غزلیں غالب کی مضمون آفرینی اور درد کی تصوف آمیزی کو پیش کرتی تھیں۔ عزیز اور جلیل کی شاعری قدیم طریقہ کی غزل گوئی کی یاد دلاتی تھی۔

غرض کہ شاعری کے جملہ اصناف سخن کو اس دور میں ترقی ہوئی اور جدید شاعری کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ ایک حد تک اس کا رنگ پختہ ہو گیا۔

نثر کے لحاظ سے جو ترقی اس دور میں ہوئی ہے اس کا اظہار تفصیل کے ساتھ کیا جا چکا ہے اور اس زمانہ کی انشاء کے نمونے بھی پیش کیے جا چکے ہیں۔ ان سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کی ترقی میں اہل دکن نے جو حصہ لیا وہ کتنا اہم اور کس قدر درخشاں ہے۔

اس دور کے اخبارات، رسائل وغیرہ نے اردو کی جو بیش بہا خدمت انجام دی وہ فراموش نہیں کی جا سکتی، اس دور کی اردو نوازی تاریخ اردو میں آب زر سے لکھی جائے تو صحیح ہو گا۔

ساتواں دَور

سنہ ۱۳۳۶ھ تا سنہ ۱۳۷۴ھ

سنہ ۱۹۱۸ء تا سنہ ۱۹۵۵ء

اردو کا عروج اور زوال

اب ہم ساتویں دَور کا تذکرہ کرتے ہیں جس کی ابتدا سنہ ۱۳۳۶ھ سے قرار دی جاتی ہے جبکہ جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے سلسلہ میں منشور خسروی ۶؍ذی الحجہ سنہ ۱۳۳۶ھ کو نافذ ہوا اور ادب کی ترقی کا ایک بالکلیہ جدید راستہ کھُل گیا۔

عصرِ گذشتہ میں دکن نے اُردو کی ترقی کے لیے اپنے دماغی اور ذہنی قویٰ جس سرگرمی سے کام میں لائے اور مال و دولت کو بے دریغ طریقہ سے صَرف کیا وہ رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ اس دَور میں جامعۂ عثمانیہ کے قیام کی وجہ سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوا تھا۔ جس کا اختتام سنہ ۱۳۶۹ھ یا سنہ ۱۹۵۰ء میں ہوگیا۔

اس دَور کی سب سے بڑی خصوصیت جامعۂ عثمانیہ کا قیام اور بعض دوسری خصوصیتیں بھی ہیں جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جامعۂ عثمانیہ

۲۲؍اپریل سنہ ۱۸۸۵ء (سنہ ۱۳۰۳ھ) وہ دن تھا جبکہ باغ عامہ میں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی مدار المہام وقت نے "نظام یونیورسٹی" کی خیالی بنیاد ڈالی تھی، جلسہ کے بعد چند دن تک تو اس کا خیال تازہ رہا مگر بہت جلد وہ خیالی صورت صرف تصویر ہی تصویر ہوکر رہ گئی اور اب جلسہ کی شان اور کارروائی اخبار کی پُرانی مسلوں میں دفن ہے۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تخت نشینی کے بعد ملک میں عام طور سے ایک بیداری کی روح پیدا ہوگئی اور چند دردمندان قوم نے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی کانفرنس

کا مقصد یہی تھا کہ حیدر آباد میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ مولوی مرتضیٰ مرحوم نے جو اپیل اہلِ ملک کے سامنے پیش کی تھی، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"ایک یونیورسٹی کے لیے مواد مہیا ہے۔ مختلف امتحانات علمی، طبی، انجینیرنگ سول سروس ودیگر سررشتہ جات متعلقہ سب یہاں ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ سب ایک سلسلہ میں رابط ہوں تمام امتحانات میں جبتہ جامعہ ملحوظ ہے کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دُور نہیں ہے جبکہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے[1]"

اس کے بعد جب کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو ملک کے عام رجحان کے مدنظر اس کے صدر رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:-

"خدا نے چاہا تو چند سال میں دار العلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دُور دُور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لیے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم وفنون بن جائے گا[2]"

رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر اس زمانہ میں معتمدی عدالت وتعلیمات کی کرسی پر متمکن تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد ۱۳۳۶ھ میں آپ نے اعلیٰ حضرت خسرو دکن کی پیش گاہ میں ایک عرضداشت پیش کی، جس میں آپ نے تعلیم کی موجودہ حالت کی پوری کیفیت تحریر کرتے ہوئے ان نقصانات سے بحث کی جو غیر زبان کے ذریعہ تعلیم دینے سے واقع ہوتے ہیں۔ آپ نے ان نقائص کو بتایا جو موجودہ طریقۂ تعلیم بنانے سے ہو سکتے ہیں اور پھر ان اعتراضات کے جوابات نہایت مدلل اور تشفی بخش دیئے۔ آپ نے عرض کیا تھا کہ:-

موجودہ طریقۂ تعلیم کی دورنگی اور بے اُصولی کو مٹانے اور ان خطرناک نقائص کو رفع کرنے کے لیے جو موجودہ طریقۂ تعلیم نے پیدا کیے ہیں اور جو گھن کی

---

[1] رپورٹ کانفرنس سال اوّل۔

[2] " " "

طرح ہمارے نظامِ تمدن و معاشرت و قوائے دماغی و جسمانی کو اندر ہی اندر کھائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں ایک جدید یونیورسٹی کی ضرورت ہے جس کی بنیاد صحیح اُصولِ تعلیم، ملکی ضروریات اور قومی خصائص پر قائم ہو جس میں قدیم جدید دونوں طریقوں کی خوبیوں سے فائدہ اُٹھایا جائے جو تعلیمی بھی ہو اور امتحانی بھی اور ساتھ ہی تالیف و ترجمہ کا کام بھی کرے اور جو ترتیبِ ذہن اور تحصیلِ علوم دونوں کے لیے اپنی ہی زبان یعنی اُردو کو کام میں لائے۔"

اعلیٰ حضرت خسرو دکن نے عرضداشت محولہ بالا کو منظور فرما کر اپنی سرپرستی کی عزت سے مفتخر و ممتاز فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت اقدس و اعلیٰ کی ذات شاہانہ فیض کریمانہ ہدایت خسروانہ اس تحریک کی رہنما نہ بنتی تو کسی قسم کی کوئی کامیابی ناممکن و محال تھی۔ ارشاد مروی و فرمان شاہی کی عبارت یہ ہے:-

"مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے کہ ممالکِ محروسہ کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا جائے کہ موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دُور ہو کر جسمانی، دماغی اور روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقوں کی خوبیوں سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے اور جس میں علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ ایک طرف طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی شعبوں میں اعلیٰ درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے۔ اس یونیورسٹی کا اصل اُصول یہ ہونا چاہیے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب العلم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسبِ مذکور اصول محولہ عرضداشت کے موافق ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام (عثمانیہ یونیورسٹی) حیدرآباد ہوگا۔"

اس فرمان واجب الاذعان کی تعمیل میں محکمۂ تعلیمات نے عملی کام کا آغاز کیا۔ ماہرینِ فن کے مشورہ و رائے سے شعبۂ فنون و دینیات کے نصاب مقرر کیے گئے اور تعلیمی حلقوں میں

گشت کرائے گئے۔

جامعۂ عثمانیہ کے نصابِ تعلیم کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ میٹریکولیشن کے امتحانی مضامین میں اس طرح تخفیف کی گئی کہ بعض مضامین کے متعلق افسران مدارس کا صداقت نامہ کافی قرار دیا۔ امتحان انٹرمیڈیٹ میں انتخاب مضامین میں بہ نسبت اور یونیورسٹیوں کے زیادہ وسعت رکھی گئی اور مضامین کو اس طرح سے مرتب کیا تھا کہ ایک طالب علم اپنے لیے ایک ایسا مجموعہ انتخاب کرسکتا ہے جس کے مضامین ایک دوسرے سے قریب کا تعلق رکھتے ہوں۔ مختلف مجموعوں میں مضامین کی تقسیم سے یہ فائدہ تصور کیا گیا تھا کہ بی۔ اے میں ایک طالب علم کسی خاص مضمون اور اس کے متعلقات کی تعلیم مکمل طریقہ پر حاصل کر سکے۔ انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہے اور اس کا وہی معیار ہے جو دوسری ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا ہے۔ اس کے ساتھ جملہ فنون کی تعلیم زبان اُردو میں دی جاتی تھی۔

ایک اور بڑی خصوصیت اس جامعہ کی یہ تھی کہ دینیات یا اخلاقیات کی تعلیم لازمی کی گئی تھی تاکہ مشرقی اخلاق کو مغربی علوم تباہ و برباد نہ کردیں بہر حال یہ ایک ایسی یونیورسٹی تھی جو مشرق و مغرب کے علوم و فنون کے امتزاج کا بہترین مرکز بن گئی تھی۔

کلیہ جامعۂ عثمانیہ

تاریخ کے اوراق پر اگست ۱۹۱۹ء م ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا جبکہ سب سے پہلے اُردو کا عظیم الشان کالج "کلیہ جامعۂ عثمانیہ کا افتتاح ہوا۔ جلسہ کا دن کبھی فراموش نہیں ہوسکتا حیدرآباد کے ایک بلند پُر فضا مقام پر آغا منزل واقع ساٖنچہ توپ) صبح کے دس بجے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب نے بحیثیت معین الامیر جامعہ (وائس چانسلر) کے اس دارالعلوم کا افتتاح فرمایا۔ مسٹر ولنکر پروفیسر انگریزی نے انگریزی علم و ادب پر اس جلسہ میں ایک لکچر دیا۔ اور دوسرے دن سے باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ طلبہ کا داخلہ ہمت افزا رہا۔ پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۹۲۱ء م ۱۳۳۹ھ میں ہوا۔ (۱۱۹) امیدواران نے اپنے نام بھیجے مگر امتحان میں (۱۱۶) شریک ہوئے جن میں (۹۱) طلبہ کامیاب ہوئے جو طلبہ امتحان میں بیٹھے ان کے منجملہ (۹۷) کالج کے طلبہ تھے جن میں (۸۵) کامیاب ہوئے۔

امتحان میں باہر کے ممتحن بھی مقرر ہوتے ہیں ان کی رپورٹوں میں طلبہ کی تعلیمی قابلیت کا اظہار کیا گیا تھا۔ تمام صاحبوں نے اس امر پر اطمینان ظاہر کیا کہ طلبہ کو جو کچھ پڑھایا گیا ہے اس

کو انہوں نے خوب سمجھ کر پڑھا ہے اور ان کے جوابوں سے خیالات کی جدت اور تازگی ظاہر ہوتی ہے۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ کی بہترین تعلیم کا اس سے اظہار ہو سکتا ہے کہ ہندوستان، یورپ اور انگلستان کی ممتاز یونیورسٹیوں میں یہاں کے طلبہ نے نام آوری حاصل کی ہے اور اپنی عمدہ قابلیت کا ریکارڈ چھوڑا ہے۔ کلیہ جامعۂ عثمانیہ کے افتتاح کے بعد کچھ دن تک منصرم ناظم تعلیمات نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر کلیہ کا کام انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی صدر کلیہ مقرر ہوئے جو مملکتِ آصفیہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کے دادا اور والد بھی سرکار آصفیہ کی ملک ملازمت میں داخل تھے۔

صدیقی صاحب کے بعد مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ صدر کلیہ مقرر ہوئے اور عرصہ تک آپ اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ کے زمانہ میں کلیہ نے بہت کچھ ترقی کی اور فرزندانِ کلیہ پروفیسری کی خدمت پر مامور ہونے لگے۔

خاں صاحب کے وظیفہ لینے پر مسٹر میکینزی پرو وائس چانسلر بنائے گئے اور صدارت کا عہدہ تخفیف کر دیا گیا۔ پھر قاضی محمد حسین صاحب، محمد اعظم صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب یکے بعد دیگرے اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ پولیس ایکشن کے بعد علی یاور جنگ اس خدمت کو انجام دینے لگے۔

دیگر کلیّات

جامعۂ عثمانیہ کے تحت دوسرے کئی "کلیات" ہیں جن کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

شعبۂ تالیف و ترجمہ

اردو یونیورسٹی کے لیے پہلا زینہ فراہمی کتب کا تھا۔ اس کے لیے ضرور تھا کہ عظیم الشان پیمانہ پر شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم کیا جائے۔ اگرچہ حیدرآباد کے لیے یہ کوئی نئی تحریک نہ تھی۔ اس کے پہلے دو مرتبہ ایسی تحریک بطور مناسب عالمِ وجود میں آئیں اور بہت کچھ بھی ہوا۔ پہلی مرتبہ شمس الامراء نے اس کی طرف توجہ فرمائی تھی جس کا ذکر پانچویں دَور میں ہو چکا ہے، اس کے بعد چھٹے دَور میں سیّد علی بلگرامی اور مولانا شبلی نعمانی کی سرکردگی میں یہ کام ہوتا رہا۔ مگر اب نہایت وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر شعبۂ تالیف و ترجمہ کی بناء ڈالی گئی اور معقول تعداد میں مترجمین و مؤلفین ایک ناظم کے ماتحت مامور کیے گئے تاکہ بطور مستقل اس اہم کام کی تکمیل ہو۔

اس شعبہ نے قابلِ تعریف طور پر کام انجام دیا ہے۔ باوجود ان شدید مشکلات کے جو

ترجمہ میں وضع اصطلاحات وغیرہ کی پیش آتی ہیں نہایت کامیابی کے ساتھ یہ کام جاری تھا۔ یہاں نہ صرف مستقل کئی مترجم مامور تھے بلکہ معقول اُجرت پر بھی بیسیوں کتابوں کا ترجمہ کرایا جاتا تھا۔

اس بیت الحکمت نے جو کام اب تک انجام دیا ہے وہ ان تمام مضامین سے متعلق ہے۔ جن کی تعلیم اس وقت جامعۂ عثمانیہ میں دی جا رہی ہے۔

۱۹۴۷ء تک جس قدر کتابیں ترجمہ ہو کر اشاعت پا چکی ہیں ان کی تعداد ۲۱۹ ہے۔ ۶۷ کتابیں ایسی ہیں جو زیر طبع ہیں۔ ۹۳ کتابوں کی نظر ثانی ہو رہی ہے یا زیر ترجمہ ہیں، ان کتابوں کی فہرست بلحاظِ فن درج ذیل ہے :-

۱۔ فلسفہ (مابعد الطبیعات، نفسیات، منطق اور اخلاقیات) ۵۹

۲۔ تاریخ و جغرافیہ (تاریخ اسلام، تاریخ ہند، تاریخ قدیم، تاریخ یورپ) ۱۱۸

۳۔ عمرانیات، سیاسیات، معاشیات ۲۹

۴۔ قانون و دستور ۲۳

۵۔ ریاضی سائنس ۷۳

۶۔ سیول و میکانیکل انجینیری ۲۷

۷۔ طب (طب قانونی، طب عام، تشریح، جراحی، امراض چشم و امراض نسواں وغیرہ ۳۰

یہ کتابیں شائع شدہ ہیں جو شائع نہیں ہوئیں ان کی تعداد اس میں شامل نہیں ہیں مگر اب توقع نہیں ہے کہ وہ شائع ہوں۔

دار الترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق بی۔ اے مقرر ہوئے اس کے بعد مولوی عنایت اللہ بی۔ اے ایک عرصہ تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ ان کے بعد مولوی محمد الیاس برنی بی۔ اے اور برنی صاحب کے بعد ڈاکٹر نظام الدین اور ڈاکٹر صاحب کے بعد مسٹر ٹوپا ناظم بنائے گئے۔

دار الترجمہ کے مترجمین میں خاص کر علامہ عبداللہ عمادی، مولوی مسعود علی محوی قاضی تلمذ حسین، چودھری برکت علی مرحوم، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :-

شعراء

جیسا کہ تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ دکن میں اُردو کے ارتقار کا یہ ساتواں دور ۱۳۳۶ھ سے شروع ہوا جب کہ جامعۂ عثمانیہ کا منشور خسروی نافذ ہوا تھا۔ یہ دَور

۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) کو ختم ہوجاتا ہے۔

یہاں ہم اس دَور کے شعراء کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ زمانہ اُردو زبان اور ادب کے ارتقاء کے لیے عام طور سے برطانوی ہند میں بھی سازگار ثابت ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہوتے ہی نئے خیالات، نئے رجحانات پیدا ہوگئے۔ انگریزی شاعری اور انگریز مفکرّین کے ساتھ فرنچ، امریکن اور روسی شاعروں، افسانہ نگاروں، نقادوں کی تصانیف سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اسی طرح ترقی پسند شعراء افسانہ نگار، مقالہ نگار اور نقّاد رونما ہوئے۔ ان کے افکار و خیالات سے اُردو کی دنیا میں ایک انقلابِ عظیم آگیا، ادب برائے زندگی کی تحریک زور شور سے پھیلنے لگی۔

برطانوی ہند کے ساتھ قلمروِ آصفی میں بھی اس کا اثر ہوا، جامعۂ عثمانیہ کے سپوت مادرِ جامعہ سے فارغ التحصیل ہوکر میدانِ عمل میں آ گئے۔ دارالترجمہ سے صدہا کتابیں ترجمہ ہوکر شائع ہوئیں۔ اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور سینما کے ذریعہ نئے خیالات کی نشر و اشاعت ہونے لگی۔ یہ تمام وجوہ تھے جس کے باعث جہاں برطانوی ہند میں اُردو کو ترقی ہوئی وہاں قلمروِ آصفی میں بھی عروج حاصل ہوا اور ترقی کے نئے مدارج طے ہوگئے۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فرزندانِ جامعۂ عثمانیہ کی ذہنی تربیت اور شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں بعض اساتذہ جامعہ نے خاص حصّہ لیا۔ ان میں مولانا سیّد علی حیدر طباطبائی، مولوی وحیدالدین سلیم، مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب پیش پیش ہیں۔

قلمروِ آصفی میں چھٹے دَور سے جدید شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ حضرت کیفیؔ، ذہینؔ نظمؔ، لمعہؔ، عظمت اللہ خاں، امجدؔ وغیرہ اس کے معمار تھے۔ اونھوں نے اصناف شاعری میں تنوع پیدا کیا، تاریخی شاعری، واقعہ نگاری، وصف نگاری، سیاسی شاعری، سماجی شاعری وغیرہ کو موضوع بنا کر خیال آرائی کی تھی۔ موضوع شاعری کو وسعت دے دی تھی۔

اس دَور میں جنگِ عظیم کے بعد مغربی تہذیب و تمدن زیادہ سرعت کے ساتھ پھیل گئی۔ ذہنی آزادی مل گئی۔ قوتِ گویائی میں آزادی کا دَور دورہ ہوا۔ زر کی قیمت گھٹ گئی۔ ضروریاتِ زندگی میں اضافہ ہوگیا۔ کھانے پینے کی چیزیں گراں ہوگئیں۔ افلاس، بھوک، قحط کی تکالیف عام ہوگئیں، اشتراکیت کی طرف لوگوں کی طبیعتیں مائل ہونے لگیں۔ قوم کی خستہ حالی اور زبوں حالت کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ رومانی شاعری کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی۔ تاریخی شاعری میں وسعت ہوئی۔ مزاحیہ رجحان، طنزیہ زاویۂ نگاہ ترقی کرنے لگا فلسفیانہ

خیالات، مفکرانہ رجحانات پیدا ہوئے، آزاد نظموں کی بنیاد پڑی، دیہاتی زبان کی شاعری کا آغاز ہوا، یہ تھے وہ رجحانات اور خیالات جو برطانوی ہند کے شعراء کی ذہنیت پر اثر انداز ہوئے اور جدید شاعری میں تنوع پیدا کردیا۔

اقبال، جوش، اکبر، چکبست، ظفر علی خاں، شبلی، احسان دانش، فراق، اختر شیرانی مجاز، فیض، ساغر، سلام، حفیظ، حسرت، جگر، اصغر، بہزاد وغیرہ کا کلام نوجوان شعراء کے لیے نمونہ ثابت ہوا اور ان کی پیروی ہونے لگی۔ دکن کے اس دور کے شعراء میں بعض تو وہ ہیں جو چھٹے دور میں موجود تھے اور ان کا انتقال اس دور میں ہوا، مثلاً توفیق، دل، ذہین کیفی، لمعہ، رعد، محب، عظمت اللہ خاں، نظم، باغ، شاد، جلیل اور عزیز وغیرہ۔ چھٹے دور کے بعض شعراء ایسے ہیں جو بحمد اللہ اب تک بقید حیات اور اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔

اس دور کے شعراء کو ہم چار گروہوں میں تقسیم کرتے ہو، پہلے گروہ میں وہ شعراء شامل ہیں جو تولد کے لحاظ سے تو دکن کے نہیں ہیں مگر وہ بچپن یا عنفوان شباب میں دکن آ گئے اور اسی کو وطن بنا لیا اور یہاں ہی سے نذر اجل ہوئے یا اب بھی اردو کی خدمت گذاری میں مصروف ہیں۔ مثلاً سید امین الحسن بسمل، حضرت فانی بدایونی، نواب اصغر یار جنگ اصغر، مرزا فرحت اللہ فرحت، نواب ہوش یار جنگ ہوش بلگرامی، حضرت اختر، مرزا یگانہ، مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت وغیرہ۔

دوسرے شعراء وہ ہیں جن کا وطن ہی دکن ہے یا جن کے آباء اور اجداد نے صدیوں پہلے دکن کو وطن بنا لیا تھا۔ ایسے شعراء میں سے بھی بعض فوت ہو چکے اور بعض زندہ ہیں مثلاً:۔

(۱) غلام دستگیر اثر (۲) نصیر الدین اصغر (۳) محترم شاہ امید (۴) عبدالرزاق بسمل (۵) اللہ بخش توحید (۶) سید علی نواز تصور (۷) مرزا جعفر علی جعفر (۸) راگوندر راؤ جذب (۹) بشن سنگھ خوشتر (۱۰) رگوناتھ راؤ درد (۱۱) عبدالرزاق راشد (۱۲) ریاض الدین ریاض (۱۳) شرف الدین ساقی (۱۴) سیف الدین سیف (۱۵) کیپٹن اعجاز علی شہرت (۱۶) عبدالکریم خاں شمشیر (۱۷) غلام پنجتن شمشاد (۱۸) غلام شاہد شاہد (۱۹) عبدالرزاق شمیم (۲۰) سید زین العابدین عابد (۲۱) محمد حبیب الدین صغیر، نرسنگ راج عالی (۲۳) محب اللہ غالی (۲۴) وحید الدین عالی

(۲۵) غلام غوث عشق (۲۶) عبدالوہاب عندلیب (۲۷) احمد یار جنگ فانی (۲۸) سید ابوالحسن قیصر (۲۹) قدرت نواز جنگ قدرت (۳۰) بدیع اللہ قیس (۳۱) لطف الدولہ لطف (۳۲) معین الدولہ معین (۳۳) مجاہد الدین مجاہد (۳۴) آفتاب علی مہر (۳۵) سید علی منظور (۳۶) دیوان شرف مجید (۳۷) منیر الدین منیر (۳۸) میر محمد علی مسرور (۳۹) عبدالقیوم خاں ناظم (۴۰) محمد علی خاں ناظم (۴۱) حبیب اللہ وفا (۴۲) عمر خاں وفا (۴۳) غلام محمد وفا (۴۴) وحید اللہ وحید (۴۵) وزیر جنگ ہادی وغیرہ۔

تیسرا طبقہ ان جوان شعراء کا ہے جو جامعۂ عثمانیہ سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ دوسری درس گاہوں سے اونہوں نے استفادہ کیا ہے اور فکر سخن میں مصروف ہیں۔ ان میں سے بعض کی شاعری پختہ ہو چکی ہے۔ اگرچہ اونہوں نے اس دور میں شاعری کا آغاز کیا مگر سرعت کے ساتھ ان کی شاعری پروان چڑھی۔ افسوس ہے ان میں سے بھی بعض نے اپنی جان شیریں جان آفریں کے سپرد کر دی ہے۔ اس طبقہ کے چند شعراء حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تراب علی خاں باز (۲) فضل الرحمٰن (۳) شمس الدین علم (۴) میر کاظم علی خاں کاظم (۵) برق موسوی (۶) اقدس (۷) لمعہ (۸) نظر (۹) دہقانی (۱۰) قاضی قطب الدین اختر (۱۱) اکبر علی خاں اکبر (۱۲) عبدالغفار شاکر (۱۳) جمشید جی آفت (۱۴) حسن نواز جنگ حسن (۱۵) محمد عباس علمی (۱۶) رشید ترابی (۱۷) امام بیگ رونق (۱۸) عابد علی سعید وغیرہ۔

چوتھا گروہ ان شعراء کا ہے جو جامعۂ عثمانیہ کی پیداوار ہیں ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں :۔

(۱) غلام احمد شریف آرام (۲) محمد جلال الدین اشک (۳) اکبر وفا فانی (۴) سلیمان ادیب (۵) محمد امیر امیر (۶) محمد عبدالقیوم خاں باقی (۷) ڈاکٹر محمد بدرالدین بدر (۸) محمد نصراللہ برنی (۹) محمد شعیب حزیں (۱۰) محمد عبدالسلام ذکی (۱۱) محمد حبیب اللہ رشدی (۱۲) ڈاکٹر سید محی الدین زور (۱۳) سید علی حسین زیبا (۱۴) صمد رضوی ساز (۱۵) مہندر راج سکسینہ (۱۶) محمد نصراللہ سروش (۱۷) رگھونندن راج سکسینہ (۱۸) بدرالدین خاں شکیب (۱۹) سید نبی الحسن شمیم (۲۰) شنکر مدھولال ارمان (۲۱) عزیز احمد عزیز (۲۲) مخدوم محی الدین مخدوم (۲۳) محمد علی خاں میکش (۲۴) سکندر علی وجد (۲۵) غلام دستگیر رشید وغیرہ ہیں۔

فرداً فرداً اس دور کے شعراء کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ کہن

سال شعرا، تو اپنی قدیم روش پر قدم زن رہے اور اپنے قدیم رنگ میں خیال آرائی کرتے رہے۔ مثلاً مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد تخلص، اپنی غزل میں تصوّف اور معرفت کا راگ سُناتے رہے، ان کی زبان کی سلاست اور اثر آفرینی باقی رہی۔ عزیز یار جنگ عزیزؔ حضرت داؔغ کے شاگرد تھے۔ اپنے اُستاد کے رنگ کو زندگی بھر نبھایا۔ اس طرح روزمرہ زبان کی شیرینی و لطافت، کلام کی رنگینی اور شگفتگی کو قائم رکھا۔ حضرت امجدؔ اپنی رُباعیوں، نظموں اور غزلوں میں تصوّف کے اسرار، تصوّف کے رمز سُناتے رہے۔ اپنے وجد آفریں کلام سے گرماتے رہے۔ اسی عہد کے دوسرے معمّر شعرا نے بھی اپنے قدیم طرز اور روش کو قائم رکھا۔ البتہ زمانہ اور ماحول کے مدنظر ان کی غزلوں میں بھی ترمیم ہوگئی۔ اُردو کے مشاہیر شعرا یعنی میر تقی میرؔ، خواجہ دردؔ، غالبؔ، مومنؔ اور اقبالؔ کی پیروی ان کا طرہ امتیاز رہا۔ جوان شعرا خواہ جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوں یا نہ ہوں۔ ان کے سامنے جو نمونے شمال اور دکن کے استادانِ سخن کے پیشِ نظر رہے اس کی اونھوں نے پیروی کی۔ تاریخی شاعری کے لیے اگر انہوں نے شبلیؔ اور ظفر علی خاں کو اپنا رہبر بنایا تو وہی کیفیؔ کی واقعہ نگاری بھی پیشِ نظر رہی۔ سیاسی نظموں کے لیے ظفر علی خاں، چکبستؔ، شبلیؔ اور اکبرؔ کی نظمیں چراغِ راہ ثابت ہوئیں۔ اشتراکی نظموں کے لیے اقبالؔ، جوشؔ، مجازؔ، سلاؔم، فیضؔ، احسان دانش وغیرہ کی شاعری مؤثر ثابت ہوئی۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری مقبول ہوئی۔ جس طرح دوسرے شعرا شمال مثلاً حفیظؔ، راشدؔ وغیرہ کے کلام نے ماڈل کا کام دیا تو اسی طرح عظمت اللہ خاں مرحوم کی ہندی آمیز شاعری اور ہندی بحریں مقبول ہوئیں۔ اور اپنا مقام حاصل کرلیا۔

غزلیات میں جہاں غالبؔ، میرؔ، دردؔ وغیرہ کے کلام کو رہبر بنایا گیا وہاں اقبالؔ، جگرؔ، حسرت موہانی، فراقؔ، یگانہؔ، فانیؔ، کیفیؔ اور توفیقؔ کو استادِ سخن جان کر پیروی کی گئی حضرت اکبرؔ کے مزاحیہ یا طنزیہ رنگ نے جو مقبولیت حاصل کرلی وہ آزادؔ، عصمتؔ، شکورؔ وغیرہ نے اپنے لیے پسند کرلیا۔ اسی زمانہ میں دیہات کی زبان میں شاعری کا آغاز ہوا اور کئی شعرا اس میں حصہ لینے لگے۔ خصوصیت سے دہقانی نے دیہاتی زبان میں سیاست کی جو موشگافی کی وہ یادگار رہے گی۔

ہزل گوئی یا عریاں نگاری کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف الحق مرحوم، غلام جیلانی عاجزؔ اور شمشاد نے اس نوع کا کافی ذخیرہ پیش کیا ہے۔ کلیاتِ عریاں دو ضخیم جلدوں میں

شائع ہوا ہے۔ یورپ کی دوسری عالمگیر جنگ عظیم کے بعد جو حالات بدل گئے اس سے شعراء خصوصاً جوان شعراء میں ایک عظیم الشان تبدیلی ہوگئی ان کو حالات نے انقلاب کی طرف زیادہ مائل کر دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے آخری چند سالوں میں نئی نئی تحریکیں رونما ہوئیں اور انقلابی تصوّرات کی بڑی فراوانی ہوئی۔ بیرونی اثرات کے ساتھ ساتھ شاعروں کی تخیل کی پرواز اور ان کے اسلوبِ بیان پر شاعروں کی خداداد طبیعتوں نے بھی حصّہ لیا ان دونوں امور کے باعث شاعری میں جو اصلاحیں ہوئیں وہ شعر کی معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں پر مشتمل ہیں۔ ادب برائے زندگی کے نظریہ نے جو مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ بیان نہیں، اس عالمگیر اثر نے شاعری کی ہر نوع میں ایک انقلاب کی صورت پیدا کر دی۔ مزید براں ہندوستان، پاکستان اور قلمرو آصفی میں جو خون کی ہولی کھیلی گئی، ہزاروں بے گناہ معصوم جانیں جس بے دردی سے ہلاک ہوئیں، جو مصیبت اور تباہی آئی، ہزاروں شریف اور عصمت مآب خواتین کی عصمتیں لوٹی گئیں اور نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑا۔ اس کا اثر شعراء کے دل و دماغ پر ہوا اور اس اثر اور احساس سے متاثر ہو کر شعراء نے جو نقش صفحۂ قرطاس پر منقش کیے ہیں وہ افلاس، تنگ دستی، بھوک، قید و بند، امراضِ کسان، سرمایہ دار کے علاوہ ظالموں کی خونی تلواروں کی نوحہ خوانی، خوں افشانی کی مذمّت، مظلوموں کے آنسو بن کر ظاہر ہوئے ہیں۔ اونہوں نے ظلم کی مذمّت اور مظلوموں کی حمایت کی ہے۔ سفّاکی اور بے دردی پر دل کھول کر لعنت ملامت کی اور امن و امان، شانتی سے زندگی بسر کرنے، انسان بن کر رہنے کی تلقین کی ہے۔ اس کے ساتھ عشق و محبّت کا جادو کم نہیں ہوا بلکہ شاید سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ البتہ عشق و محبّت کی فرضی داستان کے بجائے اب زندگی کے مشاہدات بیان ہونے لگے ہیں، عشق و محبّت کے جذبات قدیم طرز پر رمزیت، اشاریت اور استعاروں میں بیان کرنے کے بجائے اب پردہ چاک کر دیا جا رہا ہے اور راز درون پردہ کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔ اس خصوص میں خود خواتین شعراء نے کیا طرز اختیار کیا ہے وہ ہم علیحدہ بیان کریں گے۔

بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے شعراء کے کلام میں نئے نئے شعری تجربوں کی طرف طبیعتیں مائل نظر آتی ہیں اور اظہار کے سانچے بھی بدلنے لگے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد ہم بطورِ نمونہ چند شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں کئی

سو شعرار ہیں۔ سب کے کلام کو پیش کرنے کا مقصد نہیں ہے۔ باورچی دیگ کا حال معلوم کرنے کے لیے کفچہ میں تھوڑا سا کھانا نکالتا ہے اور اس سے اپنی رائے قائم کرتا ہے اس اصول کے تحت میں نے یہی کیا ہے۔ چاروں گروہوں سے چند شعرار کو منتخب کیا گیا ہے۔ جن کا تذکرہ سلسلہ وار کیا جاتا ہے۔ ان تمام شعرار کے قطع نظر خود اعلیٰ حضرت سلطان العلوم بھی شعر و سخن کے تاجدار ہیں اور بعض شہزادگان نے بھی دادِ سخن دی ہے۔

(۱) عثمانؔ میر عثمان علی خاں، آصف جاہ سابع، عثمانؔ تخلص کرتے ہیں۔ حضرت جلیلؔ سے تلمذ حاصل کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں تولد ہوئے۔ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) مسند نشین حکومتِ آصفیہ ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں حکومتِ آصفیہ ختم ہوئی اور آپ کو راج پرمکھ کی حیثیت سے حکمران رکھا گیا۔

۱۴ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ م فروری ۱۹۶۷ء کو آصف سابع کا انتقال ہوا۔ آپ کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔

جب لسانی لحاظ سے ہندوستان کی تقسیم ہوئی تو آپ نے گورنر بننے سے انکار کر دیا اور حکومت سے دست بردار ہو گئے۔ عثمان کا کلام جو فارسی اور اردو میں ہوتا ہے۔ دنیائے ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے، آپ کے کلام کو ملوک الکلام کہنا ہر طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :-

غزل

نہاں نظر سے ہوا روئے یار مشکل ہے ۔۔۔ اب اپنے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
کسی کے غمزۂ انداز ناز نے دل پر ۔۔۔ کیے وہ ظلم کہ جن کا شمار مشکل ہے
ہزار بار تمہیں آزما کے دیکھ لیا ۔۔۔ تمہارے وعدوں کا اب اعتبار مشکل ہے
نگاہِ ناز آفت ہے مرغِ جاں کیلیے ۔۔۔ یہ تیر وہ ہے کہ جس سے فرار مشکل ہے
غمِ رقیب میں تم کو نہ خاک اڑانی تھی ۔۔۔ ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے
میں اس چمن کا ہوں مرغ ترانہ سنج جہاں ۔۔۔ ترا گذر بھی نسیمِ بہار مشکل ہے
پڑی ہے بادۂ ترکی کی چاٹ اے عثمانؔ ۔۔۔ بہارِ گل میں یہ جائے ہزار مشکل ہے

دیگر

کیا محفلِ ہستی کا نقشہ متغیر ہے ۔۔۔ ساقی ہے نہ مطرب ہے، شیشہ ہے نہ ساغر ہے

غم سے نہ فراغ اس کو سونے سے نہ وہ خالی
دل ہے تو عجب دل ہے سر ہے تو عجب سر ہے

سوتے سے جب اُٹھے گا اک حشر بپا ہوگا
وہ فتنۂ خوابیدہ جو فتنۂ محشر ہے

تلوار جو کھینچی ہے حاضر ہے گلا میرا
دل میں ہے وہی میرے جو آپکے لب پر ہے

انداز ترے قاتل سب جان کے دشمن ہیں
چتون ہے کہ ناوک ہے، غمزہ ہے کہ خنجر ہے

جو برق گراتی ہے وہ ہے نگہِ جانان
جو دل کو پھنساتی ہے وہ زلف معنبر ہے

اب چشمِ عنایت سے پیاس اس کی بجھا دیجیے
بے تاب بہت عثمانؔ یا ساقیٔ کوثرؐ ہے

دیگر

پی کے مئے ساقی نہ یوں مدہوش رہنا چاہیے
کچھ خیالِ خاطرِ مے نوش رہنا چاہیے

تیرے غمزے کو، ادا کو، ناز کو، انداز کو
میرے ارمانوں سے ہم آغوش رہنا چاہیے

دیکھ کر صہبا کو زاہد کی نہ لگ جائے نظر
ان خموں پر ساقیا سر پوش رہنا چاہیے

دردِ دل آمادۂ فریاد کرتا ہے مجھے
ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے

نغمۂ بلبل جو سننا ہے تو اے اہلِ چمن
مثلِ گل ہر دم سراپا گوش رہنا چاہیے

تیغ قاتل نے سبکدوشی کا ذمہ لے لیا
اب کسی سر کو نہ بارِ دوش رہنا چاہیے

موسمِ گل جا چکا عثمانؔ مگر کہتا ہے دل
اور بھی کچھ دن جنوں کا جوش رہنا چاہیے

یہ کرنا عرض اے بادِ صبا سبطِ پیمبرؐ سے
کہ غم میں آپ کے دریا رواں ہے دیدۂ تر سے

کھوا اشک وفغاں سے ذکر ہوتا ہے شہیدوں کا
گرجنا ہو جیسے گرجے برسنا ہو جسے برسے

خدا کی شان یک قطرہ نہ پہنچا حلق تک شہ کے
مگر ہے تیغ کا پانی کہ اونچا ہو گیا سر سے

جو دل کے سخت ہیں وہ بھی سرور میں گریاں ہیں
عجب تاثیر ہے پانی نکل آتا ہے پتھر سے

مۓ حُبِّ نبی میں رات دن ہم مست رہتے ہیں
نہ خُم سے ہے غرض ہم کو، نہ شیشے سے، نہ ساغر سے

قیامت ہوگی برپا اور میدانِ قیامت میں
اوٹھیں گے ہم جو آنسو پوچھتے دامانِ محشر میں

وہ ہیں اشکِ عزا اپنے بدولت جن کے اے عثماںؔ
چکھایا ساقیٔ کوثر نے ہم کو جام کوثر سے

دیگر

محبت میں نہ دل باقی، نہ ہے تاب وتواں باقی
ابھی حصے میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی

گل وریحاں وسنبل سب خزاں میں ہوگئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ وفغاں باقی

خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحرِ الفت میں
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادباں باقی

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یارانِ رفتہ کا
غضب یہ ہے کہ ہے اب تک نشانِ کارواں باقی

زبانِ شمع سے سُنتا ہوں قصہ سوزِ الفت کا
شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستاں باقی

شبِ دوشنبہ کی بدمستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گراں باقی

سلاطین سلف سب ہوگئے نذرِ اجل عثماںؔ
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

سرزمینِ طیبہ کا رتبہ میں عثماںؔ کیا کہوں
سنگ ریزے جس کے ایماں کے ستارے ہوگئے

پوچھنا ہے ملک الموت سے اک دن مجھ کو
آپ کا کوچہ قاتل میں گزر ہے کہ نہیں

---

(۲) فرحت

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم اُردو زبان کے مشہور مزاحیہ نگار آپ کا تفصیلی تذکرہ نثر نگاروں میں کیا جائے گا۔ بحیثیت شاعر بھی آپ کا خاص مقام تھا۔ بقول غلام یزدانی صاحب، فرحت دوسرے درجہ کے شعراء میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ فرحت نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، فرحت کے کلام میں زبان کی لطافت، مضامین کی رنگینی، جدتِ خیال، حُسنِ بیان کے ساتھ اثر بھی موجود ہے۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ سب کے رنگ میں اپنے خیالات کی جولانی دکھائی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فرحت کا حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔ فرحت کی نظموں میں "جمنا کا کنارا" والی نظم جو یادِ وطن کے نام سے لکھی گئی زیادہ مقبول ہوئی، اس کا نمونہ بلاحظہ ہو:-

اے اہلِ وطن پوچھ نہ یہ مجھ سے خدارا ۔۔۔ دلی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا
ہے یادِ وطن ہی مرے جینے کا سہارا ۔۔۔ اس شہر کا ہر گوشہ ہے یوں تو مجھے پیارا
آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا ۔۔۔ رہ رہ کے وہ پھر بادِ سبک سیر کا جھونکا
پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا ۔۔۔ اس منظرِ خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشہ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکسِ رُخِ ماہ میں پانی کا وہ دھارا ۔۔۔ پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پارہ
اور سطح کو کچھ موجِ ہوا نے جو اُبھارا ۔۔۔ پھر لہروں کا اُٹھ اُٹھ کے بُلانے کا اشارا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظرِ مایوس ۔۔۔ وہ شمع زباں دانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
اک حسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس ۔۔۔ تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکزِ ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

مشرق میں اُفق کے وہ چمکدار کنارے ۔۔۔ اور ان میں وہ کرنوں کے پرازنور شرارے

مغرب میں اترتے ہوئے وہ ماند ستارے دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ وہ ساڑھیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حُسن خدا داد نہیں جس میں بناوٹ قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

پھر گھاٹ کے نزدیک وہ ڈبکی کا لگانا گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑھی میں بدن کا وہ چرانا جھک جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ بیلے کے ہر کونہ سے موروں کی جھنکاریں اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں
وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ قسمتِ بیداد کے دن اور وہ راتیں وہ کشمکشِ دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں
اور لطف جوانی کا اُٹھانے کی وہ گھاتیں فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ گھاتیں
یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

ایک اور نظم :-

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم
کہ دھرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم
اس بُری طرح پھنسے مجمع اغیار میں ہم
گھٹ کے دم مر ہی گئے کوچۂ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی منہ نہ لگائے
کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہم نے مانا کہ سنہ اُنیس کی ہی فورڈ سہی
کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں مگر کار میں ہم

چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے
کیا ہوا گر کہیں پٹ بھی گئے بازار میں ہم

مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں
کچھ برے بھی نہیں یوں دیکھو تو دو چار میں ہم

لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں
بیٹھے رہتے ہیں کتابوں ہی کے انبار میں ہم

شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانوں کا لباس
ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم

کیا غضب ہے عدو رولز ورائس میں پھریں
اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئی اک کار میں ہم

ریختی کے ایک دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے پر بوں، کیا سلیقہ والی ہے

رستہ میں دن دہاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا
میں نے بھی غل مچا کر سر پر اٹھائی بستی

غزلوں میں میر اور غالب کا رنگ :۔

شب ہجراں گذر گئی لیکن دل مرا بے قرار ہے اب تک
ہے خزاں اور دل کے زخموں سے میرے گھر میں بہار ہے اب تک
موت آچک کے غیر کے غم میں دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک
اس کے وعدے کو ہو گئے برسوں اور مجھے انتظار ہے اب تک
کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا جس کا فرحت خمار ہے اب تک

دل مرا روز ازل سے بے قرار نغمہ ہے
ہر نفس اس کے لیے آواز تار نغمہ ہے

ہر مصیبت کیا، گزشتہ راحتوں کی یاد ہے
نوحہ بھی دیکھو تو گویا یادگار نغمہ ہے

ساز کی حاجت نہیں ہے نغمۂ جاں سوز کو
گوشِ اہلِ ذوق کو ہر ساز عار نغمہ ہے

جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے سازو سرور
درد کا اس میں جو پردہ ہے شرار نغمہ ہے

انقلابِ دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دَور
کیوں دلِ راحت طلب کو انتظار نغمہ ہے

کچھ اور کلام :-

جس کی تلاش میں ہیں سارے جہاں کے رُہرو
اس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں

کیا نزاکت، کیا ادا، کیا ناز، کیا انداز ہے
تیری صورت پر ید قدرت کو کیا کیا ناز ہے

ہر نگاہ ناز گویا تیرِ بے آواز ہے
اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے

بے نیازی اور تیرا ناز ہیں کچھ ایک سے
فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے

فرحت کی طبیعت بھی اک راز ہے سربستہ   میکش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہے رندانہ

رنج کے بعد ملتی ہے راحت   انقلاب، انقلاب لاتا ہے

---

(۳) اختر

علی اختر نام اور اختر تخلص، آپ کے والد حیدر آباد آکر بس گئے۔ اختر کی نشو و نما حیدر آباد میں ہوئی، اپنے والد حضرت باغ سے تلمذ

حاصل کیا۔ اختر زیادہ تر نظم لکھا کرتے ہیں۔ مگر غزل گوئی میں بھی آپ کو پوری مہارت ہے۔ مگر غزل کے قدیم طریقہ کی پابندی نہیں کرتے بلکہ آپ کی غزل بھی اس کے محدود دائرہ سے بہت آگے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اختر کی نظمیں مختلف اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں واقعہ نگاری، وصف نگاری، نیچرل شاعری کے بڑے اچھے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ اختر کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی حد بندی کی پابندی نہیں کرتے۔ وہ شعر کو غیر محدود فضا کی دلآویزیوں سے لبریز کرتے ہیں۔ جدید رجحانات سے ان کی شاعری مملو ہوتی ہے۔ اختر کی غزلوں کا مجموعہ "انوار" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے۔ نظموں کا مجموعہ ہنوز شائع نہیں ہوا۔ آپ کا کلیات نہایت ضخیم مرتب ہو چکا ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد آپ پاکستان چلے گئے اور وہاں ہی انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے:-

کم نہ تھی قیامت سے صبح آفرینش بھی میری مضطرب نظریں اور انتخاب ان کا

لُٹا کے سرمایۂ جوانی، اسے عطا کی ہے زندگانی
عروسِ ہستی کے خال و خد میں جھلک رہا ہے شباب میرا

درد کو جاوداں کیا، حسن کو دی ستم کی خو لذتِ غم سے کیا ملا، ذوقِ نظر نے کیا کیا

پھر دل میں جنوں، سلسلہ جنباں نظر آیا شیرازۂ کونین پریشاں نظر آیا

پھر بہار آئی، نشاطِ روح کا منظر کھلا ساز جاگے، جام چھلکے، میکدے کا در کھلا

نہ دیارِ غیر میں چین ہے، نہ وطن کے دشت و دیار میں
کہ ہزاروں ذرّے ہیں مضطرب مری ایک مشتِ غبار میں

اب نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

حیات

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

مجھے یہ دھمکیاں نہ دے حیات کوئی چیز ہے
وہ کوئی چیز ہو نہ ہو مگر مجھے عزیز ہے
سمجھ سکوں یہ راز میں ابھی تو یہ تمیز ہے
ڈرا نہ دام و آز سے فریب امتحاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

حجاب دہر اُٹھا گئی گرفتگی خیال کی
مآل غم سے مٹ گئی خلش غم مآل کی
یقیں نے توڑ دیں حدیں طلسم احتمال کی
حیات پھر حیات ہے مثال رفتگاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

اجل سے بھیک مانگنا یہ کارِ زندگی نہیں
خزاں کے رحم پر ہوں جو وہ پھول پھول ہی نہیں
تجلیات وہم میں جو حسن سرمدی نہیں
حدیثِ شوق کیا اگر لطافتِ بیاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ہوائے سرد سرد ہے نشاط جاں لیے ہوئے
سرور موج موج ہے جوانیاں لیے ہوئے
حجاب گرد کارواں ہے کارواں لیے ہوئے
یہاں فغاں کا ذکر کیا یہ دعوتِ فغاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ازل سے گرم کار ہے وہ فطرتِ عظیم تر
دیار نور و نار میں سرِ بساطِ بحر و بر
اسی کی صبح و شام ہیں اسی کے لالۂ و گہر
متاعِ سود مند کو یہ تہمت زیاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

چمن کے راز داں جو ہیں انھیں غمِ خزاں نہیں
چمن بھی سرمدی نہیں خزاں بھی جاوداں نہیں
مگر وہ روحِ زندگی، کہاں رواں دواں نہیں
دیارِ عقل و ہوش میں پیام گمرہاں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

فنا مآلِ وہم ہے نہ منزلیں نہ کارواں
حیات نقشِ مستقل، حیات حسنِ جاوداں
کہیں سکوں، کہیں خلش، کہیں عیاں کہیں نہاں
یقیں کی بارگاہ میں یہ تحفۂ گماں نہ دے
اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

---

(۴) عصمت

مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب کا وطن دہلی ہے مگر بچپن میں حیدر آباد آ گئے کیوں کہ ان کے خاندان کے بیسیوں افراد حیدر آباد کو وطن بنا چکے تھے۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ان کی تعلیم ہوئی۔ مرزا صاحب کو ظرافت فطرتاً عطا ہوئی ہے۔ وہ بچپن سے اسی رنگ میں رنگے ہیں۔ شاعری کا شوق ان کو ورثہ میں ملا ہے۔

قوم کی اصلاح کے لیے حضرت اکبر مرحوم نے مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ اکبر ہی کی پیروی میں عصمت نے بھی اسی رنگ میں شاعری شروع کی اور ان کا رنگ پختہ ہوگیا ہے۔ ان کی شاعری میں بلا کی آمد ہے۔ اور فطری ظرافت پائی جاتی ہے پھر زبان کی صفائی بھی قابلِ داد ہے۔ ۱۹۵۴ء میں عصمت نے وفات پائی۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جو گھر چلتا رہے عصمت یہی ہے ہوم رول اپنا
نہ کچھ ہو ہاتھ کی تنگی یہ مطلب ہے فریڈم کا

جو اصحاب یورپ سے یورپین بیویاں لاتے ہیں ان کے متعلق ایک نظم کے شعر ملاحظہ ہوں۔

ہے تمھاری زندگی بھی زندگی غواص کی
ہے تمھاری راہ بھی اندیشہ ناک و پُرخطر

دوسرا وہ جو کہ چُن لاتا ہے تہ سے سیپیاں
بعض میں ہوتے ہیں موتی اور خالی بیشتر

تیسرا وہ جو کہ غوطہ مارتا ہے آب میں
بند وہ آنکھیں کیے پھرتا اِدھر سے ہے اُدھر

ڈھونڈ کر لاتا ہے اک دریا سے وہ سیپی بڑی
دیکھتا ہے اس کو جب خشکی میں باہر ڈال کر

ایک بڑا کچھوا دکھائی دیتا ہے چلتا ہوا
جس کو وہ سیپی سمجھتا تھا وہ کچھوا ہے مگر

تم سمندر پار سے کچھوا نہ لے آنا کہیں
لے کے تم جو کچھ چلو اس کو سمجھ لو پیشتر

لے گئے یورپ کو اپنے ساتھ بھر کر تھیلیاں
آئے خالی ہاتھ واپس خرچ کر کے مال و زر

اس پہ دعویٰ یہ کہ لاکھوں کا ہے یہ خالی دماغ
باتیں کرنے کا ملے موقع تو کھا جاتے ہیں سر

گڈّے گڑیا کا بیاہ

جو سنتا ہے کہتا ہے سمدھن مڑن ہے
جو سمدھی ہیں ان میں بھی دیوانہ پن ہے

کبھی ان کا دولھا تو ان کی دُلہن ہے
تلوّن ہے دونوں میں چرچا یہی ہے

خدا جانے جھگڑے کے اسباب کیا ہیں
یہ روٹھے ہیں ان سے، یہ ان سے خفا ہیں

کبھی یہ ہیں ملتے، کبھی یہ جُدا ہیں زبردست گڑبڑ گھٹالا یہی ہے

بیاں کی وہ سمدھن نے گڈّے کی صورت کہ سب سُننے والوں کو ہوتی ہے حیرت
مگر کچھ نہ فرمایا گڑیا کی نسبت کہ یک طرفہ ڈگری میں ہوتا یہی ہے

ہماری نظر میں ہے دونوں کا نقشہ یہ بندی خدا کی، وہ بندہ خدا کا
ہمیں بھی مُروّت کا کچھ پاس آیا کہ آدم سے آدم کا رشتہ یہی ہے

بناتے ہیں دونوں کی ہم شکل وصورت دکھاتے ہیں دونوں کی ہم سب کو ہئیت
کہ شاید نکل آئے شادی کی صورت سخن کا ہمارے خلاصہ یہی ہے

وہ صورت میں ہیں ایک سے ایک اعلیٰ وہ ہئیت میں ہیں ایک سے ایک زیادہ
اک آلو ہے ان میں اِک آلو بُخارا کہ بچّوں کا پہلا نمونہ یہی ہے

غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو :۔

مریضِ غم کی شدید حالت عیاں ہے چہرے کا رنگ ہوکر
اب اس کی قسمت پہ اس کو چھوڑا، جو چارہ سازوں نے تنگ ہوکر

اٹھائی ذلّت ہوئے پشیماں، کہیں کا رکھا نہ مفلسی نے
چلے ہیں محروم شیخ پیرِ مغاں کی باتوں سے تنگ ہوکر

ہزار ہوں دست و پا شکستہ مگر نہ ہمّت کو ہاتھ سے دو
ہزار مشکل کو کیجے آساں امیر تیمور لنگ ہوکر

تباہ غفلت میں کی جوانی یہ دیکھو اعمال کی نشانی
خضاب بالوں پہ چڑھ رہا ہے سیاہ کاری کا رنگ ہوکر

نہیں ہے تعلیم کا یہ مقصد کہ نوکری کا ہو شوق بے حد
کلر تو ہے کوٹ پر نمایاں مگر غلامی کا رنگ ہوکر

دل میں یادِ ابروئے خمدار رہنے دیجئے — اپنے دم کے ساتھ یہ تلوار رہنے دیجئے
شیخ جی رندوں میں یہ گفتار رہنے دیجئے — اپنے گھر میں آپ استغفار رہنے دیجئے
کچھ تو میرے دل میں اے دلدار رہنے دیجئے — کھینچئے دو چار تو دو چار رہنے دیجئے
رند سب سر پر رکھیں گے یہ تبرک آپ کا — میکدے میں شیخ جی دستار رہنے دیجئے

گو کہ عصمت آپ سے ہے دور اکلکوٹ میں
بزم میں اس کے مگر اشعار رہنے دیجئے

---

(۴) ابر

غلام دستگیر المتخلص بہ ابر ۱۳۰۱ھ میں حیدر آباد میں تولد ہوئے، خانگی تعلیم کے بعد ہائی اسکول میں تعلیم پائی۔ پھر تعلیم کو چھوڑ دیا۔ زمانۂ تعلیم میں ایک شاعر مدرس ہدایت علی صاحب ہدایت کے زیر اثر شاعری سے دلچسپی ہوگئی۔ حبیب کنتوری کے شاگرد تھے ان کے بعد ضامن کنتوری سے مشورہ کیا۔ ان کے فیض صحبت سے فن شعر کی تکمیل کی۔ ضخیم دیوان کے علاوہ ایک مثنوی "نقش قدم" بھی ان کی یادگار ہے۔

ابر کے کلام میں اسلوب بیان کی جدّت اور خیالات کی ندرت پائی جاتی ہے۔ کلام میں سادگی بھی ہے اور رفعتِ تخیل بھی۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

ایک وہ ہیں جو چاہے کرتے ہیں — ایک ہم ہیں وفا پہ مرتے ہیں

زندگانی حباب آسا ہے — لوگ پھر بھی غرور کرتے ہیں

بقا موج کو شور دریا میں ہے — کنارے پہ پہونچی فنا ہوگئی

یہ ناز ہے، ہے ہست میری ہست سے تیری — تو ہے تو ہوں گر تو نہیں میں چیز ہی کیا ہوں

حُسن کی لن ترانیاں عشق کی جاں ستانیاں — ہائے وہ بے نیازیاں لطفِ نیاز آگیا

اس سے مل کر دل نے کی چالاکیاں — دوست کی صورت میں یہ دشمن رہا

دید کے طالب کو سوجھی دور کی　　بن کے خالی وادیٔ ایمن رہا

دور میں دیر کس لیے پیاسوں کی تشنگی بجھے　　ابرِ فلک پہ ساقیِ رندنواز چھا گیا

میرے رونے پہ جو ہنسی اڑی وہ ہنسی ہنسی تھی بناوٹی　　جو کسی کے دل کی کھلے کلی میری آہ بادِ سحر نہیں

ہنگامہ خیز غلغلۂ گوش گوش ہے　　دُنیا قمار خانۂ اربابِ ہوش ہے

پھر اک نگاہ، گو غلط انداز ہی سہی　　ہاں اے حریف ہوش ابھی مجھ کو ہوش ہے

کیا پوچھتے ہو جلوہ گہِ ناز کے اسرار　　کیا جانیے کیا دیکھا ہے کچھ یاد نہیں ہے

---

(۵) **جعفر** مرزا علی جعفر نام اور جعفر تخلص۔ حضرت اشہر مرحوم کے چوتھے بیٹے تھے۔ ۱۳۰۰ھ میں تولد ہوئے۔ قدیم طرز پر گھر میں تعلیم پائی۔ بچپن سے شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ نوحہ، سلام، قصائد اور رُباعی اور مراثی موزوں کرتے تھے۔ جعفر کو حضرت ناجی سے تلمذ حاصل تھا۔ ناجی کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار تھا۔ جعفر کے کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے۔

حالت یہ تھی کہ کانپتا تھا جسم سر بسر　　پشتِ فرس پہ ہانپتے تھے مثلِ شیرِ نر
مجروح خود بھی ہو گئے تھے سر سے تا کمر　　بن کر لہو پسینہ ٹپکتا تھا خاک پر
تھا پیاس کا وفور بھی اور التہاب بھی　　اُف اُف کے ساتھ کہہ رہے تھے آب آب بھی

بجلی گری کہ تیغ چلی فوجِ شام پر　　نازل خدا کا قہر ہوا خاص و عام پر
قرباں تھی برق ابنِ علی کی حسام پر　　سکتہ تھا جس کا قلب نریمان و سام پر
بیکار حربے ہو گئے حرب اس کو کہتے ہیں　　تھے مدح خواں حریف بھی ضرب اس کو کہتے ہیں

آواز دے، نہ ہجر کا رنج و ملال کھینچ نزدیک اپنے اے اسد حق کے لال کھینچ
ہوشمسار ابروئے اکبر کو دیکھ کر منہ کو حجاب چرخ میں بس اے ہلال کھینچ

---

(۶) مہر میر آفتاب علی خاں، خاندان شاہی سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے صاحبزادہ کہلاتے ہیں۔ مہر کی پیدائش ۱۳۰۲ھ میں ہوئی۔ اولاً گھر پر، پھر مدرسہ عالیہ میں تعلیم پائی۔ اور پھر اسی مدرسہ کی خدمت کے لیے مستعد ہو گئے۔ چنانچہ ملازمت کا پورا زمانہ یہاں ہی بسر ہوا۔ شاعری کا مذاق کم سنی سے تھا۔ نظم طباطبائی اور داغ کی شاگردی کی مہر کی شاعری پرانے اسکول سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کا کلام لطفِ زبان، رفعتِ تخیل اور محاسن شاعری سے مملو ہوتا ہے۔ مہر کی شاعری سے ان کے کردار کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے شگفتگی، معنی آفرینی، روانی اور سلاست ان کے کلام کی خصوصیات ہیں:۔

آج کی بات آج ہو، کل کا بھلا قرار کیا کل کی خبر کسے یہاں، زیست کا اعتبار کیا

صبر میں ثابت قدم ہو دل جب اس قابل بنا کام دنیا میں مرا مشکل سے بھی مشکل بنا

سبق ایسا سکھایا ہے نظامِ دہر نے ہم کو کہ ہم یاروں کے یار، اغیار کے اغیار رہتے ہیں

میں کون تھا کہ میرے مٹانے کے واسطے دشمن اٹھے، زمین اُٹھی، آسماں اُٹھا

کبھی تدبیر سے اُلٹا، کبھی تقدیر سے پلٹا عجب صورت سے چلتا جا رہا ہے کام انساں کا

یہ بھی کوئی آنا ہے، یہ بھی کوئی ملنا ہے آئے تو خفا آئے، بیٹھے تو خفا بیٹھے

مزا ملتا ہے ایسا رال ٹپکی پڑتی ہے منہ سے زبانِ خشک پر ساقی کا جب افسانہ آتا ہے

بے مانگے موتی ملتے ہیں، مانگے ملے نہ بھیک ملتا ہے وہ نصیب سے ملنا کہیں جسے

حشر میں خاموش جلنے سے بھلا کیا فائدہ   تم سناتے جاؤ، ہم فریاد کرتے جائیں گے

---

(۷) عالی راجہ نرسنگھ راج نام اور عالی تخلص، آپ کے والد راجہ گردھاری پرشاد المتخلص بہ باقی کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے، عالی کی ولادت حیدرآباد میں ۱۳۰۴ھ میں ہوئی۔ کم عمری میں باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ مدرسۂ عالیہ میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ اس کے علاوہ خانگی طور پر گھر میں فارسی، ہندی، اور مراٹھی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ شاعری کا بچپن سے شوق رہا۔ حضرت جلیل سے تلمذ رہا۔ زیادہ تر غزل یا رباعی کہتے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے مشاعروں میں ہمیشہ شریک ہوتے رہے۔ مہاراجہ کو آپ سے بڑا خلوص تھا۔ اسی خلوص کے باعث مہاراجہ کی یادگار میں مشاعرہ آپ کے اہتمام میں ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ عالی کے کلام میں تصوف اور معرفت کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں میں داغ کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ عالی قدیم اخلاق اور قدیم وضع و معاشرت کے پابند ہیں۔ ان کی سادگی، محبت، خلوص، ہمدردی کا ان کے ہر ملنے والوں کو اعتراف ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

رُباعی

پوشیدہ ہے گر جلوہ عیاں تیرا ہے   کثرت ہو کہ وحدت ہو، نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن   کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے

کس کے لیے ہائے اب میں دنیا میں رہوں   دنیا کے مصائب کو سہوں، صبر کروں
عالی جینا تھا صرف جینے سے ترے   اب دونوں برابر ہیں جیوں یا کہ مروں

تم یاد سے اپنی ستایا نہ کرو   غمگین ہوں میں غضب یہ ڈھایا نہ کرو
عالی کو دیا خوب جہاں میں دھوکا   بہتر ہے کہ خواب میں بھی آیا نہ کرو

کون ہمدرد ہو پھر جب نہ ہو اپنا اپنا   غیر ممکن ہے کہ ہو جائے پرایا اپنا
سر بھی سودائے محبت میں دیا جان بھی دی   کس گرانی سے ہوا دیکھے سودا اپنا

اس نے ٹھکرا کے مری لاش کو نخوت سے کہا | کیا ہوا اک نہ رہا چاہنے والا اپنا
وہ گھڑی کیسی مبارک تھی خدا پھر لائے | روٹھنا ان کا شبِ وصل منانا اپنا
یاد میں کس کی ہوا حال یہ تیرا عالی | گم ہوا یوں کہ پتہ آپ نہ پایا اپنا

نہیں بھاتی ہیں دور کی باتیں | سنو موسیٰ سے طور کی باتیں
زاہدِ خشک کچھ سنا پی کر | ہم سنیں گے سرور کی باتیں
سنتے سب کچھ ہیں واعظوں سے مگر | کون جانے قبور کی باتیں
تجھ کو زیبا ہیں اور معاف بھی ہیں | اے جوانی قصور کی باتیں
تلملانا، تڑپنا، جاں دینا | ہیں دلِ ناصبور کی باتیں

---

(۸) وفا محمد حبیب اللہ المتخلص بہ وفا، ان کے دادا ذکار کا تذکرہ صفحات ماقبل میں گذر چکا ہے۔* وفا کی پیدائش ۱۲۹۹ف میں حیدرآباد میں ہوئی مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم پائی، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں منشی فاضل اور مولوی فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فارسی میں سہا، شمسی، نوری اور ضیاء سے تلمذ رہا۔ اردو میں مائل، بیدل، جلیل اور نظم طباطبائی سے اصلاح لیتے رہے۔ جملہ اصنافِ سخن، مثنوی، قصیدہ، مسدس، غزل وغیرہ میں اچھی مشق ہے۔ وفا کے کلام میں قدما کا رنگ غالب ہے۔ تخیل کی پرواز، لطف بیان، رنگینی سب کچھ ان کے کلام میں موجود ہے آپ کا کلام پُر اثر ہوتا ہے۔ انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں بھی طول طویل غزلیں لکھی ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ سررشتۂ تعلیمات میں ملازمت کی اور تمام عمر لڑکوں کو تعلیم دینے میں گذاری ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

مثنوی کا نمونہ :-

صریرِ کلک نے سیٹی بجادی | زمیں شعر و سخن کی ہی ہلادی
رواں انجن ہوا طبعِ رواں کا | کہ اسٹیشن ہے میداں آسماں کا

---

* وفا کا ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔

مضامیں کا تسلسل ہے کچھ ایسا　　قطاریں ریل کی جاری ہیں گویا
تعالی اللہ فیضِ دورِ عثماں　　رعیت کی ہے آسائش کا ساماں
جدھر دیکھو ادھر ریلیں ہیں جاری　　مبارک ہو یہ دورِ کامگاری

سلام کا نمونہ :-

گیا داغ دل کے سینۂ روشن میں پھول ہیں　　نخلِ غمِ حسین کے گلشن میں پھول ہیں
رنگِ بہار خونِ شہیداں ہے گل فشاں　　مجروح سرسناں پہ ہے آہن میں پھول ہیں
دل بوئے عشق ساقیِ کوثر سے مست ہے　　اس مے کے قطرے ساغرِ روشن میں پھول ہیں

غزلوں کا نمونہ

مزے خراش کے لیتے ہیں دل فگار الم　　گماں ہے پنبۂ مرہم کا تنگ ناخن پر
کمندِ زلف میں اب مرغ دل کی خیر نہیں　　قفس میں بند شکستہ ہے رنگِ ناخن پر

نکالو گے کہو کس کس کو بزمِ ناز سے اپنی　　وہ خود اپنے سے باہر ہے جو اس محفل کے اندر ہے

غم سے حالت غیر ہے دھوکا ہے ان کو غیر کا　　اے غمِ الفت تصدق تیری اس تدبیر پر

ساغر پہ جان دیتے ہیں ہم رنگ دیکھ کر　　مستانہ چشم کا تری مستانہ چال کا

اسرارِ عشق دل پہ ابھی تک کھلے نہیں　　پیمانہ بے خبر ہی رہا مے کے راز سے

پسِ مردن بھی داغِ عشق دل سے مٹ نہیں سکتا　　جلے گی شمع یہ صبحِ قیامت تک مزاروں میں

تو مری ہمدم ہے، میں ہمدم ترا اے بے کسی　　تو مری تقدیر میں ہے، میں تری تقدیر میں

---

(۹) **حیرت**

سید حسن نام اور حیرت تخلص ، بدایوں وطن ، مگر حیدر آباد آکر حکومتِ آصفیہ کی ملازمت میں شامل ہوئے اور یہیں ہی بس گئے۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۴ھ میں ہوئی ، عربی ، فارسی کی تعلیم پائی ، مولوی فاضل ، منشی فاضل کے

امتحانات کامیاب کیے۔ بارہ سال کی عمر سے شعر گوئی آغاز کی، کسی کی شاگردی نہیں کی بلکہ اپنے صحیح ذوق اور علمی وفنی کتابوں کو دلیل راہ بنایا، غزل گوئی آپ کا محبوب مشغلہ ہے، کام میں پختگی اور اُستادانہ رنگ ہوتا ہے، زبان اور بیان پر پوری قدرت حاصل ہے۔

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور
کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

ساقی تپش شوق کہیں سرد نہ پڑ جائے
ہاں آتش سیّال کا اِک رطل گراں اور

اب ہے کف محنت میں کلید در دولت
کچھ دیر کی ہے کشمکش سود و زیاں اور

اردو کے حریفوں کی ہمیں کچھ نہیں پروا
ہنگامہ پیکار میں چلتی ہے زباں اور

ہندی کو تو اردو سے کوئی بَیر نہیں ہے
اُردو کی مخالف ہے کوئی روح رواں اور

اللہ سمجھتے نہیں اب وہ مری اُردو
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہم پیر ہیں اور پختگی عمر میں حیرت
ہو جاتے ہیں انسان کے افکار جواں اور

آدمی بچے کیوں کر ان حسیں گناہوں سے
وہ ضرور گذرے ہیں دل کی شاہراہوں سے

آج خود بہ خود پردے اُٹھ گئے نگاہوں سے
ہو گناہ آتے ہیں نیکیوں کی راہوں سے

عالم جوانی میں پارسائیاں توبہ
عالم جوانی کی شان ہے گناہوں سے

آیئے نگاہوں میں، چھایئے نگاہوں پر
لوٹیے نگاہوں کو، کھیلیے نگاہوں سے

میں نہ تھا تو دنیا تھی لوح سادۂ بے رنگ
رنگ بھر دیئے میں نے نت نئے گناہوں سے

انقلاب آتے ہیں آتے رہیں، رنگ پر رنگ عالم بدلتا رہے
ہم سے کیا ہم پرانے گنہ گار ہیں، ساقیا دَور پر دَور چلتا رہے

غنچہ پیکر رہو، سرو قامت رہو، کہہ رہی ہیں بہاریں سلامت رہو
اک قیامت ہو تم، تاقیامت رہو حُسن جادو کے سانچوں میں ڈھلتا رہے

شمع و گل ہوں کہ لیلائے محمل نشیں، ماہ کنعاں ہو یا ماہ چرخ بریں
جس کو رہنا ہے دنیا میں بن کر حسیں آپ ہی کے اشاروں پہ چلتا رہے

ے علامہ حیرت بدایونی نے ۱۵ رفروری ۱۹۷۵ء کو وفات پائی

کسی سے بھی بلندی عشق کی جانی نہیں جاتی — خرد بھی ماورائے حدِّ امکانی نہیں جاتی
اک ایسی بھی حقیقت جلوہ فرما ہے دوعالم میں — جو اپنی بے نقابی پر بھی پہچانی نہیں جاتی
جہاں سے ابتدائے جلوۂ بیرنگ ہوتی ہے — وہاں تک بھی مگر تخئیل انسانی نہیں جاتی

خیر و شر کے تصادم سے ہے زندگی — یا الٰہی سلامت رہیں خیر و شر
منزلِ صبح خود دے رہی ہے صدا — شام کے راہیو تیز تر، تیز تر
انقلابوں سے ہوتی ہے دنیا جواں — انقلابوں کی یورش سے حیرت نہ ڈر

---

(۱۰) حیدر سید حیدر پادشاہ قادری، حیدر تخلص، حیدرآباد وطن ۱۲۹۸ھ میں تولّد ہوئے، پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی، مختلف اضلاع میں ملازمت کی، مگر جلد سبکدوشی حاصل کرلی، شعرگوئی کا شوق ہوا، اوّلاً ہاتف پھر توفیق سے رجوع ہوئے، ان کے انتقال کے بعد ضامن کنتوری کے زمرۂ تلامذہ میں شریک ہوئے، حیدر ایک کہنہ مشق، پرگو استادِ سخن کی حیثیت رکھتے ہیں، قدیم رنگ تغزّل میں بہت اچھی غزل کہتے ہیں۔ شوکت لفظی، الفاظ کی بندش، محاورہ اور روزمرّہ کا خاص خیال رکھتے ہیں۔

بے کسی، صدمۂ فرقت، شبِ تنہائی ہو — آپ ہی کہئے کہاں تک رہے طاقت دل میں
غیر اور میرا مقابل ہو، خدا کی قدرت — آپ ابھاریں گے مگر ہو بھی تو ہمّت دل میں
میں کوئی غیر نہیں، مجھ پہ جفائیں کیسی — تم عدو تو نہیں پھر کیوں ہے عداوت دل میں

حیدر اس روز سے سب تاب و تواں بیٹھ گئے
اُٹھنے جس دن سے لگا دردِ محبّت دل میں

ہم نے کچھ سمجھا تھا لیکن ہو کا عالم ہے وہاں — کیا پشیمانی ہوئی ہے لامکاں کو دیکھ کر
اعتبارِ زندگی ہے اک فریبِ اعتبار — سب اثر میں آتے ہیں نام و نشاں کو دیکھ کر
اب کے ایسا انقلاب آیا ہے باغِ دہر میں — خود خزاں بھی رو رہی ہے گلستاں کو دیکھ کر
دینے والے کا تو کر اندازہ اور خود کو نہ دیکھ — مانگ روزی شوکتِ روزی رساں کو دیکھ کر

زندگی بھر دل میں حیدرؔ شیرِ یزداں کی ہو یاد　　موت آئے تو علی کے آستاں کو دیکھ کر

جلوۂ غزنوی عیاں ہے نگہِ ایاز میں　　جذب کسی کا ہے نیاز آج کسی کے ناز میں
میری نگاہِ حق نمود بن گئی وحدت الوجود　　قید ہیں سیکڑوں شہود میری حدِ مجاز میں
عشق نے کھو دیا بھرم، آہ رہی نہ تابِ غم　　حسن کو تیرے بیش و کم ہم نے رکھا تھا راز میں
تیر نگاہِ ناز کا، چُبھ کے جگر میں رہ گیا　　کوئی علاج ہی نہ تھا قدرتِ چارہ ساز میں
اس پہ درود اور سلام لے لیا میں نے کس کا نام　　مل گیا مجھ کو اک مقام بے خودیٔ نماز میں

حیدرِ بے قرار کی ہے یہی حسرتِ دلی
زندگی گذرے یا علی آپ کے پائے ناز میں

جورِ بے حد میں بھی اندازِ کرم ملتے ہیں　　تیرے دیوانے جو آسودۂ غم ملتے ہیں
کفر و ایماں کا محبت میں کوئی فرق نہیں　　یہ وہ مرکز ہے جہاں دیر و حرم ملتے ہیں
منزلِ غم سے بھی آگے ہیں وفاؤں کے حدود　　رہروِ عشق اسی موڑ پہ کم ملتے ہیں
بہت اونچا ہے ترے در کے سائل کا مقام　　سرنگوں ہوتے ہیں جب اہلِ کرم ملتے ہیں
جام خالی نہیں لیتے کبھی مے نوش ترے　　توڑ دیتے ہیں اگر ساغرِ جم ملتے ہیں

حیدرؔ آسان تو ہے منزلِ عارض کا خیال
لیکن اس راہ سے تو زلف کے خم ملتے ہیں

---

(۱۱) **نجم**

مرزا تجمل حسین آفندی نجمؔ تخلص، آگرہ میں تولد ہوئے اور حیدرآباد آکر بس گئے۔ آپ کے خاندان میں چار پشتوں سے شاعری چلی آرہی ہے۔ نجمؔ بارہ سال کی عمر سے شعر گوئی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے والدِ محترم بزمؔ آفندی سے فنِ شاعری میں استفادہ کیا، اب ایک کہنہ مشق، قادر الکلام شاعر ہیں، قدیم مکتبِ خیال سے آپ کا تعلق ہے مگر اس کے باوجود موجودہ شعر و ادب کے تقاضوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں، الفاظ کی بندش، محاورہ کی برجستگی، اندازِ بیان کی نُدرت، مضمون آفرینی، رمزیت اور

سوز و گداز آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ نظم و نثر کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

پیامِ حق پہ تیغِ ستم سُنانا تھا
یہ وار بھی دلِ قاتل پہ کر کے جانا تھا
بھری بہار تھی پھولوں میں آشیانا تھا
میں سوچتا ہوں حقیقت تھی یا فسانا تھا
نگاہ پھیر لی فطرت نے حسن دے کے فقط
یہ جبر عشق تمھیں آدمی بنانا تھا
جو ہار بیٹھے تھے ہمت وہ اب کدھر جاتے
خیال و خواب کی منزل ہی اِک ٹھکانا تھا
رہِ وفا میں۔ بڑا بول کوئی کیوں بولے
کہاں گئے وہ جھنیں میرے ساتھ آنا تھا
قدم قدم پہ خطا کی ہے ابنِ آدم ہوں
نئے گناہ مگر سلسلہ پُرانا تھا

میں نجمؔ حال کا مفہوم ہی سمجھ نہ سکا
مری نظر میں گذرتا ہوا زمانا تھا

ہزار مرحلوں سے زندگی گزر آئی
قدم اُکھڑ گئے جب راہ راست پر آئی
بلائے عشق ہزاروں کی جان پر آئی
نجاتِ خلق کی اِک آرزو نہ بر آئی
عذاب ہوگئی راہِ ثواب ارے توبہ
ہزار بار طبیعت گناہ پہ بر آئی
بشر وہ کیا ہے اگر چاند تک پہنچ نہ سکے
زمیں پہ جس کے لیے چاندنی اُتر آئی
یہ دُور وہ ہے کہیں سے جواب تک نہ ملا
ہر ایک در پہ محبّت سلام کر آئی

یہ موت ہوگئی اے دوست زندگی نہ رہی
جو دل میں کوئی تمنّا بُری بھلی نہ رہی
ہوئی تھی خاک سے پاک اور خاک بھی نہ رہی
وہ مشتِ خاک جو مفہوم آدمی نہ رہی
صلہ کچھ اس کے سوا نجمؔ کو نہیں منظور
اگرچہ ذریعۂ عزّت یہ شاعری نہ رہی

عید اس کی ہے محبت جس کو سوز و ساز دے
عید اس کی ہے جسے احساسِ غم آواز دے
جس کا ذرّہ بے سر و ساماں کا ہے ساماں طراز
جو غریبوں سے گلے ملنا سمجھتا ہو نماز
جس کا دل ہو مستِ عشرت ایک آہِ شکر میں
عید ہو جس کی غریبوں کی نگاہِ شکر میں
علم ہو جس کا اساسِ فخر اس کی عید ہے
جس کی خودداری لباسِ فخر اس کی عید ہے

ے علامہ نجم آفندی کا ۱۹۷۷ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔

جس کے سر پہ کج ہو آئین صداقت کی کلاہ　　بے تکلف جو زمانے سے ملاتا ہو نگاہ

---

(۱۲) **جذب**

رگھو پندر راؤ نام اور جذب تخلص ہے۔ ذات کے برہمن ہیں کنڑی مادری زبان ہے۔ مگر اردو میں خاص دلچسپی ہے۔ صوفی مشرب ہیں ہندو ویدانت کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ اس طرح تصوف اور ویدانت کو ملا کر رباعی موزوں کرتے ہیں۔ اب تک دو تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کلام میں اثر ہے۔ ان کی رباعیوں میں اخلاق اور نصیحت کے انمول نگینے ہیں۔ کلام صاف اور عام فہم ہوتا ہے۔

اخلاق کو تن سے ہے اگرچہ نسبت　　دونوں میں بہت فرق ہے لیکن حضرت
تن ہے کہ بہت جلد فنا ہوتا ہے　　قائم رہتی ہے انتہا تک سیرت

رہتا ہے کوئی بڑوں کی قربت میں اگر　　پاتا ہے وہ جذب منفعت ہی اکثر
دیکھا نہیں کیا تم نے کہ چھوٹی سی بیل　　بڑھتی ہے درخت کا سہارا لے کر

کر صدق و خلوص سے خدا کو سجدہ　　ہے شرک ہوس کو، یا ہوا کو سجدہ
جذب اس سے زمیں کو زلزلہ آتا ہے　　کرتا ہے زمیں پہ جو ریا کو سجدہ

---

(۱۳) **خوشتر**

بشن سنگھ نام اور خوشتر تخلص۔ راجپوت خاندان سے ہیں۔ زیرک مرحوم سے تلمذ حاصل کیا۔ نظم اور نثر دونوں میں مہارت ہے۔ ناول بھی لکھتے ہیں۔ زیادہ تر غزل موزوں فرماتے ہیں۔ نظم نگاری کی بھی مہارت ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

میں اک تڑپ میں کروں لاکھ بجلیاں پیدا　　اگر میری یہی بے تابیاں رہیں برسوں
تیری فغاں میں اثر ہو ابھی سے کیا معنی　　کہ مشق چاہیے تجھ کو دل حزیں برسوں

رنگ محفل میں جماتے ہیں وہ یکتائی کا　　لو ہوا شوق انھیں انجمن آرائی کا

ساتھ چھوٹے نہ رُخِ یار سے رعنائی کا — حُسن کے ہاتھ میں دامن رہے زیبائی کا

---

(۱۴) آفت

جمشید جی پستن جی صاحب، پارسی قوم کے خوش فکر شاعر ہیں۔ آبکاری کے تاجر ہیں۔ غزل گوئی میں مہارت ہے۔

اہلِ محشر سے ہمیں کچھ بھی تعلق نہ رہا — دل نے فتویٰ دیا جب سے تری یکتائی کا

آہ کے ساتھ دھواں اب تو نکلتا ہے مگر — دل نکل جائے گا اک دن یونہی شیدائی کا

ہمہ ہنگامۂ جوشِ تکلم بے زبانی ہے — سراپا حشر ساماں طرزِ آشفتہ بیانی ہے

رہے دنیائے دوں میں آدمی دُنیا سے بیگانہ — مذاقِ فطرتِ حُسنِ اصولِ زندگانی ہے

جو تھے اہلِ وفا ان کو زمانہ ہوگیا مر کر — بس اک گزری ہوئی بات اب محبت کی کہانی ہے

دلِ سرمایہ دارِ آرزو منت کشِ ارماں — ہوس زا کس قدر یہ پیکرِ دُنیائے فانی ہے

ہماری سعیٔ لاحاصل تھی اک سرمایۂ لذت — خلافِ جذبۂ فطرت حصولِ کامرانی ہے

جہانِ رنگ و بو دامِ فریبِ زندگی آفت — مآلِ کارِ ہستی صرف مرگِ ناگہانی ہے

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ساقی نے دی شراب — مستی رہین بادہ نہیں بادہ خوار کی

شورشِ دل نے بڑھایا حُسن کی توقیر کو — ورنہ کیا تھا حُسن میں ذوقِ نظر کے واسطے

قید سے بڑھ کر مجھے آفت ہے بے بال و پری — ... ...

---

(۱۵) رہبر

حکیم ست گرو پرشاد صاحب والا جاہی نام اور رہبر تخلص، کائستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ شاعری میں اچھی مہارت حاصل ہے۔ جناب زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔ اگرچہ غزل گوئی میں قدیم اساتذہ سخن کی پیروی کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اخلاقی مضمون بھی ہوتے ہیں۔

تفوق خاکساری کے سوا حاصل نہیں ہوتا — بلندی پر پہنچنے کا ذریعہ ہے تو پستی ہے

نرالا ہے عجب کچھ قاعدہ بازارِ الفت کا — گراں جنسِ وفا ہے تو متاعِ جور سستی ہے

ہمیں عاصی ہیں اس کے مستحق واعظ سرِ محشر گنہگاروں پہ ہی اللہ کی رحمت برستی ہے

---

(۱۶) **منظور**

سید علی نام اور منظورؔ تخلص۔ نظم نگاری اور غزل گوئی میں کافی دستگاہ حاصل ہے۔ اردو کا کوئی معیاری رسالہ ایسا نہ ہوگا جس میں سید علی منظور کا کلام شائع نہ ہوتا ہو۔ وہ بڑے پُرگو شاعر ہیں۔ واصل شمسی اور المتقی سے مشورہ لیتے رہے ہیں۔ جدید شاعری میں اچھی مہارت ہے۔ منظورؔ کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی سادگی و پرکاری ہے۔ زندگی کی صحیح ترجمانی منظورؔ کی شاعری کا مقصد ہے۔ اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔
۱۹۵۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

نا امیدی میں بھی رہ رہ کے خیال آتا ہے اب بلایا ہے مجھے اس شوخ نے اب یاد کیا
یہ ہنسی اور بڑھائے گی مرے دل کی تڑپ اپنی دانست میں تم نے تو مجھے شاد کیا

ہے طرب آموز دلِ ذوقِ نگاہ دیدنی مجھ کو ہر اک منظر ملا

میری مستیاں سمجھیں تیری شوخیاں جانیں تو نے کیا لیا مجھ سے میں نے تجھ سے کیا پایا

منظورؔ کی نظم کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس نظم کا عنوان ہے "عالمانہ اور جاہلانہ بے نیازی"

میں ہوں بحر العلوم میں ہوں۔ ہر سمت ہے جس کی دھوم میں ہوں
چرچا مرا کابل و عرب میں شہرت مری ٹونس و حلب میں
زینت دہ مسندِ سلف ہوں روشن کن جادۂ خلف ہوں
اصحاب خرد مرے ثنا خواں ارباب نظر ہیں مجھ پہ حیراں
مقصد مرا حق کی ترجمانی ہیں شارح وحی آسماں

"کلکِ قلم وایں شبِ تار"
"بس معنئ خفتہ کردہ بیدار"

میری نظر و خرد کی حجت آمیزش مذہب و سیاست
ہے فخرِ علم مجھ سے راضی مفتی ہوں کبھی، کبھی میں قاضی
پکی مری دُھن ہے میں ہوں بے لاگ ہے قوم کی میرے ہاتھ میں باگ

سلطاں مری خوشہ چیں پہ حیراں　　شاہی مری درس گہ سے لرزاں
یکساں مرا باطن اور ظاہر　　ہوں میں ہی علوم دیں کا ماہر
پیوند زمینیاں گسستم
نزدیک بآسماں نشستم
شہرت نہیں پائی میں نے ارزاں　　ہر دشمنِ شرع مجھ سے لرزاں
مغرور کا میں نے کفر توڑا　　اس ہاتھ میں دُرّہ اس میں کوڑا
سرکش مرا نام سن کے جھک جائے　　رہرو مجھے دیکھ لے تو رک جائے
ہے گرچہ مرا لباس میلا　　پر چرچا مرا پھر بھی خوب پھیلا
آرائشِ تن کے غم سے ہوں دُور　　آسائشِ جاں ہے مجھ کو منظور
از دولتِ علم سر فرازم
در مال و مناں بے نیازم

طلسمِ مجاز

(۱)

یہی نگاہ، یہی "ساز باز" رہنے دے　　مرے لیے تو درِ فتنہ باز رہنے دے
بصیرتوں سے مجھے بے نیاز رہنے دے　　حقیقت اپنی بہ حدِ مجاز رہنے دے
مری نگاہ کو نظارہ باز رہنے دے

(۲)

جو عشق و حسن میں ہے امتیاز رہنے دے　　یہی مشاہدہ اے دل نواز رہنے دے
بڑھائے جا یوں ہی کیفِ نظر بڑھائے جا　　تو حلقہ ہائے نگاہِ ہوس پرست میں آ
تصوّراتِ دلِ پاکباز رہنے دے

(۳)

رہین "حسرتِ راز و نیاز" رہنے دے　　انھیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے
میں چاہتا ہوں اسی طرح سے رہوں ناکام　　متاعِ بلبل و پروانہ سے مجھے کیا کام
مرے لیے ہوسِ سوز و ساز رہنے دے

(۴)

انھیں حدوں میں مجھے سرفراز رہنے دے | مری نگاہ کا دامن دراز رہنے دے
گناہ میرے لیے کیوں ہو پھر نظر بازی | ترے خیال سے لے جاؤں میں اگر بازی

کچھ اور دن ابھی حکم جواز رہنے دے

(۵)

"معاملہ" کی خموشی کو راز رہنے دے | فروغِ آئینۂ دیدہ ساز رہنے دے
بنا دیا تری شوخی نے مائلِ دیدار | خدا گواہ نہ تھا میں تو سائلِ دیدار

مجھے قریبِ حریمِ مجاز رہنے دے

اب ہم اس عہد کے جوان ترقی پسند شعراء کا تعارف کراتے ہیں جنھوں نے جدید شاعری میں اچھا مقام حاصل کرلیا ہے۔

(۱۷) فضل الرحمٰن

فضل الرحمٰن صاحب کا کوئی تخلص نہیں ہے۔ آپ کے والد حکیم عبداللہ صاحب مدرسۂ طبیہ کے صدر تھے اور سختی سے مذہبی پابندی کے لحاظ سے مشہور تھے۔ فضل الرحمٰن کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی، چادرگھاٹ ہائی اسکول کے بعد نظام کالج میں تعلیم پائی اور پھر پونہ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اولاً سٹی ہائی اسکول میں مدرس ہوئے تھے۔ ملازمت سے علیحدگی اختیار کی، اس کے بعد مختلف دفاتر کی ذمہ دارانہ خدمات انجام دیں۔ ناظم لاسلکی کے بعد نائب ناظم تعلیمات اور پھر ناظم تعلیمات بنے مگر اب قبل از وقت وظیفہ حاصل کرکے اطمینان کی زندگی بسر کررہے ہیں

فضل الرحمٰن صاحب ڈرامہ نگار بھی ہیں جس کا تذکرہ اس کے مقام پر آئے گا۔ آپ کے کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقشِ حیات" شائع ہوچکے ہیں، فضل الرحمٰن صاحب بڑے متین اور سنجیدہ ہیں مگر ان کی طبیعت اتنی ہی شوخ اور مزاحیہ ہے۔ پاکیزہ ذوق ہے، وہ بہترین نقاد ہیں۔ ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی بحور کی موزونیت، تخیل کی لطافت اور مضامین کی بلندی قابلِ داد ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند شعراء میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ ترقی پسند ادب کے ایک نئے باب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کا کلام لحن اور ترنم کی لطافتوں کا گنجینہ ہے۔ غلام یزدانی صاحب ان کو ان کی بلند پایہ شاعری اور بہترین نقادی کی بناء پر دکن کی اردو شاعری کا میتھو آرنلڈ قرار

دیتے ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

من سے کہتے من کی باتیں | کٹتی ہیں تنہائی کی راتیں
راگنی ہیں کچھ دھیمی سُریلی | دل میں دُھن ہونٹوں پہ خموشی
خلوت میں مجلس کا سماں ہے | نغموں کی محفل بزمِ جاں ہے
سینے میں میٹھی دھڑکن پیدا | باہر عالم خموشی کا
جگ پہ اندھیرا سا چھایا ہے | جل تھل پر اک پردہ ہے
جیسے صنم ایک سنگ سیہ ہے | نقش مجسم رنگِ سیہ کا
آنکھوں میں دل کا درپن ہے اب | کس موہن کا درشن ہے اب

جگت دیوی

کبھی دھوپ کے روپ میں مُسکرانا | کبھی چھپ کے بدلی میں آنسو بہانا
شعاعوں سے سورج کی ماتھے پہ افشاں | شفق سے ہتھیلی پہ مہندی لگانا
ستاروں سے مکھڑا چھپانے کی خاطر | پھر اودی گھٹاؤں کی آنچل بنانا
سبھا میں کبھی شہر والوں کی آکر | لجائی نگاہوں سے بجلی گرانا
کبھی قتل کرنا، جلانا کبھی پھر | کبھی یوں ہی شورِ قیامت مچانا
ادھر دور رہنے کی آنکھوں سے کوشش | ادھر دل میں رس بس کے شوخی دکھانا
ادھر ڈھونڈھنا جیلے انجان بن کر | ادھر پیت کی ریت من کو سکھانا
دکھا کر کبھی بے رُخی زندگی بھر | دل و جاں کو سو سو طرح آزمانا

غرض اس کی چاہت کا کوئی بھروسہ
نہ کچھ بیر اور دشمنی کا ٹھکانا

"ہنگامۂ ہستی" کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

یہی دنیا تھی، یہی گرمیِ بزمِ عالم | یہی گنتی، یہی ہنگامۂ نسلِ آدمؑ
رنج و راحت تھے اسی طرح جہاں میں توام | دلِ شاداں بھی یہی تھا یہی چشمِ پُرنم

وادیِ نیل میں یا سامری گلزاروں میں
یا بلستان کے آراستہ بازاروں میں

ہند کے مندروں میں چین کے درباروں میں
نقشِ اُلفت تھا بہر رنگ دلوں پر قائم

ساعتِ موت یہی، زیست کے دن رات یہی
حسن اور عشق کی دزدیدہ مُلاقات یہی

عہد و اقرار یہی حرف و حکایات یہی
گرچہ موجود نہ تھے رُوئے زمیں پر ہم تم

راہ گیروں کی سرا منزلِ فانی ہی سہی
چھاؤں ڈھلتی ہوئی بہتا ہوا پانی ہی سہی

سربسر ابرو ہوا سیل و روانی ہی سہی
اس روانی پہ بھی ہے منظرِ ہستی دائم

یہ پہاڑ، یہ ہیریں، یہ کھیت، یہ بن
یہ زمیں جو ہے جلوؤں میں رشکِ چمن

وہ ستارے جو پھول ہیں روشنی کے
وہ فلک جو ہے نور کا باغِ عدن

یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمیں
وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں

یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

یہ ہوائیں جو باغوں میں مست ہیں سب
یہ درخت جو شیشہ بدست ہیں سب

یہ بہار اور نکہت و رنگ کی ہے
یہ صراحیِ لالہ یہ جام سمن

یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

۱۸۔ وجدؔ[1]

سکندر علی نام اور وجدؔ تخلص، اورنگ آباد وطن۔ ۱۹۱۴ء میں تولّد ہوئے۔ جامعۂ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ایچ۔ سی۔ ایس میں کامیاب ہو کر سررشتۂ عدالت میں مامور ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ان کو شاعری کا شوق ہے۔ موسیقیت، جدّت، بلند خیالی، عشقیہ سوز و گداز ان کے کلام کی نمایاں

---

[1] وجد کے کلام کے چار مجموعے لہو ترنگ، آفتاب تازہ، اوراق مصوّر اور بیاضِ مریم شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے ان کے انتخاب کلام کی اشاعت بھی عمل میں آ چکی ہے۔

خصوصیات ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "لہو ترنگ" و "آفتاب" شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ غزل اور نظم نگاری دونوں میں دستگاہ حاصل ہے۔ وجد کے پڑھنے کا طرز بڑا دل آویز ہوتا ہے۔ ان کی بیسیوں نظمیں اپنی خصوصیت کے لحاظ سے بہت مشہور ہیں۔ کلام کا نمونہ حسبِ ذیل ایک نظم "نرس" کے عنوان پر ہے:۔

نسیم آتی ہے سب سے بیشتر تیرے جگانے کو — گلوں سے قبل اوس آتی ہے تیرا منہ دھلانے کو
سحر ملبوس تورانی قمر سے مانگ لاتی ہے — تجھے پہنا کے جوڑا کل جہاں پر پھیل جاتی ہے
ہوائیں مست و عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں — ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں
دلِ پژمردہ پاتے ہیں رہائی بے قراری سے — تری آمد نہیں کم آمدِ بادِ بہاری سے
بلا کی دل نشینی ہے تری گفتار نے پائی — تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی
نہاں جذبات مہر و لطف ہیں خدمتگزاری میں — اثر اکسیر کا پنہاں ہے تیری غم گساری میں

نظامِ دہر کو تھا ناز اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پر

اجنٹا پر ان کی متعدد نظمیں ہیں، ایک نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں:۔

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی — تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیل انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا اہلِ جنوں کو حسن کاری کا — اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بے قراری کا — سکھایا گُر اسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے — ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے — کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

"عبدالرزاق لاری" نظم کے چند بند یہ ہیں:۔

باقی کوئی سلطاں کا ہوا خواہ نہیں ہے — ہے کون جو انجام سے آگاہ نہیں ہے
دل کس کا اسیرِ کششِ جاہ نہیں ہے — لاری ہی اکیلا ہے جو گمراہ نہیں ہے
غصّے میں رُخِ تیغِ دو دم چوم رہا ہے
خادم درِ آقا پہ کھڑا جھوم رہا ہے

لڑنے لگے خونخوار مغل قلعہ کے در پر — تیغوں کی چمک سے ہیں در و بام منوّر
کس شیر کی ہمّت سے پریشان ہے لشکر — بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا فوجِ عدو پر
یہ ہاتھ ہے یا دستِ اجل طالبِ جاں ہے
قبضے میں ترے تیغ ہے یا برقِ تپاں ہے

بجلی سرِ اعدا پہ تڑپتی ہے مسلسل — عمروں کے تعیّن کے ہیں پیمانے گھڑی پل
لاشوں کے ہیں انبار زمیں خون سے جل تھل — ہیبت سے پڑی ہے تری افواج میں ہلچل
جس سمت پھرا، شور اُٹھا "جن بچہ آمد"
ہنگام دغا نیست قضا پیش خر آمد

ملبوس ترا خون سے گلنار ہوا ہے — ہر عضو بدن زخم سے بیکار ہوا ہے
یہ ضعف ہے سرتن پہ گرانبار ہوا ہے — قد خون میں ڈوبی ہوئی تلوار ہوا ہے
لے جاتے ہیں گو تجھ کو شہنشاہ کی جانب
نظریں ہیں تری تختِ قطب شاہ کی جانب

شمشیر دکن! تو نے عجب دھاک بٹھا دی — دشمن کو شبِ گور کی تصویر دکھا دی
اے مردِ خدا قدرِ وفا تو نے بڑھا دی — قرباں ترے، مالک کے لیے جان لڑا دی
جب تک یہ نظامِ سحر و شام رہے گا
تاریخ دلیراں میں ترا نام رہے گا

اب بعض غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

حریم عشق کے قابل بنا دیا تو نے — روئیں روئیں کو مرے دل بنا دیا تو نے
یہ سب قصور ہے اے قیس کم نگاہی کا — نظر کو پردۂ محمل بنا دیا تو نے

ہر ایک کامل و ناقص کو رشک ہے مجھ پر — خوشا کہ ناقصِ کامل بنا دیا تو نے
سفینہ ڈوب چکا اب سکوں ہے اے طوفاں — بھنور کو دامنِ ساحل بنا دیا تو نے
بچاؤ اپنے نشیمن کا وجدؔ خوب کیا
کہ بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

رہروِ راہِ محبت کی کوئی منزل نہیں — زندگی ہے عشق حاصل، عشق کا حاصل نہیں
چشمِ ساحل آشنا تجھ سا کوئی غافل نہیں — دیکھ! طوفانِ اجل کی موج ہے ساحل نہیں
ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل — اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں
قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحاں گاہِ کمال — بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں
شعر کے پردے میں رازِ زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا وجدؔ میں قائل نہیں

ادائے خاص سے اک بار کوندا اے بجلی — چمک کے رہ گئی تقدیر آشیانے کی
رہے گا وجدؔ بیاں عشق کا سدا یکساں — بدلتی جائے گی سُرخی فقط فسانے کی

چمک رہا ہے مرا مقدر، بھلا عدو کو کہاں میسر — وہ جلوۂ خاص جس کے رُخ پر نقاب کھلتا ہے برہمی کا

اب "اوراقِ مصوّر" کے نام سے تمام کلام کو دوبارہ شائع کیا ہے۔

---

(۱۹) مخدومؒ مخدوم محی الدین۔ جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ سٹی کالج میں لکچرار بنے پھر مستعفی ہو گئے۔ مزدور کی تحریک کی حمایت اور تائید کی، کچھ عرصہ حیدرآباد سے روپوش رہے، کیونکہ کمیونسٹ تحریک کے

لہ ۲۵ر اگست ۱۹۶۹ء کو مخدوم کا انتقال ہوا۔ ان کا مکمل مجموعۂ کلام "بساطِ رقص" کے نام سے ادبی ٹرسٹ حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ مخدوم کی بعض نظموں کے ترجمے تلگو، ہندی، مرہٹی، بنگالی کے علاوہ انگریزی، روسی، جرمن اور چیک زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

سردار ہیں۔ طالب علمی کے زمانہ سے شاعری سے دل چسپی ہے۔ کلام میں وارفتگی اور بے باکی پائی جاتی ہے۔ ندرت خیال اور دلکش جذبات، نئے مضامین، ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ منظر کشی میں بڑی اچھی مہارت ہے۔ مخدوم ایک انقلابی شاعر ہے۔ اس کی وجہ سے سب سے الگ ہوکر اپنی نئی دُنیا بنالی ہے۔ ان کے کلام میں جمالی اور جلالی دونوں رنگ نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "سرخ سویرا" اور "گلِ تر" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے نظم "طور" کے چند بند۔

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأتِ اظہارِ حرفِ مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز و حیا میں نے
یہیں پہلے سُنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

حیا کے بوجھ سے جب ہر قدم پر لغزشیں ہوتیں
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں
، جفائے راز کی پُر لطف باہم کوششیں ہوتیں
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

بلائے فکر و فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرورِ سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی
ہماری خلوتِ معصوم رشکِ طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزلخواں حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

مخدوم کے جلالی رنگ کے لیے باغی، جنگ، مشرق، موت کا گیت، جوبلی گھر اور زلفِ چلیپا وغیرہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ جن میں ملک کی حالت کی المناکی اور دردانگیز تصویریں طیش اور غضب کی آتش فشاں زلزلہ خیز قوتیں نظر آتی ہیں۔ نظم "مشرق" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی تازگی عقل و فراست کا مساں
وہم زائیدہ خدا دل کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
ایک ننگی لاش بے گور و کفن لتھڑی ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں، ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اِک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

ایک تاتاری شاعر جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ملاحظہ ہو :-

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
استالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا، اخوت کا، محبت کا خمیر
وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں

.. ..

برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

مسافر

ترے ہجر میں کھو گئے اے مسافر   مسافر چلے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے اے مسافر   مسافر چلے چل

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل ، چلے چل ، چلے چل

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے

بہر حال چل رات کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل ، چلے چل ، چلے چل   چلا جا رہا ہے

سمجھ سوت کی وادیوں سے گذرتا   چلا جا رہا ہے

سحر کے تعاقب میں گرتا اُبھرتا   چلا جا رہا ہے

تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر،

چلے چل ، چلے چل ، چلے چل

غزل کا نمونہ :-

پھر بُلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے
تم بھی آجاؤ کہ باتیں کریں پیمانوں سے

رُت پلٹ آئے گی اِک آپ کے آجانے سے
کتنے افسانے ہیں سنتے ہیں جو دیوانوں سے

تحفۂ برگ گل و باد بہاراں لے کر
قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

بدلا بدلا سا نظر آتا ہے دُنیا کا چلن
آپ کے ملنے سے ہم جیسے پریشانوں سے

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسّم ہیں ندیم
مُسکراتے ہوئے ٹکراتے ہیں طوفانوں سے

پھر چھڑی رات ، بات پھولوں کی   رات ہے یا برات پھولوں کی

پھول کے ہار، پھول کے گجرے   شام پھولوں کی رات پھولوں کی
یہ مہکتی ہوئی غزل مخدوم
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

---

(۲۰) **میکش** صاحبزادہ محمد علی خاں میکش، حیدر آباد کے شاہی خاندان سے میکش کو تعلق تھا اس لیے صاحبزادہ کے لقب سے موسوم تھے۔ حیدر آباد میں تولد ہوئے اور جامعۂ عثمانیہ میں تعلیم پائی۔ نشرگاہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے مگر زندگی نے وفا نہیں کی۔ نوجوانی میں ۱۹۴۸ء میں دنیا سے چل بسے۔ مگر تھوڑی سی مدت میں ہی انھوں نے شاعری میں اچھا نام پیدا کیا۔ نظم نگاری اور غزل گوئی میں اپنے کلام سے بہترین نقش چھوڑ گئے۔ میکش کا کلام حسنِ خیال، لطف گفتار، بلندیٔ تخیل کے لحاظ سے قابلِ داد ہے ان کے کلام میں موسیقیت، غنائیت اور ترنّم پایا جاتا ہے۔

ان کی نظموں کا مجموعہ "گریۂ وتبسّم" کے نام سے ادارہ ادبیات اُردو سے شائع ہوا ہے۔

جوانی کا گیت

مَیں اپنے ذوقِ آرزو سے زندگی بناؤں گا   شرارِ شوق کی تڑپ میں شمعِ دل جلاؤں گا
جہاں کی سختیوں کو کھیلتے ہوئے اُٹھاؤں گا   ترقیوں کی شاہراہ پر قدم بڑھاؤں گا
عمل کے گیت گاؤں گا
جہانِ نو بساؤں گا
ابھی تو مَیں جوان ہوں

ربابِ دل میں مرتعش ہے نغمہ زارِ زندگی   رگوں میں بہہ رہی ہے ایک جوئبارِ زندگی
نفس کی بے قراریوں میں ہے قرارِ زندگی   قدم قدم پہ لاکھ مشکلیں ہوں مسکراؤں گا
عمل کے گیت گاؤں گا
جہان نو بساؤں گا
ابھی تو مَیں جوان ہوں

ے "گریۂ وتبسّم" کے علاوہ میکش کے کلام کے دو اور مجموعے "نوید" اور "میخانہ" شائع ہو چکے ہیں۔

ہیں جستجو کی بے قراریاں نظر کے نور میں
ہے انکسار کی جھلک شباب کے غرور میں
چھپی ہوئی ہے اک تڑپ سکون کے وفور میں
میں زندگی کی وسعتوں پہ کیف بن کے چھاؤں گا

عمل کے گیت گاؤں گا
جہانِ نو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

پسِ پردہ

رنگ و بو کے متوالے اے حسن و نور کے دیوانے
ان پردوں کے پیچھے کیسے محشر ہیں تو کیا جانے
کتنے دلوں کے داغ چھپے ہیں جھل مل جھل مل تاروں میں
ماضی کے کتنے لمحے گم ہیں رنگین نظاروں میں

کتنے گناہوں کی تاریکی ہے ان کالی راتوں میں
کتنے آنسو سہمے ہوئے ہیں رومانی برساتوں میں
کتنی بہاریں توڑ رہی ہیں دم ان ہنس مکھ پھولوں میں
کتنے طوفاں جھول رہے ہیں شاخِ گل کے جھولوں میں

شبنم جو آسودہ نظر آتی ہے کنول کے سفینے میں
کتنے طوفاں انگڑائی لیتے ہیں اس کے سینے میں
کتنے بے بس پیاسوں کے ٹوٹے ارماں ہیں گلابی میں
کتنے بھوکوں کی آہیں ہیں کھیتوں کی شادابی میں

ڈوبتے ہیں گل پاش شفق کی رنگینی میں شام و سحر
لیکن اس میں کتنی غمگیں روحوں کا ہے خونِ جگر
ٹوٹتے تاروں کو لے کر کتنی نگاہیں گرتی ہیں
انسانوں کے روپ میں کتنی زندہ نعشیں پھرتی ہیں

برکھا رت ماتم کرتی پھرتی ہے اب ویرانوں میں
چاندنی راتیں آتی ہیں کھو جاتی ہیں قبرستانوں میں

حُسن ملے گا نظاروں میں اب وہ گھڑیاں آئیں گی
اپنے ہاتھوں اپنی بہاریں واپس لائی جائیں گی

اب میکش کی غزلوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
جھلک رہا تھا تبسم بھی ساغرِ مے میں پھر ایک بار اسی طرح مسکرا کے پلا
شراب نغمہ بھی بہتی رہے فضاؤں میں کلام حافظ و خیام گنگنا کے پلا
ترا خیال ہے مجھ کو کبھی نہ بہکوں گا تری قسم مجھے سو بار آزما کے پلا
کچھ امتیاز رہے میکدے میں میکش کا
لبوں سے اپنے ہر اک جام کو لگا کے پلا

میری محویت کو گرما کر ہنسے برق سی ہونٹوں پہ لہرا کر ہنسے
ہنس کے دیکھا دیکھ کر تڑپا دیا دیکھنے والے کو تڑپا کر ہنسے
کچھ تکلف سے گرائی برق بھی جب ہنسی آئی تو شرما کر ہنسے
چاندنی کرنوں میں پھونکی روح سی مستیاں منظر میں بکھرا کر ہنسے
کھو دیا حسنِ تکلم میں مجھے اپنے منہ سے پھول برسا کر ہنسے
دستِ نازک میرے شانے پر رکھا بجلیاں رگ رگ میں دوڑا کر ہنسے
میکشِ خاموش نے مانگی جو مے دُور سے ساغر کو دکھلا کر ہنسے

بے زار ہو گئے بہار و خزاں سے ہم
اُڑتے ہیں اب قفس کی طرف آشیاں سے ہم
قسمت نے اپنے ساتھ تھپک کر سُلا دیا
کچھ چونکنے ہی والے تھے خوابِ گراں سے ہم
گم گشتگی میں منزلِ مقصود مل گئی
اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے کارواں سے ہم

مری گردش سے گردش میں رہا بختِ فلک اکثر
اٹھائی ہے بلندی نے مری پستی سے زک اکثر
سکھائی ہے جن آنکھوں نے محبت کی تڑپ مجھ کو
ان ہی آنکھوں میں دیکھی ہے محبّت کی جھلک اکثر
بلندی کے ستارے میری پستی سے نہ منہ پھیریں
شعاعِ مہر بن جاتی ہے ذرّوں کی چمک اکثر

دل اسیرِ شباب ہے پیارے — زندگانی عذاب ہے پیارے
تیری ہر بات مے کدہ بردوش — تو مجسّم شراب ہے پیارے

وہ آرہا ہے میکشِ مخمور جھومتا — پوچھیں گے میکدہ کا پتہ اس جواں سے ہم

---

(۲۱) ارمان

شنکر موہن لال نام اور ارمانؔ تخلص، جامعۂ عثمانیہ سے طیلسان حاصل کیا ہے۔ ہندی تخیل کے ساتھ اُردو شاعری کرتے ہیں۔ قدیم طرز کے جذبات کو جدید سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ زبان صاف اور سُتھری ہے۔ خیالات میں اُلجھاؤ نہیں ہوتا۔ نظمیں اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔

بہار

پھر آیا موسمِ گل عاشقوں کی قدر دانی سے
زمیں خود ہوگئی ہے آسمانی گل فشانی سے
نچھاور کررہے اس قدر گل سبز پوشاکاں
کہ گلچیں بول اُٹھا میں باز آیا باغبانی سے

بہار آتے ہی گلشن میں عجب مستی سی چھائی ہے
کہ بوئے گل سے بڑھ چڑھ کر شرابِ ارغوانی سے
ہوا ہے سُرخ غصّہ سے اگر لالہ چنبیلی پر
تو نرگس دیکھتی چمپا کو ہے کس دل ستانی سے

یہ ہے موسم کی حالت اور پھر ایسا بیاں اپنا
نہ کیوں ارمان پھولوں انتہائے شادمانی سے

ایک ہندی عورت عالمِ خیال میں

میرے پریتم آؤ آؤ بن کے جوانی مجھ پر چھاؤ
آؤ مست فضائیں لے کر بھولی بھالی ادائیں لے کر
آؤ، آؤ میرے پریتم

رات کو چھپ کر گاؤں میں آؤ تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں آؤ
آؤ بھیگی بھیگی فضا میں کالی کالی مست گھٹا میں
آؤ، آؤ میرے پریتم

دھندلے دھندلے سپن میں آؤ میرے مست احساس پہ چھاؤ
آؤ لب پہ تبسّم لے کر ارمانو کا تلاطم لے کر
آؤ میرے بھولے پریتم

پھولوں کی گھمبیر کھپا میں برکھارُت کی مست ہوا میں
نینوں کے رس تم کو پلاؤں پریم کے نغمے گا کے سناؤں
آؤ اداؤں والے پریتم

بن میں پپیہا گونج رہا ہے پتّہ پتّہ مست ہوا ہے
آؤ لوٹیں ہم بھی بہاریں جھُولا جھولیں گائیں ملہاریں
کالی آنکھوں والے پریتم
آؤ بھولے بھالے پریتم

دیکھو کیا ہے حُسن کی مایا اک ہی نظر میں ہوش اُڑایا
اس نے سارے جگ کو پھنسایا ہنستے ہنستے مجھ کو رُلایا
دل میں میرے خاک بنایا

غزل

اب کہاں وہ لطفِ عیشِ سرمدی تیرے بغیر
اک عذابِ مستقل ہے زندگی تیرے بغیر
صحنِ گلشن ہو، لبِ دریا ہو یا مے خانہ ہو
بجھ نہیں سکتی کہیں دل کی لگی تیرے بغیر

کون کہتا ہے مری حالت میں تبدیلی ہوئی
تھی وہی جانے سے پہلے، ہے وہی آنے کے بعد
جب ہوا بے دل تو پردہ غیریت کا اُٹھ گیا
سوز میں بھی ساز آجاتا ہے دل جانے کے بعد
یوں تو سب ہی آتے جاتے ہیں سرائے دہر میں
ہے وہی اک مرد جو جی جائے مر جانے کے بعد
یہ جہاں ارماں کبھی منزل گہِ عشرت نہیں
یہ کھلا ہے راز ہم پر ٹھوکریں کھانے کے بعد

اب تو خدا کے واسطے جلوہ مجھے دکھائیے
جان بھی لب پہ آگئی آپ کے انتظار میں
یادِ جمال ہم نشیں تازہ ہوئی ہے خود بخود
ضبط کروں تو کس طرح دل نہیں اختیار میں
رنگِ چمن کو دیکھ کر جان میں جان آگئی
غنچے کھلے تو کھل گئی دل کی کلی بہار میں

جو مقدر میں لکھا ہے وہ ملے گا بے شک
ہاتھ پھیلا کے کسی اور سے کہنا کیا ہے

(۲۲) بدرؔ ابوالکلام بدرالدین نام اور بدرؔ تخلص۔ جامعۂ عثمانیہ کے اوّلین دور کے گریجویٹ ہیں۔ پھر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹری کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ شاعری میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ غزل گوئی اور نظم نگاری میں بڑی عمدہ دستگاہ حاصل ہے۔ حسن وعشق اور رومان کے رنگیں مزاج رنگین خیال شاعر ہیں سلاست اور روانی ان کے نغموں کی جان ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام بدرؔ نے رامائن کے کئی کانڈ (باب) کو نہایت سلیس اُردو میں نظم کیا ہے۔ بدرؔ کا انتقال ہو چکا ہے۔

جراثیم میں بھی طرح داریاں ہیں — قضا میں قضا کی یہ چنگاریاں ہیں
یہ افشاں سے ہیں کاکُلِ عنبریں کے — نثر بچہ یہ تارے ہیں چرخ بریں کے
انہیں پالنا ناز برداریوں سے — بڑی کاوشِ اور بیداریوں سے
بہت تجربوں سے یہ پائے ہوئے ہیں — یہ تحقیق کے گل کھلائے ہوئے ہیں
یہ لڑیاں ہیں ان کی کہ موتی کے دانے — انہیں شکل پیاری عطا کی خدا نے
یہ افعی ہیں یا موت کے نامہ بر ہیں — ستم کوشِ فطرت کے تیرِ نظر ہیں
رگ و ریشہ گویا ولایت ہے ان کی — قضا کا ہراول سرایت ہے ان کی
کھلے بندوں کی کوئی، کوئی گھات میں ہے — سکندر کوئی بحرِ ظلمات میں ہے
وہ جیتا بچے کب جو بسمل ہے ان کا — لعابِ دہن زہرِ قاتل ہے ان کا
ہر اک فرد ان میں کا رنگیں ادا ہے — اگرچہ ہے ظالم، بڑا دل ربا ہے
رگِ جاں کا دشمن یہی نازنیں ہے — جلالِ مشیئت بھی کتنا حسیں ہے

ایک طویل نظم ملاحظہ ہو:۔

تو کہ بیٹھی ہے مسہری پہ نکالے گھونگھٹ — یوں نہ گردن کو جھکا لے مری پاکر آہٹ
نیچی نظروں سے ذرا دیکھ تو گھونگھٹ کو اُلٹ — میں سناؤں تجھے مٹ جائے جو دم بھر تری ہٹ

دے دیا عشق وغمِ دہر کا چھینٹا تو نے
پھول دے کر مجھے کانٹوں میں گھسیٹا تو نے

چھوڑا بچپن نے ہمیں عقد کا تحفہ دے کر — سر پہ دستار بندھائی ہے تو سودا دے کر

کس مصیبت میں پھنسایا ہمیں دُنیا دے کر　　　باب ابجد کا ہوا ختم تمنّا دے کر

آ نکالیں وہ عبارت کہ تھی دل میں ملفوف

آ کر اب مل کے پڑھیں عشق و محبّت کے حروف

بھولی لڑکی تجھے معلوم ہے دُنیا کیا ہے　　　گھاٹیوں سے کہیں دشوار گذر اس کا ہے

سر پہ ٹھلیا ہے بڑی دُور مگر چشمہ ہے　　　ساتھ میں بھی تو چلوں گا تجھے پروا کیا ہے

باندھ ہمّت وہ چٹانوں کو بھی جو نرم کرے

سرد مہریِ جہاں اور بھی دل گرم کرے

سُن مری موہنی اے سانوَلے مکھڑے والی　　　دل کے بہلانے کو خالق نے تھی مورت ڈھالی

میں تھا بے چین اکیلا مجھے یہ دے ڈالی　　　پھر تو وہ پیار کی باتیں ہوئیں بھولی بھالی

سر بہ سجدہ ہیں ملک جھوم رہی ہے فطرت

دیکھتا ہے ہمیں کس پیار سے ربّ العزّت

غزل

غم جو چھا جاتا ہے دل پر تو برس جاتا ہوں

اے فلک تُو نے سکھایا مجھے نیساں ہونا

کوچۂ یار میں آ دیکھنا منظور ہے گر

خاک کے فرش کا اورنگ سلیماں ہونا

ذرّے ذرّے میں نظر آتے ہیں تیرے جلوے

چمنِ دہر کی قسمت تھی پرستاں ہونا

---

(۲۳) اشک

جلال الدین نام، اشک تخلص، جامعۂ عثمانیہ کے طیلسان شاعری کا بڑا اچھا مذاق حاصل ہے۔ نظمیں اور غزلیں دونوں موزوں کرتے ہیں۔ تخلص کی طرح مزاج بھی نرم اور نازک ہے۔ درد اور احساس ان کی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔ سلطانہ رضیہ، برسات، گوند شہزادی، نغمۂ رنگیں وغیرہ ان کی نظمیں کافی مقبول ہو چکی ہیں۔

سلطانہ رضیہ میدان جنگ میں

ہاتھ میں تیر کماں اور کمر میں تلوار
دوش پر زلف سیہ گوش میں دُرِّ شہوار
زیرِ راں اسپ سُبک سیر و صرصر رفتار
تمتماتے ہوئے گرمی سے وہ دونوں رُخسار

آج میدان میں رضیہ کی سپہ داری ہے
کچھ انوکھی یہ زمانے سے طرح داری ہے

گرد آلودہ جبیں ہونٹوں پہ آہِ سوزاں
اثرِ رنج و الم دیدۂ گریاں سے عیاں
دولتِ حسن پہ اپنے جو کبھی تھی نازاں
آج میدان میں آئی ہے وہ نالاں گریاں

پیچ تقدیر کا ہے گیسوئے پُرپیچ اسے
کام دُنیا کے نظر آتے ہیں سب ہیچ اسے

آہ بگڑی نظر آتی ہے زمانہ کی ہَوا
اپنی ہی فوج کے سردار ہیں سرگرم جفا
کل وفادار تھے جو، آج وہ دیتے ہیں دَغا
لُٹ رہی ہے سرِ بازارِ جہاں جنس وفا

ظلمت یاس کی چھائی ہیں گھٹائیں سر پر
کس غضب کی ہوئی نازل ہیں بلائیں سر پر

یاس انگیز زمانہ کی ہے حالت کیسی
آنکھ جھپکاتے پلٹ جاتی ہے قسمت کیسی
سر پہ رضیہ کے ہے آئی ہوئی آفت کیسی
اس کی صورت سے عیاں آج ہے حسرت کیسی

جو وفادار تھے غدار نظر آتے ہیں
تختِ شاہی کے طلب گار نظر آتے ہیں

گونڈ شہزادی کے دو بند ملاحظہ ہوں:۔

غاب آزاد نہیں قیدیٔ بندِ تہذیب
کبھی پائے گا نہ تجھ کو یہ سمندِ تہذیب
دُور رہتا ہے بہت تجھ سے گزندِ تہذیب
نہ تو تہذیب پسند اور نہ پسندِ تہذیب

تیری توصیف میں خامہ کو جو جولاں کر دوں
سارے تہذیب کے دفتر کو پریشاں کر دوں

کوہ تیرے ہیں، ترا دشت ہے، صحرا تیرا
ندیاں تیری ہیں، نالے ترے دریا تیرا
اور گنگا میں نہاں آئینہ خانہ تیرا
چارسو عالمِ فطرت میں ہے چرچا تیرا

شیر بھی کانپتے ہیں بانگِ درا سے تیری
چیتے گھبراتے ہیں دل دوز صدا سے تیری

ہے یہ زنجیرۂ کہسار ترا حسن حسین — قلّۂ کوہ پہ ہوتا ہے تو اورنگ نشیں
سامنے تیرے درختوں کا ہے حسنِ رنگیں — اور پھیلائے ہے گنگا بھی ردائے سیمیں

تیری تقدیر میں فطرت کی شہنشاہی ہے
ساری دنیا تری مصروف ہوا خواہی ہے

غزل کا نمونہ :-

شعلوں میں خود کو یوں نہ چھپایا کرے کوئی — خونِ شفق سے جلوہ دکھایا کرے کوئی
آنکھیں بچھی ہیں انجمِ تاباں کی ہر طرف — گل گشت کے لیے کبھی آیا کرے کوئی
اے اشک قصۂ غمِ اُلفت نہ چھیڑنا — ایسا نہ ہو کہ تجھ کو بھی رسوا کرے کوئی

آسمانوں کی طرف مائل پرواز ہے دل — اک ستارے کی طرح محو تگ و تاز ہے دل
کتنی دلچسپ ہے دنیا میں کہانی دل کی — کشتۂ ناز ہے دل کشتۂ انداز ہے دل

بل کھاتی ہوئی زلفِ معنبر کو ذرا دیکھ — شرمائی ہوئی نرگسِ شہلا کی ادا دیکھ
ہاتھوں میں لیے بادۂ گلرنگ کے ساغر — کس شان سے آتا ہے محبت کا خدا دیکھ

---

(۲۴) واحد — ابو ظفر عبدالواحد جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی ڈگری لی ہے اور تعلیمی لائن اپنے لیے منتخب کی ہے۔ اوّلاً سٹی کالج میں لکچرار رہے پھر جامعۂ عثمانیہ رہ کر اس کے بعد سکندر آباد کالج میں صدر رہے۔ جدید شعرا کی ذہنیت پر آپ کا خاص اثر ہوا ہے۔ ہندی آمیز شاعری آپ کی محبوب شاعری ہے۔ آپ کے کلام میں شیر...نی اور حلاوت ہوتی ہے۔

وفا شعار ہوں مسلکِ مرا جفا طلبی — یہ قرب و بعد کے قضیے یہ فاصلے کیا ہیں
پسند ہے تجھے دوری تو دور رکھ مجھ کو — کہ آگے تیری خوشی کے مرے گلے کیا ہیں

ازل سے تا بہ ابد ایک آن کا ہے سفر نگاہِ مردمِ بینا میں فاصلے کیا ہیں

تو اپنی آن پہ رہ طائرِ بلند مقام وزارت اور امارت کے گھونسلے کیا ہیں

یہ سب کھلونے ہیں فانی اک آن باقی ہے مجاہدانہ گزر جا یہ بلبلے کیا ہیں

اُچھل کے بحرِ حوادث سے بیکراں ہو جا

سبک ہے پلّہ ابھی اور کچھ گراں ہو جا

---

(۲۵) اقدس

عباس حسین المتخلص بہ اقدس ۱۳۲۱ھ میں تولّد ہوئے اور ۱۳۴۶ھ میں انتقال کر گئے۔ مگر اپنے کلام کو یادگار چھوڑا۔ اورنگ آباد وطن تھا۔ وحید الدین سلیم مرحوم کو اپنا اُستاد مانتے تھے۔ اقدس کے کلام میں بلا کی قنوطیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ سلاست اور روانی بھی ہے اور مضمون آفرینی بھی۔

ہمیں تڑپا رہا ہے انتظارِ وعدۂ محشر

یہی لے دے کے اک دن ہے ہماری شادمانی کا

ترا دستِ ستم بھی باغباں شانے سے کٹ جائے

غضب ہے چھانٹ کر چھانٹا مری شاخِ نشیمن کو

فرقت نصیب مانگ رہے ہیں دُعائے مرگ گھبرا گئے ہیں کشمکشِ انتظار سے ہم

تم کیا بگڑ گئے کہ زمانہ بگڑ گیا تم کیا خفا ہوئے کہ زمانہ خفا ہے اب

جو نہ کرنا تھا کیا حُسن کی خاطر ہم نے جو نہ ہونا تھا ہوا عشق کی رسوائی میں

ناکام جا رہا ہے کوئی بزمِ یار سے

ہوش و حواس کھو کے دلِ بے قرار سے

نالہ برہم، اشک مضطر، آہ بیتابانہ ہے
ہو گئے ساماں مری بربادیٔ تقدیر کے

اقدس ہے جس کا نام وہ عاشق مزاج ہے
خوش ہوں گے مل کے آپ بھی اس جانثار سے

کیوں ہوئے دامنِ فریاد کے ٹکڑے ٹکڑے
خارِ حسرت تو نہ تھا قلبِ تمنّائی میں

اقدس کی نظموں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ "تجلّیاتِ سحر" کے چند شعر یہ ہیں:-

تورے ہیں جگمگا رہے، نور کا وقت ہوگیا
آتی ہے آبشار سے نغمۂ عیش کی صدا

سبزے سے دشت پٹ گیا جوشِ نمو کا یہ اثر
رنگِ فضا کو دیکھ کر محوِ سرور ہے نظر

سُرخ سپید پھولوں کا رنگ بھی شوخ و شنگ ہے
چشمِ حقیقت آشنا دیکھ کے جس کو دنگ ہے

تند ہَوا سے جھڑ گئے پتّے جو زرد زرد تھے
ٹہنیاں سبز ہوگئیں تازہ شگوفے ہو گئے

تابِ نظارہ ہے کہاں چشم نظارہ باز کو
کھوئے ہوئے اب تو ہم قوتِ امتیاز کو

زینتِ حُسن میں ہے محو صبح کو روئے مہوشاں
آئینے میں سما گئیں حُسن کی سحر تجلیاں

نرگس اگر ہے زرفشاں لالہ بھی شعلہ ریز ہے
پھولوں سے چھیڑ کرتی ہے موجِ ہوا جو تیز ہے

دیکھ تو چشم دید باز، تجھ میں کہاں یہ تاب ہے
تیری ہی تابشِ نظر تیرے لیے حجاب ہے

بلبلِ بے نوا کے اب نالے شرر فشاں نہیں
آہ نہیں، بکا نہیں، یاس نہیں، فغاں نہیں
ظلمتیں شب کی چھٹ گئیں پھیل گئیں تجلیاں
جام جہاں نما ہے یہ کہیے اسے نہ آسماں
صدرنشیں بنا ہوا مجلسِ کائنات کا
جس نے کہ ذمہ لے لیا تازگیٔ حیات کا

---

(۲۶) لمعہ

محمد عباس علی خاں لمعہ تخلص۔ سٹی ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد ڈاکٹری تعلیم پائی۔ سرجری میں مہارت حاصل کی۔ شاعری سے بچپن سے دلچسپی رہی۔ اُردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی شاعری کا بھی شوق رہا۔ لمعہ اقبال سے بھی زیادہ متأثر ہیں۔ اقبال سے ان کو بچپن سے عقیدت رہی۔ ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ ۶ مارچ ۱۹۷۷ء کو اس دنیا سے چل بسے۔ اب تک ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ عرصہ پہلے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "پریم رس" کے نام سے لاہور سے شائع ہوا تھا۔ کلام کا نمونہ پیش ہے :-

پیری میں شباب یاد آیا — زاہد کو خضاب یاد آیا
دنیا نے بھلا دیا سب کچھ — محشر میں حساب یاد آیا
جی بھر کے رو لیا اسی وقت — جب ان کا عتاب یاد آیا
رحمت کا خیال کر کے مجھے — دوزخ کا عذاب یاد آیا
اللہ رے وسعتِ تخیل — دریا کو حباب یاد آیا

عشق مذہب ہے مرا سوز ہے فطرت میری
شمع ہے حسن، تو پروانہ ہے حسرت میری
حسن ایماں ہے مرا، درد ہے راحت مجھ کو
غم مری روح ہے نالے ہیں عبادت میری

آتشِ حسن تو اتنا نہ بھڑک بہرِ خدا
سو رہی ہے ترے پہلو میں محبت میری

---

(۲۷) جامی

خورشید احمد نام، جامی تخلص، ۱۹۱۵ء میں حیدر آباد کے ایک صاحب علم خاندان میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی کے امتحان منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی، شاعری کا شوق صغر سنی سے ہے، نظم اور غزل دونوں اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، جامی شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، ان کا کلام اسلوب بیان زبان خیال ہر حیثیت سے قابلِ داد ہوتا ہے، سوز و گداز، جذبات کی فراوانی کے لحاظ سے کلام موثر ہوتا ہے۔ خورشید احمد جامی نے ۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو وفات پائی۔ ان کے کلام کے چار مجموعے رخسارِ سحر، برگِ آوارہ، قیمت عرض ہنر اور یاد کی خوشبو شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک نظم اور غزل کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

گریز

میرے محبوب ترے دیس کی ان راہوں میں
آج میں ایک مسافر کے سوا کچھ بھی نہیں
تو، کہ مغرور امارت نے تجھے پالا ہے
اور میں دہر میں شاعر کے سوا کچھ بھی نہیں

جانتا ہوں کہ یہ مسرور گریزاں لمحے
میری دنیا سے بہت دُور بھی ہو جائیں گے
چند ٹوٹے ہوئے آوارہ ستاروں کی طرح
وقت کی وادیٔ تاریک میں کھو جائیں گے

میرا فن، میرا تخیل، مرے نغموں کا شباب
تیری تزئین کا ساماں تو نہیں بن سکتا
آنکھ جو تابشِ الماس و گہر میں کھولے
وہ چمکتا ہوا ارماں تو نہیں بن سکتا

جانتا ہوں کہ یہاں خونِ جگر کی قیمت — صِرف اک تلخیٔ احساس ہوا کرتی ہے
مختلف چشمِ فسوں سازکی ہر ایک ادا — نشترِ سینۂ افلاس ہوا کرتی ہے

یہ ترا دعویٔ اُلفت یہ ترا جوشِ وفا
جانتا ہوں کہ ندامت سے بدل جائے گا

آج آنکھوں میں تری پیار سہی میرے لیے
کل یہی پیار حقارت سے بدل جائے گا

سیم و زر تجھ پر نچھاور تو نہیں کر سکتا
ہاں سلگتے ہوئے کچھ گیت سُنا سکتا ہوں

میرے دل میں جو فروزاں ہے، اگر تو چاہے
تیرے دل میں بھی وہی آگ لگا سکتا ہوں

غزلیات کا نمونہ :-

جب سے ہوا ہے ساتھ ترا اے غمِ وطن — گیتوں میں آگیا ہے بہاروں کا بانکپن
اہلِ جنوں نے قلب و جگر کا لہو دیا — گزرے تو دشت کو بھی بتاتے گئے چمن
حالات آج پاؤں کی زنجیر بن گئے — ورنہ کچھ اتنی دُور نہیں تیری انجمن
گذرے گا قافلہ کہ یہی نقشِ پا مرے — دیکھو تو ہیں چراغ رہِ عظمتِ سخن
جامیؔ بڑا عجیب ہے دستورِ میکدہ — پیتے ہیں زہر مئے کی جگہ آج اہلِ فن

ہنگامۂ دوراں میں دل کو کتنے ہی سہارے یاد آئے
طوفان نے باہیں پھیلا دیں جس وقت کنارے یاد آئے

ہر سمت اُجالا تھا لیکن اک سوچ میں گذرا سارا دن
جب رات ہوئی تو ہم کو بھی سب کام ہمارے یاد آئے

تاریک چٹانوں سے جیسے رُخسارِ سحر کی آنچ آئی
اے شہرِ تمنا جب تیرے شاداب نظارے یاد آئے

ماضی کی سنہری وادی میں جو پاس رہے جو ساتھ چلے
نغموں کی سلگتی راہوں میں وہ پھول وہ تارے یاد آئے

پیمانِ وفا کے سفینے سے پھر آج لہو ٹپکا جامیؔ
جو راہ میں تھک کر بیٹھ گئے احباب وہ سارے یاد آئے

تمناؤں کے شعلے میں نہ غم کا چاند نکلا ہے
تمہارے شہر سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے

بچھڑ کر زندگی سے مدتیں گذریں مگر اب بھی
مہکتا جھومتا سا ایک سایہ ساتھ چلتا ہے

وفا کے پھول ہاتھوں میں حیا کا نور ماتھے پر
کوئی نازک بدن اب یوں مرے دل سے گذرتا ہے

اک ایسے کاروانِ زندگی میں ہوں جہاں جامیؔ
مرا احساس، میرا درد، میرا دل اکیلا ہے

---

(۲۸) برق

میر کاظم علی موسوی نام اور برقؔ تخلص، برقؔ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد صدیوں سے شاعری میں نام آوری حاصل کرتے رہے ہیں۔ ان کے پردادا "شہیدؔ" وادا "شعلہؔ" باپ رعدؔ اور چچا لمعہؔ کا تذکرہ صفحات ماقبل میں ہو چکا ہے۔ برقؔ حیدرآباد میں ۱۹۱۴ء کو تولد ہوئے۔ باپ کی اضلاع کی ملازمت کے باعث اعلیٰ تعلیم میسر نہ ہو سکی۔ خاندانی ماحول اور ذاتی شوق سے فارسی اور اُردو میں خاصی مہارت حاصل کر لی ہے۔ بچپن سے شاعری سے دلچسپی رہی۔ وہ اکتسابی شاعر نہیں بلکہ خاندانی میراث کے طور پر شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ کلام کے دو مجموعے "عقل و جنوں" اور "کنول" شائع ہو چکے ہیں۔ برقؔ نظم نگاری کرتے ہیں اور غزل گوئی بھی۔ ان کے کلام میں جوشؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اس رنگ میں کامیابی سے لکھ جاتے ہیں کہ جوشؔ کے کلام کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ ان کی شاعری میں مزدوروں کی فریاد غریبوں کا درد، مظلوموں کے آنسو، بہار کی نیرنگی، مناظرِ قدرت کی دلکشی اور دل فریبی نظر آتی ہے

کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ "مزدور حسینہ" ایک طویل نظم ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :۔

مانگ میں ہے تیری صندل کے عوض گرد و غبار
سر پہ پھولوں کے عوض یہ سنگ سیو کا ہے بار

دھوپ سے کمھلا رہا ہے تیرا چہرہ نازنیں
ہے عرق میں تر عوض چندن کے چاندسی جبیں

مدھ بھری آنکھوں میں اور یہ بے کسی کا توتیا
تیری چشمِ مست میں کاجل جو کھلتا خوب تھا

جم رہی ہیں پپڑیاں تیرے لبوں پر دھوپ میں
خوب جم سکتی تھی مسّی پتلے ہونٹوں پر ترے

تیرے ہاتھوں پر ہیں پتھر کی خراشیں جابجا
گورے ہاتھوں میں ترے مہندی جو رچتی خوب تھا

سچ ہے تیرا حُسن مزدوری کے قابل تو نہ تھا
لیکن اس کا کیا علاج اے پیکرِ صدق و صفا

تیرا بس کیا ہ؟ گو کہ دنیا ہے تری دار المحن
شاد باید زیستن ، ناشاد باید زیستن

اے مرے مفلس وطن ہندوستاں ہندوستاں
سخت حیرت ہے تجھے کہتے ہیں کیوں جنّت نشاں

چلچلاتی دھوپ میں حُسن اور مزدوری کرے
سر پہ پتھر ڈھوئے دن بھر چند پیسوں کے لیے

جس کے نازک ہاتھ ہوں مہندی رچانے کے لیے
حیف وہ مجبور ہو پتھر اُٹھانے کے لیے

جس کے تلوے ہوں مناسب فرش قالیں کے لیے
حیف وہ سرپا برہنہ سنگ ریزوں پر چلے

سود خواروں سے غریبوں پر یہ دُنیا تنگ ہے
ہند میں اہلِ وطن سرمایہ داری تنگ ہے

برکھا کے نظارے

مدہوش، بلا نوش گھٹا جھوم رہی ہے
کلیوں کا صبا ناز سے منہ چوم رہی ہے
بھونروں کی لگن مست صدا گھوم رہی ہے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے
کوئل کی ملہاریں ہیں پپیہے کے کدارے

سرخی پہ شفق کی یہ گھٹاؤں کی سیاہی
رنگین دھنک یہ تری قدرت ہے الٰہی
یہ سات جُدا رنگ بھلے لگتے ہیں کیا ہی
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے
سورج کی شعاعوں نے عجب رنگ نکھارے

یہ ٹھنڈی ہوا، مست گھٹا، ہلکی پھواریں
یہ آم کے باغات، یہ جھولوں کی بہاریں
یہ قہقہے، یہ شوخیاں، یہ دُھن، یہ ملہاریں
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے
مر رہنے کے سامان تو جینے کے سہارے

کاکل ہیں کہ یہ کالی گھٹا سر پہ کھڑی ہے
ناسفتہ یہ موتی ہیں کہ پانی کی جھڑی ہے
یا مانگ میں دلہن کی یہ موتی کی لڑی ہے
برکھا کے نظارے ہیں یہ برکھا کے نظارے
لائے ہیں جیسے بیاہ کے منڈپ میں سنوارے

غزل

آئے وہ دل میں آگ لگا کر چلے گئے
بے تابیوں کو اور بڑھا کر چلے گئے

کافر نظر ملا کے ذرا مسکرا دیا
قلبِ حزیں پہ برق گرا کر چلے گئے

دُنیا کے ساز چھو نہیں سکتے ہیں جس کی دھن
وہ راگ سازِ دل پہ سُنا کر چلے گئے

اہلِ خرد کے نقشِ قدم جس جگہ نہیں
وہ مجھ کو ایسی راہ بتا کر چلے گئے

رُسوائیوں کا خوف نہ پروائے ننگ و نام
وہ سب سے اک نظر میں چھڑا کر چلے گئے

پیتے ہیں جس کو ساغر و پیمانہ کے بغیر
ایسی شراب مجھ کو پلا کر چلے گئے

دُنیا تمام مست نظر آ رہی ہے اب
ایسا وہ مجھ کو مست بنا کر چلے گئے

میری مشامِ جاں کو معطّر بنا دیا بو زُلفِ عنبریں کی سُنگھا کر چلے گئے
کچھ سو گئی تھی روح مری برق موسوی
وہ آئے اور اس کو جگا کر چلے گئے

---

(۲۹) باقیؔ

عبدالقیوم خاں باقیؔ تخلص، آپ کے والد فانیؔ تخلص، حیدر آباد کے مشہور شاعر تھے۔ باقیؔ کی تعلیم جامعۂ عثمانیہ میں ہوئی۔ ایم۔ اے میں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ باپ سے شاعری میں تلمذ رہا۔ نظام کالج میں اُردو فارسی کے لیکچرار تھے۔ ہر صنفِ سخن میں دستگاہ حاصل تھی۔ نظم میں ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے۔ باقیؔ ایک باکمال آرٹسٹ تھے۔ شاعری، موسیقی اور مصوری میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ پروفیسر عبدالقیوم خاں باقیؔ کا ۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو بعارضۂ قلب انتقال ہوا۔ انہوں نے اقبالیات پر اچھا کام کیا ہے ان کی کتاب "اقبال اور اشتراکیت" علمی اور ادبی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ جرمن شاعر و فلسفی گوئٹے کی نظم کا منظوم ترجمہ "فاوسٹ" ان کا بہترین کارنامہ ہے۔

گناہ

ذرّے میں رقص برقِ شرارت کا آگیا آدم کسی کی بزمِ محبت پہ چھا گیا
شوخی، سمندِ شوق کی مہمیز ہو گئی دوزخ کی آنچ اس کے لیے تیز ہو گئی
مخمورِ اضطراب اثر دیکھتا نہیں فردوس سامنے ہے مگر دیکھتا نہیں
گردن اٹھا کے خاک کا پتلا رواں ہوا یہ ذرّۂ زمیں نہ ہوا آسماں ہوا
زہرہ میں اسکی دھوم ہے اور کہکشاں میں دھوم سُنتے ہیں اسکے شوق کی کون مکاں میں دھوم
یہ گرمیاں کہاں کی ہیں پہچانتے ہیں کیا اس کے جنوں کو اہلِ فلک جانتے ہیں کیا
ہر سانس میں گناہ کی لذت ملی ہوئی یوں ساکنِ زمیں کو عطا زندگی ہوئی

مقبرہ رابعہ دورانی

کس درد سے چھیڑنے لگا پھر سازِ محبت کس سمت سے آنے لگی آوازِ محبت
ماتم کدۂ حسن کی اس نوحہ گری میں حسرت کدۂ عشق کی خونیں جگری میں
بے درد کی دُنیاؤں کا اک آئینہ خانہ کس شان سے ہے جلوہ نما غم کا فسانہ

دروازے پہ جو حوض ہے سرشار الم ہے
دُنیائے محبت کا چھلکتا ہوا غم ہے

اور جوئے رواں اشک رواں کی ہے نشانی
ماں کے لیے خونبار ہے بیٹے کی جوانی

ہے سرو کی مانند نکلتی ہوئی آہیں
جو ڈھونڈتی ہیں عرش پہ پرواز کی راہیں

مینار نہیں دستِ دُعا فاتحہ خواں ہیں
یہ امن و اماں کے لیے ہر سو نگراں ہیں

گنبد میں صدا گونجتی ہے نالہ و فریاد
بے ساختہ کرتا ہے کوئی نام خدا یاد

غزلیں

دلِ غریب کی بے تابیاں دکھا نہ سکے
ہم اس کے دردِ محبت کو آزما نہ سکے

نگاہِ شوق کو ہر ہر قدم پر لغزش تھی
نظر ملا کے بھی ان سے نظر ملا نہ سکے

خیالِ عشق کی رعنائیوں سے ڈرتا ہوں
بھلا ہوا کہ تصوّر میں وہ سما نہ سکے

یہ اور بات ہے تقدیر ہی بدل ڈالیں
لکھا ہوا مری تقدیر کا مٹا نہ سکے

غمِ جدائیِ پیہم کی خیر ہو یاربّ
وہ اپنی یاد کا دامن چھُڑا کے جا نہ سکے

نظر جھکا کے دیا ساغرِ شراب مجھے
جو مانگتی تھیں نگاہیں وہی پلا نہ سکے

زہے نصیب کہ تیرِ ہدف تھے مستِ وفا
نگاہ رُک نہ سکی، دل کو ہم بچا نہ سکے

خدا گواہ کہ باقیؔ کے چاہنے والے
کبھی خلوص و محبت اسے دکھا نہ سکے

روٹھ گئی ان کی نظر دیکھنا
جرمِ محبت کا اثر دیکھنا

پی گئے افسانۂ طور و کلیم
دیکھنے والوں کا جگر دیکھنا

پوچھنے والے تو یونہی رہ گئے
مل گئی غیروں کو خبر دیکھنا

ہوش، سکوں، زیست، تمنّا، خوشی
زیست کا سامانِ سفر دیکھنا

باعثِ جمعیت دل بن گیا
باقیِؔ آشفتہ نظر دیکھنا

مرحبا اے جذبۂ عشق آفریں صد مرحبا
حسن بن جاتی ہے دُنیا جس طرف جاتا ہوں میں

اک کھلونا رکھ کے دو عالم کا اپنے سامنے
مجھ کو بہلاتے ہیں وہ اور ان کو بہلاتا ہوں میں

(۳۰) لطیف ساجد

دورِ موجودہ کے ترقی پسند شاعر تھے۔ اپنے انفرادی تاثر کو روحِ اجتماعیت سے علیحدہ کرنا پسند نہیں کرتے وہ زندگی کے ترقی پسند افراد کی ترجمانی کرتے۔ ادب اور شاعری میں زندگی کی حرکت پذیر تغیر آشنا قدروں کا نام ہے۔ جامعۂ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ ان کی شاعرانہ ذہنیت کو مجلا کرنے میں ان کے قابل پروفیسر ابوظفر عبدالوحید صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ لطیف ساجد غزل اور نظم دونوں موزوں کرتے تھے۔ دفتری خشک فضا کے باوجود ان کی شاعری پروان چڑھتی رہی۔ نوجوانی میں ۱۹۵۵ء میں انتقال ہوا۔

کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات

آہ یہ بزم کہ ہے مجلسِ اوہام میں شاد
عقل سہمی ہوئی تدبیر کے ساماں برباد
ہر طرف جہل کی تاریک گھٹاؤں کا خروش
سینۂ زیست پہ ہے رقص کناں دیو عناد

کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات

شوق کو فرصتِ آرائشِ افکار تو دے
میری آزاد روی کو دلِ سرشار تو دے
اور کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں اے دردِ حیات
اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے

کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات

نورِ احساس کا بہتا ہوا دھارا بن کر
ایک خورشید در آغوش شرارا بن کر
چھین ہی لوں گا امارت کی جبیں سے تنویر
شبِ افلاس کی قسمت کا ستارا بن کر

اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے
اور کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں اے دورِ حیات

آب و آتش

یک بہ یک نالۂ شب گیر کی مانند اٹھا — ابر کا شور دلِ چرخ کو دہلاتا ہوا
ایک بپھرے ہوئے امڈے ہوئے طوفاں کی طرح — وقت کے ساحلِ خاموش سے ٹکراتا ہوا

مسندِ خاک پہ وہ دیکھو ہوئے جلوہ فروز
گوہرِ آب کی صورت میں ستاروں کے رسول
ہر طرف نورِ مسرّت کا ہے فرماں جاری
قلبِ گردوں ہے مگر خستہ و ناشاد و ملول

جانے کس بزم میں لے آئے ہیں دل کو میرے — یہ سلگتے ہوئے ارماں یہ برستی ہوئی رات
جس جگہ کیف نہیں، رنگ نہیں، حسن نہیں — گرمیٔ ساز سے بیزار دلِ سازِ حیات

شعلۂ زیست سسکتی ہوئی آہوں کا دھواں
جذبۂ شوق، اترتے ہوئے نشہ کا خمار
نہ تلاطم کی تمنّا، نہ تبسّم کا شعور
صرف اک جنبشِ انفاس سو وہ بھی بیمار

کس طرح دیکھوں یہ دم توڑتی نظروں کا گداز — کس طرح آتشِ احساس بجھاؤں آخر
حسن اور حلقۂ تاریکیٔ غم میں مجبور — آہ کس دل سے لگا ہوں کو چراؤں آخر

دل کو مدّت سے اسیرِ خمِ ابرو ہی رہا
خنجر و تیغ کی جھنکار بھی سن سکتا ہے
لاؤ اب ظلمتیں تا دیر نہیں رہ سکتیں
صبحِ فردا کی بھی اس گیت پہ سر دھنتا ہے

غزل

بے گانۂ آلام، نہ وابستۂ آلام — پہلو میں ہو دل یا کوئی دیوانۂ خودکام
ہنستے ہوئے دیکھے ہیں جہاں نے — روتی ہوئی آنکھوں کے اشارے

وہ نگاہِ ناز کہ حسرتوں کو نوید کیف و دام ہے
کبھی شمع بزمِ سکوت ہے، کبھی موج نغمہ خرام ہے

نہ سحر میں روح شگفتگی، نہ شبوں میں لذتِ تازگی
یہ عجیب دورِ بہار ہے، یہ عجیب گردشِ جام ہے

میں خراب بادۂ غم سہی، تو ملول فکرِ کرم نہ ہو
تری غفلتوں کی پناہ میں مری زندگی کا نظام ہے

کبھی برق بن کے مچل گئی، کبھی شمع بن کے پگھل گئی
وہ نوائے غم جسے روح میں نہ قرار ہے نہ قیام ہے

یہ کوئی پیام نظر نہیں، یہ کوئی نویدِ سحر نہیں
ابھی زندگی ہے فسردہ دل ابھی شوق نیم تمام ہے

---

(۴۱) شاہد عبدالمتین نام، شاہد تخلص، آگرہ سے آکر یہاں بس گئے۔ شاہد صدیقی بھی ترقی پسند شعرا میں شامل ہیں۔ نظم اور غزل گوئی میں دستگاہ نوجوان شعرا میں شاہد کا مقام بہت بلند تھا۔ کلام کا مجموعہ "چراغ منزل" شائع ہوا ہے۔

شاہد صدیقی نے شاعری کے ساتھ طنز و مزاح نگاری میں اچھی شہرت حاصل کرلی تھی۔ ان کے اس قسم کے مضامین اخبار سیاست میں "کوہ کن" کے نام سے شائع ہوتے تھے۔ آخر جولائی ۱۹۶۲ء کو یک بیک انتقال ہوگیا یکم اگست ۱۹۶۲ء درگاہ شاہ خاموش نام پلی میں دفن ہوئے۔

یہ زمانہ

آپ کیوں ہیں انقلاباتِ جہاں سے بدگماں
زیست منزل کے لئے بیتاب ہے اے مہرباں

کل تک اس کی عقل میں کارِ زمیں بھی بار تھا
آج انساں کی نظر ہے ماورائے کہکشاں

عقل محتاجِ سکوں ہے، عشق جویائے خلش
بڑھ رہا ہے اپنی منزل کی طرف ہر کارواں

آج تقدیرِ چمن کو جانے کیا منظور ہے
اک طرف کچھ آشیاں ہیں اک طرف کچھ بجلیاں

اپنی بربادی کا اس کو خوف ہو سکتا نہیں
بجلیوں پر جس نے رکھی ہو بنائے آشیاں

کھولتی جاتی ہیں راہیں ذہنِ تازہ کے لئے
ایک فرسودہ نظامِ فکر کی بربادیاں

کہنگی کی لاش پر محوِ تبسم ہے شباب
اور بڑھاپا ہے پُرانے مقبروں میں نوحہ خواں

اک طرف بھڑکے ہوئے شعلوں میں بھی خشکی سی ہے
ایک جانب اٹھ رہا ہے سطحِ دریا سے دھواں

ایک جانب موت کی آنکھوں میں ہے کچھ نیند سی
ایک جانب لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں

ایک جانب چہرۂ افلاس پر رنگِ وقار
اک طرف روئے امارت پر ہزاروں جھریاں

ہے یہ موزوں وقت تعمیرِ نشیمن کے لئے
زلزلے ہی زلزلے ہیں آندھیاں ہی آندھیاں

یہ زمانہ کس قدر مغموم و راحت خیز ہے
زندگی کی دوڑ کتنی سست کتنی تیز ہے

کبھی خرد کا، کبھی عشق کا بہانا تھا
مری حیات کا مقصد فریب کھانا تھا

تری نگاہ کی گہرائیوں میں جانا تھا
مرے سکوت کی ہر تہہ میں اک فسانا تھا

خزاں کا خوف تھا غنچوں کو فصلِ گل میں مگر
وہ مسکرا کے رہے جن کو مسکرانا تھا

کبھی کبھی تو وہ عالم گذر گیا شبِ غم
ترا خیال بھی گذرا ہوا زمانا تھا

جہاں جہاں میں رُکا وقت کے قدم بھی رُکے
مرا وجود خود اپنی جگہ زمانا تھا

حضورِ حُسن مجالِ نظر نہ تھی شاہد
ہمیں تو اپنے مقدر کو آزمانا تھا

یہ لطف کشاکش کیا کم ہے، سامان سکوں حاصل نہ سہی
کشتی کا کوئی وارث تو ملا، طوفاں ہی سہی، ساحل نہ سہی
رُکتے ہی فنا ہو جائیں گے یا رستے میں کھو جائیں گے
ہم لطف سفر کے خوگر ہیں، رہبر نہ سہی منزل نہ سہی
ماضی کی فسردہ یادوں سے کیوں خون کریں مستقبل کا
محفل تو سجانی لازم ہے، وہ پہلی سی محفل نہ سہی

یہ کیا ستم ہے کہ احساسِ درد بھی کم ہے — شبِ فراق ستاروں میں روشنی کم ہے
اک ایسی موجِ کرم تھی نگاہِ ساقی میں — کہ اس کے بعد سے طوفانِ تشنگی کم ہے
قریب و دُور سے آتی ہے آپ کی آواز — کبھی بہت ہے غمِ جستجو کبھی کم ہے
عروجِ ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن — ہنوز عظمتِ انساں سے آگہی کم ہے
تمام عمر ترا انتظار کر لیں گے — مگر یہ رنج رہے گا کہ زندگی کم ہے

اس زمانہ میں دیہات کی زبان میں یا قدیم نہج پر اصلاحی شاعری کا بھی رواج ہوا کئی شعراء اس نہج کی شاعری کرنے لگے ان میں دہقانی، کھنہ، رحیم صاحب میاں وغیرہ کئی اصحاب نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس موقع پر ہم صرف دہقانی کا تعارف کراتے ہیں۔

(۳۲) دہقانی نذیر احمد نام اور دہقانی تخلص۔ اسی دور کے شاعر ہیں ان کی شاعری کو تین دور میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جبکہ انہوں نے دیہات کی سادہ زندگی میں اپنی عمر بسر کی۔ گاؤں کی فضا اور ماحول میں ان کی شاعری پروان چڑھی جس میں دیہات کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں۔ موٹ کا گیت، شاعر اور برسات، لمبارن، دیہاتن وغیرہ اس دور کی مشہور اور مقبول نظمیں ہیں۔ دوسرا دور ان کا شہر میں آنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے شہری زندگی کی تکلیف اور تصنع دیکھا۔ حیدرآباد کی جگمگاتی فضا میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ تیسرا دور ان کا سیاسی دور رہا جبکہ قائد ملت اور قائد اعظم کی تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی شاعری میں سیاسی پہلو کو پیش نظر رکھا۔ اس دور کی نظموں میں "تحفت تمہاری کی"، "غچ چپ"، رونق صورت، خالہ ماں، رص تو کیا نہس تو نہیں رص تو کیا، مزدور، موسیٰ ندی کی کہانی، کب تلک وغیرہ نظمیں مشہور ہیں یہ پاکستان چلے گئے ہیں۔

دہقانی کی نظمیں اپنی صداقت، صاف گوئی کے لحاظ سے موثر ہوتی ہیں۔ ان میں وہی ہوتا ہے جو زندگی میں گذرتا پیش آتا اور نظر آتا ہے تخیل کی بلندی معانی کی رفعت محاورات اور ضرب الامثال کی بندش ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کلام کا نمونہ:۔

موٹ کا گیت

جب لوکاں رہتیں نینداں میں ہاتھ ہیں لمبا لٹے کو
میں موٹ چلانے جاتا ہوں تو کھاندے پو کمل سٹے کو

میں موٹ چلاتے رہتا ہوں جب ہو کر مست خیالاں میں
شونم کے موتیاں پراتی ہوے تو مرے سر کے بالاں میں

یہ گر کا بم ہر چکر پو کو عمل کے نقلاں کرتا ہے
او ٹھتا ہے درد جی میں مرے تو ٹھنڈے سانس بھرتا ہی

جب ڈھول ڈبا توں بوڑی میں ہر رگ رگ جنبش کرتی ہے
تو دیکھ کو ہمت تھنڈی ہوے اک اک کو ہش ہش کرتی ہے

جب کھیت کے مڑیاں پانی سے سن جیسا جیسا بھرتے ہیں
آسماں سے تو اک اک کرکو سب تارے نہارنے اترتے ہیں

خاموش ہوئے ہیں گانوں میں جب جی میں شولے بھڑکتے ہیں
تو سن کو بھڑا پھر بوڑی میں سب مچھلیاں سارے پھڑکتے ہیں

بم ڈھول سے پانی نیچے کو جب جوش میں آکر بہتا ہے
گویا فرشتہ دونی میں ایک سو کو خراٹے لیتا ہے

میں مجتا پینے دم لیتوں جب پاواں میرے دکتے ہیں
تو میرے بلایاں لینے کو جھاڑاں کے ڈھالیاں جھکتے ہیں

رونی صورت

گراڑی مار یکو بلبلا رہا رونی صورت
نجومیاں آکو ہے بیگی بتاوے ہاتھ اپنا

شرم میں ہو کر اب بھر کو پلا رہا رونی صورت
تو سگیاں کو چ کیوں ہاتاں بنا رہا رونی صورت

چلے گئے کھیت چگ کو کب کی تیرا چڑیاں ساری　　　تو منہ پوکھڑے کو کیا اڑا رہا رونی صورت

ادھر جوتے برس رہیں سر پو تیرے حد سے بے حد　　　ادھر تو سر کو کھجا رہا رونی صورت

یہ دہقانی کے باتاہیں سچ کو نو کاں بوسے

ارے ان ہمنا پڑ کو کیا سنا رہا رونی صورت

---

(۳۲) اثر صدیق احمد نام، اثر تخلص، حضرت جلیل (نواب فصاحت جنگ) کے فرزند اکبر، آپ کی ولادت ۱۳۰۲ھ میں ہوئی آپ کی تعلیم اولاً ندوۃ العلماء لکھنؤ اور پھر حیدرآباد میں مشہور مشرقی علوم کے مدرسہ دارالعلوم میں ہوئی، عربی، فارسی میں فارغ التحصیل ہوئے حکومت آصفیہ کی ملازمت میں داخل ہوئے سررشتہ عدالت میں منصفی ملی، ترقی کر کے ناظم عدالت ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) ہوئے۔ اور اس خدمت سے وظیفہ حاصل کیا، ایک عرصہ تک ایک ادبی رسالہ "فصاحت" بھی شائع کیا۔ شاعری کا شوق، کم عمری سے رہا۔ اپنے والد محترم کی شاگردی کی۔ اور آپ استاذ سخن ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

---

فیض بخشا بہار نے سب کو　　　گل کو دیکھا، نہ خار کو دیکھا

وفا اک متاع گراں ہو گئی ہے　　　فقط نام دنیا میں ہے دوستی کا

معلوم تھا کہ ہوگا نتیجہ یہی مرا　　　پہلے ہی جا کے شہر خموشاں میں سو گیا

جان لیوا ہے مصیبت آج کی　　　ہم بھلا کیوں کر غم فردا کریں

مختصر ہے عمر اپنی یاد راز　　　زندگی کا کوئی پیمانہ نہیں

نرالا ہے سفر اس زندگی کا　　　ٹھہرنے کے لئے منزل نہیں ہے

ہر شجر باغ جہاں میں بار ور دیکھا کیے　　اک فقط نخلِ تمنّا بے ثمر دیکھا کیے

کیا رنگ لائے اشکِ ندامت نہ پوچھیے　　جو بوند اپنی آنکھ سے ٹپکی گُہر ہوئی
میں کارواں سے چھوٹ کے تنہا نہیں رہا　　اُٹھ اُٹھ کے گرد راہ مری ہم سفر ہوئی

لے کے پہونچی ہے طلب میری یہ کس گلشن میں　　خار مہنگے ہیں جہاں پھول کی ارزانی ہے
دعوتِ برق نشیمن میں بلا وجہ نہیں　　ایک اک تنکے کی قسمت مجھے چمکانی ہے

پُر اثر نغمے سناتا ہوں اسے گلشن میں　　صید کرتا ہوں میں صیّاد کو، صیّاد مجھے

ساتویں دور کی نثر نگاری

چھٹے دور میں نثر نگاری کے موضوع کو بڑی وسعت ہو چکی تھی۔ تاریخ، سوانح سفرنامے، فلسفہ، سائنس، ناول، افسانے، مختصر افسانے قانون وغیرہ کی کتابیں مرتب ہو چکی تھیں۔ اس ساتویں دور میں نثر نگاری کے موضوع کو اور زیادہ وسعت ہوئی۔ نئے نئے موضوع۔ نئے نئے رجحانات کا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ سے اردو کے خزانے میں انمول نگینوں کا کافی مسالہ جمع ہوگیا۔ تاریخ ادب، تنقید ادب، معاشیات، جغرافیہ ڈومسٹک سائنس، سائنس کے مختلف شعبوں، کیمیاء، طبعیات، حیاتیات وغیرہ کے موضوع کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور تصانیف کی گئیں۔ ریسرچ کر کے انکشافات کا دروازہ کھل گیا۔ اس طرح اردو نثر کی کتابوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ گئی۔

اس دور کے شعراء کی طرح نثر نگاروں کے بھی چار گروہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کے آباؤ اجداد صدیوں سے یہاں سکونت کرتے آئے ہیں۔ اور وہ نسلاً بعد نسلاً دکن کے ہیں۔ ایسے اہل قلم میں بعض وہ ہیں۔ جو چھٹے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اس دور میں ان کا انتقال ہوا۔ مثلاً مولوی سید اشرف شمسی، سید جمال الدین نوری، مولانا محمد مرتضیٰ، مولوی عبدالواسع، راجیشر راؤ اصغر، نانک راؤ وٹھل راؤ۔ حضرت امجد، سید شمس اللہ قادری سید خورشید علی وغیرہ۔

دوسرے وہ اہل قلم ہیں جو اسی زمانہ میں نثر نگاری میں مشغول ہوئے۔ ان کے کارنامے اسی ساتویں دور کی یادگار ہیں، لیکن ان کو جامعہ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے۔ ان میں سے بھی بعض فوت ہو چکے ہیں، اور بعض مصروف عمل ہیں۔ مثلاً عبدالرحمٰن خاں، سید سردار علی، سراج الدین طالب مرحوم مولوی عبدالسلام مرحوم، سید احمد اللہ قادری، سید حسام الدین، فضل الرحمٰن، سید بادشاہ حسین ناکارہ، عبدالغفور عابدی، رہبر فاروقی، سید تمکین کاظمی، ابراہیم جلیس وغیرہ۔

تیسرے وہ صاحبِ قلم ہیں جن کو جامعہ عثمانیہ نے پیدا کیا ہے۔ مثلاً

ڈاکٹر زور، سید عبد القادر سروری، ڈاکٹر رضی الدین، ڈاکٹر ولی الدین، عبد الحمید صدیقی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد غوث، سید محمد، رشید قریشی، سری کشن سنہا وغیرہم۔

چوتھا طبقہ ان اصحاب علم وفن کا ہے جو ولادت کے لحاظ سے تو دکن کے نہیں ہیں۔ مگر عنفوان شباب میں یا فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کے سلسلہ میں دکن آ گئے اور یہاں بس گئے۔ افسوس ہے کہ ان میں بعض قضا کر چکے ہیں۔ مثلاً مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم، سید علی اصغر بلگرامی، غلام یزدانی، حسین احمد بیگ صاحب، ہارون خاں صاحب شروانی، مولوی عبد اللہ عمادی مرحوم، محمد الیاس برنی، مولوی محمد جمیل الرحمٰن مرحوم وغیرہ

اگر بلحاظ فن نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دینیات کے موضوع پر مولوی سید حسام الدین صاحب، شمس الدین صاحب صدیقی، عبد الغفور عابدی، عبد الغفار صاحب، ابو الخیر خیر اللہ صاحب، عبد الوہاب عندلیب، ڈاکٹر محمد حمید اللہ اور ڈاکٹر یوسف الدین وغیرہ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ تاریخ اور سوانح عمری کے موضوع پر عبد الرحمٰن خاں، غلام یزدانی، سید علی اصغر بلگرامی، محمد مظہر، سراج الدین مرحوم، ڈاکٹر سید محی الدین زور، عبد المجید صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسن خاں، ڈاکٹر محمد غوث وغیرہ نے بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ تاریخ ادب اور تنقید ادب کا موضوع اس دور کا ایک جدید موضوع ہے اس پر ڈاکٹر سید محی الدین زور۔، عبد القادر سروری، سید محمد صاحب کے علاوہ راقم الحروف نے بہت سا مسالہ جمع کر دیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ زیر نظر کتاب "دکن میں اردو" ہی اس فن کی اوّلین کتاب ہے۔ اور ایک کتاب آفریں کتاب ثابت ہوئی ہے تو غلط نہیں ہو سکتا۔

فلسفہ کی جانب سر امین جنگ، ڈاکٹر ولی الدین وغیرہ نے توجہ کر کے جو ذخیرہ قلمبند کیا ہے وہ قابل ستائش قرار پاتا ہے، سائنس اور ریاضی کے متعلق ڈاکٹر رضی الدین، عبد الرحمٰن خاں، سید محمد علی خاں، ڈاکٹر سعید الدین نے جو کتابیں مرتب کی ہیں وہ نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ معاشیات کے عنوان پر مولوی الیاس برنی، محمد شرف الدین، ڈاکٹر یوسف الدین وغیرہ کے کارنامے اردو کی

اہم کتابیں ہیں۔

ناول اور مختصر افسانوں کا بھارت اور پاکستان کی طرح دکن کے اہل قلم اصحاب نے بھی بہت سا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، مختلف النوع افسانے ان کے قلم کے رہینِ منت ہیں، رومانی افسانے، تاریخی افسانے، اصلاحی، سماجی معاشرتی اور اشتراکی افسانوں کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے۔ افسانہ نگاری میں کئی اصحاب مصروف ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔ محشر عابدی، شبیر حسین قیس، ڈاکٹر سید محی الدین زور، ابراہیم جلیس، رشید قریشی، ظفر الحسن سری کرشن سنہا، جے شنکر راؤ، مسلم ضیائی، محبوب حسین جگر، امجد یوسف زائی وغیرہ کے افسانے ہر طرح قابل قدر ہیں اس ضمن میں عبدالقادر سروری نے دنیائے افسانہ وغیرہ کے عنوان پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ بھی ادب اُردو میں خاص مقام رکھتی ہیں۔

مزاحیہ نگاری اور طنز نگاری میں سب سے پہلے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم اور پھرنا کارہ کا نام خصوصیت سے قابل تذکرہ ہے۔ ان اصحاب نے جو ادب مُہیا کر دیا ہے وہ دنیائے اُردو میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ڈرامہ کے متعلق ہم نے علیحدہ صراحت کر دی ہے۔ بہر حال شاعری کی طرح نثر نگاری کو بھی اسی دور میں خاصی ترقی ہوئی، نہ صرف جدید موضوع زیر بحث رہے بلکہ جدید رجحانات بھی پیدا ہوئے ان پر جس کامیابی سے دکن کے مُصنّفین نے اپنے قلم کے نقش ثبت کئے ہیں وہ اُردو زبان اور ادب میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گے۔ اس موقع پر یہ بھی قابل تذکرہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے تحت جن اصحاب نے ریسرچ کر کے مقالات مرتب کئے ہیں یعنی ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محمد غوث، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر یوسف الدین ان کے مقالات قابل قدر ہیں۔ ان اصحاب نے تحقیق وانکشافات کے لحاظ سے جو کام کیا ہے وہ بلند معیار کا حامل اور اُردو میں خاصی اہمیت رکھتا ہے شیخ چاند صاحب کا مقالہ جو سودا پر لکھا گیا ہے وہ شائع بھی ہوگیا ہے۔ ڈاکٹریٹ کے علاوہ ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ کے امتحان کے لئے جو مقالے، تاریخ، فلسفہ، معاشیات، عربی، فارسی اور اُردو کے قلمبند ہوئے ہیں وہ بھی اپنے معلوم آفریں اندراجات اور تحقیق کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اگرچہ

ان میں سے بہت کم مقالے طبع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں اور ان کا زیادہ حصہ غیر مطبوعہ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جن اصحاب نے ان مقالوں کا مطالعہ کر کے تنقیدی رائے دی اور طلبہ کو کامیاب کیا گیا ہے۔ ان آرا سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مقالے اردو میں تحقیقی لحاظ سے اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تفصیل کے بعد ہم چند نثر نگاروں کا تعارف کراتے ہیں اولاً کہن سال اور پھر جوان مصنفوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) فرحت اللہ بیگ مرحوم | مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مرحوم کی پیدائش دہلی میں ۱۸۸۳ء میں ہوئی، وہاں ہی تعلیم پائی۔ بی اے میں کامیابی حاصل کر کے حیدرآباد آ گئے۔ کیونکہ یہاں آپ کے خاندان کے بیسیوں افراد سرکاری ملازمت میں شامل تھے، ملازمت کے بعد مرزا صاحب دکن کے ہی ہو گئے۔ یہاں ہی مضمون نگار بنے، نقاد بنے، شاعر بنے ادیب یعنی مزاحیہ نگار بنے، غرض وہ جو کچھ تھے۔ دکن آ کر ہی بنے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں انتقال ہوا، چار گھاٹ کے پل کے قریب آپ کا مدفن ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی مزاحیہ نگاری کے متعلق مرحوم عظمت اللہ خاں کا خیال بالکل درست تھا۔ آپ کی تحریر کو خوش مذاقی سے موسوم کرنا چاہیئے جس میں قہقہے کا موقع نہیں ہوتا بلکہ تبسم کے موقع ملتے ہیں۔ مرزا صاحب نے علمی اور ادبی رنگ میں شوخی پیدا کی تھی۔

مرزا صاحب کو صرف مزاحیہ نگار یا طنز نگار کہنا صحیح نہ ہوگا وہ جس طرح ایک اچھے مزاح نگار تھے اسی طرح بڑے نقاد بھی تھے ان کی تنقید قابل قدر اور صحیح تنقید کا نمونہ ہوتی تھی۔ انہوں نے شعراء کے کلام پر جس طرح تنقید فرمائی ہے اور ان کے اچھے بُرے رنگ کو اجاگر کیا ہے وہ مرزا صاحب کا ہی حق تھا، وہ محقق تھے۔ انہوں نے جس تحقیق اور موشگافی سے ادیبوں اور شاعروں کے کام کی تحقیق کی ہے وہ اردو زبان میں زندہ جاوید کی مستحق ہے۔ مرزا صاحب ایک بہترین سوانح نگار بھی تھے۔ انہوں نے مولانا نذیر احمد اور مولوی سلیم کی سیرت اور کردار کو جس طرح پیش کیا ہے وہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ مرزا صاحب کے قلم کی بے باکی اور ذہن کی برّاقی اردو انشاپردازی میں اپنی

نظیر آپ ہے۔ مگراس کے ساتھ ہی وہ ادبی تحقیقی مضامین میں تحقیق، سوچ، بچار، تلاش وجستجو کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ اگر وہ مزاحیہ نگاری میں من چلے، بے چین، قلم کے بے باک تھے تو اس کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیقی مقالوں کے لئے وہ صبر اور استقلال کے ساتھ داد تحقیق دیتے تھے۔ پوری کوشش اور فکر د کاوش کو کام میں لاتے تھے۔ مرزا صاحب کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"سود لینا وہ جائز سمجھتے تھے، اگر کوئی حجّت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ دوسرے عالم، تیسرے لسّان، بھلا ان سے کون در آسکتا تھا۔ اور تو اور خود مجھ سے سود لینے کو تیار ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر متفرق قرضے تھے خیال آیا کہ ایک جگہ سے قرض لے کر سب کو ادا کر دیا جائے۔ قرضہ کس سے لیا جائے۔ یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا۔ ہر پھر کر مولوی صاحب ہی پر نظر جاتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کر کے میں نے مولوی صاحب سے سوال کر ہی دیا۔ کہنے لگے کتنا روپیہ چاہئے۔ میں نے کہا بارہ ہزار بولے ضمانت۔ میں نے کہا چوڑی والوں والا مکان۔ پوچھا کتنی مالیت کا ہے۔ میں نے کہا ساٹھ ستّر ہزار روپے کا، فرمایا کل قبالہ لیتے آنا۔ میں نے دل میں سوچا چلو چھٹی ہوئی۔ بڑی جلدی معاملہ نبٹ گیا، دوسرے دن قبالہ لے کر پہنچا، کہا ٹھیک ہے۔ مگر بیٹیا سود کیا دو گے۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ اور سود، کہنے لگے کیوں، اس میں کیا حرج ہے۔ میں نہ دوں گا تو کسی ساہوکار سے لو گے اس کو خوشی سے سود دو گے، ارے میاں مجھے کچھ فائدہ پہنچاؤ گے تو دین دُنیا دونوں میں بھلا ہوگا" (مولانا نذیر احمد کی کہانی)

"نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دو زانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکالیں۔ خواص نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے میں سے نکال بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سر سوٹھ کر ... پڑھنا شروع کیا،

الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا، ایک کیفیت تھی کہ زمین سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ استادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ، سبحان اللہ کے الفاظ بہت نیچی آوازمیں نکل گئے تو نکل گئے۔ ورنہ ساری مجلس پر ایک عالمِ بے خودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا، باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اٹھایا، لیجئے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا[1]

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ آزاد مرحوم سید انشا کو قبولیت عام اور شہرت دوام کا خلعت دینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آبِ حیات میں نہ صرف شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی رائے سے اختلاف کیا بلکہ انشا کے متعلق ایسے ایسے واقعات بیان کئے جن کی تائید کسی تذکرے یا کسی اور کتاب سے نہیں ہوتی۔ اس پر غضب یہ کیا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں راوی کا ذکر نہیں کیا ہے اور جہاں کیا ہے وہاں غلطی کھائی ہے مثلاً جہاں انشاء کی زندگی کے دَور دکھائے ہیں وہاں سعادت یار خاں رنگین کا حوالہ دیا ہے لیکن ان میں سے ایک واقعہ کا بھی ذکر رنگین کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو مجالس رنگین میں ہوتا، مگر وہ ۱۲۱۵ھ کی تصنیف ہے اور اس زمانہ میں انشاء اور رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے درباریوں میں تھے اس لئے

---

[1] ۱۲۶۱ء میں دہلی کا مشاعرہ۔

اس کمزوری کو آزاد مرحوم نے "رنگین کہا کرتے تھے" کے پردے سے ڈھانکا ہے[1]"

(۲) مولوی مسعود علی محوی مسعود علی خاں کے بزرگوں کا وطن فتحپور ضلع بارہ بنکی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸۶۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ علی گڈھ سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آکر ہوم سکریٹری میں مترجم بنے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے ناظم صدر عدالت تک پہنچکر وظیفہ حاصل کیا۔ اس کے بعد پھر جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں مامور ہوئے مسعود علی صاحب کو تصنیف و تالیف سے دلچسپی رہی چنانچہ کئی ایک کتابیں آپ کی شائع ہوئی تھیں مگر ایسی اور کتابیں بھی ہیں جن کی اشاعت نہیں ہوئی ہے۔ آپ کی بعض کتابیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) کوکبہ حمیدی (۲) وکالت (۳) مشیر الوکلا (۴) دستور العمل کوتوالی (۵) حالات اقوام جرائم پیشہ (۶) اُصول واقعات متعلقہ (۷) شعرائے دربار سلطان محمود (۸) اربعہ عناصر رباعی (۹) مخدوم زادگان فتحپور (۱۰) مجموعۂ نظم فارسی

ان کے علاوہ دارالترجمہ میں جو قانون وغیرہ کی کتابیں آپ نے ترجمہ فرمائی ہیں وہ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ مولوی مسعود علی صاحب کو شاعری سے بھی دلچسپی رہی۔ زیادہ تر فارسی سے دلچسپی رہی ہے۔ محوی آپ کا تخلص ہے مہاراجہ کشن پرشاد سے خاص روابط تھے۔ مہاراجہ کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے اور فارسی کلام سناتے تھے۔

(۳) عبدالرحمٰن خان صاحب خاں صاحب کے اجداد مدراس سے حیدرآباد آئے تھے۔ آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۸۷۹ء ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔ خاندانی اصحاب اور خود آپ کے والد اہل سیف تھے۔ آپ نے قلم ہاتھ میں لیا۔ نظام کالج سے جبکہ اس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ بی۔ اے میں کامیابی حاصل کرکے ملازم ہوگئے مگر پھر تعلیمی شوق کے

---

[1] انشا صفحہ ۵۷

مدِنظر یورپ گئے اور لندن یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔
واپسی پر نظام کالج میں لکچرار طبعیات بنے پھر پروفیسر طبعیات پر آپ کو ترقی
ملی۔ آپ پہلے مسلمان تھے جو طبعیات کے پروفیسر بنے تھے۔ اس کے بعد جامعۂ
عثمانیہ کی صدارت پر آپ کا تقرر ہوا جس وقت خانصاحب کا تقرر اس خدمت
پر ہوا۔ جامعہ کی حالت ابتدائی تھی۔ آپ کی کوشش جدوجہد سے جامعہ کو ترقی
ہوئی اور اس کے سپوت یورپ کو روانہ کئے جانے لگے۔ اور واپسی کے بعد
ان کو یونیورسٹی میں مددگار پروفیسر اور پروفیسر کی جگہ دی جانے لگی۔ جامعہ
کے ہر شعبہ میں اصلاح ہوئی اور ترقی کے زینے طے ہونے لگے ۔۔۔۔۔ ۱۹۳۶ء
میں خدمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ بعض اصحاب کا یہ قول بالکل صحیح ہے۔
خاں صاحب ہمیشہ سے علم آشنا، علم پرور اور علماء دوست رہے۔
اگرچہ جامعۂ عثمانیہ کے قیام میں حیدری صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ مگر یہ حقیقت
ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے فرزندوں کو یورپ روانہ کرنے اور ان کو خدمتیں دلانے
اور جامعہ کے بعض دوسرے امور میں خاں صاحب آپ کو حیدری صاحب سے مدد
نہیں ملی بلکہ قدم قدم پر ٹکر لینی پڑی بالآخر اسی مخالفت کی وجہ سے خان
صاحب کو خدمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ یہ واقعہ ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے
استحکام میں عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں
اور ان کا دورِ صدارت تاریخ جامعہ کا ایک شاندار باب رہے گا۔ خاں صاحب
کو علم سے جو دلچسپی رہی اس کے مدِنظر انھوں نے بیسیوں مقالے انگریزی اور
اُردو میں قلمبند کئے۔ جامعہ کے لئے سائنس کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کے
مضامین اپنی تحقیقات کی رفعت اور انکشافات کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں
جن کا اعتراف یورپ اور امریکہ کے سائنسدانوں نے کیا ہے۔ سائنس کی
کتابوں کے مصنف بھی ہیں طبعیات فلکیات آپ کے اہم مضمون رہے ہیں
اس کے ساتھ تاریخ سے بھی دلچسپی رہی خان صاحب کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا
نثر کا نمونہ پیش ہے:-
"سیارگان نظام شمسی کا جب ہم غائر نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ وہ عموماً اسی سمت میں اپنے اپنے محوروں اور مداروں میں حرکت کرتے ہیں جس سمت میں آفتاب اپنے محور پر گھومتا ہے تقریباً سیارے (بہ استثنار بعض نجمیہ سیاروں کے، طریق الشمس کے مستوی یا اس کے ساتھ چھوٹے زاویوں پر مائل مستویوں میں حرکت کرتے ہیں۔ پلوٹو کا مدار البتہ طریق الشمس سے ۱۷ درجہ پر مائل ہے لیکن ہمارے چاند کا مدار صرف ۵ درجہ پر مائل ہے"

(سیاروں پر زندگی کے امکانات[1])

"جملہ مستقل عناصر کی تعداد اس وقت ۹۲ ہے۔ ممکن ہے کہ کائنات کے ابتدائی زمانہ میں اس سے زائد ہو۔ ان کی کمیتی اعداد ایک سے لے کر ۲۳۸ تک ہے، مرکزہ کی کمیت ہمیشہ ایک آساسی اکائی کی تقریباً صحیح عددی صعف ہوتی ہے۔ یہ اکائی ہیڈروجن کے مرکزہ یعنی پروٹون کی کمیت کے قریب قریب مساوی ہے۔ اس صحیح عدد کو کمیتی عدد کہتے ہیں۔ اور وہ باستثناء ہیڈروجن اور ایک شاذ و نادر ہمجائے ہیلیم (کمیتی عدد ۳) کے ہمیشہ جوہری عدد کا کم از کم دو چند ہوتا ہے چونکہ پرولون کی کمیت ابلکڑ ون کی کمیت کا ۱۸۴۰ گنا ہوتی ہے۔ اس لئے جوہر کی کمیت تقریباً تمام کی تمام اس کے مرکزہ ہی پر مجتمع ہے[2]"

سید علی اصغر صاحب بلگرامی

نواب عماد الملک کے حیدرآباد آنے کے بعد جن بلگرامی خاندانوں نے حیدرآباد کو وطن بنالیا ان میں سے ایک سید علی اصغر صاحب کا خاندان بھی ہے۔ آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۳۰۱ھ میں ہوئی۔ تصنیف و تالیف کا شوق ہے کئی کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں۔ مختلف رسالوں میں آپ کے بلند پایہ مضامین شائع ہوئے اور پسند کئے گئے ہیں۔ حیدرآباد کے آثار قدیمہ پر آپ کی

---

[1] و [2]۔ مجموعہ مقالات علمیہ نمبر ۵ و نمبر ۹ ۱۹۴۳ء و ۱۹۴۷ء

ایک کتاب "ماثر دکن" شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ "فلسفۂ ازدواج" دوسری کتاب ہے۔ ان کے علاوہ اور تصانیف بھی ہیں۔ ادب اور تاریخ سے آپ کو دلچسپی رہی ہے۔ صوبہ داری کی خدمت سے آپ نے وظیفہ حاصل کیا ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ نمونۂ نثر حسب ذیل ہے:۔

"جب سے دُنیا پر تمدن جلوہ ریز ہوا ہے۔ یہ تلقین تقریباً سارے مذاہب عالم کے واعظوں اور مقرروں کے افکار و خطب میں قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ زندگانی دُنیا چند روزہ ہے۔ "مکن تکیہ بر عمر ناپائیدار" دنیا گذر رہی ہے اور اپنے گذرنے کا بہانگ دہل اعلان کر رہی ہے۔ اس دنیا کا سایہ زوال پذیر ہے اس کا حال انتقال و زوال ہے۔ دُنیا کے عیش مکدّر ہیں۔ اس کی شیرینیاں ناگوار اس کی حلاوتیں تلخ اس کے اسباب مٹنے والے اور اس کی زندگی کا انجام موت ہے۔ باوجود اس کے وہ آرائشیں جو دل کو لبھاتی ہیں ہم ان پر مفتوں ہیں، ہماری نگاہیں اس کی زینتوں میں الجھی ہوئی ہیں۔[1]"

(۵) ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب

آپ کی پیدائش ۱۸۸۵ء میں دہلی میں ہوئی جو آپ کے اجداد کا وطن ہے۔ مشرقی اور مغربی علوم میں فارغ التحصیل ہو کر پنجاب گورنمنٹ میں تحصیلدار بنے پھر مشرقی بنگال میں پروفیسر عربی اور فارسی کی خدمت پر منتقل ہوئے اسی خدمت سے ۱۹۱۵ء میں حیدرآباد کی ملازمت میں منسلک ہوئے آثار قدیمہ کی نظامت پر آپ کا تقرر ہوا اسی وقت سے آپ حیدرآباد کو وطن بنا کر مقیم ہو گئے برطانوی ہند میں آپ نے کتبات کے متعلق بہت کچھ انجام دیا ہے۔ اسلامی آثارِ قدیمہ کے دیکھنے کے لئے حکومتِ آصفیہ نے روانہ فرمایا تھا دو سال تک آپ نے سیاحت کی اور کثیر معلومات جمع کیں۔ غلام یزدانی صاحب کو عربی، فارسی، انگریزی کے

---

[1] روح ترقی جمادی الاول ۱۳۶۹ھ۔

ساتھ اُردو سے بھی دلچسپی ہے۔ تاریخ اور ادب آپ کے خاص مضمون ہیں۔ انگریزی اور اُردو میں آپ کی کئی تصانیف طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ آپ نے جو اُردو مقالے مختلف عنوان پر لکھے ہیں وہ معلومات آفریں اور دلچسپ ہیں۔ تحقیقات اور انکشافات سے آپ کو بڑی دلچسپی رہی ہے۔ آپ کا اسلوب بیان صاف، سادہ اور دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اپنی معلومات کے ماخذوں کو نہایت دیانت کے ساتھ واضح طور پر ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت بعض اُردو کے نامور محققین میں نہیں پائی جاتی، رسالہ اردو، ہمایوں، ساقی" وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"اجنتا کی تصاویر کی ممتاز خصوصیات ان کی مسرت آمیز روحانیت ہے یا وہ انسانی اُمنگیں ہیں جو ہر کہہ و مہ کے دل میں پیدا ہوتی ہیں یہ ایسی صفات ہیں جو ہر خیال اور ہر طبقہ کے آدمی کو اپنی طرف کھینچ کر محویت اور بے خودی پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہی فنون لطیفہ کی اصلی غرض ہے۔ زمانہ کے لحاظ سے ان تصاویر کا مقابلہ پومپیائی کی تصاویر سے کیا جا سکتا ہے۔ روماوی زندگی میں تزک و شان کے ساتھ جبروتیت ہمیشہ نمایاں رہی ہے اور چونکہ یہ جبروتیت ہمیشہ اوقات بہیمیت تک پہنچ جاتی ہے اس لئے اس کا اثر پومپیائی کی تصاویر میں صاف نظر آتا ہے مغربی مبصران کی تعریف میں خواہ کیسے ہی رطب اللساں ہوں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مرقعوں میں فن کا احساس بہیمی جذبات کے تحت کیا گیا ہے اور پاکیزگی یا روحانیت بالکل مفقود ہے۔ جو اجنتا کی تصاویر کی خاص شان ہے۔"[1]

"ذہنی تربیت اور شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور بعض فاضل عہدہ داران کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان بزرگوں میں مولوی علی حیدر طباطبائی، مولوی وحید الدین

---

[1]۔ اجنتا کی نقاشی صفحہ ۲

سلیم اور مولانا ڈاکٹر عبدالحق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان ماہرین کی صحیح تنقید نے نوعمر شعراء کو پرانی طرز کی بھول بھلیوں اور منزل سے ہٹی ہوئی پیچ دار راہوں سے بچا لیا اور ایسے روشن اور واضح طریقے بتائے جس سے وہ شاعری کے اصل مقصد تک آسانی سے پہنچ جائیں[1]۔ یزدانی صاحب کا حیدرآباد میں اسی سال کے سن میں نومبر ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا۔ سردار بیگ صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔

(۶) **محمد مظہر** مولوی حافظ محمد مظہر صاحب اگرچہ گزشتہ دور کے لکھنے والے ہیں مگر اس دور میں انہوں نے اُردو کی خدمت زیادہ سے زیادہ انجام دی۔ ان کے بھائی مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کا تذکرہ گزشتہ دور میں ہو چکا ہے محمد مظہر صاحب کی ولادت ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی سے کامیابی حاصل کی۔ روزانہ اخباروں اور ماہوار رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے "قلمرو آصفی کی دولت" آپکی تصنیف مرحوم حضور آصف جاہ سادس کے جوبلی کے زمانہ میں مرتب ہوئی اور اس دور میں شائع ہوئی ان کی دوسری قابل قدر کتاب "تذکرہ باب حکومت" ہے۔ اخبار صحیفہ روزانہ میں ان کے قابل قدر مضمون شائع ہوتے رہے۔ اور اس کی ادارت کے فرائض بھی آپ سے متعلق رہے۔ رسالہ "روح ترقی" شائع کرتے رہے۔ سرکار عالی کی ملازمت میں شامل رہنے کے باوجود انہوں نے جو کچھ علمی خدمت کی وہ قابل قدر ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور صاف ہے تحریر میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ تاریخ، مذہب، معاشرت، سیاست، تعلیم اور صنعت و حرفت وغیرہ آپ کے دلچسپ اور پسندیدہ موضوع رہے اعداد شمار سے بحث کرنا گذشتہ تاریخ کو پیش کر کے آئندہ کے لئے سبق دینا آپ کا معمول رہا ہے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی معتمدی کے فرائض بھی کئی

---

[1] "حیدرآباد کے چند شعرا"۔ ساقی ۴۵ھ۔

سال سے انجام دے رہے ہیں۔ ایک دوسرے صاحب کی معتمدی کے زمانہ میں جو نقصان عظیم کانفرنس کے فنڈ کو برداشت کرنا پڑا۔ اس کی تلافی مختلف ذرائع سے آپ نے کی اور ایک معتد بہ رقم فراہم کرلی تاکہ غریب طلبہ کو وظائف دئے جائیں آپ کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

"مہاراجہ چندولال کی سبکدوشی کے بعد حضرت آصف جاہ رابع ناصر الدولہ غفران منزل نے معتد بہ عرصہ تک مدارالمہامی پر کسی کو مامور نہ فرمایا تھا۔ اور خود پیش گاہ جلالت مآب ہی سے اس کی ذمہ داریاں وابستہ رہی تھیں۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مغلیہ سلطنت کی اصطلاح دیوان عام اور دیوانِ خاص سے وہ مقام مراد ہے جہاں اقتدار اعلیٰ کے فرائض و احکام سرانجام پاتے تھے اور جہاں وزرا، سپہ سالار اور ذمّہ دار افراد حکومت، علما، وصلحا، اہل غرض، عرض گذار مستغیث جمع ہو کر عرض معروض کرتے تھے۔ لفظ دیوان خانہ بھی ناظم صوبہ یا وائسرائے سے متعلق اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے[1]"

حقیقت یہ ہے کہ ہندوپاکستان کے تمام مروجہ السنہ میں بلکہ مشرق کے السنہ میں عربی کے پہلو بہ پہلو اُردو ہی ہے جو گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی ہے۔ سرکاری مراسلت، تجارتی کاروبار اُردو کے ذریعہ انجام پاتے رہے اور پا سکتے ہیں۔ قانون، فلسفہ، سائنس، ادب، تاریخ، شاعری اور مذہب اسلام ہندومت کے متعلّق جو علمی خزائن اُردو میں موجود ہیں، وہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ گذشتہ تیس سال میں جامعۂ عثمانیہ نے جو کچھ بھی کام کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ کشمیر سے لے کر راس کماری تک جو زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کو نظر انداز کرتے ہوئے انگریزی زبان کو مزید پندرہ سال تک گوارا کرنا اور اس کے ساتھ ہندی کو بھی سرکاری زبان

---

[1] تذکرہ باب حکومت صفحہ ۲۱

قرار دینا دو گونہ مشکلات کا باعث ہے[1]۔

(۷) **سراج الدین** مولوی سراج الدین صاحب مرحوم بھی اسی دور کے ایک مؤرخ اور انشاپرداز تھے، حیدرآباد ان کے آباؤ اجداد کا وطن تھا۔ حیدرآباد میں ان کی ولادت ہوئی۔ تعلیم زیادہ تر مشرقی ہوئی۔ انگریزی بھی پڑھی تھی مگر کسی جامعہ کی ڈگری حاصل نہیں کی۔ ابتداً سررشتہ مالگذاری میں گزبند خدمت پر مامور ہوئے۔ پھر تخفیف میں آکر ملازمت کے لئے سرگرداں رہے۔ آخر دفتر دیوان و مال میں ملازم ہوئے۔ اور زمانہ ملازمت ہی میں بمرض دق انتقال فرمایا۔

مرحوم کو فن تاریخ اور خصوصاً حیدرآباد کی آصفیہ تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس موضوع میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں "نظام علی خاں، حصہ اوّل و دوم"، "میر عالم" اور "شیر جنگ"، مشہور کتابیں ہیں۔ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ طالب تخلص تھا۔ ان کی اردو نثر صاف اور سادہ ہوتی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

> "سب سے پہلے ہم شاہ نواز خاں کا ذکر کرتے ہیں کہ پہلے انہیں کا منصوبہ برسرِ کار آیا ہے۔ وہ فرانسیسیوں کی مخالفت کی بنا پر یہ چاہتے کہ کسی طرح ان سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ انہوں نے دیوان ہوتے ہی اپنی تمام تر توجہ اسی طرف منعطف کر دی لیکن جب یہ دیکھا کہ صلابت جنگ خود یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ انہیں (فرانسیسیوں) کی بدولت سلطنت پر جلوہ فرما ہیں تو پھر ممکن نہ تھا کہ ان کے پاس فرانسیسیوں کے خلاف کوئی چال چل سکتے۔ چنانچہ شاہ نواز خاں کے پیشتر لشکر خاں نے بھی بہ حیثیت مدار المہام فرانسیسیوں کے خلاف کوشش کی تھی[2]۔"

(۸) **ہارون خاں شروانی** پروفیسر ہارون خاں شروانی جامعہ کے افتتاح ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد آکر یہاں

---

[1] رسالہ روح ترقی صفحہ ۲ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ [2] نظام علی خاں اوّل۔ صفحہ ۳۶

بس گئے، جامعہ عثمانیہ کے صدر شعبۂ تاریخ اور پھر نظام کالج کی پرنسپلی کی
خدمت انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا، سیاست اور تاریخ آپ کے خاص مضامین
ہیں۔ اس فن میں آپ کی کتابیں اور مقالات شائع ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں
آپ کی ولادت ہوئی، تعلیم و تربیت علی گڈھ، لندن، کیمبرج اور آکسفورڈ میں
ہوئی۔ اُردو انگریزی کے ممتاز عالموں میں آپ کا شمار ہوتا ہے حق گوئی
بے باکی آپ کے کردار کے نمایاں جوہر ہیں۔ اس وقت اندھرا پردیش کے
ایوان بالا کے نامزد کردہ رکن ہیں جیساکہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ شروانی صاحب
اُردو انگریزی کے قابل ستایش مصنف ہیں، دونوں زبانوں میں تاریخ
اور سیاست کے موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے
کی بھی خاص مہارت حاصل ہے۔ اندھرا تلنگی وار دو اکیڈمی کی جانب
سے آپ نے دستور ہند کا ترجمہ فرمایا ہے۔ اُردو رسم خط اور وضع اصطلاحات
سے بھی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ انگریزی، اردو، فارسی، عربی کے علاوہ فرانسیسی
اور اب تلنگی زبان میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ اب
بھی جاری ہے۔ شروانی صاحب کی نثر پیش ہے :-

"حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اصطلاحات کی تدوین کی ضرورت
جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ہی سے محسوس ہونی شروع ہوئی
جب جامعہ کے نصاب میں سیاسیات کا مضمون شامل ہوا۔
اور بعض دقیق کتابوں کے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی جن کے
مولفین نے گویا بال کی کھال نکالی تھی تو ایک مجلس بطور
خاص سیاسی اصطلاحات کو اردو کا جامہ پہنانے کے لئے
بنائی گئی اس مجلس نے کم و بیش پانچ سو انگریزی سیاسی
اصطلاحات کا اُردو میں ترجمہ کیا اور حقیقت میں اصطلاح
سازی کے میدان میں اس نے پہل کی، اس کے ارکان میں
نواب حیدر یار جنگ مرحوم (علی حیدر طباطبائی)، نواب
مسعود جنگ (سر راس مسعود) مولانا عمادی صاحب جناب

عنایت اللہ صاحب اور بعض دوسرے اہل فکر کے نام آتے ہیں
ان کی بنائی ہوئی اصطلاحات میں سے بہت سی ایسی ہیں جو اب
ٹکسالی ہو گئی ہیں اور جنہوں نے اُردو میں مستقل جگہ پیدا کر لی
ہے۔ جیسے وقایقیہ، وفاق، مقننہ، مجلس عاملہ، امور معرضہ،
امور منتقلہ، تقسیم اختیارات، قلمرو، سیاسی فرقہ بندی کابینہ،
اقتدار اعلیٰ، آمر، اور امریت، مزاج، ولندستان، پولستان
وغیرہ، نیز ایسے بعض اصطلاحات کے مفہوم کا قطعی فرق بتانا
پڑا، جیسے عمومیت، جمہوریت کے درمیان، غرض اس مجلس نے
سیاسیات کے میدان میں اردو کی بڑی خدمت کی۔"

(۹) سید محی الدین قادری زور

حیدر آباد کے مشہور قابل قدر مصنف اور جامعہ عثمانیہ کے قابل فخر سپوت

ڈاکٹر زور کا خاندان اس وقت دکن آیا تھا جبکہ محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا تھا۔ قندھار میں ان کے اجداد مقیم ہوئے اور علم و فن کی خدمت کے ساتھ ارشاد و ہدایت میں مشغول رہے۔ ڈاکٹر زور کی پیدائش ۱۳۲۳ھ میں ہوئی دار العلوم اور جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر لندن گئے اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور فرانس میں بھی لسانیات پر ریسرچ کیا۔ واپسی پر جامعہ عثمانیہ میں مامور ہوئے، پروفیسر اردو کی خدمت انجام دی اور پھر چادر گھاٹ کالج کے صدر بنے اب وظیفہ کے بعد کشمیر یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو اور ڈین ہیں۔ ڈاکٹر زور کو تصنیف اور تالیف سے خاص دلچسپی ہے، تاریخ، ادب تنقید، ان کے خاص موضوع ہیں۔ دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع کر دی ہیں۔ ادارہ ادبیات اُردو آپ نے قائم فرمایا ہے۔ جس کے ذریعہ اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر زور کی کتابوں میں اُردو شہ پارے، روح تنقید، سلطان محمد قلی قطب شاہ، اُردو اسالیب بیان، میر محمد مومن، تذکرہ اُردو مخطوطات اور ہندوستانی لسانیات وغیرہ بڑے معرکہ کی کتابیں ہیں۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو

کشمیر میں آپ کا انتقال ہوا۔ وہاں ہی دفن ہوئے۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن وامان اور راحت وآرام سے گذرا اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش وعشرت اور بہجت وکامرانی میں گذار دی مغل مورخوں نے قطب شاہیوں کے آخری یادگار ابوالحسن تاناشاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تاناشاہ کو بڑا عیاش رند بدمست مشہور کر رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقع حاصل ہوئے تاناشاہ کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز ونعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگمتی والا قصہ صحیح ہے جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود ردموسی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظر بند کر دیا گیا اور وہاں ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور رقاصہ چنچلم کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں، تو ظاہر ہے کہ عنفوان شباب کے ساتھ ہی وہ مہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا، جن میں سے ہر ایک اس پر جان ودل فدا کرنے کو تیار تھی[1]۔"

"پھول بن بلاشبہ ان چند نظموں میں سے ہے جو حقیقی معنوں میں سخت کد وکاوش کا نتیجہ ہیں اس کے مصنف کا اصل مقصد ایک خاص ادبی اور دلچسپ کتاب تحریر کرنا تھا نہ کہ فارسی قصے کا خشک اور لفظی ترجمہ کرنا جیسا کہ اس نے خاتمہ پر بتایا ہے

---

[1] سلطان محمد قلی قطب شاہ صفحہ ۵۸ و ۵۹

اس امر کی کوشش کی ہے کہ علم معانی کے اصول و قواعد کے موافق انتالیس قسم کی مصنوعی خوبیاں پیدا کرے اس پر بھی یہ نظم اس قسم کی محض مشق نہیں رہی، زبان وطرز بیان کے لحاظ سے یہ دکھنی کی بہترین مثنویوں میں سے ہے اس کی بحر بھی خاصی اور دلکش ہے۔ مصنّف اپنی طبیعت کی اپج اور اصلی جوش کو قدم قدم پر ظاہر کرنے کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ تقاریب اور شادی کی رسومات کے جو بیانات اس میں پیش کیے گئے ہیں، بالکل نیچرل اور جبات انسانی کے بالکل مطابق ہیں، وہ سلطنت قطب شاہیہ کی معاشر اور رسم و رواج کی اعلیٰ تصویریں ہیں[لہ]"

جس طرح ادیبوں کی تصنیفات کے معائب و محاسن کا محاسبہ ارتقائے ادب کا زبردست حامی ہے۔ تنقید نگاروں کے کارناموں کی تنقیح کرنی ادبی مذاق کی درستی کے لئے ضروری ہے کیونکہ جس طرح ادیبوں کو آزاد چھوڑ دینا قوم کے لئے خطرناک ہے تنقید نگاروں کو بے لگام کر دینا بھی ادب کے لئے مہلک ہے لیکن مؤخر الذکر کام انجام دینا پہلے کام سے بہت زیادہ دشوار ہے[عہ]

ڈاکٹر زور زمانہ تعلیم کے زمانہ میں شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ مگر دوسری علمی مصروفیتوں کے باعث شاعری کا جذبہ دب گیا تھا۔ وظیفہ کے بعد جب کشمیر میں ملازم ہوئے تو شاعری کا جذبہ پھر ابھر آیا، غزلیات موزوں کرنے لگے تھے۔ افسوس کہ حرکت قلب بند ہو جانے پر ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء میں کشمیر ہی میں انتقال ہو گیا وہیں دفن کئے گئے۔

(۱۰) **سید عبدالقادر سروری** سروری صاحب بھی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کو تصوف سے دلچسپی تھی اور صاحبِ باطن تھے۔ حیدرآباد آپ کا وطن ہے ۱۳۲۱ھ کو آپ کی

لہ۔ اردو شہ پارے۔ صفحہ ۱۰۸ عہ۔ روح تنقید صفحہ ۱۲۹

ولادت ہوئی، مختلف مدارس میں آپ کی تعلیم ہوئی اور بالآخر جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری ایک ساتھ امتیاز کے ساتھ حاصل کی، مادرِ جامعہ کو اپنے قابل سپوت کو اپنے دامن سے جدا کرنا پسند نہ آیا۔ مددگار پروفیسر اُردو کی خدمت پر مامور ہوئے، چند سال کے بعد میسور یونیورسٹی نے آپ کو پروفیسر اُردو کی حیثیت سے طلب کرلیا۔ مگر پھر جامعۂ عثمانیہ میں واپس ہوگئے صدر شعبۂ اردو کی خدمت انجام دی اور اب وظیفہ پر سبکدوش ہوئے سروری صاحب کو کم سنی سے مضامین نگاری سے دلچسپی رہی اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے، فارغ التحصیل ہونے پر تصنیف وتالیف سے زیادہ دلچسپی ہوگئی، تاریخ ادب، تنقید، افسانہ نگاری وغیرہ آپ کے خاص موضوع ہیں، آپ کی تصانیف کے منجملہ چند یہ ہیں:۔ جدید اُردو شاعری (اس کے کئی اڈیشن شائع ہوتے ہیں بعض جامعات کے نصابوں میں شریک ہے)، دنیائے افسانہ، کردار افسانہ، حیدر آباد کی پچیس سالہ تعلیمی ترقی، اُردو مثنویات، حضرت سراج اور ان کی شاعری، جامعہ عثمانیہ کے اُردو مخطوطات، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں مضامین کی تعداد بھی کثیر ہے۔ سروری صاحب کا اسلوب بیان بھی سادہ ہے اس میں ندرت ہے۔ مضامین میں عمق اور گہرائی کے ساتھ ساتھ دلچسپی اور اثر پایا جاتا ہے نمونہ پیش ہے۔

"اُردو شاعری نے اپنی پیدائش سے لے کر اب تک کئی لباس بدلے نہایت سرسری اور وسیع مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کم سے کم تین رجحان اس نے زبردست ظاہر کئے۔ سب سے پہلے اپنی پیدائش میں یہ زیادہ تر ہندوی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہندی سرزمین اور ہندی معاشرہ کے آب وگل سے اس کا خمیر ہوا ہے۔ بعد میں حاکم مغلوں کی زبان یعنی فارسی سے یہ اس قدر متاثر ہوئی کہ ظاہر اور باطن دونوں لحاظ سے یہ فارسی شاعری کا مثنیٰ معلوم ہونے لگی، پھر جب انگریزوں کا تسلّط ہندوستان پر ہوا تو مغربی شاعری کی طرف یہ زیادہ سے زیادہ

مائل ہونے لگی۔ گویا اُردو شاعری کے بھی وہی تین دور ہیں جو
خود ہندوستان کی تاریخ کے سمجھے جاتے ہیں۔ اُردو شاعری پر
موجودہ انقلاب آنے سے پہلے اس کی جو حالت تھی اس پر ہم
یہاں تفصیل سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس باب کا مطالعہ
موجودہ دور میں اُردو شاعری کی اُصولی تبدیلی کی ضرورت
قارئین کرام پر اچھی طرح کر دے گا اور اس سے یہ بھی فائدہ
حاصل ہوگا کہ ہم انقلابات سے قبل کی شاعری کا موازنہ جدید
شاعری کے ساتھ بہ آسانی کرسکیں گے"[1]

(۱۱) ڈاکٹر رضی الدین

رضی الدین صاحب کا خاندان حیدرآباد کے قدیم صدیقی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ رضی الدین صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم ہوئی۔ منشی اور عثمانیہ میٹرک کا امتحان ایک ساتھ دے کر درجۂ اوّل میں کامیابی حاصل کی۔ پھر جامعہ عثمانیہ کے امتحانوں میں فرسٹ آتے رہے۔ سرکاری وظیفہ پر انگلینڈ گئے، اور کیمبرج سے ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر رضی الدین فن ریاضی میں جس طرح مہارت تامہ رکھتے ہیں وہ پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو ادبیات سے بہت دلچسپی ہے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے ادب پر عبور رہے۔ اقبال کا مطالعہ خصوصیت سے کیا ہے۔ اسی طرح وہ امجد کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔ کئی ایک کتابوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور کئی ایک کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ان کے ادبی مقالے بھی بلند پایہ ہوتے ہیں، ان سے ان کی قابلیت اور غور و فکر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں

"نظریہ اضافیت اور کوانٹم نظریہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات
کی ہر شے میں دوئی پائی جاتی ہے، ایک ہی شے کبھی ذرّہ کے

---

[1] جدید اردو شاعری صفحہ ۶۴

خواص کا اظہار کرتی ہے اور کبھی موج کے خواص کا۔ مادّہ اور توانائی میں کوئی اساسی اختلاف نہیں ہے۔ اس جدید انکشاف نے مادیت کا خاتمہ کر دیا ہے مادّہ پرستوں اور دہریوں کا خدا کی ہستی کے خلاف یہ استدلال تھا۔ کہ ایک غیر مادّی خالق مادّی اشیاء کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ مادّہ اور توانائی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے

یعنی خدا آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔ نظریۂ اضافیت کے اس فلسفیانہ پہلو کی قدر و قیمت اقبال خوب جانتے تھے چنانچہ وہ خطبات صفحہ ۵۲ میں فرماتے ہیں "اس طرح ہمیں معلوم ہو گیا کہ قدیم طبعیات کی مادیت کا سرے سے وجود نہیں" نظریۂ اضافیت نیچر کی واقعیت کو معدوم نہیں کرتا بلکہ مادّہ کے متعلق اس تصوّر کا خاتمہ کرتا ہے کہ مادّہ نیچر میں خودبخود پھیلا پڑا ہے۔ اسی تصوّر نے قدیم طبعیات کو مادیت کے غار میں ڈھکیلا تھا۔ جدید اضافیتی طبعیات میں مادّہ کوئی پائدار شئے نہیں ہے جس کی خاصیتیں بدلتی جائیں بلکہ یہ محض ایک باہمی تعلق رکھنے والے واقعات کے نظام کا نام ہے"[1]

"ہر فرد کی زندگی کے دو بڑے پہلو ہوتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی پھر انفرادی زندگی بھی تین ذیلی شعبوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ یعنی جسمانی ذہنی اور روحانی زندگی کے ان مختلف پہلوؤں کے نشو و نما اور ترقی میں مدد دے اور کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ اس لئے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت میں ورزش اور کھیل کود کے ساتھ عقلی اور ذہنی علوم اور

---

[1] اقبال کا تصوّر زمان و مکان۔ صفحہ ۵۵۔ ۵۶

مذہب و دینیات کی تعلیم کا صحیح تناسب میں انتظام ہونا چاہیئے تاکہ انفرادی زندگی کے تینوں پہلو ایک ساتھ نشو و نما پائیں۔ اگر کسی فرد کی زندگی میں ایک پہلو بھی حد سے زیادہ کمزور رہ جائے تو اس کی زندگی مکمل اور خوش گوار نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ زندگی کے ان مختلف شعبوں میں سے ہر شعبہ کی اس حد تک تربیت حاصل کرے کہ وہ شعبہ نشو و نما کے ایک قلیل ترین (MINIMUM) معیاری درجہ تک پہنچ جائے اور آئندہ زندگی میں مفید ہو سکے۔[1]

(۱۲) ڈاکٹر حمید اللہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب راقم الحروف کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ۱۳۲۶ھ میں ان کی پیدائش ہوئی مدرسہ دار العلوم میں میٹرک میں کامیابی حاصل کر کے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں شرکت کی اور ایم اے، ایل ایل بی کی کامیابی کے بعد یورپ گئے۔ جرمنی کی بون یونیورسٹی سے صرف دس ماہ کے عرصہ میں ڈی فل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فرانس گئے اور ایک سال کے عرصہ میں ڈی لیٹ کی ڈگری حاصل کی۔ دو سال کے اندر انہوں نے جرمنی اور فرنچ زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ آنحضرت صلعم کی سیرت مقدس اور آپ کے غزوات کے متعلق انہوں نے بڑا ریسرچ کیا ہے اور اس ریسرچ کے متعلق کئی تصانیف کرنے کے علاوہ جامعۂ فرانس کے تحت لکچرز بھی دئے ہیں، قانون بین الاقوام کے ماہر ہونے کے لحاظ سے آپ کی بڑی شہرت ہے۔ انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالینی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی، ترکی اور اردو زبان کے ماہر ہیں، عربی، اردو، انگریزی، فرنچ اور جرمنی زبانوں میں مقالات قلمبند کرنے کے علاوہ تصانیف بھی کی ہیں، ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ اردو تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) آبادی کے متعلق قرآن کا مواد (۲) رومی اور اسلامی ادارہ غلامی،

---

[1] تعلیم کا مسئلہ۔ صفحہ ۹

(۳) رسول کریم کی سیرت کا کیوں مطالعہ کیا جائے (۴) قانون بین الممالک کے اُصول اور نظریے (۵) اسلامی قانون بین الممالک (۶) عہد نبوی کے میدان جنگ، (۷) عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔

"اسلام کا اصل اصول یہ ہے کہ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ (یعنی دنیا میں بھی اچھے رہیں اور آخرت میں بھی)، اوّلاً ہم یہی دیکھیں گے کہ دنیاوی معاملات میں آنحضرت کی سیرت اور طرز تعلیم میں ہمارے لئے کیا سبق ہیں؟ دنیا میں ایک حیثیتی بڑے لوگوں کی کمی نہیں، لیکن اگر ہم مثلاً سکندر اعظم، پنولین و ہٹلر کو لیں تو ان کی زندگی صرف ایک سپہ سالار اور فاتح کے لئے مفید مطالعہ ثابت ہو سکتی ہے اور بس۔ گوتم بدھ کی زندگی ریاضت اور عبادت میں خصوصی دلچسپی لینے والوں ہی کے لئے سبق آموز ہو سکتی ہے، ہومر صرف ایک شاعر اور قصہ گو تھا، افلاطون اور ارسطو صرف حکیم و فلسفی تھے، زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی بڑی وقعت نہیں، خاص کر اکثر ناصح بے عمل رہے۔

اس کے برخلاف پیغمبر اسلام کی زندگی قول و فعل کی یکسانی ہمہ جہتی حیثیت اور سب سے بڑھ کر یہ زندگی ہی میں کامیابی کے لحاظ سے ایک بے مثل چیز ہے۔ چنانچہ سیاسی پہلو کو لیجئے تو آپ نے دس سال کے قلیل عرصہ میں جزیرہ نمائے عرب کے نراج (حکومتی) زیادہ تر خود سر خانہ بدوش قبائل میں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں ایک مستحکم اور بڑی مملکت قائم کر دی تھی"۔

"چینی مسلمانوں میں سب سے مستند سیرت النبی نان کنگ کے ایک عالم لیوچی کی ہے، ان مؤلف کا نام کیٹی لیئن بھی ہوتا ہے، یہ ۱۱۳۴ھ میں لکھی گئی اور بعد میں دس جلدوں میں شائع ہوئی، اسمیں آغاز اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ چین کے بادشاہ نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا کہ اس کے

ے۔ عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ صفحہ ۶

محل میں بھوت گھس آئے ہیں، پھر ایک عمامہ پوش شخص آ کر اپنے ہاتھ میں ایک کتاب تلاوت کرنے لگا تو بھوت گڑگڑانے لگے۔ مگر تلاوت جاری رہی تو تھوڑی دیر میں وہ خاک کا تودہ ہو گئے۔...... قبل اس کے کہ اس روایت کی تنقید کی جائے دو امور قابلِ ذکر ہیں ایک تو یہ کہ بیوچی کا تذکرہ "سعد وقاص" چین کی جس قدیم ترین تالیف میں ملتا ہے وہ خانوادہ منگ کا عظیم الشان جغرافیہ ہے جو ۱۲۷۰ھ میں مرتب ہونا شروع ہوا اور ۸۶۶ھ ۱۴۶۱ میں شائع ہوا، اس میں شہر مدینہ کے حالات پر بھی ایک باب ہے، اور اس میں لکھا ہے کہ سعد وقاص صحابی کی چین میں آمد خانوادۂ سوی کے حکمران کائی ہوانگ کے زمانہ میں ہوئی، دوسری قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ چینی رسم الخط کے باعث جن اشخاص کے بطور سفیر و مبلغ چین آنے کا ذکر کیا گیا ہے ان کا مختلف کتبوں اور کتابوں میں بدلا ہوا ہے۔[1]"

(۱۳) **ڈاکٹر ولی الدین** ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب حیدرآباد کے باشندہ ہیں۔ آپ کے اجداد صاحب منصب و جاگیر تھے۔

جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ڈھاکہ سے ایم۔ اے کی کامیابی کے بعد لندن گئے اور لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی فلسفہ آپ کا مضمون ہے۔ واپسی کے بعد مددگار پروفیسر فلسفہ کی خدمت پر جامعہ عثمانیہ میں مامور ہوئے اور اس کے بعد صدر شعبۂ فلسفہ ہوئے اور اب وظیفہ پاتے ہیں۔

مغربی فلسفہ کو اسلامی فلسفہ کی روشنی میں متعارف کرانا آپ کا محبوب مشغلہ ہے اس عنوان پر کئی کتابیں اور مقالے قلمبند کر چکے ہیں، معیاری رسالوں میں آپ کے مضامین قدر اور عزت کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ قنوطیت، ابطال مادیت، قرآن کا فلسفہ مذہب، اقبال اور حدیث جبر و قدر وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ آپ حیدرآباد اکیڈمی کے

---

[1] مجلہ طیلسانین۔

معتمد ہیں۔ اکیڈمی کی جانب سے کئی مرتبہ بلند پایہ علمی لکچر ہونے کے علاوہ مقالات علمیہ بھی شائع ہوتے ہیں، یہ مقالے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ہیں ان مقالات کی یورپ کے جامعات نے بڑی قدر کی ہے اور ان کے تحقیقی مضامین کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر ولی الدین کے مضامین کی خوبی یہ ہے کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو وہ بڑا دلچسپ اور دلکش بنا دیتے ہیں، عبارت عام فہم سادہ اور صاف ہوتی ہے

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"یہ صحیح ہے کہ خدا کے وجود اور حیات بعد الموت کے انکار کی وجہ سے ایک قسم کی آزادی طبیعت میں سماجاتی ہے اور نیٹشے کی طرح کہا جاتا ہے کہ معاذ اللہ" خدا مرچکا اور اس کی قبریں منادر و مساجد میں بنائی جاچکیں اب ہر چیز جائز ہے" فطرت اور فطرتی ہیجانات برے نہیں اچھے ہیں، شرم و ضبط دور کرنی چاہیئے، جذبات وخواہشات کا اظہار ضروری ہے، آزاد مرد کا اخلاقی اصول اظہار ذات ہے نہ کہ انکار ذات۔ خیام نے تو سارے جہان پر نظر ڈالی، صاحب نظر حکیموں سے مشورہ کیا اور کہا

در عالم خاک از کراں تا بکراں	چندانکہ نظر کنند صاحب نظراں
حاصل ز جہاں ہیو فا چیزے نیست	الا می لعل و عارض خوش پسراں[1]

"بہرحال اتباع نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن" اجملوا فی الطلب کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا

---

[1] ابطال مادیت صفحہ ۲۶

مستقبل سبب یا قطعی علّت نہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے بعد از طلب می یابی اما نہ بطلب می یابی، یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے۔

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی　　کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد[1]

(۱۴) ڈاکٹر یوسف حسین خاں

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے والد مولوی فدا حسین خاں صاحب قائم گنج (شمالی ہند) سے حیدرآباد آکر بس گئے۔ یہاں آپ کی اولاد پروان چڑھی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی پھر تکمیل تعلیم کے لئے علی گڈھ گئے۔ ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں جب جامعہ ملیہ قائم ہوئی تو اس میں شریک ہوئے اور یہیں سے ۱۹۲۴ء میں بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ اسی سال فرانس گئے اور جامعہ پیرس سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر جامعہ عثمانیہ میں ریڈر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا، اور ۱۹۴۵ء میں شعبۂ تاریخ کے صدر بنے، سنٹرل ریکارڈ آفس میں کیوریٹر کی حیثیت سے کام کیا، ۱۹۵۷ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے آپ کے خدمات سے مستفید ہونے کے لئے پرو وائس چانسلری پر آپ کو مامور کیا اس وقت وظیفہ پاتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا شمار ہندوستان کے سربرآوردہ مؤرخوں میں ہوتا ہے۔ انگریزی اور اردو میں آپ کی کئی کتابیں اور مقالے شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو کے شعرا اور ادب سے خاص دلچسپی ہے، آپ شعر و ادب کا پاکیزہ اور سلجھا ہوا انداق رکھتے ہیں۔ تنقیدی شعور میں پختگی اور عمق ہوتا ہے جو بہت کم نقادوں

---

[1] قرآن کا فلسفہ ۲۵

میں نظر آتا ہے۔ اقبال کا آپ نے خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ اقبال کے متعلق آپ نے جو کتاب روح اقبال قلمبند کی ہے۔ وہ دنیائے اردو میں بلند مقام رکھتی ہے اس طرح آپ کی دوسری اردو کتاب "اردو غزل" بڑی کارآمد اور مقبول ثابت ہو رہی ہے۔ اس کے ابتک کئی اڈیشن شائع ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب کی نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"شاعر اپنی تخلیق کا مواد خام تحت شعور سے حاصل کرتا ہے اور اسے اپنے تجربوں میں سمو کر شعوری انداز میں پیش کرتا ہے، لیکن اس کی آواز چونکہ خود اس کے جذباتی تجربے کی گہرائیوں میں سے اٹھتی ہے اس لئے اس میں لبھاؤ ہوتا ہے جس سے سن کر دل اس کی طرف کھنچتے ہیں اس کی بات میں لبھاؤ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ عالمگیر تجربے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ وہی ہے جو ان کے جی میں ہے بقول غالب

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غزل گو شاعر کے تحت شعوری تجربوں پر عشق و محبت کے جذبات چھا جاتے ہیں اور ایسا چھا جاتے ہیں کہ کائنات میں سوائے ان کے انہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہی منزل کی مسافت بھی ہوتے ہیں، اور وہی منزل بھی، وادئ عشق کا مسافر جذبۂ شوق کی آواز پر کشاں کشاں چلا جاتا ہے اور اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟ چلتے چلتے تھک کر چور چور ہو جاتا ہے اور قریب ہے کہ گر پڑے لیکن قوتِ عشق اس کو سنبھال لیتی ہے، ماجرائے عشق کا نقشہ حسرت نے اپنے کلام میں اس طرح کھینچا ہے۔

قوّتِ عشق بھی کیا شئے ہے کہ ہو کر مایوس
جب کبھی گرنے لگا ہوں میں سنبھالا ہے مجھے

(۱۵) آغا حیدر حسن

آغا صاحب دہلی میں پیدا ہوئے مغلیہ خاندان کی نشانی بن کر حیدر آباد میں آکر بس گئے۔ آپ کے والد آغا صفدر حسن دہلوی تھے۔ آغا صاحب کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی، اس کے بعد علی گڈھ گئے اور وہاں سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان کامیاب کرکے حیدر آباد آئے اولاً سررشتہ پولیس میں مامور ہوئے اس کے بعد نظام کالج میں اردو کے لکچرار بنے رہے، مددگار پروفیسری کی خدمت سے وظیفہ حاصل کیا، اب حیدر آباد میں جوبلی ہل پر تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہیں آپ کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا، اور ابتک دوسری شادی نہیں کی، آپ کی لڑکی اور داماد افریقہ میں ملازم ہیں اور لڑکا حضور نظام کی پوتی کو بیاہ کر کے خسر کے پاس ہے۔ دہلی کی زبان، دہلی کی تہذیب اور دہلی کے مشاہیر کے بارے میں آغا صاحب کی رائے حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے، دہلی کی عورتوں وہ بھی شاہی محلات کی بیگمات کی زبان بولنے والا طوطیٔ شیریں سخن لکھتا بہت کم ہے، مگر جب بولنے پر آئیں تو گھنٹوں زبان نہ رکے دوست پرست، دوست کے ہمدرد مخلص، صداقت پسند، صداقت شعار، ظاہر و باطن کی صفائی کے ساتھ تصوّف کا مذاق بھی رکھتے ہیں۔ صوفیا سے دلی عقیدت اور بزرگوں کا ادب، دوستوں سے مروّت، چھوٹوں پر شفقت آپ کے معمول ہیں آغا صاحب کا گھر ایک عجائب خانہ ہے جہاں پرانی تاریخی تصاویر معاشرت کا سامان جمع ہے۔ نمونہ نثر یہ ہے:۔

"صدر دالان میں بیگم صاحبہ کو بہو کا پیام سنا دیا، وہ کہنے لگیں کہ سچ مچ دلہن بیگم کا سیر کو جی چاہا اس پر کیجہ جان نے کہا کہ یہ سر سفید دھوپ میں نہیں ہوا۔ انہیں بٹر چینوں کا اشغلا اٹھایا معلوم ہوتا ہے، دلہن بیوی نے کدھی نہ کہا ہوگا۔ دلہن بیگم یہ انہیں لنکا بیریوں کی پٹی پڑتی ہے، ہاں دواجی کیا ہے، بچّے ہیں کوئی حرج نہیں کہہ دو چلیں گے جمعہ کو، مگر اتنا کرنا کہ ایک آنکھ انتظام دیکھ لینا، میں ابھی آتوں جی سے کہہ دیتی ہوں وہ باہر داروغہ جی کو کہوا دیں گی اور بڑی درو غن کو میں حکم دیتی ہوں

وہ سب سامان مہیا کر دیں گی، چلے گی ساری محل سرائے، عمدہ کے طائفہ کو بلوالو۔ پریا اس کی بیٹی ضرور آئے اور کہنا نقلیں بھی ہوں گی۔ ہوا خوری کو جارہے ہیں، فرنگی کی نقل خدر کرے ڈرے نہیں، باہر نقلیں نہیں ہوں گی، کالے صاحب سے بنگلے کی اجازت منگوالی ہے۔ جاؤ سب تیاریاں کرو۔ مجھے نفل پڑھ لینے دو، ابھی تسبیحاں بھی باقی ہیں، سارے محل میں ایک اُدھم مچ گئی سب نے مہندیاں لگائیں، جن کی مہندیاں پھیکی ہوگئی تھیں انہوں نے اور رچائیں، سُرخ سبز جوڑے پہنے۔ لال سبزے دانک کے لاکھی جوڑے پہنے سب۔ بن سنور گئیں، کل سامان بس ہوگیا، اندھیرے منہ سب اٹھ کے تیار ہو گئے۔

(۱۶) عبدالمجید صدیقی

عبدالمجید صاحب صدیقی کے اجداد حیدرآباد میں کئی صدی سے متوطن ہیں، مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم ہوئی۔ منشی اور دبیر کی کامیابی کے بعد عثمانیہ میٹرک کا انگریزی امتحان دیا، پھر جامعہ عثمانیہ سے بی اے، ایم، اے، ایل، ایل، بی کی ڈگریاں حاصل کیں، بعد کامیابی جامعہ میں تاریخ کے لکچرار ہوئے۔ پھر مددگار پروفیسر بنے، پھر سکندرآباد کالج کے صدر ہوئے اور اب وظیفہ پاتے ہیں۔

صدیقی صاحب ایک خاموش پسند انہماک سے کام کرنے والے شخص ہیں اپنے فن کے ماہر ہیں تاریخ اور سیاست میں انہوں نے ریسرچ کیا ہے اور اپنے ریسرچ کے نتائج کو کتابوں اور مقالوں کے ذریعہ پیش کرکے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ تاریخ گول کنڈہ، تاریخ سیاسیات ان کے شہ کار ہیں اوّل الذکر تاریخ میں گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کی تاریخ ہے۔ زمانۂ حال کے مطابق تیار کی گئی ہے، تاریخ سیاسیات بھی فن سیاسیات کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے، کئی مقالوں میں تاریخ کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے، ان کا مجموعہ بھی ایک ضخیم کتاب کی صورت رکھتا ہے۔ مقدمہ تاریخ دکن، بہمنی سلطنت، اور ارسطو جاہ آپ کی دوسری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

صدیقی صاحب کا اندازِ بیان، دلکش اور دل نشیں ہوتا ہے۔ عبارت

صاف اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ طرز بیان کی سلاست بھی قابل داد ہوتی ہے۔ نمونہ پیش ہے۔

"گول کنڈہ اور بیجاپور کی تسخیر سے مغل سلطنت کو نقصان پہنچا ہی تھا لیکن دکن کو بھی ناقابل تلافی ضرب لگی۔ اس کے تمدّن کی رفتار ترقی بہت دنوں تک رکی رہی، بلکہ دکن کے بعض اقطاع تو ہمیشہ کے لئے بے چراغ ہو گئے۔ قطب شاہوں نے تلنگانے میں جو تمدّن پیدا کیا تھا اس کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا۔ شاہ عالم کے حملے میں شہر حیدرآباد کی اس قدر افسوس ناک تاخت و تاراج ہوئی کہ تمام قطب شاہی تمدّن خاک میں مل گیا۔ مغل قبضے کے بعد بھی شاہی محلات کی خاطر خواہ نگہداشت نہیں کی گئی۔ چنانچہ یہ سب بربادی کی نذر ہو گئے مغل فاتح یہاں سے لاکھوں روپے زر و جواہر توے گئے۔ لیکن قطب شاہی عمارتوں کو برباد ہونے دیا۔ اس وقت حیدرآباد اور اس کے گرد و نواح میں قطب شاہی مساجد کے سوا کسی محل کا پتہ نہیں چلتا حالانکہ مختلف بادشاہوں کے بنائے ہوئے بے شمار محل تھے۔"[1]

"مملکت کی ابتدا کے متعلق اسلام کا تخیل یہ ہے کہ اس کی تشکیل ایک سماجی ضرورت پر مبنی ہے، بغیر مملکت کے معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، چنانچہ سیاست اسلام کے بڑے مفکّر ماوردی کا کہنا ہے کہ "لوگ فطری طور پر اپنے معاملات ایسے رہبر کے سپرد کر دینا چاہئے ہیں۔ جو انہیں ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکے اور باہمی معاملا میں ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ اور اگر ذی وقار اقتدار اشخاص نہ ہوں تو دنیا میں شخصی اقتدار پھیل جائے گا اور تہذیب و اجتماع کا شیرازہ بکھ جائے گا" مقصد کے متعلق ماوردی کہتا ہے کہ دین کی حفاظت ہو، اور دنیا کا انتظام برقرار رہے، چونکہ اس کا کام بلند

---

[1] تاریخ گول کنڈہ۔ صفحہ ۲۴۶

کرداری کی تربیت ہے اس لئے اسلامی مملکت کا مدعا اخلاقی ہے نہ کہ مادری۔
اس کے لئے مملکت ضروری ہے۔ اور یہی حقیقی و فطری توجیہ ہے۔ نہ کہ لاک
اور روسو کی طرح معاہدہ معاشری۔ اب رہا مملکت کا اقتدار اعلیٰ، تو اس کو
عہد نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بلند شخصیت اور اسوۂ
حسنہ سے حاصل کر لیا اور تمام مسلمانوں نے یہ اقتدار نہایت خوشی سے
مان لیا۔[1]

(۱۷) تمکین کاظمی

سید تمکین کاظمی، حیدر آباد کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں کاظمی صاحب کو مزاحیہ نگاری، تنقید نگاری
اور تاریخی مضمون سے دلچسپی ہے اُردو کے معیاری رسالوں میں آپ کے مضامین
شائع ہوتے ہیں۔ ''غنچۂ تبسم'' مزاحیہ مضمون کا مجموعہ اور تذکرہ ریختی وغیرہ آپکی
کتابیں شائع ہو چکی ہیں، عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ تمکین کاظمی صاحب کی
تحریریں دکھنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں، چنانچہ وہ کہتے :۔

''میری مادری زبان اُردو ہے اور میں نے اُردو کا گہرا مطالعہ کیا ہے مگر میں
اس قدر مجبور ہونا پسند نہیں کرتا کہ اماخوا کی بجائے ماما خوا گنڈیوں کے حوض گھنڈیاں
چھپاتے کی بجائے ستیہ گرد، ڈاڑھی اور چپکے ہوئے گال کو پچکے ہوئے گال کہوں.....
میں نے جان بوجھ کر ان الفاظ کا استعمال کیا ہے'' اس صراحت سے واضح ہو سکتا ہے
کہ ان کی طرز نگارش کس نہج کی ہو سکتی ہے۔ غنچۂ تبسم پر مُلّا رموزی نے مقدمہ لکھا ہے
ان کے مزاحیہ مضمون کی داد دی ہے تمکین صاحب کا ۱۹۶۱ء میں انتقال ہوا۔ نمونہ
ملاحظہ ہو :۔

''میرزا صاحب کے پھکڑپن سے ہماری روح ہی فنا ہوتی ہے۔ ہم نے سوچا
کہ مرزا صاحب نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ راستے میں جہاں کہیں ملاقات
ہو گی حضرت لے دے ڈالیں گے وہ وہ بے نقط سنائیں گے کہ توبہ، سنگ آمد و سخت
آمد کہہ کر پہنچ ہی گئے مرزا صاحب نے دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ ایک صاحب

---

[1] تاریخ سیاسیات۔ صفحہ ۱۲۸، ۱۲۹

کو بنوٹ کے کچھ زبانی گُر بتا رہے تھے، ایک شخص کو موجود پا کر مسرت ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو جھک جھک کرنے دو۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے آئیں گے مگر ہمارا بیٹھنا ہی تھا کہ مرزا صاحب نے اپنا لکچر ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے ہماری طرف رسمی گفتگو کے بعد ستار ہارمونیم کا موازنہ شروع کیا اور دیر تک اس پر روشنی ڈالتے رہے"

اس وقت بیگم صاحب کا پارہ ایک سو پندرہ سے بھی کچھ اونچا ہو چلا تھا۔ ہمیں خوف یہ تھا کہیں حملہ آور نہ ہوں۔ مگر خیر یہ گذری کہ ابھی وہ رجز خوانی کر رہی تھیں کہ اذان کی آواز آنے لگی۔ الصلوٰۃ خیر من النوم کو ہم نے دہرانے کے بجائے الصلوٰۃ خیر من الغضب کو تین تین چار چار دفعہ دہرانا شروع کیا۔

"بعض نقادوں کی رائے میں قدیم گیت اور کہانیاں تارودت کا بہترین انگریزی کارنامہ ہے جس سے اس کی ذاتی قابلیت اور اس تارودت پر فرانسیسی اور انگریزی فنون عالیہ کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا یہ کارنامہ سنسکرت میں یک سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے جبکہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ انگلستان سے واپس ہوئی تھی۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا اس کی کم عمری کے پیش نظر اس کے کارنامے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں"

(۱۸) ڈاکٹر محمد غوث مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کا تذکرہ گذشتہ دور کے نثر نگاروں میں آ چکا ہے۔ اور پھر حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد اور حیدر آباد میں جامعہ کے قیام کے پہلے معمار کی حیثیت سے ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں، مرحوم کے قابل فرزند محمد غوث ہیں جو ۱۳۲۷ھ میں تولد ہوئے، دار العلوم سے تعلیم کی ابتدا ہوئی اور جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات سے بی اے، ایم اے۔ ایل ایل بی اور اس کے بعد ڈاکٹریت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرنے سے پہلے جامعہ کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے بھی ایک قابل قدر مقالہ قلمبند کر چکے ہیں، اسلامی فقہ کو جدید قوانین سے مطابقت دے کر آپ نے جو مقالے لکھے ہیں وہ اردو میں نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں، اس کے علاوہ فن تاریخ پر بھی آپ کے کئی مضامین اور مقالے ہیں جو

معیاری رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس میں تاریخی واقعات کو جو تاریکی میں ہیں انکشاف کیا گیا ہے۔

رسالہ "طیلسانین" کو کئی سال تک محمد غوث صاحب کی ادارت حاصل رہی اس زمانہ میں اس رسالہ نے بڑی ترقی کی، دفتر دیوانی و مال کے عربی، فارسی مخطوطات پر آپ کی ضخیم کیٹیلاگ ریویو اور ایتھے کی کیٹیلاگوں کے مماثل ہے۔ جو اُردو میں اپنی آپ نظیر ہے۔ افسوس ہے کہ اس کو شائع نہیں کیا گیا جامعہ عثمانیہ کی اُردو فارسی مخطوطات کی وضاحتی فہرست آپ نے مرتب کی ہے مگر ہنوز یہ شائع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر محمد غوث کی تصانیف یہ ہیں۔ عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"جن اصحاب نے کرناٹک کی تاریخ کی فارسی کتابیں پڑھی ہیں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی مدراس میں ابھی صرف تاجرانہ کاروبار کے نشیب و فراز سے دوچار تھی کہ فرانسیسی حکمت عملی کے ایک استاد دوپلے نے انگریزی تاجروں کو مدراس سے بے دخل کر دیا محض کمپنی کی درد بھری التجاؤں پر اس وقت کے حاکم صوبہ کرناٹک نواب انوارالدین خاں شہید نے جن کا مستقر حکومت ارکاٹ تھا۔ فرانسیسی کار پردازوں کی قرار واقعی تنبیہ کی اور یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں نواب محمد محفوظ خاں اور نواب محمد علی خاں والا جاہ کو فرانسیسی فوج سے مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور بالآخر اس کو فرانسیسی اقتدار سے آزاد کرا کے پھر انگریزی کمپنی کے سپرد کر دیا۔"[1]

"بختاور خاں اورنگ زیب کے زمانہ میں خواجہ سرا تھا۔ اور داروغہ خواجان میں بڑا اعتبار حاصل کیا تھا۔ علم اور متعدد کتابوں کے مؤلف کی حیثیت سے نمود پیدا کیا، آخری کتاب میں اپنی تصانیف کی تفصیل بیان کی ہے۔ شاہی نوازش ان کے حال پر بہت تھی، ۱۰۹۶ھ میں انھوں نے احمد نگر میں انتقال کیا اور خود شاہ خلد مکاں نے نماز جنازہ

---

[1] خاندان والاجاہی کا خاتمہ مجلہ طیلسانین۔

پڑھی، تاریخ کا ان کو خاص ذوق تھا، مراۃ العالم ۱۰۷۸ھ میں اتمام کو پہنچی اور "آئینہ بخت" سے سنہ تالیف کے اعداد برآمد ہوتے ہیں، لیکن ۱۰۸۸ھ (غالباً بعد میں) کے واقعات زیادہ کیے گئے ہیں، سر ہنری الیٹ نے یہ امر تسلیم کیا ہے کہ مشرق کی تاریخ میں یہ کتاب بہت ہی کار آمد اور قابل اسناد ہے۔"

---

(۱۹) وزیر حسن

مولانا نذیر احمد دہلوی کے خاندان سے تعلق ہے، دہلی میں تولّد ہوئے اور ابتدائی تعلیم دینی ہوئی، اس کے بعد حیدر آباد آکر جامعۂ عثمانیہ سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ختم تعلیم پر معتمدی عدالت و تعلیمات میں ملازم ہوئے اور پچپن سالہ عمر پر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

وزیر حسن صاحب اپنی تعلیم کے زمانہ ہی سے اُردو کی خدمت کرنے لگے۔ زبان اور انشاء پردازی کا ذوق ان کو ورثہ میں ملا، کئی افسانے قلمبند کیے۔ ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ مضامین کا مجموعہ "رادھا اور رنگ محل" کے نام سے شائع ہوا ہے، ان کی دوسری تصنیف "چاند بی بی سلطانہ" ہے، یہ کتاب وزیر حسن صاحب کی شہ کار ہے، یہ تاریخ بھی ہے اور افسانہ بھی، دونوں کا امتزاج اس خوبی سے کیا ہے کہ بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

"پھر ان سب جہازوں کا غرباتہ کے ساتھ سینا ندی میں سیلا دیا جس سے چاند بی بی کو یاد آیا کہ ایک دن وہ چوگان کھیل کے آرہی تھی، ساتھ سکھی سہیلیاں تھیں، سب جھومتے پیڑوں، لہلہاتے کھیتوں، ندی کنارے چلی آتی تھیں کہ ایک ہندنی نظر پڑی، دیکھا کہ اس نے ابرک کی چھوٹی سی ناؤ بنائی ہے اس میں گھی کا دیا جلا ہے اور پیتل کی تھالی میں رکھ کے بہت سے پھولوں سے سجایا ہے، جس کی پہلے تو وہ ہندنی پوجا کرتی ہے، پھر کانپتے ہاتھوں سے اس ناؤ کو ندی میں چھوڑ دیتی ہے؟ یہ سب وہ ایسے دھیان گیان سے کرتی ہے کہ اسے یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ اس وقت کون آیا؟ کون گیا؟ اور کون اسے دیکھتا ہے؟ ناؤ پانی کی لہروں پر ہچکولے کھانے لگتی ہے جیسے دل آس نراس کے جوار بھاٹا

میں ہو، دیا ناچتا، مچلتا بہنے لگتا ہے، جس کے ساتھ ساتھ دل بھی بہتے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندی جوگیا گاتی ہے۔ "پیتم ملن کی آس سکھی"
اب وقت، موسم اور راگ کے اثر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دئے کی سنگت میں چلتی ہوائیں، بہتی ندی، جھومتے درخت بھی بہے چلے جا رہے ہیں۔"

---

(۲۰) ابوظفر عبدالواحد

بزرگوں کا وطن الٰہ آباد، جو حیدر آباد آگئے اور یہاں کے ہو رہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں ابوظفر صاحب کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی، رزیڈنسی اسکول اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں تعلیم پاکر نظام کالج میں شریک ہوئے، اس وقت نظام کالج کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا، بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ پھر مدراس یونیورسٹی سے ایم۔ اے انگریزی میں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے فارسی میں ایم۔ اے کی ڈگری لی، یعنی ڈبل ایم۔ اے ہوئے، ملازمت کا آغاز سٹی کالج سے ہوا پھر چادر گھاٹ کالج میں ریڈر اور محبوب کالج سکندر آباد کے پرنسپل ہوکر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

ابوظفر صاحب کا تذکرہ شعراء کے سلسلہ میں کیا گیا ہے، وہ اچھے شاعر بھی ہیں اور بلند پایہ ادیب نثر نگار بھی، ان کی نثر رنگین اور جاندار ہونے کے علاوہ شعر کا حسن رکھتی ہے، ان کی تنقیدی ظرافت میں چاشنی ہوتی ہے، ہندی الفاظ کو اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت رنگین سے رنگین تر بن کر چمک اٹھتی ہے، نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

غرض اسے فلسفہ سمجھیے یا نشہ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی نشۂ مجاز نے شبلی سے بڑے بڑے کام کرائے اور یہی پایان کار سرمایۂ نجات بھی ہوا۔ مجاز کی بہ ظاہر ناکامی قنطرۃ الحقیقت بنی اور چمن زار بمبئی میں بیٹھ کر شبلی نے شعر العجم اور سیرت النبی کے بعض بہترین حصے اپنے امرت بھرے قلم سے لکھے۔ شبلی کی علمیت، ناقدانہ نظر، شاعرانہ ذوق اور مؤرخانہ تلاش و تحقیق کا بہترین کارنامہ عجم کی وہ ولولہ انگیز داستان ہے جسے شبلی نے شعر العجم کا نام دیا ہے، حقیقت میں وہ شاندار کارنامہ ہے جو سیرت النبی سے بھی بزرگ تر کارنامہ کہا جا سکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ سیرت النبی بھی اسی ٹکر کی یا اس سے بڑھ چڑھ کر ہوتی، لیکن سیرت ادھوری ہی رہی، اس لیے

کہ حیات نے شبلی کا ساتھ نہ دیا۔"

---

(۲۱) ڈاکٹر جعفر حسن

امیر حسن صاحب کے فرزند اور نواب محسن الملک کے بھتیجے ڈاکٹر جعفر حسن صاحب حیدر آباد میں ۱۹۰۴ء میں تولد ہوئے مدرسۂ عالیہ اور عثمانیہ کالج میں تعلیم پائی۔ پھر جرمنی گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر جامعہ عثمانیہ میں اولاً معاشیات اور عمرانیات کے لکچرار ہوئے، پھر ترقی کرتے ہوئے شعبۂ عمرانیات کے صدر شعبہ بنے اور اسی خدمت سے وظیفہ حاصل کیا۔ نطشے ان کا محبوب ادیب اور فلسفی ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور اردو زبان کے متعلق خاص ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو وضع اصطلاحات کے موضوع سے خصوصی دلچسپی ہے اور اس عنوان پر غیر معمولی کام کیا ہے۔ ایک لغت بھی مرتب کر رہے ہیں جس کو ان کی زندگی کا اصلی سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن نے عمرانیات کے موضوع پر جو کام کیا ہے وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تجردی زندگی مطالعہ اور تحقیق کے لیے وقف ہوگئی ہے، نثر کا نمونہ پیش ہے:-

"لوتھر نے انجیل کا ترجمہ کرکے جرمن زبان کے ذریعہ جرمن کی وحدت کا بیج بویا۔ اگر لوتھر نہ ہوتا یا لوتھر جرمن نہ ہوتا یا جرمن ہوتا بھی تو اسے جرمن زبان کی مختلف قسموں یا جرمن بولیوں پر عبور نہ ہوتا یا ان مختلف بولیوں کے لفظوں کو استعمال کرتے ہوئے آسان زبان لکھنے کا ملکہ نہ ہوتا تو جرمنی کے اتحاد میں بڑی دشواری ہوتی بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ جرمنی دو یا دو سے زیادہ تمدنی حلقوں میں منقسم ہو جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ جرمن انجیل کی ادیبانہ اور سیاسی اہمیت بہت بعد میں ظاہر ہوئی۔ اس کا مطالعہ زیادہ تر تقدس کی وجہ سے اور الہامی کتاب ہونے کی وجہ سے کیا گیا، مگر نتیجہ تو بہرحال یہی نکلا کہ اس لاجواب ترجمہ کی وجہ سے معیاری ادبی جرمنی وجود میں آئی۔ جس طرح فرانس کا سیاسی، تہذیبی اور ادبی مرکز پیرس تھا۔ ایسی راجدھانی جرمنی میں تو تھی نہیں اگر انجیل کا یہ معیاری ترجمہ نہ ہوتا تو شاید جرمنی کی ادبی اور مرکزی اہمیت کبھی پیدا نہ ہوتی۔ جس طرح

لوتھر نے ایک مذہبی کتاب کے معیاری ترجمے سے ادبی اور قومی زندگی میں بڑا انقلاب پیدا کیا اسی طرح والمیکی نے سنسکرتی رامائن کے ذریعے قومی سیرت وکردار پر صدیوں اثر ڈالا تھا۔"

---

(۲۲) شیخ چاند

شیخ چاند مرحوم حکومتِ آصفیہ کے مہاراشٹر علاقہ کے ایک تعلقہ پٹن سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم یہیں ہوئی۔ امتحان میٹرک سے فارغ ہوکر اورنگ آباد آئے۔ یہاں کالج میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالحق مرحوم کے محبوب شاگرد کی حیثیت سے اونہوں نے ادبی میدان میں نام آوری حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی ڈگری لینے کے بعد ریسرچ کر کے سودا پر مقالہ قلمبند کیا۔ اس زمانہ میں ہنوز جامعۂ عثمانیہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دینے کا تصفیہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے شیخ چاند صاحب باوجود بہترین مقالہ قلمبند کرنے کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل نہ کرسکے۔ ۱۹۳۶ء میں موت نے ان کو سپردِ خاک کردیا، ملک عنبر اور سودا دو کتابوں کے علاوہ ان کے کئی تحقیقی مضمون وسعت نظر اور تفکر کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں، نثر کا نمونہ یہ ہے:-

"سودا کی طبیعت کا یہ نمایاں وصف ہے کہ اس نے ہزل کے تنگ کوچے میں قدم نہیں رکھا بلکہ اپنے لیے ہجو کا وسیع میدان تجویز کیا، یہ رسماً خوش طبعی یا دل بہلانے کی خاطر نہیں بلکہ ضرورتاً اس نے اپنا دل بہلانے یا لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ہجو نہیں کہی ہے۔ اس کی ہجوگوئی کے بس دو ہی محرکات تھے، یا تو وہ کسی سے ناراض اور خفا ہو یا پھر کوئی ایسا واقعہ نظر سے گذرے جو خود موجبِ تضحیک ہو، ہجو اس کے دل سے نکلتی تھی جس میں تصنع کو کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ بھی اس کے کردار کا ایک وصف ہے، وہ کبھی ایسی چیز یا واقعہ کو دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتا تھا جو خود تضحیک کا باعث ہو یا کوئی امر اس کے ناگوارِ خاطر ہو، وہ ضبط وصبر سے اس باب میں زیادہ کام نہیں لیتا تھا بلکہ فوراً ناگواریٔ خاطر کا انتقام اور شخصی مضحک کی سرزنش ہجو سے کرتا تھا، یہ ایک طاقتور حربہ اس کے پاس تھا جس کے استعمال کی فطری صلاحیت اس میں تھی، اس نے ہر صنفِ نظم کو اپنی ہجوگوئی کا ذریعہ بنایا، نظم کی کوئی صنف ایسی نہیں کہ جس

میں اس کا ہجویہ کلام موجود نہ ہو۔"

---

(۲۳) میر حسن

میر حسن حیدر آباد کے سپوت ہیں ۱۹۱۱ء میں تولد ہوئے۔ یہاں ہی تعلیم اور تربیت ہوئی، جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی آپ جامعہ کے تعلیمی زمانہ سے اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بزم اُردو کے سکریٹری، انجمن طلبہ جامعۂ عثمانیہ کے صدر، مجلہ طیلسانین کے ایڈیٹر رہے ہیں، محترمہ زینت ساجدہ نے اپنی کتاب "حیدر آباد کے ادیب" میں یہ صراحت فرمائی ہے کہ "میر حسن کو حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے بڑے مجلسی آدمی ہیں۔ ہر بزم میں گلدستہ اور ہر چمن میں پھول، جس محفل میں ہوتے ہیں وہ لطائف و ظرائف سے زعفران زار بن جاتی ہے۔"

میر حسن ڈرامہ بھی لکھا کرتے ہیں اور افسانے بھی، تنقیدی مضامین بھی اہمیت رکھتے ہیں پہلے حیدر آباد کی نشر گاہ میں مامور تھے اور اب آل انڈیا ریڈیو سے تعلق ہے۔ میر حسن کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"اُردو کے مغربی شیدائیوں میں گارساں دتاسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے اُردو ادب کی تاریخ فرانسیسی زبان میں لکھی، اس مشہور مستشرق کے احسانات پر کسی آیندہ صحبت میں روشنی ڈالی جائے گی، اُردو ایک زندہ زبان ہے، اس سے جن اقوام کو گذشتہ آٹھ نو سو سال کے دوران میں ہندوستان سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے ان کے آثار ان کے لغات اور اسالیب میں محفوظ ہیں۔ اُردو مشرق کی وسیع ترین زندہ زبانوں میں سے ہے اس کو وسیع تر بنانے کے لیے ہم نے عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کو لوٹ کر بے شمار لغات، انداز اور اسالیب میں محفوظ ہیں۔ اُردو مشرق کی وسیع ترین زندہ زبانوں میں سے ہے اس کو وسیع تر بنانے کے لیے ہم نے عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کو لوٹ کر بے شمار لغات، انداز اور اسالیب بیان کا اس میں اضافہ کیا، ہندی، تلنگی، مرہٹی اور دوسری مقامی بولیاں اور زبانیں بھی اُردو کی دست درازیوں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ زبان اُردو، ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے گذشتہ ہزار سالہ اتحاد کی بہترین اور زندہ یادگار ہے۔ ابتدا سے

اس وقت تک برابر ترقی کے راستہ پر گامزن ہے۔ بالخصوص اورنگ زیب کی حکمرانی کے ابتدائی دس سال کے واقعات بہت ہی قابلِ لحاظ ہیں[1]۔"

---

(۲۴) سیّد محمّد صاحب

سیّد محمّد صاحب کا وطن بھی حیدرآباد ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی میں کامیابی حاصل کی، پہلے سٹی کالج میں لکچرار بنے۔ پھر جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے مددگار پروفیسر رہے اور اب وظیفہ پاتے ہیں۔ مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی ہے۔ "ارباب نثر اُردو" آپ کی قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں آپ نے فورٹ ولیم کالج کے اُردو نثر نویسوں کا تحقیقی اور تنقیدی تذکرہ کیا ہے، اس کتاب کے پیش نامہ میں ڈاکٹر سیّد عبداللطیف نے جو صراحت کی ہے اس میں مؤلف کی محنت کا اندازہ ہو سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں "مؤلف نے جس تحقیق و تلاش سے منتشر مواد کو خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش و لائق قدر ہے، اس کتاب کو لکھ کر مؤلف نے ادبیات اُردو میں تاریخی، تحقیق و تدقیق کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

نمونہ عبارت حسبِ ذیل ہے:۔

"تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب حقیقت سے سب واقف ہیں کہ انگریز اس ملک میں تجارت کے بہانے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ملک گیری اور تسخیرِ سلطنت شروع کر دی، ملک کے حالات نے ان کی مساعدت کی مرکزی حکومتِ مغلیہ کی کمزوری اور صوبہ داروں اور راجاؤں کے آپس کے نفاق نے بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان پر حکمران بنا دیا ...... یہ ایک عجیب بات ہے کہ اُردو کی ترقی میں ایک ایسی قوم کو حصہ لینا پڑا جو اہل زبان یعنی ہندوستانیوں سے صورت شکل، رنگ، لباس، و ... ج ہر حیثیت سے جدا تھی، یہی قوم جس نے اہلِ ہند کے بابیوں۔ ... ستان کی حکومت چھین لی اور خود اس کی مالک بن بیٹھی۔ ان کی زبان کی ترقی کا باعث ہوئی، اسی قوم

---

[1] دفتر دیوانی کے مخطوطات۔

کی ہر وقت توجہ نے اہلِ ہند کی عام زبان یعنی اُردو کی پرورش کی اور اپنی مسیحا نفسی سے اس کے قالبِ مردہ میں جان ڈال دی[1]"۔

---

(۲۵) ناکارہ محمد شفیع الدین صاحب ناکارہ لقب، حیدرآباد وطن، نظام کالج میں تعلیم پائی، مگر خانگی مجبوریوں کے باعث بی۔اے کا امتحان نہ دے سکے، زمانۂ تعلیم ہی سے مضمون نگاری سے دلچسپی رہی۔ اخبار رہبر دکن میں آپ کے مضمون شائع ہوتے رہے، اس کے بعد آپ نے مزاحیہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس میں بڑی دستگاہ حاصل کرلی ہے۔ اُردو کے معیاری رسالوں میں آپ کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ "صمدانی" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔

ناکارہ صاحب کے مزاحیہ افسانے، ڈرامے اور مضامین مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کسی میں طنز ہوتا ہے تو کسی کے خاکے میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسی پر مجبور ہوجاتے ہیں، کسی مضمون میں اپنی گردوپیش اور تجربہ کی باتیں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہم ہنسی پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشار پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد ہی غیر معمولی شگفتگی پیدا کرلیتا ہے۔ ناکارہ کے مضامین قہقہہ کی سرحد میں نہیں پہنچتے، ان کے مزاحیہ اور طنزیہ مضمون سبق آموز ہوتے ہیں، صرف ہنسنا ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ فنّی حیثیت سے ناکارہ کے مضمون اہمیت رکھتے ہیں اور وہ اُردو کے مزاحیہ نویسوں کی صفِ اوّل میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

> میں نے چچا ابّا کو دیکھا وہ باری باری سے میری اور اس عورت کی صورت تک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہم دونوں میں شوہر کون ہے اور بیوی کون؟۔
>
> میں نے چچی جان کو دیکھا وہ محبّت بھری نظروں سے اپنی نام نہاد بھتیجی بہو کو دیکھ رہی تھیں، غالباً ان کا دل چاہ رہا ہوگا کہ اس کو گلے سے لگالیں

---

[1] ارباب نثر اُردو صفحہ ۹۰۸

اور خوب پیار کریں اور اس کی زندگی دردناک افسانہ سنیں اور اس کا اشک آلودہ چہرہ دیکھ کر خود بھی آنسو بہائیں۔" (ناشادی[1])

"صمدانی نے ایک مرغی آغا کے اتاری، ڈرکر یوں پیچھے ہٹے جیسے مُرغی کاٹ کھائے گی، بولے ارے یہ کیا واہیات ہے، پھینکو اسے پھینکو، نانسنس، میں ان کو اندر لے گیا۔ کمروں کو ناک بھوں چڑھا کر دیکھا، فرمایا ناٹ بیڈ (بُرے نہیں) کام چل جائے گا۔ صوفے نہیں ہیں، آل رائیٹ آل رائیٹ کوئی مضائقہ نہیں، باتھ روم کون سا ہے؟ میں ذرا نہالوں پھر فرصت سے ٹاک (گفتگو) کریں گے۔" (مشرقی اور مغربی تہذیب کی ٹکر[2])

خالدہ:۔ ایک بات ذہن میں آئی ہے کملا۔

کملا:۔ کیا بات؟ جلدی سے کہیے۔

خالدہ:۔ تم نے ابھی کہا تھا سلمہ کسی کو پہچانتی نہیں، میری رائے ہے کوئی عورت اس کی بہن بن جائے۔

کملا:۔ آپ ــــ آپ کا مطلب ہے کوئی عورت جھوٹ موٹ اس کی بہن بن جائے۔

خالدہ:۔ وہ اس کے سامنے جاکر کہے لو سلمہ میں آگئی۔

کملا:۔ خوش ہوکر بڑی اچھی ترکیب ہے، خالدہ میں جانتی تھی تم ایسی ہی کوئی ترکیب بتاؤگی یہ دھوکا تو ہے مگر کوئی اور صورت بھی تو نہیں کہ اس سکرات سے اسے چھڑایا جائے۔"[3]

---

(۲۶) سنہا سری کرشن صاحب سنہا۔ حیدرآباد کے متوطن ہیں، ان کے اجداد رتلام سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے، جو وہاں وزیراعظم تھے۔ سری کرشن صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی، آپ کا خاندان حیدرآباد کے

---

[1] صمدانی

[2] "

[3] ماہ نو، جولائی ۱۹۴۹ء۔

معزز کائستھ خاندانوں میں شمار ہوتا ہے، سنہا صاحب کی اُردو، فارسی اور انگریزی تعلیم اولاً گھر پر ہوئی، پھر سٹی کالج سے میٹرک میں کامیابی حاصل کر کے جامعۂ عثمانیہ سے بی اے کی ڈگری لی، اکثر مضامین میں امتیازی نمبر حاصل کیے، آپ کو امتیازی قابلیت کا وظیفہ ملا، جامعہ کی زندگی میں انہوں نے اُردو اور انگریزی مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی سلیس اور شُستہ اُردو اور انگریزی لکھنے میں انہیں کمال حاصل ہے اور ایک اچھے ادیب ہیں، ان کے مضامین اور افسانے اُردو کے معیاری رسالوں زمانہ ساقی، سب رس، مجلہ عثمانیہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں، ان کا ایک مقالہ اشتراکیت کے عنوان سے بہت پسند کیا گیا تھا۔ حیدرآباد سول سروس میں شامل ہوئے اور اس وقت ایک ضلع کے کلکٹر ہوئے اور اب مرکزی حکومت میں سکریٹری ہیں۔ آپ کے اُردو کے افسانے کے دو مجموعے "رم جھم" اور "زمیں کانپ رہی تھی" کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں، آپ ایک ترقی پسند مصنّف ہیں اس لیے مزدور، قحط، سرمایہ دار، جنگ کی ہولناکیاں سب موجود ہیں۔ یہ افسانے آسان اور عام فہم ہیں، ان کی تشبیہیں دلکش ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں طنز کی ہلکی چاشنی بھی ہوتی ہے، حقیقت نگاری اور فلسفیانہ سوچ بچار پختگی خیال ان کے افسانوں کی خصوصیات ہیں، ایک انگریزی کتاب "مسلم سلاطین دکن" جلد اوّل بھی شائع فرمائی ہے۔

"رات ہو چکی ہے ہوا کے جھونکے جھومتے، گیت گاتے نظر آنے لگتے نہر کا صاف و شفاف پانی کسی رنگین پری کے روپ میں نظر آنے لگا، وہ تھوڑی دُور تک اسی دھن میں مست چلا گیا، مگر کچھ لوگوں کی آواز سے آخر اس کے خیال کا تانتا ٹوٹ گیا، وہ ان لوگوں تک پہنچ کر ان کی باتیں سُننے لگا اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ یہ قافلہ بھی اپنے گاؤں کو چھوڑ کر آب و دانہ کی کوشش میں بڑے شہر کو جا رہا ہے تو اس کے جسم میں ایک خطرے کی لہر دوڑ گئی، اس نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ لوگ بڑے شہر کو اس سے پہلے پہنچ گئے تو سارا کھیل بگڑ جائے گا ان کو روٹی مل جائے گی اور وہ مایوس ہوگا۔ اس خیال نے اس پر تازیانے کا کام کیا اور وہ زیادہ تیزی سے چلنے لگا یہاں تک کہ وہ ان لوگوں سے بہت آگے نکل گیا۔ وہ لوگ اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے، شیامو نے اطمینان کا سانس لیا۔" (زمیں کانپ رہی تھی)

"میری شادی ہوگئی، محبت کا کنگن اجیت نے مجھ کو پہنا دیا، میں یہ محسوس کرنے لگی کہ مجھ کو آزاد فضا سے نکال کر محبت و عشق کے پنجرے میں قید کر دیا گیا۔ لیکن یہ وہ قید نہ تھی جس کی شکایت بلبل کرتی ہے بلکہ میری تمنّا اور آرزو کی تکمیل کی قید تھی۔ انتہائی خوش کن اور مسرت خیز۔ اجیت کی تھوڑی دیر کی جدائی بھی مجھ کو گوارا نہ ہوتی، اجیت جب کورٹ جاتے تو میں کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی، آنکھیں کتاب کے ورقوں پر لیکن کان کسی کی آواز کے منتظر ہوتے۔ کوئی سال بھر عیش و عشرت میں گذر گیا۔ میں نے کبھی بے اتفاقی کی بھیانک صورت نہ دیکھی، لیکن دُنیا آخر دنیا ہے۔" (بُت شکن)

---

(۲۷) رشید قریشی

حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ سے استفادہ کیا ہے۔ ایم۔ اے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ افسانہ نویسی میں نام پیدا کیا ہے، جامعہ کے ان فرزندوں میں شامل ہیں جنہوں نے افسانہ کو اپنے قلم کا جولان گاہ بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "من کی دنیا" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر زور کے یہ الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں :۔

"اس مجموعہ کا مطالعہ کرنے والا تن کی دُنیا کو تھوڑی دیر کے لیے بالکل بھول جائے گا کیونکہ ان افسانوں میں زیادہ تر ایک نوجوان کی خیال کی بستی "آباد ہے" ان میں سے اکثر شباب کی تفسیریں ہیں، ان میں سوز ہے، مستی ہے، جذب ہے، شوق ہے اور کہیں کہیں شاید یک گونہ عُریانی بھی ہے، جس کو آج کل شبابیات کے نام سے بدقسمتی سے اُردو ادب میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔"

اور پروفیسر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے :۔

"رشید قریشی کے قصّوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یہ تقریباً سب کے سب ان کے طبعزاد ہیں، اس لیے یہ ہماری زندگی کے نقشے معلوم ہوتے ہیں۔ ان قصّوں کے مطالعہ کرنے والے رشید صاحب کے مشاہدے انتخاب اور پیش کش کے انداز کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔"

ان آرا سے رشید صاحب کے افسانوں کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رشید ایک ترقی پسند افسانہ نگار ہیں، اگرچہ ان کے یہاں مزدور کی حمایت، سرمایہ داری کی مخالفت نہیں ہے وہ رومانی افسانے لکھتے ہیں اور خوبی یہ ہے کہ بات میں بات نکل آتی ہے، دوپٹوں کی سرسراہٹ اور چوڑیوں کی جھنکار میں ان کے افسانے پروان چڑھتے ہیں، بہرحال رشید ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں، مزاحیہ نگاری میں بھی دسترس ہے۔

"باہر دروازہ پر کچھ آہٹ ہوئی، میں نے سمجھا کہ وہ ...... کیا رمیش بابو ہیں یہ کون ہیں ؟ میں نے دل میں کہا یہ وہ دوست ہیں۔ بڑے حسن پرست ہیں ایک دفعہ کہہ رہے تھے، حسن کو ایک کے لیے مقید کرنا پاپ ہے واہ گویا سب کو آنکھیں سینکنے کا موقع دینا چاہیے...... میں انہیں کی آواز سے پہچان گئی، رمیش بابو نہیں ہیں، مَیں نے بڑبڑانا شروع کیا، وہ گھر میں نہیں رہتے انہیں اب گھر میں کوئی لطف نہیں آتا۔ وہ سیر کرنے گئے ہیں ...... دروازہ پر پہونچکر میں نے بسورتے ہوئے کہا رمیش بابو نہیں ہیں۔"

ایک دوست سے ملنے گیا میرے ہوش وحواس پر جیسے بجلی گر پڑی۔ کلثوم ایک چھوٹے بچّے کو گود میں لیے میرے سامنے سے گزر گئی۔ اتنے میں میرا دوست بھی آ گیا۔ کہنے لگا "کیوں کیسی ہے یہ ہماری نئی آیا۔" "مبارک" میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ لگی ہے۔ مگر یار تعجب ہوتا ہے گاؤں والیوں میں بھی اتنی تمیز، اتنی شرارت اور دل موہ لینے والے ڈھنگ ہوتے ہیں، وہ ہنسنے لگا۔ میں نے خون کے گھونٹ پیے صرف جی ہاں کہا اور دوبارہ کبھی اس کے گھر نہ گیا۔"

"موت پر کس کا زور چل سکتا ہے۔ بنواڑی لال تھوڑی سی علالت کے بعد تیس سال کی عمر ہی میں مر گیا —— ایک بیوی کو دنیا سے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے لیے زندہ چھوڑتے ہوئے ایک نوجوان۔ بیوی کو جس کی اُمیدوں اور آرزوؤں کے چراغ اپنی پوری روشنی سے اس کے دل کو منوّر کر رہے تھے۔ شیلا اب وہ بیوہ تھی۔" (من کی دنیا)

---

(۲۸) جلیس

ابراہیم جلیس، حیدرآباد وطن علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ ترقی پسند مصنّفین میں شامل ہیں، افسانہ نگار ہیں اور بہت جلد انہوں نے ترقی کی ہے اور ایک مشہور افسانہ نگار کی حیثیت سے دُنیائے اُردو میں نام آوری حاصل کرلی ہے، جلیس ترقی پسند صاحب طرز افسانہ نگار ہیں، انہوں نے اپنا راستہ آپ بنالیا ہے اور دوسرے ان کی طرز کی پیروی کرنے لگے ہیں، وہ لطیف طنز کرتے ہیں۔ باتوں باتوں میں طنزیہ جملے پوشیدہ ہوتے ہیں جن کو سطحی نظر میں محض مزاح سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کے عمق میں طنز کی گہرائی نہیں ہوتی ہے، گھر کی اندرونی اور باہر کی زندگی کی سیاست کو ہم آہنگ کرنا جلیس کا کام ہے۔ ان کو معاشرتی اور سیاسی افسانے لکھنے کا خاصہ ملکہ ہے، ان کے افسانے اُردو کے معیاری رسالوں میں بڑی قدر کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے افسانہ نگاروں میں ان کو مختلف حیثیت سے تفوق حاصل ہے، ان کے افسانوں کا پلاٹ کردار دونوں قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ سینکڑوں افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔ ان کے مجموعے اب تک حسبِ ذیل شائع ہو چکے ہیں:۔

(۱) چور بازار ناول (۲) زرد چہرے، افسانے (۳) چالیس کروڑ بھکاری، افسانے (۴) کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں (۵) بھوکا ہے بنگال (۶) ترنگے کی چھاؤں میں (۷) گورے گئے کالے آئے (۸) دو ملک ایک کہانی (۹) جیل کے دن جیل کی راتیں۔ اس وقت پاکستان کے اخبار جنگ کے اسٹاف میں شامل ہیں۔ نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

جب سے موجودہ مالک مکان نے ہمیں مکان خالی کرنے کا نوٹس دیا ہے ہمیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے:۔

ہم ایک مکان صرف اس لیے کرائے پر لیتے ہیں کہ اس میں رہ کر دوسرا کرائے کا مکان تلاش کرتے رہیں۔

ہم کوئی مکان کرائے پر لیتے ہیں، ہم سے عموماً دو قصور سرزد ہوتے ہیں۔
پہلا قصور کہ ہم ہر مہینے نہایت پابندی سے مقررہ تاریخ پر مکان کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔

ہر مہینہ نہایت پابندی سے مکان کا کرایہ ادا کرنا موجودہ مالک مکان کے لیے چونکہ انوکھی بات ہے اس لیے مالک مکان کھٹک جاتا ہے کہ ضرور کوئی

گھپلا یا چکر ہے! یہ کرایہ دار، نہ تو عام کرایہ داروں کی طرح نادہند اور جھگڑالو ہے اور نہ رینٹ کنٹرول کے محکمے یا عدالت میں رجوع ہوتا ہے۔ یہ تو کوئی بڑا گھنا آدمی معلوم ہوتا ہے اور گھنے آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسے پہلے مکان سے نکالو۔

دوسرا قصور براہِ راست ہمارا تو نہیں لیکن قصور، قصور ہوتا ہے اور وہ قصور یہ ہے کہ:-

مکان کرائے پر لینے سے پہلے ہم مالک مکان کو سال چھ مہینے جو کرایہ پیشگی (ایڈوانس) ادا کرتے ہیں۔ ایڈوانس سال چھ مہینے ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جب تک ہمارا "ایڈوانس" مالک مکان کے مکان میں رہتا ہے، ہم بھی مالک مکان کے مکان میں رہتے ہیں۔ ادھر مالک مکان کی جیب ایڈوانس سے خالی، تو ادھر ہم سے بھی مکان خالی۔"

---

(۲۹) جانکی پرشاد

حیدرآباد آپ کا وطن ہے یہاں ۱۹۰۰ء میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ہوئی، پھر نظام کالج میں تعلیم پانے کے بعد سرکاری ملازمت میں شامل ہوئے۔ اٹھارہ سال تک سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ میں ملازمت کرتے رہے اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں محکمۂ اطلاعات میں تبادلہ ہوا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اس دفتر کے نائب ناظم بنے۔

جانکی پرشاد صاحب مشرقی تہذیب و تمدّن کے گرویدہ ہیں۔ ہندو مُسلم اتحاد اور امن و شانتی کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ اسی اُصول کے حامی اور موئد ہیں۔ عرصۂ دراز تک انجمن "قیامِ امن" کے پبلسٹی آفیسر رہے۔ اس انجمن نے اپنے دورِ حیات میں بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جس کا سہرا جانکی پرشاد صاحب کے سر ہے۔

زمانۂ تعلیم ہی سے آپ کو مضمون نویسی تصنیف و تالیف کا شوق رہا۔ تاریخی، اصلاحی، سماجی اور تعلیمی مضامین سے زیادہ شغف رہا۔ نشرگاہ حیدرآباد نے اکثر آپ کی تقریریں نشر

ہوتی ہیں جو معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتی ہیں۔ پولیس ایکشن کے بعد دفتر اطلاعات کے ڈپٹی ناظم ہوئے اور اب وظیفہ پاتے ہیں۔ انڈین کانفرنس آف سوشل ورک کے سکریٹری ہیں اور اُردو مجلس کے صدر ہیں۔

"عصرِ جدید" کے نام سے جانکی پرشاد صاحب کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع کے چہل سالہ جوبلی کے موقع پر شائع ہوئی، اس میں دورِ عثمانی کے نظم و نسق کی ترقی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہم اصلاحات اور ترقیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کا اسلوبِ بیان صاف، سادہ، عام فہم اور دلچسپ ہوتا ہے۔ نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

"جامعۂ عثمانیہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کی علمی سرگرمیوں نے اپنے فرزندانِ تعلیم سے گزر کر خصوصاً" بلدۂ حیدر آباد اور عموماً" مستقر ہائے اضلاع وقصبات کی رعایا میں ایک عام علمی چہل پہل پیدا کر دی ہے، اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے دورِ حکمرانی میں جس قدر اخبارات اور رسالے حیدر آباد سکندر آباد اور بعض مستقر ہائے اضلاع سے نکل رہے ہیں ان کی نظیر کسی گذشتہ دور میں پائی نہیں جاتی، یہ اخبارات اور رسائل زیادہ تر اُردو زبان میں ہیں مگر تعدادِ اشاعت میں ہم کو انگریزی، تلنگی، مرہٹی اور کنڑی اخبارات و رسائل کے نام بھی ملتے ہیں[1]۔"

---

(۳۰) بال ریڈی

آپ حیدر آباد کے ایک ریڈی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعۂ عثمانیہ سے استفادہ کیا۔ بی۔ اے اور ڈپ ایڈ میں کامیابی حاصل کی، سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہیں، اُردو سے خاص دلچسپی ہے مقالے اور مضامین لکھا کرتے ہیں۔ جو سبق آموز اور اصلاحی ہوتے ہیں، مضامین سے گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ بال ریڈی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

"مہاتما گاندھی نے دسمبر ۱۹۴۵ء میں بمقام "رام پور ہاٹ" اس بارے

---

[1] عصرِ جدید صفحہ ۴۴۔

میں بالکل بجا فرمایا کہ :۔" اگر ہم سارے ہندوستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ہمارے پاس آئیں تو ہماری ایک مشترک زبان ہونی چاہیے اور یہ زبان ہندوستانی ہی جو لوگ ہندوستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہندوستان کی دونوں اشکال اور رسم الخط (اردو، ہندی) سیکھنا چاہیے۔ اس ضرورت کو ہماری اپنی بین قومی زبان لنگوا فرینکا نے (چاہے ہم اسے اُردو کہیں یا ہندی یا ہندوستانی) پورا کر دیا ہے۔ یہاں اس بات کے بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ اس زبان کو بنانے، پال پوس کر پروان چڑھانے اور ارتقائی منازل سے گزار کر موجودہ حالت پر پہنچانے کا سہرا کسی خاص قوم و مذہب کے سر نہیں ہے بلکہ اس کی پرورش اور پرواخت میں مادرِ ہند کے دونوں سپوت ہندو اور مسلمان برابر کے حصہ دار ہیں، یہ ایک بڑی غلط فہمی اور لاعلمی ہے کہ اس زبان کو کسی خاص مذہب یا فرقہ سے متعلق کر کے اُردو اور ہندی کا جھگڑا کیا جائے۔ کیونکہ اُردو اور ہندی میں بجز طرزِ نوشت کے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔"

---

(۳۱) غلام پنجتن

غلام پنجتن صاحب کے دادا ضیاء الحسن صاحب حکومتِ آصفیہ میں تعلقدار (کلکٹر) تھے اور والد سراج الحسن المخاطب نواب سراج یار جنگ ناظم تعلیمات اور پھر ہائی کورٹ کے جج رہے، غلام پنجتن صاحب کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی، مگر عمر کا ایک حصہ تعلیم کے سلسلہ میں شمالی ہند میں بسر ہوا، علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہوئے اور پھر یورپ جا کر اس کی تکمیل کی، آپ کی سیاسی خدمات سے اس وقت بحث نہیں ہے، مولانا محمد علی شوکت علی وغیرہ کے ساتھ آپ بھی شریک رہے ہیں اور عملی کاموں میں حصہ لیا ہے، حیدر آباد کے مشہور اخبار "رعیت" ہی کے لیے آپ نے سیاسی مضامین قلمبند کیے ہیں حکومتِ آصفیہ میں سلک ملازمت میں شامل ہونے کے بعد عملی سیاست سے دست بردار ہوگئے۔

غلام پنجتن صاحب کی ملازمت کا آغاز سررشتۂ عدالت سے ہوا، ناظم عدالت ضلع اور پھر سشن جج کی خدمت سے وظیفہ حاصل کیا۔ آپ شاعر ہیں اور سوانح نگار بھی۔ شمشاد

آپ کا تخلص ہے، نثر نگاری میں ادب، تاریخ اور سوانح نگاری سے آپ کو دلچسپی رہی ہے چونکہ آپ کی عمر کا ایک بڑا حصہ حیدر آباد کے اعلیٰ عہدہ داران کے ساتھ بسر ہوا اور بڑے غور سے ان اصحاب کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اور نفسیات سے آپ کو بڑی دلچسپی رہی ہے اس لیے سوانح نگاری کے فن میں آپ کو بڑی اچھی دستگاہ حاصل ہوگئی ہے، اُردو کے بہترین سوانح نگاروں میں غلام پنجتن صاحب کو شریک کرنا چاہیے، نمونہ پیش ہے:۔

"اُن کا دستر خوان بہت وسیع تھا اور عمدہ عمدہ کھانے پکتے تھے۔ وہ اپنے احباب کو، وہ کسی مرتبے کے کیوں نہ ہوں لنچ پر مدعو کرتے تھے، ڈنر کبھی شاذ ہی دیتے تھے، البتہ اپنے پُرتکلف احباب کو ڈنر پر ساتھ بٹھا لیتے اور جب کوئی بے تکلف دوست باہر سے آتے ہی تو اس کو مدعو کرتے، ایسے موقعوں پر ناچ گانا بھی ہو جاتا۔ وہ ہفتے دو دفعہ جاگیرات کے مقدمات کی سماعت کرتے، اس کے لیے عموماً سہ پہر کا وقت مقرر ہوتا۔ بحث سماعت کر کے اسی وقت فیصلہ کر دیتے، نواب صاحب مرحوم کو تجارت سے بھی لگاؤ تھا اور وہ کئی کمپنیوں کے ڈائرکٹر تھے، اپنی خود رائے رکھتے تھے......

(سالار جنگ حیدر آباد کے بڑے لوگ)

بُہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ادب وسیاست کے ساتھ ساتھ انہیں دیگر مذاہب کے فقہ و دینیات سے بھی دلچسپی تھی اور ہر مذہب کے مسئلہ مسائل کو سمجھتی تھیں، مجھے اس کا علم بڑے اچنبھے کے طور پر پہلی مرتبہ قائداعظم کی شادی کے زمانہ میں بمبئی میں ہوا، حیدر آباد کے بعض نوجوانوں کو ان کی وہ تقریر یاد ہوگی جو اعظم جنگ کے زمانہ وائس چانسلری میں مرحومہ نے یونیورسٹی میں میلادالنبی کے موقع پر ان کے اصرار پر برجستہ کرنی شروع کر دی، جس میں قرآن کی آیتوں کا لفظی ترجمہ بھی تھا اور احادیث بھی، سچ ہے آسمان سو سال چکر کھاتا ہے جب ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے۔

عزیز ماں مری ہنس مکھ مری بہادر ماں
تمام جوہر فطرت جگا دیئے تو نے

---

(۳۲) ڈاکٹر محشر عابدی

سیّد محمد محسن نام، محشر تخلص، ۱۹۱۰ء میں حیدر آباد میں تولّد ہوئے، خاندان عبدالحلیم شرر کے چشم و چراغ ہیں، حیدر آباد میں تعلیم و تربیت ہوئی، جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ ایس۔ سی کے بعد حیاتیات میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، جامعۂ عثمانیہ میں اسی شعبہ میں صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ محشر عابدی سائنس کے ڈاکٹر ہیں مگر ان کو شاعری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری سے شغف ہے بلکہ ان کا سب سے مرغوب اور پسندیدہ موضوع افسانہ نگاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کی فہرست خاصی طویل ہے۔ "غبار کارواں" کلام کا مجموعہ ہے، افسانوں اور ڈراموں کی کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) محشرستان (۲) روپ متی اور بہار بہادر (۳) رستم اور سہراب (۴) سیزر اور کلوپٹرا (۵) حیات کیا ہے (۶) مطالعہ قدرت (۷) مس اور دوسرے افسانے (۸) آجکل۔

محشر عابدی کے افسانہ کا نمونہ۔ مختصر افسانوں کے مجموعہ "مس" سے لیا گیا ہے:۔

"سورج سیکڑوں بار نکلا اور ڈوب گیا، تارے چمکے اور روپوش ہوگئے، سردیاں آئیں اور گذر گئیں، برسات آئی اور ختم ہوگئی۔ سیکڑوں پیدا ہوئے اور دنیا سے کوچ کر گئے، دنیا نے بہت سی یاد کی ہوئی باتیں بھلا دیں ——— اور شیام سُندر نے بھی موہنی کا نام اس طرح فراموش کر دیا جیسے کوئی احسان کر کے بھول جائے ——— ایک مدت مزید گذر گئی۔ شیام سینکڑوں جلسوں، میلوں، تماشوں وغیرہ میں شریک ہوا، لیکن کبھی نہ تو اسے موہنی کا نام یاد آیا نہ کبھی اس کے کارڈ کا خیال دامنگیر ہوا۔ رائل سینما میں میری پکفورڈ فلم میں کام کر رہی تھی، لوگوں کا ہجوم تھا، شیام بھی دیکھنے گیا تماشا اچھا تھا، جب وہ باہر نکلا تو نگاہوں میں ایک خمار سا جھلک رہا تھا اور وہ تماشہ کے حالات میں بالکل کھویا ہوا تھا، وہ اسی حالت میں ہلکے ہلکے دھکے کھاتا باہر نکل گیا۔

"ڈیر موہنی ؟" یہ ایک انسانی آواز تھی جو ایک مترنم لہجہ میں رقص کرتی ہوئی شیام کے کانوں سے متصادم ہوئی اور وہ چونک پڑا، جیسے ایک ملازم جو رات کی تاریکی میں تھکا ہوا ایک کونے میں پڑ جاتا ہے اور نیند کے غلبہ سے خود فراموش ہو کر سو جاتا ہے۔"

(۴۴) عزیز احمد

عزیز احمد ۱۹۱۴ء میں بمقام حیدر آباد تولد ہوئے۔ ان کا وطن حیدر آباد ہے البتہ ان کے والدین شمالی ہند سے آ کر حیدر آباد میں بس گئے۔ عزیز احمد کی تعلیم و تربیت حیدر آباد میں ہوئی، جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد حکومت آصفیہ کی جانب سے تعلیمی وظیفہ ملا۔ اور انگلستان جاکر انہوں نے لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کی ڈگری حاصل کی واپسی کے بعد جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ انگریزی میں لکچرار کی حیثیت سے مامور کیے گئے اور بارہ سال تک جامعہ میں کارگذار رہے، کچھ عرصہ تک شہزادی ورشہوار کے پرائیوٹ سکریٹری کی خدمت بھی انجام دی، پولیس ایکشن کے بعد پاکستان چلے گئے وہاں مختلف محکموں میں اعلیٰ خدمات انجام دیتے رہے اس کے بعد انگلستان گئے اور اسکول آف ایڈیل اسٹڈیز میں پروفیسر اُردو مقرر ہوئے۔

عزیز احمد اُردو کے ایک ممتاز ناول نگار ہیں، انہوں نے اُردو ناول کو فنی حیثیت سے بلند اور بلند تر کرنے میں پورا حصّہ لیا ہے، انہوں نے اُردو ناول کو مغربی روایات اور رجحانات کا آئینہ دار بنا دیا، وہ مولانا عبدالحق کے خاص شاگردوں میں شامل تھے، ان کی ذہنی تربیت میں مولانا کا خاص حصّہ ہے۔ عزیز احمد کے کئی ناول شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:۔ گُریز، مرمر اور خون، ہوس، آگ، ایسی بلندی ایسی پستی، شبنم، ناولوں کے علاوہ مختصر افسانے اور تنقیدی مضامین بھی بلند معیار کے حامل ہوتے ہیں ان کے افسانوں اور تنقیدی کتابوں میں رقص ناتمام، بے کاردن، بے کار راتیں، ترقی پسند ادب، اقبال، نئی تشکیل وغیرہ کئی کتابیں قابلِ قدر ہیں، عزیز احمد شاعر بھی ہیں، ماہ لقا اور دوسری نظموں کے نام سے اس کی اشاعت بھی ہوچکی ہے، بہرحال عزیز احمد جامعۂ عثمانیہ کے ایک قابل سپوت ہیں جنہوں نے عصرِ حاضر کی ناول نگاری میں بلند سے بلند تر درجہ حاصل کرلیا ہے، عزیز احمد کی نثر کا نمونہ پیش ہے:۔

"میری اب نایاب تو نہیں مگر کم یاب ضرور تھی، اسی لیے جب ان سات پہاڑوں نے جو ہندوستان اور یورپ کے درمیان میں بلند ہوکے سات پہاڑ بن گئے ہیں بلقیس کو اپنی اوٹ میں چھپا لیا، تو نعیم کا دل ایلس کی طرف پلٹا۔

نادانستہ طور پر دوستی کی سرحد اس وقت ختم ہوئی تھی اور محبت کی سرحد اس وقت شروع ہوگئی تھی جب اب سے ڈیڑھ ہفتہ پہلے زمین دوز ریل میں روم جاتے ہوئے ایلس اس کے کندھے کا سہارا لگائے اونگھ رہی تھی اور اسے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے دل سے ہمدردی کی ایک لہر اٹھی اور ایلس کے پیلے پیلے بالوں پر چھا گئی تھی۔" (گریز)

دل افروز کی شادی کے کئی مہینے بعد اصغر نے شراب کے نشے میں سنبل کو کھینچ کے پیار کرلیا، سنبل خاقان کے لیے چُنی گئی تھی اور تین چھوکریوں میں جنہیں خورشید زمانی بیگم جاگیردارانہ انداز سے پال رہی تھیں سب سے اچھی تھی بڑی شوخ اور طرار چھوکری تھی، اور دولہن بیگم یعنی سروری اس کے خون کی پیاسی تھیں، وہ عرصہ سے اصغر پر ریجھی ہوئی تھیں چھوٹے صاحب اللہ رکھے کیا بانکے نوجوان ہیں میں ان پر سے صدقے ہو جاؤں۔"

اس دن چھوٹے صاحب ملٹری کلب سے بہت دیر میں آئے تھے۔ پی آئی تھی کہ گیرج میں گاڑی رکھتے رکھتے مڈگارڈ کو زور کا دھکا لگا، اندر کی طرف آئے، دروازہ بند تھا، بوائے کو ماں بہن کی گالیاں دے ہی رہے تھے کہ اندر سے سنبل نے دروازہ کھولا، رات کے ساڑھے بارہ بجے ہوں گے، صحن میں ساٹھ کینڈل پاور کا بلب جل رہا تھا اور برآمدے میں خورشید زمانی بیگم اور اصغر کی دونوں چھوٹی بہنیں سو رہی تھیں۔ اصغر کپڑے بدلنے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو پھر سنبل ٹھٹک کر سامنے آگئی اور پوچھا، چھوٹے صاحب کھانا لاؤں۔

اصغر نے گالی دے کر کہا "کھانا"

سنبل ٹھٹک کر گھوم گئی اس کی گدرائی ہوئی چھاتیاں لال لال کرتے میں ابھری ہوئی تھیں۔" (ایسی بلندی ایسی پستی)

خواتین کے کارنامے

اگرچہ گزشتہ ادوار میں خواتین کے کارناموں کا تذکرہ تقریباً نہیں کیا گیا ہے، اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ اس زمانہ میں ہماری خواتین جاہل تھیں اور ان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ ان کے کارنامے ہم سے پوشیدہ ہیں اور ہم کو جو کچھ معلومات ہیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مثلاً پانچویں دور میں ایک شاعرہ شرف النساء بیگم سے واقف ہیں جس کا ایک مرثیہ دستیاب ہوا ہے، مگر تفصیلی حالات کی خبر نہیں ہے، اسی طرح ایک اور شاعرہ کا پتہ چلا ہے جس نے ارسطو جاہ کی مدح میں قطعہ لکھا تھا، البتہ چندا کا تذکرہ پانچویں دور میں ہو چکا ہے۔

چھٹے دور میں چند خواتین کے کارنامے ملتے ہیں، مگر ان کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ ہم اپنی کتاب "خواتینِ دکن کی اُردو خدمات" میں ان کا تعارف کرا چکے ہیں اور پھر اکثر خواتین ساتویں دور میں باقی ہیں، مثلاً صغرا بیگم ہمایوں مرزا، رابعہ بیگم، سارہ بیگم وغیرہ۔

اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اب مردوں کے دوش بدوش عورتوں کے نظم و نثر کے نمونے بھی منظرِ عام پر نمایاں ہونے لگے ہیں، ان کی بھی تقسیم ہو سکتی ہے۔ مثلاً جامعۂ عثمانیہ سے تعلق رکھنے والی اور جامعہ سے غیر متعلق وغیرہ۔

خواتین کے کارناموں کو بھی ہم علیحدہ علیحدہ عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ شاعری کے لحاظ سے رحمت بیگم اسیر، انیسہ بیگم شروانی، انیسہ، صغرا بیگم حیا، رابعہ بیگم رابعہ، سارہ بیگم سارہ۔ بشیر النساء بیگم بشیر، منظور فاطمہ بیگم، قیصری بیگم، احمد النساء بیگم، نوشابہ خاتون، لطیف النساء بیگم، صفیہ بیگم قمر، وحیدہ نسیم، سعیدہ مظہر، شیل بالا صاحب، مسز برکت رائے، نذیر ناہید، رفعت، راحت وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں، مگر ہم صرف چند کا تعارف کراتے ہیں۔

شاعر خواتین عموماً مشاہیر شعراء کا تتبع کرتی ہیں۔ اقبال، جوش، حسرت، جگر، اختر شیرانی کا کلام ان کے لیے نمونہ ثابت ہوا ہے، نظمیں، غزل اور بے قافیہ نظم وغیرہ میں

انہوں نے اچھا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے، غزلوں میں ان کی رنگین خیالی اور شگفتگی قابلِ داد ہوتی ہے، لیکن شمالی ہند کی بعض شاعر خواتین کی طرح عریانی نہیں ہوتی۔ وہ پردہ کی باتیں پردہ میں رکھتی ہیں۔

(۱) انیسہ انیسہ بیگم شروانی کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ حیدر آباد آکر بس گئیں۔ ۱۹۲۴ء سے آپ کی شاعری کا آغاز ہوا۔ کلام کا مجموعہ "انیسیات" کے نام سے شائع ہوا ہے، نظم اور غزل دونوں موزوں کرتی ہیں۔ نظمیں حمد، لغت، مناظر قدرت، وصف نگاری قوم اور اخلاق کے عنوان پر ہیں، کلام میں سوز و گداز ہے، بے ساختگی اور برجستگی بھی، طباعی ہے اور ذہانت بھی، غزلوں میں لطافت بھی ہے اور شیرینی بھی، لطفِ زبان بھی ہے اور صفائی بھی بحیثیت مجموعی کلام قابلِ داد ہے۔ ۱۹۶۴ء میں انتقال ہوا۔

جنگ اور خواتین

گوری قوموں میں بہم جنگ یہ برپا کیا ہے
بھائی کا بھائی عدو ہے یہ تماشا کیا ہے

ظلمتِ ظلم نے اندھیر مچا رکھا ہے
شمع تہذیب کے نیچے یہ اندھیرا کیا ہے

اشرف الخلق کو توپوں کا بنا کر ایندھن
عقل و دانش کو کیا خلق نے رسوا کیا ہے

... ...

دکھ بھری خلق کی خدمت کو فریضہ جانو
دستِ شفقت کے لیے اپنا پرایا کیا ہے

حوصلہ کر کے قوی زیر کرو دشمن کو
عزمِ راسخ کے لیے زرغۂ اعدا کیا ہے

حق پسندی کی صفت ورثۂ مادر کر دو
دردِ باطل کا بجز اس کے مداوا کیا ہے

جسمِ ملت کے لیے روحِ رواں ہو تم ہی
ہار دی تم نے ہی ہمت تو سہارا کیا ہے

کوہستان شملہ

بیانِ شملہ ہم نشیں لکھوں یہ حوصلہ نہیں
ہمالیہ کے اوج میں پہاڑیوں کے فوج میں
عجیب کوہسار ہے بہار ہی بہار ہے
نشاطِ روح و قلبِ زار ہوائے سرد و خوشگوار
سکونِ جانِ مضطرب اثر ہے دل کشا عجب
مریض کی دوا ہے یہ کہ رحمتِ خدا ہے یہ
وہ چوٹیاں فلک رسا وہ گھاٹیاں خرد رسا
صنوبرانِ سبز پوش کھڑے ہیں صف بصف خموش
اگر سحاب آ گیا پہاڑیوں پہ چھا گیا
نشیب میں، فراز میں ہوائے ترک و تاز میں
وہ شور رباد و رعد و برق رہا نہ روز و شب میں فرق
غضب کی سحر کاریاں ستم کی برف باریاں
یہ کس کا سحر چل گیا کہ رنگ ہی بدل گیا
وہ سبز پوش کیا ہوئے کھڑے تھے جو کہ دیو سے
سفید ہیں پہاڑیاں سفید ساری وادیاں

... ...

سڑک پہ کیا بہار ہے کہ جان و دل نثار ہے
سحر ہے یا کہ شام ہے ہجوم کا خرام ہے
پری رخانِ شوخ و شنگ لباسہائے رنگ رنگ
بلا کی دل فریبیاں غضب کی جامہ زیبیاں
وہ دل رُبا نزاکتیں وہ حُسن کی قیامتیں
وہ جلوہ ہائے بے پناہ نہ جم کے ہٹ سکے نگاہ

عجیب کوہسار ہے
بہار ہی بہار ہے

ملک الموت مجھے تھوڑی سی مہلت دے دے
اپنے معبود کو اس وقت تو راضی کر لوں

کلیم اللہ پہنچے طور تک شوقِ تکلّم میں
وہ دل میں جلوہ فرما ہے جو چاہے گفتگو کر لے

جدھر دیکھئے فتنہ سامانیاں ہیں
ہوا و ہوس کی فراوانیاں ہیں

کب اس جہاں سے چاہ کیے جا رہی ہوں میں
جب تک نبھے نباہ کیے جا رہی ہوں میں

---

(۲) اسیر رحمت بیگم نام، اسیر تخلص، حیدرآباد وطن، یہاں ہی تولّد ہوئیں، آپ کے والد ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب تھے، رحمت اللہ شریف صاحب سابق اوّل تعلقدار کی شریکِ حیات ہیں، تعلیم خانگی طور سے ہوئی۔ اُردو، فارسی میں اچھی مہارت حاصل کرلی، شعر گوئی کا شوق ہے، کسی سے تلمذ نہیں۔ زیادہ تر غزل موزوں کرتی ہیں۔ کلام پاکیزہ اور سنجیدہ ہوتا ہے، خیالات میں جدّت پائی جاتی ہے، تخیل کی رفعت اور بیان کی ندرت بھی قابلِ داد ہوتی ہے، کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

دیکھنا پیدا نہ ہو اس سے کسی کو اشتباہ
روئے زیبا پر نگاہِ شوق جم جانا نہیں

ناصحا اس لطف سے بالکل ہے تو نا آشنا
خوب ہم سمجھے ہوئے ہیں ہم کو سمجھانا نہیں

اشتیاقِ دید میں ہر دم گذرتا ہے اسیرؔ
ہم نے کب ملنے کو ان کے مغتنم جانا نہیں

فکرِ فردا ہے نہ اب ہم کو خیالِ دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

بڑھ گئی ہیں بحرِ آزادی کی طوفاں خیزیاں
اک سفینہ وہ بھی اب طوفاں سے ہم آغوش ہے

دعوتِ دیوانگی دیتی ہے یہ وارفتگی
موجِ صہبائے تفکر بھی جنوں بردوش ہے

مائلِ تقلید کیوں ہے آج کل ذوقِ سلیم
چشمِ بینا بند ہے اور عقل بھی روپوش ہے

کس قدر پامالیٔ آئینِ فطرت ہے اسیرؔ
روحِ آزادی کا یہ جذبہ جراحت کوش ہے

---

(۳) بشیرؔ

بشیر النساء بیگم نام، بشیرؔ تخلص، حیدرآباد وطن۔ یہیں تولد ہوئیں اور گھر پر عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم پائی۔ گھر میں علمی ماحول ملا۔ شادی کے بعد بھی خسر اور شوہر، صاحبِ ذوق اور سخن فہم ملے۔ ان کی قدردانی اور ہمت افزائی نے بشیرؔ کے ذوقِ سخن کو اور زیادہ چمکا دیا۔ ان کے کلام میں پاکیزگی، حلاوت، انسانیت کا درد اور تصورات کی رفعت ملتی ہے، ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ بشیرؔ کے کلام کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبالؔ سے بے حد متاثر ہیں، لیکن ان کی اپنی انفرادیت نے ہر مقام پر ندرت اور نفاست کے کنول کھلائے ہیں۔ کلام پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقبالؔ کی شاگرد ہیں جنہیں استاد نے اپنا رنگِ سخن بخش دیا ہے۔

بشیر کے کلام کا مجموعہ "آبگینہ شعر" کے نام سے شائع ہوچکا ہے، جس میں نظمیں، مرثیے، قصائد، غزلیات سب کچھ شامل ہیں، نظموں میں واقعہ نگاری بھی ہے اور مناظر قدرت کی وصف نگاری بھی، ان کا تسلسل بیان اور تخیل کی بلندی قابل داد ہے، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

داستانِ اقبال

چھائے آثار خزاں جب گلستانِ ہند پر
اور گھرے ظلمت کے بادل آسمانِ ہند پر

ثبت مہر خاموشی تھی جب دہانِ ہند پر
تھا نہ حرفِ مدعا اک بھی زبانِ ہند پر

زندگی اور موت کا احساس تک باقی نہ تھا
کوئی اس اجڑے ہوئے خانہ کا ساقی نہ تھا

جب تباہ ہونے کو تھے ہم مغربی سیلاب سے
آفتابِ قوم چمکا مطلعِ پنجاب سے

زندگی کی لہر دوڑی اس کی آب و تاب سے
نوجوانِ وطن اٹھنے لگے پھر خواب سے

دھیمی دھیمی دور سے دلکش صدا آنے لگی
کاروان خفتہ میں "بانگِ درا" آنے لگی

جادہ پیما سوئے منزل کارواں ہونے لگا
پرچم اقبال کو تھامے رواں ہونے لگا

ذرہ ذرہ زندگانی کا جواں ہونے لگا
آسماں پر شہرۂ ہندوستاں ہونے لگا

"شکوہ" اہلِ زمیں افلاک پر جانے لگے
بال جبریلِ امیں سوئے زمیں آنے لگے

آہ اے مسلم ترا آرام جاں جاتا رہا
خون روائے ہند تیرا پاسباں جاتا رہا

نظمِ ہستی کا وہ سچا ترجماں جاتا رہا
وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

ملت آوارہ ہے میرِ کارواں رخصت ہوا
جب بہاریں آرہی تھیں باغباں رخصت ہوا

اے عروج اب تیری قسمت لٹ گئی
جس نے بخشی تھی حیاتِ نو وہ دولت لٹ گئی

فخر حاصل جس سے تھا تجھ کو وہ نعمت لٹ گئی
شعریت کی وہ ترنم ریز لذت لٹ گئی

قلب کو مسحور کر لیتا مگر ساحر نہ تھا
تھا امینِ رازِ قدرت آہ وہ شاعر نہ تھا

بشیر کی غزلیں بھی اقبال کے رنگ میں ہیں، ان میں سوز و ساز ہے، درد و غم ہے، تخیل کی بلندی ہے، جذبات کی روانی ہے، ندرتِ خیال ہے، لطفِ زبان ہے۔

بتاؤں کیا تمہیں میں کون ہوں کیا ہوں بہر صورت
سراپا درد ہوں اک ہستیِ محرومِ درماں ہوں
میں یکتا ہوں تڑپنے، تلملانے، جان دینے میں
کبھی برقِ جہندہ ہوں کبھی میں ابرِ باراں ہوں
چمن میں پھول ہوں گل میں برنگِ بو ہوں پوشیدہ
کہیں تعبیرِ ہستی ہوں کہیں خوابِ پریشاں ہوں

جو لذت میسر ہے ذوقِ طلب میں
نہیں اس سے واقف ترے عرش والے

فرشتے بھی نہ تھے واقف کہ یوں بن جائے گی دنیا
نہاں رازِ حیاتِ دہر تھا گندم کے دانوں میں

مری فطرت کا ہر ذرّہ ہے محو خود فراموشی
بظاہر آئینہ ہوں اور بباطن راز پنہاں ہوں

گردشِ چرخ کہہ رہی ہے بشیر جذبِ کامل سے کیا نہیں ہوتا

---

(۴) مسز ڈی برکت رائے حیدر آباد کے مشہور دیوان راجہ چندو لال اور مہاراجہ کشن پرشاد کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، ۱۸۹۴ء میں تولد ہوئیں، فارسی، اُردو اور ہندی کے ساتھ انگریزی تعلیم گھر پر پائی، اُردو اور ہندی شاعری اور مضمون نگاری سے دلچسپی ہے، قومی اور ملکی کاموں میں زیادہ حصہ لیتی ہیں، بھگوت گیتا کا ترجمہ اُردو نثر میں اور بچوں کے لیے نظمیں "بچوں کے بتاشے" کے نام سے شائع کی ہیں پبلک جلسوں اور گھر میں ٹھیٹ اُردو بولتی تھیں، چند سال قبل آپ کا انتقال ہوگیا، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

کالے کالے بادل آئے پانی دیکھو بھر کر لائے
خشک زمیں میں آشا آئی پودوں کی اُمید بر آئی
ایشور نے یہ دن ہے دکھایا دیکھتے دیکھتے پانی آیا
دیکھو برسے یا نہ برسے بارش کے لیے دل ہیں ترسے
اے لو بوندیں لگیں برسنے بادل بھی لگے خوب گرجنے
اب تو موسلادھار ہے پانی جل تھل سب پانی ہی پانی
پیڑوں کا اشنان ہوا ہے پودوں کا حمّام ہوا ہے
نہا نہا کر سب نکھر گئے ہیں بادل بھی اب بکھر گئے ہیں
خوشی سے پودے جھوم رہے ہیں قدم ہوا کے چوم رہے ہیں
خوشی کسانوں پر ہے چھائی اُمید ان کی بھی بر آئی

دیر و حرم کا جھگڑا مدت سے ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں پڑیں ہم، قصے ہیں یہ پرانے

ہاں اب سمند ہمت آگے بڑھا کے دیکھو
کھاتے رہو گے کب تک ذلّت کے تازیانے

---

(۶) **قمر** صفیہ بیگم، قمر تخلص، آپ کے اجداد کا وطن لکھنؤ تھا مگر گذشتہ اسّی سال سے آپ کا خاندان حیدرآباد میں مقیم ہے، قمر کی پیدائش تعلیم و تربیت حیدرآباد میں ہوئی، خاندان کے ماحول کے مدّ نظر کم سنی سے شعر کہنے کا شوق ہوا۔ زیادہ تر نظمیں لکھا کرتی ہیں، کلام میں سادگی، نفاست اور پختگی ہے۔

عورت

تکمیل ہوں انسان کی تفسیرِ وفا ہوں　　طاعت کے طریقوں میں ملک سے بھی سوا ہوں
آلام و مصائب کی میں ہی عقدہ کُشا ہوں　　اور منزلِ الفت کی میں ہی راہ نما ہوں
انسان کی صورت میں میں آوازِ خدا ہوں

تاریخ کو اُلٹو، مرے عادات کو دیکھو　　ماضی کا سبق پڑھ کے ارادات کو دیکھو
طوفان حوادث میں مہمات کو دیکھو　　اور باغِ جہاں میں مرے ثمرات کو دیکھو
میں قافلہ والوں کے لیے بانگِ درا ہوں

تہذیب و تمدّن میں سدا ہاتھ بٹایا　　انسان کو احساس فرائض کا سکھایا
خود صبر و قناعت پہ عمل کر کے دکھایا　　اور خوگرِ ہمدردی و ایثار بنایا
واقف ہے ہر اک اہلِ بصیرت کہ میں کیا ہوں

قائم ہے مرے دم سے یہ سب شان بشر کی　　شمشیر بکف رن میں تو رونق ہوں میں گھر کی
حامی ہوں ہمیشہ سے میں ایجاد و ہنر کی　　بے میری حمایت کے مہم کون ہی سر کی
لاریب میں ہم رتبۂ مردانِ خدا ہوں

گرداب میں ہے کشتیٔ عمر اپنی پھنسائی　　ہر منزلِ دشوار میں کی راہ نمائی
افسوس پسند اس پہ نہ خدمت مری آئی　　رسوائی و ذلّت ہی سدا حصّہ میں آئی
ہر بے کس و مظلوم کی آوازِ دُعا ہوں

مظلوم کی آہوں میں وہ قوت ہے اثر کی　　خالی نہیں جائے گی دُعا شام و سحر کی
رحمت سے ہم آغوش ہے فریاد قمر کی　　اُمید قوی ہے مجھے راحت کے ثمر کی

جز درگہِ حق کیوں میں کہیں ناصیہ سا ہوں

تمہارے دل کو دُکھ ہوگا نہ کُھلواؤ زباں میری
بہت پُر درد ہے پیاری جمیلہ داستاں میری
اسے شادی کہوں حیرت میں ہوں یا اپنی بربادی
کہ جس نے چھین لی مجھ سے مری بچپن کی آزادی
مرے ماں باپ ہیں اب کیا کہوں اس کے سوا ان کو
کیا جو کچھ انہوں نے خیر خوش رکھے خدا ان کو
خدا جانے کہ ان پر کیوں میں کمبخت ایسی بھاری تھی
نکل جاؤں میں گھر سے کیوں انہیں یہ بیقراری تھی
کہ جھونکا بھاڑ میں لختِ جگر کو اپنے ہاتھوں سے
خوشی کیا خاک ہو سوچو تمہیں ایسی براتوں سے
وہ کہلاتا ہے بوڑھا جو ہوا چالیس سے اوپر
مرے ہیں وہ خدا رکھے اب اڑتالیس سے اوپر
مرے سترہ برس میں بھی کئی ہفتے ابھی کم ہیں
مگر بیوی ہوں میں وہ میرے شوہر میرے ہمدم ہیں
اِدھر سترہ اُدھر کچھ پچاس اچھا ملا جوڑا
مرے جی کے جلانے کو یہی اک غم تھا کیا تھوڑا
کہ اس پر اک بلا سوکن کی بھی موجود ہے گھر میں
کسے معلوم تھا یہ کچھ لکھا ہے اس مقدر میں
یہ کیوں عقلوں پہ پردے پڑ گئے کیسا وبال آیا
کہ ابّا کو نہ اماں کو کبھی اتنا خیال آیا

---

(۷) لطیف | لطیف النساء بیگم، لطیف تخلص، سید مظفر الدین صاحب کی دختر سید یوسف علی صاحب بیچرار سٹی کالج کی شریک زندگی محبوبیہ

اسکول اور جامعۂ عثمانیہ سے استفادہ کیا۔ ایم۔ اے میں کامیاب ہیں، نظم اور نثر دونوں میں مہارت ہے، نثر میں "من کی بپتا" "ولی کا تخیل، اردو میں تصوف" آپ کے قابلِ قدر مقالے ہیں۔

لطیف النساء بیگم بچّوں کی نظمیں بڑی اچھی لکھا کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بچّے کی زبان میں ماں کا دل بول رہا ہے، غزلوں میں تسلسل خیال پایا جاتا ہے۔ جدید ندرت کے ساتھ صفائی اور سادگی بھی پائی جاتی ہے۔ سلام اور نوحہ بھی لکھا کرتی ہیں۔ ایّام عزا میں ممبر سے جادو بیان کرتی ہیں۔

تپِ سوزِ غم سے جلا چاہتی ہوں — گنا ہوں کی اپنے سزا چاہتی ہوں
ہوئی زندگی تلخ ہاتھوں سے جس کی — اسی کا ہمیشہ بھلا چاہتی ہوں

عشق نا فرجام کا انجام ہے — کوبکو بیمارِ غم بدنام ہے
اہلِ دُنیا موت کہتے ہیں جسے — اک سکونِ قلب ہے آرام ہے

ہر اک ذرہ سے آتی ہے صدا یہ — نشانی ہے یہی اس بے نشاں کی

اشارہ نزع میں ہے نیم بار آنکھوں کا — خمارِ محفلِ عیش و سرود باقی ہے
اگرچہ خرمنِ اُمّید لُٹ چکا اپنا — یہ سوزشِ دلِ اہلِ باقی ہے

تاروں کا مدرسہ

فلک پر جو تارے ہیں یہ جگمگاتے — کہاں سارا دن امّی جاں ہیں یہ جاتے
ہے شاید کوئی مدرسہ ان کا امّی — اندھیرے ہی سے جس کی بجتی ہے گھنٹی
بہت ہی سویرے سے تیار ہو کر — یہ سب وقت پر جاکے ہوتے ہیں حاضر
وہیں ہونگے دن بھر یہ سب لکھتے پڑھتے — حساب اور قواعد بھی ہوں گے یہ کرتے
وہ تارا کتابیں بڑی ہوگا پڑھتا — یہ ننھا سا پڑھتا الف، بے، تے ہوگا
بہت دُور گھر سے یہ بیچارے دن بھر — پڑے رہتے ہوں گے جماعت کے اندر

بڑے ہوں گے استادان کے غصیلے
جگہ سے سرکتے بھی ہوں گے نہ دیتے

جو ہوگا ذرا بھی کوئی جھانک لیتا
تو کونے میں ہوگا کھڑا ہونا پڑتا

یہ تاروں کا ہے مدرسہ کیسا امّی
بڑی دیر سے ان کو ہوتی ہے چھٹی

نظر آتے ہیں بعد مغرب کے تارے
نہیں دیکھتے ماں کو دن میں بچارے

ترس ان پہ آتا ہے امّی مجھے تو
اندھیرے میں آتے ہیں بیچارے گھر کو

پلنے والے گودیوں میں احمدِ مختار کی
چوسنے والے زباں کو حاملِ اسرار کی

واہ کیا کہنا ترا اے راکب دوشِ نبیؐ
تو نے دی تاثیر دکھلا فاطمہ کے شیر کی

حشر تک باقی رہا اسلام پر احساں ترا
کارنامہ نے ترے تاریخ کو چمکا دیا

ٹوٹتا ہے کفر کیونکر تُو نے بتلایا ہمیں
کس طرح مرتے ہیں حق پر تُو نے دکھلایا ہمیں

جس سے ہے دُور تو وہ پیکرِ تنویر ہے
جس پہ قدرت نے قلم توڑے تو وہ تصویر ہے

---

(۸) نوشابہ نوشابہ خاتون نام، نوشابہ تخلص، آپ کے والد مولوی عبدالحق صاحب نائب ناظمِ پولیس اضلاع تھے، ۱۳۲۰ھ میں نوشابہ خاتون کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی، گھر پر تعلیم ہوئی، خانگی تعلیم سے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان منشی فاضل اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی، آپ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے جامعہ عثمانیہ سے یہ ڈگری اس وقت حاصل کی جبکہ زنانہ کالج بھی قائم نہیں ہوا تھا، دس سال کے سن سے شاعری کا شوق ہے اور عمر کے ساتھ وہ پختہ ہوتی گئی، کسی سے تلمذ نہیں ہے" موجِ تخیل" کے نام سے نوشابہ کا مجموعۂ کلام شائع ہوگیا ہے، ہر صنفِ سخن میں آپ نے فکر کی ہے۔ کلام میں سادگی، صفائی، تاثر موجود ہے، طرزِ ادا کی جدت، تخیل کی بلند پروازی قابلِ داد ہے۔

مدت تک زنانہ کالج میں عربی کی لکچرار ہیں، مگر اب کئی سال سے دماغی ضعف اور بیماری نے آپ کو ہر قسم کے کام سے معطل کر دیا ہے، خلافت کے جلسوں میں آپ کی نظمیں جوش پیدا کر کے خراجِ تحسین حاصل کرتی تھیں۔ اسی زمانہ میں بعض نظمیں بھی شائع ہوئیں اور عام و خاص میں مقبول ہوئیں، غزلوں کا حصہ آپ کے مجموعہ

میں کم ہے زیادہ تر نظمیں ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

شق ہونے لگا ہے پردۂ شب اب خسرو خاور آتا ہے
ہے رُخ پر مقنع کرنوں کا وہ مہر منوّر آتا ہے
کیا دوش پہ ڈالے سرتا سر وہ نور کی چادر آتا ہے
لو رنگِ سحر بھی کھٹنے لگا، ظلمات کا بادل چھٹنے لگا
دامانِ شفق جو سمٹنے لگا، خورشید نقاب اُلٹنے لگا
کیا جلوہ گری صنّاعِ ازل نے مہر فلک کو بخشی ہے
مرہونِ کرم ہر تار نفس شرمندۂ احساں ہستی ہے
آباد اشارے سے جس کے دُنیا کی یہ ساری بستی ہے
یہ سارے کرشمے اس کے ہیں جو خالق ہے جگ داتا ہے
جو سندر سندر روپ نئے ہر آن ہمیں دکھلاتا ہے

طویل نظم ہے، سری نگر کے ملا شاہی باغ پر ایک عمدہ نظم ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اژدرِ ابر کوہ سے ہونے لگا گہر فشاں چوٹی بھی کس شکوہ سے بادلوں سے ہے ہم عناں

دامنِ کوہسار سبز
آئی ہے جو بہار سبز
وادیٔ دشا خسار سبز
سارے ہیں برگ بار سبز

فرش زمیں زمرّدیں، نیلگوں چتر آسماں موج ہوا ہے عنبریں، قطعہ ہے سارا بوستاں

قلۂ کوہسار برف
منظرِ پُر بہار برف
کیوں نہ ہو آبدار برف
یاں ہے گہر نثار برف

قدرتِ کردگار ہے، ذرّۂ خاک سے عیاں ظاہر و آشکار ہے شان خدائے دو جہاں

باغ دراغ گل بدوش

قوتِ تامہ بجوش

ساری زمیں ہے سبزپوش

دامنِ کوہ گل فروش

رنگِ شفق ہے لالہ گوں چرخ کا دل ہوا ہے خوں　　نورِ سپہر ہے فزوں چادرِ آب سیمگوں

باندھے ہوئے صف دیار

سرو کہیں، کہیں چنار

بید کہیں ہیں سایہ دار

سیب کہیں، کہیں انار

تازگی بخش ہے فضا اور سماں نشاطِ روح　　موج ہوا وہ دلفزا جس سے ہوا انبساطِ روح

نغمہ سرا ہیں یاں ہزار

گونج رہے ہیں سبزہ زار

جھوم رہے ہیں شاخسار

مست ہیں سارے جاندار

نقرئی جوئبار ہے، سیمگوں آبشار ہے　　منظرِ پُر بہار ہے، رحمتِ کردگار ہے

نکہتِ گل ہے عطر بار

دشت و جبل ہیں لالہ زار

وردو سمن کی ہے بہار

قدرتِ حق ہے آشکار

روح فزا نسیم ہے، پھیلی ہوئی شمیم ہے　　فضلِ خدا عمیم ہے، خطہ یہی نعیم ہے

جامۂ ہستی کی اے وحشت اُڑا دے دھجیاں

اب جُدا مہماں ترا دُنیائے دوں ہونے کو ہے

کیوں تری حسرت پہ نوشابہ نہ روئے بے کسی

تھا جو قسمت کا لکھا پورا وہ یوں ہونے کو ہے

اپنی ہستی کو مٹا کر بن فروغِ انجمن — شمع سے کچھ سیکھ لے سوز و گدازِ زندگی
منتشر شیرازۂ اوراقِ ہستی جب ہوا — آشکارا ہو گیا دم بھر میں رازِ زندگی

پھونک ڈالے جرعۂ خوش رنگ نے قلب و جگر
جس طرح پھولوں نے ہو خونِ عنادل پی لیا
روح فرسا ہو چکی ہے تلخیٔ صہبائے غم
ہم نے سرشاری میں خم خانہ ہی کامل پی لیا

---

(۹) نسیم وحیدہ خاتون نسیمؔ کے اجداد کا وطن یو۔ پی ہے، مگر گذشتہ اسّی سال سے آپ کے اجداد حیدر آباد میں رہتے ہیں، ان کے والد مولوی محمد فریدالدین اورنگ آباد میں وکیل ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں وحیدہ نسیمؔ کی ولادت ہوئی۔ اورنگ آباد ہائی اسکول کی تعلیم کے بعد جامعۂ عثمانیہ سے ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی، اس طرح آپ سائنس کی اسکالر ہیں۔ نسیمؔ شاعری کی فضا میں پروان چڑھیں ان کے نانا اعجاز حسین اعجاز اور چچا خورشید احمد خاور دونوں اچھے شاعر تھے، اس طرح نسیمؔ کو کم عمری سے شاعری کا شوق ہو گیا اسکول کے زمانہ سے ان کی شاعری کا چرچہ تھا، "نغمۂ اسکول" لکھ کر انعام حاصل کیا آپ بڑی پُرگو شاعر ہیں، اگرچہ اب تک کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا مگر پانچ ضخیم حصے مرتب ہو گئے ہیں، جن کو علیحدہ علیحدہ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ "کوثر و تسنیم" میں مختلف موضوع کی نظمیں۔ "ساغرِ صہبا" میں غزلوں کو شامل کیا ہے "تبسمِ حیات" مزاحیہ کلام ہے 'طفلستان' بچوں کے لیے نظمیں ہیں اور "درد لا دوا" میں سیاسی نظمیں ہیں، وحیدہ نسیمؔ کی شاعری سادگی، نازک خیالی، تاثر کا مجموعہ ہے، واقعہ نگاری اور وصف نگاری میں جدّت ہے، خیالات میں عمق ہے، مزاحیہ شاعری میں مزاح ہے ہجو نہیں ہے، غزل میں سوز و گداز ہے، رنگینی اور لطافت ہے، اس وقت پاکستان میں زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔

تلاشِ سکوں

دریا کا ہے کنارہ اور شام ہے سہانی — خاموشیوں میں دیکھی دریا کی ہے روانی

لیلائے شام نے جب زلفِ سیاہ کھولی
چمپلی ہے بن کے افشاں تاروں کی ساری ٹولی
جوڑا عروسِ شب نے پہنا ہے آسمانی
اور اس پہ پھر بنائی قدرت نے کامدانی
تاروں کی یہ نگاہیں کس چیز پر گڑی ہیں
صحرا کی جھاڑیاں سب کس سوچ میں پڑی ہیں
رونق وہ دن کی کیوں اب کم شب کو ہوگئی ہے
تاروں کی چھاؤں میں کیا ہستی بھی کھو گئی ہے
اے چھوٹے چھوٹے تارو ہر دم چمکنے والو
اوجِ فلک کا کوئی قصّہ مجھے سُناؤ
غائب وجود ہوگا، ہوگا سکون طاری
ہاں موت ہی سکوں ہے ہستی ہے بے قراری
گزریں یہ ساری باتیں خواب وخیال ہوکر
اک بات رہ گئی ہے دل میں سوال ہوکر
فکروں سے یہ پریشاں تاروں کی بھی جبیں ہے
دُنیا میں کیا کہیں بھی اصلی سکوں نہیں ہے

وحیدہ نسیم ترقی پسند شعراء سے متعلق نہیں ہیں مگر پھر بھی "مزدور" پر ایک دلچسپ نظم لکھی ہے۔

سامنے دیکھو وہ اک مزدور ہے
مفلسی ہے سخت اور مجبور ہے
دھجیوں سے کچھ ڈھکا ہے اس کا
جال ہے نیلی رگوں کا یا بدن
دوپہر ہے سخت لُو ہے چل رہی
آگ سے ساری زمیں ہے جل رہی
حال اس کا ہوگیا ایسا بُرا
بوجھ اُٹھانے کی نہیں طاقت ذرا
بوجھ بھاری، یہ نحیف وناتواں
جسم میں آخر نہیں کیا اس کے جاں
یہ ضعیفی اور مزدوری کرے
آہ وہ بھی چند پیسوں کے لیے
اک دفعہ پھر اس نے دیکھا اپنا حال
آگیا پھر بھوکے بچّوں کا خیال
بے کس ولاچار جو انسان ہے
آہ وہ مزدور ہندوستان ہے

غزلوں کا نمونہ:-

لب پہ لاکر حرفِ محبّت، عشق کو رسوا کون کرے
وہ بھی چُپ ہیں، ہم بھی چُپ ہیں راز کو افشا کون کرے
جو زخم لگایا اوروں نے اس زخم کو اچھا دل نے کیا
جو زخم لگایا خود دل نے اس زخم کو اچھا کون کرے

اپنے ذوقِ نظر کی غلطی تھی   ہم سے بُت کو جو پارسا سمجھے

کہہ دیا ہم نے سب کچھ اس سے نسیمؔ　　اب نہ سمجھے تو پھر خدا سمجھے

نگہ ناز سے بس ایک اشارہ پا کر　　یوں مچل جائیں گے ارماں مجھے معلوم نہ تھا
ان کی نظروں سے نسیمؔ اپنی لڑا کر نظریں　　آنکھیں بن جائیں گی نیساں مجھے معلوم نہ تھا

جام مے سے تعلق رہا مے خانہ میں　　تیری آنکھوں ہی سے پی ساغر و صہبا کی قسم

تو ہر جگہ ہے سجدہ ہو کعبے کو کس لیے　　وہ کون سنگ ہے جو ترا آستاں نہیں

مزاحیہ نمونہ یہ ہے:۔

کیا کروں حال ہوسٹل کا بیاں　　جو رہیں گے انہیں یہ ہوگا عیاں
اس کی تعریف میں جو نظم کہوں　　ایک جنجال میں میں خود ہی پھنسوں
بات سچی ہے بے مزہ لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی
نام مت لیجیے سویّوں کا　　کھیر ٹیڑھی ہے کھیر کا پکنا
نہ جلیبی کا یاں پہ حلوا ہے　　نہ تو قسمت سے اپنی شکوا ہے
عید کا چاند ہے سوہن پپڑی　　اور نایاب ہے یہاں برفی
طرفہ ہے ایک اور کھٹی دال　　کھانا جس نے کہ کر دیا ہے محال
گوشت کی روح سوخت ہوتی ہے　　کوفتے کھا کے کوفت ہوتی ہے

ہم خود ہی جب کہ ہیں کباب سیخ
کس طرح سے لگیں کباب سیخ

"دھوبن کی یاد" کے چند بند یہ ہیں:۔

چادر بہت ہے میلی بستر پہ کیا بچھائیں
میلے غلاف ہیں سب تکیہ پہ کیا چڑھائیں
بستر کی دیکھ حالت مٹی نے لی بلائیں
تو ہی بتا دے دھوبن کالج کو کیسے جائیں

میلی پڑی ہوئی ہیں سب ساڑیاں ہماری

غصّے میں خوب اب کے ہم سب بھرے ہوئے ہیں
دھوبن کے پاس آدھے کپڑے گئے ہوئے ہیں
اور اس سے بھی زیادہ مَیلے پڑے ہوئے ہیں
باقی بچے ہیں جو کچھ تن پر چڑھے ہوئے ہیں
خالی پڑی ہوئی ہیں الماریاں ہماری

نثر نگاری

نثر نگار خواتین میں افسانہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی، ادیب بھی ہیں اور انشار پرداز بھی، مقالہ نگار بھی ہیں اور مؤرخ بھی، شاعر خواتین سے ان کی تعداد زیادہ ہے۔ مگر ہم چند مشہور نثر نگار خواتین کا تعارف کراتے ہیں جو چھٹے دور سے ادبی خدمات میں مصروف ہیں اور ان کو جامعۂ عثمانیہ سے تعلق نہیں ہے ایسی خواتین کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر ہم صرف چند کا یہاں ذکر کرتے ہیں :-

(۱) صغرا بیگم

صغرا بیگم ہمایوں مرزا حیدرآباد کی مشہور خواتین ہیں جنہوں نے مختلف حیثیتوں سے نام وری حاصل کی ہے، وہ شاعرہ بھی ہیں اور نثر نگار بھی، ان کی قومی اور ملکی خدمات بھی ہر آئینہ لائق ستائش ہیں، مسلم خواتین میں وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے پردہ سے باہر آکر مردوں کے مجمع میں تقریر فرمائی اور دوسروں کے لیے ایک مثال اور نمونہ پیش کیا۔ ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں آپ کی ولادت ہوئی اور خانگی طور پر اُردو فارسی کی تعلیم پائی، پٹنہ کے متوطن سیّد ہمایوں مرزا صاحب سے آپ کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد مرزا صاحب نے حیدرآباد کو وطن بنالیا، صغرا بیگم نے اپنے شوہر کے ساتھ یورپ اور مقامات مختلفہ کی سیاحت کی۔ ہندوستان کے شمال اور جنوب اور مشرق کے دُور دُور تک سفر کیا اور سفر نامے قلمبند کیے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً پندرہ ہے جس میں زیادہ تر سفر نامے شامل ہیں، ناول اور مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی، مضامین کا ایک مجموعہ "مقالات صغرا" کے نام سے شائع ہوچکا ہے اور کثیر مضامین رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ صغرا بیگم کے ناول اور افسانے سماجی اور اصلاحی ہیں، ان کا اسلوب بیان صاف اور سادہ ہوتا ہے۔ وہ عام فہم ہوتے ہیں، یورپ میں بھی آپ نے اُردو میں تقریر کی تھی، ایک

زنانہ مدرسہ صفدریہ قائم کیا جس میں تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت بھی سکھائی جاتی۔ اپنی ایک بڑی جائداد اس کے لیے وقف فرمائی۔ صغرا بیگم کا انتقال ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ آپ کی نثر کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :۔

ایک نہایت حسین لینڈو گاڑی جس میں مشکی رنگ کے دلیر گھوڑوں کی جوڑی جُتی ہوئی ہے۔ ایک خوبصورت و عالی شان کوٹھی میں جو ایک خوش منظر مقام پر واقع ہے جس کا چمن اقسام کے پھول پتوں سے لہلہا رہا ہے داخل ہوئی سیدھی زنانہ ڈیوڑھی پر، جا کھڑی ہوئی، ڈیوڑھی دارنی نے اندر جا کر خبر کی ایک پیش خدمت کو صاحبِ خانہ نے حکم دیا کہ جا کر سواری اُتارو، جو بیوی اس گاڑی میں آئی تھیں اُتر کر محل سرا میں داخل ہوئیں، صاحبِ خانہ نے نہایت تپاک سے اپنے گلے لگایا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈرائینگ روم میں لے گئیں اور کہا :۔ ہاجرہ تم تو ٹھیک وقت پر آگئیں اب مسز عون وغیرہ کا انتظار ہے۔ ہاجرہ کہیے اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ مجھے تو رات کو رہ رہ کر بیچاری اُستانی کا خیال آیا کیا۔ دراصل قابلِ رحم ہے، ہر طرح سے لُٹ گئی۔ سارا۔ میری بھی یہی کیفیت رہی، ان کی تکالیف کا سماں آنکھوں کے سامنے کھچا رہا۔" (سرگزشت ہاجرہ)

"گاندربل سے مانس بل آٹھ نو میل ہے، کشمیر میں یہ جھیل نہایت خوبصورت سمجھی جاتی ہے، اس لیے میں دیکھنے گئی، ایک طرف سر بفلک پہاڑوں کا سلسلہ ہے، ان پہاڑوں پر درخت نہیں ہیں، مٹی اور پتھر کے پہاڑ ہیں۔ ان پہاڑوں کے دوسری طرف بستی آبادی ہے اور بیچ میں جھیل مانس بل ہے، اس جھیل میں سُرخ سُرخ کنول کے پھول سبز سبز پتوں میں نہایت بھلے معلوم ہو رہے تھے، یہ پھول فروخت ہوتے ہیں، اس کا ایک ٹھیکہ دار ہے وہ بیچتا ہے ہم نے خرید کیے، ایک طرف میدان ہے۔ یہاں چھوٹا سا باغ ہے اس جگہ ایک فقیر کا غار ہے جس کو گفہ کہتے ہیں اس فقیر کا نام احمد شاہ تھا۔ اس کا مزار اسی غار کے قریب ہے، مسجد بھی ہے ان کی اولاد بھی ہے وہ لوگ ہمارے پاس آئے اور احمد شاہ کے حالات بیان کیے اور ایک چراغ روشن کر کے ہم کو غار کے اندر لے گئے۔ دس گز لمبا غار ہے۔ فقیر کے غار کی جگہ بھی

وہیں ہے۔"

(۲) پادشاہ بیگم صوفی

نواب محمّد یار جنگ (مولوی غلام محمّد صاحب) کی دختر ہیں، نواب صاحب عربی، فارسی کے عالم تھے اور انگریزی سے ناواقف ہونے پر بھی اپنی اولاد کو اعلیٰ انگریزی تعلیم دلائی، پادشاہ بیگم آپ کی بڑی دختر ہیں۔ ۱۳۱۷ھ میں تولد ہوئیں۔ گھر پر تعلیم پائی۔ پردہ کی پابندی کے ساتھ مدراس یونیورسٹی سے ایف۔ اے کامیاب ہوئیں، شادی اور صاحب اولاد ہوکر علی گڑھ سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں لیں اور پھر یورپ جاکر ڈپلوما حاصل کیا۔ اولاً محبوبیہ اسکول میں عربی، فارسی کی تعلیم پر مامور ہوئیں۔ پھر مہتمہ مدارس کی خدمت کو عرصہ تک انجام دیا اور اب وظیفہ حاصل کرلیا ہے، مضمون نگاری سے دلچسپی ہے رسالہ سب رس، شہاب وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں، نشرگاہ حیدرآباد سے آپ کے مضامین نشر ہوتے ہیں۔ شہزادی درشہوار کو آپ ہی نے اُردو کی تعلیم دی آپ کی تحریر عام فہم، معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں مقیم ہیں۔

"ایک مشنری میم بازو کی کرسی پر آکر بیٹھی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ مختلف مضامین پر مکالمہ شروع ہوا، میں نے کہا میں اس امر کا اعتراف کرنے کو تیار ہوں کہ مشنریوں نے ہندوستان کی ایک گونہ خدمت کی ہے، دور دراز مقامات میں دشوار گذار دیہات میں آپ نے ہسپتال بنائے ہیں، مدرسے قائم کیے ہیں، بے شک دہقان آپ کے وجود کو خدا کی نعمت سمجھتے ہوں، گو آپ کی اصلی غرض اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت ہوتی ہے، لیکن آپ کی ایثار نفسی، عزم و استقلال و بنی نوع انسان کی خدمت قابل ستائش و قابلِ رشک ہے[1]۔"

---

[1] رسالہ سب رس جولائی ۱۹۳۸ء

(۳) رابعہ بیگم احمد مدنی صاحب کی دختر سارا بیگم کی چھوٹی بہن، حیدرآباد میں ۱۳۱۸ھ میں تولد ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدین سے حاصل کی اور پھر محبوبیہ اسکول سے جونیئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا، اسی مدرسہ میں عرصہ تک عربی فارسی اور اُردو کی تعلیم دیتی رہیں۔ اُردو شاعری اور نثر نگاری سے پوری دلچسپی ہے، حیدرآباد کے معیاری رسالوں افادہ، سب رس وغیرہ میں آپ کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نشر گاہ سے آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں، علمی اور معاشرتی انجمنوں میں آپ کی تقریر معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتی ہے" سوتیلی ماں" آپ کی ایک تصنیف شائع ہو چکی ہے جس میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ" سوتیلی ماں " کا رشتہ کس طرح کامیابی سے ہو سکتا ہے اور کیا طریقہ ہے جس سے سوتیلی ماں حقیقی ماں کا نمونہ بن سکتی ہے۔

" دُنیا میں فسادات کی جڑ حق تلفی ہے۔ اگر سب متعلق ہستیاں ایک دوسرے کے حقوق پر نظر رکھیں تو ناخوشگوار واقعات پیش ہی نہیں آسکتے۔ دوسرے کو اس کے حق سے کم دینا اور اپنے حق سے زیادہ لینے کی ہوس کرنا انسانیت نہیں درندگی ہے، اگرچہ تنازع للبقا کا مسئلہ فطری ہے لیکن اس کے جواز نے ایک انسان کو دوسرے انسان کے کھا جانے کا حق نہیں دیا۔ جو اس قسم کی ذہنیت رکھے وہ بے شبہ انسان نما درندہ ہے۔ خواہ وہ ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہو یا اجتماعی شخصیت کوئی شریف اور شریف النفس شخص حقدار کا حق تلف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" (سوتیلی ماں صفحہ ۲۵)

تمدن و تہذیب اور ترقی و تنظیم ملک کے لیے وسیع عمدہ اور مصفا سڑکیں بھی ایک جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہیں، تجارتی سہولت اور کاروباری آسانیوں اقتصادی ترقیوں، بیرونی افراد کے ساتھ باہم معاملات کی مشکلات کے حل کا راز اسی میں پنہاں ہے، جب تک کہ کسی ملک کے داخلی وسائل حمل و نقل اور ذرائع آمدورفت وسیع اور کافی نہ ہوں۔ صحیح معنوں میں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا، قیاس کیا جاتا ہے کہ جاپان کی ترقی کا ایک سبب اس کی کثیر و وسیع سڑکیں بھی ہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے ریاست حیدرآباد کی سڑکوں کی جو حالت تھی اس کی زیادہ تر توضیح کی ضرورت نہیں۔ سڑکوں کا

مجموعی طول صرف ایک ہزار میل تھا۔" (نذر دکن صفحہ ۸۹)

---

(۴) جہاں بانو بیگم

جہاں بانو بیگم کی دادھیال صوبۂ بہار سے آکر حیدرآباد میں بس گئی اور ننھیال ایران سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں بانو کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی، نام پلی اسکول میں تعلیم ہوئی۔ پھر جامعۂ عثمانیہ سے بی اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں لیں، بچپن سے علمی ماحول ملا۔ شادی کے بعد بھی شاعر اور علم دوست شوہر ملا۔ اولاً سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہوئیں، زنانہ کالج میں اُردو کی ریڈر رہیں۔ اب وظیفہ حاصل کرلیا ہے۔ جہاں بانو اس دور کی ممتاز نثر نگار اور انشاء پرداز ہیں وہ ادیب بھی ہیں اور نقاد بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور مقالہ نگار بھی، انگریزی سے ترجمہ کرنے کی بھی خاص مہارت ہے وہ ترجمہ کو اپنا لیا کرتی ہیں، طنزیہ نگاری کی کافی مشق ہے، افسانے، تخیل کردار، پلاٹ، مکالمہ ہر حیثیت سے قابلِ ستایش ہوتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے اپنے نقش قلم سے کافی شہرت حاصل کرلی ہے۔ معیاری رسالوں میں مضمون شائع ہوتے ہیں، نشر گاہوں سے تقریریں نشر کرتی ہیں، اب تک جو کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) رفتارِ خیال، ادبِ لطیف اور افسانوں کا مجموعہ (۲) رموز خانہ داری (۳) محمد حسین آزاد (مولانا آزاد کے متعلق تنقیدی اور تحقیقی مقالہ) (۴) بربط ناہید (اصلاحی اور طنزیہ خطوط کا مجموعہ) (۵) فتراک (سبق آموز اصلاحی معاشرتی مضامین کا مجموعہ) (۶) عرب اور عربستان (عرب کے متعلق بچوں کے لیے عام فہم معلومات) (۷) ولی کا فن شاعری، ان کے علاوہ جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا مجموعہ ضخیم ہوسکتا ہے۔

جہاں بانو بیگم کی زبان صاف، شستہ، رواں اور دلچسپ ہوتی ہے وہ قلم برداشتہ لکھتی جاتی ہیں کسی مضمون کے لیے سوچنے تیار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ نثر میں شاعری کرتی ہیں اور جا بجا ایسے شعر لکھتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی مقام کے لیے موزوں کیا تھا۔ ان کے افسانے سماجی اور اصلاحی ہوتے ہیں، وہ سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگاتی ہیں، سماج کے تصنّع کا پول کھول دیتی ہیں۔

"بربط ناہید" کے خطوط، اپنی رنگینی اور لطافت کے لحاظ سے قابلِ قدر ہیں۔ تحقیقی

اور تنقیدی مضمون میں وہ پوری تحقیق کرتی اور عمیق نظر سے دادِ تحقیق دیتی ہیں، ان کی تنقید غیر جانبدارانہ واقفیت پر مبنی ہوتی ہے۔ عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

"آزاد کے خیالات کی روانی کو ایک دریا سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو بہتا ہے اور اس کا تسلسل بوقلموں تعمیرات کا حامل ہوتا ہے، کبھی مرغزاروں میں سے اس کا گزر ہوا تو وہاں کے پُرکیف مناظر قدرت اور دلآویز نظارے اس کی سیدھی سادھی روش میں ایک لوچ پیدا کر دیتے ہیں، کہیں لق و دق میدانوں میں سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے تو کہیں سنسان وادیوں اور ویران صحراؤں کے خشک پتھریلے آغوش میں جگہ پاکر سحر آگیں نغموں سے ایک سنسنی خیز موسیقی پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی اپنے امواج کے لیے بے پناہ تھپیڑوں سے سنگین چٹانوں کو ٹکرا کر دل گداز نالے پیدا کرتا ہے، تو کہیں پہاڑوں کی بلندیوں اور کہسار کے سایہ میں آبشار کے بھیس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے فضا میں اپنی وجدانی کیفیت و جذبات کو منتشر کرتا رہتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک گم کردہ راہ مسافر کی طرح جس کو منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد اطمینان و آسودگی نصیب ہوتی ہو۔ یہ بھی بحر ناپیدا کنار سے وابستہ ہو کر اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے، بعینہٖ یہی حال آزاد کی ادبی روانیوں کا ہے کہ ہر منزل پر اس کے ادب کا سرچشمہ ایک نئے قسم سے جلوہ نما ہوتا ہے۔"

(محمد حسین آزاد، صفحہ ۱۹۱)

اُس وقت موسمِ سرما کی چمکیلی دھوپ میں تم بے اختیار یاد آگئیں، تمہاری سُنہری زلف نے عالمِ تصوّر کے گلے میں پھانسی ڈال دی۔ تمہاری سیاحت اور سیّاحی کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ تمہاری بوڑھی خادمہ "زوناکش" کیسی ہے؟ تمہارے ڈاکیہ کے انتظار نے ایک زمانے کی یاد دلا دی اور کچھ عرصہ تک مجھے دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا، ایک مغربی شاعرانہ خیال ہے۔ زمانہ گزشتہ کا تصوّر مسرور کن و مسرّت بخش ہوتا ہے، لیکن میرے لیے تو اس سے زیادہ اُلجھن انگیز کوئی اور چیز نہیں، مجھے تو اس میں کوئی اصلیت نظر نہیں آتی۔
ورنہ کا علاج [illegible] نہیں ہوتا!

پیاری سلمیٰ زمانہ کیسا جلدی بدل جاتا ہے، دن کیسے نکل جاتے ہیں
طبیعتیں کس طرح پلٹا کھاتی ہیں، عبرت عبرت!" (بربط ناہید۔ صفحہ ۱۰۰۹)

---

(۵) زینت ساجدہ

آپ ایک تقدس مآب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، جن میں حضرت شاہ محمد قادری نوردریا رائچوری اور قاضی محمود بحری وغیرہ شامل ہیں، زینت ساجدہ حیدر آباد میں ۱۹۲۴ء میں تولد ہوئیں، مدرسہ میں پہلی جماعت سے شریک ہوئیں اور پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک جماعت میں اوّل آتی رہیں اور پھر کالج میں ایف۔ اے سے لے کر ایم۔ اے تک بھی ریکارڈ قایم رکھا۔ جامعۂ عثمانیہ میں آپ کی تعلیم ہوئی۔ اب زنانہ کالج میں اُردو، ہندی کی لکچرار ہیں، ایم۔ اے امتحان کے لیے آپ نے اُردو غزل پر مقالہ قلمبند کیا تھا۔ مقالہ میں غزل کے داخلی پہلو پر روشنی ڈالی تھی اگرچہ یہ مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا۔ مگر جن اصحاب نے دیکھا ہے وہ اس کی خوبیوں کے معترف ہیں، زینت ساجدہ نے بڑی محنت اور کدو کاوش سے نہایت تحقیق کے ساتھ اس کو لکھا ہے، ان کی دو کتابیں بچوں کے لیے ہیں" حکمران عورتیں " اور "محبِ وطن عورتیں"۔ تیسری کتاب افسانوں کا مجموعہ " جل ترنگ " شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتابوں میں "حیدر آباد کے ادیب"، " تلگو ادب کی تاریخ" وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔ یہ ترقی پسند مصنّفین میں شامل ہیں، مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ وہ اکثر حقیقت کو افسانہ کا رنگ دیتی ہیں اور صالح ادب پیش کرتی ہیں، ان کے افسانوں میں خاکہ (پلاٹ) اور کردار دونوں نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں، ان میں جان ہوتی ہے شگفتگی پائی جاتی ہے، اثر ہوتا ہے۔ زینت ساجدہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں، اس لیے افسانوں میں اس پہلو کو خصوصیت سے پیش کرتی ہیں، ادب اور آرٹ سے خاص دلچسپی ہے۔ سینکڑوں شعر ازبر ہیں، شاعر نہیں ہیں، مگر شعر سے خاص مذاق ہے، افسانوں کے علاوہ سماجی اصلاحی اور تنقیدی مضمون بھی لکھا کرتی ہیں، نشر گاہ سے اکثر آپ کی تقریریں نشر ہوتی ہیں، کبھی طنزیہ مضمون بھی لکھا کرتی ہیں، زبان صاف اور شیریں ہوتی ہے۔ نمونہ پیش ہے:۔

"اسی لمحے کسی نے اس کے پاس تحفہ بھیجا، ناچتے ناچتے رُک کر اس نے اپنی لمبی سفید اُنگلیوں سے چاندی کی بڑی ڈبیا کھول کر دیکھا تو اس میں زرد

پھول تھا بندیا کا قم قم تھا۔ ابرک ملا گلال تھا اور مانگ کا سیندور۔ ایک پرچہ پر لکھا تھا "بسنتی کا کمینہ" اس کی بادامی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اس نے بڑی عقیدت سے اپنے جسم پر گلال چھڑکا، ماتھے پر بندیا لگائی۔ زرد پھول کو بالوں پر اڑس لیا۔

اور دوسرے دن جب ماں نے اس کے بیاہ کی بات چھیڑی تو اس نے انکار کر دیا۔"

---

(٦) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ

اورنگ آباد آپ کا وطن، ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی، پھر جامعۂ عثمانیہ سے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم۔اے میں کامیابی کے بعد زنانہ کالج میں ملازم ہوئیں۔ساتھ ساتھ پی۔ایچ۔ڈی کے امتحان میں شریک ہوئیں اور کامیابی حاصل کی۔ اب جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو میں ریڈر ہیں، ڈاکٹر صاحبہ کے مختصر افسانوں کا مجموعہ "کچے دھاگے" کے نام سے شائع ہوا ہے اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فن اور فنکار" کے نام سے، اس کے علاوہ ایم۔اے کا مقالہ "اُردو ادب کی ترقی میں خواتین کا حصّہ اور پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ اُردو نثر کا آغاز اور ارتقا انیسویں صدی کے اوائل" حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

رفیعہ سلطانہ کو افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری اور تنقیدی مضامین کا سلیقہ حاصل ہے آپ کے مختلف فیچر اسٹیج ہو چکے ہیں، افسانوں کا مجموعہ "کچے دھاگے" شائع ہو چکا ہے، رفیعہ سلطانہ کے افسانوں میں انسانی فطرت کی بوقلمونی، رنج و مسرت، حزن و یاس اور مظلومی کا تذکرہ بڑی اچھی طرح ہوتا ہے۔موجودہ دور کے افسانوں کے کردار کی اچھی تصویر کھینچتی ہیں۔کردار کی تحت الشعوری کیفیتوں کو واضح کرتی ہیں۔ جنسی کشمکش کو پیش کرتی ہیں مگر ساتھ ساتھ عورت کے وقار کو صدمہ ہوتا ہے اور نہ عُریانی پائی جاتی ہے۔ مردوں کی ہرجائیت اُجاگر کرنے میں ان کا قلم بڑا زور دکھاتا ہے۔ نثر کا نمونہ :-

"محبت کے جذبات پیدا ہونے تو درکنار مجھے اس کی بے نیازی پر غصّہ آگیا، عموماً لڑکیاں مجھ سے بہت زیادہ اخلاق سے ملا کرتیں اور گفتگو کی خواہشمند رہتیں، یہ عجیب لڑکی میں نے دیکھی جس پر ذرا بھی میرا رعب نہ

جم سکا، مجھے اس کے برتاؤ میں اپنی شکست محسوس ہوئی لیکن اس میں مجھے وہ جاذبیت نظر آئی جو اب سے پیشتر کسی لڑکی میں میں نے نہیں دیکھی تھی۔"

آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے، ان میں سے کبھی کبھی چاند اس طرح چمکتا تھا جس طرح کسی مہجور کی دنیائے یاس میں شعاعِ اُمید مسکراتی ہے۔ میں نے اپنی برساتی اوڑھلی اور چہل قدمی کے لیے نکل گئی سامنے کوٹھی میں چہل پہل نظر آرہی تھی، قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس میں کرایہ دار آگئے ہیں، گھر کے برآمدہ میں ایک لڑکی نظر آئی جو کتاب کے مطالعہ میں غرق تھی، میں نے دیکھا کہ وہ کتاب اس پر خاص اثر کر رہی ہے کیونکہ اس کے چہرے کی کیفیت بتا رہی تھی کہ اس کتاب کا اس پر خاص اثر ہو رہا ہے۔

---

(۷) منیرہ بانو کاوس جی

آپ حیدر آباد کے ایک معزز پارسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جو صاحبِ علم ہے۔ حیدر آباد میں منیرہ بانو پیدا ہوئیں۔ سنٹ جارجز گرلز اسکول میں ان کی تعلیم ہوئی اس کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں شامل ہوگئیں، علم کے شوق کے مدِنظر جامعۂ عثمانیہ سے بی۔ اے اور ایم اے اور ڈپ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم۔ اے کے لیے جو مقالہ قلمبند کیا اس کا عنوان "مولانا حالی اور ان کا کلام" ہے، مولانا کی سیرت اور ان کے کردار کے ساتھ کلام پر نہایت عمدہ تنقید کی گئی ہے اور ان کے ہم عصروں پر ترجیح کی وجہ کو نہایت خوبی سے ثابت کیا ہے منیرہ بانو کی ایک دوسری کتاب "کلید معرفت" ہے اس میں زردشتی مذہب کی عام عبادتوں کا اردو میں ترجمہ ہے، اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے، منیرہ بانو کے اصلاحی، سماجی اور تنقیدی مضمون قابلِ قدر ہوتے ہیں، ان کے مضامین اکثر رسالوں میں شائع ہو کر پسند کیے جاتے ہیں، نشر گاہ سے بھی ان کو موقع ملتا ہے۔ ایک پارسی عورت کا اردو ادب میں کامیابی سے حصہ لینا اس امر کو واضح کر سکتا ہے کہ حیدر آباد میں اردو نے کہاں تک ترقی کی تھی۔ منیرہ بانو کی اردو صاف، شستہ، عام فہم ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ دلچسپی بھی پائی جاتی ہے۔

"زمانہ اگر موافق نہیں تو سوائے اس کے کوئی علاج نہیں کہ ہم انقلابات کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور اپنے آپ کو زمانہ کے موافق بنالیں" زمانہ با تو نہ سازو تو بازیانہ بساز "۔ زمانہ انقلاب بدوش رہتا ہے، روزِ ازل سے اس کی یہی رفتار ہے۔ یہی انداز ہے جو اس کے شاکی رہتے ہیں۔ انہیں زمانہ کی ہوا ہمیشہ بگڑی ہوئی نظر آتی ہے، زمانہ کے خلاف کوئی کتنا ہی زہر اُگلے زہر کے گھونٹ نگلے۔ ناگوار کو گوارا کرنے کے سوا چارہ نہیں اس پہ نہ کسی کا قابو نہ کسی کا بس، زمانہ کا دھارا اپنے اندر سینکڑوں طوفان، صدہا بجلیاں، اَن گنت جھکڑ چھپائے ہوئے ٹھاٹھیں مارتا ہوا آگے بڑھتا ہے اس کے بہاؤ میں غیر معمولی قوت ہوتی ہے اس کے برخلاف جو نعرے لگاتے ہیں۔ مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔" (روح ترقی ۳۶۸)

---

(۸) خدیجہ بیگم

آپ کے والد حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر سید احمد صاحب تھے نواب اعظم جنگ کی آپ بہن ہیں، حیدرآباد میں تعلیم ہوئی، سینئر کیمبرج کے بعد یورپ جاکر مانٹی سری طریقۂ تعلیم کا ڈپلوما حاصل کیا۔ خدیجہ بیگم نے بچوں کے لیے ڈرامے اور کہانیاں لکھی ہیں، ڈرامے بیسیوں مرتبہ اسٹیج کیے گئے ہیں، نورجہاں شاہ جہاں، گوتم، ابوالحسن وغیرہ آپ کے مشہور ڈرامے ہیں۔ ڈراموں کے علاوہ بچوں کے لیے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

---

(۹) مسز شانتی بائی

آپ مسٹر سری کرشن سنہا کی شریکِ زندگی ہیں، لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وسیع مطالعہ کے علاوہ یورپ کی سیر کر کے وہاں کے حالات کا بچشمِ خود معائنہ کیا ہے۔ ادب اردو سے خاص دلچسپی ہے، آپ کے شوہر بھی ایک مشہور ترقی پسند مصنف اور افسانہ نگار ہیں، شانتی بائی کی ایک کتاب "نیا روس" شائع ہوئی ہے۔ اس میں روس کی ترقی کا تذکرہ ہے آپ کی ادبی دلچسپی اس سے بھی واضح ہو سکتی ہے کہ آپ نے اپنی کتاب کو بڑی جدت سے انتساب کیا ہے، چنانچہ لکھتی ہیں:-

"اس جذبے کے نام جو غالبؔ کے اس شعر میں پنہاں ہے ؎

منظر اک بلندی پر ہم اور بنا سکتے　　عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

شانتی بائی کی عبارت کا نمونہ حسبِ ذیل ہے :-

"روس کی انیسویں صدی کی سیاسی زندگی پر انقلابِ فرانس کا رنگ غالب تھا۔ مساوات، یکسانیت اور برادریت کے تخیلات سیاسی مفکر کے دل میں گھر کر چکے تھے، ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ جادو کی طرح سر پر چڑھ کر بول رہا تھا، لیکن شاہی اقتدار اس کو رکیک اور بے معنی سمجھ کر اپنی مطلق العنانی کے قائم رکھنے پر مُصر تھا۔"

"انتہائی اشتراکیت میں حکومت کا تخیل عنقا ہے، خود لینن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ بتدریج حکومت نیست و نابود ہوتی جائے گی، بہ الفاظ دیگر امورِ مملکت کے چلانے کے لیے کسی مرکزی ادارے کی ضرورت نہیں رہیگی خود لوگ امورِ مملکت کو بھی انفرادی اور غیر شعوری طور پر چلانے کے عادی ہو جائیں گے لیکن عصرِ جدید کے سیاست داں حکومت نہ ہونے کو سے تعبیر کرتے ہیں، انقلاب روس کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ حالات پر قابو پانے اور ملک کی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لیے ایک مرکزی ادارے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انقلابیوں نے اس کو آہستہ آہستہ تعمیر کیا۔"

(نیا روس)

ڈرامہ اور اداکاری

ڈرامہ نگاری ادب کی ایک بہت ہی اہم صنف ہے اس کے ذریعہ زبان کی خدمت کا بہت بڑا حق ادا ہو جاتا ہے اُردو ڈرامہ کی ابتدا بلا شبہ لکھنؤ سے ہوئی، امانتؔ نے اندر سبھا لکھ کر اس کی بنیاد رکھی، اس کے بعد دوسرے افراد نے ڈرامے تالیف اور ترجمے کیے اس کی وضاحت ہمارے موضوع سے جدا ہے۔

ہم کو یہ بتانا ہے کہ حیدر آباد میں اُردو ڈرامہ کب لکھا گیا؟ جہاں تک معلوم ہے سب سے پہلے مسٹر سہراب جی کا نگا نے "میکبتھ" کا ترجمہ کیا اور "تلاطمِ ایران" کے

نام سے اس کو شائع فرمایا، اس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے اس کے علاوہ اسی زمانے میں ظفر علی خاں صاحب نے جنگ روس و جاپان اور مرحوم عزیز مرزا نے 'وکرم ورسی' شائع کیا۔ ان کے سوا منشی انوار الدین صاحب مخلص نے بعض ناٹک کمپنیوں کے لیے چند ڈرامے لکھے مثلاً ہار جیت[1]، دھوپ چھاؤں، کالی ناگن اور منشی یاور علی صاحب اعظم نے دکھیا دلہن، جور مالن، آجکل وغیرہ اسی غرض سے لکھے۔

حیدر آباد کے اردو ڈرامہ کی یہ مختصر تاریخ ہے، زیرِ ذکر دور میں اور اصنافِ ادب کی طرح ڈرامہ کو بھی خاص ترقی حاصل ہوئی ہے، سب سے پہلے مولوی تفضل حسین مرحوم کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے شکسپیئر کے ڈراموں کا کامیاب ترجمہ کیا، اس کے بعد مسٹر فضل الرحمٰن قابلِ تذکرہ ہیں، ان کے ترجمے اور طبعزاد ڈراموں نے خاص وقعت حاصل کرلی ہے، ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ پیش بھی کیے جا چکے ہیں، ظاہر و باطن اور نئی روشنی، تو شیریڈن کے ترجمے ہیں، حشرات الارض، پردہ اور کارخانہ طبعزاد ہیں۔

تمکین کاظمی اور سعیدی صاحبان نے ارنسٹ کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ عصمت اللہ بیگ صاحب نے غلط در غلط مرتب کیا ہے۔ ان کے علاوہ نظام کالج کے طلبہ سے ناکارہ صاحب اور سید بادشاہ حسین صاحب نے کئی ڈرامے لکھے ہیں، اسی طرح طلبہ عثمانیہ کالج میں سے محمد اکبر وفا قانی صاحب، عزیز احمد صاحب، ظفر الحسن صاحب، مخدوم محی الدین صاحب، میر حسن صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ان اصحاب نے کئی ڈرامے لکھے ہیں اور ان میں سے اکثر اسٹیج پر پیش ہو کر کامیاب ثابت ہو چکے ہیں جامعۂ عثمانیہ کی بعض طالبات نے ڈرامے اور فیچر لکھے ہیں۔ رفیعہ سلطانہ، سلطانہ بیگم وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔ اس دور کے ڈراموں کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ ترجمہ ہوں یا طبعزاد وہ ڈرامہ نگاری کے صحیح اصولوں پر مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر ڈرامے مجموعی حیثیت سے قابلِ تعریف ہیں۔ ڈرامہ کے ساتھ اداکاری کا بیان بھی ضروری ہے۔ حیدر آباد کا سب سے پہلا تھیٹر وہ تھا جو " دال منڈی " کے نام سے موسوم تھا " جگیا " اس کا

---

[1] اردو ڈرامہ نگاری مؤلفہ سید بادشاہ حسین (حیدر آبادی)

منتظم اور "محبوب جان" ممتاز اداکار تھی[1]

اس کے بعد ایسی کوئی مشہور تھیٹر کمپنی حیدر آباد میں قائم نہیں ہوئی جو قابلِ تذکرہ ہو، البتہ بمبئی وغیرہ سے مختلف ناٹک کمپنیاں آتیں اور خوب روپیہ کماتیں، غرض آج سے پہلے ڈرامہ کو ترقی دینے کے لیے کوئی بزم قائم نہیں تھی۔ اس دور میں اس پر بھی توجہ ہوئی اور انجمنیں قائم ہوئیں جن میں سے "انجمن ترقی ڈرامہ" بزمِ تمثیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن ترقی ڈرامہ کے ارکان میں مرزا شکور بیگ، فضل الرحمٰن، مرزا محی الدین بیگ، محبوب علی طاہر، عبدالقیوم وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، اس انجمن کی جانب سے جن اصحاب نے اداکاری کی مشق کی اور کامیاب اداکار ثابت ہوئے ان کے نام یہ ہیں:۔

ظفر علی مرزا صاحب، شکور بیگ صاحب، شرافت اللہ بیگ صاحب، ظفر الحسن صاحب، عبدالرب صاحب اور غزنوی شہر یار وغیرہ۔

بزمِ تمثیل کے کامیاب اداکاروں میں محمد اکبر وفا قانی، مخدوم محی الدین، جمیل احمد، عباس علی خاں وغیرہ قابلِ تذکرہ ہیں۔

مدارس سرکاری مثلاً عثمانیہ کالج، نظام کالج، سٹی کالج، اورنگ آباد کالج، ورنگل کالج وغیرہ میں بھی ڈرامے ہوتے اور طلبہ دلچسپی سے حصّہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں صدرالذکر اداکاروں میں بڑا حصّہ کالج کے طلبہ ہی کا ہے۔

کلیہ اناث میں بھی ڈرامے ہوا کرتے ہیں اور طالبات اس میں حصّہ لیتی ہیں اور اپنی اداکاری کے لحاظ سے کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

اُردو ڈرامہ میں اداکاری کی حیثیت سے جس خاتون نے مردوں کے ساتھ پہلی مرتبہ حصّہ لیا ہے وہ مس مے مچایا ہیں، انہوں نے طبیب حاذق "کے ڈرامہ میں جو مسٹر ظفرالحسن کا مرتبہ تھا" اداکاری کی تھی، مگر اس کے بعد کئی خواتین نے لڑکوں کے ساتھ ڈرامہ میں حصّہ لیا۔ ان میں خصوصیت سے شیریں، علی اصغر قابلِ تذکرہ ہیں، جنہوں نے اپنی اداکاری سے ثابت کر دیا کہ حیدر آبادی طالبات اس مشکل فن کو کامیابی سے انجام

---

[1] اُردو میں ڈرامہ نگاری۔

دے سکتی ہیں۔ اسی ضمن میں سید بادشاہ حسین کا ذکر ضروری ہے جنہوں نے "اُردو میں ڈرامہ نگاری" لکھ کر ڈرامہ کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔ اس موقع پر فضل الرحمٰن صاحب اور سید بادشاہ حسین صاحب کا تذکرہ ضروری ہے۔ جنہوں نے ڈرامے اور تاریخ ڈرامہ لکھ کر اُردو زبان کی خدمت انجام دی ہے۔

فضل الرحمٰن صاحب

شعراء کے تذکرہ میں فضل الرحمٰن صاحب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آپ ایک بہترین انشاء پرداز اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ آپ کے ڈراموں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ صرف فنی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر ہیں بلکہ اسٹیج کے بھی قابل ہیں، چنانچہ آپ کے ڈرامے کئی مرتبہ حیدر آباد وغیرہ میں اسٹیج ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ پانچ ڈرامے اب تک لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے دو ترجمے ہیں اور تین طبعزاد، مگر جو دو ترجمے ہیں وہ بھی صرف ترجمے نہیں بلکہ ان کی حالت تصنیف جیسی ہوگئی ہے، یہ ڈرامے ظاہر و باطن، حشرات الارض، کارخانہ اور نئی روشنی پر ہیں، ان کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے، مکالمے برجستہ اور شگفتہ ہیں۔ پلاٹ کی خوبی اور کردا کے لحاظ سے بھی ان کو بلند مرتبہ حاصل ہے، بہرطور اُردو ڈراموں میں ان کا معیار اعلیٰ اور بلند ہے، عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

شہر بانو:۔ کہئے زینت کا بیاہ کب رچے گا؟۔

اعزاز۔ بہن آپ کو تو بس بیاہ ہی کی لگی ہے اور یہاں زندگی کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی۔

شہر بانو۔ یہ بکھیڑے تو دم کے ساتھ ہیں کیا ان کی خاطر کوئی دنیا کے کام بند کر دے گا؟۔

اعزاز۔ نہیں بہن! دنیا کے کاروبار کیسے رُک سکتے ہیں۔

شہر بانو۔ ہماری طرف سے تو سب تیاریاں ہو چکیں، کہئے آپ کو کون سی تاریخ پسند ہے؟

اعزاز۔ (کسی قدر جھجک کر) بہن یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے، میں ابھی کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

شہر بانو۔ کیوں کیا آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں ؟۔
اعزاز ۔ توبہ، یہ کس نے کہا۔
شہر بانو۔ پھر آخر عذر کیا ہے ؟
اعزاز ۔ بات یہ ہے۔ لڑکی ابھی زیر تعلیم ہے اور پھر لڑکا بھی نوکر نہیں، ایسی شادی سے کیا فائدہ جس میں راحت نصیب نہ ہو[1]

فیتن ۔ آپ نے دھواں دھار تقریریں کیں اور میں نے آتش فشاں مضامین لکھے، لیکن نتیجہ کیا نکلا ؟
افسر۔ آپ سائنس کے ماہر بن گئے اور میں آرٹ کا نمونہ۔
فیتن ۔ میں سائنس کا ماہر نہ سہی لیکن آپ آرٹ کا نمونہ ضرور بن گئے ہیں۔
افسر ۔ (طنزاً) شکریہ۔ یہ تعریف ہے یا مذمت ؟
فیتن ۔ نہ یہ تعریف ہے نہ مذمت بلکہ واقعہ کا اظہار ہے۔
افسر ۔ آرٹ کے بارے میں اب بھی آپ کا وہی نظریہ ہے۔
فیتن ۔ کیوں نہیں، میں ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں اور ہمیشہ یہی کہوں گا کہ آرٹ نیچر کی ترقی کا آخری زینہ ہے، وہ آرٹ نہیں جو اصلیت کو بگاڑے یا اس کی نقالی میں اپنا سارا کمال صرف کر دے۔ بلکہ وہ آرٹ جو اصلیت کو چار چاند لگا دے اور کچھ ایسے ہی آرٹ کا نمونہ اس وقت میرے سامنے ہے[1]

سید بادشاہ حسن

حیدر آباد کے متوطن، نظام کالج کے ایم۔ اے، اردو کے ادیب سید بادشاہ حسن بھی اس دور کے ایک ممتاز اہل قلم ہیں، آپ ڈرامہ نگار بھی ہیں اور نقاد بھی، افسانہ نگار بھی ہیں اور مورخ بھی، آپ کی کتاب "اردو میں ڈرامہ نگاری" اپنے فن کی بے مثل کتاب ہے، فن ڈرامہ کی تاریخ اور زبان اردو میں اس کی ابتدا اور ارتقا کا حال نہایت خوبی سے قلمبند کیا ہے، اس کتاب سے واضح ہو سکتا ہے کہ ڈرامہ کس کو کہتے ہیں، اس کی ابتدا کب ہوئی، اردو میں کب ابتدا ہوئی۔ فن ڈرامہ

---

[1] آیندہ زمانہ۔ صفحہ ۲۴۔

کی خصوصیات کیا ہیں، اُردو میں پہلا ڈرامہ کس نے لکھا، کن کن کے ڈرامے مشہور ہیں، کون کون ناٹک کمپنیاں عالمِ وجود میں آئیں ؟ اس کتاب کے بعض مضامین حسبِ ذیل ہیں :۔

ڈرامہ کی ابتدا ڈرامہ کی قسمیں، ڈراما اور تھیٹر، اُردو ڈراما کی پیدائش، اندر سبھا، قدیم اُردو ڈراموں کی بعض خصوصیات، شیکسپیئر کے ترجمے، قدیم ناٹک کمپنیاں، طرزِ جدید کے پیش رو اور ہیرو، فلم اور اُردو ڈراما اُردو ڈراما کا مستقبل۔

سید بادشاہ حسن صاحب کی دوسری مشہور کتابیں" سلاطین آصفیہ کے رعایا سے تعلقات اور دیوانِ تاباںؔ" معہ حیات اور شاعری پر تنقید ہے۔ سید بادشاہ حسن صاحب کی نثر میں لوچ اور اثر ہوتا ہے، اس کی روانی اور سادگی بھی قابلِ قدر ہے۔ اب یہ پاکستان چلے گئے ہیں۔ عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

"ارسطو نے ڈراما کے چھ حصے کئے۔ قصہ، کردار، الفاظ، خیال، آرائش اور موسیقی، ان سب میں زیادہ اہمیت قصہ کے تسلسل کو دی۔ کیونکہ اس کے خیال میں حزنیہ نقل ہے۔ انسانوں کی نہیں بلکہ افعال کی، ایسے افعال جو زندگی کی تگ ودَو میں انسان سے سرزد ہوتے ہیں، زندگی کی ابتدا اور انتہا انسانی افعال ہیں اور دراصل انہیں افعال پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے دوسرے الفاظ میں افعال ہی اسباب ہیں طربیہ اور حزنیہ کے۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بغیر قصہ کے چاہے وہ کسی قدر موہوم ہی کیوں نہ ہو، کوئی ڈراما وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ڈرامہ حقیقت میں ایک قصہ کا نام ہے جو مکالمہ کی شکل میں بیان کیا گیا ہو۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ڈرامہ کا سب سے زیادہ اہم حصہ ہے ....

واجد علی شاہ کے دربار میں جتنی چیزیں گائی جاتی تھیں، جتنے جلسے اور رہس کھیلے جاتے تھے ان کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہوتا تھا۔ کوئی ایسا درباری شاعر مخصوص نہ تھا کہ ٹھمری کہہ کہہ کر گانے والیوں کو دیتا، یا رہس اور جلسہ تیار کرتا بلکہ اکثر ایسی چیزیں " رنگیلے پیا" جانِ عالم اور اختر کی ہوتی تھیں، واجد علی شاہ کی طبیعت کا رجحان طور وطریق اور عادات سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے امانت کو کبھی اندر سبھا تیار کرنے کا حکم نہ

دیا تھا۔ اوّل تو یہی ثابت نہیں کہ امانت واجد علی شاہ کے درباری شاعر تھے یا کم از کم مصاحب[1]۔"

خطیب اور وکلاء وغیرہ

اس موقع پر وہ اصحاب بھی قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے خطیب کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور اُردو میں اپنی جادو بیانی سے سکّہ قائم کر دیا۔ یوں تو اس زمرہ میں کئی اصحاب شامل ہیں مگر ہم صرف مشہور اصحاب کا تذکرہ کریں گے۔

سب سے پہلے نواب بہادر خاں (بہادر یار جنگ) کا نام لینا ضروری ہے جو ایک معزز جاگیردار خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ حیدرآباد میں تولد ہوئے اور دار العلوم میں میٹرک تک تعلیم پائی مگر اپنی خداداد طبیعت کی روانی اور ذہانت کی تیزی سے وہ رتبہ حاصل کر لیا جو بہت کم کسی کو حاصل ہوتا ہے۔ مجلسِ اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے جو نام اور نمود انہوں نے حاصل کیا وہ حیدرآباد کی تاریخ میں جلی حروف میں نمایاں رہے گا بحیثیتِ خطیب بہادر خاں کو جو مقام حاصل تھا وہ اُردو زبان کے لیے قابلِ فخر ہے کہ اس زبان میں تقریر کرنے والا اپنی جادو بیانی سے لوگوں کے دلوں کو مسخّر کر لیتا تھا۔ ان کی جادو بیانی صرف حیدرآباد تک محدود نہیں بلکہ برطانوی ہند میں ان کی پُر زور اور اثر آفریں تقریر کا کوئی جواب نہیں تھا۔ افسوس ہے کہ جوانی میں موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔

دوسرے خطیب سیّد قاسم رضوی تھے جن کے اجداد نے لکھنؤ میں خاندانِ اودھ کے زمانے میں دیوانی کی تھی اور اس کے بعد حیدرآباد آکر بس گئے تھے۔ سیّد قاسم رضوی کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ علی گڑھ بھیجے گئے اور وہاں سے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کر کے وکالت شروع کی اور مجلس اتحاد المسلمین کے صدر بنے۔ ان کی تقریر بھی اُردو میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر سے بڑا اثر پیدا کر دیا تھا۔ زورِ بیان اور اندازِ بیان قابلِ داد ہوتا تھا۔ مولوی میر مظہر علی، سیّد محمد پادشاہ حسینی

---

[1] اُردو میں ڈرامہ نگاری۔ صفحہ ۱۸۰،۲۰

مولانا حسام الدین وغیرہ دوسرے منجھے ہوئے لوگ تھے، جنہوں نے اس دور میں اُردو خطیب کی حیثیت سے نام و نمود حاصل کر لیا تھا۔

اُردو میں وکالت کرنے والے ایڈوکیٹ یا بیرسٹر وغیرہ بھی کئی نامور ہوئے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔ میر اکبر علی خاں، خواجہ عبدالعزیز مرحوم، مولوی فیض الدین، سید عسکری حسن (عسکر یار جنگ) مولوی ابوالحسن، سید علی کلیم الدین انصاری، انیس الدین، ارملا لنگا بی رام کشن راؤ، راما چاری جوشی، گوپال راؤ بکھوٹے، وِنانک راؤ باسٹر، رام چندر نائک، راجہ رام نائر وغیرہ جامعۂ عثمانیہ اور غیر عثمانی وکلاء اور بیرسٹر بیسیوں ہیں جو اُردو میں پیروی کرتے ہیں، عدالتوں اور مالگذاری کے دفاتر میں اُردو سرکاری زبان ہونے سے پیروی کا دارومدار اُردو کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس لیے عام طور سے زبان اور وکلاء کی پیروی اور بحث کی زبان ہوتی تھی۔ اُردو کی ترقی کا یہ بھی ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا تھا۔

نستعلیق ٹائپ

زبان کی ترقی کے لیے مطابع کا وجود بمنزلہ روح کے ہے، حیدرآباد میں پانچویں دَور میں ہی مطابع کا وجود ہوگیا تھا، سنہ ۱۲۵۰ھ میں پہلا مطبع قائم ہوا تھا۔ اس کے بعد شمس الامراء نے اپنا مطبع قائم کیا۔ رفتہ رفتہ حیدرآباد میں مطبعوں کی تعداد زیادہ ہوتی گئی۔ اسی دور میں برقی پریس بھی قائم ہوگئے اور رنگین طباعت بھی ہونے لگی۔ مطابع کی دو قسمیں ہیں ٹائپ اور لیتھو، نسخ ٹائپ میں اُردو زبان کی کتابوں کی طباعت عرصۂ دراز سے حیدرآباد میں ہوتی چلی آئی ہے، اُردو زبان کے لیے نستعلیق ٹائپ تیار کرنے کی کوشش ایک عرصۂ دراز سے جاری تھی مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی، خود حیدرآباد میں بھی اس قسم کی کوشش عرصہ سے جاری تھی۔ اب حال میں انجمن ترقی اُردو، اور سرکار عالی کے دارالطبع میں پھر کوشش کی گئی، دونوں جگہ ٹائپ تیار کیا گیا اور جب یہ مکمل ہوگیا تو ہندوستان کے کئی ماہرینِ فن کی کمیٹیاں مختلف اوقات میں ہوئیں اور آخر کار سرکار عالی کے دارالطبع کا تیار کردہ نستعلیق ٹائپ پسند کیا گیا اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے مفید اور کارآمد قرار دیا گیا ہے۔ نستعلیق کا

لہ عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں سنہ ۱۲۵۰ھ میں طبع شدہ کتاب موجود ہے۔

مخزن حسب ذیل (۵۹۴) حروف پر مشتمل ہے۔

(۱)	مفرد	۴۵۷
(۲)	مرکب	۱۰۲
(۳)	زوائد	۳۵

مرکبات صرف اس خیال سے کہ الفاظ کی خوشنمائی میں کوئی فرق نہ آئے خود علیحدہ ڈھال لیے گئے ہیں۔

اس ٹائپ کی تیاری اور اس کو روزمرہ کاروبار میں مفید اور سودمند بنانے میں سررشتہ دارالطبع نے جو جدوجہد کی ہے وہ بہت قدر کے قابل ہے۔

اُردو کرنسی نوٹ یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ مملکتِ آصفیہ کی سرکاری زبان اُردو تھی اس سے ظاہر ہے کہ جس قدر سرکاری کاروبار خواہ وہ کسی قسم کے ہوں، اُردو میں ہوا کرتے تھے، چنانچہ کرنسی نوٹ بھی اُردو میں جاری ہوگئے اور اُردو کا سکہ کاغذ زر پر بھی چلنے لگا۔

اخبارات اور رسالے

اس دور میں اخبارات اور رسالوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے ان کی پوری تفصیل دشوار ہے تاہم ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ اس فہرست سے معلوم ہوسکتا ہے کہ بلحاظ اخبارات اور رسائل کے بھی اس دور کو اپنے ماسبق ادارہ پر تفوق حاصل ہے۔

شمار	نام	نوعیت	
۱۔	مشیر دکن	روزانہ	اس کے متعلق قبل ازیں صراحت ہوچکی ہے۔
۲۔	صحیفہ	″	اکبر علی صاحب کا انتقال ہونے پر محمد مظہر صاحب چندماہ تک ادارت کرتے رہے۔ پھر اکبر علی صاحب کے فرزند اس کو چلاتے رہے۔
۳۔	رہبر دکن	روزانہ	اسی دور میں اس اخبار کی اجرائی ہوئی ہے

			اولاً سیّد احمد محی الدین صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ بڑی تقطیع کے چھ اور کبھی آٹھ اور بارہ صفحہ پر شائع ہوتا تھا، کبھی تصاویر ہوتی تھیں خاص و عام میں مقبول تھا۔ سالنامہ نہایت اہتمام سے شائع ہوتا تھا جس میں قابلِ قدر مضامین اور عمدہ تصویریں ہوتی تھیں۔ احمد محی الدین صاحب کے انتقال کے بعد ان کے فرزند محمود وحید الدین بی۔اے عثمانیہ کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ پولیس ایکشن کے بعد بند کردیا گیا۔
۴۔	صبح دکن	روزانہ	احمد عارف صاحب ایک قابل نوجوان اس کے ایڈیٹر تھے بڑی تقطیع کے چھ صفحوں پر یہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد بند ہوگیا۔
۵۔	منشور	روزانہ	یہ اخبار بھی بڑی تقطیع کے چھ صفحوں پر شائع ہوتا تھا عبدالرحمٰن صاحب رئیس اس کے ایڈیٹر تھے۔ بعد پولیس ایکشن کے بند ہوگیا۔
۶۔	پیام	روزانہ	قاضی عبدالغفار صاحب کی اڈیٹری میں تھا۔ یہ اخبار ۱۳۴۴ فصلی میں جاری ہوا تھا۔ قاضی صاحب نے چند سال کے بعد اختر حسین صاحب بی۔اے (عثمانیہ) کو اپنے بجائے ایڈیٹر کردیا تھا۔
۷۔	رعیّت	ہفتہ وار	مسٹر نرسنگ راؤ اس کے ایڈیٹر ہیں۔ راؤ صاحب

			نے مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی اور فارسی کا آخری امتحان دبیر کامیاب کیا۔ اخبار کو محنت و دلدہی سے مرتب کرتے ہیں اور آزادانہ رائے کا اظہار ہوتا ہے اب بند ہو چکا ہے۔
۸۔	نظام گزٹ	روزانہ	ابتدا میں اس کے اڈیٹر حبیب اللہ صاحب رشدی اور وقار احمد صاحب تھے۔ اب صرف آخر الذکر کی ادارت میں یہ شائع ہوا کرتا ہے۔ دونوں اصحاب جامعۂ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں اولاً ہفتہ وار تھا اس کے بعد روزانہ ہوگیا۔ سالگرہ نمبر وغیرہ خاص اہتمام سے شائع کرتے تھے، اب شائع نہیں ہوتا۔
۹۔	الاعظم	ہفتہ وار	پہلے یہ اخبار ضلع بیڑ سے شائع ہوا کرتا تھا اس کے بعد حیدرآباد سے شائع ہوتا رہا، آزاد انصاری صاحب اس کے اڈیٹر تھے۔
۱۰۔	راز	ہفتہ وار	مولوی احمد اللہ صاحب روحی اس کے اڈیٹر تھے۔
۱۱۔	واعظ	ہفتہ وار	مولوی عبدالوہاب صاحب عندلیب اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ ایک مذہبی پرچہ ہے اضلاع کے واعظین کے لیے خاص کر مضامین شائع کرنا اس کا مقصد تھا۔
۱۲۔	سلطنت	روزانہ	سید احمد اللہ قادری اس کے ایڈیٹر ہیں اولاً ہفتہ وار شائع ہوا۔ اس کے بعد

روزانہ

۱۳۔	حمایت دکن	روزانہ	اوّلاً ہفتہ وار تھا پھر روزانہ ہوگیا تھا۔
۱۴۔	میزان	″	غلام محمد صاحب ایڈیٹر تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے بعض قابل فرزند اس کے اسٹاف میں شامل تھے۔ اُردو کے ساتھ انگریزی میں شائع ہوتا تھا، بڑی اہمیت حاصل کرلی تھی اور عام وخاص میں مقبول ہوگیا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد بند کردیا گیا۔
۱۵۔	پرچم	ہفتہ وار	فصیح الدین صاحب یہ اخبار ۱۹۴۷ء میں شائع کرنے لگے تھے، باتصویر اخبار تھا اپنی مختصر زندگی میں خاصی اہمیت حاصل کرلی تھی پولیس ایکشن کے بعد بند ہوگیا۔

اب اس دور کے ماہوار علمی اور ادبی رسالوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:۔

شمار	نام	اڈیٹر	سنہ اجرائی	کیفیت
۱۔	افادہ	مرزا نظام شاہ	۱۹۱۶ء	قابل اڈیٹر کی وجہ سے بلند پایہ مضمون نگار فراہم ہوگئے تھے۔ اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا۔ چند سال کے بعد اڈیٹر کی دوسری مصروفیتوں کی باعث بند ہوگیا۔
۲۔	المعالج	حکیم بشیر احمد	۱۹۱۷ء	یہ ایک طبّی رسالہ تھا۔ طبّ یونانی کے متعلق اچھے مضمون شائع ہوتے تھے۔ چند سال کے بعد جب اڈیٹر صاحب کے مریضوں کی تعداد کافی ہوگئی تو وہ رسالہ کی طرف توجہ نہ دے سکے اس لیے رسالہ بند ہوگیا۔
	اتالیق	عبدالرب کوکب	۱۹۱۷ء	یہ ایک ماہوار بچّوں کا رسالہ تھا جو سررشتہ تعلیمات کی سرپرستی سے جاری ہوا تھا،

نمبر	رسالہ	اڈیٹر	سنہ	کیفیت
				کئی سال تک جاری رہا، بچوں کے لیے اچھے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔
۴۔	رہبرِ مزارعین	مظہر حسین	۱۹۱۸ء	یہ رسالہ سررشتۂ زراعت سے شائع ہوتا تھا۔ ناظمِ سررشتہ اس کے اڈیٹر تھے، جب ان کی مصروفیت زیادہ ہوگئی تو رسالہ بند ہوگیا۔
۵۔	ثمرۃ الادب	عبدالوسیع	۱۹۱۸ء	یہ رسالہ انجمن ثمرۃ الادب دار العلوم سے شائع ہونے لگا، راقم الحروف اس کا منیجر تھا۔ اڈیٹری کے فرائض بہت کچھ انجام دیا کرتا۔ اساتذہ وغیرہ کے بعض اچھے اور بلند پایہ مضامین شائع ہوئے میرے تعلیمی سلسلہ کے موقوف ہونے پر رسالہ بھی بند ہوگیا۔
۶۔	شعلہ	سید نوازش علی شعلہ	۱۹۱۸ء	شعلہ حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے۔ ان کی وجہ سے جلد رسالہ نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی، مگر بہت جلد رسالہ بند ہوگیا۔
۷۔	النساء	صغرا بیگم ہمایوں مرزا	۱۹۱۹ء	یہ ایک نسوانی رسالہ تھا جس میں زیادہ تر خواتین کے مضامین ہوتے تھے مگر زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا کیوں کہ بیگم صاحبہ کے سفرِ یورپ کے باعث بند ہوگیا۔
۸۔	نونہال	مرغوب الدین	۱۹۳۰ء	یہ ایک تعلیمی رسالہ تھا۔
۹۔	اردو	مولوی عبدالحق	۱۹۳۱ء	یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ اسی دور میں جاری ہوا۔ اس رسالہ کے متعلق کسی صراحت کی اس لیے ضرورت نہیں

				ہے کہ اس کے بلند پایہ مضامین سے دنیائے اُردو بخوبی واقف ہے، اولاً اورنگ آباد پھر اس کے بعد دہلی سے اس کی اجرائی ہونے لگی۔ اب کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ نے اُردو زبان اور ادب کی جو خدمت اب تک انجام دی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں ہے چونکہ اس کی ابتدائی اجرائی اورنگ آباد سے ہوئی اس لیے اس دور کو اس رسالہ کے باعث اہمیت حاصل ہے۔
۱۰۔	نمائش	مرزا رفیق بیگ	۱۹۲۲ء	ایک صنعتی رسالہ تھا مگر اس میں ادبی مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کے مضامین کی ابتدا اس رسالہ سے ہوئی "مرزا الم نشرح" کے نام سے وہ مضمون لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء تک جاری رہا، اس کے بعد بند ہوگیا۔
۱۱۔	ترقی	ابو لمکارم محمد انوار اللہ	۱۹۲۲ء	یہ رسالہ نہایت ٹھوس اور معیاری مضامین کا حامل تھا، حیدر آباد کے بعض قابل افراد اس رسالہ کے مضمون نگار اور سرپرست تھے۔ اڈیٹر کی طویل علالت کے باعث بند ہوگیا۔
۱۲۔	خادمہ	مریم بیگم	۱۹۲۲ء	ایک زنانہ رسالہ تھا اوسط درجہ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔
۱۳۔	لسان الملک	سید محمد ضامن کنتوری	۱۹۲۲ء	اس رسالہ نے بھی اپنے قابل اڈیٹر اور

مضمون نگاروں کی اعلیٰ قابلیت کے باعث جلد شہرت حاصل کرلی تھی مگر زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔

۱۴۔	تاج	غلام محمد وفا	۱۹۲۳ء	یہ رسالہ گذشتہ دور میں اجرا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ تک بند رہ کر پھر اس دور میں جاری ہوا۔ رسالہ کا سائز بھی بڑا کردیا گیا تھا۔ بقول سید سلیمان ندوی یہ رسالہ ہندوستان کے معیاری رسالوں سے بہتر تھا۔ ملک کے اکثر انشاء پرداز اس کے مضمون نگار تھے، حضرت امجد کا کلام بھی اسی میں شائع ہوتا تھا۔ افسوس ہے اس مرتبہ بھی اس رسالہ کو بند ہوجانا پڑا۔
۱۵۔	نظام کالج اردو میگزین	محمد میر خاں	۱۹۲۳ء	نظام کالج کے طلبہ نے اس کو جاری کیا تھا۔ میر خاں (میر نواز جنگ) کے تعلیمی سلسلہ کے ختم ہونے پر رسالہ بند ہوگیا۔
۱۶۔	المصادق	سید محمود	۱۹۲۳ء	مہدوی اصحاب کا یہ علمی رسالہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔
۱۷۔	المعلم	محمد عظمت اللہ خاں	۱۹۲۳ء	سررشتۂ تعلیمات سے اوّلاً اس کی اجرائی ہوئی۔ پھر ٹریننگ کالج سے جاری ہونے لگا۔ مولوی سجاد مرزا صاحب کے زمانہ میں اس رسالہ نے بڑی ترقی حاصل کی تھی، عرصۂ دراز تک آب و تاب سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے فنی اور ادبی مضامین بڑے اعلیٰ پایہ کے ہوتے تھے۔
۱۸۔	معلم العلوم	سراج الدین	۱۹۲۳ء	یکے بعد دیگرے دو رسالے جو مذہبی تھے

نمبر	نام	مدیر	سنہ	کیفیت
				جاری ہوئے مگر جلد بند ہوگئے۔
۲۰۔	النور	سید باقر حسین طارق	۱۹۲۳ء	ایک مذہبی رسالہ تھا جو مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔
۲۱۔	صراط المستقیم	ابوالقدر نور محمد	۱۹۲۳ء	ایک مذہبی رسالہ تھا۔
۲۲۔	تحفہ	محب اللہ عالی	۱۹۲۳ء	انجمن ارباب اُردو کا ماہوار رسالہ تھا عموماً دکن کے ذی علم اصحاب اور خصوصاً طلبہ جامعۂ عثمانیہ کے مفامین شائع ہوتے تھے مگر ایک سال کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے ٹھوس علمی اور ادبی مضمون حیدرآباد کے علمی ذخیرہ میں اضافہ کا موجب ہوئے ہیں۔
۲۳۔	ارتقار	افضل شریف	۱۹۲۴ء	یہ رسالہ سکندرآباد سے شائع ہونے لگا تھا۔ دو سال تک جاری رہا۔
۲۴۔	ترجمان	ابوالمکارم انوار اللہ	۱۹۲۴ء	ترقی کے بعد اس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا اور ایک پرچہ بھی شائع ہوا، مگر اس کے بعد دوسرا پرچہ شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔
۲۵۔	سائیں کی صدا	بھوانی پرشاد	۱۹۲۵ء	ایک مذہبی اور اخلاقی رسالہ تھا۔ تصوف کے اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔
۲۶۔	مجلہ عثمانیہ		۱۹۲۶ء	طلبہ جامعۂ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی رسالہ ۱۹۲۶ء سے شائع ہونے لگا، ہر سال اس کے ایڈیٹر تبدیل ہوتے ہیں، اساتذہ اور طلبہ موجودہ اور طلبہ قدیم کے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں، کسی زمانہ میں اس کے مضامین بلند پایہ ہوتے ہیں

				اور کبھی ان کا معیار کمزور ہو جاتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے آرگن ہونے سے اس رسالہ نے اچھی ترقی کی، بعض خاص نمبر قابل قدر شائع ہوئے ہیں جو دنیائے اُردو میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔
۲۷۔	تجلّی	سیّد سردار علی	۱۹۲۶ء	یہ رسالہ اپنے قابل اور کہنہ مشق مضمون نگار کے باعث بڑی آب و تاب سے شائع ہوا۔ اس کے ٹھوس علمی اور ادبی مضامین قابلِ قدر ہوتے تھے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۲۸۔	آئینِ دکن	فدا حسین	۱۹۲۶ء	ایک قانونی رسالہ تھا جو اڈیٹر صاحب کے انتقال پر بند ہو گیا۔
۲۹۔	ورزشِ جسمانی	محمد صالح	۱۹۲۹ء	یہ ایک سہ ماہی رسالہ تھا جو ورزشِ جسمانی کے متعلق شائع ہوتا تھا۔
۳۰۔	تاریخ	حکیم شمس اللہ قادری	۱۹۲۹ء	حکیم صاحب دکن کے مشہور مورّخ ہیں ان کی ادارت میں یہ سہ ماہی رسالہ شائع ہوتا تھا، کچھ عرصہ کے بعد ادارت آپ کے فرزند سیّد احمد اللہ قادری انجام دینے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا۔
۳۱۔	مجلہ کتبہ	عبدالقادر سروری	۱۹۲۹ء	مکتبۂ ابراہیمیہ کی جانب سے یہ رسالہ شائع ہونے لگا تھا، طلبہ جامعۂ عثمانیہ اور ملک کے دیگر اصحابِ قلم کا تعاون حاصل تھا، کئی سال تک جاری رہا۔ اس میں بھی معیاری اور ٹھوس مضمون شائع ہوئے ہیں۔

نمبر	رسالہ	مدیر	سنہ	کیفیت
۳۲-	سائنس		۱۹۲۹ء	انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع ہونے لگا۔ اڈیٹر تبدیل ہوتے رہے۔ جب انجمن کا مستقر اورنگ آباد سے دہلی کو منتقل ہوگیا تو رسالہ وہاں سے شائع ہونے لگا تھا۔
۳۳-	حیدرآباد ٹیچر		۱۹۲۹ء	اربابِ تعلیم کی جانب سے شائع ہونے لگا تھا۔
۳۴-	ارشاد	یوسف الدین	۱۹۲۹ء	ایک مذہبی اور علمی رسالہ تھا۔ عرصہ تک جاری رہا۔
۳۵-	نورس		۱۹۲۹ء	طلبہ اورنگ آباد کالج کی جانب سے شائع ہونے لگا۔
۳۶-	کشافہ		۱۹۲۹ء	اسکاوٹ کی جانب سے شائع ہونے لگا تھا، ڈاکٹر حمیداللہ نے بھی اس کی ادارت کی ہے۔
۳۷-	ہمجولی	بیگم ابوبکر خاں خوشگی	۱۹۲۹ء	خواتین کے لیے یہ رسالہ جاری ہوا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس رسالہ نے بڑی شہرت حاصل کی، حیدرآباد کے چوٹی کے رسالوں میں اس کو شمار کرنا چاہیئے جس نے اُردو ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔
۳۸-	سفینۂ نسواں	صادقہ قریشی	۱۹۲۹ء	یہ رسالہ بھی خواتین کے لیے جاری ہوا تھا۔ کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔
۳۹-	خلیق	امام بیگ رونق	۱۹۲۹ء	ایک نیم مذہبی رسالہ تھا جو عرصہ تک جاری رہا۔
۴۰-	ترجمان القرآن	ابوالاعلیٰ مودودی	۱۹۳۰ء	کئی سال تک نہایت عمدگی اور بلند معیاری

			کے ساتھ ساتھ شائع ہوتا رہا۔مودودی صاحب کے منتقل ہوجانے سے وہ بند ہوگیا۔
۴۱۔ حُسن کار	محمد اکبر وفا قانی	۱۹۳۲ء	پندرہ روزہ رسالہ تھا "آرٹ" کی بڑی اچھی خدمت کی، کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔
۴۲۔ شہاب	عبدالرزاق بسمل	۱۹۳۳ء	یہ رسالہ اب تک شائع ہورہا تھا خواتین کے مضامین بھی خصوصیت سے اس میں شائع ہوتے تھے۔اوسط معیار کا رسالہ تھا۔اب بند ہوگیا ہے۔
۴۳۔ المؤسیٰ	طلبہ سٹی کالج	۱۹۳۳ء	مجلہ عثمانیہ کی طرح یہ طلبہ سٹی کالج کا آرگن ہے۔
۴۴۔ ورنگل کالج میگزین	طلبہ ورنگل کالج	۱۹۳۵ء	طلبہ ورنگل کالج نے اس کو جاری کیا ہے۔
۴۵۔ آئینۂ ادب	مونس احمد	۱۹۳۶ء	نواب فصاحت جنگ جلیل کے فرزند نے اس کو جاری کیا تھا۔کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگیا۔
۴۶۔ مجلہ طیلسانین	طلبہ قدیم جامعہ عثمانیہ	۱۹۳۷ء	یہ ایک بلند پایہ سہ ماہی رسالہ تھا جو لبعض قابل فرزند جامعہ کی وجہ سے شائع ہونے لگا تھا۔اس کے بلند پایہ معیاری تحقیقاتی مضامین دنیائے اُردو میں بڑی اہمیت سے دیکھے جاتے تھے، جن اصحاب کو ان سے دلچسپی تھی ان کے انجمن سے علیٰحدہ ہوجانے پر رسالہ بند ہوگیا۔
۴۷۔ سب رس	ڈاکٹر محی الدین زور	۱۹۳۸ء	ادارہ ادبیات اُردو کا ایک ماہوار رسالہ اب تک شائع ہورہا ہے، کچھ عرصہ تک

				اس کے مضامین اعلیٰ معیار کے ہوتے تھے، اس کے بعد اس میں پستی آگئی تھی اب پھر رسالہ بتدریج بلند معیار کی طرف لوٹ رہا ہے۔
۴۸۔	سب رس اطفال	سعدالدین	۱۹۳۸ء	بچوں کے لیے یہ رسالہ شائع ہونے لگا ڈاکٹر زور صاحب اس کی بھی نگرانی کرتے ہیں
۴۹۔	ہندوستانی ادب	غلام محمّد خاں	۱۹۳۹ء	اوسط درجہ کا یہ رسالہ ہے جو اس وقت بھی شائع ہو رہا ہے۔
۵۰۔	روح ترقی	حافظ محمّد مظہر	۱۹ء	مولوی مظہر صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ شائع ہونے لگا اور اپنی مختصر حیات میں بلند پایہ معیاری مضامین شائع کرتا رہا۔

ان کے علاوہ دوسرے اخبار

شمار	نام اخبار	سنہ اشاعت	نوعیت	نام ایڈیٹر
۵۱	مستقبل	۱۹۴۵ء	ہفتہ وار	عظیم الدین محبّت
۵۲	محبِ وطن	۱۹۴۶ء	روزانہ	لچھما ایڈمی
۵۳	تنظیم	۱۹۴۶ء	"	علی اشرف
۵۴	ترجمان	۱۹۴۶ء	ہفتہ وار	"
۵۵	تاج	۱۹۴۶ء	"	سیّد حسن
۵۶	ارباب	۱۹۴۶ء	"	محمّد عثمان اور حسینی شاہد
۵۷	مُبصّر	۱۹۴۶ء	"	محمّد صفدر
۵۸	یاد	۱۹۴۶ء	"	کرنل خواجہ معین الدین
۵۹	مملکت	۱۹۴۶ء	"	حسن الدین
۶۰	مُعین	۱۹۴۶ء	"	سیّد جعفر اللہ
۶۱	صحتِ عامہ	۱۹۴۶ء	پندرہ روزہ	حکیم لئیق احمد

۶۲	تاجر	۱۹۴۷ء	ہفتہ وار	عبدالقدوس ہاشمی
۶۳	البلاغ	"	"	نصیر افسر
۶۴	کلیاں	"	"	نصیر افسر
۶۵	رہنما	"	"	بی، ایس راؤ
۶۶	حریت	"	"	بیگم عبدالحفیظ
۶۷	نقش و نگار	"	"	سید حامد محی الدین
۶۸	اقتدار	"	"	علی اشرف
۶۹	پیام امن	"	"	جانکی پرشاد
۷۰	سید الاخبار	"	"	صمصام شیرازی
۷۱	اقبال	"	"	سرمست خاں
۷۲	عظیم تر حیدرآباد	"	"	عزیز احمد
۷۳	آہنگ	"	"	محمد دولت خاں
۷۴	امان	"	"	دیو شاستری
۷۵	آزادی	"	"	مختار احمد
۷۶	آزاد حیدرآباد	"	"	ٹھاکر امراؤ سنگھ
۷۷	انتخاب	"	"	شیخ ابوالقاسم
۷۸	انصاف	"	"	سید احمد اللہ قادری
۷۹	اتحاد	"	"	سلطان بن عمر
۸۰	انقلاب	"	"	مرتضیٰ مجتہدی
۸۱	جناح	"	"	سید اظہر حسین
۸۲	جمہور	"	"	سید ابراہیم وحید
۸۳	خضر	"	"	محمد فاضل
۸۴	مدرس	"	"	احمد اللہ
۸۵	مجلس	"	"	سید نور الحق
۸۶	نلگندہ نیوز	"	"	؟

۸۷	سروس	۱۹۴۷ء	ہفتہ وار	محمد عبدالقادر
۸۸	تعمیر دکن	〃	〃	فیاض الدین
۸۹	عطارد	〃	〃	خواجہ معین الدین
۹۰	وقت	〃	روزانہ	عبدالرحمٰن رئیس
۹۱	پیسہ اخبار	〃	〃	سید احمد اللہ قادری
۹۲	امروز	〃	〃	شعیب اللہ خاں
۹۳	خورشید	〃	〃	؟
۹۴	وفادار	〃	ہفتہ وار	یعقوب علی
۹۵	دکن گزٹ	〃	〃	؟
۹۶	الہدیٰ	〃	〃	صفت الرحمٰن
۹۷	اسٹیٹ نیوز	〃	ہفتے میں دوبار	محمد اختر حسین
۹۸	عوام	〃	روزانہ	اختر حسن
۹۹	جنتا	〃	ہفتہ وار	حسینی شاہد

اس فہرست سے اخبارات، رسائل کی تعداد اور ان کے ایڈیٹروں کا نام معلوم ہوسکتا ہے اس موقع پر چند اڈیٹروں کا تعارف بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے مختصر صراحت کی جاتی ہے:۔

اکبر علی

مولوی اکبر علی صاحب سنہ ۱۳۰۶ھ میں اورنگ آباد میں تولد ہوئے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ مڈل کامیاب ہوکر مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہوئے اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل میں کامیابی حاصل کی، اولاً صدر محاسبی میں ملازم ہوئے مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کو ترک کردیا۔

اکبر علی صاحب کو زمانۂ تعلیم سے قومی اور علمی کاموں سے دلچسپی رہی، وہ مدرسہ دارالعلوم کی انجمن ثمرۃ الادب کے قیام کے بانیوں میں سے ہیں، وصول چندہ کا کام آپ کے متعلق تھا، تعلیم کے بعد ملا عبدالقیوم کے ساتھ ساتھ رہنے کا موقع ملا، ملا صاحب کے علم و فضل اور قومی خدمات کا آپ پر اثر ہوا۔ رسالہ صحیفہ کی اجرائی اسی صحبت کا اثر تھا۔ جنگ بلقان اور

طرابلس کے زمانہ میں انجمنِ ہلال احمر کے کاموں میں آپ کو بہت زیادہ انہماک رہا اور انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم اور حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے کاموں میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب کو مدد دیتے رہے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں حیدرآباد میں باہر کے روزانہ اخباروں کی بڑی مانگ ہونے لگی اور لوگوں کی دلچسپی اخبار بینی کی طرف زیادہ ہوگئی اور حیدرآباد میں بجز مشیر دکن کے اور کوئی روزانہ اخبار نہیں تھا۔ مولوی اکبر علی نے اس موقع پر اپنے ماہوار رسالہ صحیفہ کو روزانہ اخبار کی صورت میں بدل دیا اور انہماک کے ساتھ اس کو چلانے لگے، چنانچہ اپنے انتقال تک وہ اخبار صحیفہ شائع کرتے رہے، مولوی اکبر علی ایک خاص پالیسی کے تحت کام کرتے تھے، جو بڑی حد تک مذہبی بلکہ تاریک خیالی سمجھی جانے لگی تھی، مگر اس میں شک نہیں کہ برسوں آپ کے اخبار صحیفہ نے ملک اور قوم کی خدمت کی ہے اور ملک کے بیدار کرنے میں حصہ لیا ہے۔

مولوی اکبر علی نے ایک عربی ناول کا ترجمہ "معجزۂ محبت" کے نام سے شائع کیا ہے اور آصف جاہ سابع کے سفرنامۂ دہلی کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اخبار صحیفہ میں آپ کے خصوصی مضمون اکثر قابلِ قدر ہوتے تھے۔ ۱۳۶۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

سیّد احمد محی الدّین صاحب

آپ مولوی سیّد ضیاء الدین صاحب کے فرزند ہیں، ضیاء الدین صاحب کے والد مدراس سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے، احمد محی الدین صاحب کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں بمقام ضلع کریم نگر میں ہوئی۔ مدرسہ آصفیہ میں ابتدائی تعلیم ہوئی، مڈل کی کامیابی پر علی گڑھ روانہ کیے گئے اور وہاں سے میٹرک اور ایف۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد نظام کالج حیدرآباد میں شریک ہوئے اور بی۔ اے تک تعلیم پائی، کچھ عرصہ تک مہتمم آبکاری کی خدمت کے امیدوار رہ کر کام کرتے رہے مگر پھر ملازمت کے خیال کو بالکل ترک کر دیا، اور صحافت کی لائن میں آ گئے۔ "رہبرِ دکن" کے نام سے روزانہ اخبار شائع کرنے لگے جس نے بڑی ترقی کرلی نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ساتھ آپ شریک کار رہے۔ انجمن اتحاد المسلمین سے آپ کو مرنے تک تعلق رہا۔ نہایت جوش اور مستعدی سے انجمن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے رہے۔

"رہبر دکن" حیدرآباد کا ہی نہیں بلکہ جنوبی ہند کے تمام اُردو اخباروں میں کثیرالاشاعت تھا، آٹھ دس ہزار کی تعداد میں روز شائع ہوتا تھا۔ کئی سال تک رہبرِ دکن کا سالنامہ نہایت اہتمام سے آپ شائع کرتے تھے، جو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے انگریزی سالناموں کے مماثل ہوتا تھا۔ مولوی احمد محی الدین صاحب کے ایڈیٹوریل مضمون اکثر بڑے قابلِ قدر ہوتے تھے۔ جمہور کی رائے کا آپ کو بڑا خیال رہتا تھا۔ مفادِ عامہ کے لیے آپ کا قلم بڑی جولانی ظاہر کرتا تھا، آپ کا اخبار نواب بہادر خاں اور اتحاد المسلمین کا آرگن تھا۔ اصلاحاتِ ملک اور حیدرآباد کی ترقی میں اخبار رہبر دکن کا بڑا حصّہ ہے اور اس کے لیے مولوی احمد محی الدین صاحب کی خدماتِ ملک و ملت ہر آئینہ لائقِ ستائش قرار پاتی ہیں۔ ۱۳۶۵ھ میں احمد محی الدین صاحب کا جبکہ ان کی ملک کو بیحد ضرورت تھی، انتقال ہوگیا۔

قاضی عبدالغفار

قاضی صاحب کا وطن یو۔پی تھا۔ یونیورسٹی سے ڈگری لے کر عملی دنیا میں مصروفِ عمل ہوئے، مولانا محمّد علی، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ساتھ رہا، مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے اخبار کے اسٹاف میں شامل رہے، اڈیٹری کے فرائض انجام دیتے رہے، وفدِ خلافت کے ساتھ لندن گئے اور وفد کے کاموں کے ساتھ ساتھ 'فنِ اخبار' کے متعلق معلومات کا ذخیرہ لائے۔

کچھ عرصہ کے بعد حیدرآباد آئے، یہاں آپ کا کسی عہدہ پر مامور ہوجانا ممکن تھا مگر قاضی صاحب نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور آزاد رہ کر ملک و وطن کی خدمت کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۳۴۴ف (۱۹۲۵ء) سے روزانہ اخبار "پیام" شائع کرنے لگے۔ اخبار پیام نے یہاں کی صحافتی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کردیا حق اور صداقت کا پرچار کرنا۔ کانگریس کی پالیسی پر عمل کرنا، اس کا مقصد تھا صحیح راہ نمائی اور آزادیِ رائے اس کے نصب العین تھے۔ پیام کی اس پالیسی۔ کے باعث یہاں کے کئی اخبار اس کے مخالف ہوگئے اور مخالفت میں جدوجہد شروع کردی، مگر "پیام" کی پالیسی میں کوئی فرق نہیں آیا، قاضی صاحب کے قدمِ استقامت کو لغزش نہیں ہوئی، ایک بہت بڑی جماعت پیام کو محبوب رکھتی اور اس کی آواز پر لبیک کہتی رہی۔

سر مرزا اسمٰعیل کی صدارتِ عظمیٰ کے دَور میں ان کے اصرار پر قاضی صاحب نے دفتر

معلومات عامہ کی نظامت قبول کی مگر سر مرزا کے سبکدوش ہونے پر آپ بھی کنارہ کشی اختیار کر کے لکھنؤ چلے گئے۔

تقسیم ہند کے بعد انجمن ترقی اُردو کی باگ آپ نے سنبھالی ہے اور ہندوستان میں اُردو کے بقا اور ترقی کے لیے سرگرم عمل رہے۔ قاضی صاحب ایک ترقی پسند ادیب ہیں، آپ کے ادبی کارنامے ہر آئینہ قابلِ قدر اور لائق داد ہیں، شائقینِ ادب اُردو کا شائد ہی کوئی فرد ہوگا جو آپ کی تصانیف سے بے خبر ہو۔ "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" آپ کی وہ مشہور کتابیں ہیں جو اُردو کے ادبی ذخیرہ میں انمول نگینے شمار ہوتے ہیں۔

بہر حال حیدر آباد کی صحافت میں قاضی صاحب کے کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

نرسنگ راؤ

مسٹر نرسنگ راؤ ضلع محبوب نگر کے وطن دار ہیں، قطب شاہی دور اس کے بعد عالمگیری زمانہ میں آپ کے خاندان کے افراد اس خدمت کو انجام دیتے رہے، چنانچہ عالمگیری اسناد بھی آپ کے خاندان میں موجود ہیں، آصفی عہد میں بھی بدستور وطن داری کے فرائض انجام دیتے رہے۔

نرسنگ راؤ صاحب ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ دار العلوم میں شریک ہوئے اور فارسی کے امتحانات منشی اور دبیر میں کامیابی حاصل کی۔ راقم الحروف کے ساتھ انجمن ثمرۃ الادب کے کاموں میں حصہ لیا۔ اور بڑی دلچسپی سے علمی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے لیے جو انگریزی تعلیمی جماعتیں قائم ہوئیں ان سے بھی استفادہ کیا مگر اس کے بعد وکالت کا امتحان دے کر وکالت شروع کی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کو اپنی طبیعت کے موافق نہ پاکر صحافت کی لائن میں آگئے۔ چنانچہ اوّلاً اخبار "رعیت" ہفتہ وار شائع کرنے لگے رعیت کے مضامین تعلیم یافتہ طبقہ میں پسند کیے جاتے تھے مگر حکومت کی پالیسی کے خلاف تھے۔ اس لیے چند سال کے بعد اخبار بند ہوگیا۔ اس کے بعد پھر روزانہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ ملک کو بیدار کرنے اور اضلاع، دیہات کی رعایا میں تعلیمی شوق کو زیادہ کرنے میں "رعیت" نے بڑا حصہ لیا ہے۔

پولیس ایکشن کے بعد کچھ عرصہ تک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں "رعیت" شائع ہورہا

ہے۔ مسٹر نرسنگ راؤ نے وطن اور اہلِ وطن کی جو خدمت اپنے اخبار کے ذریعہ کی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ آندھرا پردیش کی وزارت میں پانچ سال تک منسٹر کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اختر حسین صاحب

آپ کے اجداد دہلی سے آکر حیدرآباد میں بس گئے تھے اختر حسین صاحب کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ورنگل کالج میں لکچرار کی حیثیت سے مامور ہوئے قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد سے اخبار پیام شائع کرتے تھے۔ قاضی صاحب جب سر مرزا اسمٰعیل کے زمانہ میں ناظم دفتر اطلاعات پر مامور کئے گئے تو اخبار پیام اختر حسین صاحب نے خرید لیا اور ملازمت ترک کر کے پیام کی ادارت کرنے لگے۔

ایک زمانہ تک اخبار پیام کانگریس کا آرگن رہا، مگر اس کے بعد اس نے اپنی پالیسی بدل لی۔ اشتراکیت کی تبلیغ اس اخبار کی پالیسی رہی، ترقی پسند جماعت سے اس کا تعلق تھا، اور اختر حسین صاحب ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں۔ عرصہ تک اسی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے سکریٹری رہے، آپ کے سکریٹری شپ کے زمانہ میں ہر ہفتہ انجمن کے جلسے ہوتے تھے۔ مضامین اور نظمیں سنائی جاتی اور ان پر ردّ و قدح اور تنقید بھی ہوتی تھی۔ اس بحث و مباحثہ میں اختر حسین صاحب کا بڑا حصّہ ہوتا۔ اختر حسین صاحب معہ خاندان ترقی پسند ہیں۔ چنانچہ ان کی دو بہنیں رضیہ بیگم ایم۔ اے، رابعہ بیگم ایم۔ اے اور آپ کی شریکِ زندگی ریاست خانم صاحبہ بی۔ اے بھی اچھی ادیب اور ترقی پسند مصنفین میں شامل ہیں۔

سیّد احمد اللہ قادری

آپ حکیم سیّد شمس اللہ قادری صاحب کے بڑے فرزند ہیں جن کا تذکرہ گزشتہ دور میں ہو چکا ہے۔ سیّد احمد اللہ قادری کی پیدائش ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔ ابتداء میں جامعۂ عثمانیہ کے پریس میں ملازم ہوئے پھر ترک ملازمت کر کے اخبار شائع کرنے لگے۔ اخبار "سلطنت" ایک روزانہ اخبار آپ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

سیّد احمد اللہ صاحب قادری مصنّف بھی ہیں، کئی کتابیں شائع فرمائی ہیں۔ چنانچہ "چاند

سلطانہ" آپ کی قابلِ قدر کتاب ہے، فن تاریخ سے آپ کو زیادہ دلچسپی ہے۔ سیّد احمد اللہ قادری کی نثر کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

"علی عادل شاہ کے عہدِ حکومت میں چاند بی بی نے اپنی زندگی کا جو زمانہ بیجاپور میں بسر کیا۔ اس کے واقعات تاریخوں میں نہیں ملتے، البتہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی تخت نشینی کے بعد سے چاند بی بی سلطنت بیجاپور کے استحکام و انتظام میں منہمک نظر آتی ہے، اس زمانہ سے اس کا نام بیجاپور کی تاریخوں میں نمایاں ہوا ہے چنانچہ جب سلطان ابراہیم عادل شاہ تخت نشین ہوا اس وقت اس کی عمر نو سال کی تھی۔ سلطان اس عمر سے سنِ تمیز کو پہنچنے تک چاند بی بی کے ذریعہ پرورش پاتا رہا۔"

انجمنیں

گذشتہ دور میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ کئی علمی انجمنیں بھی اُردو کی خدمت بجالائی ہیں اور ان انجمنوں کی وجہ سے اُردو زبان اور ادب کو ترقی ہوئی ہے، اس دور میں بھی کئی انجمنیں اسی قسم کی قائم ہوئیں، جن کا تذکرہ کیا جاتا ہے :۔

۱۔ انجمن ترقی اُردو

انجمن ترقی اُردو اسی دور کے ابتدا میں بدستور قائم رہی اور اس کا مستقر اورنگ آباد رہا۔ انجمن کی جانب سے کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ سہ ماہی رسالہ اُردو اور علمِ سائنس کا رسالہ شائع ہوا۔ اصطلاحات کا کام اور ترتیبِ لغت کا کام جاری رہا۔ مگر پھر اسی دور میں انجمن ترقی اُردو کا مستقر دہلی قرار دیا گیا اور حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم رہی۔ پولیس ایکشن کے بعد انجمن ترقی اُردو کا مستقر علی گڈھ قرار دیا گیا۔ قاضی عبدالغفار صاحب معتمد اور ذاکر حسین صاحب صدر انجمن ہیں۔ حیدرآباد میں جو شاخ قائم ہے اس کے معتمد حبیب الرحمن صاحب ہیں۔ مزید صراحت آگے آتی ہے۔

۲۔ ادارہ ادبیاتِ اُردو

اس دور کی ایک اہم اور قابلِ قدر انجمن ادارہ ادبیات اُردو ہے، جس کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور ان کے بعض ہم خیال احباب یعنی سید عبدالقادر سروری، عبدالمجید صدیقی اور راقم الحروف نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا ادارہ کے مختلف شعبے قرار دیئے گئے۔ اضلاع اور دیہات میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ دارالمطالعہ کھولے گئے، ادارہ کی جانب سے ایک سو سے زیادہ کتابیں شائع کی گئیں جو تاریخ، سوانح، ادب، سائنس وغیرہ علوم پر مشتمل ہیں۔ اُردو کی ترقی کے لیے اُردو دانی، اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سالانہ امتحانات ہوئے اور کامیاب شدہ اصحاب کو اسناد اور تمغے دیئے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے علاوہ اضلاع میں امتحانات کے سنٹر مقرر ہوئے تھے۔ بلامبالغہ ہزاروں اصحاب جن میں ہر قوم اور ملت کے ذکور اور اناث اور بچے شامل تھے، امتحانات میں شریک

اور کامیاب ہوئے۔ انجمن کی جانب سے ایک ماہوار رسالہ "سب رس" اور دوسرا اسی نام سے بچّوں کے لیے شائع کرنے کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ یہ دونوں رسالے بدستور شائع ہو رہے ہیں۔

ادارہ ادبیات نے مخطوطات اور مطبوعات کو جمع کرنے کے لیے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا اور ہر قیمت پر کتابیں خرید کر کے محفوظ کی جانے لگیں چنانچہ اب تک اُردو، فارسی اور عربی کی ہزاروں کتابیں ادارہ کے کتب خانہ میں جمع ہوگئی ہیں اور ان کی ایک مفصّل فہرست مغربی طرز پر شائع ہوگئی ہے اور دوسری جلد زیرِ اشاعت ہے۔

ادارہ ادبیات اُردو میں نہ صرف کتابوں کے جمع کرنے کا سلسلہ جاری ہے بلکہ نایاب تاریخی اشیاء اور اُردو کے مصنّفین کے خطوط، قدیم اخبارات اور رسائل بھی جمع اور محفوظ کئے گئے ہیں، اس قسم کا بھی خاصا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ مرحوم شعراء اور نثر نگاروں کی قبروں کا تحفظ اور ان پر کتبات نصب کر کے بھی اُردو کی یاد کو تازہ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ادارہ کے کئی سالانہ جلسے نہایت شاندار اور اعلیٰ پیمانہ پر کئے گئے اور ان جلسوں کی صدارت خاندانِ شاہی کے افراد اور ذی مرتبہ روساء نے فرمائی۔ ادارہ نے اپنی مالی استواری کی بنیاد حکومت کی امداد یا عام چندوں کے انتظار اور بھروسے پر نہیں رکھی بلکہ بڑی حد تک اس کو خود مکتفی بنانے کی کوشش کی گئی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی، ادارہ کی کتابیں خاصی فروخت ہوئیں۔ ادارہ ادبیات اُردو دو طریقوں سے اُردو کی خدمت انجام دیتا رہا۔ ادبی اور تحقیقی اس نے تعلیم اور تحقیق کا جو کام انجام دیا ہے۔ وہ فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادارہ کی جانب سے سالانہ رودادیں شائع ہوتی ہیں جس سے اس کے کام کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے، یہ ادارہ اب بھی موجود ہے۔ ایوان اُردو کے نام سے ایک شاندار اور خوبصورت عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔

۳۔ حیدر آباد اکیڈمی

ڈاکٹر میر ولی الدین اور پروفیسر عبدالرحمٰن خاں صاحب نے اس ادارہ کی بنیاد ڈالی، اصحاب علم و فن کی ایک جماعت اس ادارہ کی رکن ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے سالانہ علمی مقالات شائع ہوتے ہیں اور لکچر بھی ہوتے رہے۔ اکیڈمی کے لکچر اور مقالات دونوں تحقیقی ہوتے تھے، ان کا باہر کی علمی دنیا نے بڑا خیر مقدم کیا۔

۴۔ اُردو مجلس

مولوی مرزا فرحت اللہ صاحب مرحوم نے اُردو مجلس کے نام سے ایک ادارہ اُردو کی خدمت کے لیے قائم فرمایا۔ اس مجلس کی طرف سے ماہوار کسی علم دوست شخص کے اہتمام میں جلسہ ہوتا اور ایک علمی مقالہ سُنایا جاتا۔ مقالہ کے بعد شعراء اپنا تازہ کلام سُنایا کرتے۔ مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرنے کے بعد مولوی غلام یزدانی صاحب اس مجلس کے معتمد قرار پائے ہیں اور سجّاد مرزا صاحب بھی اس کے روح رواں ہیں۔ خاموشی کے ساتھ اُردو کی خدمت میں یہ مجلس مصروف ہے۔

۵۔ انجمن ارباب اُردو

نواب محب اللہ خاں صاحب صاحبزادہ نے علمی انجمن اپنے مسکن سرونگر میں قائم کی تھی۔ بعض علم دوست اور ذی علم اصحاب نواب صاحب کے شریکِ کار تھے۔ ابو محمد عمر یافعی صاحب اس کے روح رواں تھے۔ "تحفہ" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع ہونے لگا اور اپنی ایک سالہ عمر میں اس رسالہ نے خاصا ادب فراہم کردیا۔

۶۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین

ترقی پسند مصنّفین کی انجمن بھی اسی دَور کی یادگار ہے۔ اولاً عابد علی خاں صاحب اس کے سکریٹری تھے، پھر اختر حسین صاحب اس خدمت کو انجام دینے لگے۔ انجمن کی جانب سے ہفتہ وار علمی جلسوں کا انتظام کیا گیا تھا جس میں مضمون اور نظمیں سُنائی جاتیں اور ان پر تنقید ہوا کرتی تھی۔ انجمن کے کئی عام جلسے ہوئے جس میں ہندوستان کے ترقی پسند مصنّفین اور شعراء جمع ہوئے اور اپنی تقریروں اور تحریکات سے انجمن کی زندگی کا ثبوت دیا۔

۷۔ بزم اقبال

علّامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یادگار میں ایک علمی انجمن بزم اقبال کے نام سے قائم ہوئی اور اس نے اقبال کے کلام کی نشر و اشاعت کا کام کیا۔ کئی کتابیں اور مقالے اس بزم کی جانب سے شائع ہوئے۔ اسی طرح اُردو زبان کی خدمت بھی اسی بزم کی جانب سے ہوتی رہی۔ سالانہ یومِ اقبال منایا جانے لگا۔ جس میں کلام اقبال کی خصوصیات بیان کرنے اور پیامِ اقبال کو پہنچانے کا فریضہ انجام دیا جاتا رہا۔ بزم اقبال نے بڑی ترقی کرلی تھی۔

۸۔ انجمن طیلسانین عثمانیہ

یہ انجمن عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم طلبہ کی انجمن تھی، اس کے روح رواں میر اکبر علی خاں صاحب

پھر مرزا ڈاکٹر محمد غوث صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی تھے، ان کے علاوہ کئی اور ممتاز عثمانین اس سے دلچسپی لیتے رہے۔ایک کتب خانہ فراہم کیا گیا تھا اور سہ ماہی رسالہ مجلہ طیلسانین کے نام سے شائع ہوتا تھا، مجلہ نے اپنی چند سالہ زندگی میں اُردو زبان کی بڑی خدمت انجام دی، کئی مقالے جو تحقیقی اور ادبی لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، شائع کیے ایم۔اے کے طلبہ کے مقالات شائع کرنے کا بھی اس مجلہ نے بیڑا اُٹھایا اور چند مقالے شائع کیے۔

انجمن طیلسانین عثمانیہ کی دوسری شاخیں جو نمائش مصنوعات ملکی وغیرہ سے متعلق رہیں، ان کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے، کیونکہ اُردو کی ترقی کے ضمن میں ان کو متعارف نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ انجمن طلبہ قدیم دار العلوم

یہ انجمن اگرچہ گوشہ گمنامی میں رہی مگر اس نے مدرسہ دار العلوم کا نو سالہ جشن مناکر اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔ جشن کے موقع پر تذکرہ دار العلوم کے نام سے ایک مقالہ شائع کیا اور ثقافت اسلامی کی نمائش کی۔

۱۰۔ پریم چند سوسائٹی

ترقی پسند مصنفین نے پریم چند سوسائٹی کے نام سے ایک بزم قائم کی ہے، پریم چند کے افسانوں نے جو مقبولیت حاصل کر لی، وہ دنیائے اُردو سے مخفی نہیں ہے، اکثر اس سوسائٹی کے جلسے ہوتے ہیں اور افسانے وغیرہ سنائے جاتے ہیں، اس سوسائٹی کے سالانہ جلسے بھی کامیابی سے ہوتے ہیں۔

۱۱۔ کالجوں میں نئی بزمیں

حیدرآباد اور اضلاع کے کالجوں میں مختلف بزمیں قائم ہیں، جن میں طلبہ اور طالبات حصّہ لیتے ہیں، اس قسم کی بزموں سے بھی اُردو زبان اور ادب کی ترقی ہوتی ہے۔ان بزموں سے بین الکالج تقریر اور مباحثوں کے مقابلے بھی ہوتے اور انعامات دیئے جاتے ہیں۔" بزمِ اُردو " کے علاوہ دوسری بزموں مثلاً بزمِ تاریخ، بزمِ فلسفہ، بزم معاشیات وغیرہ میں بھی اُردو میں بھی تقریریں ہوتی ہیں، ان سے نہ صرف طلبہ میں اُردو کا صحیح مذاق پیدا ہوتا ہے بلکہ اُردو کی ترقی میں بھی مدد ملتی ہے۔

۱۲ - ادارۂ اشاعت علوم و فنون

چند ارباب علم نے جن میں ہندو اصحاب کی تعداد زیادہ ہے۔ اشاعتِ علوم و فنون کے نام سے ایک ادارہ قائم فرمایا ہے۔ ادارہ کی جانب سے چھوٹی بڑی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی تعداد تقریباً دو درجن ہے، برج لال صاحب اس ادارہ کے معتمد ہیں، ایک ماہوار رسالہ رہبرِ تعلیم کی اشاعت بھی ادارہ کی جانب سے ہوئی تھی۔ اس ادارہ نے اُردو کی خدمت گذاری کا ایک اچھا حق ادا کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ دکن کے ہندو اصحاب بھی اُردو سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

۱۳ - ادارۂ عالمگیر تحریک قرآن مجید

اگرچہ اس ادارہ کا مقصد دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن مجید کی اشاعت ہے مگر اس سلسلہ میں ادارہ کی جانب سے اُردو میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح اُردو میں قرآن شریف کے متعلق بہت کچھ ذخیرہ فراہم ہوگیا۔

دکن میں اُردو کے ساتویں دور کا اختتام

ساتویں دَور کا آغاز جامعۂ عثمانیہ کے قیام ۱۹۱۸ء سے ہوا تھا اور اس کا اختتام پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۵۵ء میں ہوجاتا ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کا منشور ۱۹۱۸ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے لحاظ سے اس جامعہ کی تعلیمی زبان اُردو قرار دی گئی تھی۔ پولیس ایکشن کے بعد اوّلاً جامعہ کی زبان بتدریج تبدیل ہونے لگی اور بالآخر جب علی یاور جنگ کے بعد نئے وائس چانسلر صاحب آئے تو انہوں نے منشور کے خلاف یونیورسٹی کی تعلیم زبان انگریزی میں کردی اور حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

حکومتِ آصفیہ کی سرکاری زبان اُردو تھی۔ اب حکومتِ حیدرآباد نے اس کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا، یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ دوسرے مدارس میں بھی اُردو پر زوال آگیا اور مدرسوں میں نہ صرف کمی آگئی بلکہ جہاں اُردو کی تعلیم ہوتی تھی اس میں اُردو کی حالت بد سے بدتر ہوگئی، بڑے بڑے پریس جو اُردو کتابیں شائع کرتے تھے، بند ہوگئے اور کتابوں کے مطالعہ اور خریداری پر بھی اوس پڑگئی، حالاتِ زمانہ کا یہ اثر ہوگیا تھا کہ اُردو کا نام لینا بھی گناہ سمجھا جاتا تھا، اُردو کی تائید اور حمایت میں زبان کھولنا بڑی جراَت اور جسارت کا کارنامہ تصور ہونے لگا۔ چونکہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد پورے ہندوستان میں اُردو کی مخالفت کا دَور دورہ رہا، اس لیے اس کا اثر حیدرآباد میں بھی رونما ہوا، حتیٰ کہ ایک وزیر صاحب نے جن کا لہو گوشت اُردو کے ذریعہ معاش کرتے بنا تھا، اعلانیہ اُردو کوئی زبان نہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اُردو اخبارات میں کمی آگئی تھی، اُردو کی انجمنوں کے دروازے بند ہوگئے تھے، بہرحال ۱۹۴۷ء کے بعد چند سال تک اُردو زبان حیدرآباد میں یتیم اور یسیر بنی رہی۔ یہ اُمید نہیں کی جاسکتی تھی کہ خدمتِ اُردو کے قدیم روایات باقی رہ سکیں گے، لیکن ہمیشہ تاریخ یہ دکھاتی آئی ہے کہ متوقعہ اور متحصلہ نتائج میں بڑا فرق ہوجاتا ہے، چنانچہ آندھرا پردیش بننے کے کچھ پیشتر سے اُردو کی فضا میں تبدیلی ہونے لگی جس کا تذکرہ صفحاتِ آیندہ میں بہ ضمن "آندھرا میں اُردو" آئے گا۔

یہاں ہم گذشتہ (۴۷) سالہ دَور کی اُردو شاعری، نثر نگاری وغیرہ پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر اس دَور کو ختم کرتے ہیں۔ یہ زمانہ اُردو زبان اور ادب کے ارتقاء کے لیے عام طور سے برطانوی ہند میں بھی سازگار ثابت ہوا۔ پہلی جنگِ عظیم ختم ہوتے ہی نئے خیالات، نئے رجحانات پیدا ہو گئے۔ انگریزی شاعری اور انگریز مفکرین کے ساتھ ساتھ فرنچ، امریکن اور روسی شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تصانیف سے استفادہ کیا جانے لگا۔ اس طرح ترقی پسند شعراء، افسانہ نگار اور نقاد رونما ہوئے، ان کے افکار اور خیالات سے اُردو دنیا میں ایک انقلابِ عظیم آ گیا۔ ادب برائے زندگی کی تحریک زور شور سے چلنے لگی۔

برطانوی ہند کے ساتھ ساتھ قلمرو آصفی میں بھی اس کا اثر بڑی سرعت سے ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے سپوت مادر جامعہ سے فارغ التحصیل ہو کر میدانِ عمل میں آ گئے۔ دارالترجمہ سے بیسیوں کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں۔ اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور سینما کے ذریعے خیالات کی نشر و اشاعت ہونے لگی۔ یہ تمام وجوہ تھے جن کے باعث جہاں برطانوی ہند میں اُردو کو ترقی ہوئی۔ وہاں قلمرو آصفی میں بھی عروج حاصل ہوا۔ اس نے اپنی ترقی کے کئی مدارج طے کر لیے۔ اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی ذہنی تربیت اور ادبی شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں بعض اساتذہ جامعہ نے خاص حصّہ لیا۔ ان میں مولانا سیّد علی حیدر طباطبائی، مولوی وحیدالدین سلیم، ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر سیّد سجاد پیش پیش ہیں۔ ان اصحاب کے بعد ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور ابو ظفر عبدالواحد نے بھی شعر و سخن کا اعلیٰ مذاق پیدا کرنے میں نمایاں خدمت انجام دی ہیں۔ شاعروں اور نثر نگاروں پر ہم علیحدہ علیحدہ صراحت کرتے ہیں، اُمید ہے کہ موجب دلچسپی ثابت ہوگا۔

قلمرو آصفی میں چھٹے دور سے جدید شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ حضرت کیفی، ذہین امجد، نظم طباطبائی، لمعہ اور عظمت اللہ خاں وغیرہ اس کے معمار تھے۔ انہوں نے ابواب سخن میں تنوع پیدا کیا۔ سیاسی شاعری، واقعہ نگاری، وصف نگاری، تاریخی شاعری، سماجی شاعری اور اخلاقی شاعری وغیرہ کو موضوع بنا کر خیال آرائی کی تھی۔ اس طرح موضوع شاعری کو بڑی وسعت دی تھی۔

اسی دور میں جنگِ عظیم کے بعد مغربی تہذیب و تمدن زیادہ سرعت کے ساتھ

پھیل گئی، ذہنی آزادی مل گئی، قوم ۔ گویا ۱۹۴۷ء میں آزادی کا دور دورہ ہوا، زر کی قیمت گھٹ گئی، ضروریاتِ زندگی میں اضافہ ہوگیا، کھانے پینے کی چیزیں گراں ہوگئیں، افلاس بھوک، قحط کی تکالیف عام ہوگئیں، اشتراکیت کی طرف لوگوں کی طبیعت مائل ہونے لگی قوم کی خستہ حالی اور زبوں حالی کی اصلاح کی طرف توجہ مبذول ہوئی، ادب برائے زندگی کا بول بالا ہوا، رومانی خیالات کی جولانی رہی، تاریخ کے موضوع میں وسعت ہوئی، مزاحیہ رجحان، طنزیہ زاویۂ نگاہ کو ترقی ہونے لگی، فلسفیانہ خیالات، مفکرانہ رجحانات پیدا ہوئے، آزاد نظموں کی بنیاد پڑی، دیہاتی زبان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ یہ تھے وہ نئے خیالات اور رجحانات جو برطانوی ہند کے شعراء کی ذہنیت پر اثر انداز ہوتے، اس طرح جدید شاعری یا ترقی پسند شاعری میں بھی تنوع پیدا ہوگیا۔ اقبال، جوش، اکبر، چکبست، احسان دانش، ظفر علی خاں فراق، اختر شیرانی، فیض، مجاز، ساغر، حفیظ، سلام، حسرت موہانی، جگر اور بہزاد وغیرہ کا کلام نمونہ ثابت ہوا اور ان کی پیروی ہونے لگی۔

یورپ کی دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو حالات بدلے اس سے نوجوان شعراء میں بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ ان کو حالات نے انقلابی شاعری کی طرف مائل کر دیا۔ اس دور کے آخری آٹھ دس سال میں نئی نئی تحریکیں اور انقلابی تصوّرات کی بڑی فراوانی ہوئی۔ بیرونی اثرات کے ساتھ شاعروں کے لیے ان کی خداداد طبیعتوں نے بھی حصّہ لیا، ان دونوں وجوہ سے جو اصلاح ہوئی، وہ شعر کی معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں پر مشتمل ہے۔ ادب برائے زندگی کے نظریے نے بڑی مقبولیت حاصل کر لی، اس کا عالمگیر اثر شاعری کی ہر نوع پر ہوا۔ اور اس دور کے آخری دو تین سال میں جو انقلاب ہوا اس کا اثر بھی ناگزیر تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور دکن میں جو خونی ہولی کھیلی گئی، ہزاروں بے گناہ معصوم جانیں جس بے دردی سے ہلاک کی گئیں، جو مصیبت اور تباہی ہوئی، ہزاروں شریف عصمت مآب خواتین کی عصمتیں لُٹیں اور نقصانِ عظیم برداشت کرنا پڑا اس کا اثر شعراء کے دل اور دماغوں نے قبول کیا ہے۔ اس اثر اور احساس سے متاثر ہو کر شعراء نے جو نغمہ صفحۂ قرطاس پر نقش کیا ہے، وہ افلاس، تنگ دستی، بھوک، قید و بند، امراض، مزدور، کسان، سرمایہ داری اور آخر پر ظالموں کی خونی تلوار کی خوں افشانی کی مذمّت اور مظلوموں کے آنسو بن کر ظاہر ہوئے ہیں، وہ ماتم کرتے ہوئے آیندہ کے لیے خبردار کرنے لگے ہیں، بیدار ہونے اور غفلت

سے چونکنے کے لیے آواز دے رہے ہیں، امن اور شانتی سے رہنے کی ہدایت کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ عشق و محبّت کا جادو کم نہیں ہوا بلکہ وہ سر جوڑ کر بول رہا ہے، البتہ عشق و محبّت کی فرضی داستان کے بجائے اب زندگی کے مشاہدے بیان ہونے لگے۔ عشق و محبّت کے جذبات کو قدیم طرز پر رمزیت، اشاریت اور استعاروں میں بیان کرنے کے بجائے اب پردہ چاک کر دیا جا رہا ہے۔ رازِ دروں بے پردہ نظر آنے لگے ہیں۔

بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں شعراء کے کلام میں نئے شعری تجربوں کی طرف طبیعتیں مائل رہیں اور اظہار کے سانچے بھی بدلنے لگے۔

دکن میں اُردو کی ترقی کے چھٹے دور میں نثر نگاری کے موضوع کو بڑی وسعت ہو چکی تھی۔ تاریخ، سوانح، سفرنامہ، فلسفہ، سائنس، ناول، افسانے، مختصر افسانے اور قانون وغیرہ کی کتابیں مرتب ہو چکی تھیں۔ ساتویں دور میں نثر نگاری کے موضوع کو اور زیادہ وسعت ہوئی۔ نئے نئے موضوع، نئے نئے رجحانات کا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ سے اُردو کے خزانے میں انمول نگینوں کا کافی مسالہ جمع ہو گیا، تاریخ، ادب، تنقید ادب، معاشیات، جغرافیہ دو ومسلک سائنس اور سائنس کے مختلف شعبوں، کیمیا، طبیعیات، ہیئت، ریاضی علمی و نظری، برقیات، انجنیرنگ، طب، معدنیات، حیاتیات اور نباتیات وغیرہ کے موضوع کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور تصانیف کی گئیں، ریسرچ کر کے انکشاف کا دروازہ کھل گیا۔ اس طرح اُردو نثر کی کتابوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔

شاعری کی طرح نثر نگاری کو بھی اس دور میں خاصی ترقی ہوئی ہے۔ نہ صرف جدید موضوع زیرِ بحث رہے بلکہ جدید رجحانات بھی پیدا ہوئے ان پر جس کامیابی سے دکن کے مصنّفین نے اپنے قلم کے نقش ثبت کیے ہیں، وہ اُردو زبان اور ادب میں ہمیشہ تاباں اور درخشاں رہیں گے۔

ساتویں دور کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ خواتین نے بھی شاعری اور نثر نگاری کے میدان میں اپنے اچھے نقش ثبت کیے ان میں سے بعض کا تذکرہ صفحاتِ گذشتہ میں کر دیا گیا ہے، شاعری میں بشیر النساء بیگم بشیرؔ، نوشابہ خاتون، انیسہ خاتون ثریا، وحیدہ نسیم وغیرہ اور نثر نگاری میں جہاں بانو، زینت ساجدہ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، سلطانہ شرف الدین فاطمہ شجاعت وغیرہ نے جو کارنامے پیش کیے وہ قابلِ قدر ہیں۔

جامعۂ عثمانیہ اُردو زبان کی ترقی کی وہ منزل تھی جہاں یہ کارواں صدیوں کے مراحل سفر طے کرنے کے بعد پہنچا تھا، جامعۂ عثمانیہ کے عالمِ وجود میں آجانے کے بعد حیدرآباد پر جو علمی فضا چھائی ہوئی تھی، وہ اُردو ادب کے لیے ایک نہایت پرشان و شکوہ مستقبل کی کفیل تھی، لیکن جامعہ کی زبان بدل جانے اور دوسرے امور جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے مدِّ نظر اس دَور کا اختتام اُردو کے لیے حسرت ناک ثابت ہوا۔

آندھرا میں اُردو

از ۱۹۵۶ء

تمہید

(۱)

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی، ہندوستان اور پاکستان دونوں آزاد حکومتیں قرار دی گئیں، ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پولیس ایکشن ہوا، اولاً کچھ عرصہ تک فوجی حکومت رہی، جنرل چودھری حکومت کرتے رہے، اس کے بعد حکومت حیدرآباد کے نام سے عوامی حکومت قائم ہوئی۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں راج پرمکھ اور شری بی رام کشن راؤ چیف منسٹر ہوئے، یہ عوامی حکومت اکتوبر ۱۹۵۶ء تک قائم رہی، اسی مہینہ میں ہندوستان کی لسانی طور پر تقسیم عمل میں آئی، زبان کے لحاظ سے صوبے بنائے گئے، اس فارمولے کے لحاظ سے حکومت حیدرآباد کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، چند اضلاع یعنی اورنگ آباد، پربھنی، ناندیڑ، بیڑ اور عثمان آباد مہاراشٹر میں شامل ہوئے اور اضلاع رائچور، گلبرگہ اور بیدر کرناٹک (میسور) میں ضم ہوگئے، حکومتِ حیدرآباد کے جو نو اضلاع تلنگانہ کے باقی رہے، ان کو آندھرا کے دوسرے اضلاع کے ساتھ شامل کرکے صوبہ آندھرا پردیش بنایا گیا، اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے راج پرمکھ کے بجائے گورنر کی حیثیت سے کام کرنا قبول نہیں کیا، اس لیے شری ترویدی آئی۔سی۔ایس جو پہلے سے آندھرا کے گورنر تھے، اب نئے صوبہ آندھرا پردیش کے گورنر تھے، ان کے بعد شری بھیم سین سچر صاحب گورنر ہوئے، اور اس وقت تک وہی آندھرا پردیش کے گورنر ہیں، آندھرا پردیش قائم ہونے پر چیف منسٹری کی خدمت پر شری سنجیوا ریڈی کا انتخاب ہوا، چند سال کے بعد جب شری سنجیوا ریڈی کل ہند کانگریس کے صدر چنے گئے تو شری سنجیوا ریڈی منسٹر ہوئے، اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں دوسری بار رائے شماری ہوئی۔ انتخابات ہوئے تو پھر سے شری سنجیوا ریڈی صاحب کو چیف منسٹری کا قلمدان حاصل ہوگیا۔

یہاں اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لسانی تقسیم کے پہلے ہی صوبہ مدراس سے آندھرا کے علاقے جدا کرکے آندھرا کے اضلاع کی ایک جدید ریاست قائم ہوچکی تھی اور شری گوپال ریڈی اس نئی ریاست کے چیف منسٹر ہوئے تھے، جب یہ نیا صوبہ قائم

ہورہا تھا تو آندھرا والوں کا ارادہ مدراس کو اپنی ریاست کا دارالسلطنت بنانے کا تھا، مگر چونکہ مدراس آندھرا میں نہیں ہے، اس لیے اس نئی ریاست کا دارالحکومت کرنول بنایا گیا، آندھرا کے بعض لیڈروں کی یہ خواہش رہی کہ حیدرآباد جو آندھرا کے وسط میں ہے، آندھرا پردیش کا دارالحکومت بن جائے، چنانچہ جب تلنگانہ کے عوام نے اپنے باقی نو اضلاع کی علیحدہ ریاست کے بجائے چند تحفظات کے ساتھ آندھرا میں شامل ہوجانا پسند کیا تو نومبر ۱۹۵۶ء میں تلنگانہ اور آندھرا کے تمام اضلاع کو ملا کر حکومت آندھرا پردیش بنادی گئی، آندھرا والوں کی تمنا پوری ہوگئی۔

حیدرآباد جیسا خوبصورت شاندار شہر جو اپنی تہذیب، ثقافت، کلچر اور تمدن کے لحاظ سے ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے دارالحکومتوں میں ممتاز رکھتا ہے، آندھرا پردیش کی ریاست کا دارالحکومت بن گیا اور آندھرا والوں کو شہر حیدرآباد کے ساتھ عدالت العالیہ، شفاخانہ، یونیورسٹی، مجلس مقننہ، محکمہ جات معتمدین، وغیرہ کے لیے شاندار عمارتیں بنانے کی ضرورت ہوئی، بلکہ سب کچھ مل گئے، یہ آندھرا والوں کی خوش قسمتی تھی کہ قطب شاہی دارالحکومت آصفجاہی دارالسلطنت، دکھنی کلچر، ثقافت، تہذیب اور شائستگی کا ورثہ میسر آیا۔ اس کلچر کا ایک شعبہ اردو زبان تھی جو دکھنی کلچر کی اعلیٰ روایات میں شامل رہی اور بلا تفریق مذہب پورے تلنگانہ میں استعمال ہوتی تھی۔

(۲)

واضح ہو کہ ہندوستان کی جب تقسیم عمل میں آئی، ہندوستان اور پاکستان بن گئے اور خونی ہولی کھیلی گئی تو اردو کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، اردو کی علانیہ زور شور سے مخالفت ہونے لگی اور ہندی زبان کو ہندوستان کی جمہوریت کی سرکاری زبان کا درجہ مل گیا، گاندھی جی کا فارمولا پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ اس ناموافق حالت میں صرف مولانا ابوالکلام آزاد اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی شخصیت تھی کہ ان دونوں کی سعی اور سری جواہر لال کی مدد سے اردو زبان کو باقی رکھنے اور ترقی دینے کے لیے انجمن ترقی اردو قائم کی گئی، علی گڑھ کو اس کا صدر مقام بنایا گیا، جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جو اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے، کل ہند انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرمائی اور قاضی عبدالغفار صاحب سکریٹری بن گئے، حکومتِ ہند

سے سالانہ امداد مقرر ہوئی۔

قاضی صاحب اُردو کو فروغ دینے اور انجمن کو مستحکم کرنے پر ہمہ تن متوجہ ہو گئے اور اس کی شاخیں قائم کرنے لگے، دوسرے شہروں کی طرح حیدر آباد میں بھی انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کی گئی اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کو جو حکومت کے ایک اعلیٰ محکمہ کے سکریٹری کے عہدہ سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تھے، انجمن کا سکریٹری بنایا گیا۔ کچھ عرصہ تک انجمن ترقی اُردو اپنی بساط کے موافق کام کرتی رہی، تلنگانہ کے عوام کی کثرتِ زبان جو اُردو تھی اور جہاں صدیوں سے اُردو زبان اور ادب کی خدمت ہو رہی تھی، اب وہاں اُردو کا نام لینے، اُردو کی ترقی کے لیے جدوجہد کرنے میں دُشواری محسوس ہو رہی تھی، دلوں میں خوف طاری تھا، اُردو کا نام لینے میں بھی پس وپیش ہو رہا تھا، ایک جمود تھا، ایک مایوسی تھی، جرأت کا فقدان تھا، اُردو کی حمایت میں زبان کھولنا گناہ تصور کیا جاتا تھا اُردو جن کی مادری زبان تھی، ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے، ہمتیں جواب دے چکی تھیں، غرض اُردو کے سپوت اور ہمدردانِ اُردو، اُردو کی ترقی تو کجا اس کے باقی رہنے سے بھی مایوس ہو کر نااُمید ہو گئے تھے، حیدر آباد میں اُردو اب باقی رہنا دشوار سے دشوار تر معلوم ہو رہا تھا۔

اس تاریک فضا میں انجمن ترقی اُردو (حیدر آباد) کا قائم رہنا ہی دشوار تھا تو اس کی ترقی کی اُمید کہاں ہو سکتی تھی، بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن اصحاب کے ہاتھوں میں انجمن ترقی اُردو کی باگ تھی، ان کی بلند ہمتی، جرأتِ استقلال اور حوصلہ کی داد دینا ضروری ہے کہ انہوں نے اُردو کی ترقی کے لیے ایک مستقل عمارت کا بنانا قرار دیا اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے مکان کے احاطہ سے ایک وسیع آراضی انجمن کو مفت دے دی اور جناب سجاد مرزا صاحب کے پندرہ ہزار روپیہ کے عطیہ سے جو کچھ عرصہ پہلے انجمن کو ملا تھا۔ ہال تعمیر کرنے کا آغاز کیا گیا، اُردو کے ہمدردوں، بہی خواہوں سے چندہ کی اپیل کی گئی۔ چونکہ اپیل کرنے والوں کی نیّت میں خلوص تھا، صداقت تھی، ہمّت تھی، استقلال تھا، اس لیے چند ہی ماہ میں ایک خاصی رقم جمع ہو گئی اور حمایت نگر میں اُردو ہال تعمیر ہو گیا۔ اُردو کے لیے ایک مستقل عمارت بن گئی لیکن اس کے باوجود اُردو کی ترقی سے مایوسی تھی، چند اشخاص کے سوا عوام کی ہمتیں پست اور حوصلے مایوس کن تھے۔ ایسی حالت میں انجمن والوں نے ایک کانفرنس کا انعقاد ضروری خیال کیا اور اس کانفرنس کی صدارت پنڈت کشن پرشاد کول جیسے اُردو کے

مُربّی نے قبول فرمائی۔ کانفرنس بڑی سے ہوئی، اس کانفرنس سے بڑا فائدہ ہوا۔ لوگوں کی ہمتیں بلند ہونے لگیں۔ اُردو کی تائید میں زبان کھولنے اور قلم کو جولانی دینے کا احساس پیدا ہوگیا، مایوسیاں ہمت سے بدل گئیں، خوف جو دامن گیر تھا وہ دُور ہوگیا، اُردو کی ترقی کی امید پیدا ہوگئی۔

اسی عرصہ میں ڈاکٹر سیّد محی الدین زور اور ان کے بعض رفقار جو ادارہ ادبیات اُردو کے بانی تھے اور کئی سال سے اُردو کی ٹھوس خدمت میں مصروف تھے، ایوانِ اردو کی تعمیر کرنے لگے، ڈاکٹر زور کو جب حکومت سے آراضی ملنے کی اُمید باقی نہیں رہی تو موصوف کے اہلیہ خانہ نے اپنے مکان کے ایک حصّہ کی آراضی ادارہ کو عطیہ کردی اور اب حکومتِ آصفیہ کے زمانے میں ادارہ کی جو رقم حکومت کے خزانہ میں محفوظ تھی، وہ حاصل ہوگئی اور ایوانِ اُردو کی تعمیر ہونے لگی، مرکزی حکومت نے امداد دی، اہلِ خیر سے رقمیں ملیں، نواب مہدی نواز جنگ کی وجہ سے کمیٹی سالار جنگ اسٹیٹ نے کئی ہزار کی رقم دی، غرض ایک طرف اُردو ہال اور دوسری طرف ایوانِ اُردو مکمّل ہوگیا۔

پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد میں اُردو پر جو اوس پڑگئی تھی، وہ دُور ہونے لگی اور اُردو کے باقی رہنے کے آثار نظر آنے لگے، اس عرصہ میں حکومتِ آندھرا کے اعلیٰ سیاست داں چیف منسٹر سری سنجیوا ریڈی صاحب نے اعلان کیا کہ اُردو حکومتِ آندھرا کی تلنگی کے ساتھ دوسری زبان سرکاری رہے گی، اس اعلان کا اچھا اثر ہوا، ایک بڑی حد تک اُردو کی مخالفت دُور ہوگئی اور آسانیاں پیدا ہوگئیں۔ مدرسوں میں اُردو کی تعلیم کی جو دقتیں تھیں، وہ کم ہونے لگیں، بعض دفاتر میں اُردو درخواستیں قبول کی جانے لگیں، بہرحال اُردو کی جو حالت ۱۹۴۸ء کے بعد ہوگئی تھی وہ تو دُور ہوگئی مگر ۱۹۴۸ء کے پہلے اُردو کو جو درجہ اور مرتبہ حاصل تھا وہ اب حاصل ہونے کی توقع کرنا بے جا ہے۔ اُردو کو نہ اب پہلا سا رتبہ حاصل ہوسکتا ہے اور نہ اُردو پہلے کی طرح پروان چڑھ سکتی ہے۔ البتہ اُردو کے مٹ جانے کا جو خوف دامن گیر تھا وہ دُور ہوگیا ہے اور کچھ نہ کچھ اس کی بقا کے آثار نظر آتے ہیں اور اُمید ہوچلی ہے کہ اس کی آئندہ ترقی ہوسکتی ہے۔

انجمن ترقی اُردو اور ادارہ ادبیات اُردو کے ساتھ کئی اور اُردو کے ادارے اُردو کی خدمت میں مصروف ہیں، اُردو کتابوں کی تصنیف و تالیف ہونے لگی اور ان کی طباعت و

اشاعت شروع ہوگئی ہے اُردو کی ترقی کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے، اُردو کی خدمت
کرنے میں مردوں کے دوش بدوش خواتین بھی میدانِ عمل میں گامزن ہیں، ان کی کتابیں
منظرِ عام پر آنے لگی ہیں۔ مشاعروں کی کثرت ہوگئی ہے، مشاہیرِ اُردو کے یوم بڑی کامیابی
سے منائے جانے لگے ہیں اس طرح اُردو کی تاریک فضا روشنی سے بدل رہی ہے، یہ
کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے بعض دوسرے صوبوں یعنی اُتر پردیش، بہار اور پنجاب
کے مقابلہ میں آندھرا پردیش میں اُردو کے لیے سازگار ماحول ہے اور اس کی ترقی کی
اُمید ہوتی ہے۔

حکومتِ آندھرا کے اعلان کے ساتھ اُردو کے پرستاروں اور ہمدردوں کے لیے
یہ امر بھی باعثِ تشکر اور لائقِ تسکین ہے کہ آندھرا کے گورنر شری بھیم سین سچر صاحب
اپنی سرکاری تقاریر اکثر و بیشتر اُردو میں فرماتے ہیں اور موصوف کو پوری طرح اس امر کی
آگاہی ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے عوام بلالحاظ مذہب و ملت اُردو بولتے اور
اُردو میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ غرض اُردو کی یہ وہ داستان ہے جو آندھرا پردیش
سے متعلق ہے۔

اب اس تفصیل کے بعد آندھرا کے موجودہ بعض مشہور شعراء اور نثر نگاروں کا تعارف
کرایا جاتا ہے اور بعض دوسرے امور بیان کئے جائیں گے جو اُردو سے تعلق رکھتے ہیں، اُمید
ہے موجب دلچسپی ثابت ہوں گے۔

شاعری

ہر زبان کے ادب میں شاعری کو بڑا مرتبہ حاصل ہوتا ہے، ادب کی ترقی
اور اس کے معیاری ہونے کا ثبوت شاعری سے ملتا ہے۔ صفحاتِ
گزشتہ میں تفصیل کے ساتھ شاعری کا تذکرہ ہوچکا ہے، یہاں ہم چند موجودہ شعراء کا تعارف
کراتے ہیں۔ واضح ہو کہ آندھرا کے موجودہ شاعروں میں بڑا حصہ ایسے شعراء کا ہے جو آندھرا
بننے کے پہلے سے شہرت رکھتے ہیں اور اُردو شاعری کے میدان میں اپنے بلند مقام کے لحاظ
سے نامور ہوچکے ہیں، افسوس ہے، آندھرا پردیش کے دور میں حضرت امجد اور حضرت حسرت
کا انتقال ہوا، اگرچہ دونوں شعراء نے خاص عمر پائی مگر ان کا انتقال دکن کی شاعری میں ایک خلا
کا باعث ہوا ہے۔

دورِ حاضر میں بعض قدیم شعراء کے افکار کتابی صورت میں شائع ہوئے، مثلاً شہید یار جنگ

شہید نے تذکرۂ شعراء کی ایک کتاب نظم میں شائع فرمائی ہے۔ مخدوم محی الدین کا دوسرا مجموعۂ کلام "گلِ تر" کے نام سے شائع ہوا، شاہد صدیقی کا پہلا مجموعہ "چراغِ منزل" کے نام سے منظرِ عام پر آیا، غرض دَورِ گذشتہ کے شاعر اس دَور میں خاموش نہیں ہو گئے بلکہ نئے رجحانات، نئے جذبات، نئے شعور، نئی قدروں کے ساتھ میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ ان کے افکار میں پختگی، تخیل میں بلند پروازی، خیالات میں عمق اور گہرائی پیدا ہوگئی، شگفتگی، سادگی صفائی، نازک خیالی، جدت آمیزی کے جوہر زیادہ ہو گئے، شاعری میں ان کا مرتبہ بلند ہوگیا یا بلند سے بلند تر مرتبہ پر پہونچ گئے۔ اس مقام میں شعراء کی تفصیل یا ان کے ناموں کی صراحت غیر ضروری ہے اس لیے تمام قدیم اور جدید شعراء کو نظر انداز کر کے صرف چند شعراء کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے تاکہ اس دَور کے شعراء کے کلام کا اندازہ کیا جا سکے۔

(۱) اریب سلیمان نام، اریب تخلص، ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد میں تولّد ہوئے، میٹرک تک تعلیم پائی، شعر گوئی میں مصروف ہو گئے، حیدرآباد کے ترقی پسند شاعروں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ انقلابی نظمیں لکھنے کی وجہ سے دو مرتبہ قید گئے تھے کچھ عرصہ تک رسالہ سب رس کی ایڈیٹری کی، اب کئی سال سے رسالہ صبا شائع کرتے ہیں۔

اریب، نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں، بگڑے ہوئے سماج کی مخالفت اور زمانہ کی سنگ دلی کی شکایت ان کی اکثر نظموں کا موضوع ہوتا ہے، غزلوں میں اس کی اصلی روایات عشق و محبّت، ساغر و مے، شاہد و ساقی، حسن و عشق کی دل آویزی، بے قراری، سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی روئداد ہوتی ہے" ان کے کلام کا مجموعہ انجمن ترقی اُردو حیدرآباد نے "چاکِ گریباں" کے نام سے شائع کیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

پیش کش

میں ترے حُسن کی تعریف ہی کرتا رہتا
تیری تعریف کے الفاظ اگر مل سکتے

اُف ری بے مائگی دامن گلزار زباں
ایک دو پھول ہی مطلب کے اگر مل سکتے

لالہ و گل ہوں کہ نرگس ہو کہ سرو و شمشاد
میں کسی سے بھی کوئی کام نہیں لے سکتا

تیرے رخسار و لب و چشم قد و قامت کو
میں کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتا

جانے کب تک تجھے اللہ نے شاعر بن کر
شعرِ نازک کی طرح ذہن میں سوچا ہوگا
جب کہیں دہر کے دیوانِ مصور میں تجھے
گنگناتے ہوئے گاتے ہوئے لکھا ہوگا

چاندنی رات اور جھیل

دودھ کی سی ہے چاندنی چھٹکی
یا سمن زار بن گیا ہے جہاں
ہے سرِ چرخ مطربِ مہتاب
بربطِ خامشی پہ نغمہ کناں

کھوئے کھوئے ہوئے سے دم سادھے
بام و در نور میں نہاتے ہیں
گود میں اپنی دھرتی ماتا کے
خاک کے ذرّے مسکراتے ہیں

کتنا گمبھیر ہے یہ سناٹا
سحر بستہ ہو جیسے ہر اک شے
دل کو محسوس ہوتا ہے ایسا
جیسے سستا رہی ہو زیست کی لے

وہ زمانہ قریب ہے جب ہم
زیست کو آنگبیں بنائیں گے
حسن و الفت کے جوگ اور بہاگ
چاند کے ساتھ ہم بھی گائیں گے

پھر حافظ و غالب کو جوانی دے دوں
خیام کو پھر قالبِ ثانی دے دوں
اک پل کے لیے میں جو خدا ہو جاؤں
دنیا کو بس انگور کا پانی دے دوں

غزلیات کا نمونہ :-

ہم تجھ سے محبت کر کے بھی اے دوست محبت کر نہ سکے
جینے کے لیے تو جیتے ہیں پر تیرے لیے بھی مر نہ سکے
کیا کس کو ملا، کیا کس نے دیا، یہ بات کسی سے کیا کہیے
دنیا نے یہی دیکھا ہوگا دامانِ تہی ہم بھر نہ سکے
جو کچھ بھی پڑی ہم جھیل گئے، کیا ان کی جفا کیا ان کا کرم
آغازِ وفا کی ڈھارس پر انجام وفا سے ڈر نہ سکے

دزدیدۂ نگاہ کی خواہش ضرور ہے
کم کم سہی، گناہ کی خواہش ضرور ہے

میں تیرے غم سے غمِ روزگار تک پہنچا
تری گلی سے چلا اور دار تک پہنچا

ہر ایک دوست نے دامن جب اپنا کھینچ لیا
اریب رو نہ سکا پھر اریب رو نہ سکا

---

(۲) اسد انصاری

ڈاکٹر اسد انصاری کی پیدائش حیدر آباد میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی، آپ کے والد محمد احمد حسن تھے، علماء فرنگی محل لکھنؤ سے آپ کا تعلق ہے، مگر چار پشتوں سے آپ کے اجداد نے حیدر آباد کو وطن بنایا ہے، اسد انصاری صاحب مدرسۂ مفید الانام اور مدرسۂ نظامیہ سے استفادہ کر کے لکھنؤ گئے اور فرنگی محل میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی، پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے علومِ مشرقی کی ڈگریاں لے کر ہومیو پیتھک کی تعلیم پائی اور یہی آپ کی مصروفیت ہے۔

اسد انصاری صاحب کو شاعری کا شوق کم عمری سے ہے، قاضی وحید اور مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محلی سے مشورۂ سخن کیا۔ پھر آرزو لکھنوی سے تلمذ حاصل کیا۔ آرزو صاحب کے انتقال کے بعد نواب جعفر علی خاں اثر اور سراج لکھنوی کی شاگردی میں منسلک ہیں، اسد کو فارسی کے ساتھ اردو اور ہندی شاعری سے بھی شغف ہے، اس طرح اردو، فارسی، ہندی میں طبع آزمائی کرتے ہیں، ہر صنفِ سخن میں مشقِ سخن کرتے ہیں۔ غزل، نظم، رباعی، قطعہ، گیت، قصائد، سلام اور مرثیہ آپ کی جولانیٔ طبع کے میدان ہیں، کلام صاف، عام فہم ہونے کے ساتھ نازک خیالی اور تاثر کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہوتا ہے، تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی گہرائی، آپ کے کلام کے جوہر ہیں، پرگو شاعر ہیں اور اکثر مشاعروں میں حصہ لیا کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

تجھ سے وابستہ ہوا، اپنے سے بیگانہ بنا
بعد ازاں ہوش نہیں۔ کیا میں بنا، کیا نہ بنا

جو ہے کم ظرف وہ محفل میں تیری آ نہ سکے
ایسا قانون کوئی ساقیٔ میخانہ بنا

اک نظر دیکھ لے تغافل کیش　　　لذتِ درد ہے کمی کے قریب

توہینِ جبہ سائی ہے تضحیک بندگی　　　فعلِ عبث ہے سجدہ ترے آستاں سے دُور

تمہارے ساتھ جہاں تم گئے بہار گئی
جہاں پہونچ گئے تم جل اُٹھے وہاں کے چراغ
پڑھا نہ فاتحہ بھی تو کسی نے دفن کے بعد
کہاں کے پھول میری قبر پر کہاں کے چراغ

محبّت کا بھرم ہے ضبطِ غم تک　　　رہے گا رازِ اُلفت راز ہم تک
فسونِ زلف و عارض کچھ نہ پوچھو　　　تہ و بالا ہوئے دیر و حرم تک

خوبیٔ تقدیر نام التفاتِ چشمِ دوست
گردشِ تقدیر چشمِ دوست پھر جانے کا نام
جن کو کہتا ہے زمانہ فصلِ گُل دَورِ خزاں
آپ کے آنے کا دن، یہ آپ کے جانے کا نام

حدودِ فہم سے بالا ہے آئینِ چمن بندی
گلستانِ وفا میں سوکھ کر غنچے مہکتے ہیں
جلن دل کی بڑھا دیتی ہے اشکوں کی فراوانی
مدد پانی کی پا کر اور بھی شعلے بھڑکتے ہیں

جب کہ ہر انساں کے قبضے میں ہے جبر و اختیار
کاروبارِ زندگی پھر حسبِ منشا کیوں نہ ہو

یہ آخر بات کیا ہے کچھ بتا اے پیرِ میخانہ
کہ اکثر نام کا میرے چھلک جاتا ہے پیمانہ

اب تک کوئی نظر نہ حقیقت نگر ہوئی
دیدِ جمالِ دوست بہ حدِّ نظر ہوئی

واعظ و محتسب و شیخ حرم، پیرِ مغاں
زیبِ محفل ہیں اسدؔ آج غزل خواں کتنے

---

(۳) آذرؔ

راشد علی خاں نام، آذرؔ تخلص، پروفیسر حسین علی خاں مرحوم کے فرزند ۱۹۳۰ء میں تولد ہوئے، ایک علم دوست صاحب علم خوش حال خاندان سے تعلق ہے۔ آذرؔ کو علمی ذوق اور شغف ورثہ میں ملا ہے، نظام کالج میں تعلیم پاکر عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے، ایل۔ ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہے اور آرٹ سے دلچسپی رکھتے ہیں، اگرچہ ان کی شاعری کو آغاز ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، مگر اس کے باوجود اظہارِ خیال اور اندازِ بیان پر اچھی قدرت حاصل کرلی ہے، زیادہ تر نظمیں موزوں کرتے ہیں، غزلوں سے بھی دلچسپی ہے، ان کا کلام اُردو کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتا اور پسند کیا جاتا ہے، نمونہ پیش ہے:۔

نقشِ تازہ

فکرِ آذرؔ نے تراشے تھے خیالوں میں صنم
آتشِ گل سے حسیں، موجِ تبسم سے گداز
جو حقیقت سے جِلا پا نہ سکے ٹوٹ گئے
اک ہزیمت نے عیاں کر دیئے سب نیست کے راز

فکرِ فردا نے پھر اک بار سجا رکھے ہیں
میرے ماضی کے جھروکوں میں پرانے اصنام

ان کے ماتھے پہ دمکتی ہے لہو کی بندی
ان کے چہرے پہ منقش ہے مرے شوق کا نام

خون میں ڈوبی ہوئی سُرخ کرن پھوٹی ہے
میری یادوں کے دہکتے ہوئے رُخساروں سے
میرے ماضی کے شبستاں میں دِئے جلتے ہیں
روشنی دل میں ہوئی درد کے انگاروں سے

آج پھر دل کی تمناؤں نے بیدار کیا
آج پھر میں نے اسی شوق سے کچھ سوچا ہے
ایک اُمیدِ غم آگیں کا سہارا لے کر
میں نے ہر یاد کے ماتھے سے لہو پونچھا ہے

ہر تمنا کو کسی یاد نے چمکایا ہے
غم نے تاریکِ تخیل کو ضیا بخشی ہے
کش مکش حسرتِ اُمید کی آمیزش سے
زیست کے ہاتھ کو محنت نے حنا بخشی ہے

جب کبھی زیست کے ہر رنگ کو مبہم پا کے
یاس اُمید کی تصویر مٹا دیتی ہے
آرزو یاد کی بکھری ہوئی کرنیں لے کر
پردۂ دل پہ نیا نقش بنا دیتی ہے

غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

نسیمِ صبح پیامِ بہار لائی ہے
مگر جنوں سے واقف نہیں ہیں دیوانے

خود اپنے جذبِ وفا کا اگر شعور نہ ہو
فریبِ شمع سے غافل رہیں گے پروانے

بکھر تو جائیں ذرا میکدے بہاروں کے
صبا کے ہاتھ سے چھلکیں گے سُرخ پیمانے

شعورِ شوق سے آذرِ رُخِ حیات تراش
سنور ہی جائیں گے دن اور دلوں کے بُت خانے

دلِ صد چاک شکستوں سے سنور جاتا ہے
غمِ جاناں، غمِ دوراں سے بکھر جاتا ہے
جب کبھی وقت کے ماتھے پہ شکن پڑتی ہے
کہنہ تہذیب کا شیرازہ بکھر جاتا ہے

---

(۴) برزمی

احمد معین الدین نام، برزمی تخلص ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے، جامعۂ عثمانیہ سے بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حکومتِ آندھرا پردیش کے مختلف محکموں سے تعلق رہا، اب محکمۂ آبکاری سے تعلق ہے زمانۂ تعلیم سے شعرگوئی کا شوق دامن گیر رہا۔ پہلے اپنے استاد عبدالقیوم خاں باقی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ سیّد علی منظور مرحوم سے بھی تلمذ رہا۔ نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں غزل میں تغزل کی تفسیر خوبی سے کرتے ہیں، عاشقانہ جذبات اور کیفیات کو اپنی غزلوں میں پیش کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

مرے لیے ترا غم ہی غمِ جہاں نکلا
یہ سوزِ عشق مرا سوزِ جاوداں نکلا
نگہ بلند ہے، فطرت بلند ہے میری
قفس بھی میرے لیے ایک آشیاں نکلا
اب اس مقام پہ پہنچی ہے بندگی میری
جہاں بھی رکھ دی جبیں تیرا آستاں نکلا
وہ میرے عشق کا افسانۂ مسلسل ہے
جو تیرے حسن کا عنواں داستاں نکلا
کشاکشِ غمِ دل ہی کو زندگی کہیے
ہر اضطرابِ محبت سکونِ جاں نکلا
تلاش میں نہ ملا نقشِ پائے ناز کہیں
سمجھ رہا تھا زمیں جس کو آسماں نکلا
خرد نے مجھ سے جو پوچھا مرے جنوں کا نام
مری زباں سے ترا نام ناگہاں نکلا
ہے کچھ خبر بھی تجھے جانِ بزمِ حسن و جمال
تری تلاش میں برزمی کہاں کہاں نکلا

زندگی کی خاطر ہم انقلاب سے گذرے
عزمِ کامراں لے کر اضطراب سے گذرے
آج بھی وہی مے کش جام کو ترستے ہیں
بارہا جو ساقی کے انتخاب سے گذرے
مے کدہ میں کیا ہوگی مجھ سے مے کشی ساقی
جب کہ میرا ہر ساغر احتساب سے گذرے

ہم تری تجلی کی جستجو میں روز و شب آفتاب سے گذرے ماہتاب سے گذرے
عالمِ محبت میں کچھ سکوں نہیں ملتا ہم بہر قدم بزمی اضطراب سے گذرے

کیا خوب نشیمن پر میرے یہ برق کا احساں ہوتا ہے
بڑھ جاتی ہے رونقِ گلشن کی اک جشنِ چراغاں ہوتا ہے
اس حسنِ مجسّم کا جلوہ آنکھوں میں سمایا ہے جب سے
جس شے پہ نظر پڑجاتی ہے اس میں وہ نمایاں ہوتا ہے
رقصاں ہیں اسیرانِ آفت، ہیں طوق و سلاسل نغمہ سرا
اک میری جنوں سامانی سے ہنگامۂ زنداں ہوتا ہے
ہے درسِ بصیرت ہر شے میں، آنکھیں تو ذرا کھولے کوئی
رنگین کلی کے سینے میں چھوٹا سا گلستاں ہوتا ہے
ہنگامہ بپا ہو جاتا ہے اربابِ خرد کی محفل میں
اک عالمِ کیف و مستی میں بزمی جو غزلخواں ہوتا ہے

---

(۵) تاب

امین احمد، تاب تخلص، حیدر آباد کے جوان اور خوش فکر صاحبِ ذوق شاعر ہیں، جامعۂ نظامیہ حیدر آباد میں تعلیم پائی، سید حیدر پاشاہ حیدر کو اولاً اپنا کلام دکھایا، پھر حضرت صفی سے تلمذ رہا، زیادہ تر غزل موزوں کرتے ہیں اور اسی صنفِ شاعری سے ان کو خاص لگاؤ ہے، ان کی غزل میں اندازِ بیان کی ندرت، افکار کی جدت اور کلام میں سوز و گداز ہوتا ہے، کلام میں پختگی، آمد اور روانی پائی جاتی ہے۔ اکثر معیاری رسالوں، مشاعروں اور ریڈیو کے ذریعہ ان کے کلام کی اشاعت ہوتی ہے، اگرچہ اب تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا مگر خاصا کلام جمع ہوگیا ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:-

نہ تخت و تاج، نہ ہم اقتدار مانگتے ہیں نظر کی روشنی، دل کا قرار مانگتے ہیں
یہ کیا غضب ہے کہ اربابِ گلستاں ہو کر گلوں سے قیمتِ فصلِ بہار مانگتے ہیں
کچھ ایسے ہاتھ بھی پھیلے ہیں صحنِ گلشن میں جو گل سے حسن، کلی سے نکھار مانگتے ہیں
کبھی تم ان کے بھی حسنِ طلب کی داد تو دو تمہیں سے تم کو جو بے اختیار مانگتے ہیں

بیتابیٔ دل کے افسانے کب شرح و بیاں تک پہنچے ہیں
اے دوست اگر پہنچے بھی تو بس شائستہ فغاں تک پہنچے ہیں

زلفوں سے تری زنجیروں تک، زنجیروں سے پھر دار و رسن
اک لفظِ محبت کی خاطر دیوانے کہاں تک پہنچے ہیں

زندگی کو جو ترے درد کی منزل سمجھے
ہر تبسّم کو وہ عنوانِ غمِ دل سمجھے

اتنے مانوس رہے ہیں ترے غم سے اے دوست
ہم تسلّی کو بھی توہینِ غمِ دل سمجھے

ہم تو منزل پہ پہنچ بھی لئے ہیں لے تابؔ
لوگ پھر بھی ہمیں آسودۂ منزل سمجھے

تم وجہ بنائے درد ہوئے اور درد کا حاصل ہو نہ سکے
مدت سے مرے دل میں رہ کر تسکینِ غمِ دل ہو نہ سکے

تم قبلہ نما، تم شیخِ حرم، تم صاحبِ ایماں، اہلِ کرم
حیرت ہے کہ سب کچھ ہو کر بھی اک درد بھرا دل ہو نہ سکے

راہوں کی دل آویزی اکثر مجبورِ سفر کر دیتی ہے
منزل پہ پہنچ کر بھی کتنے آسودۂ منزل ہو نہ سکے

اب تو منزل کا تصوّر بھی گراں ہوتا ہے
اپنے گھر پر مجھے رستے کا گماں ہوتا ہے

بات کرتا ہوں تو اک درد کی بو ہوتی ہے
سننے والوں کو یہ احساس کہاں ہوتا ہے

مقصدِ نور سے جب تک نہ ہو آگاہ نظر
شمع روشن بھی اگر ہو تو دھواں ہوتا ہے

بس اسی بات سے ہو جاتا ہے اندازۂ غم
ہر تبسّم پہ تصنّع کا گماں ہوتا ہے

کیسے دیوانے ہیں بے خوف و خطر چلتے ہیں
پاؤں زنجیر سے بوجھل ہیں مگر چلتے ہیں

کوئی مخلص نہیں ملتا ترے دیوانے کو
سنگ اندازی ملتے ہیں جدھر چلتے ہیں

وہ اندھیرے میں بھی پڑھ لیتے ہیں تحریرِ حیات
جو نگاہوں میں لئے نورِ سحر چلتے ہیں

تاب سایہ نہیں تیرا کہ ترے ساتھ چلے
ساتھ تیرے تو ترے دست نگر چلتے ہیں

---

(۶) تاباںؔ

محمد شمس الدین نام، تاباںؔ تخلص، حیدر آباد وطن ۱۹۲۲ء میں ولادت ہوئی۔ جامعۂ عثمانیہ سے منشی فاضل کامیاب کیا اور ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہو گئے۔ شعر و سخن کا ذوق فطری تھا۔ حضرت صفیؔ کے شاگردوں میں شامل ہیں اور ممتاز شاگرد شمار کیے جاتے ہیں، زیادہ تر غزل کہتے ہیں اور اس میں تصوف کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ کلام دلی جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سوز و گداز اور تڑپ آپ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں، حیدر آباد کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں تاباںؔ کا کلام پسند کیا جاتا اور دادِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ علمِ عروض سے بخوبی واقف ہیں اور اپنی شاعری کو قواعد و ضوابط شاعری کے معیار پر جانچتے ہیں۔ فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

دیکھنا ہے امتیاز رنگ و خوں کب تک رہے
ابنِ آدم اس طرح خوار و زبوں کب تک رہے

لاکھ روکیں ایک دن آ کر رہے گا انقلاب
دل میں طوفاں ہو تو چہرے پر سکوں کب تک رہے

ذوق منزل ہے نہ تاباںؔ رہروی کا شوق ہی
موت کا سا موت سے پہلے سکوں کب تک رہے

تیرا دھیان جس وقت آ جائے نا
کوئی کام ہم سے کیا جائے نا

کچھ ایسا کرا ے جذبۂ شوقِ دل
کہ آ جائے تو پھر پیا جائے نا

میں تجھ میں ہوں تجھ بن جیا جائے نا
یہی غم کہیں جی کو کھا جائے نا

زمانے کے غم بھی اُٹھا لے گئے
مگر پیار کا دُکھ سہا جائے نا

کہا خوب تاباںؔ قطب شاہ نے
پیا باج پیالہ پیا جائے نا

تم بھی پیے ہوئے ہو نہ چھوڑو پلا کے ساتھ
آنکھیں ملا کے آنکھیں نہ پھیرو ادا کے ساتھ

بندوں کے ساتھ ہے نہ وہ بندہ خدا کے ساتھ
جس کا معاملہ ہے دلِ مبتلا کے ساتھ

جو دوست نے کیا ہے وہ دشمن نہ کر سکے
ایسا سلوک ایک خرابِ وفا کے ساتھ

اللہ ری بزمِ ناز کی صبر آزمائیاں
ہو آئے ہم بھی اس صبر آزما کے ساتھ

تم میرے ساتھ ساتھ نہ ہو بھی تو کیا ہوا
جبر جفا کا ذکر ہے صبر وفا کے ساتھ

کس طرح اس کا دامنِ دل ہاتھ آ سکے
دامن بچا بچا کے چلے جو صبا کے ساتھ

وہ آرہے ہیں جانِ بہاراں بنے ہوئے
تاباںؔ سلام کیجئے ان کو دُعا کے ساتھ

---

(۷) ڈنڈا غلام سرور نام، ڈنڈا تخلص، عام طور سے سرور ڈنڈا کے نام سے شہرت رکھتے ہیں، حیدر آباد وطن ہے، دکن کی دیہاتی زبان میں شعر کہتے ہیں اور ہر محفل میں ان کا کلام نہایت شوق اور ذوق سے سُنا جاتا ہے، غزل، نظم، گیت، ہر قسم کا کلام موزوں کرتے ہیں، ہنسی مذاق کے پیرائے میں بڑے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں عوام کے جذبات اور ماحول کی ترجمانی ان کی شاعری کا سرمایہ ہے، کالج آف فائن آرٹ سے پینٹنگ کا ڈپلوما حاصل کیا ہے، اس طرح شاعری کے ساتھ مصوری سے بھی واقف ہیں۔ اگرچہ ان کا اپنا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے مگر رسالوں اور اخباروں میں کلام شائع ہوتا اور پسند کیا جاتا ہے نمونہ پیش ہے:۔

گیت

(۱)

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

بھاگیہ رتی سے لے کر بھاگ متی تک   ممتا کے چاؤں سے مدھر متی تک

مست مراداں الوے تلوے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

جنتا کی سیوا میں تن من دھن سے   کبھی چھن چھن سے، کبھی کھن کھن سے

جنتا کی سیوا میں پاپڑ بھی بیلے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

اکھاڑے میں رُستم، اکھاڑے میں اندر   اپنے وقت کا تھا بانکا سکندر

گُن اس کے دُنیا سے نئے نویلے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

(۳)

اُردو زباں کا تھا پہلا وہ شاعر   تھا اپنے فن میں بھی یکتا وہ ماہر

غزل گیت اس کے رسیلے سُریلے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

(۴)

اُمیداں کے دن تھے مُراداں کے راتاں   ہندو مسلمن کے ہاتاں میں ہاتاں

دن ان کے بیتتے تھے سنہرے روپہلے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

بڑے گمتاں سے بڑے ارماناں سے   قطب شہ کی خاطر بصد دل و جاں سے

بنی صدقہ ڈنڈا بھی لکھیا سہیلے

قلی قطب بادشاہ تھے رنگ رنگیلے

رنگ رنگیلے بڑے چھیل چھبیلے

غزلیات کا نمونہ :-

جب دل میں آیا دُنیا میں کچھ نام کمانا
ہم سیکھ لیں انکھیاں سے کاجل کا چرانا

چورستے پو پہنچیں جو سیاست کی تو بولیں
اندھا ہوں مائی باپ جرا رستہ بتانا

تعریف سیاست کی صرف آتی ہے یارو
جس کوں بھی ملیا موقع انیں ڈھول جمانا

قانون نرالا چ ہے محفل میں ان کی آج
کمزور و ناتواں کو اُٹھ بیٹھ کرانا

جو اچھی بُری مانتے نیں چپکے اکڑتیں
ایسوں کو صبوں شام فقط ڈنڈا بجانا

ان کی وہ اوندھی چال ہے سو ہے	جینا اپنا محال ہے سو ہے
گاڑی ابنی الال ہے سو ہے	دل کو اپنے ملال ہے سو ہے
تھپیڑ ایسا انوُ رسید کریں	اب تلک سُرخ گال ہے سو ہے
ان کی قسمت میں مرغی اور مچھلی	میری قسمت میں دال ہے سو ہے
ایسے روشن زمانے میں ڈنڈے	ایلو اُلفت کا کال ہے سو ہے

دلِ ناداں سو یا مچلتے مچلتے	کریا ناک میں دم سملتے سملتے
میری اُمیدوں کی میرے ارماناں کی	پتنگ تھاپ کھا گئی سلکتے سلکتے
کبھی دم پور کھ کبھی دھونساں دیکر	میری جان لے رہیں مسلتے مسلتے
رہ عاشقی میں پرافنت تو دیکھو	میرے ساتھ چل رہیں سملتے سملتے

---

(۸) **سعید** | میر عابد علی نام، سعید تخلص، نواب شہید یار جنگ (جن کا تذکرہ اوراق گذشتہ میں ہو چکا ہے) کے فرزند، ۱۹۱۴ء میں حیدرآباد میں تولد

ہوئے، مدرسۂ عالیہ میں تعلیم پائی، حکومتِ آندھرا کے سررشتۂ آبکاری میں ملازم ہیں، بچپن سے شاعری کا شوق ہے، اولاً حضرت مسرور کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے، اب حضرت نجم آفندی سے مشورۂ سخن لیا کرتے ہیں۔ سعید غزل گوئی کرتے ہیں اور یہ ان کی طبیعت کے موزوں بھی ہے، ان کی غزل دردوغم، سوزوگداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے اور انداز بیان میں ندرت ہے۔ زبان میں صفائی، سادگی اور روانی کے ساتھ ساتھ دل کشی اور ترنم بھی ہوتا ہے۔ مشاعروں میں ان کے کلام کو بڑی داد ملتی ہے اور اکثر ریڈیو میں بھی پروگرام ہوتا ہے، کلام کا نمونہ پیش ہے:۔

تری محفل میں آنا چاہتا ہوں — تڑپنے کا بہانہ چاہتا ہوں
زمانہ جس کا ہو کر رہ گیا ہے — اسے اپنا بنانا چاہتا ہوں
سُنا صیّاد کچھ حالِ نشیمن — قفس میں گنگنانا چاہتا ہوں
سمٹ آتے ہیں سجدے دو جہاں کے — جہاں مَیں سر جھکانا چاہتا ہوں
اسی کی یاد وجہ زندگی ہے — اسی کو بھول جانا چاہتا ہوں
ابھی کچھ اور غم دے، غم کے مالک — ابھی میں مسکرانا چاہتا ہوں
سعید آواز دے بجلی کو بڑھ کر — نشیمن پھر بنانا چاہتا ہوں

اجل ہر بار رستہ روکتی ہے
خدا جانے کہاں کی دشمنی ہے

ترے آنے کی کچھ اُمید بھی ہے
ستاروں میں ابھی کچھ روشنی ہے

چلو میں بھی کسی کے کام آیا
مرا غم آج کل ان کی خوشی ہے

جہاں میں ہوں وہاں ہے ذکر تیرا
جہاں تُو ہے وہاں میری کمی ہے

خدا جانے کہاں ہے آشیانہ
جہاں تک دیکھتا ہوں روشنی ہے

طلبگارانِ ساحل یاد رکھیں
لب ساحل بھی کشتی ڈوبتی ہے

کوئی پہچاننے والا نہیں اب
بہار اک اک کی صورت دیکھتی ہے

بُجھا کے آگ نشیمن سے کام لے لوں گا
غرور برق سے یوں انتقام لے لوں گا

تجھے بغیر تکلّف پکار سکتا ہوں
میں خود کو بھول کر بھی تیرا نام لے لوں گا

ہزار روکیں مجھے جاگتے ہوئے فتنے
میں ان کی آنکھوں سے اپنا پیام لے لوں گا

ابھی تو آنکھوں سے پیتا ہوں مجھ کو پینے دے
میں پھر کبھی ترے ہاتھوں سے جام لے لوں گا

ہجوم غم کو ہٹانا پڑے گا جب بھی سعید
بس ایک موجِ تبسّم سے کام لے لوں گا

سرِ شام میری آہوں کی روش بدل نہ جائے
وہ دیئے جلا رہے ہیں کہیں ہاتھ جل نہ جائے

یہ جو تم بدل رہے ہو، ذرا سوچ لو سمجھ لو
کہ تمہیں بدل کے دُنیا کہیں خود بدل نہ جائے

اگر ایک بار سن لے تو سعید کی غزل بھی
ترے دل سے زندگی بھر خلشِ غزل نہ جائے

---

(۹) شاذ تمکنت

سیّد مصلح الدین نام، شاذ تمکنت تخلّص، ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے اولاً سٹی کالج میں تعلیم پائی، پھر ایوننگ کالج سے استفادہ

کیا۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۴۸ء پولیس ایکشن کے بعد ہوا۔ شاعری کی منزلیں جلد جلد طے کرلیں، اب ایک اچھے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ تر نظم موزوں کرتے ہیں۔ غزل سے بھی لگاؤ ہے۔

ان کی نظموں میں رازِ حیات کی جستجو، زندگی کی اُلجھنوں کو معلوم کرنے کی کوشش نظر آتی ہے، حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے تعلق ہے۔ ڈرامہ اور گیت بھی لکھا کرتے ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے

آب و گِل

مجھے یاد پڑتا ہے اک عمر گذری
لگاوٹ کی شبنم میں لہجہ ڈبو کر
کوئی مجھ کو آواز دیتا تھا اکثر
بلاوے کی معصومیت کے سہارے
میں آہستہ آہستہ پہنچا یہاں تک
یہ ہر سمت انبوہ آوارگاں تھا
بڑے چاؤ سے میں نے اک اک سے پوچھا
کہو کیا تم ہی نے پکارا تھا مجھ کو
کہو کیا تم ہی نے پکارا تھا مجھ کو
مگر مجھ سے انبوہ آوارگاں نے
ہراساں ہراساں، پریشاں پریشاں
کہا صرف نہیں، وہ نہیں تم
ہمیں بھی بُلا کر کوئی چھپ گیا ہے

خلوت

وا کرو کاسنی گل پوش دریچے جاناں
چاپ کرنوں کی چلی آتی ہے دھیرے دھیرے
تم بھی پردہ نہ کرو، میں بھی تکلّف نہ کروں
چاند چُپ چاپ چلا آئے گا آ جانے دو
جانے کیا کہتا ہے دیکھیں تو سفیرِ شبِ تاب
کیسے کھِل اُٹھتے ہیں اسکے لب و عارض کے گلاب
کیا دُعا دیتا ہے اس دولتِ یکجائی پر!

غزل

صبح کیوں اتنی بھلی ہے مجھے معلوم نہ تھا
عمر کی رات کٹی ہے مجھے معلوم نہ تھا
خیرِ شبنم و گل کب تھی جنوں سے پہلے
کون کس درجہ دکھی ہے مجھے معلوم نہ تھا
آخر آخر غم و شادی سے جُدا ہونا تھا
عشق قسمت کا دھنی ہے مجھے معلوم نہ تھا

شدتِ یاس میں جینے کی دُعا پاتا ہوں آج تک حُسن وہی ہے مجھے معلوم نہ تھا
تار تار آج وہ سوغاتِ چمن لایا تھا دامنِ شاذ تہی ہے مجھے معلوم نہ تھا

عیسیٰ نفسو ہم کو دوا کیوں نہیں دیتے مٹنے کی تمنا ہے، مٹا کیوں نہیں دیتے
کیوں شمع سرِ رہگذرِ باد جلی ہے یہ رسمِ وفا ہے تو اُٹھا کیوں نہیں دیتے
اس یوسفِ کنعانِ تصور سے کہو شاذ کس شہر میں ہو اپنا پتا کیوں نہیں دیتے

---

(۱۰) شارب

منوہر لال نام اور شارب تخلص، حیدر آباد کے ایک قدیم کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے، روایات خاندانی کے مطابق اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پائی، اس کے بعد ہائی اسکولوں سے استفادہ کیا، سررشتۂ زراعت میں ملازم ہیں، شاعری کا ذوق فطری ہے، غزل، رُباعی، نظم سب کچھ لکھا کرتے ہیں اولاً نرسنگ پرشاد سے تلمذ رہا پھر عبدالباقی شطاری کے شاگردوں میں شامل ہوتے۔

ان کی غزلوں میں سوز و گداز بھی ہوتا ہے، غمِ دوراں کا تذکرہ بھی، شارب دکھنی کلچر کے نمونہ تھے۔ ہر مکتبِ خیال سے اپنا کلام سُنا کر دادِ تحسین حاصل کرتے، جو محسوس کرتے اس کو اپنے کلام میں پیش کرتے تھے، چونکہ تخلص شارب ہے۔ اس لیے غزل میں جام و سبو، مے و مینا کا ذکر معنی خیز انداز میں کرتے ہیں۔ افسوس ہے ابھی حال ۱۹۶۲ء میں ان کی زندگی کا جامِ حیات ٹوٹ گیا۔

دل اب شائستۂ درد و الم ہے ستم میں بھی اِک اندازِ کرم ہے
محبت کی نہیں ہے کوئی منزل یہاں ہر اِک قدم پہلا قدم ہے
ہے ازراہِ تکلف پُرسشِ غم ستم اور کس سلیقے کا ستم ہے
بھلائے دل نے دنیا کے سبھی غم مگر اب تک جواں اک نیرا غم ہے
خلوص میکشی کس میں ہے ساقی غنیمت ایک بس شارب کا دم ہے

گلشن گلشن، صحرا صحرا دیوانے مشہور ہوئے
ایک حقیقت تھی اور کتنے افسانے مشہور ہوئے

ایک تری چاہت نے مجھ کو عالم عالم بھٹکایا
ایک مری وحشت سے کتنے ویرانے مشہور ہوئے

ہائے رے یہ دستورِ محبت، ہائے رے یہ آئینِ وفا
شمع بیچاری جلتی رہی اور پروانے مشہور ہوئے

ایک ذرا پینے نے کتنا شارب کو بدنام کیا
شارب کے پینے سے کتنے مےخانے مشہور ہوئے

چمن چمن میری زندگانی، کلی کلی پر مری جوانی
کہاں نہیں ہے مری کہانی، کہاں نہیں ہے مرا فسانہ

کوئی بلندی ہو کوئی پستی بہر قدم ایک رقصِ مستی
رُکوں تو رُک جائے نبضِ ہستی چلوں تو چلنے لگے زمانہ

نہ ہم ہیں ہندو، نہ ہم مسلماں، ہمارا مذہب ہے درد انساں
عطا ہوا ہم کو نورِ ایماں مگر یہ اندازِ کافرانہ

شرابیوں کے امام شارب یہ تیرا اعزاز، کلام شارب
چلے یونہی دورِ جام شارب کہ رُک نہ جائے کہیں زمانہ

فرق داماںوں میں باقی نہ گریبانوں میں
اب کے اس طرح بہار آئی گلستانوں میں

صحنِ گلشن سے جو رہ رہ کے دھواں اٹھتا ہے
کوئی صیاد بھی شامل ہے نگہبانوں میں

ہائے نیرنگیٔ رفتارِ زمانہ مت پوچھ
کتنے اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانوں میں

آگہی عشق کی تکمیلِ طلب ہے شاید
اک تامل سا ابھی ہے ترے دیوانوں میں

زمزم و کوثر و تسنیم کے چشمے پھوٹے
دی اذاں جھوم کے رندوں نے جو میخانوں میں

کافروں میں ہے ترے دین کی شہرت شارب
اور ترے کفر کے چرچے ہیں مسلمانوں میں

رُباعی

ہر جلوہ مقابل نظر آتا ہے مجھے
ذرہ بھی تو منزل نظر آتا ہے مجھے
فیضانِ غمِ یار کے قربان جاؤں
ہر پھول میں اک دل نظر آتا ہے مجھے

درد اٹھے تو پہلو میں دبا لیتا ہوں — اشک امڈیں تو پلکوں میں دبا لیتا ہوں
کھل جائے نہ ساقی کی عنایت کا بھرم — میں جام تہی لب سے لگا لیتا ہوں

---

(۱۱) طالب

سید محمد قطب الدین حسن رزاقی نام اور طالبؔ تخلص، آپ کے والد لکھنؤ سے آکر حیدرآباد میں بس گئے اور یہاں ہی شادی کرلی طالبؔ کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۳۱ء کو ہوئی، آپ اردو کے مشہور ادیب انشاء پرداز اور صوفی بزرگ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے بھتیجے ہیں، طالبؔ کو عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی میں بھی مہارت ہے، طالبؔ فنِ شعر سے بخوبی واقف ہیں۔ علامہ حیرتؔ بدایونی سے تلمذ حاصل کیا۔ مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے نوجوان شعراء میں طالبؔ کو خاص مقام حاصل ہے۔ آپ کے کلام میں تخیل کی بلند پروازی، احساسات کی ندرت اور موسیقیت پائی جاتی ہے اگرچہ کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے مگر معیاری رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا اور پسند کیا جاتا ہے، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بھی طالبؔ کو دادِ سخن ملتی ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

غمِ حیات کو جی بھر کے پیار کرلینا — یہ جبر جبر سہی اختیار کرلینا
حسابِ مہر و وفا ہم سے مانگتے کیا ہو — شمار میں اگر آئے شمار کرلینا
خزاں کا ظلم و ستم حد سے جب گزر جائے — یقینِ آمدِ فصلِ بہار کرلینا
خزاں رسیدہ چمن میں بہار لے آؤں — تم اتنی دیر ذرا انتظار کرلینا

وہ ایک یاس کہ جس سے ڈرا رہے ہو مجھے — وہ ایک یاس بھی راس آگئی تو کیا ہوگا
نگاہِ شوق کو پیہم نہ دیجیے دعوتِ دید — نگاہ اس سے بھی اکتا گئی تو کیا ہوگا
سنور سنور کے نہ آؤ کہ سادگی دل کی — تکلفات سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے تدبیر ہماری خام نہیں
فریاد سے ہم کو کیا مطلب، فریاد ہمارا کام نہیں

بے تاب نہ ہوں کیوں دیوانے بے چین نہ ہوں کیوں پروانے
یہ دل کے دھڑکنے کی ہے صدا آوازِ شکستِ جام نہیں

توہینِ خرد ہے رُک جانا، تحقیرِ خودی ہے جُھک جانا
ہر گام پہ سجدہ کر لینا خوددار جبین کا کام نہیں

اربابِ سخن جھوم اُٹھتے ہیں اشعار مرے سُن کر طالبؔ
یہ فکر و نظر کی کاوش ہے عرفان نہیں، الہام نہیں

وہ قافلے جو اپنی جسارت کے بل گئے — آگے نکل گئے، بہت آگے نکل گئے
ساقی سے جب نگاہ ملی دَور چل گئے — شکوے تمام شکر کے سانچے میں ڈھل گئے
انسانیت پہ جن کو بڑا ناز تھا کبھی — افسوس ہے کہ آج وہ انساں بدل گئے

زندگی سے مجھے کیوں پیار ہے کیا عرض کروں
زندگی کتنی طرحدار ہے کیا عرض کروں

غمِ جاناں ہے ادھر اور غمِ دوراں ہے ادھر
کس دوراہے پہ دلِ زار ہے کیا عرض کروں

ان کا اور ان کے اشاروں کا سمجھنا اب بھی
سہل ہوتے ہوئے دشوار ہے کیا عرض کروں

کس کو انصاف نے دی طوق و سلاسل کی سزا
کون مجرم ہے، گنہگار ہے کیا عرض کروں

ذکرِ دل، ذکرِ وفا، ذکرِ محبت طالبؔ
طبعِ نازک پہ گراں بار ہے کیا عرض کروں

لب ترستے رہے جامِ مے کے لیے، دل تڑپتا رہا بے خودی کے لیے
ہائے کیا وقت ہے ظلمتوں سے ہمیں ربط رکھنا پڑا روشنی کے لیے

رقص و رم بھی نہیں کیف وکم بھی نہیں پیچ و خم بھی نہیں درد و غم بھی نہیں
موت کی سی فضا تابہ کے تابکجا آئیے کچھ کریں زندگی کے لیے
کچھ پتہ ہے تجھے کیا ہے رنگِ جہاں کچھ خبر ہے تجھے تیرے طالب یہاں
مُسکراتے ہوئے کتنے غم سہہ گئے اے صنم ایک تیری خوشی کے لیے

---

(۱۲) قمر سیّد علی رضا نام، قمر ساحری کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، ۱۹۲۷ء میں حیدر آباد میں تولد ہوئے، حکومت آندھرا میں ملازم ہیں، حیدر آباد کے ترقّی پسند شعراء میں خاص مقام رکھتے ہیں، بزم سعدی کے نام سے فارسی کی ترقی کے لیے ایک انجمن قائم کی ہے، ہر ماہ اس بزم کی جانب سے جلسہ ہوتا ہے جس میں ایک مقالہ کی سماعت کے بعد فارسی طرحی مشاعرہ ہوتا ہے، قمر ساحری کا کلام معیاری رسالوں میں شائع ہوتا ہے، مشاعروں میں بھی دادِ تحسین حاصل کرتا ہے، ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ان کا انقلابی رنگ ہے۔ تخیل میں بلندی اور افکار میں گہرائی ہوتی ہے۔

اینگلو امریکن بلاک

چند مشہور دماغوں کی سیاسی محفل — جس میں احساس تخیّل ہے کچھ کچھ بھی نہیں
آفتابوں کی شعاعوں پہ حکومت ہے مگر — ظلمتِ شب کو مٹا دینے کا حل کچھ بھی نہیں
رات دن شدّتِ افلاس کا غم ہے لیکن — نرم ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہیروں کے ایاغ
تاج شاہی کی عقیدت کو بسائے دل میں — فکر جمہور میں ہر وقت پریشاں ہیں دماغ
یہی آزادیٔ انساں کے پرستار دماغ — فکر میں ہیں کہ کریں سب پہ حکومت کیونکر
جو ہری بم کو چھپائے ہوئے سینوں میں بھی — سوچتے ہیں کہ کریں امن کی خدمت کیونکر
یہی انصاف و صداقت کے مقدس پیکر — پھول ہونٹوں پہ تو سینوں میں شرر رکھتے ہیں
یوں تو ہمسایہ ممالک سے محبت ہے مگر — نقشۂ جنگ پہ ہر وقت نظر رکھتے ہیں
رات کو دل میں چھپائے ہوئے سورج کا غرور — ایک منزل پہ یقیناً یہ بھرم کھودے گا
کرنیں برسائے گا اس طرح سحر کا پرچم
وقت تاریخ کے ماتھے کا لہو دھودے گا

غزلیات کے اشعار

فلک پہ ارضِ درخشاں کی بات ہوتی ہے
کہاں کہاں غمِ انساں کی بات ہوتی ہے

چٹکنے لگتی ہیں دامن میں خون کی کلیاں
قفس میں جب بھی گلستاں کی بات ہوتی ہے

نہ جانے ہوش کیوں اہلِ خرد کے اڑتے ہیں
کبھی جو اپنے گریباں کی بات ہوتی ہے

یہ رہ گزارِ جنوں ہے ہوس پرست یہاں
قدم قدم پہ دل و جاں کی بات ہوتی ہے

کبھی کبھی تو سُلگتے ہیں چاندنی کے ایاغ
کبھی کبھی دلِ ناداں کی بات ہوتی ہے

کہاں کہاں لیے پھرتی ہے میرا خون صبا
کہ دشت میں بھی گلستاں کی بات ہوتی ہے

یہ میکدہ تھا یہاں دل میں پھول کھلتے تھے
یہاں بھی اب غمِ دوراں کی بات ہوتی ہے

ہمارے خواب جہاں جرم تھے وہیں یہ قمر
ہمارے حالِ پریشاں کی بات ہوتی ہے

جلوۂ یار تماشا ہے، تماشا بھی نہیں
ایسے دیکھا ہے کہ دیکھا بھی ہے دیکھا بھی نہیں

سچ تو یہ ہے کہ کسی نے اسے سمجھا بھی نہیں
زندگی خواب ہے دیوانے کا ایسا بھی نہیں

کتنا بے برگ و نوا ہے یہ جہانِ امروز
حُسنِ یوسف بھی نہیں حُسنِ زلیخا بھی نہیں

کیا قیامت ہے کہ سودائے گہران کو ہے
جن کو طوفان سے لڑنے کا سلیقہ بھی نہیں

ایک بے نام سا عالم ہے سنبھل کر چلیئے
رات گہری بھی نہیں صبح کا دھوکہ بھی نہیں

کل یہ غم تھا کہ نگاہوں میں کہیں دھوپ نہ تھی
اب یہ غم ہے کہ کہیں دھوپ میں سایہ بھی نہیں

اور کچھ دیر ٹھہر اور یوں ہی سروِ رواں
ہم نے جی بھر کے تجھے پیار سے دیکھا بھی نہیں

(۱۳) قیصر

سید مظہر حسین نام، قیصر تخلص، ۱۹۲۸ء میں تولد ہوئے، جامعہ عثمانیہ سے ایم، اے، ایل، ایل، بی کی ڈگری حاصل کی اگرچہ قیصر کی شاعری کی عمر زیادہ نہیں مگر ان کی شاعری نے اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے جوان ترقی پسند شاعروں میں اپنا مقام بنالیا ہے، نظم اور غزل دونوں کہتے ہیں، ہندی کے رس بھرے الفاظ کو بڑی خوبی سے اردو میں استعمال کرتے ہیں، جس کے باعث ان کی شاعری میں ایک خاص اثر پیدا ہوجاتا ہے مشاعروں میں اپنا کلام سُناتے اور داد پاتے ہیں۔ اب

بمبئی کے ہفتہ وار اخبار دورحیات کے ایڈیٹر ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

دردِ تنہائی

رات خاموش ہے تاروں کے دیئے بھی کم ہیں
پھیلتی جاتی ہے ہر سمت کُہر کی چادر
نیند کی گود میں سویا ہے گھنا سنّاٹا
آسماں چُپ ہے، زمیں چُپ ہے، فضا بھی چُپ ہے
آسمانوں کی بلندی پر خُدا بھی چُپ ہے

زرد رو چاند سرِ شاخ، شجر نوحہ کناں
ٹوٹتی رات کے آنسو کو گُہر کون کہے
راکھ کے ڈھیر کو انوارِ شرر کون کہے

رات خاموش ہے تاروں کے دیئے بھی کم ہیں
دور پھیلے ہوئے پیڑوں کی گھنی شاخوں سے
چاند کی کرنیں دبے پاؤں اُتر آئی ہیں

جانے کس سمت سے یہ کیسی صدا آتی ہے
جیسے دیتا ہو کوئی دور سے مجھ کو آواز

یہ کہیں میری تمناؤں کی حسرت تو نہیں
یہ کہیں میرے حسیں خواب کی مورت تو نہیں
یہ مری کھوئی ہوئی چاند سی صورت تو نہیں

ڈھلتی رات

یہ ڈھلتی رات کا ہنگام، یہ فسردہ سماں
یہ جاں بہ لب مہ وانجم یہ چاندنی کا دھواں
بُجھا بُجھا سا نظر آ رہا ہے سارا جہاں

قمر کا خون کنارِ فلک پہ پھیل گیا
افق پہ دور ستاروں سے آگ گرتی ہے
فضا خموش ہے اک سرد لاش کے مانند
ہُوا سیاہی کے پرچم اُڑاتی پھرتی ہے
مہیب پیڑوں پہ سویا ہُوا ہے سنّاٹا
شکستِ شب کی کراہوں کو اپنے دل میں چھپائے
فرازِ کوہ سے تاریکیاں اُترتی ہیں
چلے بجھے ہوئے میداں پہ اپنے پر پھیلائے

طویل نظم ہے، غزلیات کا نمونہ پیش ہے۔

دل معصوم نے ہر چیز کو عریاں سمجھا
پھول کو پھول، گلستاں کو گلستاں سمجھا

ہم سے کیا پوچھتے ہو قصۂ بیدادِ جنوں
ان کے دامن کو بھی اپنا ہی گریباں سمجھا

مجھ سا احساس جواں کوئی کہاں سے لائے
ہم نے بے مہریٔ یاراں کو بھی احساں سمجھا

ایسا بھی ظلم ہم پہ خدارا نہ ہو کہیں
اس کے بغیر دل کا گذارا نہ ہو کہیں

بس اے نشاط نام ہمارا نہ ہو کہیں
لہجہ بدل کے غم نے پکارا نہ ہو کہیں

چمکا ہے میرا چاند بڑی مدتوں کے بعد
یہ انقلاب صبح کا تارا نہ ہو کہیں

یوں غم تو اور بھی ہیں مگر تیرا ایک غم
یہ غم ہی ہم کو جان سے پیارا نہ ہو کہیں

کنول

کنول پرشاد کنول، اگرچہ ان کا تعلق دکن کے ساتویں دور سے ہے مگر چونکہ ان کی شاعری زیادہ تر پولیس ایکشن کے بعد پختہ ہوگئی اس لیے کنول کا تذکرہ آندھرا میں کیا جاتا ہے اور اردو ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں، نظم اور غزل دونوں موزوں کرتے ہیں، ان کی نظموں میں حلاوت اور شیرینی پائی جاتی ہے، گیت بھی لکھا کرتے ہیں۔ کلام میں اثر اور درد بھی ہوتا ہے، کنول کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر اس کو نستعلیق خط میں لکھیں تو اردو اور ناگری رسم خط میں لکھیں تو ہندی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ کنول کی پیدائش ۱۹۲۱ء میں ہوئی اور ۱۹۵۴ء میں جامعۂ عثمانیہ سے بی، اے کی ڈگری لی، دفتر اطلاعات میں اولاً مددگار ناظم اور پھر رسالہ آندھرا پردیش کے اڈیٹر بنے، اب صرف اس کے ہندی اڈیشن کے اڈیٹر ہیں۔

مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

میں راہی ہوں ایک اکیلا
گھیرے رہتا راہ کو جس کی ہر دم طوفانوں کا ریلا
تم اپنے دھندلے دن دیکھو میری ڈھلتی شام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

تھک کر چور ہوا جاتا ہوں

جتنا چلتا ہوں منزل سے اتنا دور ہوا جاتا ہوں
اُجڑے گھر میں۔ بسنے والو میرا اُجڑا گھر نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

سانجھ سویر رونے والو
جینے کے پیچھے مر مر کر اپنا جیون کھونے والو
اپنے اُلجھے دھندے دیکھو میرا اُلجھا کام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

آزادی کا دیوانہ ہوں
انگاروں سے کھیلنے والا اک البیلا پروانہ ہوں
تم تو بندھن میں جکڑے ہو آزادی کے دام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

"نذر یارانِ وطن"

جسے تم یاد میں اپنی تڑپتا چھوڑ آئے ہو
تمہاری نذر اُس بھولے وطن کا نام لایا ہوں
جلی جاتی ہے اُجڑی کوکھ کے شعلوں میں جو ہر دم
اسی ارضِ دکن کا دوستو پیغام لایا ہوں
سکوتِ بزمِ رنداں، وحشتِ ساقی و میخانہ
میں اپنے ساتھ بے کیفیِ شعر و جام لایا ہوں
جو چھائی کوٹتا ہر ایک بزمِ شعر سے گذرے
وہ خاموشی میں کفنایا ہوا کہرام لایا ہوں
قیامت تک نہ ڈھل پائیں گے جن کے نقش آنکھوں سے
وہ حسنِ صبح لایا ہوں وہ رنگِ شام لایا ہوں
میں دیکھوں گا کہ اب کن کن سے تم آنکھیں چراؤ گے
شبِ عثمان ساگر صبحِ باغِ عام لایا ہوں

اُلجھ کر جن میں پل کو اپنا آپا بھول جاؤ گے
کچھ ایسے ساتھ یادوں کے سنہرے دام لایا ہوں

دکن کی مدھ بھری بولی کے رنگا رنگ پھولوں میں
میں کالی داس کا رس بادۂ خیّام لایا ہوں

اٹھاؤ اپنی نظریں پی سکو تو ان کو پی جاؤ
بھری آنکھوں میں الفت کے چھلکتے جام لایا ہوں

جدا جس چاک نے دامن کو کر ڈالا گریباں سے
اسے سانسوں سے سینے کا کٹھن اک کام لایا ہوں

غزلوں کے چند شعر:۔

نظر میں بجلی، نفس میں طوفاں یہ حال کیسا ہے بندگی کا
بڑھے جو یہ روگ اور کچھ تو خدا ہی حافظ ہے خواجگی کا

ستم سہے ہیں ہزار لیکن یہ انتہائے ستم نہ پوچھو
کہ ذکر کرنا بھی جرم ہے اب چمن میں پھولوں کی دوستی کا

گلے لگایا تھا گُل سمجھ کر تو خار کی طرح چھید ڈالا
کُچل دیا دل ہی بن کے دلبر عجب ہے یہ ڈھنگ دلبری کا

ترے بغیر بہاروں میں گنگنا نہ سکے
گھٹا اُٹھی پہ کبھی جام تک اُٹھا نہ سکے

ہے اب وجود ہی اپنا وہ نالۂ خاموش
تڑپ کے دل سے جو نکلے لبوں تک آ نہ سکے

تمام عمر کٹی آسماں کے سائے میں
کسی بھی شاخ پہ ہم آشیاں بنا نہ سکے

نہ جانے کہہ دیا کیا اپنی چشمِ ویراں نے
جو ہنسنے آتے تھے ہم پر وہ مسکرا نہ سکے

غرور دھول میں نغموں کا مل نہ جائے کنولؔ
غزل نہ چھیڑ جو دل تک اُنھیں بُلا نہ سکے

---

(۱۵) مرزاؔ

مرزا شکور بیگ نام، مرزاؔ تخلص، حیدرآباد میں تولّد ہوئے، ان کے اجداد شمالی ہند سے آ کر یہاں بس گئے تھے، مرزا نے

جامعۂ عثمانیہ سے بی اے، ایل، ایل، بی کی ڈگریاں حاصل کیں، طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر کہتے ہوئے خاصے مشہور ہو گئے تھے، تعلیم ختم کر کے ضلع ورنگل میں وکالت شروع کی، وکالت میں بھی نام پیدا کیا، ایڈوکیٹ تھے اور پھر مجلس مقننہ کے رکن منتخب ہو گئے۔

مرزا شکور بیگ کی شاعری تمامتر طنز و مزاح کا مجموعہ ہوتی ہے، اس میں طنز کے نشتر اور مزاح کی چاشنی ہوتی ہے، شعر و سخن کی محفل میں جب مرزا صاحب اپنا کلام اپنے خاص انداز میں تحت اللفظ سُناتے ہیں تو ساری محفل پر زندہ دلی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

انھیں درپیش جب کوئی بہت دشوار کام آیا
بُلاوے کا ہمارے نام لاسلکی پیام آیا

سفارش اور رشوت چل رہی ہے بزم ساقی میں
ترستے رہ گئے مخلص نہ ان تک دورِ جام آیا

ملی فرصت نہ اپنے عقد کی بیچارے قاضی کو
مگر یہ کام کیا کم ہے کہ وہ اوروں کے کام آیا

پڑی ہے آج کل عاشق کی صحت ایسے چکّر میں
گیا نزلہ، ہوئی کھانسی، گئی کھانسی، زکام آیا

وکالت کر کے گم نامی کی حالت میں رہے مرزاؔ
پلیڈر سے بنے لیڈر تو اخباروں میں نام آیا

لب پہ ہے ایمان داری دل کی مکّاری کے ساتھ
دشمنی گھُل مِل گئی ہے ان دنوں یاری کے ساتھ

یہ عنایت ہے کہ زحمت، زندگی ہے یا عذاب
ان کی ہمدردی بھی جاری ہے دلآزاری کے ساتھ

دید کے قابل ہے ہمدم یہ تضادِ قول و فعل
امن کا پرچار بھی چالو ہے بمباری کے ساتھ

کام کا ہے شور لیکن کام چلتا ہی نہیں
سرد مہری بھی ہے قائم گرم بازاری کے ساتھ
بے سبب "انسلٹ" کر کے یار نے "ساری" کہا
اپنی تھوڑی سی جو عزت تھی گئی ساری کے ساتھ

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے
ہم تاپتے رہیں کہیں ایسا نہ کیجئے
کچھ دیر سُن کے خونِ تمنا کی داستاں
یہ مشورہ دیا کہ تمنا نہ کیجئے
دینی ہو جو سزا وہ دیا کیجئے مگر
پبلک کے سامنے ہمیں رسوا نہ کیجئے
ہم مر گئے تو آپ پر آخر مرے گا کون
کہتے ہیں اس لیے ہمیں کوسا نہ کیجئے
بیزار ہو کے یار نے مرزا سے یہ کہا
یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھا نہ کیجئے

قطعات وغیرہ :-

مچلتے دل کو بہلانا پڑے گا
کیے پر اپنے پچھتانا پڑے گا
اگر مرزا کی آہوں میں ہے تاثیر
انھیں جھک مار کر آنا پڑے گا

زبردستی کا شاعر ہوں خوشی کے گیت گاتا ہوں
بُرا کیا ہے جو تک بندی سے روتوں کو ہنساتا ہوں
نظر آتی ہے جب اِک مردنی سی بزمِ یاراں میں
سمجھ داروں کا کہنا ہے میں اکثر یاد آتا ہوں

موٹر ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے
سب کچھ ملے خسر کی طرف سے مگر ملے
ہے جس کے دل میں درد وہ انساں نہیں ملا
لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے

فصلِ گل نے گلشن نے آگ بھی لگائی ہے
اب جنوں میں اپنوں سے خنجر آزمائی ہے
غیر کی غلامی میں ہم تباہ تھے لیکن
اپنی حکمرانی میں جان پر بن آئی ہے

(۱۶) سعادت نظیر

سعادت نظیر المتخلص بہ نظیر، والد کا نام محمد محسن خاں متین تخلص، نوجوان شاعر ہیں، جامعۂ عثمانیہ میں تعلیم پائی۔ ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور ٹریننگ کا ڈپلوما بھی رکھتے ہیں۔ سررشتۂ تعلیمات میں ملازم ہیں، شاعری کا شوق گویا ورثہ میں ملا ہے، ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرتے ہی بھائی اور بہنوں کی پرورش کا بوجھ ان کے ناتواں کندھوں پر آپڑا۔ جوان ہمت، ثابت قدم نظیر نے ایک طرف ٹیوشن کے ذریعہ اپنی اور بھائی بہنوں کی پرورش کی، دوسری طرف اپنی تعلیم جاری رکھی اور اعلیٰ امتحان پاس کر لیے۔ اصنافِ سخن کے تمام نوع میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مشاعروں میں حصہ لیا کرتے، معیاری رسالوں میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے، نظیر کے کلام کے چھوٹے چھوٹے کئی حصے شائع ہو گئے ہیں جو "آب و تاب" "نویدگل" اور "پھول کلیاں" کے ناموں سے موسوم ہیں، نظیر کے کلام میں روانی، شگفتگی اور تخیل کی پرواز پائی جاتی ہے، سوز و گداز سے کلام میں اثر پایا جاتا ہے۔ جیسے جیسے مشق زیادہ ہوگی، کلام میں پختگی آتی جائے گی۔ نوجوان شاعروں میں سعادت نظیر کو خاص مقام حاصل ہے، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

حرفِ تمنّا

میرے موضوعِ حسیں، جانِ چمن، جانِ بہار
چاند تاروں کی ضیا، چمپئی کلیوں کا نکھار

جی میں آتا ہے کلیجے میں چھپا لوں تجھ کو
اپنے ارمانوں کی بستی میں بسا لوں تجھ کو

عمر بھر بزمِ تصوّر میں مرا کوئی نہ ہو
دل کی گہرائیوں میں تیرے سوا کوئی نہ ہو

ربط اتنا ہو تو ہی تو مری دمساز رہے
میرے ہر تارِ نفس میں تری آواز رہے

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں نغمے لکھوں
غمِ دوراں جو بھلا دیں وہ ترانے لکھوں

تغیّر

جب شعور آیا نئے سر سے زمانہ بدلا
تال سُر بدلے، نوا بدلی، زمانہ بدلا

رنگِ محفل کو ابھی اور بدلنا ہوگا
جیسے امروز نے ماضی کا فسانہ بدلا

ادائے زلف برہم ہے خیالات پریشاں میں
غمِ جاناں بھی شامل ہو گیا غم ہائے دوراں میں

ہزاروں بجلیاں ہیں خندہ ہائے گُل میں پوشیدہ
نشیمن دیکھئے کس کس کا جلتا ہے بہاراں میں

نظیرؔ خستہ کامل ہو جو ذوقِ آبلہ پائی
تو ہر کانٹا شگفتہ پھول بن جائے بیاباں میں

چوٹ پر چوٹ دل نے کھائی ہے — لذّتِ درد تازہ پائی ہے
موت کیفیتِ سکوں کا ہے نام — اِک مسافر کو نیند آئی ہے
ان سے اُمید اور وفا کی نظیرؔ — جن پر الزامِ بے وفائی ہے

دم گُھٹا جاتا ہے فریاد کروں یا کروں — ہم قفس شکوۂ صیّاد کروں یا نہ کروں
اب مرے حال پہ ان کو بھی ترس آتا ہے — سوچتے ہیں ستم ایجاد کروں یا نہ کروں
جب چمن اور قفس دونوں برابر ٹھہرے — ذکرِ بے مہریٔ صیّاد کروں یا نہ کروں

---

(۱۷) ناصر

ناصرؔ۔ کرنول وطن، جامعۂ عثمانیہ سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ویلوک وردھنی کالج میں اردو کے لکچرار ہیں، شاعری کا شوق بچپن سے ہے نظم اور غزل دونوں موزوں کرتے ہیں، کلام میں بلندی، گہرائی شگفتگی اور روانی پائی جاتی ہے، مشاعروں میں آپ کا کلام پسند کیا جاتا ہے اور دادِ تحسین ملتی ہے، اگرچہ اب تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا؛ مگر خاصا کلام جمع کر لیا ہے ناصرؔ کو مولانا ڈاکٹر عبدالحق (جنوبی ہند) کی رہبری میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، اس طرح ان کی شاعری کو ایک بلند مرتبہ ادیب کی صحبت نے بڑی جلا دے دی ہے۔

زندگانی ہے مسلسل اضطرار — شکریہ اے گردشِ لیل و نہار
ان کی نفرت پہ بھی الفت کا گماں — اے دلِ ناداں برنگِ اعتبار
انتظارِ لطفِ ساقی تابکے — چھین لے ساغر کو بڑھ کے بادہ خوار

نہ پوچھو گردشِ ایام سے کیا کیا ستم گذرے
مگر اک ہم ہی تھے جو بے نیاز رنج و غم گذرے

کبھی بھی کاروانِ زندگی ٹھہرا، نہ ٹھہرے گا
ہزاروں منزلیں آئیں ہزاروں پیچ و خم گذرے

نشیمن نذرِ آتش، پھول افسردہ، کلی پامال
بہاروں ہی کے ہاتھوں کچھ نہ پوچھو کیا ستم گذرے

اجل کی آرزو ہے اور نہ جینے کی ہوس باقی
بتا اے زندگانی کون سی منزل سے ہم گذرے

خدا ہی جانے کیا گذری ہے مے خانے پہ اے ناصر
کہ راہِ مے کدے سے جھومتے شیخِ حرم گذرے

برہم ملے، اداس ملے، چشم تر ملے
ہر چند چاہتے تھے نہ ملنا، مگر ملے

منزل کا کیا ملے نہ ملے، رہ گذر ملے
رہبر نہ مل سکے تو کوئی ہم سفر ملے

ہے مضطرب نگاہ کہ جلوے ہوں حسن کے
جلووں کو اشتیاق کہ ذوقِ نظر ملے

واللہ ان کی دید کو آنکھیں ترس گئیں
جن سے تصورات میں آٹھوں پہر ملے

ناصر یہ شرط ہے کہ محبت میں ہو خلوص
ملتا ہے دل سے دل، جو نظر سے نظر ملے

چمن کی تازگی افسردگی معلوم ہوتی ہے
بہاروں میں بہاروں کی کمی معلوم ہوتی ہے

ابھی احساسِ غم کا حوصلہ ہے زندگانی میں
شعورِ غم ابھی تجھ میں کمی معلوم ہوتی ہے

بتا پیرِ مغاں کیا فطرتِ بادہ بدلتی ہے
کہ جتنا پی رہا ہوں تشنگی معلوم ہوتی ہے

نگاہیں کیا ملیں، دل مل گئے، دنیا ملی ناصر
مجھے اب زندگی میں زندگی معلوم ہوتی ہے

(۱۸) ندیم

میر خیرات علی نام اور ندیم تخلص، مگر زیادہ تر خیرات ندیم کے لقب سے مشہور ہیں، شاعری کا فطری ذوق ہے، گذشتہ بیس سال

سے شاعری کے میدان میں گامزن ہیں اور خاصا کلام موزوں کرلیا ہے۔ نظم اور غزل دونوں لکھا کرتے ہیں، مشاعروں میں کلام پسند کیا جاتا ہے کلام میں لطافت رنگینی اور حلاوت ہوتی ہے۔ مسائل زندگی کی ترجمانی اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں۔

دورِ گذشتہ کے اساتذہ سخن مثلاً فانی بدایونی، علی اختر مرحوم اور باقی مرحوم سے تلمذ حاصل کیا اور اب خورشید احمد جامی سے مشورہ کرتے ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے۔

(۱)

زندگی جاگ اٹھی صبح بہاراں آئی — ہوگئے دور فسوں کار لرزتے سائے
شوخ پریوں کی طرح ناچتی کرنیں اتریں — دل کے لمحات اُجالوں کی طرح لہرائے

(۲)

پھر کسی وادیٔ گل پوش میں آکر جیسے — خیمہ زن آج ہوا قافلۂ رعنائی
ہوگئی وقت کے جادو سے مجسّم گویا — آرزوؤں کی امیدوں کی جواں انگڑائی

(۳)

زندگانی کے حسیں شہر کا اک اک منظر — نغمۂ ساز محبت کو جگا دیتا ہے
فکر و احساس کی دنیا میں ہر اک ذرے کو — حُسنِ محبوب کا آئینہ بنا دیتا ہے

(۴)

جگمگاتے ہوئے خوابوں کے دریچے وا ہیں — جن میں تعبیر کے مہتاب نظر آتے ہیں
رہِ تاریخ میں جمہور کی اُمّیدوں کے — ہر جگہ گلشنِ شاداب نظر آتے ہیں

(۵)

آج کا جشن ہے اک جشنِ وفا جشنِ حیات — اور چمکاؤ ارادوں کے شبستانوں کو
اپنے گیتوں کے فسانوں کی نئی محفل میں — اور چھلکاؤ چھلکتے ہوئے پیمانوں کو

(۶)

یہی انداز، یہی ذوق سفر ساتھ رہے — یونہی ہر سال نیا جشن مناتے گذرو
فن کی عظمت کے اجالوں کو بنام امروز — حسن فردائے جہاں تاب بناتے گذرو

غمِ حیات پہ چھا نا کوئی مذاق نہیں — کسی سے پیار جتانا کوئی مذاق نہیں

تلاشِ صبحِ مسرت کی رہگذاروں میں — غموں سے ہاتھ ملانا کوئی مذاق نہیں
ہر اک پیام کو خونِ جگر سے مہکا کر — ندیمؔ شعر سنانا کوئی مذاق نہیں

وہ آرزو کی صبح ، نہ زلفوں کی رات ہے — بدلا ہوا سا آج مذاقِ حیات ہے
اک دردکیا ملا ہے بنامِ جنونِ عشق — ہر واردات آج حسیں واردات ہے
ذکرِ بہارِ حسن ہو، یا ہو حدیثِ درد — جو بات بھی ہے اب غمِ انساں کی بات ہے

شب کی اُکھڑی سانسوں میں ڈوبنے لگے تارے
دیکھئے سحر کب تک جلوہ گر نہیں ہوتی

وہ بھی آج کہتے ہیں منزلوں کا افسانہ
منزلوں کی خود جن کو کچھ خبر نہیں ہوتی

جل اُٹھیں ندیمؔ آخر مشعلیں حقائق کی
شاعری مسائل سے بے خبر نہیں ہوتی

(۱۹) **وحیدؔ**

ڈاکٹر وحید اختر نام ، وحیدؔ تخلص ، حیدر آباد کے نوجوان ترقی پسند شاعر ہیں ، جامعہ عثمانیہ سے ایم ، اے کے بعد پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ، خواجہ میر درد کے نظریۂ تصوف پر مقالہ لکھا تھا ، ایک اُبھرتے ہوئے شاعر ، نقاد اور ادیب ہیں ، نظم نگاری سے زیادہ شغف ہے کبھی کبھار غزل بھی موزوں کرتے ہیں ، تعلیم کے ختم پر اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں لکچرار ہو گئے ہیں ان کے کلام کا کوئی مجموعہ تو شائع نہیں ہوا ، مگر معیاری رسالوں میں اکثر نظمیں شائع ہوتی ہیں ، ان کا کلام اپنے حسن بیان ، تخیل کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی کے باعث پسند کیا جاتا ہے کلام کا نمونہ پیش ہے ۔

"شہرِ دل"

ایک جام اس کے لیے نغمہ ہے جس کی تفسیر
ایک پیام اس کے لیے شعر ہے جس کی تفسیر

ایک جام اس کے لیے جس کو بُھلانے کے لیے
شہرِ دل چھوڑ چلا ٹھوکریں کھانے کے لیے
ایک جام ان کے لیے دل شکن و روح گداز
جن کے دشنام میں کھو کھو گئی میری آواز

شہرِ دل تیغ ستم پیکِ ہوس کی زد پر
شمعِ سوزِ غمِ دل لے کے گیا ہو در در
شہرِ دل مجھ سے شناسائی ہے ترا ہر منظر
میں رہا آٹھ برس شمعِ سرِ راہ گذر

نکہتِ گل بھی ملی مجھ سے گریزاں ہو کر
خواب میں سامنے آئے تو پریشاں ہو کر
میری وحشت نے ہر اک راہ میں چھوڑے ہیں نشاں
آبلہ پائی نے چمکائی ہے ہر کوئے بتاں

میں چراغِ سرِ طوفاں ہوں رہا یا نہ رہا
ایک جھونکا تھا بھٹکتا ہوا ٹھہرا نہ رہا
ہے تری خاک کا احسان مرے ذہن پر
تیرے ایواں رہیں آباد چھلکتے رہیں گھر

تو مجھے اپنا نہ مانے بھی تو میں تیرا ہوں
چھوڑے جاتا ہوں فضاؤں میں تری اپنا جنوں
ابنِ آدم ہوں سفر میرا ازل تا بہ ابد
ابنِ مریم ہوں میرا گھر نہ پتہ اور نہ لحد

طویل نظم ہے۔ غزل کا نمونہ :-

تم گئے ساتھ اُجالوں کا بھی چھوٹا ٹھہرا
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھہرا
یاد کرتے نہیں اتنا تو دلِ خانہ خراب
بھولا بھٹکا کوئی دو روز اگر آ ٹھہرا
کوئی الزام نسیمِ سحری پر نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطا وار اکیلا ٹھہرا
پتّیاں رہ گئیں بُو لے اُڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھہرا

روز نظروں سے گذرتے ہیں ہزاروں چہرے — سامنے دل کے مگر ایک ہی چہرا ٹھہرا
وقت بھی سعیِ مداوائے الم کر نہ سکا — جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت سے ٹھہرا ٹھہرا
تم نے جو شمع جلائی تھی نہ بجھنے پائے — اب تو لے دے کے یہی کام ہمارا ٹھہرا
دل ہے وہ موم ملا ہے جسے شمعوں کی گداز — اب کوئی دیکھے نہ دیکھے یونہی جانا ٹھہرا
اشک کو جب کسی آنچل کا کنارا نہ ملا — ساحلِ چشم پہ یہ غم کا سفینا ٹھہرا

گنگنا لیں گے غزل آج وحید اختر کی
نام لینا ہی جو در پردہ تمہارا ٹھہرا

کیوں تری قند لبی، خوش لبی یاد آئی — زہر افشانیٔ دنیائے دنی یاد آئی
درد سینے میں وہ اٹھا ہے کہ جاں جاتی ہے — ہائے کن آنکھوں کے ہیروں کی کنی یاد آئی

جام اُٹھاتے ہی دل اُمڈا تو بھر آئیں آنکھیں
چشمِ ساقی تری ساغر شکنی یاد آئی

خواتین شاعرہ

صفحۂ گذشتہ میں عصرِ حاضر کے چند شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے، تاکہ دورِ حاضر کے شعراء کا اندازِ بیان، طرز ادا وغیرہ کا اندازہ کیا جا سکے، اس وقت بیسیوں شعراء اپنی شعر گوئی کے لحاظ سے مشہور ہیں، ان سب کا تذکرہ کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے، جن شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے وہ ناکافی نہیں ہے۔

اس دور کے شعراء کے ساتھ شاعرہ خواتین بھی کئی ایک ہیں جو مشق میں مصروف اور اپنے کلام کو منظرِ عام پر لایا کرتی ہیں، یہاں چند شاعرہ خواتین کو بھی پیش کیا جاتا ہے تاکہ ان کے کلام کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

(۱) تہنیت

تہنیت النساء بیگم نام، تہنیت تخلص، حیدرآباد کے ایک جاگیردار خاندان سے تعلق ہے اور اس خاندان کو علماء فرنگی محل سے بھی رشتہ داری ہے، آپ کے والد نواب رفعت یار جنگ ثانی تھے۔ ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئیں، محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی، بچپن سے شعر و ادب کا شوق رہا، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی شریکِ زندگی ہیں اس لیے ادب کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا، حج و زیارت سے مشرف ہوئیں اور زیادہ تر نعتیہ کلام موزوں کرنے لگیں، آپ کے کلام کے دو مجموعے "ذکر و فکر" اور "صبر و شکر" شائع ہوئے ہیں۔ چونکہ تہنیت کو پردہ کا بہت زیادہ خیال ہے، اس لیے کسی مشاعرہ میں شریک ہو کر اپنا کلام نہیں سناتیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

جان کے ساتھ جائے گا یہ غم — کیوں حرم سے چلے آئے تھے ہم
روضۂ پاک کی جالیاں ہیں — اور ادھر اپنی آنکھیں ہیں پُرنم

شیدا بنائیے ہمیں دیوانہ کیجیے — دُنیا میں پر کسی طرح رُسوا نہ کیجیے
جلوہ دکھا کے پھر کوئی پردا نہ کیجیے — دل میں ہمارے حشر سا برپا نہ کیجیے
تڑپائیے، رُلائیے، سب کیجیے مگر — محرومِ التفات ہوں ایسا نہ کیجیے
سہہ لیں گے تلخیٔ غمِ دنیا کسی طرح — شرمندہ حشر میں تو خدارا نہ کیجیے
جب ان کی ذات حاصلِ کل کائنات ہے — کیوں ان کی ذات ہی پہ سہارا نہ کیجیے
اُلفت جو ہو کسی سے تو ہے مصلحت یہی — مرجائیے مگر کوئی چرچا نہ کیجیے

حُبِّ نبی ہے نعمتِ دارین تہنیت
اس کے سوا کسی کی تمنّا نہ کیجیے

دلِ زار کیا کرے گا مرے سینے میں مچل کے
ترا کام بس یہی ہے بہے آنسوؤں میں ڈھل کے

ترا اضطراب اے دل مجھے بے ادب نہ کردے
ہے یہ بارگاہِ اقدس ذرا ہاں سنبھل سنبھل کے

نہیں ایسا میرا ساقی، نہ پلائے جو نظر سے
وہ شراب ہی نہیں ہے جو بغیر جام چھل کے

ہمیں اتنا یاد ہے بس کہ حرم سے ہم چلے تھے
یہ کہاں چلا گیا دل مرے سینے سے نکل کے

یہی تہنیت کی خواہش، یہی تہنیت کے ارماں
یوں ہی نعت کے مضامیں لکھیں ہم بدل بدل کے

تمہارے لطف کا جب سے

تمہارے لطف کا جب سے کیا یقیں ہم نے
کبھی نہ اَور کے در پہ رکھی جبیں ہم نے

خیال ہی میں تمہارے کٹے ہیں دن سارے
تمہاری یاد میں راتیں گذار دیں ہم نے

تم ہی سمائے ہوئے ہو سدا تصور میں
تمہیں کیا ہے کچھ اس طرح دلنشیں ہم نے

---

(۲) روحی

تراب النساء بیگم، روحی تخلص، حیدرآباد کے ایک صاحب علم خاندان سے تعلق ہے، حیدرآباد میں تولد ہوئیں، گھر اور پھر محبوبیہ اسکول میں تعلیم پائی، مطالعہ کا شوق رہا، ان کے اجداد میں کئی اصحاب بلند پایہ شاعر گذرے ہیں، روحی کو خاندانی میراث کے طور پر شاعری سے دلچسپی ہوئی، اولاً زیادہ تر نظم لکھا کرتی تھیں پھر غزل بھی موزوں کرنے لگیں۔ بقول ڈاکٹر زور صاحب روحی ایک پختہ مشق شاعرہ ہیں انھوں نے نظمیں اعلیٰ پایہ کی لکھی ہیں اور غزلوں کو جدید معیار غزل تک پہنچانے میں سعیِ بلیغ بھی کی ہے، ان کی غزلیں نئی قدروں کی ترجمانی کرتی ہیں اور قدیم مذاقِ سخن کی آئینہ دار بھی ہیں وہ پیشہ ور شاعر نہیں ہیں محض ذوقِ سخن گوئی ان سے شعر لکھواتا ہے۔

روحی کا مجموعۂ کلام "نیرنگ نظر" اور سلاموں وغیرہ کا مجموعہ "پیام کربلا" شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے، چونکہ فن موسیقی سے واقف ہیں اس لیے لحنِ داؤدی سے کلام سناتی ہیں۔

پیغامبر خودی

گہوارۂ ادب میں پل کر شعورِ عالم
کرتا رہا ازل سے تنظیمِ ابنِ آدم
تہذیب حاضر ہے اسلاف کی نشانی
پیتے ہیں جامِ نو میں ہم مئے وہی پرانی

... ...

کھوئی ہوئی تھی منزل بھٹکے ہوئے تھے راہی
اہلِ نظر نے تجھ سے پائی ہے رہنمائی
تقلید کو گناہِ ذہنی قرار دے کر
تحقیق کی نکالیں راہیں نئی سراسر
دیر کو حرم کو بخشی مذہب کی پاسبانی
فکر و نظر کو سونپی تصویرِ زندگانی
تھا تیرے فلسفے کا انداز شاعرانہ
بن کر پیامِ ہستی گونجا ترا ترانہ
معراجِ آدمیت ہستی کا مدعا ہے
آئینۂ خودی کی اقبالیت جلا ہے
آزاد ہے حدوں سے اہلِ ہنر کی دنیا
سارے جہاں کے وہ ہیں ان کی ہے ساری دنیا

اقبال کے ترانے روحی سُنا رہی ہے
بانگِ درا کی گویا آواز آ رہی ہے

اب غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں :-

ہم نے روشن کی ہے دل کی آگ سے شمعِ حیات
آندھیوں کے سامنے یہ شمع تھراتی نہیں

پہلے کچھ آنسو بہانے سے ہی ملتا تھا سکوں
ان ستاروں کی چمک اب مجھ کو بہلاتی نہیں

اشک کو چاہیئے اب زینتِ داماں ہونا — کبھی قطرہ، کبھی دریا، کبھی طوفاں ہونا
ہم خزاں میں بھی سُنائیں گے ترانے روحی — کیا ضروری ہے بہاروں میں غزلخواں ہونا

کچھ محبت کا حق ادا نہ ہوا — مجھ کو شکوہ ہے زندگانی سے
ساری دنیا مری مخالف ہے — آپ کی ایک مہربانی سے

کوئی ہنستا ہے کوئی روتا ہے — اپنی اپنی خودی کا ہے یہ سوال

ہم جسے دیکھ لیں نظر بھر کے — اصلِ انتخاب ہو جائے

جس کو معلوم ہے خوشی کا مآل — اس کو روحی ملال کیا ہوگا

تیری رحمت کو کیوں کروں رُسوا — میری فریاد میں اثر کم ہے

میرے لیے یہ دنیا ہے جلوہ گہِ معنی — اے چرخ تری گردش بھولا ہوا افسانہ

صاف دل ایک بھی دشمن نہیں ملتا روحی — بدگماں دوست زمانے میں بہت ملتے ہیں

(۳) طاہرہ

بانو طاہرہ نام، طاہرہ تخلص، ایرانی والدین کی دختر ہندوستان میں تولد ہوئیں، لکھنؤ میں تعلیم پائی، لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری لی، والد کے پنشن لینے پر ایران چلی گئیں مگر پھر گذشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر کرنل سعید کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر حیدر آباد آ گئیں۔

طاہرہ کو تعلیم یافتہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھنے کا موقع ملا، پھر ایران کی علمی فضا میں اقامت۔ بچپن سے انگریزی، فارسی اور اردو شاعری سے شغف رہا۔ اور شاعری کے ساتھ مختصر افسانہ نویسی میں دلچسپی لیتی رہیں، چنانچہ آندھرا ساہتیہ اکیڈیمی سے مختصر افسانوں کو انعام کا اعزاز دیا گیا۔

اردو کلام کا مجموعہ "برگ سبز" اور سلاموں کا مجموعہ "ہدیۂ طاہرہ" شائع ہو گئے ہیں، نظم، غزل، فلسفہ سب کچھ لکھتی ہیں اور مشاعروں میں خاص انداز سے کلام سناتی ہیں، طاہرہ کے کلام میں شعری خصوصیات پائی جاتی ہیں، لطف زبان، پرواز تخیل، روانی کے ساتھ ساتھ صفائی اور شگفتگی کے جوہر پائے جاتے ہیں، کلام کا نمونہ پیش ہے

اُلجھنیں

آدمی آج بھی صد حیف کہ انسان نہیں — ایسی اُلجھن ہے سُلجھنے کا کچھ امکان نہیں
کیف کیا جینے میں جب کیف کے سامان نہیں — زندگی میں کوئی نغمہ نہیں رومان نہیں

آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
زر پرستی کی ادا عام ہے دلداروں میں

کھنکھناتے ہوئے سکّوں کا ترنم ہے عزیز — عزتِ نفس کے گاہک کا تبسّم ہے عزیز
غیر سے، غیر حجابانہ تکلّم ہے عزیز — چار پیسوں کے لیے اُف یہ تلاطم ہے عزیز

آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
خواجۂ شہر ہے یوسف کے خریداروں میں

اُفقِ دل پہ محبّت کی گھٹائیں نہ رہیں — عشق و اخلاص کی پاکیزہ فضائیں نہ رہیں
اب وہ صحرا نہ رہے اور وہ ہوائیں نہ رہیں — قصۂ قیس تو باقی ہے وفائیں نہ رہیں

آج بھی جسم کے انبار ہیں بازاروں میں
کاش آ جائے مسیحا کوئی بیماروں میں

مجھے تڑپا کے شرماتا تو ہوگا　　　کیے پر اپنے پچھتاتا تو ہوگا

یہ کیا زندگی ہے جیا جائے نا　　　پیا باج پیالا پیا جائے نا

زندگی سے نہ یوں فرار کرو　　　غمِ دوراں کو ہم کنار کرو
چاند پھر سے نکلنے والا ہے　　　چار دن اور انتظار کرو

ان کے ہونٹوں پہ مسکراتی ہے　　　مسکراہٹ ہزار پھولوں کی

نہ ہوتا اس قدر شدت سے احساسِ غمِ دوراں　　　ہمارا بھی زمانے میں کوئی گر قدرداں ہوتا

پھر آرہی ہے آہ اسی بے وفا کی یاد　　　پھر لذتِ تصورِ جاناں ہے آج کل

گم ہو نہ جاؤں طائرہ راہِ طویل میں　　　ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

واعظ شراب نوشی کے بے حد خلاف ہیں　　　مل جائے مفت کی تو پھر انکار بھی نہیں

---

(۴) نازؔ نازنیں بیگم نام، نازؔ تخلص، علی اصغر صاحب بلگرامی کی دختر، بلگرام وطن، مگر والدین کے ساتھ حیدرآباد میں زندگی بسر ہوئی۔ پیدائش ۱۹۲۶ء میں ہوئی، والدین کے ساتھ حیدرآباد کے مختلف اضلاع میں قیام رہا اور وہاں ہی تعلیم ہوئی۔ اورنگ آباد سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے بعد شادی ہوگئی اور تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ بچپن سے شاعری کا شوق ہے۔ اپنی تیرہ سالہ عمر سے شعر کہتی ہیں، کسی سے تلمذ حاصل نہیں کیا اپنے فطری ذوق کی رہنمائی میں ان کی شاعری پروان چڑھی۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی ہیں، ڈرامہ، فیچر، افسانہ بھی لکھا کرتی ہیں، بمبئی، حیدرآباد، اورنگ آباد کی نشر گاہوں سے نظم و نثر دونوں نشر ہوتے ہیں۔ یوپی اور دہلی کے اکثر

مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں، دہلی اردو مجلس کے ہر مشاعرہ میں ناز کا کلام پسند کیا جاتا رہا ہے۔ معیاری رسالوں میں ساقی، کہکشاں وغیرہ میں کلام شائع ہوا ہے۔

اِدھر دوری، اُدھر وابستگی ہے
یہ کیسا عشق، کیسی بندگی ہے

یہ راہیں، عشق کی پُرپیچ راہیں
نہ گذرو تیرہ گی ہی تیرگی ہے

ہوس ہے یا مجھے تیری تمنّا
مرے دل کو تری دیوانگی ہے

وفا میری نہ یاد آئی ہو تم کو
نگاہوں میں جب ہی شرمندگی ہے

خزاں گذری، بہارِ صبح آئی
مگر دل پر وہی افسردگی ہے

یہ وعدے آپ کے یہ لمبی راہیں
بہت ہی مختصر یہ زندگی ہے

تم ہی اچھے بُرا ہے ناز کا دل
تمہیں چاہنا ہی اِک دیوانگی ہے

کیوں کھلے ہیں یارب پھر سے کیوں بہار آئی
آرہی تھی مشکل سے دل کو پھر توانائی

کس قدر کشاکش سے آپ آئے محفل میں
داستاں ہی چھیڑی تھی بات کچھ نکل آئی

آشیاں جَلا جس دم ہم نے دیکھ لی دُنیا
جن پہ کچھ بھروسہ تھا اس نے آگ بھڑکائی

ہے شباب پر محفل اذن لب کشائی بھی
دل کو یہ نہیں منظور آپ کی ہو رسوائی

کیا کسی کو یاد آیا پھر دلِ حزیں میرا
موت کے قریں جاکر زندگی جو لوٹ آئی

نہ خوشی ملی، نہ سکوں ملا، مجھے پھر بھی تم سے گلہ نہیں
ملی مجھ کو اتنی جفا کہ اب مجھے یاد اپنی جفا نہیں

تمہیں دیکھ لوں تمہیں پاسکوں، تمہیں دل میں اپنے بُلا سکوں
یہ نصیب ایسا نصیب ہو، مری آہ اتنی رسا نہیں

مَیں بُھلا چکی ترے سب ستم، میں مٹا چکی ترے سب نشاں
مگر یاد اب بھی ہے دلنشیں یہ ہی نقش ہے جو مٹا نہیں

تبصرہ صفحاتِ گذشتہ میں دورِ حاضر کے کئی شاعروں کے مختصر حالات اور ان کا کلام پیش کیا گیا ہے، یوں تو اس وقت سیکڑوں شعراء ایسے ہیں جن کا کلام پسند کیا جاتا ہے اور انھیں تحسین و ستائش کے تمغے دیے جاتے ہیں، مگر ان سب کا کلام پیش کرنا دشوار ہے، کیونکہ یہ شعراء کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ تاریخ ادب کا ایک گوشہ ہے، جو نمونے پیش ہوئے ان سے اس امر کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں شاعری کا کیا رنگ ہے اور اس کے رجحانات کیا ہیں، اگرچہ نظم اور غزل دونوں سے دلچسپی ہے اور اکثر شعراء دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، مگر بعض شعراء نے زیادہ تر نظم کو اپنی جولانیٔ طبع کا مرکز بنایا ہے اور بعض شعراء غزل میں اظہارِ خیال کو ترجیح دیتے ہیں۔

شعراء کے کلام سے نئے رجحانات، نئی قدریں، نئے شعور کا پتہ چلتا ہے مگر بعض شعراء نے پرانی ڈگر، پرانے مذاق اور پرانے ذوق کو بھی محور بنایا ہے، اردو شاعری کو دکن میں آغاز ہو کر تقریباً چھ سو سال کا طویل زمانہ گذر چکا ہے۔ زمانہ کے انقلابات، حکومتوں کے قیام و زوال، پستی اور بلندی کے بیسیوں دَور اردو شاعری پر گزر چکے ہیں، وہ ایک طرف بادشاہوں، امیروں، جاگیرداروں کی سرپرستی اور تقرب بلکہ خود ان کے اظہارِ خیال کا مرکز بنی رہی تو دوسری طرف صوفیوں، مشائخوں، اہلِ سلوک باطن کے لیے بھی گرمیٔ محفل کا سامان مہیا کرتی رہی، اور غزل شروع سے آجتک مسلسل کہی جاتی رہی ہے اور عیش و طرب، بزم نشاط و سرور میں زندگی، زندہ دلی کا ذریعہ بنی رہی تو ذہنی غم و الم، یاس و حسرت، بربادی اور نامرادی کے پیغام سُناتی رہی، مسرت و شادمانی، خوشی اور کامرانی کے نغمے سُناتی تو پھر ہجر و فراق، بدنصیبی، حرمان، مفلسی، تنگ دستی، رنج و الم، سوگ داری و ماتم کی داستان بھی گوش گزار کرتی رہی۔

اس دَور کے سیکڑوں شعراء ایسے ہیں جن کا کلام اپنے تخیل کی بلند پروازی، خیالات کی گہرائی، عمق اور فکر و نظر کی وسعت اور ندرت کے لحاظ سے قابلِ ستائش اور لائقِ داد قرار پائی ہے، مگر ہمارے لیے ان تمام کے افکار کو پیش کرنا دشوار بھی ہے اور ضروری بھی نہیں، اگر ان شعراء کا صرف نام ہی لیا جائے تو کئی صفحے درکار ہوں،

اس لیے ناموں کا بھی تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔

جن شعراء اور شاعرات کا کلام پیش کیا گیا ہے وہ ناکافی نہیں ہے بلکہ اس سے دورِ حاضرہ کے رجحانات اور اسلوب کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، بہرحال آندھرا پردیش میں اردو شاعری اس وقت ترقی کے زینے طے کر رہی ہے، اگرچہ کالجوں میں اعلیٰ تعلیمی زبان بدل گئی ہے اور اردو کی ترقی کے لیے وہ آسانیاں نہیں ہیں جو پہلے تھیں اور بازار اردو میں اردو کتابوں رسالوں کی مانگ کم سے کمتر ہو چکی ہے، تاہم آندھرا پردیش بن جانے کے بعد شعراء اور شاعرات کے کئی مجموعے نہایت آب و تاب اور حسین صورت میں شائع ہوئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ شعراء اپنے کلام کو منظر عام پر پیش کرنے اور مقبولیت حاصل کرنے میں کوشاں ہیں اور ان کی کوششیں بڑی حد تک بار آور نظر آتی ہیں، شاعری کا ذوق عام ہونے کا ایک ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ روزانہ اخباروں میں ہفتہ میں ایک دن کئی کالم شاعروں کے کلام کو پیش کرنے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں، جو کلام شائع ہوا کرتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کا مذاق ترقی پر ہے اور شوقِ شاعری پروان چڑھ رہا ہے۔ نہ صرف شاعر بلکہ شاعر خواتین بھی میدانِ شاعری میں گامزن ہیں اور عام طور سے پرانے طرز کو متروک کیا جا رہا ہے۔ شاعری کے نئے رجحانات سامنے آ رہے ہیں۔

نثر نگاری

عصرِ حاضر کے شاعروں کے بعد نثر نگاروں کا تذکرہ کرنا چاہیے، اگرچہ موجودہ نثر نگاروں میں بعض ایسے ہیں جن کی نثر نگاری دَورِ گزشتہ سے شروع ہو چکی تھی؛ مگر چونکہ ان کی نثر کا بڑا حصہ دورِ حاضر کا منت پذیر ہے اس لیے ان کو اسی دَور میں شامل کیا گیا ہے۔ جس طرح بیسیوں شعراء میں چند کو منتخب کیا گیا ہے اسی طرح نثر نگاروں میں سے بھی چند کو پیش کیا جائے گا۔

اس دَور میں نہ صرف کئی ایک جدید ادیبوں اور نثر نگاروں نے اپنے نقش قلم پیش کیے بلکہ دَورِ گذشتہ کے کئی اصحابِ قلم کے کارنامے اس دَور میں شائع ہوئے ہیں، مثلاً پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی کی کتاب، محشر عابدی صاحب کی کتاب، زینت ساجدہ صاحبہ کی کتابیں، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تالیفات وغیرہ سب اس دَور کی رہینِ منت ہیں، کئی خواتین نے ڈاکٹریٹ کے مقالے بھی اردو میں قلمبند کیے ہیں، ان سب کا تذکرہ کیا جائے تو ہماری کتاب کا حجم اور زیادہ ہو جائے گا اس لیے نظر انداز کیے جاتے ہیں، واضح ہو کہ اس دور میں انجمن ترقیٔ اردو، ادارہ ادبیاتِ اردو کے علاوہ کئی اور اداروں کی جانب سے اردو کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان اداروں کی صراحت صفحاتِ آیندہ میں پیش کی جائے گی۔

(۱) اختر حسن

اختر حسن صاحب کے مختصر حالات کا تذکرہ گذشتہ دور کے ایڈیٹروں کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔ مگر وہ ایک بلند پایہ نثر نگار اور قابل ادیب بھی ہیں۔ اختر حسن کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم، اے کی ڈگری حاصل کر کے جامعہ کی ملازمت میں شامل ہوئے، مگر چند سال بعد ورنگل کالج میں لکچراری سے سبکدوش ہو کر اخبار پیام کے ایڈیٹر ہو۔

مگر حالات سازگار ہوئے اس لیے اخبار بند ہوگیا، اخبار کے بند ہونے کے بعد آپ کے علمی اور ادبی کاموں میں اضافہ ہوا۔ کئی کتابیں قلمبند کی ہیں، مگر ہنوز اس کی اشاعت نہیں ہوئی، البتہ بیسیوں علمی، ادبی، تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں، نشرگاہ سے تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نثر کس قدر معلومات آفریں، ٹھوس، دلچسپ اور پُراثر ہوتی ہے، اختر حسن کو شعر و ادب کا نہایت اچھا اور پاکیزہ مذاق حاصل ہے۔ نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"سروجنی نائیڈو کی شخصیت کے حلقے میں ادب کلچر اور قومی اتحاد کو اہم مقام حاصل تھا۔ دراصل سروجنی نائیڈو اس دور کی یادگار تھیں جب برطانوی سامراج سے لڑنے کے لیے کانگریس رہنماؤں کو ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت تھی۔ بعد میں ہماری قومی تحریک جیسے جیسے سمجھوتے کی طرف بڑھتی گئی سروجنی کی آواز مدھم پڑتی گئی۔ ہندوستان کی تاریخ کا وہ تاریک دور تھا جب قومی اتحاد پارہ پارہ ہوگیا، اور جنگ آزادی کے سپاہیوں کو سمیٹ کر سرمایہ پرست لیڈر فرقہ پرستی کے قلعوں میں محصور ہو گئے۔ سروجنی نائیڈو اس دور میں ملک کی بڑی بڑی تنظیموں پر اثر نہیں ڈال سکیں، لیکن اپنے قرب ہمیشہ وہ ایک چھوٹی سی بزم سجاتے رہیں جس میں ہندو مسلمان کی شرمناک تفریق کا وجود نہیں تھا۔ ان کی گورنری کے مختصر عہد میں یو، پی میں وہی سب کچھ ہوا جو تمام دوسرے صوبوں میں ہوا تھا۔

---

(۲) اکبر الدین صدیقی

حیدرآباد کے ایک صاحب علم خاندان سے اکبرالدین صدیقی کا تعلق ہے، آپ کی پیدائش ۱۹۱۳ء میں ہوئی، خاندان میں کئی پشت سے قضائت کا سلسلہ قائم رہا اولاً بھینسہ میں تعلیم پائی، پھر حیدرآباد میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، جامعۂ عثمانیہ سے بی، اے اور ایم، اے کی ڈگریاں حاصل کیں، زمانہ تعلیم ہی سے مضمون نگاری کا شوق دامنگیر رہا، آپ کی پہلی کتاب جو شائع ہو کر مقبول ہوئی، وہ "مشاہیر قندھار" ہے جو ۱۹۲۸ء میں مرتب

ہوئی، اس کے بعد اب تک کئی کتابوں کے مُصنّف اور مؤلّف بن چکے ہیں، صدیقی صاحب کی کتابوں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) مشاہیر قندھار دکن (۲) پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری (۳) فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو، جلد اوّل، دوم، سوم (۴) چندر بدن و مہیار (مقیمی) اس کو ایک مقدمہ کے ساتھ ایڈیٹ کیا ہے (۵) کلام بے نظیر اس کو بھی ایک مقدمہ کے ساتھ مرتّب کیا ہے (۷) سیف الملک و بدیع الجمال اس کو ناگری رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ (۸) یادگار امجد۔

ان کے علاوہ "تاج الحقائق" ایک قدیم نثری کتاب کو ایڈیٹ کر رہے ہیں۔ نثر نگاری کا نمونہ پیش ہے۔

"مقیمی کی مثنوی ادبی نقطۂ نظر سے بعد کی مثنویوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اس میں نہ غواصی کا زورِ بیان پایا جاتا ہے اور نہ ہی نادر اور اچھوتی تشبیہات ہی ہیں، غواصی کی عشقیہ مثنوی "سیف الملک اور بدیع الجمال" اس کے سامنے موجود تھی، وہ اس سے زیادہ بہتر لکھنے کی کوشش کر سکتا تھا، لیکن وہ ایرانی نژاد اور فارسی کا شاعر تھا۔ اس لیے دکھنی اشعار میں وہ روانی نہیں پائی جاتی، غواصی کی مثنوی میں فوق فطری عناصر کی بہتات ہے لیکن مقیمی نے تمام واقعات کو بالکل فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، البتہ ایک چیز غیر فطری دکھائی دیتی ہے کہ انجم نگر کا بادشاہ جو مہیار کا ہمدرد بن گیا تھا اس کو اپنے حرم میں لے گیا تاکہ وہ اپنے لیے کسی نازنین کو منتخب کر لے اس حد تک قباحت نہ تھی، لیکن اس کے بعد امرا کی سراؤں میں اور اس کے بعد تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں میں مہیار کو بھیجا گیا کہ اگر کوئی حسین لڑکی پسند خاطر ہو تو اس سے شادی کرادی جا سکے۔ مقیمی کی تشبیہات میں بہت کم تشبیہیں اچھوتی ہیں۔" (مقدمہ چندر و مہیار)

امجد علی خاں یوسف زئی

آپ امجد یوسف زئی کے لقب سے مشہور ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں

حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد محمد قاسم خاں سب رجسٹرار تھے۔ امجد صاحب جامعہ عثمانیہ سے بی، اے ایل، ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کر کے وکالت کرنے لگے، طالب علمی کے زمانہ سے ادبی، سیاسی مسائل سے دلچسپی رہی حیدرآباد اور ہندوستان کے معیاری رسالوں میں مضامین شائع ہوتے رہے، نقش ونگار، سویرا' اخبار نئی زندگی کے ایڈیٹر رہے، قانون لگان داری، زرعی آراضی کا ترجمہ شائع کیا جو بہت مقبول ہوا ۱۹۵۶ء ہندوستان کی وزارتِ خارجہ نے ماسکو سے بدیشی زبانوں کے ترجمے کرنے کے لیے آپ کا انتخاب کیا۔ وہاں گیارہ کتابوں کا ترجمہ اور دو کتابیں ایڈٹ کیں۔ ان میں سے کئی کتابیں مثلاً اندھیرا اُجالا، لنگڑا شہزادہ' زیریست کے سورما' وغیرہ شائع ہو گئے ہیں۔ ماسکو میں ترجمہ اور ایڈٹ کے علاوہ دیگر علمی کاموں میں آپ کا حصہ رہا، صحت کی خرابی کے باعث ماسکو میں اور زیادہ قیام نہ ہو سکا۔ واپسی کے موقع پر یورپ کے کئی ممالک کا سفر کرتے ہوئے واپس ہوئے، اب حیدرآباد میں وکالت کرنے کے علاوہ علمی کاموں میں مصروف ہیں، اردو کے علاوہ ہندی، مرہٹی، انگریزی' روسی، گجراتی زبانوں سے واقف ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی ہے' مختلف ممالک کی تہذیب تمدن سے خاص لگاؤ ہے' آپ کے مضامین میں ان ہی امور کی صراحت ہوتی ہے اخبار سیاست کے علاوہ دوسرے علمی ادبی رسالوں میں آپ کے مضامین شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ نثر کا نمونہ پیش ہے۔

عہد حاضر کی حُسن کاری پر ایک ریڈیو تقریر کا یہ پیراگراف بہت پسند ہے۔

"حسن کاری خطوط' رنگوں اور (SHADES) کا ایک متناسب اور ہم آہنگ کھیل نہیں بلکہ حیات کی تنقید ہے۔ حسن کار اپنے خطوط میں جان رکھتا ہے ان میں سماج کی دھڑکنیں پوشیدہ ہوتی ہیں' اس کے رنگوں میں اس کی اور اس کے دور کی روح جھلکتی ہے۔ اس کے (SHADES) میں جذبات اور ارمان مچلتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ تصویر صرف حیاتی اور غیر حیاتی چیزوں کا رنگین منظر ہی نہیں بلکہ حُسن کار کا ایک رنگین خواب ہے۔"

کوپن ہیگن میں تین دن' میں فطرت کے حسن کو اس طرح بیان کیا۔

"ہمارا ہوائی جہاز بادلوں کے اوپر آگیا۔ کتنا خوبصورت منظر تھا وہ؟ ایسا

معلوم ہورہا تھا کہ کسی نے نیچے برف کے گالے بچھا دیئے ہوں۔ ابھی ابھی
تو ہم برف آلود زمین پر سے آئے تھے۔ اب فضا میں بھی برف کا احساس
ہونے لگا۔ دھرتی کا یہ غلاف کتنا حسین ہے۔ ہمارے اوپر بادل تھے اور
نیچے بھی بادل۔ بادلوں پر بادل کے سائے تیر رہے تھے وہ دُور سے نیلگوں
دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا کہ فضا میں سبھی کئی جھیلیں بن
گئی ہیں۔ بادلوں کی شکلیں بھی مختلف تھیں۔ کہیں گھٹا چھا جانے کا انداز تھا۔
کہیں بگولے کی شکل کے تھے۔ کتنی لطیف اور حسین دنیا تھی۔"

"ہندی ادب اور دوہے" میں دوہے کے تعلق سے لکھا۔

"جس طرح اردو شاعری میں غزل تمام اصناف پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی
طرح ہندی شاعری میں دوہا ہندی ادب کے چہرے پر اونچی ناک کی طرح
نمایاں ہے۔ ہندی اودھی، برج بھاشا اور راجستھانی سے بنی ہے،
دوہا اودھی میں ایسا فٹ ہوا اور اتنا موزوں ثابت ہوا کہ ہندی کی کسی
دوسری شاخ میں وہ اتنا کامیاب نہیں ہوسکا۔ لیکن برج بھاشا اور راجستھان
میں اس کا رنگ نکھر گیا۔ اودھی نے ماں کی طرح اس بچّہ کو اپنے سینے سے
لگا لیا، دوہے کے ساتھ ساتھ چوپائی بھی رہی گویا یہ ہم توام بھائی اور
بہن ہی تھے۔"

آمجد صاحب کے مضامین کی دلچسپی، رنگینی، روانی، معلومات آفرینی قابلِ داد اور لائقِ
ستائش ہوتی ہے، آپ کے ترجمہ کی خوبی کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو حکومتِ ہند
نے ماسکو میں ترجمہ کے قابل تسلیم کرکے انتخاب کیا۔

اقبال متین

اقبال متین حیدرآباد کے سپوت شاعر بھی ہیں اور نثر نگار
بھی، وہ فکر کے لحاظ سے رومانی اور عقیدے کے لحاظ
سے ترقی پسند ہیں، لیکن وہ ادب میں کسی ازم کے قائل نہیں، ان کے افسانوں کا مجموعہ
"اُجلی پرچھائیاں" کے نام سے ادارۂ صبا کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ ان کے
افسانوں کے متعلق مخدوم محی الدین نے یہ صراحت کی ہے:۔

" اقبال متین اپنے گردوپیش کی زندگی سے واقعات اور کردار چُنتا ہے۔

قدرتِ بیان اور قوتِ مشاہدہ کی مدد سے ان میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ معمولی
واقعات اور کردار غیر معمولی اور دل کش بن جاتے ہیں "۔

متینؔ کے افسانوں کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"قلندر حسین خاں سیدھے سادھے نواب تھے۔ ساحل سمندر پر رہیں گے لیکن طغیانیوں کا اندازہ طوفانوں کی آمد کا پتہ، پانی سر سے اونچا ہو جاتا تو ڈوبتے وقت انھیں اس کا اندازہ ہوتا کہ وہ ڈوب رہے ہیں، لیکن ابھی طغیانیاں دُلھن کے سینے میں مچل رہی تھیں۔ بادل منڈلا رہے تھے، کھُل کر برسیں گے اس کا خود دُلہن کو علم نہ تھا، آج دو چار قطرے برس پڑے تھے تو نواب قلندر حسین خاں نے محسوس تک نہ کیا کہ گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر چھا رہی ہیں تو کبھی کبھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسیں گی بھی۔ انھوں نے صرف اتنا ہی پوچھا کہ بیگم نصیب دُشمناں طبیعت ناساز تو نہیں آپ اتنی رات تک جاگ کیوں رہی ہیں؟ ....

نواب قلندر حسین خاں کو ہر گھڑی یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ابّا حضور کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کریں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے ابّا حضور کے ہو رہنے میں عزّت، حکومت اور دولت ہر شے ان کے قدم چومتی رہے گی اور واقعی انھیں ہر چیز حاصل تھی لیکن اس کے باوجود گلبدن بیگم ڈیوڑھی بھر میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ دوسری بیگمات گلبدن پر اس لیے رشک کرتیں کہ قلندر حسین خاں نے نواب صاحب کا دل موہ لیا ہے"۔

---

(۵) بھارت چند کھنّہ

بھارت چند کھنّہ کا اصلی وطن پنجاب ہے لیکن وہ نہایت کم عمر میں اپنے بھائی (داماد مہاراجہ کشن پرشاد) کے ہمراہ حیدر آباد آکر بس گئے۔ یہاں ہی تعلیم پائی اور جامعہ عثمانیہ سے ایم، اے کی ڈگری لی، ملازمت کے دائرے میں منسلک ہوئے، پولیس ایکشن کے بعد جب جلد ترقی کے زینے طے کیے، اور اب نائب چیف سکریٹری ہیں، کھنّہ صاحب ایک اچھے انشا پرداز اور مزاحیہ نگار ہیں، ان کے مختصر افسانوں کی کئی کتابیں شائع

ہوئی ہیں ۔ ابھی حال میں ادارۂ ادبیاتِ اردو نے "ٹھنڈی بجلیاں" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، ڈاکٹر زور صاحب نے اس کے پیش لفظ میں بالکل صحیح لکھا ہے۔

" افسوس ہے کہ اردو ایک اور کرشن چندر سے اب تک محروم رہی مجھے ان کی تحریروں میں کرشن چندر کے سے تیور نظر آتے ہیں ۔ زندگی کے سیاہ اور رنگارنگ پہلوؤں اور انسانی فطرت کے اتھاہ گہرائیوں تک وہ اسی طرح پہنچتے نظر آتے ہیں جس طرح کرشن چندر پہنچ جاتے ہیں "

مسٹر کھنہ ایک ادیب بھی ہیں اور کرکٹ کے مشہور پلیئر بھی ہیں ' زور صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان افسانوں اور مزاحیہ مضمون کے شیدائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی طرح لگن اور شوق کے ساتھ اس میدان میں اُتر پڑیں، جیسا کہ کرکٹ فیلڈ میں اُترتے تھے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

" بیوی کو ہم سے اس بات کی بھی شکایت ہے کہ ہم گھر کے دھندوں اور خانہ داری کے انتظام میں ان کا ہاتھ نہیں بٹاتے بلکہ گل چھرے اُڑاتے رہتے ہیں' بیوی کو پورا پورا یقین ہے کہ دفتر کا کام محض تفریح ہوتا ہے، کچھ اُلٹے سیدھے دستخط کیے، کچھ ادھر ادھر ٹیلیفون ملائے، جب صاحب کے حضور میں حاضر ہوئے تو بھیگی بلی کی طرح جی جناب، جی جناب کی میاؤں میاؤں کرنے لگے، اپنے رتبہ والوں کے ساتھ اناپ شناپ بکا ۔ چھوٹوں کو ذرا گھورا' ذرا دھمکایا ' ڈرا اور بس' بیوی اس قسم کی گفتگو کرتی ہیں تو میں ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اگر آپ کا یہ نظریہ صاحب نے تسلیم کرلیا تو ہماری جگہ بھی تخفیف کرنی جائے گی اور ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا، مگر بیوی مُصر ہیں کہ ان کے کام ہمارے کاموں سے کہیں مشکل ہیں' ان کو ہر ماہ بجٹ تیار کرنا پڑتا ہے حالانکہ ملک کے وزیر مالیات اس کام کو سال میں صرف ایک مرتبہ انجام دیتے ہیں ۔ اس پر مصیبت یہ کہ کبھی بچوں کے جوتے چھوٹے ہوگئے تو کبھی سوئٹر کے لیے نئی قسط فراہم کرنی پڑتی ہے کبھی سگریٹ کی قیمت بڑھ گئی تو کبھی انڈے نایاب ہوگئے اس کے علاوہ نوکروں سے سدا کی

جھک جھک اور اس ہمہ گیر سوال کا حل کہ آئندہ کھانے کے لیے کیا پکایا جائے۔" (ٹھنڈی بجلیاں - صفحہ ۹۰)

(۶) ڈاکٹر حفیظ قتیل

حفیظ قتیل صاحب کی پیدائش ضلع میدک میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی، ابتدائی تعلیم وہاں ہی ہوئی اس کے بعد حیدرآباد میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور جامعہ عثمانیہ سے ایم' اے کی ڈگری لے کر اردو میں ڈاکٹریٹ کے لیے ریسرچ کیا اور ۱۹۵۳ء میں پی' ایچ' ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اردو کے آپ پہلے پی' ایچ' ڈی ہیں' جامعہ عثمانیہ سے ملازمت کا آغاز ہوا اس وقت شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں، کئی کتابوں کے مصنف اور کئی کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے' چنانچہ غزل اور مسائل' معیار غزل' راہرو اور کارواں' میراں جی خدا نا' آپ کی تصانیف ہیں' تحفۃ الشعراء' دیوان ہاشمی' دیوان ریختی قیس' سوانح جہاں گرد کو آپ نے اپنے مقدموں کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ کئی تحقیقی' تنقیدی مضامین قلمبند کیے ہیں' آپ کی کتابیں اسلوب بیان کے لحاظ سے لائق ستائش اور زبان کے لحاظ سے قابلِ قدر ہوتی ہیں' ان کی دلچسپی' معلومات آفرینی' شگفتگی بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی' آپ کے ادب کو صالح ادب کہنا بجا ہے' نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"یوں تو غزل انسانی' حسن اور عشق کی کیفیات و واردات' کو بیان کرنے کے لیے وضع ہوئی اور آج تک اس صنفِ سخن کا دامن اس موضوع سے بندھا ہوا ہے' لیکن ایران میں غزل کا آغاز ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ تصوف کی اشاعت شروع ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا ہی سے غزل میں مادی اور مجازی حُسن وعشق کے ساتھ ساتھ حقیقی اور ماورائی حسن وعشق کی باتیں بھی کی جانے لگیں۔ وہی زبان' وہی زبان کے تیور' وہی تشبیہات و استعارات' وہی اشارات وعلامات' غرض فن اظہار کی وہ پوری روایت جو انسانی حُسن کی عکاسی اور انسانی محبت کے اظہار کے لیے وجود میں آئی تھی۔ شاہدِ حقیقی کی تجلیات اور عشق حقیقی کے احوال ومقامات کو بیان کرنے کے لیے کچھ اس طرح استعمال ہونے لگی کہ زبان و اسلوب کی یکسانیت

کو پہچاننا مشکل ہو گیا ؟

---

(۷) حسینی شاہد

حیدر آباد میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، حیدر آباد کے رہنے والے ہیں ۔ دار الشفا ہائی اسکول، سٹی کالج اور جامعۂ عثمانیہ میں تعلیم پائی۔ ۱۹۴۸ء میں ایم اے کی ڈگری لی ۔ ڈاکٹر سید سجاد مرحوم سابق پروفیسر جامعۂ عثمانیہ کے خاص شاگردوں میں شامل ہیں، کئی اخباروں اور رسالوں کی ایڈیٹری کر چکے ہیں، ادبی، تنقیدی، تحقیقی مضمون قلمبند کرتے ہیں ۔ اوّلاً شنکر کالج یادگیر میں لکچرار کی حیثیت سے مامور کیے گئے، اب بدرو کا کالج اور ممتاز کالج میں لکچرار ہیں حیدر آباد کی مشہور ادیبہ زینت ساجدہ آپ کی شریکِ زندگی ہیں ۔

حسینی شاہد صاحب ایک خاموش اردو کے خدمت گذار ہیں ۔ طبیعت میں سنجیدگی اور متانت ان کے ادب میں بھی نمایاں ہوتی ہے، نثر کا نمونہ پیش ہے ۔

" دکن میں نہ صرف ترکیبوں کے تراشنے، الفاظ کے ڈھالنے اور اصطلاحات کے وضع کرنے میں ہندی سے مدد لی گئی ۔ بلکہ ہندی اور فارسی کی گنگا جمنی ترکیبیں رائج کی گئیں اور ہندی الفاظ کو بلا جھجک استعمال کیا گیا، دکھنی ادب میں ہندی کا عنصر فارسی کے مقابلہ میں زیادہ ہے ۔ سب رس اور سیف الملوک بدیع الجمال میں عنصر اور زیادہ ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غواصی فارسی الفاظ سے شعوری طور پر احتراز کرتا تھا، یہاں مثالیں طوالت کا موجب ہوں گی اس لیے صرف چند ترکیبوں کے حوالے پر اکتفا کی جاتی ہے

درد فام (درد جاننے والا) ادکھ فام (عقلمند) بس ہار (آباد) پھول باڑا (گلستاں) پھل تیر (گلاب) فکر زاد (فکر مند) پھلارا (گل فروش) مٹ بول، منہ بول (شیریں کلام)، شاہ مارگ (شہ راہ)

دکھنی ادیب جس طرح زبان کی سادگی کو پیش نظر رکھتے تھے ۔ اسی طرح ایسی تشبیہوں اور استعاروں سے بھی گریز کرتے تھے جو پُر پیچ اور غیر واقعاتی ہوں ان کی تشبیہیں زندگی سے قریب اور واقعاتی ہوتی تھیں ۔ مثلاً ... ..

(۸) میر سراج الدین علی خاں

میر سراج الدین علی خاں حیدرآباد کے، ایک قدیم جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جو صاحبِ علم بھی تھے۔ آپ کی پیدائش حیدرآباد میں ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ جامعۂ عثمانیہ سے بی، اے کی ڈگری حاصل کی اور ایک عرصۂ دراز تک حضرت جلیلؔ فصاحت جنگ کی صحبت میں بسر کیا ہے اس لیے صحیح ادب اور صحیح تنقید اور فن شاعری کے نکات سے بخوبی واقف ہوگئے اور معیاری اردو لکھنے کا سلیقہ آگیا ہے۔ اس وقت سنٹرل ریکارڈ آفس اندھرا پردیش میں اسسٹنٹ آرکالیوجسٹ ہیں۔

اردو ادبیات اردو کی مجلس اشاعت تاریخ و تمدن دکن کے اعزازی معتمد بھی بنائے گئے ہیں، نمونۂ نثر پیش ہے:۔

"حضرت جلیلؔ کی شخصیت بحیثیت شاعر اور امام فن محتاجِ تعارف نہیں آپ کو فنِ شاعری میں جو کمال حاصل تھا اور آپ کی ذات جن ستودہ صفات کی حامل تھی اس سے دُنیائے علم و ادب بخوبی واقف ہے، حقیقت یہ ہے کہ جوں جوں ہندوستان کے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں کا ذوق نکھرتا جائے گا وہ اُستاد جلیلؔ کے صحیح مقام کو پہچاننے کے قابل ہوتے جائیں گے۔"

---

(۹) عالم خوندمیری

عالم خوندمیری ۱۹۲۲ء میں تولّد ہوئے، آپ کے نانا مشہور مہدوی عالم مولانا سیّد اشرف شمسی تھے جو جامعۂ عثمانیہ کے فارسی کے پروفیسر تھے۔ عالم خوندمیری نے جامعۂ عثمانیہ سے فلسفہ میں ایم، اے کیا ہے اور وہیں شعبۂ فلسفہ میں ریڈر ہیں، آپ ترقی پسند تحریک میں شامل ہیں، حیدرآباد کی اکثر ادبی، تہذیبی، علمی جلسوں میں آپ کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ آپ کے معلومات آفریں مقالوں کو دلچسپی کے ساتھ سُنا جاتا ہے، عالم خوندمیری ادبی، تنقیدی، فلسفی موضوعات کے ساتھ ساتھ سیرت النبی صلعم اور شہادت امام حسینؑ کے موضوعات پر بھی فلسفیانہ انداز میں بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں، نمونہ نثر پیش ہے:۔

"اپنے ادبی ماضی کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نہ تو سارے کا

سارا قدیم ادب دفن کر دینے کے قابل ہے اور نہ ماضی کی ساری میراث اتنی مقدس ہے کہ اس کا ایک ایک جزو متبرک اور پرستش کے لائق، ماضی سے انکار اور اس کا انتہا پسندانہ احترام، دونوں رجحانات گمراہ کن ہیں، زندگی مسلسل بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ماضی کی نفی بھی کرتی ہے، نیا تمدن پرانے تمدن کی نفی کرتے ہوئے اس کے بعض اجزا کو اپنے اندر اس طرح سمو لیتا ہے کہ وہ نئے کا ایک حیاتی جزو بن جاتے ہیں، زندگی کے تسلسل کا جدلیاتی مفہوم یہی ہے، ترقی پسند ادب کے اکثر نقاد ترقی پسند تنقید کے اس عظیم الشان کارنامے کو فراموش کر جاتے ہیں کہ اس نے ہمیشہ اس تسلسل پر زور دیا ہے، انھوں نے ہر منزل پر اس امر کا اعلان کیا کہ ترقی پسند ادب ہمارے قدیم ادب کا صحیح وارث ہے اور ہماری ادبی میراث ہماری عظیم قومی تاریخ کا ایک شاندار جزو ہے لیکن وہ یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ قدیم ادب کی ہر سطر اور قدیم شاعری کا ہر شعر زندہ رہنے والا ہے۔ آج ترقی پسند تنقید نگاروں کا ایک بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ہمارے ادبی ورثہ کا جائزہ لیں اور کھرے کھوٹے کا پتہ لگائیں۔"

---

(۱۱) عاتق شاہ

حیدر آباد کے نوجوان افسانہ نگاروں میں عاتق شاہ کو بلند مرتبہ حاصل ہے، آپ حیدر آباد کے رہنے والے کالج کی اعلیٰ تعلیم کے خواب دیکھ کر اس کی تعبیر سے محروم ہیں، ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہیں، ان کی زندگی اور افسانہ نگاری میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ عاتق شاہ کی ہر کہانی میں ایک نئے رنگ کی جلوہ گری ہوتی ہے، ان کے افسانوں میں طنز، تلخی اور حقیقت کی صداقت مملو ہوتی ہے، عاتق شاہ کی افسانہ نگاری صرف چند سال کی پیداوار ہے، لیکن اس کے باوجود کئی مجموعے شائع ہو گئے ہیں، مثلاً، فٹ پاتھ کی شہزادی، ایک وقت کا کھانا، اندھیری، مائی ڈیر شکنتلا وغیرہ۔

"شکنتلا میری رفیق حیات ہے، میری زندگی ہے، میری روح ہے، میں بغیر شکنتلا کے کوئی کام نہیں کر سکتا، اس کی ذرا سی بیماری میرے سکون

کو چھین لیتی ہے اور میں پریشان ہو جاتا ہوں اور اس پریشانی میں سب کچھ بھول جاتا ہوں، یہاں تک کہ دفتر کو اور جو چیز مجھے یاد رہ جاتی ہے وہ ہے شکنتلا۔ جب تک اس کا مزاج ٹھیک نہ ہو جائے میں چین نہیں لیتا۔ تب مجھے ناشتہ کی سوجھتی ہے، دفتر جانے کی۔ کام کرنے کی۔ اگر اسی جذبہ کا نام محبت ہے تو میں زور زور سے کہوں گا کہ شکنتلا سے مجھے محبت نہیں عشق ہے۔

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ شکنتلا مجھ سے کبھی چھین لی جائے گی، خواہ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو تو اس کھردری زمین پر قدم رکھنے سے پہلے اس نیلی چھتری والے کے حضور میں گڑگڑا کر فریاد کرتا کہ —— اے بھگوان سارے دکھ دے میں سہہ لوں گا مگر شکنتلا کا داغ نہ دے۔

.. ..

انسپکٹر صاحب آپ مذاق کیوں اڑا رہے ہیں، اس میں حیرت اور تعجب کی کون سی بات ہے، ہاں ہاں یہی ہے میری شکنتلا، میری رفیق، میری روح اور میری زندگی جسے آپ اور دنیا والے عرف عام میں بائیسکل کہتے ہیں۔" (مائی ڈیر شکنتلا)

---

(۱۱) لاہوتی

سری نواس لاہوتی، حیدرآباد کے رہنے والے مارواڑی فرقہ کے ادیب، جامعۂ الہ آباد سے استفادہ کیا، عرصہ دراز تک قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام کے ساتھ ان کے اسٹاف میں کام کرتے رہے، ۱۹۲۱ء میں تولد ہوئے اور کئی مرتبہ سیاسی تحریکات کے ضمن میں جیل کی سیر کی، ترقی پسند مصنفین کے زمرہ میں شامل ہیں، ہندی پرچار سبھا اور انجمن ترقی اردو دونوں اداروں سے تعلق ہے، دونوں زبانوں میں مضمون لکھا کرتے ہیں۔ ادب کے ساتھ سیاست میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی نثر میں سادگی، صفائی، جدت اور شگفتگی ہوتی ہے مسٹر لاہوتی کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

" انیسویں صدی عیسوی کے آخری تیس سال کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی

تاریخ میں ۱۹۵۷ء کی تباہی کے بعد عوام کی بیداری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اور اسی زمانہ میں ہندوستان کی بعض نامور ہستیوں نے جنم لیا ان میں سے ایک سروجنی نائیڈو بھی تھیں، نوجوان سروجنی نے زندگی کا پہلا نظارہ شعرو ادب کے فطری آئینہ میں کیا۔ اس وقت انھوں نے دنیا کو جس نظر سے دیکھا وہ پھولوں کی خوشبو اور قوس قزح کی رنگینی سے معمور تھی، لیکن زندگی کا یہ عبوری دَور بہت جلد گذر گیا اور ان کے اندر ایک ایسا آتش خانہ روشن ہوا جس نے اپنا ناتہ زندگی کی عریاں حقیقتوں سے جوڑ لیا اور اس کے بعد سے سروجنی نائیڈو کے افکار نے شاعری کے آسمان سے اُتر کر اپنے وطن کی اس خاک پر قدم رکھا جو اہلِ وطن کی آبرو کے خون سے آلودہ تھی۔ سروجنی نے اپنی روح کو ملک کے حوالے کر دینے کے بعد کسی وقت بھی اس سے پہلو تہی نہیں ہوتی بلکہ ہر امتحان کی آگ میں تپ کر ایسا جوہر خالص بن گئیں کہ اہلِ وطن نے ان کے سر پر کانگریس کی صدارت کا تاج رکھا۔" (رسالہ ایوان حیدرآباد نمبر ۱۹۵۱ء)

---

(۱۲) محمدؐ بن عمر

مرحوم محمد بن عمر آندھرا کے ایک ایسے سپوت تھے کہ جن کو موت کے فرشتہ نے بہت جلد اپنی آغوش میں لے لیا۔ جامعہ عثمانیہ کے ڈبل ایم، اے تھے یعنی اوّلاً انگریزی میں ایم، اے کیا، پھر اردو میں ایم اے کی ڈگری لی دونوں درجہ اوّل میں ہوئے، پی، ایچ، ڈی کا مقالہ مرتب کیا جو اردو زبان میں مغربی زبانوں کے الفاظ پر مشتمل تھا۔ بعض وجوہ سے مقالہ ترمیم کے لیے واپس ہوا تھا، اس عرصہ میں محمد بن عمر نے جاسوتاک پور سے فارسی میں بھی ایم، اے کی ڈگری حاصل کر لی۔ اور اسی جامعہ سے پی، ایچ، ڈی کے لیے غواصی پر ریسرچ کر رہے تھے، ان کا انتخاب ترکی زبان حاصل کرنے کے لیے ہوا اور استنبول گئے وہاں موت کے پنجے نے ان کو جکڑ لیا۔ محمد بن عمر نے کئی کتابیں لکھی ہیں، یہ کتابیں ادبی تنقید، ڈرامہ، تصوّف وغیرہ پر مشتمل ہیں، اردو زبان کی مغربی زبانوں کے جو الفاظ داخل ہوئے ہیں اس کے متعلق بھی محمد بن عمر کی بعض کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

محمد بن عمر کی نثر کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان کے خیالات بلند افکار میں عمق اور دلچسپی ہوتی ہے، تنقید سے غیر جانبداری، حقیقت برداری کا انکشاف ہوتا ہے افسوس ہے کہ غواصی پر وہ اپنا مقالہ مکمّل نہ کر سکے، اگر مقالہ مکمل ہو جاتا تو اردو میں ایک گراں بہا کتاب کا اضافہ ہوتا۔ محمد بن عمر کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

"ملّا غواصی گولکنڈہ کے ملک الشعرا سمجھے جاتے ہیں اور وہ عہد محمد قلی (۹۸۸ تا ۱۰۲۰) میں اپنے عنفوانِ شباب میں تھے اور ان کی شاعرانہ ترنگوں اور کمالِ فن کی اُٹھان کے باعث گولکنڈہ کے ایک اور بڑے شاعر ملّا وجہی اپنی بزرگی اور شاہی سرپرستی کے باوجود غواصی سے رشک و حسد کرنے لگے تھے اور یہی وجہ ہے کہ ۱۰۱۸ھ میں ان پر اپنی مثنوی قطب مشتری میں بہت چوٹیں کی ہیں، اس کے علاوہ ممکن ہے کہ شاہی دربار سے بھی غواصی کو دور رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔ کوئی تعجب نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ کو ان سے بدظن کرا دیا گیا ہو۔ اس لیے کہ غواصی کے دیوان میں کئی غزلیں ایسی ملتی ہیں جو محمد قلی کی غزلوں کی ہم طرح ہیں" اور ایک غزل میں تو مصرعے کے مصرعے لڑ گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غواصی نے بادشاہ کی غزلوں کے جواب میں غزلیں لکھنے کی جرأت کی تھی اور یہ ہمت اس وقت پیدا ہو سکتی تھی کہ جب کہ شاہی قدردانی سے ناامیدی ہو گئی اور بادشاہ کی حضوری سے محرومی کا یقین ہو۔" (کلیات غواصی)

خواتین کی نثرنگاری

اردو کی ترقی اور بقا کے لیے جس طرح صنفِ قوی کوشاں ہے اسی طرح صنفِ نازک بھی اس کے دوش بدوش حصہ لے رہی ہیں۔ آندھرا پردیش کی شاعر خواتین کا تذکرہ صفحاتِ گذشتہ میں ہو چکا ہے، اب یہاں نثرنگار خواتین کو پیش کرتے ہیں، مگر جس طرح بیسیوں نثرنگار مردوں میں سے چند کو پیش کیا گیا تھا۔ اس طرح کئی نثرنگار خواتین میں سے بعض کا تعارف کرایا جائے گا، کئی ایسی خواتین ہیں جن کے کارنامے منظرِ عام پر آگئے ہیں، مگر ان سب کا تعارف کرانا اور ان کی نثرنگاری کا نمونہ پیش کرنا دشوار ہی ہے اور غیر ضروری بھی، تاہم بعض بعض کے نام اور کام یہاں پیش کیے جاتے ہیں، مثلاً تاج یٰسین علی خاں صاحب جنھوں نے "آسٹریلیا کی جھلک" کے نام سے آسٹریلیا کا سفرنامہ دلچسپ اور دلکش انداز میں قلمبند کر کے شائع کیا ہے، جس کی مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے بھی ستائش فرمائی ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ شجاعت صاحبہ جنھوں نے جامعۂ عثمانیہ سے نفسیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، ابتدائی سماجی انسانیات شائع کی ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کا مقالہ "اردو ایسز" اور ماسٹر رام چندر کے مضامین، ڈاکٹر خالدہ کا مقالہ، اورنگ آباد کے اردو شعرا اور دیوان داؤد ڈاکٹر ثمینہ شوکت کی کتابیں مہ لقا وغیرہ، ڈاکٹر شریف النساء بیگم کا مقالہ ابو طالب حکیم کی حیات اور سوانح، جو موصوفہ کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔ زنانہ کالج کی فارسی ریڈر رضیہ بیگم کا مقالہ نظام گنجوی، ڈاکٹر قطب النساء کا مقالہ اردو سفرنامے، غرض اس طرح کئی ایک کتابیں مرتب ہوئیں، اور ان کو معیاری کہا جا سکتا ہے، دورِ گذشتہ کی کئی خواتین کی کتابیں اسی دور میں شائع ہوئی ہیں یعنی ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تین کتابیں، زینت ساجدہ بیگم کی چار کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ اب ہم بعض خواتین کا تعارف کراتے ہیں۔

آمنہ ابوالحسن

آمنہ ابوالحسن کا حیدرآباد کے صاحبِ علم خاندان سے تعلق ہے۔ آپ کے والد مولوی ابوالحسن سید علی صاحب حیدرآباد کے سربرآوردہ ایڈوکیٹ کے علاوہ سیاسی لیڈر بھی تھے۔ بہادر یار جنگ کے بعد آپ ہی مجلس اتحادالمسلمین کے صدر چُنے گئے۔

آمنہ ابوالحسن مصطفیٰ علی اکبر صاحب اخبار سیاست کے مشہور مضمون نگار کی شریک زندگی ہیں۔ آمنہ نے گھر میں تعلیم پائی ہے۔ مضمون نگاری اور افسانہ نگاری کرتی ہیں معیاری رسالوں مثلاً بیسویں صدی، شاعر، صبا، آندھرا پردیش وغیرہ میں آپ کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے علاوہ معلومات آفریں اور افسانے اپنے فنی معیار سے قابلِ قدر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ اب تک آپ کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے مگر افسانوں کی کافی تعداد شائع ہو گئی ہے جس کا ضخیم مجموعہ ہو سکتا ہے نمونہ پیش ہے۔

"اور زرینہ ٹھٹک کر پھر تیر کی طرح چھوٹ کر سیدھی اندر دوڑی" ناشتے میں توس مکھن کھاتے ہوئے اس کو بار بار احساس ہوتا رہا کہ اس کا دل اتنی زور سے کبھی نہیں دھڑکا۔ نہ جانے کیوں، نہ جانے کیسے، جیسے کوئی ہواؤں کے سہارے ان کے دل میں آن گھسا ہو، اسے صاف نظر آنے لگا۔ یہ بھڑکتا ہوا شعلہ اسے جلائے بغیر نہ رہے گا اور اس کے مزاج کی شوخی یک بیک نہ جانے کہاں چلی گئی۔

چور چوری نہ کرے، ہیرا پھیری ضرور کرتا ہے، موقع نکال کر شفیق نے اس سے کہا۔

"انسان کو کسی کا احسان نہیں بھولنا چاہیئے"

"اور احسان کر کے جتانے والوں کو کبھی یاد نہیں رکھنا چاہیئے"

"بھول جانے میں جتنا درد ہے اتنا لطف نہیں زرینہ"

اور زرینہ نے چپکے سے کہہ دیا۔

"چاہے لطف نہ ہو، لیکن زندگی کا کیف تو اس میں پنہاں ہے"

اور اتنا کہہ کر وہ گھبرا گئی۔

ایک بڑا سا ہاتھ اس کے تصور میں پھیلا رہتا۔

"صلح کرلو"

(صلح - بیسویں صدی)

(۲) جیلانی بانو

جیلانی بانو علامہ حیرت بدایونی کی دختر ہیں، حیرت صاحب بدایوں سے آکر حیدرآباد میں بس گئے۔ جیلانی بانو کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد میں ہوئی، صاحبِ علم خاندان ہونے سے بچپن سے جیلانی بانو کی فضا علمی رہی، جامعہ عثمانیہ سے بی، اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ جیلانی بانو کے لکھنے کا آغاز پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء سے ہوا۔ ابتدا میں علمی موضوعات پر خامہ فرسائی کی پھر افسانہ نگاری شروع کی اور اس وقت وہ ہندوستان اور پاکستان کے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں شامل ہیں، اپنے دَور کی نمایندہ سماجی اور سیاسی حقیقتوں کو موضوع بناکر کہانیاں لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔

جیلانی بانو کے افسانے ہندوستان اور پاکستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے ہیں اور پسند کیے جاتے ہیں، افسانوں کا ایک مجموعہ "روشنی کے مینار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

بلاخوفِ تردید یہ کہا جاسکتا ہے، جیلانی بانو نے صرف چند سال میں جو شہرت مقبولیت، پاکستان اور ہندوستان کی علمی دنیا میں حاصل کی ہے وہ قابلِ رشک ہے ان کو ترقی پسند زمرہ میں شامل کرنا چاہیے، ان کے افسانے حقیقت نگاری کا صحیح مُرقّع اور صالح ادب کا بیش بہا ذخیرہ ہوتے ہیں، نمونہ پیش ہے۔

"ان ہی دنوں مسلسل بیکاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کرایا، گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوا تو عائشہ کے خط سے پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا، تم لڑکیوں کو خط لکھنے کے لیے بھی تو کوئی بات نہیں ملتی، عائشہ کے خط بھی اس کی طرح خاموش اور معصوم ہوتے، جن میں اباّ کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے زیوروں کے ڈیزائن اور اس کی سہیلیوں

کے رومال تک ہر چیز کا ذکر تفصیل سے ہوتا ......

"بھائی جان آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہیئے کیونکہ آیندہ کوئی اس کی بات نہ ہوگی، جو میں آپ کو سناؤں آج تنہا اطہر بھائی کو ابا گھر لے آئے ہیں۔ قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مرچکی ہے۔

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔ یہ اپنی اپنی ذہنیت کا تصور ہے ادھر منہ کرو۔ تمہارے چمکتے آنسو کیا کہہ رہے ہیں، .... تم آج پھر گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لیے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو، لیکن میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا کہ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں" (روشنی کے مینار)

---

(۲) خدیجہ عالم

خدیجہ، آمنہ ابوالحسن کی بہن ہیں اور عالم خوندمیری کی شریک حیات، جس طرح پاکستان میں ہاجرہ مستور اور خدیجہ مستور دونوں بہنوں نے افسانہ نگاری میں بلند مرتبہ حاصل کرلیا ہے، اسی طرح حیدرآباد میں یہ دونوں بہنیں آمنہ اور خدیجہ نے بامِ شہرت پر قدم رکھا ہے۔ آمنہ کے افسانے قابلِ قدر ہوتے ہیں تو خدیجہ کے تنقیدی مضامین، اصلاحی مضامین عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، خدیجہ بیگم کے تنقیدی مضامین اور سیاسی مضامین حیدرآباد کے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔

" جمہوریت محض ایک طرزِ حکومت نہیں ہے بلکہ ایک طرزِ حیات بھی ہے خود جمہوری حکومت کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے اس ملک یا اس سماج کے لوگوں نے جہاں جمہوری طرزِ حکومت موجود تو ہے کہاں تک جمہوری طرزِ فکر اور جمہوری طرزِ حیات کو اپنایا ہے مشرق کے مشہور شاعر اور مفکر علامہ اقبال نے جمہوری طرزِ حکومت پر تنقید کی تھی اس طرزِ حکومت میں انسانوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ اگر جمہوری طرزِ حکومت، جمہوری طرزِ حیات کے بغیر کسی سماج پر عائد کردیا جائے تو واقعی

ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جمہوری طرزِ فکر کا بنیادی عنصر یہی ہے کہ ہر انسانی فرد اپنی جگہ پر ایک مقصد ہے۔

جمہوری طرزِ فکر انسانی افراد سے اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا کہ ہر فرد اپنی شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے اور نمایاں عنصر کو ایک اجتماعی سطح پر لے آنے کے لیے مٹادے اس کے برخلاف سچی جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی افراد اپنے انوکھے پن اور اپنی امتیازی خصوصیات کو اس طرح نمایاں کریں کہ وہ خصوصیات جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں اُبھر آئیں "۔

---

(۴) زینب امجد

زینب النساء بیگم نام، مگر زینب کے لقب سے مشہور ہیں، حیدرآباد کے مشہور عالم حکیم سید علی صاحب سشن جج کی پوتی اور برہان الدین صاحب مجسٹریٹ کی لڑکی ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد میں تولّد ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ سے بی، ایس، سی کی ڈگری حاصل کی، طالب علمی کے زمانہ سے اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتی رہیں، اردو، انگریزی، روسی، گجراتی تلگو وغیرہ زبانوں سے بخوبی واقف ہیں۔

امجد یوسف صاحب سے ۱۹۵۳ء میں شادی ہوئی اور ۱۹۵۷ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ ماسکو گئیں وہاں چند ماہ تک ایک نسواں رسالہ "سوویت عورت" میں کام کرتی رہیں، پھر ماسکو ریڈیو میں اردو کی اناؤنسر ہوگئیں، چند سال تک کام کیا اور اپنے شوہر کے واپس ہونے کے بعد حیدرآباد آئیں ماسکو کے قیام کے زمانہ میں بھی حیدرآباد کے مشہور اخبار سیاست میں مضامین لکھا کرتی تھیں، مضمون نویسی کا سلسلہ اب بدستور جاری ہے، مزاحیہ مضمون لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے، بچوں اور عورتوں کے لیے آپ کے مضامین بڑے دل چسپ ہوتے ہیں، ماسکو سے واپسی کے موقع پر انگلستان، فرانس، اٹلی، افغانستان وغیرہ ممالک کا سفر کیا ہے، آپ کے ایک مزاحیہ مضمون کا نمونہ پیش ہے۔

" اگر ناموں کو ہماری زندگی سے خارج کیا جائے تو فلسفہ، تاریخ اور سائنس کا خاتمہ ہو جائے، ہمارے تمدن کا شیرازہ بکھر جائے، سیاہ و سفید کی تمیز

باقی نہ رہے اور نہ کوئی سیاہ و سفید کا مالک ، بس روز ازل کا سماں ہو'
دنیا کی مختلف چیزوں کے بارے میں ہم اسی طرح دِقّت محسوس کرنے لگیں
جس طرح کسی نومولود کے نام رکھنے تک پیش آتی ہے ۔

ہر نام اپنی زبان کا قیدی ہوتا ہے ۔ اگر اس کا ترجمہ ہو جائے تو وہ اس
قید و بند سے آزاد ہو جاتا ہے اور مضحکہ خیز بن جاتا ہے' ایک روسی نام ہے
چیکوکوب (روس میں چسنوکوف لہسن کو بولتے ہیں) اگر اس کو اردو کا جامہ
پہنایا جائے تو یہ مرزا لہسن بیگ ہو جائے گا ۔ اربوزوف روسی زبان کے
مشہور ادیب ہیں ۔ اس کا ٹھیٹھ ترجمہ تربوز فاسے ہوگا۔

سوویت یونین میں بچوں کی دیکھ بھال میں لکھا :۔

جو قوم بچوں کی سب سے زیادہ فکر کرتی ہے اس کی ترقی کو پر لگ جاتے
ہیں اور اس کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا ۔ یہاں بچّہ کی فکر اس
کی دُنیا میں قدم دھرنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتی ہے ۔

جدید ادب کے بارے میں لکھتے ہوئے (FORMS) کے بارے میں لکھا :۔

"ہر تہذیب اپنی طرزِ ادا کے مختلف سانچے رکھتی ہے' ہر قوم اپنے تمدن' روایات
اور مزاج کے مطابق اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے مختلف طریقے
اور سانچے اختیار کرتی ہے ۔ یہ سانچے امتداد زمانہ کے ساتھ مٹتے ہیں لیکن روایات
کی طرح ان کی عمر طویل ہوتی ہے ۔ انسان جب نئی فضا میں سانس لینے لگتا
ہے تو زندگی کے تقاضے بدل جاتے ہیں وہ قدرت کا جوا اتار پھینکتا ہے ۔
قدیم (   ) آخری سانس لینے لگتے ہیں' شراب کہنہ سہی مگر جام
بدل جاتے ہیں :۔

عورت کی ازدواجی زندگی کے بارے میں لکھا :۔

" عورت کی مرد کے مظالم کے خلاف مسلسل جدوجہد ہمارے سماج کا
ایک ایسا پہلو ہے جس کو مورخوں نے جو کہ مرد ہی تھے یکسر نظر انداز کر دیا
ہے ۔ مرد نے عورت کو معاشی اور مذہبی بندھنوں میں ایسا جکڑا کہ اس
نے نہ اس کے آنسوؤں کا خیال کیا اور نہ اس کی آہوں کا ۔ لیکن عورت بھی

خاموش نہیں بیٹھی اس نے ان بندھنوں کو توڑنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی اور گذشتہ تین صدیوں میں اس نے خود کو مرد کے چنگل سے بڑی حد تک آزاد کرلیا ہے۔"

ڈاکٹر ناصرہ بیگم

ناصرہ بیگم مولوی فضل اللہ صاحب بانی حیدری گشتی کتب خانہ کی دختر اور مولانا صفی الدین کی پوتی ہیں، حیدرآباد میں تولد ہوئیں اور گوشہ محل ہائی اسکول وغیرہ میں تعلیم پائی۔ پھر زنانہ کالج میں شریک ہوئیں۔ بی۔ اے۔ ایم، اے کے بعد جامعۂ عثمانیہ سے فلسفہ میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اب گنتور کے زنانہ کالج میں فلسفہ کی لیکچرار ہیں، زمانۂ تعلیم سے مضمون نویسی کا شوق رہا۔ اصلاحی مضامین، تراجم، افسانے، تنقیدی مضامین وغیرہ لکھا کرتی ہیں، حیدرآباد میں اہل نوابط کا جو مشہور خاندان مولوی حسین اللہ مرحوم کے نام سے موسوم ہے خواتین میں ناصرہ بیگم پہلی خاتون ہیں جنھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آپ کی دو بڑی بہنیں ذاکرہ بیگم اور شاکرہ بیگم ایم، اے کی ڈگری رکھتی ہیں۔

ناصرہ بیگم کا پی، ایچ، ڈی کا مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کا عنوان "نقشبندی خاندان کا تصوف" ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے۔

"آج کا انسان جسم اور ذہن کی ترقی کے لیے کوشاں ہے، لیکن وہ روح کی ترقی کو فراموش کرچکا ہے۔ آج کے انسان کے لیے سائنس اور تمدن نے اتنی حیرت انگیز اور کارآمد اشیاء مہیّا کردی ہیں کہ موعودہ جنّت سے زیادہ اس دنیا کی عشرتوں پر فریفتہ ہوچکا ہے۔ بہت سے لوگ خدا اور آخرت پر یقین رکھنے کے باوجود بھی سمجھتے ہیں کہ دنیا میں آسانیوں کو حاصل کرنا بے انتہا ضروری ہے۔ اس کوشش میں خواہ انسان خدا سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہوجائے اور وہ زندگی جو مذہبی نقطۂ نظر سے کامیاب لیکن دنیاوی نقطۂ نظر سے ناکام رہتی ہے تو اس پر تاسف کرتے ہیں کیونکہ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی محرومیوں کے بعد کوئی اور محرومی قابلِ افسوس نہیں ہوسکتی، ایسے ہی لوگوں کا خیال اس شعر سے واضح ہوسکتا ہے۔

یہ آب و خاک باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو وہ یہی زمین ہے

---

(۶) واجدہ تبسّم

تقسیم ہند کے زمانہ میں سی، پی سے کئی خاندان حیدر آباد آکر آباد ہو گئے تھے، ان میں واجدہ تبسّم کا خاندان شامل ہے جو صاحب علم بھی تھا اور دولت مند بھی، مگر حیدر آباد آنے کے بعد اس خاندان کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی، مگر جس ہمت اور استقلال کے ساتھ اس خاندان کے افراد نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا وہ قابلِ قدر ہے، واجدہ نے اپنے جو تعلیمی حالات شائع کیے ہیں وہ اس قدر المناک اور رقّت انگیز ہیں کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، غرض انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ایم، اے کی ڈگری حاصل کرلی اور افسانہ نگاری میں اپنا نام پیدا کرلیا۔ اس وقت نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے مشہور افسانہ نگاروں میں شامل ہیں، ان کے افسانے بلحاظ فن، بلحاظ زبان، بلحاظ اسلوب قابلِ قدر ہوتے ہیں، واجدہ تبسّم کے افسانے اردو کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے ہیں، ان افسانوں کا مجموعہ "شہر ممنوع" پاکستان سے شائع ہوا ہے اور ایک ناول "شعلہ" بھی پاکستان ہی سے منظرِ عام پر آگیا ہے۔ ان کے افسانے "شہر ممنوع" اور دوسرے افسانے شکاگو یونیورسٹی (امریکہ) کے کورس میں شریک ہیں۔ آپ اپنے شریکِ حیات کے ساتھ بمبئی میں قیام ہے۔ افسانے کا اقتباس پیش ہے :-

" انسان دن بھر کام کرتا رہے۔ تھک کر چور ہو جائے، مر جائے اور کوئی تعریف کے صرف دو بول کہہ دے تو ساری محنت سپھل ہو جاتی ہے۔ بڑے بھیا نے نہ جانے کہاں سے محبت کا یہ انداز پالیا تھا۔ میں کانٹوں پر جی رہی تھی۔ پھر بھی محسوس کر رہی تھی، پھولوں کی گود میں پل رہی ہوں ان کا کام کرتے تھکن کے بجائے تازگی سی محسوس ہوتی۔ ان کے غم میرے غم تھے، ان کی خوشیاں میری خوشیاں، ان کے پیارے میرے پیارے۔ اور اب میرا دل یہ سوچ سوچ کر کیسا بیٹھا جا رہا تھا کہ میرے اتنے پیارے بڑے بھیا پائلٹ بن جانے کی سوچ رہے تھے۔ ہائے! ان طیارو

کا کیا بھروسہ ۔ آسمان کی فضا میں چلے جاتے ہیں ۔ ذرا کوئی خرابی آئی اور دھم سے زمین پر۔ کیا میں اپنے پیار کی آخری کرن کو بھی اندھیرے میں ڈوبتا دیکھوں گی ؟ اس دن میں نے بڑی بے بسی سے بھیّا سے منت کی تھی " بڑے بھیّا! خدا کے لیے آپ کوئی اور لائن ڈھونڈیے ۔ یہ آپ کو کیا سوجھی ۔ خدانہ کرے کچھ ہوگیا تو ؟ مجھے ان طیاروں کو دیکھ کر کبھی کوئی اچھا خیال نہیں آتا ۔"

بڑے بھیّا ہنس کر پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے ۔ نہ جانے کہاں کہاں سے بے سروپا باتیں سن آتی ہے ۔ کس نے تجھ سے کہہ دیا کہ میں پائلٹ بن رہا ہوں ۔ میں کہاں وہ تو' دکی' سوچ رہا ہے ۔ اور جیسے وہ کچھ رُک سے گئے نہ جانے کہاں سے سرسر کرتی آگ کی بڑی بڑی لپیٹیں آئیں اور جیسے میرے انگ انگ کو جلا گئیں ، جھلسا گئیں " دکی ، وکی ، دکی " میں ذرا رُکتے رُکتے بولی " مگر بھیّا آپ نے منع کیوں نہیں کیا ؟ "

(کھوئی ہوئی منزل ۔ بیسویں صدی)

تبصرہ

آندھرا پردیش میں اردو کے سلسلہ میں نظم (شاعری) اور نثر کا نمونہ پیش کر دیا گیا ہے ، نظم اور نثر کی ترقی سے اردو کی ترقی کا ایک خاکہ ذہن نشین ہوسکتا ہے ، اس دور میں نثر کے مختلف اقسام پر صنف قوی اور صنفِ نازک نے خامہ فرسائی کی ہے ۔ نثر کی کئی ایک کتابیں مرتب اور شائع ہوئی ہیں ، ان سے اردو کی ترقی اور اردو میں معیاری نثر کا اضافہ ہوا ہے ، مختصر افسانہ ، تنقید ، تاریخ سوانح ، سفرنامہ ، ڈرامہ ، تصوف ، معاشرت ، فلسفہ وغیرہ فنون میں اچھی اچھی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں ، نہ صرف عصرِ حاضر کے مصنفین بلکہ سابقہ دور کے نثر نگاروں کی اچھی اچھی اور بلند معیاری کتابیں شائع ہوئی ہیں ، چنانچہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری ، ہارون خاں شروانی ، ڈاکٹر جعفر حسین ، عبدالقادر صاحب سروری ، ڈاکٹر محشر عابدی وغیرہ کے ساتھ زینت ساجدہ ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ اس کے ساتھ عصرِ حاضر کی کئی اور خواتین مثلاً ڈاکٹر فاطمہ شجاعت ، ڈاکٹر سیدہ جعفر ، ڈاکٹر شریف النساء بیگم ، ڈاکٹر خالدہ یوسف اور ڈاکٹر شمسہ شوکت صاحبہ کی نثر کی کتابوں نے شائع ہو کر ثابت

کردیا ہے کہ اردو پر اوس نہیں پڑگئی ہے اگرچہ وہ حکومت کی سرکاری زبان نہیں رہی وہ جامعۂ عثمانیہ میں اس کو تعلیمی زبان کی حیثیت سے باقی نہیں رکھا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود کئی اچھی اور بلند معیار کی کتابوں کا شائع ہونا اور ان سے اردو کے ذخیرہ میں صالح ادب کا اضافہ ایک اچھی علامت ہے، اس سے اردو کی ترقی میں مدد ملتی ہے، اس دور میں جہاں افسانہ، ناول، انشائیہ، تنقید، سفرنامہ، فلسفہ، تاریخ، سوانح، معاشیات وغیرہ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں اور کلاسیکل ادب میں اضافہ ہوا ہے وہاں یہ امر بھی اردو کی ترقی کا ضامن ہے کہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ کی اُردو قلمی کتابوں اور کتب خانہ آصفیہ کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرستیں راقم نے شائع کیں، اور راقم کی کتاب "دکھنی اردو اور ہندو" جس میں دکن کے چار سو سال کے ہندو شعرار، نثرنگار، ایڈیٹر وغیرہ کا تذکرہ ہے اسی دَور میں شائع ہوئی ہیں۔

اس دور کی اردو کی ترقی کا ایک شعبہ یہ بھی ہے کہ کئی کتابوں کو ایڈٹ کرکے شائع کیا گیا ہے، مثلاً دیوان ہاشمی، دیوان داؤد، تحفۃ الشعرا، ریختی قیس، کلمۃ الحقایق، کلیات شاہی وغیرہ۔

اس دور میں کئی اداروں نے اردو کی اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں جو اردو کے نثری ذخیرہ میں بیش بہا اور گراں قدر اضافہ کا موجب بنی ہیں۔

اخبارات اور رسائل

اس دور میں جو روزانہ، ہفتہ وار اور ماہوار رسائل شائع ہوئے ہیں، ان میں بعض تو وہ ہیں جو ۱۹۴۸ء یعنی پولیس ایکشن کے بعد جاری ہوئے، اور بعض اخبار کی اجرائی اسی دور کی رہین منت ہے، اس موقع پر ہم ان تمام اخباروں اور رسالوں کی تفصیل نہیں کریں گے جو چند ماہ یا ایک دو سال تک شائع ہو کر بند ہو گئے بلکہ صرف ان اخباروں اور رسالوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو عرصہ سے جاری ہیں اور انھوں نے معیاری حیثیت حاصل کرلی ہے، کیونکہ اردو کی ترقی میں وہی اخبار اپنا مقام رکھتے ہیں جن کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

(۱) نظام گزٹ (روزانہ) یہ وہ اخبار ہے جو حکومتِ آصفیہ کے دور میں جاری ہوا، اور اپنی پالیسی کے باعث پولیس ایکشن میں بند نہیں کرایا گیا، حکومت حیدرآباد کے دور میں شائع ہوتا رہا اور اب آندھرا پردیش کے دور میں بھی برابر روزانہ شائع ہوتا ہے، البتہ اس کے پہلے ایڈیٹر وقار احمد صاحب کا اسی دور میں انتقال ہو گیا اور اب سید فاروق احمد صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔

اس اخبار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو کنگ کوٹھی (نذر باغ) یعنی نواب میر عثمان علی خاں کی سرکار سے تعلق ہے اور اکثر و بیشتر روزانہ نذر باغ کی خبریں جو نواب میر عثمان علی خاں کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں شائع ہوتی ہیں، اس اخبار میں ہفتہ میں ایک دن ادبی مضامین اور غزلیات وغیرہ بھی شائع ہوا کرتے ہیں۔

(۲) مشیر دکن (روزانہ) یہ حیدرآباد کا سب سے قدیم ترین اخبار ہے۔ اس کی اجرائی ۱۸۹۹ء میں ہوئی اور اب تک برابر شائع

ہوا کرتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر مسٹر واس دیو راۓ ہیں جو اپنے والد محترم کشن راؤ صاحب کے لگاۓ ہوۓ پودے کی پرداخت کرتے ہیں، مشیر دکن اپنی سلامت روی کے باعث ہر دور میں قابلِ ستایش ثابت ہوا ہے اور اب تک جاری ہے۔

(۳) **رہنمائے دکن** یہ اخبار حکومت حیدر آباد کے دور میں جاری ہوا، رہبر دکن کا قائم مقام ہے اور اسی پالیسی پر گامزن ہے اس کے ایڈیٹر منظور احمد صاحب ہیں۔ بڑے سائز کے چھ، آٹھ اور کبھی بارہ صفحے پر شائع ہوتا ہے اس اخبار کا اپنا برقی پریس ہے۔ نہ صرف حیدر آباد بلکہ حیدر آباد کے باہر بھی کافی مقبول ہے عصرِ حاضر کے اخباری معیار سے جانچا جاۓ تو اس اخبار کو پوری کامیابی حاصل ہوگی ادب سیاست، تاریخ، مذہب، ہر قسم کے اچھے اور بلند معیار کے مضامین اس میں شائع ہوتے ہیں۔ اخبار کے اسٹاف میں تعلیم یافتہ اصحاب شامل ہیں، اس کے علاوہ حیدرآباد کے ادیبوں، شاعروں، مؤرخوں، سیاستدانوں کا تعاون حاصل ہے۔ ہفتہ کے مختلف دنوں میں اس کی خاص اشاعتیں ہوتی ہیں، ایک دن شاعری کے لیے مخصوص ہوتا ہے، دوشنبہ کو جو اشاعت ہوتی ہے اس میں دنیا کے سیاسی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے اور بڑے غور و فکر سے اس کو مُرتّب کیا جاتا ہے، اخبار کا اداریہ بھی جاندار ہوتا ہے اور تدبر کر لکھا جاتا ہے، غرضکہ ایک بلند معیار کا روزنامہ ہے جس کا وقار قائم ہے، تصاویر بھی ہوا کرتی ہیں

(۴) **سیاست** اخبار سیاست بھی حیدر آباد قائم ہونے کے بعد جاری ہوا اور مسلسل ترقی کرتا جا رہا ہے، عابد علی خاں صاحب جو جامعۂ عثمانیہ کے ایک قابل سپوت گریجویٹ ہیں اس کے ایڈیٹر ہیں اور محبوب حسین صاحب جگر جوائنٹ ایڈیٹر ہیں، اخبار کا ذاتی برقی نسخ اور نستعلیق کا پریس اور اسٹاف ہے۔ ادیب اور شاعر دونوں شامل ہیں، حیدر آباد کے مشہور ادیبوں، شاعروں، مؤرخوں، سیاستدانوں کا تعاون بھی سیاست کو حاصل ہے، اس لیے اخبار سیاست، سیاسی، معاشی، اصلاحی اور ادبی نقطۂ نظر سے ایک کامیاب اخبار ہے، بڑے سائز کے آٹھ اور کبھی بارہ صفحے پر شائع ہوتا ہے، خصوصی اشاعتیں بھی قابلِ ستائش ہوتی ہیں، اخبار سیاست کو حکومت کا بھی پورا تعاون میسّر ہے اس کی ادبی، سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تاریخی مضامین بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

اس اخبار کا اداریہ بھی دلچسپ اور معیاری ہوتا ہے، حکومت کی پالیسی کی تائید بھی کرتا ہے اور تنقید بھی۔ لیکن اس کے باوجود اداریے جرأت سے لکھے جاتے ہیں، اور آزاد اخبار کے بلند معیار کو ظاہر کرتے ہیں، اکثر و بیشتر تصاویر بھی شائع ہوتی ہیں۔

(۵) ملاپ پولیس ایکشن کے بعد اور حکومت حیدرآباد قائم ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد جاری ہوا۔ اس اخبار کا صدر مقام دہلی ہے اور اس کی دو شاخیں حیدرآباد اور جالندھر میں قائم ہیں، انگریزی اور اردو میں اس کی اشاعتیں ہوتی ہیں، اولاً ہندی میں بھی اس کی اشاعت ہوتی تھی مگر اس کو قیام و دوام حاصل نہ ہو سکا۔

اخبار ملاپ کافی سرمایہ سے شائع ہوتا ہے۔ روزانہ اور ہفتہ وار اخبار میں تصاویر شائع کرنے کا خاص انتظام ہے، بلاک سازی بھی ملاپ پریس میں ان کے اپنے ذاتی شعبہ میں ہوتی ہے، پہلے اس کی اشاعت میں شاکر صاحب شامل تھے، انھوں نے اپنا ایک ذاتی اخبار جاری کر کے ملاپ سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ اب علاؤالدین حبیب صاحب اس کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں، اخبار سیاست، رہنمائے دکن کی طرح ملاپ کی بھی ہفتہ میں کئی خاص اشاعتیں مثلاً ادبی، فلمی وغیرہ مخصوص ہوتی ہیں، شاعری کو بھی اس میں شامل کیا جاتا ہے۔ ملاپ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ عموماً شاعر اور ادیب کی تصویر بھی اس کے مضمون اور کلام کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ یدویر صاحب ایک قابل سیاستداں اس کے ایڈیٹر ہیں، دوسرے اخباروں کی طرح اخبار ملاپ بھی حیدرآباد کے علاوہ اضلاع اور بیرون حیدرآباد میں جاتا ہے۔

اخبار سیاست، رہنمائے دکن اور ملاپ حیدرآباد کے وہ روزانہ اخبار ہیں جو معیاری قرار دیئے جاتے اور اشاعت کے لحاظ سے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عوام میں بھی ان اخباروں کو پسند کیا جاتا اور خواص میں تو ان اخبارات کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور پوری اہمیت دی جاتی ہے۔

(۶) انگارے یہ بھی روزانہ اخبار ہے اس کے ایڈیٹر معین فاروقی صاحب اور جوائنٹ ایڈیٹر وحید فاروقی صاحب ہیں، اس کی اشاعت بھی حکومت حیدرآباد کے قائم ہونے کے بعد ہوئی ہے، ہفتہ وار اشاعت بھی خصوصی ہوتی

ہے ۔ ادبی، سیاسی، اقتصادی، مضامین کافی دلچسپ اور معلومات آفریں ہوتے ہیں۔

(۷) **ہمارا اقدام** یہ بھی روزانہ اخبار ہے اور اس کی اشاعت حکومت آندھرا کے قیام کے بعد ہوئی ہے، پہلے " اقدام " کے نام سے شائع ہوتا تھا، پھر اس کے ایڈیٹر وغیرہ تبدیل ہو گئے اور نام بھی بدل دیا گیا۔

(۸) **امر بھارت** اخبار ملاپ کے جوائنٹ ایڈیٹر شاکر صاحب نے ملاپ کے اسٹاف سے سبکدوشی حاصل کر کے اپنا ذاتی اخبار امر بھارت جاری کیا ہے ۔ اخبار کے لیے سرمایہ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے ۔ چونکہ یہ اخبار حال ہی میں جاری ہوا ہے اس لیے ہنوز ابتدائی مراحل میں نظر آتا ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ اپنے قابل ایڈیٹر کی وجہ سے ترقی کے زینے طے کرے گا۔

ان روزانہ اخباروں کے علاوہ اور چند روزانہ اخبار بھی شائع ہوئے ہیں۔

ماہنامہ اور سہ ماہی رسالے

حیدرآباد یا آندھرا پردیش سے ماہوار اور سہ ماہی رسائل بھی شائع ہوئے ہیں، حیدرآباد میں ماہانہ اردو رسائل کو کبھی استحکام حاصل نہیں ہوا ۔ گرچہ اچھے اچھے بلند معیار کے ادیب، شاعر، مؤرخ ، افسانہ نگار حیدرآباد میں موجود ہیں اور ان کے مضامین حیدرآباد کے باہر کے رسالوں میں نہایت احترام کے ساتھ شائع ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود حیدرآباد کا کوئی علمی، ادبی رسالہ کامیاب ثابت نہیں ہوا ۔ چند سالوں کے بعد اس کی اجرائی بند ہو جاتی یا معیار پست ہو جاتا اور بالآخر دم توڑ دیتا ہے، آج سے نہیں بلکہ گذشتہ نصف بلکہ ایک صدی سے یہی حالت نظر آتی ہے، رسالہ حسن، دکن ریویو، افادہ، ذخیرہ، صحیفہ، ترقی وغیرہ نہایت آب و تاب سے شائع ہوتے تھے مگر ان کو بھی چند سال کے بعد بند کر دیا جاتا رہا ۔ بہرحال آجکل جو رسالے شائع ہوتے ہیں، ان میں سے چند کی صراحت یہاں کی جاتی ہے ۔

(۱) **آندھرا پردیش** یہ حکومت کے دفتر اطلاعات کا سرکاری رسالہ ہے جو کافی اخراجات کے ساتھ شائع ہوتا ہے ۔ طباعت، کاغذ وغیرہ کے لحاظ سے دیدہ زیب ہوتا ہے، مضامین کے لحاظ سے اس کو اہمیت دی جاسکتی ہے

ہر رسالہ میں عمدہ فوٹو بھی ہوتے ہیں۔ اب تک مسٹر کنول پرشاد اس کے ایڈیٹر تھے مگر اب موصوف کو ہندی سے متعلق کر دیا گیا ہے اور اردو ایڈیشن کے لیے ایک خاص ایڈیٹر کا تقرر ہونے والا ہے، اس لیے توقع ہے کہ جب اردو حصے کا ایک خاص ایڈیٹر ہو جائے گا تو اس رسالہ کا معیار اور زیادہ بلند ہو جائے گا تو اس رسالہ کا معیار اور زیادہ بلند ہو جائے گا اور ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے رسالوں، آجکل، نیا دور، تعمیر وغیرہ سے بازی لے جانے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۲) سب رس

یہ ادارہ ادبیات کا ماہوار رسالہ ہے اور عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ حیدر آباد کے دوسرے رسالوں سے اس لیے اس کو ترجیح ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہے، اس رسالہ کا معیار کبھی بلند سے بلند تر اور کبھی پست تر ہو جاتا ہے۔ اس کو ادارۂ ادبیات کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے، ادارہ کا آرگن ہے۔ اس وقت اس کو وقار خلیل اور اکبر الدین صدیقی صاحب مرتب کرتے ہیں۔ اگرچہ رسالہ کے بورڈ میں کئی اصحاب کے نام شامل ہیں اور راقم کا نام بھی اس میں درج ہوتا ہے مگر دراصل اس بورڈ کو عملاً کوئی زیادہ تعلق رسالہ اور اس کے مضامین سے نہیں ہوتا۔

(۳) صبا

یہ ماہوار رسالہ ہے، اس کے ایڈیٹر سلیمان ادیب صاحب ہیں جو حیدر آباد کے ترقی پسند زمرہ کے مشہور شاعر ہیں اپنے قابل ایڈیٹر کی وجہ سے رسالہ کے مضامین بلند معیار کے حامل، معلومات آفریں اور دلچسپ ہوتے ہیں، مگر سرمایہ کی کمی وجہ سے وقت پر شائع نہیں ہوتا اس لیے اس کی اشاعت بھی محدود رہتی ہے، لیکن اس کے باوجود رسالہ "صبا" اردو کے دوسرے معیاری رسالوں کے ہم پایہ ہے اس کے مضامین ہر لحاظ سے معیاری ہوتے ہیں۔

(۴) مجلس

یہ سہ ماہی رسالہ ہے اور اردو مجلس کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔ منظور احمد صاحب ایم۔ اے اس کے ایڈیٹر ہیں۔ اکثر وہ مضامین شائع ہوتے ہیں جو اردو مجلس میں ہر ماہ سنائے جاتے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین بھی اچھے اور بلند معیار کے اس رسالہ میں ہوتے ہیں۔

(۵) ہندوستانی ادب

یہ ماہوار رسالہ ہے جو حکومتِ آصفیہ کے زمانہ سے شائع ہوتا ہے۔ غلام محمد صاحب ایم۔ اے عثمانیہ اس کے ایڈیٹر ہیں

اس رسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ " اردو املا " ایک خاص طرز کے مطابق لکھا جاتا ہے تاکہ اردو کو آسان اور عام فہم بنایا جائے۔

(۶) **ارشاد** ارشاد ایک ماہوار رسالہ ہے جو آندھرا پردیش بننے سے پہلے مولوی یوسف الدین صاحب شائع کرتے تھے، یہ نیم مذہبی رسالہ تھا۔ اب مولوی صاحب کے فرزند اس کو شائع کرتے ہیں اور اب علمی وادبی رسالہ ہے۔

(۷) **القدیر** ایک مذہبی رسالہ ہے جو دورِ آصفیہ کے وقت سے شائع ہوتا ہے ماہوار رسالہ ہے۔

بعض کالجوں کی جانب سے سالنامے شائع ہوتے ہیں جو محنت اور تن دہی سے مرتب کیے جاتے ہیں اور اکثر مضامین افسانے پسندیدہ اور دلچسپ ہونے کے علاوہ معیاری ہوتے ہیں۔

اخبارات کے سلسلہ میں دو اصحاب کا تذکرہ فراموش نہیں کیا جاسکتا جو اخبار سیاست اور اخبار ملاپ سے تعلق رکھتے ہیں، اوّل الذکر محبوب حسین صاحب جگر اور ثانی الذکر علاؤ الدین صاحب حبیب ہیں، دونوں جامعۂ عثمانیہ کے ایم' اے ہیں اور اپنے تعلیمی زمانہ سے ادب کی خدمت میں مصروف، ان کی وجہ سے اخبار سیاست اور اخبار ملاپ کو ترقی ہوتی جارہی ہے چونکہ دونوں اصحاب اردو لٹریچر کے ساتھ ساتھ اخباری دنیا کے فنی معلومات اور شہری اصحاب کی نفسیات سے پوری مہارت رکھتے ہیں اس لیے اپنے زور قلم سے کام لے کر اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اُردو کے ادارے

اردو کی ترقی کے سلسلہ میں اردو اداروں کا بھی حصہ ہوتا ہے یوں تو حیدرآباد کے کئی ادارے اور انجمنیں ہیں جو اپنی بساط کے موافق اردو کی خدمت کرتے ہیں، مگر یہاں ان مشہور اداروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن کو خصوصیت حاصل ہے۔

(۱) ادارۂ ادبیات اُردو

سب سے پہلے ادارہ ادبیاتِ اردو کا تذکرہ ضروری ہے جو دورِ آصفیہ میں قائم ہوا تھا اور اب تک ترقی کے زینے طے کر رہا ہے، اب اس ادارہ کی ایک عمارت ایوان اردو کے نام سے تعمیر ہوگئی ہے، جس کے لیے بیگم ڈاکٹر زور نے اپنے مکان کے وسیع احاطہ سے کئی سو گز زمین مفت دے دی اور اس پر ایوان کی عمارت حکومتِ آصفیہ کی امدادی رقم جو جمع تھی اور حکومت ہند کے عطیہ اور دیگر عطیوں سے مکمل ہوئی ہے، ادارے میں اردو کے نوادرات یعنی مخطوطات، فرمان، خطوط وغیرہ کا بھی ذخیرہ ہے، اس ادارہ کی جانب سے اردو کتابوں کی اشاعت ہوتی ہے، رسالہ سب رس شائع ہوتا ہے، کبھی کبھی مشاعرہ کی محفل منعقد ہوتی ہے ادارہ میں مطالعہ گھر بھی ہے، بعض کتابوں کے لکھنے کے لیے وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔ سلطان محمد قلی کا سالانہ جشن بھی ادارہ کی جانب سے نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اس کے بانیوں میں ڈاکٹر زور صاحب کے علاوہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب، راقم اور سروری صاحب شریک تھے، اب اس کے صدر علی اکبر صاحب سابق ناظم تعلیمات حکومت آصفیہ اور ارکان میں کئی اصحاب شامل ہیں، ڈاکٹر زور صاحب کے کشمیر میں صدر شعبۂ اردو اورڈین کی خدمت کے سلسلہ میں مامور رہنے سے ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ صاحب جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام انجام دیتے ہیں۔ آندھرا میں اردو

کی ترقی کے سلسلہ میں ادارہ ادبیات اردو اپنی امکانی کوشش میں مصروف ہے۔

(۲) انجمن ترقیِ اردو

کل ہند انجمن ترقی اردو علی گڈھ کے قیام کے بعد یہاں اس کی شاخ قائم ہوئی اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب اس کے سکریٹری چنے گئے اور ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب صدر منتخب ہوئے تھے، اب اس انجمن کے صدر نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات ہیں۔

انجمن ترقی اردو نے حیدرآباد میں اردو کی بقا اور ترقی میں بڑی سعی اور جدوجہد کی ہے۔ پولیس ایکشن کے بعد اردو کا نام لیتے اور اس کی حمایت میں زبان کھولنے سے اہلِ علم کو خوف دامن گیر ہوتا تھا اور حکومت کی باز پرس یا حکومت کی ناراضی کا خوف لگا ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اوّلاً اس خوف کو کانفرنس کر کے دور کیا اور اردو کی ترقی کے لیے راستہ ہموار کیا، اس کے بعد دوسرے کئی امور انجام دیئے، کتابیں شائع کیں، کتب خانوں کی اردو مخطوطات وضاحتی فہرستیں مرتب کرانے کا آغاز کیا، اس سلسلہ میں راقم الحروف سے خرچ سواری ادا کر کے کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ سنٹرل ریکارڈ آفس اور کتب خانہ حیدرآباد میوزیم کی قلمی اردو کتابوں کی وضاحتی فہرست مرتب کرائی، کتب خانہ سالار جنگ کی فہرست اسٹیٹ کمیٹی کی جانب سے شائع ہوئی اور آخر الذکر دو فہرستیں رسالہ نوائے ادب بمبئی میں شائع کی گئیں اور اب کتب خانہ آصفیہ کی فہرست مرکزی حکومت کے وزارت سائینٹفک ریسرچ و کلچرل افیرس کی امداد سے کتب خانہ خواتین دکن وادارہ تحقیقات نے شائع کر دی ہے۔

انجمن ترقی اردو کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو ہال تعمیر کیا، اردو کے لیے کوئی مستقل عمارت نہیں تھی، مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے اراضی کا وسیع قطعہ اپنے مکان حمایت نگر سے انجمن ترقی اردو کو عطیہ دیا اور اوّلاً سجاد مرزا صاحب کے عطیہ پندرہ ہزار سے عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ عوام کے چندہ سے اس کی تعمیر کا آغاز ہوا، حکومت ہند نے بھی عطیہ دیا اس طرح دو لاکھ سے زیادہ صرف سے اردو ہال کی شاندار خوبصورت عمارت مکمل ہوگئی اور اردو کے لیے ایک مستقل عمارت وسیع ہال کافی گنجائش سے تیار ہوگیا۔

انجمن نے اردو کالج بھی قائم کیا ہے جو جامعۂ عثمانیہ سے ملحق ہے، اس طرح انجمن ترقی اردو آندھرا میں اردو کی ترقی اور اس کی بقا کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ مدراس میں اردو

جماعتوں کے قائم رکھنے اور اردو کلاسوں کے کھولنے کا کام بھی کرتی ہے۔

انجمن نے جو ہال تعمیر کیا ہے اس کو دوسرے علمی اور ادبی انجمنوں اور آرٹس کے جلسوں کے لیے کرایہ سے بھی دیا جاتا ہے، اس طرح انجمن ترقی اردو کو ایک ذریعۂ آمدنی بھی اردو ہال بن گیا ہے، اردو ہال ایک بورڈ کے تحت ہے، انجمن ترقی اردو کا کتب خانہ اور مطالعہ گھر بھی اسی ہال میں قائم ہے۔

(۳) اردو مجلس

اردو مجلس کو مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے قائم کیا تھا جو پولیس ایکشن کے پہلے کا زمانہ ہے، پولیس ایکشن کے بعد یہ مجلس بدستور قائم رہی، ہر مہینہ کسی علمی، ادبی موضوع پر تقریر ہوتی اور اس کے بعد مشاعرہ ہوتا، دو تین گھنٹہ کی نشست ہوتی اور اصحابِ علم اور تعلیم یافتہ خواتین کا خاصا مجمع ہوتا ہے اس وقت رائے جانکی پرشاد صاحب اس کے صدر اور منظور احمد صاحب ایم، اے اس کے آنریری سکریٹری ہیں، اس مجلس کی جانب سے سہ ماہی رسالہ "مجلس" شائع ہوتا ہے اور مجلس نے بعض مشاہیر اردو کے یوم بھی شاندار پیمانے پر منائے ہیں۔

(۴) مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ادارہ ادبیاتِ اردو کے ساتھ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہے، اس ادارہ کے صدر نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات اور سکریٹری ڈاکٹر زور صاحب ہیں، اس ادارہ کے دو بورڈ ایک انتظامی اور دوسرا تحقیقی، مرکزی حکومت اور دیگر ذرائع سے اس ادارہ کو امداد ملتی ہے، اور ریسرچ اسکالروں کو وظائف دے کر کتابیں لکھوائی اور ترجمہ کی جاتی اور شائع کی جاتی ہیں۔ اس ادارہ کا مقصد اردو کے علاوہ دیگر زبانوں میں علمی لٹریچر مہیا کرنا ہے اس ادارہ کا قیام آندھرا پردیش کے قائم ہونے کے بعد ہوا ہے۔ یہ ادارہ اپنے دائرۂ عمل میں اردو کی خدمت کر رہا ہے۔

(۵) ادارہ تحقیقات نسواں

کتب خانہ خواتین دکن کے ساتھ ادارہ تحقیقات نسواں بھی قائم ہے، اس کی صدر مسز روڈا مستری اور سکریٹری راقم الحروف ہے۔ کتب خانہ سے طالبات ایم، اے، بی، اے کے علاوہ دیگر تعلیم یافتہ خواتین مفت اپنے مکان کو کتابیں لے جا کر استفادہ کرتی ہیں اور پی، ایچ، ڈی کے لیے ریسرچ کرنے والی طالبات اور بعض طلبہ بھی مستفید ہوتے ہیں،

دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ اپنے مقالوں کے لیے مواد طلب کرتے ہیں۔ اب اس کتب خانہ کے ساتھ ادارۂ تحقیقات قائم کردیا گیا ہے۔ حکومتِ ہند کے وزارت سائنٹفک ریسرچ اور کلچرس افیریس کی امداد سے اردو کتابیں شائع کرنے کا آغاز کیا گیا ہے۔ اس ادارہ کی اوّلین پیش کش کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات دو جلدوں میں اور مقالۂ پی' ایچ' ڈی ڈاکٹر شریف النساء بیگم جو ابوطالب کلیم کی حیات اور شاعری پر مشتمل ہے' کی رسم اجرائی نواب مہدی نواز جنگ گورنر گجرات نے انجام دی ہے اگرچہ حیدرآباد میں کئی کتب خانے اور مطالعہ گھر موجود ہیں مگر کتب خانہ خواتین دکن کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے۔ اس سے خواتین میں مطالعہ کا شوق زیادہ ہوتا اور اردو کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔

(۶) مجلسِ تحقیقاتِ اُردو

پروفیسر عبدالقادر سروری کی زیرنگرانی یا زیرصدارت یہ ادارہ قائم ہوا ہے اور چند کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ بیگم کی کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں' اس کے علاوہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت صاحبہ کی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

(۷) اُردو اکیڈیمی

یہ بھی ایک ادارہ حال میں قائم ہوا ہے اور اس کی جانب سے بھی چند کتابیں شائع ہوئی ہیں' اکبرالدین صاحب صدیقی اس کے سکریٹری ہیں ان اداروں کے ساتھ اور دو اداروں کا تذکرہ اردو کی ترقی کے سلسلہ میں کرنا ضروری ہے یعنی (۱) آندھرا ساہتیہ اکیڈیمی اور (۲) تلگو اُردو اکاڈیمی برائے تاریخ و سائنس۔

(۸) آندھرا ساہتیہ اکیڈیمی

اس کے صدر ڈاکٹر گوپال ریڈی صاحب ہیں۔ آندھرا میں تلنگی اور اردو کی ترقی اور توسیع کے سلسلہ میں یہ ادارہ اہم کام انجام دے رہا ہے' حکومت کی جانب سے کافی امداد ملتی ہے۔ بلکہ اس کو نیم سرکاری ادارہ کہا جائے تو بیجا نہیں ہے۔

اس ادارے کی جانب سے اردو کے سلسلہ میں دو کتابیں " حیدرآباد کے شاعر" اور حیدرآباد کے ادیب شائع ہوئی ہیں اور ان کی دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ادیب کی مؤلف زینت ساجدہ ہیں دونوں جلدیں انھوں نے مرتب کی ہیں۔ "حیدرآباد کے شاعر" کی پہلی جلد کو حمیدالدین صاحب شاہد نے مرتب کیا اور

دوسری جلد سلیمان ادیب صاحب نے مرتب کی ہے۔

اس ادارہ کی جانب سے اردو کے شعرا اور ادیبوں کو نقد انعام بھی دیا جاتا ہے، چنانچہ اب تک تین مرتبہ انعاموں کی تقسیم ہوئی ہے۔ پہلی مرتبہ حضرت آمجد، بانو طاہرہ سعید، راگھوبندر راؤ جذب، شاہد صدیقی صاحب، تمکین کاظمی صاحب، وزیر حسن صاحب، رشید الحسن صاحب، محشر عابدی صاحب اور راقم الحروف کو یہ اعزاز دیا گیا، دوسری مرتبہ سلیمان ادیب صاحب، دیس رائے صاحب وہمی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم صاحبہ کو یہ انعام ملا، تیسری مرتبہ واسدیو راؤ صاحب ایڈیٹر مشیر دکن، قمر پیامی صاحب اور عبدالرزاق صاحب بسمل کو اس انعام سے نوازا گیا۔

بہرحال آندھرا ساہتیہ اکیڈمی سے اردو کے ادیب اور شعراء کی سرپرستی ہوئی ہے جو اردو کے سلسلہ میں ایک نیک فال ہے۔

(۹) تلنگو اُردو اکاڈیمی برائے تاریخ وسائنس

اس کے صدر رائے کاشیشور راز صاحب آنجہانی تھے۔ اس ادارہ کا مقصد تلنگی اور اردو میں تاریخ اور سائنس کے ذخیرہ کا اضافہ کرنا ہے۔ اس ادارہ کی جانب سے دو اور کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یعنی

(۱) ہندوستان کا دستور اور اس کی تشریح" مترجمہ پروفیسر ہارون خاں صاحب۔

(۲) "حیوانات کی زندگی کی دلچسپ باتیں" مرتبہ ڈاکٹر محشر عابدی صاحب۔

توقع ہے کہ اردو کی اور کتابیں بھی شائع ہوں گی۔ اس اکیڈیمی سے اردو کی معیاری کتابوں کا اضافہ ہوگا۔

خاتمہ

دکن میں تاریخ ادب اردو کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لانے کا کام آج سے چالیس سال پہلے ۱۹۲۳ء میں طالب علمانہ طریقہ پر آغاز کیا گیا تھا۔ اس چالیس سالہ زمانہ میں کوشش و سعی کا جو سلسلہ جاری رہا اس کا نتیجہ اب یہ ضخیم مجلّد ہے۔

" شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم "

اس امر کا صدقِ دل سے اعتراف ہے کہ تحقیق، کاوش اور تنقید و تبصرہ کا ابھی بڑا میدان طے ہونا ہے، لیکن اب یہ کام ان افراد کا ہے جن کے دماغ تازہ ہوں اور جو خالص علمی کام کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔

چھیاسٹھ سالہ سن سے اس سے زیادہ کی امید کرنا صحیح نہ ہوگا۔ جو ذخیرہ معلومات جمع کیا گیا اور ان اوراق میں ان کو پیش کیا گیا ہے وہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جبکہ اس کو اپنی زندگی اور اپنے متعلقین کی زندگی بسر کرنے کے لیے دوسرے ذرائع مشیت بھی فراہم کرنا ہوتا ہے جو سررشتۂ تعلیمات یا یونیورسٹی سے متعلق نہیں۔

صفحاتِ گذشتہ سے اس امر کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے کہ دکن میں چھ صدیوں سے اردو ادب کی ترقی کے مدارج طے ہوتے رہے اور اس کی تخلیق اور ارتقا میں اگر ایک طرف معمولی شہریوں نے اپنی کاوش کا حق ادا کیا ہے تو دوسری طرف خود شاہانِ وقت نے بھی برابر سعی کی ہے ان کی سرپرستی نے ہی اردو کو اس قابل کیا تھا کہ دکن میں اس کی پہلی جامعہ کھولی گئی۔

جامعۂ عثمانیہ اردو زبان کی ترقی کی وہ منزل تھی جہاں یہ کارواں صدیوں کے مراحل سفر طے کرنے کے بعد پہنچا تھا، جامعۂ عثمانیہ کے عالم وجود میں آجانے کے بعد حیدرآباد پر جو

علمی فضا چھائی ہوئی تھی وہ ادبِ اردو کے لیے ایک نہایت پُرشان وشکوہ مستقبل کی کفیل تھی بیکن ۱۹۴۸ء کے پولیس ایکشن کے بعد یہ امید ختم ہوگئی تھی کہ اردو کی قدیم روایات اب پائیدار اور استوار رہ سکیں گی۔

۱۹۵۶ء میں حیدر آباد کی تقسیم ہوگئی اور آندھرا پردیش عالم وجود میں آیا، حکومتِ آندھرا پردیش نے یہ اعلان کیا ہے کہ تلنگی کے ساتھ اردو بھی اس کی سرکاری زبان ہوگی۔ اس وقت حکومت کے دفاتر کی زبان انگریزی ہے، لیکن اضلاع اور تعلقات وغیرہ میں تلنگو کو حکومت کی زبان کا درجہ مل رہا ہے۔ آئندہ چل کر ریاست کے دارالحکومت میں بھی تلنگی کو اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ جامعۂ عثمانیہ سے جس طرح اردو کو خارج کر دیا گیا ہے وہ چشم بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے، آندھرا کی دو یونیورسٹیوں میں تلنگی کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنایا جانے والا ہے، اگر یہ ہو جائے تو پھر ہمدردانِ اردو کے لیے نئے سوالات پر غور کرنا ہوگا۔ تاریخ ہمیشہ یہ دکھاتی آئی ہے کہ متوقع اور متحصلہ نتائج میں بڑا فرق رہتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی